www.pkdigest.com

چینی نکتہ چینی — 11
مدیر اعلیٰ
قارئین کی کرم فرمائیاں، کچھ اور آئیں
نامہ و پیام، تحسین، تعریفیں اور شکایتیں

تپش عشق — 18
سائرہ فاروقی
آگ کے دریا میں ڈوب کر منزل عشق تک پہنچنے
کا عزم سفر کرنے والے دو دلوں کی داستان

تحریک — 53
محمد عرفان رامے
تحسین اسراری تحریک کے ساتھ
ایک پراسرار حقیقت پر مبنی کہانی

دماغ فروش — 65
مختار آزاد
اس فرض شناس پولیس افسر کی سرگرمیاں جو
صورت معاشرے سے جرم کا خاتمہ چاہتا تھا

سیلاب کے بعد — 81
منظر امام
سیلاب آئے اور پانی اتر جانے کے بعد جنم
لینے والے مسائل کی ایک تصویر کشی

للکار — 88
ظہیر جاوید مغل
محبت کے محاذ پر لڑنے والے شخص کی جدوجہد
اسے اپنے تحفظ کی جنگ کا سامنا تھا

چاہ کن — 131
عبدالرب بھٹی
اسرار و تحیر کی دھند میں چھپا قاتل ایک
حیرت انگیز انجام کی منتظر و پراسرار کتھا

قاتل گھنٹی — 135
سیر بینا راشد
حقوق انسانی اور تہذیب کا گڑھ کہلانے والے
مغرب کی بدتہذیب شرانگیزیاں

بہروپیا — 147
بابر نعیم
کسی کا اعتبار کرنے والے افسران کو
پیش آنے والے پیچیدہ کیس کی روداد

گرداب — 156
اسد قادری
تقدیر کی ستم ظریفی اور قسمت کی کج ادائی کا مقدر
کا کھیل، ملتے اور بچھڑ جانے والوں کی کہانی

چالاک احمق — 195
آصف ملک
عقلمندوں کی عقل کے آگے بے وقوفی جو خوشی
کے شادیانے بجاتے ہیں، مزاح کا شگفتہ ناول

کٹھ پتلی — 206
کاشف زبیر
تحیر و اسرار کے پردے کے پیچھے
کھیلے گئے سنسنی خیز خونی کھیل کا ماجرا

زرِ زن زمین — 227
تنویر ریاض
زمانہ شناس عیار ذہنوں میں پنپنے
والی سازشوں کے انکشافات

گمشدہ کل — 258
احمد اقبال
اس تغیر پرست کا احوال جس کی
زندگی میں سب ہی کچھ جز وقتی تھا

www.pkdigest.com

جلد 39 • شمارہ 10 • اکتوبر 2010 • زرِ سالانہ 600 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 50 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون: 5895313 (021) فیکس 5802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

چٹنی نکتہ چینی

مدیر اعلیٰ

قارئین... السلام علیکم!

اکتوبر 2010ء کا شمارہ پیش خدمت ہے... نہ جانے کیوں آج اکتوبر 1951ء کا وہ دن شدت سے یاد آرہا ہے... جب نوزائیدہ مملکت خداداد پاکستان کے استحکام کے لیے کوشاں پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان کو خون میں نہلا دیا گیا تھا۔ پاکستان کو غیر مستحکم کرنے کی جو سازش لیاقت علی خان کے قتل سے شروع ہوئی تھی... اس کا تسلسل آج بھی جاری محسوس ہوتا ہے۔ پاکستان کے بانیوں نے جس مملکت کو استحکام بخشنا چاہا تھا وہ ریاست اب اس سے کہیں زیادہ غیر مستحکم نظر آتی ہے... جتنی کہ اپنے قیام کے وقت عالم بے سروسامانی میں بھی نہیں تھی... 1951ء سے لمحہ بہ لمحہ سفر کرتے ہم اکتوبر 2010ء میں آپہنچے... لیکن بے یقینی اب بھی آسیب کی طرح ہمیں اپنے خون آشام پنجوں میں لیے ہوئے ہے۔ تیز رفتار ابلاغ عامہ کے ذرائع ہر لمحہ خبر کی صورت تفکرات کو جنم دیے جا رہے ہیں۔ ان گزرے ماہ و سال میں کیا کیا نہ ستم ہم پر گزرے... جو دل پہ گزری وہ تو دل ہی جانے۔ اب تو یہی خوف رہتا ہے کہ آنے والے ایام میں کن کن نئی پریشانیوں اور آزمائشوں کے دَر ہم پر وا ہوتے ہیں... اب تو عرض گزار ہیں خالق کائنات کی بارگاہ میں کہ یا خدا ہم تیرے کمزور بندے ہیں... اب ہم پر سے اس پُر آزمائش طویل دور کو ختم کر اور ہمیں ایسے رہنما دے جن کے جو قوم کے لیے نوید مسرت اور جن کے اعمال باعث ترقی ہوں...

اس خوش امیدی کے ساتھ چلتے ہیں... پاکستان کے چھوٹے بڑے شہروں سے آئے ہوئے آپ کے مکتوبات کی بزم میں اور دیکھتے ہیں کہ کس نے کیسے موتی بکھیرے ہیں۔

عذرا ہاشمی کی داستان جاسوسی گلشن ٹاؤن گڑھ موڑ ضلع جھنگ سے ”آج سے 3 سال قبل میری نسبت طے ہوئی تو پتا چلا کہ موصوف کو ڈائجسٹ پڑھنے کا بہت شوق ہے اور بچپن سے ہی کہانیوں اور رسالوں کی لت میں مبتلا ہیں اور نیا ڈائجسٹ آنے کے بعد وہ دنیا اور مافیہا سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔ ہم نے سوچا کہ شاید ان ساری باتوں میں کچھ صداقت ہے اور کچھ مبالغہ آرائی سے بھی کام لیا جا رہا ہے۔ ہمیشہ منگیتر موصوف ہمیں فون کرنے کی کوشش کرتے تھے اور ہم جان بوجھ کر اکثر و بیشتر ان کی یہ کوشش ناکام بنا دیتے تھے۔ جب پہلی بار ہم نے کال کرنے کا ارادہ کیا تو ہمارا ذاتی خیال تھا کہ منگیتر موصوف خوشی سے اتنا اچھلیں گے کہ چھت سے جا لگیں گے لیکن یہاں تو سب الٹ ہو گیا۔ مہینے کی 8 تاریخ کو ان کی منگیتر یعنی اختر یعنی ہم نے پہلی بار ان کو کال کی تو موصوف نے کہا۔ ”بہن جی ابھی میں آپ کو نہیں جانتا... سوری رونگ نمبر۔“ اور فون بند کر دیا۔ ہم صدمے سے گنگ ہو کر رہ گئے۔ یہ واقعہ ہمارے گھر میں 9/11 سے بھی زیادہ اہمیت اختیار کر گیا اور بات اتنی بڑھی کہ نسبت ٹوٹنے تک جا پہنچی۔ بعد از تحقیق پتا چلا کہ موصوف اسی دن جاسوسی ڈائجسٹ لے کر آئے تھے اور پڑھنے میں مصروف تھے۔ پھر انہوں نے بھی اپنی غلطی کی تلافی کرنے کی ٹھان لی اور سب کو راضی کرنے کے لیے انہوں نے کیا کیا پاپڑ بیلے، یہ الگ داستان ہے جو یقیناً ڈائجسٹ کے کئی صفحات پر بار گراں ہوگی۔ معافی تلافی کے بعد ہم نے منگیتر موصوف کو اپنی سوکن (جاسوسی ڈائجسٹ) لانے کو کہا۔ تجسس تھا کہ دیکھیں وہ کیسا ڈائجسٹ ہے جس نے ان کو اس قدر سحر زدہ کر رکھا تھا کہ وہ ہمیں بھی وقتی طور پر بھول گئے۔ چند گھنٹوں بعد ڈائجسٹ ہمارے ہاتھ میں تھا۔ ایک دو صفحات تو ہم نے نیم دلی سے پڑھے لیکن جوں جوں پڑھتے گئے دلچسپی بڑھتی گئی اور ہمیں ماننا پڑا کہ جاسوسی فضول رومانوی کہانیوں سے ہٹ کر ایک بہترین رسالہ ہے۔ جاسوسی کے بارے میں جو سنا تھا، اس سے کہیں بڑھ کر پایا۔ تب سے لے کر اب تک جاسوسی اور ہمارا اٹوٹ ساتھ ہے۔ ڈیڑھ سال ہو چلے ہیں ہماری شادی کو اور جب سے میاں کا محبوب (جاسوسی ڈائجسٹ) ہمارا محبوب بنا ہے، ہم میاں کے زیادہ محبوب ہو گئے ہیں اس لیے جاسوسی کی تمام ٹیم اتنے اچھے رسالے کی اشاعت پر مبارک باد کی مستحق ہے۔ سب سے پہلے چٹنی نکتہ چینی میں قدم رکھا۔ خالد سیال صاحب بہت اچھا تبصرہ لکھنے پر مبارک باد۔ اختر عباس صاحب! آپ نے شاید بے خبری میں چٹنی نکتہ چینی کے نام کو ہی الٹا دیا ہے۔ اکثر تبصرے جاندار تھے جیسے کہ راج صاحب اور افضال مرزا اور صبا مرزا کے تبصرے اور چند تبصرے خبرنامے کا منظر پیش کر رہے تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے للکار پڑھی۔ یہ قسط کافی تیز رہی۔ واقعات اچانک رونما ہوتے چلے گئے۔ اسٹیٹ کے قیدیوں پر سحر یا جادو والی بات دل کو نہیں لگتی۔ یقیناً ان کے جسم میں کوئی مائیکرو چپ وغیرہ فٹ کی جاتی ہوگی۔ ایک یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ طاہر جاوید مغل صاحب نے اس چھوٹے سے سسپنس کو کیوں برقرار رکھا ہوا ہے جبکہ انہوں نے اتنی بڑی بڑی باتیں جن میں سسپنس برقرار رکھا جا سکتا تھا، کھول دی ہیں۔ شاید آئندہ قسط میں یہ بھی کھل جائے اور تابش کا اپنے پیاروں کو خط لکھنا اور آئی بوتل کے سپرد کرنا ہی عمران کی واپسی کا سبب بن جائے لیکن مغل صاحب کیا ہی اچھا ہو کہ تابی چھوٹے سرکار سے ملنے والی پناہ قبول کر لے اور اس طرح اس کی وطن واپسی کی کوئی سبیل نکل آئے۔ یہ تو ہیں ہمارے ذاتی قیاس جو قبل از وقت ہیں، بہرحال آپ ہم سے زیادہ بہتر سوچ سکتے ہیں۔ گرداب اور اسما قادری صاحبہ کا بھی جواب نہیں۔ اس قسط میں مشاہد خان کا تن تنہا اتنے سارے تربیت یافتہ افراد کا مقابلہ کرنا کچھ عجیب سا لگا لیکن ناممکن تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ واقعی اللہ ماوا لو کے ساتھ ہے۔ رانی کی موت کا دکھ ہوا۔ اس نے قدیم روایت کو زندہ کر دیا اور جب تک چودھری کو کشود نہیں مل جاتی، یقیناً ماسٹر آفتاب کی زندگی بچی رہے گی اور اس وقت تک ان کی رہائی کی بھی کوئی سبیل نکل آئے گی۔ اسما قادری صاحبہ! اگر ممکن ہو تو شہریار کے کردار کو کچھ بڑھا دیں۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ خودکش بے شک لاجواب کہانی تھی۔ اقبال مجنون (احمد اقبال، اقبال کاظمی مرحوم اور ایچ اقبال) کے حصے دار مصنف کی عظیم تخلیق تھی جس پر ہمارا کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہوگا۔ اللہ ان کا اقبال بلند کرے اور زورِ قلم زیادہ ہو۔ قیام کے درمیان میں ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ خنجر سلوٹر کے پیٹ میں چھپایا گیا ہوگا۔ خواہش افسانوی پہلو لیے ہوئے انسانی فطرت کو روشناس کروانے کی ایک اچھی کوشش تھی۔ پہلا رنگ الٹ پھیر میں مزاح تو بہت خوب تھا مگر کہانی کا پلاٹ اور واقعات بالکل بکواس لگے۔ دو جمبر میں شامی اور تیمور کی واپسی اچھی لگی۔ کہانی کا موضوع بھی اچھا تھا اور برجستہ مکالمے بھی۔ تیرہ دے دار اچھی کہانی تھی لیکن اس میں کافی سارے جھول تھے مثلاً پہلے تو کارسن فیملی کے تمام لوگوں کو بالواسطہ یا بلاواسطہ مافیا کے کاروبار میں شریک ظاہر کیا گیا اور اینڈ میں جیسن والے جم کارسن کو اور اس کے والدین کو دودھ کا دھلا ثابت کیا گیا اور میکلین ایڈگر اور کارلوس جیسے پیشہ ور جاسوس اور کرس مورگن جیسا تیز صحافی جو کارسن فیملی کے تمام ممبرز کے بارے میں جانتا ہے اور

www.pkdigest.com

ان کی تصاویر بھی رکھتا ہے ان تینوں کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ جرم کا رسی نام کے دو کزن ہیں۔ ہے نا عجیب بات؟ باقی کہانیاں ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔“

ہمایوں سعید راج کی اٹھکیلیاں یوں ہیں ”سرورق کی حسینہ کو ذاکر انکل نے یقیناً بڑی فرصت میں بنایا ہے۔ دلکش اور معصوم نقوش، دلنشیں مسکان، آؤٹ اسٹینڈنگ پوز اور بے پناہ خوب صورت آنکھوں والی مس جاسوسی بڑی محبت سے ٹریل ایس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ خالد صاحب! سرورق پر تو ہمیں کبھی بھی تمہارا پرعطا نام نظر نہیں آیا۔ یہ ہمارا اتو نظر ہے یا آپ کا؟ اشفاق بھائی! اڑیل ایس کے کا مطلب ہے اسٹوری سے سری کرنا۔ جہانگیر بھائی! کیا یہ ضروری ہے کہ ماہا ایمان خوشبو لگا کے نام بتائے؟ اعجاز بھائی! دلنشیں، گوشہ نشیں نہیں ہوئی بلکہ سلیم شیلی کی وجہ سے پردہ نشیں ہو گئی ہے۔ آسیہ خان! اگر آپ کو اعتراض ہوتا بھی تو میں تب تک راج ہی رہتا، جب تک سمرن چاہتی اور تصویر العین کے تعلیمی سوال کا جواب یہ ہے کہ میں نے قائداعظم یونیورسٹی سے بی بی اے آنرز کیا ہے اور اب اسی ادارے سے HRD میں ایم ایس کر رہا ہوں۔ اختر بھائی! آپ کو بھی راج کی طرح وجودِ زن کے بنا کائنات اور محفل بے رنگ لگتے ہیں۔ بازو سویٹ۔ تصویر العین کافی غصے میں نظر آ رہی تھی شاید روزے کی وجہ سے۔ افشاں اینڈ صبا! آپ کو قطعاً زیب نہیں دیتا کہ ایک مشرقی عورت کو چادر اتار پھینکنے کی درخواست کریں۔ للکار کے لیے اس بار بیچ کا میرے پاس کوئی تعریفی الفاظ نہیں ہیں۔ مجھے تو یہ سمجھ نہیں آیا کہ جب بھی تابلی صاحب تمام تر ہمت مجتمع کر کے فرار ہونے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ انڈین کیسے وہاں آناً فاناً پہنچ کر اس کی گردن دبوچ لیتے ہیں؟ ہاں بات ہو گرداب کی تو وہ بیچ بیچ دل پر اثر کرتی ہے۔ عمران کے جو الفاظ ماہ بانو کے دماغ میں گونجتے ہیں، وہ میرے دل پر بھی نقش ہو گئے اور ماہ بانو پر بیچ بیچ خدا بہت مہربان ہے۔ ایک اور پیارا انسان اس کی جان بچاتے بچاتے خود جان سے گزر گیا۔ ادھر کشور کی غیابی کے بھیانک نتائج نکلنا شروع ہو گئے ہیں۔ لگتا ہے رانی اور مہتاب سمیت وہ معصوم بچے بھی اپنی دھن بچی پر قربان ہو گئے ہیں۔ اسحاق کو اتنی حساس اور دلوں کو چھو لینے والی کہانی لکھنے پر ڈھیروں مبارک باد۔ ابتدائی صفحات پر انچ اقبال موجودہ زمانے کے سب سے بڑے المیے دہشت گردی جیسے تکلیف اور زہریلے موضوع سمیت حاضر تھے۔ ماں کی ممتا، باپ کی محبت جیسے جذبوں سے نہ پگھلنے والے زریون نے بے حد دکھی کیا۔ آخر کون سی قوتیں ہیں جو اسلامی دنیا کی جڑیں اتنی بے رحمی سے کاٹتی ہیں؟ دونوں رنگوں میں اس بار فلمی ٹچ کا تڑکا تھا چھی ولن رول۔ الٹ پھیر نے تو بالکل بھی متاثر نہیں کیا۔ شروع میں جو عجیب و غریب حرکتیں کرائی گئیں، وہ سب مختلف فلموں سے لی گئی تھیں۔ ہاں کاشف زبیر کی دو نمبر لاجواب تھی۔ شاہی اور تیمور نے اس بار پرائے کے بجائے اپنے پھڈے میں ٹانگ اڑائی۔ اعظم کی ذہانت کے تو قائل ہی ہو گئے۔ نوشی نے اس دفعہ شاہی کا دل جلایا جس سے مجھے بے پناہ راحت ملی۔ مختصر کہانیوں میں مریم کے خان کی خواہش نمبر ایک پوزیشن پر رہی۔ ایک محروم انسان کے جذبات اور احساس کی بہت خوب صورت ترجمانی کی گئی۔ جنھیں لوگ زمین پر جگہ نہ دیں تو وہ ہوائی قلعے نہیں بنائے گا تو کیا کرے گا۔ رضوانہ منظر کی بے وجود بھی بے حد پُرتجسس تحریر تھی۔ اگرچہ موضوع پرانا تھا مگر اسٹائل اور منظر نگاری لاجواب تھی۔ اتنے سمجھدار ہونے کے باوجود مس شکیل پر ذرا بھی شک نہیں ہوا۔ (یہ انکشاف آپ نے دیر سے نہیں کیا؟) فرار مشکل ناموں اور پرانے موضوع والی ایک بور کہانی تھی۔“

جعفر حسین کی فکر انگیز باتیں ضلع بھوانہ سے ”ذاکر انکل ایسے ایسے پارہ صفت اور جداگانہ انداز کے صنفِ نازک کے پوز متعارف کرواتے ہیں کہ دل دھڑکنا بھول جاتا ہے۔ محفل میں پہنچے تو وہی روایت ملی کہ ایک مہینے کوئی صدارت اور دوسری دفعہ خط بیک سے بالکل غائب۔ مہینے کے ابتدائی ہفتے میں خط پوسٹ کرنے کے باوجود میرے ساتھ یہ صورت حال دوسری دفعہ پیش آئی۔ (ہر قاری کو موقع ملتا رہنا چاہیے...) اداریہ ملک کے بد سے بدترین ہونے والے حالات کا عکاس تھا۔ ان حالات میں انفرادی اور اجتماعی طور پر صبر و تحمل، مذہبی یگانگت اور برداشت کا پرچار کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمایوں صاحب! بجائے اصلاح اور کچھ تعمیری پہلوؤں سے روشناس ہونے کے اگر ہم نے صرف ٹائم پاس اور مزے ہی لینے ہیں تو اس کے لیے اور بہت سے غیر معیاری ڈائجسٹ موجود ہیں۔ آپ کی تجویز سے ملتی جلتی تجویز میں نے بھی چھ مہینے پہلے سسپنس میں دی تھی۔ میری تجویز کو تو کھڈے لائن لگا دیا گیا تھا۔ تصویر العین کی تصویر کشی پسند آئی۔ ہمارے پڑوسی شوکت سیال کو ان کی بہترین خیال آفرینی پر مبارک باد۔ اطہر صاحب! لگتا ہے کہ آپ نہیں سمجھے، نواب صاحب نے اہمیت کے حامل پس منظر کو پس پشت ڈال کر رومانوی فیکٹر کو ترجیح دی حالانکہ تحریر کا پلاٹ مختلف توجہ کا متقاضی تھا۔ پیارے نعمان! دوستی کرنا چاہتے ہو مگر کس طرح؟ اختر عباس صاحب! اتنی خوش فہمی بھی اچھی نہیں ہوتی۔ ناصر حسین صاحب! آپ نے میری سوچ کو زبان دی۔ مختصر کہانیوں میں سب سے پہلے غیر ذمے دار پڑھی۔ بیٹی کی محبت سے سرشار غلط فہمی کی بنیاد پر عین وقت پر غلط شخص پر ہاتھ ڈالنے والے مسکین ایلاگر کی روداد کافی دلچسپ رہی۔ آصف ملک کی نیام زبردست رہی۔ گزرے ماہ و سال کی دھند میں لپٹی کامیاب چوری کا عقدہ کھلا بھی تو اس وقت جب خاموش رہنا ہی بہتر تھا۔ چور چوری سے جاتا ہے ہیرا پھیری سے نہیں کی عمدہ عکاسی۔ فرار جہاں اس حقیقت کی ترجمانی کر رہی تھی کہ آزادی بہت بڑی نعمت ہے، وہیں یہ بات بھی ظاہر کر رہی تھی کہ ضمیر کی خلش انسان کو کس طرح گناہوں کا کفارہ ادا کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ غیر حقیقی اور معروضی حالات و واقعات کو پس پشت ڈال کر تخیل کی بنیاد پر لکھی جانے والی خواہش جہاں انسانی فطرت میں موجود تجسس کے مادے کو اجاگر کر رہی تھی، اس کے ساتھ ہی انسان کی لامحدود نفسانی خواہشات کو بھی وا کر رہی تھی۔ سسپنس اور تجسس کا مرقع بے وجود دلچسپ پیرائے میں لکھی گئی کافی مربوط تحریر تھی۔ منشیات فروشوں کے چنگل میں پھنسنے کے باوجود اکثر وان کی نیکی پھندا میں اخلاق و اتفاقات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بچ نکلی۔ جس تحریر نے صحیح معنوں میں متاثر کیا وہ انچ اقبال صاحب کی خودکش تھی۔ عالمی طاقتوں کے ہاتھوں کھیلنے والے سفاک درندوں کے گھناؤنے پس پردہ مقاصد اور معصوم ذہنوں کی مذہب کے نام پر برین واشنگ کر کے خودکش بمباروں کی کھیپ تیار کرنے والے جنونیوں کے بارے میں اقبال صاحب کا تجزیہ بڑی وسعت لیے ہوئے تھا۔ جاسوسی میں ایسی ہی سنجیدہ تحریروں کی تو اشد ضرورت ہے۔ رنگوں میں الٹ پھیر نے کافی محظوظ کیا۔ شارٹ کٹ طریقوں سے وقتی کامیابی کے لیے کوشاں نوید جمال ٹائپ کے لوگوں کی اخلاقی اور انسانی قدروں کو روند کر ناجائز مطلب نکالنے کا لطیف پیرائے میں احوال لیے الٹ پھیر کافی اچھی لگی۔ برجستہ اور شگفتہ انداز میں معاشرے کی خامیوں اور ہمارے رویوں کو جس طرح کاشف صاحب نے ہلکے پھلکے انداز میں اجاگر کیا وہ قابلِ تعریف لگا۔ مزاحیہ تحریر ہونے کے باوجود کہیں بھی عامیانہ پن کی ذرا بھی جھلک نظر نہ آئی۔ ایک وقت تھا کہ رنگوں کے لیے غلام قادر صاحب مسلسل حاضری دیتے تھے مگر پتا نہیں کیا ہوا ہے کہ منفرد طرزِ اسلوب کے حامل ہر دلعزیز مصنف نے کیوں لکھنا بند کر دیا ہے۔ ان کا جداگانہ طرزِ بیان، تحریر میں روانی اور سب سے بڑھ کر مکالمہ نگاری میں ندرتِ خیال کا اچھوتا پن وہ خوبیاں تھیں جو ہمیں رنگوں کو پڑھنے پر مجبور کرتی تھیں۔“

ماہا ایمان کی خوش خبری پنجاب سے ”خلافِ توقع اس بار 3 تاریخ کو ہی جاسوسی نے اپنے رخِ روشن کے جلوے سے نوازا۔ سرورق پر ایک دلکش حسینہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں مجھ پر مرکوز کیے ہوئے تھی۔ حسینہ کی آنکھیں ”میر ان نیم باز آنکھوں میں ساری مستی شراب کی سی ہے“ کی تفسیر پیش کر رہی ہیں۔ صنفِ کرخت کا علمبردار پیچھے دہشت گرد کا روپ دھارے ہے اور اوپر کونے میں اپنی ظاہری اچھائی اور باطنی بدخوئی کے ساتھ کھڑا ہے۔ یعنی اس سے صنفِ نازک کے لیے سبق کا پہلو نکلتا ہے کہ مردوں کی ظاہری اچھائی پر نہیں جانا چاہیے۔ اشتہارات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے محفل تک پہنچے تو حسبِ روایت اس بار بھی ٹاپ پر اپنے کسی لاڈلے کو ہی پہنچایا آپ نے۔ لگتا ہے اپنی لاڈلیوں کے زبردست خط آپ کو ملتے ہی نہیں ہیں یا راستے ہی سے کوئی بدخواہ اڑا لیتا ہے جبھی تو صنفِ نازک کے تبصرے تشویش ناک حد تک کم ہوتے جا رہے ہیں۔ خیر، مایوس تو نہیں ہیں طلوعِ سحر سے ہم۔ حسبِ دستور، حسبِ موقع، حسبِ روایت خالد شوکت سیال کو نسبتاً اچھا تبصرہ لکھنے پر مبارک ہو۔ آگے بڑھنے سے پہلے میں اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی سب دوستوں سے شیئر کرنا چاہتی ہوں۔ عنقریب میں اپنے والدین کے ہمراہ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کرنے جا رہی ہوں۔ وہ میری زندگی کا سب سے شاندار لمحہ ہو گا جب میں اپنے رب کے گھر کی زیارت کروں گی۔ معراج انکل، عذرا آنٹی اور اپنے سب دوستوں کی طرف سے عمرے بھی کروں گی اور ڈھیروں دعائیں بھی۔ ان شاء اللہ (آپ کو بہت بہت پیشگی مبارک باد) افشاں مرزا، اچھا بالکل ٹھیک کہتی ہیں اور آپ پلیز اپنی صنف کی وضاحت کر دو تو مزہ آئے۔ اطہر احمد صدیقی کے قلم کی رنگینیاں کم محسوس ہو رہیں۔ نوٹی اسے سمجھنے والے سمجھ چکے ہیں اور کیا بتاؤں؟ خیر، آپ اپنا ذکر نہ دیکھ کے خفا تھیں یا یہ کوئی یونیورسل ایشو نہیں تھا۔ جہانگیر اسلم کومل! آپ بھی اس محفل کی بنیاد سے استفادہ فرمایے جو 6 جولائی میں جاسوسی میں لگی تھی۔ آسیہ خان! صنفِ مخالف کی تعریف کرتے وقت اپنی نسوانیت کے وقار کا خیال رکھا کریں پلیز۔ ہمایوں سعید! شاید جانی انجانی کا پاؤں آپ کی دُم مبارک پر آ گیا ہے جو غصے میں ہو کے بدلہ لینے کی بات کر رہے ہو۔ محفل میں دلنشیں کی کمی محسوس ہوئی۔ اختر عباس! کیوں محفل کے پیچھے لٹھ لیے پڑے ہو بھائی۔ میں نے جاسوسی میں گانا سنایا نہیں پڑھایا تھا، ویسے تعریف کا شکریہ۔ فاطمہ گل! آپ کی انٹری ہمیشہ اتنی مختصر ہی کیوں ہوتی ہے؟ ناصر حسین کا حساس تبصرہ اچھا لگا۔ ہماری دعائیں اپنے سیلاب زدگان بھائی بہنوں کے لیے بے شمار ہیں۔ نہ صرف دعائیں بلکہ ہمیں ان کی مالی امداد بھی کرنی چاہیے اور ہم کر بھی رہے ہیں۔ ان شاء اللہ ہم سب کی کوششوں سے یہ کڑا وقت جلد ہی کٹ جائے گا۔ کہانیوں کی دنیا میں سب سے پہلے گرداب نے اپنے سحر میں جکڑا۔ رانی کی قربانی رائگاں گئی اور چودھری آفتاب تک پہنچ گیا۔ ہمارے اکثر سیاست دانوں کی طرح چودھری بھی زمین پر ہی خدا بنا بیٹھا ہے۔ یقیناً یہ سب ایک عبرت ناک انجام سے دوچار ہوں گے۔ آفتاب اور کشور سے ہمدردی یقیناً محفل کو بھی پڑتی ہے۔ کہانی اس دفعہ بہت ہی سنسنی خیز لمحے میں اختتام پذیر ہوئی ہے۔ یہ بے چینی اگلے ماہ تک قائم رہے گی اور مہتاب اور بچوں کی موت سے ایک گہرے دکھ میں ڈھل جائے گی یقیناً۔ یہ بات من اطہر الحسن ہے کہ طاہر جاوید مغل صاحب کے قلم کا سیل رواں سب کو بہا کر لے جاتا ہے اور اس کے آگے بند باندھنا ناممکن ہے۔ للکار میں تابلی کے ایکشن میں آتے ہی ہمیں متاثر کرنا شروع کر دیا ہے۔ عمران کی کمی محسوس ہوئی جو خود تو جانے کہاں چلا گیا لیکن تابلی کو بہادری سے جینے کا ڈھنگ سکھا گیا۔ خاک و خون کی محفل سجانے والے سفاک چہروں سے نقاب اٹھاتی دلخراش داستان خودکش ہمیں جھنجوڑ کر رکھ گئی۔ یہ ایک ایسا عفریت ہے جو روز بروز میرے وطن کو لہولہو کر رہا ہے۔ آخر ہم کب تک لاشے اٹھاتے رہیں گے؟ کب ہمارے اربابِ اختیار زبانی بیانات سے باہر نکل کر کوئی عملی قدم اٹھائیں گے؟ [illegible] اتنا جاندار ہوتا ہے کہ وہ جو بھی دیکھنا چاہیں تصور میں دیکھ سکتے ہیں۔ [illegible] ہے جو قطرے کو سمندر اور ذرے کو آفتاب کر دے۔ کاشف زبیر صاحب ہمارے فیورٹ ہیں [illegible] شاہی کو لا لائے اور دل خوش کر گئے۔ منظر امام کی تحاریر مجھے بھی پسند نہیں آئیں۔ سو میں انھیں پڑھنے سے گریز ہی کرتی ہوں۔“

تصویر العین اوکاڑہ کی سے ”چلتی ہیں“ سب سے پہلے بات کرتے ہیں جاسوسی کے ٹائٹل کی تو ایک حسین مہ جبین انداز و ادا سے ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔ سائڈ پر موجود شخص داخل کا رخ دوسری طرف کیے نشانہ باندھ رہا تھا مگر اوپر موجود شخص تو بس ہلکا سا ہی نظر آیا۔ بس ٹائٹل پر عید کے حوالے سے ایک ہی کمی تھی اور وہ تھی دوشیزہ کے ہاتھوں پر مہندی۔ اس دفعہ صدارت کی کرسی جناب خالد شوکت سیال کو ملی اور واقعی ان کا تبصرہ اسی لائق تھا کہ یہ حق انھی کو ملتا۔ اطہر احمد صدیقی کا تبصرہ پڑھ کر تو لگا کہ بہت فرصت سے اور دل لگا کر تبصرہ لکھا ہے۔ ماشاء اللہ ایک کہانی پر دل کھول کر تبصرہ کیا۔ جی الدین اشفاق الاکاڑوی! ابھی ڈھنگ سے شروع بھی نہیں ہوئی آپ ختم کرنے کی بات کر رہے ہیں۔ نوٹی اے، سلیم شیلی آپ کے نام کے ساتھ لکھا ہوا ہے مگر کہاں؟ ہمیں تو دیکھنے پر کہیں نظر نہیں آیا۔ جہانگیر اسلم کومل! اس دفعہ لگتا ہے کہ عید کی خوشی میں آپ ساری پرفیوم کی بوتل چھڑک آئے ہیں، دلنشیں ذرا سب کو ذرا کام تو نہیں ہو گیا۔ اعجاز احمد! آپ کے بارے میں بس اتنا کہیں گے کہ تبصرہ اچھا تھا۔ قمرنی! خوش آمدید آپ کے ساتھ تو دو والا معاملہ لگتا ہے، ویسے ہی نظر میں کیا جادو کر دیا۔ لگتا ہے جاسوسی نے بھی آپ پر جادو ہی کر دیا ہے۔ ایم اے خان! آپ کا خط پڑھ کر ہمیں اس میں کوئی شک نہیں رہا کہ آپ ذہنی مریض ہیں اور دوسروں کو بھی بنانا چاہتے ہیں۔ آسیہ خان! آپ کے مختصر تبصرے سے دل سیر نہیں ہوا تھوڑا زیادہ لکھا کریں۔ اختر عباس! آپ کی اپنی محفل ہے جیسے مرضی آئیے۔ شکریہ کہ آپ نے ہم لوگوں کی کمی پوری کرنے کی کوشش تو کی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے گرداب پڑھی۔ اس دفعہ کہانی میں تھوڑی تیزی آئی۔ شاید ماہ بانو دشمنوں کے ٹھکانے تک پہنچ گیا۔ چودھری اشتیاق کو کشور اور آفتاب کے بارے میں پتا چل گیا۔ شہریار بھی اب چودھری کے خلاف ایکشن لینے پر مجبور ہو گیا ہے۔ ماہ بانو بھی اب جلد ہی شہریار سے مل پائے گی۔ افضل کے ساتھ اچھا نہیں ہوا۔ یقیناً اس کے بیوی بچوں کے ساتھ چودھری نے ہی کچھ کروایا ہو گا۔ للکار کا ٹائٹل امید پیر گری کے ٹائٹل جیسا ہے۔ بہرحال اس دفعہ للکار میں کچھ خاص تبدیلی نہیں آئی۔ سوائے اس کے کہ تابش کے حوصلے اور بلند ہو گئے۔ مجھے لگتا ہے کہ جس اجنبی شخص کو تابلی کشتی سے اٹھا کر لایا ہے، اس کا آسمند کہانی میں کوئی رول ضرور ہو گا یا پھر ہو سکتا ہے کہ یہ عمران ہی ہو۔ یہ تو بہرحال آسمند ہی بتائے گا۔ دوسرا رنگ کاشف زبیر کی دو نمبر بہت اچھی کہانی تھی۔ مزاحیہ انداز کی کہانی پڑھ کر مزہ آ گیا۔ الٹ پھیر میں نوید جمال کے ساتھ اچھا ہوا۔ کوا چلا ہنس کی چال اپنی چال بھی بھول گیا۔ بے وجود افروز کے ساتھ اس کے شوہر نے بہت برا کیا۔ کس نے کہا تھا کہ اندھا اعتماد کرے۔“

اختر عباس تجراج کبیر والا سے حاضر ہیں ”اس دفعہ اپنا جگر جاسوسی ڈائجسٹ تین تاریخ کو ہی کبیر والا سے مل گیا۔ راستے میں آتے ہوئے ٹائٹل پر خوب صورت لڑکی نظر آئی۔ لگتا ہے ذاکر انکل نے اس پر کافی محنت کی ہے۔ اس لیے ہمیں عید پر اس حسینہ کا گفٹ دیا ہے۔ خیر، اس کی دلکشی کو نظر انداز کرتے ہوئے دوستوں کی محفل کی طرف بڑھے۔ خالد شوکت کو وزٹ پایا۔ بھائی جی عید کے ساتھ ساتھ ہماری مبارک باد بھی قبول کیجیے۔ شوکت صاحب! آپ کی اس

www.pkdigest.com

بات سے میں بھی اتفاق کرتا ہوں کہ لکار میں عمران کے بغیر مزہ کرکرا ہو رہا ہے۔ عمران کے بغیر لطف نہیں آرہا۔ اطہر صدیقی! اگر آپ محی الدین نواب کی کہانی پر تنقید برداشت نہیں کرتے تو میں بھی آپ کی طرح خیالات رکھتا ہوں۔ ان کے بارے میں صرف اتنا کہوں گا، نواب صاحب از دی گریٹ۔ نوری صاحب! آپ کیوں بے چاری ماہا ایمان کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ یار وہ اگر اپنا اصلی نام آپ کو نہیں بتا رہی تو پلیز آپ اس کو مجبور نہ کریں۔ جہانگیر اسلم گوندل کا خوشبو بھرا انداز پڑھ کر بے حد اچھا لگا۔ بالکل اسی لیے چند وہ دوست یاد آ گئے جب کوئی آگ لگا کے کوئی مکھن لگا کے کوئی تڑکا لگا کے جاسوسی میں حاضر ہوتے تھے۔ پتا نہیں ہمارے وہ پرانے دوست کہاں غائب ہو گئے ہیں؟ نئے آنے والے قریشی بھائی خوش آمدید۔ رخشندہ الیاس! اگر آپ نواب انکل کی پرانی فین ہیں تو آپ پہلے کہاں تھیں؟ اوکے اس دفعہ تو آپ آ گئی ہیں نا۔ محمد نعمان آف تمبر! کیا آپ سچ مچ بچارے ہیں یا ویسے ہی کہتے ہو یار؟ آسیہ خان! لگتا ہے کہ آپ دو مہینے بے چارے سے سب کچھ اگلوا لیں گی۔ ہاں ہم کیا کہہ سکتے ہیں یہ تو آپ دونوں کا معاملہ ہے۔ ہمایوں بھائی کیا میں نے یہ کہا تھا کہ مجھے ٹائٹل پر لڑکی بھی نظر آئی؟ نہیں یار! سب ہی بالوں سمیت ٹائٹل پر نظر آئی ہیں۔ تصویر الدین شمسی آپ نے میرا تبصرہ پسند کیا۔ شکریہ۔ ڈی سیال صاحب! آپ کہاں ہیں؟ یار آ جاؤ۔ اس کے علاوہ آمنہ پٹھانی کی نوک جھونک ہوتی رہتی تھی تو آمنہ صاحبہ اب تو آجاؤ کیونکہ ایف ایس سی کا رزلٹ آ چکا ہے۔ میں نے تو اوٹی کا کام بڑے اچھے مارکس سے پاس کیا ہے۔ اب ہو جائے کہانیوں پر کچھ تبصرہ (ضرور)۔ سب سے پہلے گرداب پڑھی۔ اسما قادری کی گرفت کہانی پر کافی بھاری ہے۔ رانی نے خود کو ختم کر دیا مگر اپنی مالکہ سے وفاداری نبھا دی۔ ماہ بانو اب آزاد ہو جائے گی۔ اس کے بعد لکار پڑھی مگر پتا نہیں عمران کے بعد تو ہر قسط پھیکی پھیکی سی لگتی ہے۔ مغل انکل! پلیز پلیز... عمران کو کہیں سے لے آئیں نا۔ تابش اب رستم کے روپ میں آ گیا مگر پھر بھی لگتا ہے اب کہانی میں پہلے والا مزہ نہیں ہے۔ ایک اور زخمی شخص اس کے بارے میں کچھ شک سا کھٹک رہا ہے۔ لگتا ہے اس کا عمران سے کوئی گہرا تعلق ہے۔ خیر مغل انکل کی کوئی بھی اسٹوری ہو دل نہیں کرتا چھوڑنے کو... فی الحال تو یہ بھی پڑھ رہے ہیں۔ ایچ اقبال کی خودکش نے اصلی چہروں سے پہچان کرائی اور موجودہ حالات کے بارے میں ہمیں بہت کچھ بتایا جبکہ چھوٹی کہانیاں اور رنگ زیر مطالعہ ہیں۔''

سید محی الدین اشتیاق کی تحریر لیے ''اس مرتبہ جاسوسی 7 تاریخ کو ملا۔ عید کی تیاریوں کے باوجود ہم نے جاسوسی کا مطالعہ جاری رکھا۔ اپنا خط دیکھ کر خوشی ہوئی مگر کرسی صدارت تک پہنچنے کے لیے شاید کوئی خاص قسم کا تبصرہ درکار ہوگا۔ اسی لیے ہم ابھی تک اس منزل سے دور ہیں۔ خیر، اس مرتبہ جاسوسی واقعی عید نمبر تھا۔ سب سے پہلے فیورٹ لکار پڑھی۔ تابش صاحب ہنگو بنتے جا رہے ہیں لیکن سلطانہ کے ساتھ اس کا تعلق واضح نہیں کیا جا رہا۔ کیا واقعی وہ تابش کی بیوی ہے؟ قسط کے اختتام سے پہلے تابش نے جو کارنامہ سرانجام دیا تھا، دریا کے بھاگنے سے اس پر پانی پڑ گیا ہے۔ اس کے بعد پہلا رنگ الٹ پھیر پڑھا۔ منظر امام صاحب نے آج کے معاشرے کو ہائی لائٹ کیا تھا مگر کیا ضروری تھا کہ مزاح میں بھی سزا دی جائے۔ اگر نوید کی سزا نہ بھی ہوتی تو اچھا تھا۔ اس کے بعد فیورٹ رائٹر کی فیورٹ تحریر فیورٹ کرداروں شامی اور تیمور کا نیا کارنامہ تھا۔ بڑا مزے دار رنگ تھا۔ کاشف زبیر بھی شامی کا جن پورا بھی دکھا دیں۔ اس کے بعد ابتدائی صفحات پر ایچ اقبال کی تحریر خودکش پڑھی۔ یہ ایک گہری تحریر تھی۔ ایچ اقبال صاحب نے دکھایا کہ فرض شناس باپ نے چھوٹے بھائی اور بیٹے کی محبت کو پس پشت ڈال دیا۔ اینڈ دکھی کر گیا۔ یہ کہانی اس مرتبہ نمبرون بن گئی ہے۔ گرداب میں پھنسی ماہ بانو کو جاپانی آدمی کی شکل میں سہارا مل گیا ہے۔ دوسری طرف ماسٹر آفتاب گرداب میں پھنس گیا ہے۔ مہتاب کے ساتھ ابھی کوئی انہونی ہو سکتی ہے۔ اسما قادری صاحبہ پلیز ماہ بانو کو جودو کرانے اور کوئی تربیت دلوائیں۔ مشکل سے ہم گرداب سے نکلے۔ چھوٹی کہانیوں کا انتخاب زبردست تھا۔ عفان آزاد کی تحریر بھی خوب رہی۔ وراثت کیا کمال تھی؟''

کبیر عباسی عرف شہزادہ کو ہساری مری سے تفصیلی رائے ''محفل کی شان، محفل کی آن اور محفلوں کی شان کبیر عباسی عرف شہزادہ جو محفل کی رونق بڑھانے اور رقابتوں کے چھکے چھڑانے ایک دفعہ پھر اپنی محفل میں حاضر ہے۔ (تالیاں)۔ جاسوسی کی ٹیم کو عید مبارک اور قارئین کو میٹھے منہ کر عید گزرے مہینے سے اوپر گزر چکا ہوگا جب میرا تبصرہ آپ کی نگاہوں کی زینت بنے گا۔ ای وے امانت کیجیے گا کیونکہ ہم آپ کے حقیقی دوست ہیں۔ جیسا کہ ایک لطیفہ ہے کہ کسی قاری کا تبصرہ شائع ہونے پر اس کا دوست اسے کہے گا۔ آپ کا تبصرہ بہت اچھا لگا جبکہ حقیقی دوست کہے گا تبصرہ وفت تھا تیرا، اگر یہ بتا لکھوایا کس سے تھا؟ تو دوستو! ہم آپ کے ایسے دوست ہیں۔ (خوش کیتا ہے)۔ ٹائٹل گرل ہاتھ پر ٹھوڑی ٹکائے، ہونٹ ادا سے ہمیں متاثر کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ جواباً ہم نے بھی اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور اپنے مخصوص انداز سے اسے دیکھا۔ اب ہماری اس ادا سے اس کے دل پر جو بجلیاں گریں ان کے بارے میں وہی بتا سکتی ہے۔ ساتھ میں حسب معمول روایتی صنف کے تناظروں کو دیکھ کے اتنی بوریت ہوئی کہ نہ پوچھیں۔ ڈاکٹر انکل! اگر آپ کے پاس آئیڈیا رکھا ہے تو ہم سے رابطہ کریں۔ ہمارا ذہن اس معاملے میں انتہائی زرخیز واقع ہوا ہے۔ فہرست خوب صورت طریقے سے سجائی گئی، پسند آئی۔ حالات حاضرہ کی عکاسی کرتا اداریہ بھی اچھا لگا۔ خالد شوکت! مونچھوں والی حسینہ؟ ہاہاہا... یہ اچھی سنائی آپ نے۔ اطہر علی صدیقی! اتنا بڑا تبصرہ... ماشاء اللہ بڑا اعتماد ہے آپ کا۔ اشتیاق صاحب! آپ کیوں لوگوں کے اصلی نام کے پیچھے پڑ گئے ہیں؟ نوری دوست! آپ کا ساتھ ہی ہے کہ ہم ابھی تک ڈٹے ہوئے ہیں۔ ورنہ ہم تو ہر چیز سے بہت جلد بور ہو جانے والے آدمی ہیں۔ جہانگیر اسلم! آسیہ خان کے تبصرے کو نہیں بلکہ ان کا تبصرہ پڑھنے والے کو رومال کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسپیشلی جن لوگوں کا دل معمولی تعریف سن کر مچل جاتا ہے۔ ویسے ہم تو ٹائٹل گرل کو بعد میں دیکھتے ہیں، باقی ٹائٹل کا پہلے جائزہ لیتے ہیں۔ اعجاز احمد! لگتا ہے آپ بڑے شرمیلے واقع ہوئے ہیں۔ رخشندہ الیاس! ویلکم بیک۔ آپ کی ٹیم کو آپ کی ضرورت ہے لہٰذا آتی رہیے گا۔ ہمایوں ڈیئر! سیدھی سی بات ہے جس کو آئینے میں پیاری لڑکی نظر آنے والے اسے پیاری لڑکی میں ہی اپنی شکل نظر آئے گی۔ تصویر الحسن شمسی! ہمارا تعلق آپ کے خاندان سے تو نہیں ہے۔ رہی بات ڈرانے کی تو ہم پیاروں کو پیار اور مخالفوں کو ڈرا دیتے ہیں۔ ناظم گل! جی ہاں، ویسے آپ کو دیکھ کے لوگ ڈر جاتے ہیں۔ ہی ہی ہی... آمنہ پٹھانی پر لگتا ہے جاسوسی اور نتائج کی قیمت میں اضافے کا اثر پڑا ہے کہ محفل میں حاضر ہونا ہی چھوڑ دیا۔ گرداب کی ایک اور خوب صورت قسط پڑھنے کو ملی۔ کشور اور آفتاب کا پارٹ مزید سنسنی خیز ہو گیا۔ آفتاب اور شہریار معاشرے کی فلاح کے لیے انفرادی کوشش کر رہے ہیں جبکہ میرے خیال میں یہ صرف اجتماعی کوشش سے ہی ممکن ہے۔ اس سلسلے میں ہم سیرت طیبہ سے مدد لے سکتے ہیں۔ نبی حضور نے باصلاحیت لوگوں پر مشتمل ایک تربیت کر کے ایک ایسی جماعت تیار کر دی جس نے تقریباً پوری دنیا میں فلاحی نظام قائم کیا جو ہزار سال سے زیادہ عرصے تک لوگوں کی فلاح کا باعث بنا رہا۔ لکار رنگ ہی نہ... عمران کے بغیر مزہ نہیں آیا۔ ویسے بھی طاہر صاحب کی تحریروں کے واقعات میں یکسانیت آ گئی ہے۔ دیوی اور پرواز کے بعد لکار میں بھی دلوے اور ہے ہیں جن میں

بہت سے لوگ لاٹھیوں اور رائفلوں سے مسلح ہو کر باہم برسرپیکار نظر آتے ہیں۔ ہاں، البتہ کردار نگاری میں طاہر صاحب کی صلاحیتیں لاجواب ہیں۔ تابش کا کردار حقیقت کے بہت قریب ہے۔ عموماً ہیرو ہر لحاظ سے اچھا ہوتا ہے جبکہ تابش کافی حد تک خود غرض ہے۔ منظر امام کی تحریر کا کوئی سر پیر ہی نہیں تھا تاہم مزاح کی وجہ سے کافی مزہ آیا۔ کاشف زبیر دی گریٹ! اعلیٰ مذاق کے ساتھ ساتھ ہمیں ایک نئے طریقۂ واردات سے روشناس کرا گئے۔ کاشف زبیر صاحب! آپ جیلی بیریز کو تو بھول ہی گئے۔ پلیز ان سے بھی کبھی کبھار ملاقات کرا دیا کریں۔ ایچ اقبال کی تحریر موجودہ حالات کی عکاسی کر رہی تھی۔ اچھی لگی۔ مختصر تحریروں میں عمر نعمان کی پھندا پہلے نمبر پر رہی۔ تجسس سے بھرپور تحریر نے ہم کو پوری طرح پھندے میں جکڑ لیا جس سے رہائی آخری الفاظ کے ساتھ ہی ملی اور ہم نے کھل کے سانس لینا شروع کی۔ دوسرے نمبر پر مریم کے خان کی خواہش رہی۔ سراغ رسی اور کچھ مزاحیہ فقروں کے ساتھ عفان آزاد کی تحریر غیر ذمے دار تیسری پوزیشن حاصل کرنے میں کامیاب رہی۔ آصف ملک کی نیام کو ہم نے چوتھا نمبر دیا۔ رواں اور سسپنس بھرے انداز میں لکھی گئی یہ تحریر بھی پسند آئی۔ ویسے ہمارا شک نواب پر تھا جو غلط ثابت ہوا۔ رضوانہ منظر کی بے وجود کے ساتھ موجود تاثر رکھے گئے جملے سسپنس میں مبتلا کر گئے اور ہم نے بڑے ذوق و شوق سے تحریر شروع کی مگر تحریر کا اختتام خاص نہ لگی۔ تنویر ریاض کی فرار آخری نمبر پر رہی۔ تحریر کا آغاز برا تو نہیں تھا تاہم ہمیں کچھ مزہ نہ آیا پڑھنے میں۔ کترنیں کافی زیادہ اور کافی بہتر تھیں اور شاہد صاحب نے اسکیچز میں بھی اپنی مہارت کا ثبوت دیا۔ ہمارے خیال میں تو ٹائٹل بھی انہی کو بنانا چاہیے کہ ان کا ذہن نت نئے آئیڈیاز سے بھرا رہتا ہے جنہیں اکثر وہ اپنے اسکیچز میں استعمال کر کے شاہکار تخلیق کرتے رہتے ہیں۔ یہ اور بات کہ ان پر نظر ہم جیسے باریک بین اور گہرا مطالعہ کرنے والے قاری کی ہی پڑ سکتی ہے۔''

محسن آفریدی کی جسارت بالاکوٹ سے ''میں جاسوسی کا طویل عرصے سے خاموش قاری ہوں۔ آج پہلی بار خط لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ ماہ ستمبر کا شمارہ 6 تاریخ کو ملا۔ سرورق کی اس مرتبہ حسینہ کچھ ایسی تھی کہ جسے دیکھ کر کوئی بھی ہوش مند آدمی اپنے ہوش کھو سکتا ہے۔ ابھی ہم حسینہ کے حسن میں کھوئے ہوئے تھے کہ ایک دہاڑ نے ہمیں گویا اچھلنے پر مجبور کر دیا۔ غور کیا تو نظر بندوق بردار بھائی پر پڑی جسے شاید میرا یوں حسینہ کو دیکھنا پسند نہیں آیا۔ سرورق پر مزید غور کیا تو پس منظر پر موجود بھائی صاحب کو اپنی طرف گھورتا پایا۔ اس کی نگاہوں کی تاب نہ لا کر ہم نے چھلانگ لگائی اور پہنچے محفل دوستاں میں۔ وکٹری اسٹینڈ پر خالد شوکت سیال کو دیکھ کر حیرت ہوئی۔ بہرحال، خالد جی مبارکاں۔ ہمایوں سعید صاحب! آپ رومیو سے اچانک راج۔ یہ کایا پلٹ کیسے ہوئی؟ ضرور بتائیے گا۔ باقی سب دوستوں کے تبصرے اچھے لگے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے ایچ اقبال کی خودکش پڑھی۔ تحریر جان دار تھی۔ کہانی بے شک ایرانی پس منظر میں تھی لیکن حالات پاکستان ہی جیسے تھے۔ اس کے بعد لکار کو للکارا۔ تابش کو میدان عمل میں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ آخر انکل نے تابش کو ان ایکشن کر دیا۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ اس کے بعد گرداب پڑھی جو کافی سلوموشن میں جا رہی ہے۔ اسما جی پلیز! کہانی میں تیزی لائیں۔ رنگوں میں دونوں رنگ پسند آئے۔ مختصر کہانیوں میں فرار پسند آئی۔ نیام اور خواہش کچھ زیادہ متاثر نہ کر سکیں۔''

محمد سلیم تبسم کی باتیں ملتان سے ''خوب صورت ٹائٹل گرل ہمیں دیکھ کر مسکرا رہی تھی جبکہ پیچھے بیٹھے آدمی سے یہ بات ہضم نہیں ہو رہی تھی جبکہ تیسرا ایکشن سے بھرپور آدمی ہاتھ میں گن تھامے نہ جانے کس بات پر غصہ دکھا رہا تھا۔ بہرحال، ٹائٹل زبردست تھا۔ سب سے پہلے گرداب پڑھی۔ یہ قسط کافی سنسنی خیز تھی۔ اسما قادری صاحبہ یہ کیا کیا؟ ابھی لکار کے عمران کی موت کا غم بہت تازہ تھا۔ آپ نے عمران کی بھی چھٹی کروا دی۔ بے چاری ماہا نو کو اس ویران جگہ پر بھٹکنے کے لیے تنہا چھوڑ دیا۔ ... بہت جلد ماہا نو تک پہنچ جائے گا۔ رانی کی موت کا بہت افسوس ہوا۔ وہ اپنی وفاداری نبھا کر چلی گئی جبکہ آفتاب اب چودھری کے جال میں پھنس چکا ہے۔ کشور اور آفتاب کے لیے اب یہ وقت امتحان کا ہے۔ دیکھتے ہیں امتحان بھی تو لیتی ہے۔ جبکہ شہریار اب چودھری کے سامنے ڈٹ چکا ہے۔ لکار میں اب تابش میں بھی بہادری کے جراثیم بیدار ہو چکے ہیں۔ جارج گورا کا اب آخری ایام آ گیا ہے لیکن ہیرو بھائی کی کمی بہت شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔ ایچ اقبال کی خودکش پڑھی۔ حقیقت کے قریب تر کہانی تھی۔ منظر امام کی الٹ پھیر میں بے چارہ نوید جھوٹ بولتے بولتے خود پھنس گیا۔ ایسے کردار بہت اچھا لگا۔ کہانی کافی حد تک مزے دار تھی۔ دوسرے رنگ میں کاشف زبیر کا یہ دادا جان، نوشی اور شامی والا سلسلہ ہمیں بالکل پسند نہیں۔ رضوانہ منظر کی بے وجود کافی سسپنس کہانی تھی۔ پلاٹ کا منصوبہ تھا تو بہت شان دار مگر انسپکٹر ریاض نے اس کا سارا کھیل خراب کر دیا۔ پھندا کہانی بھی پسند آئی جبکہ مغربی کہانیاں ہمیں زیادہ اچھی نہیں لگتیں۔ اب کچھ دوستوں کی محفل میں حاضری لگا لیں۔ نوری! اے یار! اب تو ہم بہاولپور سے ہو کر آ گئے۔ ہمیں نہیں پتا چلا کہ یہ مسلم ٹاؤن کہاں ہے۔ آسیہ خان! آمنہ پٹھانی اپنی جعلی ڈگری منظر عام پر آنے کے خوف سے روپوش ہو گئی ہیں۔ اب یہ کہاں واپس آنے والی ہیں؟ ہمایوں سعید راج! آپ کے پاس یہ سب چیزیں لگتا ہے موجود ہیں۔ آپ ایسا کریں یہ سب چیزیں کچھ عرصے کے لیے مجھے ادھار دے دیں۔ دوست ہونے کے ناتے ہماری مدد کریں۔ آپ کا فرض ہے تا کہ ہماری کچھ بچت تو ہو جائے۔ ولنٹین بلوچ! ویسے آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آپ کو ملتان سے اتنا جذباتی لگاؤ کیوں ہے؟ بہرحال، آپ ملتان آئیں یا نہ آئیں آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ہم بہت جلد فیصلہ آ رہے ہیں۔ سسپنس میں بتائی گئی آپ کی خاص نشانی سے شاید کام چل جائے۔ اختر عباس! ابھی تک ہم نے محفل کی کرسی صدارت کا سرکاری منصب تو نہیں سنبھالا لیکن بلیک لسٹ کی صدارت سنبھال چکے ہیں۔ انشال ایڈ سا مرزا! تبصرے کے معاملے میں دل کو شامل نہ کریں۔ یہ دل والا معاملہ خاصا نازک ہوتا ہے۔ تصویر الحسن! یہ آپ کی نصیحتوں کا اثر ہی تو ہے کہ ہم اتنا اچھا تبصرہ لکھ لیتے ہیں۔ آپ کی صحبت میں رہیں گے تو سنور جائیں گے۔ بلیک لسٹ میں زیادہ تر نام تھے جبکہ ہمارا اپنا خط نہ جانے کہاں غائب تھا۔ پتا نہیں اسے کوڑے میں کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ (گھر برو کا)''

قیم تبسم کی پسندیدگی شورکوٹ سے ''سرورق کی حسینہ مغربی نقوش کی حامل تھی جو جاذب نظر اور خوب صورتی کا شاہکار لگ رہی تھی۔ بالائی حصے میں انڈین فلمی اسٹار جیکی شیروف سے مشابہ شخص کو چہرے پر گہری چوٹ کرب میں مبتلا کیے ہوئے تھی۔ زیریں جانب کسی انگلش مووی کا ہیرو بندوق تھامے کسی کو للکارنے میں مصروف تھا۔ فہرست کی خبر لی تو خالد شوکت بی جان سے صدارت تھامے نظر آئے۔ صدارتی مبارک باد! اطہر احمد صدیقی کا تبصرہ بھی قابل تعریف تھا۔ جہانگیر اسلم کا بات بے بات میں خوشبو لگانا ایک آنکھ نہیں بھایا۔ خودکش، ایرانی پس منظر میں لکھی گئی تحریر سے بے چارے حقیقتیں عیاں ہو رہی تھیں۔ کہانی کا اختتام اندوہناک تھا۔ غیر ذمے دار میں کہانی کے ہیرو نے اپنی دانست میں تو غیر ذمے داری کا ثبوت نہیں دیا لیکن اسی حیلے سے خس کم جہاں پاک والا معاملہ ہو گیا۔ آصف ملک کی نیام میں چوروں نے کمال مہارت و چالاکی کا ثبوت دیتے ہوئے تجوری ایسی نیام بنائی کہ عقل دنگ رہ جائے۔ لکار

www.pkdigest.com

بلاشبہ جاسوسی کی جان کے ساتھ ساتھ ہمارے دل کی دھڑکن بھی بنتی جارہی ہے۔ موجودہ قسط کی ہر سطر سنسنی خیز اور دھواں دھار ایکشن سے بھرپور تھی۔ طاہر انکل کا ہیرو انگڑائی لے کر بیدار ہوچکا ہے۔ قرار بے چارہ بور کرگئی۔ مریم کے خان کی خواہش نے آخری سطور تک دلچسپی برقرار رکھی۔ جیلی باربی ایڈ نے اچھے تخیل کی دنیا ڈھونڈ لی مگر بھیانک انجام کے ساتھ۔ اسما قادری گرداب کو مختلف زاویوں سے بیک وقت آگے بڑھا رہی ہیں، قسط شاندار رہی۔ پھندا بہت اچھی اسٹوری تھی۔ موت نے ڈاکٹر شہزادہ اور اس کی فیملی کا ہر لمحہ تعاقب کیا۔ آخر میں موت کے ہرکارے ہی نیست و نابود ہوگئے۔ رضوانہ منظر کی تحریر بے وجود میں شاطر شکیل نے کمال مہارت سے شاطرانہ پچویشن پیدا کی۔ انوکھی ترکیب جرم سے بنی کہانی بہت زبردست تھی۔ سرورق کے رنگ اس بار خوب تھے۔ پہلے رنگ میں جھوٹ کے بل بوتے پر کامیابی حاصل کرنے والے نوید کی خوب شامت آئی۔ نوید کی ایسی وات لگی کہ ساری زندگی جیل میں سڑے گا۔ تحریر مسکراہٹ آمیز ہونے کے علاوہ سبق آموز بھی تھی۔ دوسرا رنگ دو نمبر ہالا تے مکمل طور پر تحریر تھی۔ شامی اور تیمور نے داد اعصور کے پاسپورٹ کے غلط استعمال کی صورت میں بھرپور ایکشن لیا۔ خاص بات یہ کہ اس دفعہ تحریریں لاجواب تھیں۔"

افضال مرزا اینڈ صبا مرزا، اچھوال سے رقم طراز ہیں "خوب صورت ہیئر اسٹائل کے ساتھ، سادہ سی خوب صورت جیولری کے ساتھ، اوالڈ ویرائٹی کپڑوں کے ساتھ ماڈل گرل واقعی تاج محل کی شہزادی لگ رہی تھی۔ صفحے کو پلٹتے ہی اپنے محفل کے دوستوں کی روداد سننے کی جلدی پڑ گئی۔ خالد شوکت ڈائجسٹ کی طرف سے آپ کو جو عیدی ملی، ہماری طرف سے مبارک ہو۔ اختر عباس! پہلے ذرا آپ سے بات ہو جائے۔ ہم نے اپنا ہاتھ خود ہی ہولے رکھا ہوا ہے۔ دراصل ہم آج ہی کسی کی دشمنی افورڈ نہیں کرسکتے۔ پہلے دوستی کا رشتہ قائم کرلے دیں پھر دیکھیں ہم کیسے چٹنی کے شیرے میں کالی مرچیں پیس کے ڈالتے ہیں۔ تصور العمین! ہماری بہن ابھی ہم پر اتنا بڑا وقت نہیں آیا کہ ہمارے رائٹرز اپنے قلم سے کہانی کے ہیرو کے ہاتھوں انتہا کی پٹائی کروا کر خود بھی خوش اور ہمیں بھی خوش کرتے پھریں۔ جن بھائیوں کو ہمارا تبصرہ پسند آیا ان کا ڈھیروں شکریہ جن کو ابھی تک ہمارے تبصرے پسند نہیں آرہے، ان سے یہی کہیں گے کہ شاید مستقبل میں پسند آجائیں لیکن پھر بھی نہ آئے تو جس طرح آپ اسماعیل خان آفریدی کو برداشت کررہے ہیں تو ہمیں بھی کرلیجیے گا شکریہ کے ساتھ۔ اس بار پہلے ہم رنگوں کے رنگ میں رنگے۔ کاشف انکل کی کہانی میں اس دفعہ کوئی خاص کامیڈی پڑھنے کو نہیں ملی۔ منظر امام کی تحریر مسکراہٹوں کے ساتھ بھری ہوئی تھی لیکن نوید جمال کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہوا۔ ایچ اقبال کی کہانی کا موضوع کافی پرانا تھا۔ بہت سی ایسی کہانیاں شائع بھی ہوئی ہیں۔ ہمارے بہت سے دوست اس پر تبصرہ کرتے رہے ہیں۔ اب ہمارے پاس کچھ خاص نہیں ہے کہنے کے لیے مگر اس بات میں کوئی شک نہیں، رائٹر نے کہانی کے ساتھ پورا انصاف کیا۔ طاہر انکل نے اس بار اپنے خاص قلم کے ساتھ چھ بے کو شیر بنادیا۔ عرصے بعد کہانی پڑھنے میں مزہ آیا۔ گرداب میں آفتاب کا دکھ ایک دم کم ہوگیا۔ افضل کا دکھ اس سے کہیں زیادہ بھاری محسوس ہونے لگا۔ فیروز نے وار میں کہیں سے بھی فیروز نے وار نہیں لگا۔"

راجن پور سے ماہ تاب گل رانا کے خیالات "آج کے دن جبکہ لوگ عید کی خوشیاں منا رہے تھے میں جاسوسی کے انتظار میں ابنِ انشا کی غزل کا وہ مصرع گنگنا رہی تھی

دل ہجر کے غم سے بوجھل ہے، اب آن ملو تو بہتر ہو

آخر عید کی نماز کے کچھ دیر بعد جاسوسی نے میرے مرجھائے چہرے پر رونق بحال کردی۔ ڈاکٹر انکل! آپ اپنی صنف کو صنفِ نازک ثابت کرنے پر کیوں تلے ہیں؟ بزم یاراں میں قدم رنجہ فرماتے ہی ایک زوردار ... انکل! آپ ... دی جاتی ہے کہ پھر بھی حاضر ہوں۔ شوکت بیالی! کرسیِ صدارت مبارک ہو ... تصور العمین کے نام پر رک گئیں۔ تصور العمین! آپ کے بغیر محفل بلیک اینڈ وائٹ لگتی ہے۔ ... اس بات کا تو اندازہ ہوگیا، یا آپ کا اور جنگجو کا نام نہیں۔ مجھے آپ کی انٹرویو والی بات سے اتفاق ہے۔ اس کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ پہلے ایک رائٹر کا نام ووٹنگ سے سلیکٹ کریں اور پھر سب ریڈرز "ان" کے متعلق ایک، ایک سوال پوچھیں۔ اس طرح ڈاکٹر انکل جی کو کوئی نیا سلسلہ شروع کرنے کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی۔ کیا خیال ہے؟ دلشین اور روشانے! مستقل غائب... کیوں؟ اب ذرا تحریروں پر نظر کرم۔ للکار میں تو تابش نے دل خوش کردیا۔ میرا خیال ہے کہ جو معذور شخص تابش کو ملا ہے اس کا کسی نہ کسی حوالے سے عمران سے تعلق ہوگا اور مغل انکل! تیسری یا چوتھی قسط میں تابش کو کار کے ڈیش بورڈ سے عمران کی ڈائری ملی تھی اور وہاں یہ الفاظ تھے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ یہ ڈائری آئندہ میرے کتنے کام آنے والی ہے تو میرے خیال میں اس معذور شخص اور ڈائری کا آپس میں کوئی ربط ہو۔ گرداب میں عمران اور رانی کی موت نے بہت دکھ دیا۔ مہتاب اور اس کے بچوں کی موت تو پہلے ہی نظر آرہی تھی۔ انسان کیوں اتنا درندہ بن گیا ہے کہ اس کی نظروں میں انسانی جان کی کوئی اہمیت نہیں؟ یہی ظلم تو ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا قہر برستا ہے۔ سیلاب، زلزلے آتے ہیں۔ پھر ہم پوچھتے ہیں کہ اے خدا یہ عذاب کیوں؟ ہمارا کیا قصور؟ کتنے معصوم بن جاتے ہیں۔ تیر، گرداب بہت سست روی کا شکار ہے۔ اسما آپی! کچھ رفتار بڑھائیں۔ کاشف زبیر کو بڑے عرصے بعد اپنے مخصوص انداز میں دیکھا۔ شامی کا نام پڑھ کر دل خوش ہوگیا تھا لیکن خلاف توقع تحریر کچھ خاص نہ لگی۔ اتنی آسانی سے مجرم کیفر کردار تک پہنچ گئے۔ پہلا رنگ الٹ پھیر کا انداز تحریر پرانا تھا لیکن اینڈ پھر بھی ٹھیک ہوگیا۔ رضوانہ منظر کی بے وجود بھی تحریروں میں بہتر رہی۔ باقی رسالہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔"

زاہد اعوان کی شمولیت لاہور سے "جاسوسی سے وابستگی 1999ء کی بات ہے جب ہم میٹرک میں تھے۔ جاسوسی پڑھ کر خود کو جاسوسی دنیا کا ایک حصہ سمجھتے تھے۔ آج تعلیم مکمل کرنے کے بعد اچھے عہدے پر فائز ہونے کے باوجود ہم جاسوسی کی عادت ختم نہیں کرسکے۔ سچ یہ ہے کہ بچپن کے شوق آسانی سے ختم نہیں ہوتے۔ اور ایک کڑوا سچ تو یہ ہے کہ ہم جادوگر قیر صاحب کی گمراہ، احمد اقبال کی شکاری، مودی صاحب کی سرکش، اقبال کاظمی کی آتش فشاں، طاہر جاوید مغل کی دیوی، پرواز اور پھر للکار اور اسما قادری کی گرداب پڑھنے میں ایسے مصروف رہے کہ اتنے سالوں میں محفل چھپتی بلکہ چھپی پڑھنے کی ضرورت محسوس ہی نہیں کی لیکن اتفاق سے کراچی سے لاہور سفر کرتے ہوئے ہم نے سوچا باقی سب تو سکون سے گھر جاکر پڑھیں گے کیوں نہ لاہور ائرپورٹ تک محفل ہی کا مطالعہ کیا جائے۔ ہم نے جیسے ہی اس محفل میں قدم رکھا تو ہم محفل سے تو نہ نکل سکے البتہ جہاز والوں نے جہاز سے نکال دیا اور پتا ہی نہیں چلا کب لاہور آگیا۔ گھر آنے کے بعد پھر محفل میں گھس گئے۔ مرزا برادرز اینڈ سسٹر کا خوب صورت تبصرہ، فاطمہ گل کا نام کے برعکس کانٹوں جیسا تبصرہ... ہمایوں سعید راج

جیسا عجیب نام، جہانگیر گوندل خوشبو والے، یار! آپ سے کوئی بو تو نہیں آتی جو ہر وقت ہر بات پر خوشبو لگاتے ہو؟ محمد نعمان پیارے، یار جو پیارے ہوتے ہیں ان کو اپنے نام کے آگے پیارے لکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آسیہ خان صاحبہ! آپ کو سرورق کی خاتون کیوں پسند نہیں آئی، اس کی شکل آپ جیسی تو نہیں تھی؟ درخشندہ الیاس اور قریش کے عام سے لیکن دلچسپ تبصرے، جب ہم نے ان سب ساتھیوں کو دیکھا تو ہم نے سوچا ہم بھی اس محفل میں حصہ لے کر دیکھیں، ہم جیسے نازک سے بندے کو محفل میں جگہ مل سکتی ہے؟ حقیقت میں ہم ایسے ہی ہیں، تھوڑی سی جگہ بھی ملی تو محفل میں سما جائیں گے۔" (خوش آمدید)

پی ایم آر پی کی فرمائش دیر سے "رسالہ 4 تاریخ کو ملا۔ سرورق پر نظر پڑتے ہی خوش بھی ہوا اور پریشان بھی۔ خوش تو اس لیے کہ سرورق کی حسینہ بہت خوب صورت تھی لیکن خفا اس لیے ہوا کہ اس کی وجہ سے دو مردوں کے درمیان جھگڑا ہے۔ سرورق کو پھلانگتے ہوئے سیدھے چٹکی بکھتچی میں پہنچے تو وہاں خالد شوکت کو کرسی صدارت پر پایا، مبارک باد۔ تبصرہ واقعی شاندار تھا۔ ہمایوں سعید رومیو صاحب! کبھی رومیو کبھی راج انشاء اللہ اس کے بعد راجا ہوں گے۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے دو نمبر پڑھی۔ شامی اور تیمور کی جوڑی نے اس بار بھی محفل لوٹ لی۔ پھر گاڑی ریورس کردی اور خود کش پر بریک لگادی۔ گرداب میں اسما جی نے آخر کار عمران کو مروادیا۔ اسما جی! کہانی کے لیے ویلڈن لیکن شہریار کو فرنٹ پر لائیے۔ اس کا تذکرہ ہوتا ہے لیکن سرسری... للکار میں آخر کار تابش، عمران کے نقشِ قدم پر چلنے لگا اور گورے جارج کی بہن کو بھی اغوا کرلیا۔ محمد عفان کی تحریر نے دار پسند آئی۔ ایڈ گرتے اپنی بیٹی کے لیے بہت کچھ کرنا چاہا لیکن کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔ جام میں میر اشک سلور سٹار پر تھا۔ مریم کے خان نے اس بار زرا بھی متاثر نہیں کیا کیونکہ اس بار خیال کی کہانی لے آئی تھیں لیکن ہمیں سوچنا بالکل پسند نہیں۔ چھوٹی کہانیوں میں رضوانہ منظر کی بے وجود بازی لے گئی۔ شکیل کتنی چالاکی سے منصوبہ بنارہا تھا لیکن سب انسپکٹر نے اس کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ آخری کہانی ہم نے الٹ پھیر پڑھی۔ واہ منظر امام! کیا بات ہے۔ ہم اتنے تھے ہیں کہ کیا بتاؤں۔ نوید کے سفید جھوٹ، مکالمہ بازی بہت خوب صورت تھی باپ اور بیٹے کے درمیان۔ آخر میں ایک درخواست اقلیم علیم کی کوئی کہانی جاسوسی ڈائجسٹ میں شائع کریں۔"

عابد جان کی چار سدہ سے گل افشانی "جاسوسی کی بروقت یعنی 3 تاریخ کو دستیابی نے عید کا مزہ ہی دوبالا کردیا۔ لیکن سرورق میں وہی پرانا راگ الاپا جارہا ہے۔ صنفِ مخالف کو بجلیاں گراتے ہوئے دکھایا جارہا ہوتا ہے جبکہ اپنی ہی صنف کو سلطان راہی کا جانشین ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہوتی ہے۔ ارے بھئی اب بس بھی کرو۔ یار ... کچھ نیا دکھاؤ سرورق میں۔ ... اور بھی تو شاہکار ہیں اس کائنات رنگ و بو میں۔ بہرحال، ہمیں پتا ہے کہ ہماری آواز اس سلسلے میں صدا بصحرا ثابت ہوگی اس لیے صبر کے گھونٹ پی کر آگے بڑھ گئے۔ اشتہارات کے ساتھ وہی سلوک کیا جو ادارہ ہماری تجاویز کے ساتھ کرتا ہے اور فہرست کو آہستگی سے چھیڑتے ہوئے بزم دوستاں میں پہنچ گئے۔ بیال صاحب! پہلے تو اول آنے پر مبارک باد، اس کے بعد یاد دہانی کہ جاسوسی ایسی محبوبہ کے فراق میں آپ اکیلے دل فگار نہیں ہو، کچھ اور بھی بلبل اس باغ کے تنخواہ دار ہیں۔ گوندل صاحب! ہمارا تو آٹومیٹک سسٹم ہے گیئر ویئر کے چکر میں نہیں پڑتے خوشبو لگا کے۔ رومیو کم راج صاحب! ثبوت کے طور پر ہم آسیہ خان کا نام پیش کرتے ہیں۔ ویسے ذرا خیال رکھیے، راج جس کی کہانی تو سنی ہوگی نا؟ تصور العمین صاحبہ! آپ کے اپنے تبصرے نے ہی آپ کے عقل کے تور کی وضاحت کی۔ خود تو ہاتھ گیا، پاؤں دھو کے ہی ... رضوان صاحب... آپ کو کہا بھی تھا کہ زیادہ گرم نہ کھایا کرو ... بہرحال، ... دوستوں کے ساتھ اظہار ہمدردی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے گرداب پڑھی، کہانی آہستہ آہستہ رہی ہے۔ دونوں فریق اب کھل کر سامنے آگئے ہیں۔ شاید کہ ماہ پارا توبھی شہریار کے پاس دوبارہ پہنچ جائے، اب مزہ آئے گا۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ للکار میں تابش صاحب کے اندر چھپا ہوا شیر انگڑائی لینے لگا ہے اور آگیا تے چھا گیا کے مصداق دشمنوں کو پچھاڑ کر رکھ دیا۔ ویسے مغل صاحب اب کہانی کو اپنے ملک لے آئیں تو بہتر ہوگا۔ اس کے بعد خود کش پڑھی۔ ایچ اقبال صاحب کی تقریباً ہر کہانی کا تانا بانا ایران سے جڑا ہوتا ہے۔ یہ کیا ماجرا ہے بھئی؟ بہرحال کہانی زبردست تھی لیکن انجام پڑھ کر دکھ ہوا۔"

مدثر عالم خان کی قلابازیاں اوچ سے "جاسوسی ہاتھ میں آتے ہی کہانیوں کی فہرست میں چھلانگ لگادی اور للکار کا نام اور صفحہ ذہن میں نقش کرنے کے بعد واپس نکل آئے۔ سرورق پر ایک لڑکی لپارٹس انداز میں مسکرا رہی تھی۔ پاس ہی ارباز خان ہاتھ میں بندوق لیے حسینہ سے اڑنے کی کوشش کررہے تھے۔ یہ سین قطعاً متاثر نہ کرسکا تو واپس للکار سے ملنے چلے گئے جہاں پرتابی نے جی خوش کردیا۔ اگلی قسط کا انتظار ہے۔ اس کے بعد گرداب دیکھی جس میں تمام پسندیدہ کردار گرداب کے شکنجے میں جکڑے نظر آئے۔ رنگوں میں کاشف زبیر کا نام دیکھ کر فوراً پہنچے جہاں ہمارے خیال میں ہماری من پسند کہانی ہونی چاہیے تھی مگر شامی اور تیمور کی موجودگی کا لالہ کیے بغیر مایوس ہوگئے۔ الٹ پھیر بھی متاثر نہ کرسکی۔ پھر ایچ اقبال کی کہانی خود کش پڑھی، پلاٹ دیکھ کر جی خوش ہوا کہ چلو کچھ نیا انکشاف تو ضرور ہوگا۔ کچھ ہم بھی تو جان سکیں گے کہ اسلامی دنیا میں کیا کھیل کھیلا جارہا ہے مگر اقبال صاحب کہانی کا تجسس برقرار نہ رکھ سکے اور روایتی مسالا بھر دیا جس سے مایوس ہوگئے۔"

نوری اے کے مسلم ٹاؤن بہاولپور سے تنقیدی گلے "سرورق اس بار گزارے لائق تھا، سو نظرانداز کرتے پہنچے محفل میں۔ خالد شوکت! اچھا تبصرہ لکھنے پر مبارک باد۔ جہانگیر اسلم اتنی خوشبو بھی نہ لگایا کریں، سنا ہے جن بھی عاشق ہوجاتے ہیں۔ ہم آپ کو کھونا نہیں چاہتے۔ ایم اے خان! اچھا مذاق تھا، شامل ہوتے رہنا۔ آسیہ خان اس بار آپ کو سرورق کی حسینہ میں اپنی جھلک نظر نہیں آئی؟ انکل! ہمایوں سعید کی فرمائش کی ہم بھی تائید کرتے ہیں، پلیز ضرور پورا کریں۔ تصور العمین آپی! ایسی نئی صنف نازک ایسی کوششیں اکثر کرتی ہیں پر ہم کسی چکر میں نہیں آتے۔ فاطمہ گل عید سے پہلے عید کیسے ہوسکتی ہے؟ سب سے پہلے للکار سے آنکھیں چار کیں۔ حسبِ توقع مغل انکل کا ہیرو روایت کے مطابق شعلہ جوالا بن کر دشمنوں پر ٹوٹ پڑا۔ امید ہے اب بلی تھیر بن کر جارج گورے پر ٹوٹ پڑے گا۔"

ان قارئین کے نام جن کے خطوط شامل بزم نہ ہوسکے۔

ناصر خان، پشاور۔ اظہر علی، بہاولپور۔ اجمل لودھی، لاڑکانہ۔ اظہر حسین، کراچی۔ نعیم احمد، لاہور۔ کامران خان، کراچی۔ عمران آفریدی، کوئٹہ۔ نعیم شاہ، نجف۔ محمود قادری، کراچی۔ ناہید یوسف، حیدرآباد۔ شاہین تبسم، بھکر۔ شاہد حسن، سیالکوٹ۔ ثمرین صبا، کراچی۔ اعجاز الامین، جھنگ۔ اقبال لطیف، ملتان۔ وسیم اختر، مری۔ عدیل پاشا، نواب شاہ۔

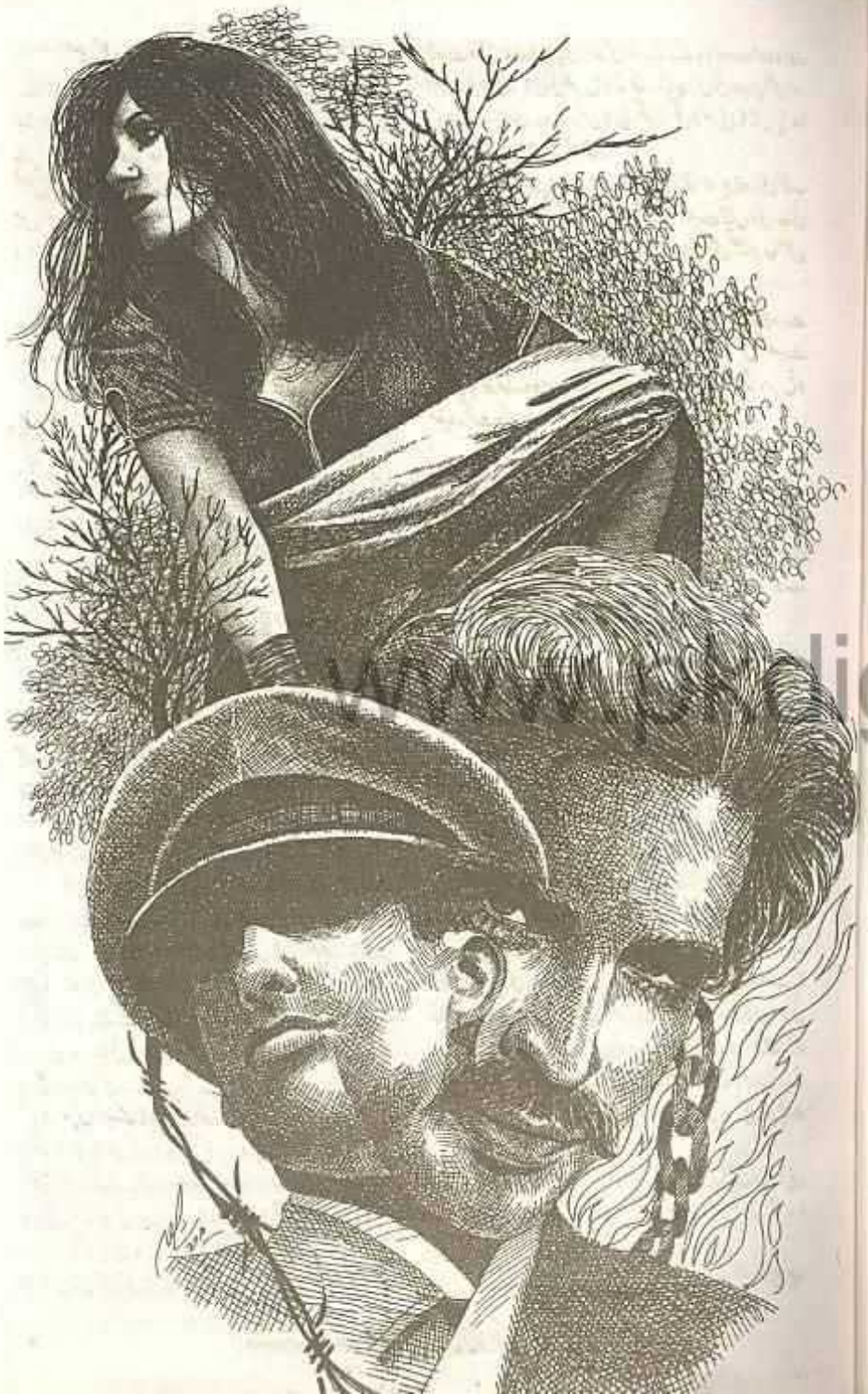

آگ کے دریا میں ڈوب کر منزلِ عشق تک پہنچنے کا کٹھن سفر طے کرنے والے دو دلوں کی داستان

سلیم فاروقی

نیشِ عشق

زہرِ عشق کا پیالہ منہ سے لگانے والوں کو اس بات کی پروا کہاں کہ دنیا داروں کے لیے ان کا یہ عمل کیا معنیٰ رکھتا ہے۔ دو دلوں کے ملن کے بیچ ہوشمندوں کی دنیا تے تو ہمیشہ صرف رکاوٹیں ہی کھڑی کی ہیں مگر جن کے سروں پر عشق کا سودا سما جائے تو پھر انہیں کوئی بھی نہیں روک پاتا۔ اب یہ بات تو صرف دل پر تیرِ عشق کا گھاؤ کھانے والے ہی جانتے ہیں کہ منزل تک پہنچنے میں انہیں راہ کی کون کون سی رکاوٹوں کو پار کرنا پڑا۔ سچ ہے کہ راہِ طلب میں جن کے پاس جذبۂ صادق اور عشق کا زادِ راہ ہو منزل خود آگے بڑھ کر انہیں آواز دیا کرتی ہے۔ ایسے ہی دو دھڑکتے دلوں کے فسوں خیز عشق کا ماجرا۔ ان کے ملن کے بیچ دو الگ الگ سماجی روایتوں کے بپھرے دریا حائل تھے۔

یونیورسٹی میں وہی رونق، وہی چہل پہل تھی... وہی ہنستے مسکراتے چہرے، وہی اٹھلاتی اور ناز و ادا دکھاتی ہوئی لڑکیاں... وہی بات بے بات قہقہے لگاتے لڑکے لیکن تانیہ ان سب سے الگ بیزار بیٹھی تھی۔ اس کا دل کسی بھی کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ مجھے یونیورسٹی آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔

"کن خیالوں میں گم ہو مہارانی؟" اچانک نزہت نے لان میں اس کے نزدیک بیٹھتے ہوئے کہا۔

تانیہ نے چونک کر اسے دیکھا لیکن جواب میں کچھ نہیں بولی۔

"ارے بھئی، یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟" روبی نے کہا۔ وہ اور ثمرہ بھی نہ جانے کب وہاں آ گئی تھیں۔ "نہ گل کھلے ہیں، نہ ان سے ملے، نہ مے پی ہے۔" روبی نے فیض کی نظم کا مصرع گنگنایا۔ اس کی آواز بہت اچھی تھی اور بالکل میڈم نور جہاں کو کاپی کرتی تھی۔

"تم لوگوں نے زیادہ پریشان کیا تو میں اٹھ کر چلی جاؤں گی۔" تانیہ نے منہ بنا کر کہا۔

"تم بھی خفا ہو، لوگ بھی برہم ہیں دوستو!" روبی نے کہا۔ "اب ہو چلا نصیب کہ بُرے ہم ہیں دوستو!" روبی نے پھر تان لگائی۔

"اچھا بھئی، اب تانیہ کو زیادہ پریشان مت کرو۔" نزہت نے کہا۔ "آؤ تانیہ! تم میرے ساتھ آؤ۔" وہ تانیہ کو لے کر اٹھ گئی۔

روبی اور ثمرہ وہیں بیٹھی رہ گئیں۔ تانیہ کی دوستی بھی صرف نزہت ہی سے تھی۔ یوں تو وہ ثمرہ، روبی، سعدیہ اور جاوید سبھی سے بے تکلف تھی لیکن نزہت اس کی رازدار بھی تھی اور وہ دونوں اسکول کے زمانے سے ایک ساتھ تھیں۔

نزہت وہاں سے کچھ فاصلے پر تانیہ کو ایک پُرسکون گوشے میں لے گئی۔ کینٹین کا باہر والا لڑکا نظر آیا تو نزہت نے اسے دو کولڈ ڈرنکس کا آرڈر دے دیا اور بولی۔ "ہاں تانیہ! اب بتاؤ، تم اتنی پریشان کیوں ہو؟"

"آج مراد کو گئے پانچواں دن ہے۔" تانیہ نے کہا۔ "اس کی طرف سے کوئی اطلاع ہے نہ خیر خبر... بھئی وہ اگر کسی کام میں پھنس بھی گیا تھا تو سیل فون پر اطلاع تو دے سکتا تھا نا؟"

"ارے یار! تو اس میں اتنی پریشانی کی کیا بات ہے؟" نزہت نے ہنس کر کہا۔ "بھئی اس نے ٹیلی فون نہیں کیا تو کیا ہوا؟ تم اسے ٹیلی فون کر لو۔"

''میں کئی دفعہ کوشش کر چکی ہوں۔'' تانیہ نے فکرمندی سے کہا۔ ''لیکن اس کا سیل فون ہی بند ہے۔ میں نے لینڈ لائن پر بھی کئی فون کیا تھا۔ دوسری طرف سے شاید کسی ملازم نے فون اٹھایا تھا۔ اسے سندھی کے سوا کوئی زبان ہی نہیں آتی تھی۔ میں نے مراد کے بارے میں پوچھا تو جواب میں اس نے نہ جانے کیا کہا۔ میری سمجھ میں صرف ''سائیں مراد'' ہی آیا۔''

''یہ بھی ایسی کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔'' نزہت نے اسے تسلی دی۔ ''بھئی وہ ایک اہم مشن پر گاؤں گیا ہے۔ اپنے جاگیردار باپ کو شادی کے لیے راضی کرنا بھی تو ایک مشن ہی ہے۔ یہ وڈیرے اور جاگیردار مشکل ہی سے شہر کی پڑھی لکھی لڑکیوں کو قبول کرتے ہیں۔'' نزہت کے لہجے میں چنچلی گھل گئی۔ ''تم ایسا کرو، جاوید سے بات کرو۔ وہ مراد کے گھر ٹیلی فون کرے گا۔ وہ کافی عرصہ اندرون سندھ میں بھی رہا ہے اس لیے سندھی بھی بہت اچھی بولتا ہے۔''

''ہاں، جاوید کا تو مجھے خیال ہی نہیں آیا تھا۔'' تانیہ کے چہرے پر چمک سی آگئی۔ ''میں ابھی اس سے بات کرتی ہوں۔''

''یہ تو بتاؤ، تم نے بھی اپنے پاپا اور مما کو مراد کے بارے میں بتایا ہے؟''

''ارے، ان لوگوں کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' تانیہ نے ہنس کر کہا۔ ''وہ مراد کے گھر والوں کی طرح دقیانوسی نہیں ہیں۔ پھر تم جانتی ہو کہ پاپا مجھے کتنا چاہتے ہیں۔ وہ میری پسند سے انکار نہیں کر سکتے۔''

پیریڈ ختم ہونے کا گھنٹا بجا تو دونوں کلاس روم کی طرف روانہ ہوگئیں۔

تانیہ کے والد بریگیڈیئر اکرام گزشتہ سال ہی آرمی سے ریٹائر ہوئے تھے۔ اس کا ایک بھائی احتشام بھی پاکستان آرمی میں کیپٹن تھا اور ان دنوں کھاریاں میں مقیم تھا۔ تانیہ کی والدہ سرکاری کالج میں انگریزی ادب کی پروفیسر تھیں۔ اس کا گھرانا پڑھے لکھے اور انتہائی مہذب افراد پر مشتمل تھا۔ وہ والدین اور بھائی کی لاڈلی تھی اور اس کی ہر خواہش بغیر کہے پوری ہو جاتی تھی۔

مراد اس کا کلاس فیلو تھا۔ وہ سندھ کے بہت بڑے جاگیردار کا بیٹا تھا۔ روایتی جاگیرداروں کے برعکس وہ انتہائی سلجھا ہوا اور مہذب نوجوان تھا۔ بہت شائستہ گفتگو کرتا تھا، بلا کا ذہین تھا۔ کلاس میں تو وہ ٹاپ کرتا ہی تھا، اس کے علاوہ اردو اور انگریزی کا بہت اچھا مقرر تھا اور بے شمار تقریری مقابلوں میں ٹرافیاں جیت چکا تھا۔ یہ بھی اس کی ذہانت ہی کا ثبوت تھا کہ مادری زبان سندھی ہونے کے باوجود وہ اردو اور انگریزی اہلِ زبان کی طرح بولتا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ وہ شروع ہی سے لارنس کالج، گھوڑا گلی (مری) میں پڑھا تھا اور ہوسٹل ہی میں رہتا تھا۔

وہ شاید اپنے خاندان کا پہلا فرد تھا جو یونیورسٹی تک پہنچا تھا ورنہ اس کے گھرانے میں تعلیم کو اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ اس کو دیکھ کر اس کا چھوٹا بھائی کمال بھی تعلیم حاصل کر رہا تھا اور اب وہ کالج میں تھا۔

مراد اپنی نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں کی وجہ سے پوری یونیورسٹی میں مقبول تھا۔ اس میں اس کی پُرکشش شخصیت کا بھی ہاتھ تھا۔ وہ مردانہ وجاہت کا نمونہ تھا۔ دراز قد، سرخ و سفید رنگت، کسرتی جسم اور خوب صورت اندازِ گفتگو۔

یونیورسٹی کی بہت سی لڑکیاں اس کے قرب کی خواہش مند تھیں لیکن وہ کسی بھی لڑکی کو منہ نہیں لگاتا تھا۔ اس کے دل میں تو تانیہ کی تصویر پہلے ہی دن نقش ہوگئی تھی۔ تانیہ بھی انتہائی سلجھی ہوئی اور کام سے کام رکھنے والی لڑکی تھی۔ وہ نسوانی حسن کا مجسمہ تھی۔ سرو قد، متناسب جسم، بڑی بڑی خوب صورت آنکھیں اور لمبی سیاہ زلفیں۔

نہ جانے دونوں میں کب اور کیسے محبت کا آغاز ہوا اور اب تو محبت کا یہ پودا تناور درخت میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اب وہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

ان کی محبت، یونیورسٹی کے دوسرے طالب علموں کی نظر سے بھی چھپی نہ رہ سکی تھی لیکن مراد کے خوف سے کسی میں کچھ کہنے کی جرأت نہیں تھی۔

بریگیڈیئر اکرام صاحب اور ان کی بیگم ماجدہ، تانیہ کی فوری طور پر شادی تو نہیں کرنا چاہتے تھے لیکن جب یکے بعد دیگرے تانیہ کے دو رشتے آئے تو وہ لوگ بھی سنجیدگی سے اس پر غور کرنے لگے۔ ان میں سے ایک رشتہ بریگیڈیئر صاحب کے ایک ساتھی میجر جنرل آصف کے بیٹے کیپٹن عاطف کا تھا۔ دوسرا رشتہ شہر کے ایک معروف صنعت کار عرفان موتی والا کے بیٹے عدنان کا تھا۔ دونوں ہی رشتے بہت اچھے تھے لیکن اکرام صاحب عاطف کے حق میں تھے۔ انہوں نے بچپن سے عاطف کو دیکھا تھا۔ وہ انہیں تانیہ کے لیے ہر لحاظ سے موزوں لگتا تھا۔

''بھئی ماجدہ بیگم!'' اکرام صاحب نے ایک دن اپنی بیگم سے کہا۔ ''میں تو آصف کے بیٹے کا رشتہ قبول کر رہا ہوں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟''

''اتنی جلدی مت کریں۔ پہلے تانیہ سے بھی تو پوچھ لیں کہ وہ اس رشتے پر راضی ہے یا نہیں؟''

''تانیہ!'' اکرام صاحب نے حیرت سے کہا۔ ''اسے بھلا کیا اعتراض ہوگا؟ اس نے عاطف کو دیکھا ہے۔ بچپن میں دونوں ایک ساتھ کھیلتے بھی رہے ہیں۔ اس کا جواب یقیناً ہاں ہی ہوگا۔''

''آپ تو یوں کہہ رہے ہیں جیسے تانیہ آپ کی کوئی ماتحت ہو اور اپنے باس کی بات کو رد کرنے کی ہمت نہ کر سکے۔ ہر جگہ یہ آرمی والا ڈسپلن نہیں چلتا ہے بریگیڈیئر صاحب!'' ماجدہ بیگم نے ہنس کر کہا۔

''تو بھئی، میں کون سا حکم دے رہا ہوں۔ میں نے تو اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ تم تانیہ سے پوچھ لو۔''

اسی رات ماجدہ بیگم نے تانیہ سے پوچھا تو وہ سناٹے میں رہ گئی۔ پھر سنبھل کر بولی۔ ''امی! ابھی تو میں پڑھ رہی ہوں۔ ایسی جلدی بھی کیا ہے؟ کیا میں آپ لوگوں پر بوجھ ہوں؟'' اس کی آواز بھرا گئی۔

''ایسی بات نہیں ہے بیٹا!'' ماجدہ بیگم نے جلدی سے کہا۔ ''ہم کون سی کل تمہاری شادی کر رہے ہیں۔ میں تو صرف یہ معلوم کرنا چاہ رہی ہوں کہ عاطف کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟''

''امی پلیز!'' تانیہ نے کہا۔ ''ابھی اس موضوع پر بات نہ کریں۔ مجھے اپنی تعلیم مکمل کرنے دیں۔''

ماجدہ بیگم خاموش ہوگئیں۔

دوسرے ہی دن تانیہ نے مراد سے اس بات کا تذکرہ کیا تو وہ بھی پریشان ہوگیا۔

''دیکھو مراد! ہمارے پاس صرف دو مہینے ہیں۔'' تانیہ نے کہا۔ ''اس کے بعد میں تعلیم سے فارغ ہو جاؤں گی۔ تم اگر واقعی مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو تو اپنے بابا سائیں سے بات کرو۔ وقت گزر گیا تو میں بھی کچھ نہ کر سکوں گی۔ پھر میرے پاس انکار کا کوئی جواز بھی تو ہو۔ ہاں اگر تمہارے گھر سے رشتہ آگیا تو میں بھی اپنی بات پر اڑ جاؤں گی۔''

مراد کچھ دیر تک خاموشی سے سوچتا رہا پھر بولا۔ ''تم ٹھیک کہتی ہو تانیہ! مجھے بابا سائیں سے بات کرنا ہی پڑے گی۔ میں کل ہی گوٹھ جا رہا ہوں۔ وہاں سے واپسی پر تمہیں خوش خبری سناؤں گا۔ ہاں، میری غیر حاضری میں ایسی ویسی بات ہو تو تم بلا جھجک جاوید سے کہہ سکتی ہو۔ وہ میرا بہت اچھا اور اسکول کے زمانے کا دوست ہے اور ہمارے بارے میں سب کچھ جانتا ہے۔''

جاوید کے والد حال ہی میں ڈپٹی سیکریٹری کے عہدے سے

ہر شمارہ خاص شمارہ

ماہنامہ سرگزشت

اکتوبر 2010ء کا شمارہ ہر بک اسٹال پر موجود ہے

محسن ملت

پوری دنیا کے مسلمانوں میں بیداری کی لہر پیدا کرنے والے شخص کا زندگی نامہ

اکبر کھوجی

ایک الگ انداز کی تحریر، تاریخ ہند کا مخفی باب

معطر ملکہ

اس عجوبہ عالم مسلمان چینی ملکہ کا احوال جس کے بدن سے خوشبو پھوٹتی تھی

عزت دار

آنکھیں نم کر دینے والی آپ بیتی

ان کے علاوہ

ڈھیر ساری معلوماتی تحریریں، کہانیاں، آپ بیتیاں، جگ بیتیاں

آپ کے علم کی پیاس بجھانے کا واحد ذریعہ دلچسپ ماہنامہ صرف ایک بار پڑھ کر دیکھیں پھر خود ہی آپ گرویدہ ہو جائیں گے۔

آج ہی نزدیکی بک اسٹال سے حاصل کریں

سے ریٹائر ہوئے تھے اور انہوں نے اسلام آباد کے بجائے کراچی میں بنگلا بنایا تھا۔ جاوید اپنے والدین کا اکلوتا تھا۔ وہ مراد کے گھر کے ایک فرد کی طرح تھا اور اب تو تانیہ کے گھر بھی بلا جھجک چلا جاتا تھا۔ نہ صرف وہ بلکہ مراد بھی تانیہ کے گھر جاتا رہتا تھا۔ بریگیڈیئر صاحب خاصے روشن خیال تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ جیسے نزہت، روبی اور ثمرہ، تانیہ کی دوست ہیں اسی طرح جاوید اور مراد بھی ہیں۔ وہ مراد کو پسند بھی کرتے تھے اور مختلف موضوعات پر گھنٹوں اس سے بات چیت کرتے تھے۔ بریگیڈیئر صاحب شطرنج کے شوقین تھے اور مراد بھی شطرنج کا چیمپئن تھا۔ اکثر وہ جان بوجھ کر بریگیڈیئر صاحب سے ہار جاتا تھا کہ ان کی فوجی انا کو تکلیف نہ پہنچے۔

اب مراد گزشتہ چار روز سے گوٹھ گیا ہوا تھا اور اس کی طرف سے کوئی اطلاع بھی نہیں ملی تھی۔ تانیہ اسی وجہ سے پریشان تھی کہ کہیں مراد کے جاگیردار باپ نے اس رشتے سے انکار کے بعد مراد پر کراچی آنے پر پابندی تو نہیں لگا دی۔

اسی وقت اسے جاوید نظر آیا۔ وہ تیزی سے لائبریری کی طرف جا رہا تھا۔ تانیہ نے اسے آواز بھی دی لیکن شاید اس نے سنی نہیں۔ تانیہ اس کے پیچھے لپکی اور اسے آدھے راستے میں جا لیا۔

''کیا بات ہے جاوید؟'' اس نے پھولے ہوئے سانسوں کے ساتھ پوچھا۔ ''بہت مصروف ہو؟ میں تمہیں آوازیں دے رہی ہوں اور تمہیں کچھ سنائی ہی نہیں دے رہا ہے۔''

جاوید نے غور سے اسے دیکھا۔ اسے وہ تانیہ اس تانیہ سے بہت مختلف لگی جسے وہ جانتا تھا۔ کملائی ہوئی سی، پریشان، اجڑی اجڑی سی۔ اس نے تشویش سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے تانیہ! خیریت تو ہے... تم اتنی پریشان کیوں ہو؟''

''تمہارے پاس کچھ وقت ہو تو میں بات کروں۔'' تانیہ کے لہجے میں طنز تھا۔

''ارے، میرے پاس تمہارے لیے وقت ہی وقت ہے۔ ایک اسائنمنٹ بنانا تھا لیکن وہ کوئی اتنا ضروری بھی نہیں ہے۔ ایک گھنٹے بعد بنا لوں گا۔'' پھر وہ اسے لے کر لان کے ایک پرسکون گوشے میں چلا گیا۔ ''ہاں، اب بتاؤ کیا پریشانی ہے؟''

''مراد گزشتہ پانچ دن سے گوٹھ گیا ہوا ہے۔'' تانیہ نے کہا۔ ''اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ دو دن میں آ جائے گا۔''

''اوہو، تو یہ پریشانی ہے۔ چندا تو ری چاندنی میں جیا جلا جائے رے...''

''جاوید!'' تانیہ سنجیدہ ہو گئی۔ ''تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے۔ تم جانتے ہو کہ وہ اس مرتبہ گوٹھ کیوں گیا ہے؟''

''جانتا ہوں بابا جانتا ہوں۔'' جاوید نے ہنس کر کہا۔ ''اسے اپنے ضدی باپ کو منانے میں کچھ زیادہ ہی وقت لگ گیا ہے۔ بس اتنی سی بات ہے۔''

''لیکن اس کا سیل فون بھی بند ہے۔'' تانیہ نے کہا۔ ''میں نے لینڈ لائن پر کال کی تو کسی ملازم نے ریسیور اٹھایا۔ اسے سندھی کے سوا کوئی زبان نہیں آتی تھی۔ تم ذرا اس کے گھر ٹیلی فون تو کرو۔''

جاوید نے اپنی جیب سے سیل فون نکالا اور مراد کا لینڈ لائن نمبر ملایا۔ تانیہ کو سنانے کے لیے اس نے سیل فون کا اسپیکر بھی آن کر دیا تھا۔

دو تین گھنٹیاں بجنے کے بعد کسی نے فون کا ریسیور اٹھا لیا۔ ''ہیلو!''

''بابا سائیں مراد آہے چھا؟'' (سائیں مراد ہے کیا؟)

''سائیں، تہاں کیر تھا گالہایو؟'' (سائیں، آپ کون بول رہے ہیں؟)

''میں کراچی سے جاوید بول رہا ہوں۔'' جاوید نے سندھی میں کہا۔

''سائیں مراد تو بڑے سائیں کے ساتھ زمینوں پر گیا ہے۔'' ملازم نے جواب دیا۔

''زمینوں پر کیا ہے؟'' جاوید نے حیرت سے کہا۔ ''بابا، اس کے امتحان ہونے والے ہیں اور وہ زمینوں پر گھوم رہا ہے۔ وہ واپس آئے تو اس سے کہنا کہ مجھے ٹیلی فون کرے۔ تم مختل بول رہے ہو نا؟''

''جی سائیں۔'' ملازم نے جلدی سے کہا۔ ''میں مختل بول رہا ہوں۔ میں سائیں مراد کو بتا دوں گا کہ آپ نے فون کیا تھا اور بہت ضروری بات کرنا ہے۔''

جاوید نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس کے چہرے پر بھی فکرمندی کے تاثرات تھے۔

''ایسے وقت میں اسے زمینوں پر جانے کی کیا ضرورت تھی؟'' وہ خود کلامی کے انداز میں بولا۔

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ مراد حویلی ہی میں ہو۔'' تانیہ نے کہا۔ ''اور ملازم نے جھوٹ بولا ہو۔''

''لیکن ملازم ایسا کیوں کرے گا؟'' جاوید نے پرخیال انداز میں کہا پھر خود ہی بولا۔ ''بابا سائیں کا حکم ہو تو وہ مراد سے بھی جھوٹ بول سکتا ہے۔ میں آج شام کو خود ہی گوٹھ جا کر معلوم کرتا ہوں۔''

''اور تمہارے پیپر؟'' تانیہ نے کہا۔

''پیپر مراد سے زیادہ اہم تو نہیں ہیں۔ مجھے بھی نہ جانے کیوں لگ رہا ہے کہ مراد کا ملازم جھوٹ بول رہا تھا۔''

تانیہ مزید فکرمند ہو گئی۔ ابھی وہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اس کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے سیل فون نکال کر دیکھا، اسکرین پر مراد کا نام تھا۔

''مراد کی کال ہے۔'' اس نے حیرت سے کہا، پھر فوراً ہی سیل فون کان سے لگا لیا۔ ''ہاں مراد! کہاں ہو تم؟... کب... اچھا... تمہارا ملازم تو بتا رہا تھا کہ تم بابا سائیں کے ساتھ زمینوں پر گئے ہو... اچھا... اچھا... کب... آج شام کو... ویسے خیریت تو ہے نا؟... چلو ٹھیک ہے، میں انتظار کروں گی۔'' تانیہ نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

''کیا کہہ رہا تھا مراد؟'' جاوید نے پوچھا۔

''کہہ رہا تھا کہ بابا سائیں گھر سے کراچی ہی کے لیے نکلے تھے لیکن وہاں سب سے یہی کہا ہے کہ وہ زمینوں پر جا رہے ہیں۔ کسی دوسرے وڈیرے سے زمین کے ایک ٹکڑے پر ان کا مقدمہ چل رہا ہے۔ ابھی دو دن پہلے ہی ان کے آدمیوں میں تصادم ہوا ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ دشمنوں کو ان کے گاؤں چھوڑنے کا علم ہو۔ وہ آج شام کو مجھ سے مل رہا ہے۔''

''تو پھر میں جاؤں؟'' جاوید نے ہنس کر کہا۔ ''اب میرا کام تو ختم ہو گیا۔ تم جانو کہ اب جانے، یہ جھلی تو چلی۔''

''ارے سنو جاوید!'' تانیہ جلدی سے بولی۔ ''مراد نے کہا تھا کہ جاوید کو بھی بلا لینا۔''

''مجھے لگتا ہے کہ میں تم دونوں کے درمیان خرچ ہو جاؤں گا۔ خیر، ابھی تو جاؤں یا ابھی سے اس نواب صاحب کا انتظار شروع کر دوں؟''

''جاوید! تم مرچیں کیوں چبا رہے ہو؟ ویسے تم سندھی اچھی بولتے ہو۔''

جاوید ہنستا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

مراد ہوسٹل کے بجائے ڈیفنس کے ایک بنگلے میں رہتا تھا جو اس کے جاگیردار باپ نے اسے خرید کر دیا تھا۔ اس کے بنگلے پر ایک باورچی، دو گن مین اور ایک ملازم گھر کے کاموں کے لیے بھی تھا۔ تانیہ اور مراد کی ملاقات بھی بنگلے ہی پر ہوتی تھی۔

تانیہ ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ مراد سے ملاقات کہاں کرے گی کیونکہ بنگلے پر تو اس وقت اس کے بابا سائیں بھی ہوں گے۔

اچانک مراد کی کال آ گئی۔ اس نے کہا۔ ''تانیہ! میں تمہیں یہ تو بتانا ہی بھول گیا کہ بابا سائیں بھی میرے ساتھ ہیں۔ تم ایسا کرو کہ جاوید کے گھر پہنچ جاؤ، میں بھی شام کو ساڑھے پانچ بجے تک وہیں آ جاؤں گا۔''

☆☆☆

تانیہ اور جاوید بے چینی سے مراد کا انتظار کر رہے تھے۔ جاوید کے ڈیڈی اس وقت گھر پر موجود تھے۔ اس کی امی کچھ دیر تانیہ سے باتیں کرتی رہیں، پھر نماز کے لیے اٹھ گئیں۔

مراد ساڑھے پانچ کے بجائے چھ بجے وہاں پہنچا۔ اس کی حالت دیکھ کر تانیہ کے دل کو دھچکا سا لگا۔ اس کا چہرہ مرجھایا ہوا سا نظر آ رہا تھا۔ دو دن کی بڑھی ہوئی شیو کی وجہ سے وہ بیمار بیمار سا لگ رہا تھا۔

''کیا ہوا مراد؟'' تانیہ نے کہا۔ ''تم ٹھیک تو ہو؟''

''ہاں، میں ٹھیک ہوں۔'' مراد نے تھکے تھکے انداز میں کہا۔

''یار! یہ رونی صورت لے کر آنے سے بہتر تھا کہ تو نہ ہی آتا۔ پھر کہہ رہا ہے کہ سب ٹھیک ہے۔ آخر بات کیا ہے؟''

''کچھ نہیں یار!'' مراد نے مسکرانے کی کوشش کی۔

''ٹھیک ہے۔ اب تانیہ ہی تجھ سے پوچھے گی۔ ایسا کرو، تم لوگ میرے کمرے میں چلو۔'' جاوید نے کہا۔

وہ تینوں اٹھ کر جاوید کے کمرے میں آ گئے۔ جاوید نے ملازم سے چائے کے لیے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔

ملازم چائے لے کر آیا تو جاوید بولا۔ ''مجھے ذرا مارکیٹ تک جانا ہے۔ میں ابھی دس پندرہ منٹ میں آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ وہاں سے نکل گیا۔

تانیہ اور مراد دونوں سمجھ رہے تھے کہ جاوید انہیں کھل کر بات کرنے کا موقع دینا چاہتا ہے ورنہ اس وقت مارکیٹ جانے کا کیا سوال؟

''اب کچھ بولو گے بھی یا یونہی خاموش بیٹھے دیواروں کو تکتے رہو گے؟'' جاوید کے جانے کے بعد تانیہ نے پوچھا۔ ''کیا بابا سائیں نے اس رشتے سے انکار کر دیا؟''

''ہاں تانیہ!'' مراد نے افسردگی سے کہا۔ ''میں نے تو بہت کوشش کی لیکن بابا سائیں کسی بھی طرح راضی نہیں ہو رہے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ کیا کروں؟''

''تم کچھ مت کرو۔'' تانیہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''جا کر اپنی جاگیر سنبھالو... اپنی زمین میں مزید اضافہ کرو، عیش کرو اور تم کر بھی کیا سکتے ہو؟''

''مجھ پر طنز مت کرو تانیہ!'' مراد نے کہا۔ ''جب میں نے تم سے کہہ دیا کہ میں شادی صرف اور صرف تم سے کروں گا تو پھر کروں گا۔ میں نے تم سے وعدہ کیا ہے تو اسے نبھاؤں

www.pkdigest.com

گا بھی۔"

"لیکن کیسے؟" تانیہ نے پوچھا۔ "کیا تم میں اتنی جرأت ہے کہ تم اپنے بابا سائیں کے مزاج کے خلاف کوئی بات کرسکو؟"

"مجھ میں تو جرأت ہے۔" مراد نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "کیا تم میں بھی جرأت ہے؟ کیا تمہارے بابا میرا رشتہ قبول کرلیں گے؟ بابا سائیں اس شادی میں شریک ہوں یا نہ ہوں... یہ شادی تو ہوگی۔"

"میرے پاپا اور امی سب سے پہلا سوال یہی کریں گے کہ لڑکے کے والدین اور دوسرے رشتے دار شادی میں شریک کیوں نہیں ہیں۔"

"وہ کیا سوال کریں گے اور تم کیا جواب دو گی، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ مجھے صرف اتنا بتاؤ کہ میں تمہارے گھر رشتہ لے کر کب آؤں؟"

"کیا تم واقعی سنجیدہ ہو؟"

"کیا تم اب تک میری محبت کو مذاق سمجھ رہی تھیں؟" مراد نے ناگواری سے کہا۔

"میرا مطلب یہ ہے کہ کیا تم واقعی بابا سائیں کی مرضی کے بغیر شادی کرنے کو تیار ہو؟"

"میں اتنی دیر سے کیا کہہ رہا ہوں؟" مراد نے کہا۔

"ٹھیک ہے، پھر میں بھی آج امی اور پاپا سے دوٹوک بات کروں گی۔" تانیہ نے بھی فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"اور اگر وہ نہ مانے؟" مراد نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"ہمیشہ تصویر کا روشن پہلو دیکھا کرو۔" تانیہ نے کہا۔ "وہ نہ مانے تو پھر کچھ اور سوچیں گے۔ میں بھی تم سے جدا ہوکر زندہ نہ رہ سکوں گی مراد!" تانیہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"اچھا ڈائیلاگ ہے۔" مراد نے ہنس کر کہا۔ "کس فلم کا ہے؟"

تانیہ نے بیڈ پر سے تکیہ اٹھا کر اسے کھینچ مارا۔

مراد بے اختیار ہنسنے لگا۔ تانیہ بھی مسکرانے لگی۔

"میرا یہی مقصد تھا کہ تم رونے بسورنے کے بجائے مسکراؤ۔"

دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر جاوید اندر آگیا۔ اس نے استفسار طلب نظروں سے تانیہ اور مراد کی طرف دیکھا۔ تانیہ نے اسے بتادیا کہ مراد کے بابا سائیں راضی نہیں ہوئے ہیں۔ پھر تانیہ نے اسے تفصیل سے سب کچھ بتادیا۔

"مسئلہ خاصا ٹیڑھا ہے۔" جاوید نے کہا۔ "پہلی بات تو یہ کہ مراد کا رشتہ لے کر جائے گا کون؟"

"یہ بعد میں سوچیں گے۔" مراد نے کہا۔ "ابھی تو تانیہ اپنے والدین سے بات کرے گی پھر دیکھیں گے۔"

☆☆☆

"تم ہوش میں تو ہو؟" ماجدہ بیگم نے چیخ کر کہا۔ "یہ کیسی شادی ہوگی جس میں لڑکے کی طرف سے اس کے والدین اور رشتے دار شریک نہ ہوں۔ اور یہ وڈیرے اور جاگیردار عورت کو کھلونا سمجھتے ہیں۔ مراد بھی تو آخر وڈیرا ہی ہے۔ جب اس کا دل بھر جائے گا تو وہ استعمال شدہ ٹشو پیپر کی طرح تمہیں اٹھا کر پھینک دے گا۔"

"امی! مراد ایسا نہیں ہے۔" تانیہ نے کہا۔ "وہ روایتی جاگیرداروں سے بالکل مختلف ہے۔"

"لیکن تانیہ! تمہارے پاپا اس رشتے پر کبھی بھی راضی نہیں ہوں گے۔ مراد لاکھ سلجھا ہوا اور مہذب لڑکا سہی لیکن تمہارے پاپا اس صورت میں تو کبھی راضی نہیں ہوں گے کہ وہ اپنے والدین کی مرضی کے بغیر شادی کرے۔" ماجدہ بیگم نے کہا۔

"تم نے شاید ان وڈیروں اور جاگیرداروں کے بارے میں صرف کتابوں میں پڑھا ہے یا فلموں اور ڈراموں میں دیکھا ہے۔ اپنی انا کی خاطر یہ لوگ کسی کی بھی جان لے سکتے ہیں۔"

"میں نے صرف پڑھا اور سنا نہیں ہے۔" تانیہ نے کہا۔ "بلکہ میں مراد کو گزشتہ دو سال سے جانتی ہوں۔"

"میں جانتی ہوں کہ تمہیں سمجھانا فضول ہے۔" ماجدہ بیگم نے کہا۔ "میں تمہارے پاپا سے بات کروں گی لیکن ان کے ردِعمل کے لیے ذہنی طور پر تیار رہنا کیونکہ وہ بھی تمہارے ہی باپ ہیں۔"

"امی! آپ رہنے دیں۔" تانیہ نے کہا۔ "پاپا سے میں خود ہی بات کرلوں گی۔"

"جو تمہارا دل چاہے کرو۔" ماجدہ بیگم نے جھنجلا کر کہا اور پیر پٹختی ہوئی وہاں سے چلی گئیں۔

☆☆☆

"تم ہوش میں تو ہو؟" بریگیڈیئر اکرام غصے سے بے قابو ہو رہے تھے۔ "تم نے ایسا سوچا بھی کیسے؟ یہ وڈیرے اور جاگیردار دوسروں کو اپنے سے کم تر سمجھتے ہیں۔ ان کے خاندانوں میں تعلیم کا فقدان ہوتا ہے۔ پھر یہ ہر شہری لڑکی کو شوپیس سمجھتے ہیں۔ گاؤں میں ان کی ایک یا دو بیویاں موجود ہوتی ہیں لیکن یہ پڑھی لکھی شہری لڑکیوں سے محض اس لیے شادی کرتے ہیں کہ دنیا والوں کو دکھا سکیں۔ کیا بریگیڈیئر اکرام اتنا گرا پڑا ہے کہ اس کی بیٹی یوں چھپ چھپا کے شادی کرلے۔ نہیں تانیہ... ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔"

"لیکن پاپا..."

"میں تمہاری کوئی بات بھی سننے کو تیار نہیں ہوں تانیہ!" بریگیڈیئر اکرام نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "ہاں، یہ شادی صرف ایک ہی صورت میں ہوسکتی ہے۔" انہوں نے کچھ توقف کیا، پھر بولے۔ "وڈیرا شہباز خود یہاں رشتہ لے کر آئے اور تمہیں باعزت طور پر بیاہ کر لے جائے، اس کے علاوہ کوئی بھی صورت ممکن نہیں ہے۔ اور اب اس موضوع پر بات کرکے میرا وقت ضائع مت کرنا۔" یہ کہہ کر انہوں نے بات ختم کردی۔

تانیہ بوجھل قدموں سے اپنے کمرے میں آگئی۔ وہ عجیب گومگو کی کیفیت میں تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے؟ وہ تھوڑی دیر اضطراب کے عالم میں کمرے ہی میں ٹہلتی رہی، پھر بیڈ پر پڑے سیل فون نکالا لیکن پھر بیزاری سے بیڈ پر پھینک دیا۔

☆☆☆

اچانک تانیہ کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے چونک کر سیل فون اٹھایا۔ اسکرین پر مراد کا نام آرہا تھا۔ وہ سیل فون کان سے لگا کر بولی۔ "ہاں مراد!" اس نے شکستہ لہجے میں پوچھا۔ "بابا سائیں سے بات کی تم نے؟"

"میں نے بابا سائیں سے بات کی تھی لیکن وہ کسی بھی قیمت پر ماننے کو تیار نہیں ہیں۔ تم نے اپنے پاپا سے بات کی؟"

"ہاں، میں نے بھی بات کی تھی۔" تانیہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "پاپا بھی اس رشتے کے شدید مخالف ہیں۔ ان کی یہ شرط ہے کہ تمہارے بابا سائیں خود رشتہ لے کر آئیں۔"

"اب تم ہی بتاؤ تانیہ... کیا ہوسکتا ہے؟" مراد نے تشویشناک لہجے میں پوچھا۔

"یہ تم مجھ سے پوچھ رہے ہو؟" تانیہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "تم نے بہت بڑے بڑے دعوے کیے تھے کہ میں ہر قیمت پر تمہیں اپناؤں گا... بابا سائیں میری پسند سے انکار کر ہی نہیں سکتے۔ کیا ہوئے وہ دعوے؟"

"یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے تانیہ!" مراد نے سنجیدگی سے کہا۔ "اب صرف ایک ہی راستہ ہے... اگر تم راضی ہو تو..."

"اب کون سا راستہ باقی رہ گیا ہے؟"

"ہم کورٹ میرج کرسکتے ہیں۔ بعد میں..."

"نہیں مراد! میں یہ نہیں کرسکتی۔" تانیہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تم چاہتے ہو کہ میں گھر سے بھاگ جاؤں؟"

"اس بندھن کے لیے اتنا گھٹیا لفظ استعمال مت کرو تانیہ!" مراد نے کہا۔ "ہمیں فوری طور پر اس صورتِ حال سے نکلنا ہے۔ بعد میں تو سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔"

"کچھ بھی ٹھیک نہیں ہوگا۔" تانیہ نے مایوسی سے کہا۔ "میرے پاپا اور تمہارے بابا سائیں دونوں ہمارے دشمن ہو جائیں گے۔ میں پاپا کے غصے سے بھی واقف ہوں۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں لیکن اپنی عزت کی خاطر وہ مجھے اور تمہیں دونوں کو اپنے ہاتھوں سے گولیاں مار دیں گے۔ میں پاپا سے بچ گئی تو احتشام بھائی ہمیں نہیں چھوڑیں گے۔"

"بابا سائیں بھی اس معاملے میں بہت حساس ہیں۔ میں نے ان کی مرضی کے خلاف ایک قدم بھی اٹھایا تو وہ بھی مجھے گولیوں سے بھون کر رکھ دیں گے۔ اس وقت وہ بابا سائیں نہیں بلکہ جاگیردار شہباز خان ہوں گے۔"

"اس کے باوجود تم مجھے کورٹ میرج کا مشورہ دے رہے ہو؟" تانیہ نے کہا۔ "نہیں مراد! بہتر یہ ہے کہ مجھے بھول جاؤ۔"

"میں نے بھولنے کے لیے تم سے محبت نہیں کی تھی۔ میری بات غور سے سنو تانیہ!" مراد نے سنجیدگی سے کہا۔ "اگر تم نے میری بات نہ مانی تو کل تمہیں میری موت کی خبر ملے گی۔ میری رگوں میں بھی اسی وڈیرے شہباز خان کا خون ہے اور تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں جو کچھ کہتا ہوں، وہ کرتا بھی ہوں۔"

مراد کے سرد لہجے سے ایک لمحے کو تو تانیہ بھی لرز کر رہ گئی لیکن وہ جواب میں کچھ بھی نہ کہہ سکی۔

"تمہارے پاس سوچنے کے لیے آج کی پوری رات اور کل کا پورا دن ہے۔ اچھی طرح سوچ لو۔ میں کل شام کو جاوید کو تمہارے پاس بھیجوں گا۔ اگر مجھے سات بجے تک تمہارا جواب نہیں ملا تو پھر تمہیں میری موت کی خبر ملے گی۔ میں تمہارے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔" یہ کہہ کر مراد نے سلسلہ منقطع کردیا۔

تانیہ گم صم سی سیل فون ہاتھ میں پکڑے بیٹھی رہ گئی۔ پھر اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی اس کا دل مٹھی میں پکڑ کر زور زور سے بھینچ رہا ہو۔ ایک طرف باپ اور بھائی کی عزت تھی اور دوسری طرف محبت! اسے یقین تھا کہ مراد جیسا ضدی آدمی اپنی جان بھی دے سکتا ہے۔

اس نے شام سے کچھ کھایا بھی نہیں تھا لیکن اسے کھانے پینے کا ہوش بھی نہیں تھا۔

www.pkdigest.com

وہ رات بھر سوچتی رہی اور بستر پر پہلو بدلتی رہی۔ دماغ زیادہ تھک جاتا تو وہ عالم اضطراب میں ٹہلنے لگتی۔

صبح ہوتے ہوتے بالآخر اس نے فیصلہ کرہی لیا کہ وہ مراد کے ساتھ کورٹ میرج کرے گی۔ جب اس کے والدین کو اس کی خوشیوں کا خیال نہیں ہے تو وہ بھی ان کا خیال کیوں کرے؟ مراد بھی تو اپنے باپ کی مخالفت مول لے کر یہ قدم اٹھا رہا تھا۔ اس نے تو زمین، جائداد کسی بھی چیز کی پروا نہیں کی تھی۔ پھر وہ تو اپنی جان بھی دینے پر آمادہ تھا۔

یہ فیصلہ کرنے کے بعد اسے گویا قرار سا آگیا اور وہ لمبی تان کر سوگئی۔

صبح اس کی آنکھ کھلی تو کمرے میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ شاید امی نے اس کے کمرے کے پردے ہٹا دیے تھے۔

وہ شاور لے کر باہر نکلی تو بالکل پُرسکون تھی۔

اسی وقت امی کمرے میں داخل ہوئیں اور بولیں۔

''کیا بات ہے تانی! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں امی! ہاں، رات کو بہت دیر سے نیند آئی تھی اس لیے صبح کو آنکھ نہیں کھلی۔''

''تانیہ! میں نے رات بھی تمہارے پاپا سے بات کی تھی۔ ان کی صرف یہی ضد ہے کہ وہ لوگ خود رشتہ لے کر آئیں۔''

''چھوڑیں امی!'' تانیہ نے بیزاری سے کہا۔ ''وہ لوگ رشتہ لائیں گے، نہ پاپا راضی ہوں گے۔ مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں۔''

''اچھا چلو، ناشتا تو کرلو۔'' ماجدہ بیگم نے کہا۔

''ناشتا کیا، اب میں کھانا ہی کھاؤں گی۔ آپ چلیں میں آرہی ہوں۔''

ماجدہ بیگم کمرے ہی میں تھیں کہ تانیہ کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اسکرین پر جاوید کا نام تھا۔

اس نے سیل فون اٹھالیا اور امی کو سنانے کو کہا۔ ''ہاں رابعہ!... ہاں طبیعت ٹھیک ہے۔''

اسے سیل فون پر بات کرتے دیکھ کر ماجدہ بیگم کمرے سے باہر نکل گئیں۔

جاوید نے کہا۔ ''کیا بات ہے تانیہ! کوئی تمہارے پاس موجود ہے؟''

''ہاں، امی تھیں لیکن اب وہ جاچکی ہیں۔ تم نے کیسے ٹیلی فون کیا؟''

''مراد سے تمہاری بات ہوئی تھی؟''

''ہاں، ہوئی تھی۔'' تانیہ نے کہا۔

''تمہارا جواب 'ہاں' میں ہے یا 'نہیں' میں؟ لیکن جواب دینے سے پہلے اتنا ضرور سوچ لینا کہ انکار کی صورت میں مراد اپنی جان دے دے گا۔''

''میرا... جواب... ہاں، میں ہے جاوید!'' تانیہ نے آہستہ سے کہا۔

''گڈ!'' جاوید نے کہا۔ ''اب تم ایسا کرنا کہ شام کو ساڑھے سات بجے اسی پارک میں پہنچ جانا جو تمہارے گھر کے بالکل نزدیک ہے۔ اور ہاں، اپنی ضرورت کی کچھ چیزیں لاسکو تو لے آنا۔'' یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کردیا۔

☆☆☆

جاوید، مراد کے بنگلے پر پہنچا تو ماحول میں عجیب سی کشیدگی تھی۔ مراد کے سب ملازم اور گارڈ جاوید کو پہچانتے تھے اس لیے کسی نے بھی کوئی تعرض نہیں کیا اور وہ بلا روک ٹوک ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا۔ ڈرائنگ روم میں شہباز خان بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر اضطراب اور غصے کی ملی جلی کیفیت تھی۔

جاوید نے اسے سلام کیا تو وہ سلام کا جواب دے کر بولا۔ ''بابا جاوید! یہ مراد کن چکروں میں پڑگیا ہے؟''

''کیسا چکر بابا سائیں؟'' جاوید نے انجان بن کر پوچھا۔

''اب تم مجھے چکر دینے کی کوشش کررہے ہو؟'' شہباز خان نے اسے گھورا۔ ''یہ اس لڑکی... کیا نام ہے اس کا... ہاں تانیہ... تانیہ کا کیا چکر ہے؟''

''بابا سائیں، چکر کچھ بھی نہیں ہے۔'' جاوید نے سنبھل کر کہا۔ ''مراد اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔ میں صرف اتنا ہی جانتا ہوں۔''

''بابا! اس لڑکی نے تو مراد پر کوئی جادو کردیا ہے۔ زندگی میں پہلی دفعہ مراد نے مجھ سے آنکھ ملا کر بات کی ہے۔ تم اس کے دوست ہو بابا... تم اسے سمجھاؤ کہ تانیہ جیسی لڑکیاں وڈیروں اور جاگیرداروں کو صرف دولت کے لیے پھانستی ہیں۔ تم تو برسوں سے ہمارے گھر میں آرہے ہو۔ تم شاید مراد کے پہلے دوست ہو جو ہمارے گھر کے اندر بھی آتا ہے۔ تم بھی میرے لیے کمال اور مراد کی طرح ہو بیٹا... اسے سمجھاؤ کہ اس شادی کا انجام تباہی اور بربادی ہوگا۔''

''مراد ہے کہاں بابا سائیں؟'' جاوید نے پوچھا۔

''وہ اپنے کمرے میں ہے۔ اس نے رات سے کچھ نہیں کھایا ہے۔ بابا... اسے سمجھاؤ کہ ایک معمولی لڑکی کے لیے اپنے خاندان کی عزت داؤ پر نہ لگائے۔''

''میں اسے سمجھاتا ہوں بابا سائیں۔'' جاوید یہ کہہ کر مراد کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

مراد بیڈ پر نیم دراز تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے تھے اور کئی دن کی شیو بڑھی ہونے کی وجہ سے وہ برسوں کا مریض لگ رہا تھا۔ اس کا لباس بھی شکن آلود تھا اور آنکھوں میں عجیب سی ویرانی تھی۔

جاوید کو دیکھتے ہی وہ اٹھ بیٹھا اور بولا۔ ''جاوید! تانیہ سے بات ہوئی؟''

''تم اس سے خود بات کیوں نہیں کرتے؟'' جاوید نے کہا۔ ''اور تم نے یہ حلیہ کیا بنا رکھا ہے؟ پہلے تم اپنا حلیہ درست کرو، کھانا کھاؤ، باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔''

''میں پوچھ رہا ہوں کہ تم نے تانیہ سے بات کی یا نہیں؟'' مراد کے لہجے میں وحشت تھی۔ ''میں نے خود اس سے اس لیے بات نہیں کی کہ اگر اس کا جواب نفی میں ہوا تو میں فوری طور پر اپنی جان دے دوں گا۔'' اس نے تکیے کے نیچے سے ریوالور نکالتے ہوئے کہا۔ ''پھر میں اسے سوچنے کا موقع بھی نہیں دوں گا۔''

''ہاں، تانیہ سے میری بات ہوئی ہے۔'' جاوید نے کہا۔

مراد نے ریوالور نکال کر اسے لوڈ کیا اور بولا۔ ''کیا جواب دیا اس نے؟''

''او بھائی! اس ریوالور کو تو ہٹاؤ، کیا تم مجھے شوٹ کروگے؟''

''میں پوچھ رہا ہوں کہ اس نے کیا جواب دیا؟'' مراد چیخ کے بولا۔

جاوید نے حیرت سے اسے دیکھا اور بولا۔ ''ارے یار اب یہ ڈراما ختم کرو، وہ تمہاری بات ماننے کو تیار ہے۔''

''کیا؟'' مراد نے بے یقینی سے پوچھا۔ ''کیا وہ...''

''ہاں، وہ بھی تم سے اتنی ہی محبت کرتی ہے۔'' جاوید نے کہا۔ ''میں جانتا ہوں کہ تم دونوں کے درمیان بعد میں مجھے ہی پھنسنا پڑے گا لیکن دوست کے لیے یہ بھی گوارا ہے۔ اب تم جلدی سے اپنا حلیہ درست کرو، کھانا کھاؤ۔ میں نے بابا سائیں سے وعدہ کیا ہے کہ تمہیں کھانا کھلائے بغیر نہیں

نسیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

آخری معرکہ 350/-
اندھیری رات کے مسافر 325/-
ثقافت کی تلاش 150/-
قیصر و کسریٰ 380/-

اور تلوار ٹوٹ گئی 350/-
گمشدہ قافلے 350/-
داستان مجاہد 200/-
پردیسی درخت 325/-
یوسف بن تاشفین 325/-

معظم علی 325/-
خاک اور خون 350/-
کلیسا اور آگ 300/-
قافلہ حجاز 350/-
محمد بن قاسم 300/-
پورس کے ہاتھی 180/-

انسان اور دیوتا 280/-
پاکستان سے دیارِ حرم تک 160/-
آخری چٹان 325/-
سو سال بعد 150/-
سفید جزیرہ 225/-
شاہین 325/-

Buy online:
www.anarkalimall.com
www.jbdpress.com

جہانگیر بک ڈپو
061-4781781
022-2780128
051-35539609
021-2765086
042-37220879
041-2627568

جاؤں گا۔"

"وہ سب میں کروں گا۔ تم یہ بتاؤ کہ تانیہ سے کہاں ملاقات ہوگی؟"

"تانیہ شام ساڑھے سات بجے کے بعد میرے پاس آئے گی۔ تم سیل فون پر مجھ سے رابطہ کر لینا، پھر تم جہاں کہو گے، میں اسے وہاں پہنچا دوں گا۔ اب جلدی کرو۔ میں بابا سائیں کے پاس بیٹھا ہوں، تم بھی تیار ہو کر وہیں آجاؤ۔" یہ کہہ کر جاوید کمرے سے باہر نکل گیا۔

وہ ڈرائنگ روم میں پہنچا تو وڈیرا شہباز اپنے کمدار کو سندھی میں کچھ سمجھا رہا تھا۔

جاوید کو دیکھ کر وہ خاموش ہو گیا اور بولا۔ "ہاں بابا! کیا حال ہے تمہارے دوست کا؟"

"بابا سائیں! میں نے اسے سمجھایا تو ہے۔ وہ ابھی کپڑے بدل کر تھوڑی دیر میں نیچے آرہا ہے، آپ اس کے لیے کھانا منگوائیں۔"

شہباز خان کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ وہ خوش ہو کر بولا۔ "بابا دوست ہو تو ایسا۔" پھر وہ بلند آواز میں بولا۔ "اڑے پریل! بابا کھانا لگواؤ، چھوٹا سائیں کل سے بھوکا ہے۔ میں نے بھی کل سے کھانا نہیں کھایا ہے۔" پھر وہ جاوید سے بولا۔ "جاوید بیٹا! تم بھی ہمارے ساتھ کھانا کھا کر جانا۔"

"بابا سائیں! میں نے تو ابھی تھوڑی دیر پہلے کھانا کھایا ہے۔ آپ مراد کو کھانا کھلائیں، میں شام کو پھر چکر لگاؤں گا۔ آپ پریشان نہ ہوں، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

"اللہ سائیں تجھے خوش رکھے بیٹا!"

اسی وقت مراد وہاں آگیا۔ وہ پہلے کی طرح نکھرا نکھرا نظر آرہا تھا۔ جسم پر بہترین تراش کا سوٹ تھا اور اس نے اپنا مخصوص پرفیوم بھی لگا رکھا تھا۔

شہباز خان اسے دیکھ کر خوش ہو گیا اور بولا۔ "مراد بیٹا! تو جب خوش ہوتا ہے تو پورا ماحول خوش گوار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح خوش رہا کر۔"

"مراد! میں چلتا ہوں۔" جاوید نے کہا۔ "مجھے ابھی ایک دو بہت ضروری کام نمٹانا ہیں۔ اب تم سے شام کو ملاقات ہوگی۔" یہ کہہ کر اس نے معنی خیز انداز میں مراد کو دیکھا اور باہر کی طرف چل دیا۔

☆☆☆

شام کے چھ بج چکے تھے۔ تانیہ نے ایک بیگ میں اپنے دو تین جوڑے اور ضرورت کی دوسری چیزیں رکھ لی تھیں۔ اس نے اپنے زیورات، نقدی، چیک بک اور اے ٹی ایم کارڈ اپنے شولڈر بیگ میں رکھے تھے۔ ممکن ہے اسے کپڑوں کا بیگ لے جانے کا موقع ہی نہ ملتا۔

اس نے جانے سے پہلے گھر کا ایک چکر لگایا۔ پاپا اس وقت گھر میں نہیں تھے۔ امی کی ایک دوست مسز قریشی آگئی تھیں۔ امی ان کے ساتھ ڈرائنگ روم میں مصروف تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ مسز قریشی دو گھنٹے سے پہلے امی کی جان نہیں چھوڑیں گی۔

اسے خطرہ صرف چوکیدار سے تھا۔ وہ اسے بیگ سمیت دیکھ لیتا تو فوراً گھر میں اطلاع دے دیتا۔ اس کا حل بھی اس کی سمجھ میں آگیا۔

پونے سات بجے کے قریب اس نے اپنا شولڈر بیگ کندھے سے لٹکایا، کپڑوں کا بیگ اٹھایا اور دبے پاؤں کوریڈور میں نکل آئی۔ کوئی ملازمہ کچن میں مصروف تھی۔ تانیہ بھیگتی ہوئی لان میں آئی اور بنگلے کی پشت پر جا کر اس نے کپڑوں کا بیگ باہر اچھال دیا۔ پچھلی گلی عموماً سنسان ہی رہتی تھی۔ پھر وہ بہت پُرسکون انداز میں گیٹ کی طرف بڑھی۔ چوکیدار نے اسے سلام کیا۔ وہ اس کے سلام کا جواب دیتی ہوئی باہر نکل گئی۔ گھر سے باہر نکل کر اس نے اپنے بنگلے پر حسرت بھری نظر ڈالی۔ نہ جانے اب یہ در و بام دوبارہ دیکھنا اس کے مقدر میں تھا بھی یا نہیں؟ اس کا دل بھر آیا اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔

اگر اسی وقت جاوید کا ٹیلی فون نہ آجاتا تو شاید وہ جذباتی ہو کر واپس گھر میں چلی جاتی۔

جاوید پوچھ رہا تھا۔ "تانیہ! تم کہاں ہو؟"

"میں بس دس منٹ میں پہنچ رہی ہوں۔" وہ جانتی تھی کہ اس کے گھر سے پارک کا فاصلہ محض دس منٹ کا ہے۔

عقبی گلی میں جا کر اس نے اپنا بیگ اٹھایا اور تیزی سے پارک کی طرف روانہ ہو گئی۔

☆☆☆

کھانے سے فارغ ہو کر مراد اور شہباز خان ڈرائنگ روم میں آبیٹھے۔ شہباز خان نے خوش گوار موڈ میں پوچھا۔ "ہاں بابا! پھر مریم کے باپ کو "ہاں" میں جواب دے دوں؟"

"مریم کے باپ کو؟" مراد نے کھوئے کھوئے لہجے میں پوچھا۔ اس نے شہباز خان کا جملہ سنا ہی نہیں تھا۔

"اڑے بابا! تیرا دھیان کدھر ہے؟" شہباز خان ناگواری سے بولا۔ "میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ تجھے مریم کا رشتہ قبول ہے؟"

مراد بھنا کر کھڑا ہو گیا ہے۔ "بابا سائیں! میں آپ کو کیسے بتاؤں کہ میں تانیہ کے سوا کسی سے شادی نہیں کر سکتا۔"

"میں تجھے اپنی جائداد سے عاق کر دوں گا مراد! تجھے

ایک پیسا بھی نہیں دوں گا۔"

"مجھے آپ کی دولت اور جائداد نہیں چاہیے، بابا سائیں!" مراد اچانک اس کے قدموں میں گر گیا۔ "بابا سائیں! میں نے زندگی میں پہلی دفعہ آپ سے کچھ مانگا ہے۔ پلیز! مجھے مایوس مت کریں۔"

"اٹھ جا مراد!" شہباز خان گرج کر بولا۔ "شہر آکر تو تجھ میں وڈیروں اور جاگیرداروں والی کوئی بات ہی نہیں رہی ہے۔ ہمارے قدموں میں بڑے بڑوں نے سر جھکایا ہے۔ اب کیا ہمیں بھی تیری طرح اس دو ٹکے کے سرکاری ملازم کے سامنے سر جھکانا پڑے گا۔ اور اب تمہاری اتنی جرأت ہو گئی ہے کہ تم میرے سامنے، وڈیرے شہباز خان کے سامنے نظریں اٹھا کر اونچی آواز میں بات کرو۔ تو جانتا ہے کہ مریم کے باپ کی زمین کتنی ہے؟ بیس ہزار ایکڑ... اور وہ سب کی سب آباد ہے اور مریم کے باپ جاگیردار لمان بھی کی آمدنی کروڑوں روپے سالانہ ہے۔ مریم اس کی اکلوتی بیٹی ہے اور ساری جائداد بھی تیری ہوگی۔"

"بابا سائیں! میں زمین سے نہیں بلکہ کسی انسان سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ کسی ہنستی بولتی، پڑھی لکھی اور مہذب لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ کیا زمین اور جائداد ہمارے پاس کم ہے؟ آپ کو زمین کی اتنی ہی ضرورت ہے تو آپ مریم کی شادی کمال کے ساتھ کر دیں۔"

"مراد!" شہباز خان گرج کر بولا۔ اس کی اس گرج دار آواز سے حویلی کے اچھے اچھے جی دار ملازمین کا دل بیٹھ جاتا تھا۔ کمرے کے باہر کھڑے ہوئے ملازمین اور شہباز خان کے گارڈز بھی سہم سے گئے۔ "تو اس دو ٹکے کے افسر کی بیٹی سے شادی کرے گا؟"

"وہ دو ٹکے کا افسر پاکستان آرمی میں بریگیڈیئر تھا۔ اس کی آج بھی اتنی عزت ہے کہ اس سے دس گنا دولت مند ہونے کے باوجود آپ کی وہ عزت نہیں ہے۔"

وڈیرے شہباز کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا اور اس نے مراد کے منہ پر زناٹے دار تھپڑ رسید کر دیا۔ "میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ تیری شادی مریم کے ساتھ ہوگی۔"

"تو پھر میرا فیصلہ بھی سن لیں بابا سائیں..." مراد نے اپنے ہونٹوں سے بہتے ہوئے خون کو ہتھیلی کی پشت سے صاف کرتے ہوئے کہا۔ "میں اس جاہل گنوار مریم سے کسی بھی قیمت پر شادی نہیں کروں گا۔ وہ کروڑوں، اربوں روپے کی جائداد کی وارث ہے تو ہوا کرے، میں..."

"بس!" شہباز خان نے گرج کر کہا۔ "تو آج ہی میرے ساتھ گوٹھ جائے گا اور جب تک تیری شادی نہیں ہو جاتی، تو کہیں نہیں جائے گا۔"

"بابا سائیں! آپ مجھے... اپنے بیٹے کو بھی اپنے باریوں کی طرح قیدی رکھیں گے؟"

"میرا کوئی باری ایسی حرکت کرتا تو وہ دوسرا سانس لینے کے قابل بھی نہیں ہوتا۔ ہاں، میں تجھے اس وقت تک قید رکھوں گا جب تک تیری شادی مریم سے نہیں ہو جاتی۔"

"بابا سائیں! میں..."

وڈیرے شہباز نے اس کی بات سنے بغیر ملازم کو آواز دی۔ "پریل!"

"جی سائیں۔" پریل چراغ کے جن کی طرح فوراً حاضر ہو گیا۔

اس کے شانے سے کلاشنکوف لٹکی ہوئی تھی۔ وہ گہرے رنگ کے ڈھیلے ڈھالے شلوار قمیص میں ملبوس تھا۔ چہرے پر اتنی گھنی مونچھیں تھیں کہ اوپر کا ہونٹ چھپ کر رہ گیا تھا۔ وہ خاصا لمبا تڑنگا اور مضبوط جسامت کا آدمی تھا اور شاید وہ چرس کا نشہ کرتا تھا کیونکہ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

"بابا... گوٹھ چلنے کی تیاری کرو۔ ہم ابھی آدھے گھنٹے

Monthly Digest
SUSPENSE
سسپنس
SARGUZASHT
سرگزشت
PAKEEZA
پاکیزہ
JASOOSI
جاسوسی
مکتبہ اعلا و سہلا
Sole Distributor
ویلکم بک شاپ
WELCOME BOOK SHOP
P.O.Box 27869
Karama,Dubai
Tel: 04-3961016
Fax: 04-3961015
Mobile: 050-6245817
E-mail: welbooks@emirates.net.ae
JD Group of Publications

www.pkdigest.com

میں یہاں سے نکلیں گے۔"

"حاضر سائیں۔" پریل نے اپنے چوڑے چکلے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا اور جانے کے لیے مڑا۔

"ٹھہرو پریل!" مراد نے کہا۔ "تم لوگوں کے ساتھ میں نہیں جا رہا ہوں۔ میرے سامان کو ہاتھ بھی مت لگانا۔"

"تجھ سے جو کہا ہے وہ کر پریل!" شہباز خان نے اسے بُری طرح جھڑک دیا۔

"میں گوٹھ نہیں جاؤں گا بابا سائیں!" مراد نے فیصلہ کُن لہجے میں کہا۔ "میں جا رہا ہوں۔"

"تو میرے حکم کے بغیر ہل بھی نہیں سکتا۔" شہباز خان نے چیخ کر کہا۔ "محرم خان... رمضان! مراد یہاں سے جانے نہ پائے۔ اس کی تلاشی لو اور اس کا ریوالور لے لو۔"

محرم خان بھی خاصا مضبوط اور قد آور نوجوان تھا۔ اس کی کمر پر دو ہولسٹر لگے ہوئے تھے۔

وہ جونہی نزدیک آیا، مراد نے جھپٹ کر اس کے ہولسٹر میں سے دونوں ریوالور نکال لیے اور پلٹ کر پھرتی سے ایک ریوالور کی نال شہباز خان کی کنپٹی پر رکھ دی۔ "کسی نے بھی اپنی جگہ سے حرکت کی تو میں گولی چلا دوں گا۔"

شہباز خان کے ملازم اور گارڈز حیرت سے منہ پھاڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

"دیکھ کیا رہے ہو؟" مراد خان چیخا۔ "اپنے ہتھیار پھینکو۔"

ان سب نے مشینی انداز میں اپنے ہتھیار پھینک دیے۔

مراد نے وڈیرے شہباز خان کو دروازے کی طرف چلنے کو کہا۔

شہباز خان چیخ کر بولا۔ "مراد! تُو نے... تُو نے مجھ پر ہتھیار اٹھایا... اپنے باپ پر... وہ دو ٹکے کی لڑکی تیرے لیے اتنی اہم ہے کہ... تُو... اپنے باپ پر ہتھیار بھی اٹھا سکتا ہے... آج کے بعد تو میرے لیے اور میں تیرے لیے مر گیا۔ اور دیکھ... مجھے زندہ مت چھوڑنا ورنہ بہت پچھتائے گا۔"

مراد نے سب گارڈز کو دیوار کی طرف منہ کرنے کو کہا اور دروازے کے پاس پہنچ کر اس نے وڈیرے شہباز کو اچانک اندر کی طرف دھکیل کر پھرتی سے دروازہ باہر سے بند کر دیا۔

باہر وڈیرے کی دو گاڑیاں موجود تھیں۔ تیسری گاڑی مراد کی تھی۔

مراد دوڑتا ہوا پورچ میں پہنچا تو وڈیرے کا ڈرائیور رمضان گھبرا کر باہر نکل آیا اور بولا۔ "سائیں! خیر تو ہے؟ مجھ سے کوئی خطا ہو گئی ہے؟"

مراد کے پاس وقت بہت کم تھا۔ اس نے وہاں کھڑی ہوئی دونوں گاڑیوں کے چاروں ٹائر فائر کر کے پھاڑ دیے اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر تیز رفتاری کے ساتھ وہاں سے نکل گیا۔

مین روڈ پر آنے کے بعد اس نے سیل فون جیب سے نکالا اور جاوید کا نمبر ملانے کے بعد بولا۔ "جاوید! تم لوگ کہاں ہو؟"

"ہم لوگ گزشتہ دس منٹ سے اسی پارک کے اردگرد گھوم رہے ہیں۔ ایک جگہ کھڑے ہونے میں بھی خطرہ ہے۔"

"تم پارک کے مین گیٹ پر پہنچو۔ میں وہاں پہنچ گیا ہوں۔" مراد نے گاڑی مین گیٹ پر روکتے ہوئے کہا۔

دوسرے ہی لمحے جاوید بھی وہاں آ گیا۔

"جاوید! تم فوری طور پر اپنی گاڑی یہیں چھوڑ دو اور میری گاڑی میں آ جاؤ۔ بعد میں ہم کسی جگہ یہ گاڑی بھی چھوڑ دیں گے کیونکہ اس گاڑی کی وجہ سے بھی ہم پکڑے جا سکتے ہیں۔"

"آخر ہوا کیا ہے؟" جاوید نے پوچھا۔

"یار لمبی کہانی ہے۔" مراد نے کہا۔ وہ تانیہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "ہمیں تو اب اپنی کہانی کا آغاز کرنا ہے۔" اور تانیہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔

"ابے یار! اس کا مطلب ہے کہ تو نے مجھے اسی لیے ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھایا ہے۔"

"یار جاوید!" مراد سنجیدہ ہو کر بولا۔ "تیرے پاس کوئی ایسا ٹھکانا ہے جو کسی کے بھی علم میں نہ ہو۔ نہ تیرے کسی جاننے والے کے... نہ میرے ڈیڈی کے؟"

"ہاں، ایسا ایک ٹھکانا ہے تو۔"

جاوید نے کہا۔ "گلستانِ جوہر میں ایک زیرِ تعمیر کمپلیکس ہے۔ وہاں میرے ایک کزن نے فلیٹ بک کرایا تھا۔ وہ گزشتہ ہفتے امریکا چلا گیا ہے اور اس فلیٹ کے کاغذات اور چابیاں میرے حوالے کر گیا ہے کہ مناسب گاہک دیکھ کر میں اس کا سودا کر دوں۔ ویسے بھی وہ کمپلیکس ابھی آباد نہیں ہوا ہے۔ وہاں گنتی کے چند فلیٹ ہی آباد ہیں۔"

"تو پھر ہمیں وہیں لے چلو۔ ہم کچھ دن تک شہر سے باہر نکلنے کا رسک نہیں لے سکتے۔ بابا سائیں نہ صرف سڑکوں کی ناکا بندی کرا دیں گے بلکہ ریلوے اسٹیشن اور ائرپورٹ پر بھی چیکنگ کا بندوبست کرا دیں گے۔ اس کے علاوہ ان کے آدمی بھی کتوں کی طرح مجھے ڈھونڈ رہے ہوں گے۔" پھر اس نے جاوید اور تانیہ کو تفصیل بتائی کہ وہ وہاں سے فرار کیسے ہوا ہے۔

"تم نے... تم نے اپنے بابا سائیں... پر ہتھیار اٹھا لیا؟" تانیہ کے لہجے میں وحشت تھی۔

"جب کوئی انسان خود اپنی جان دینے کا فیصلہ کر لے تو

اس کے لیے کچھ بھی کرنا مشکل نہیں ہوتا۔"

نرسری کے ایک پارکنگ لاٹ میں جاوید نے مراد کی گاڑی پارک کر دی۔ وہاں سے وہ لوگ ٹیکسی کے ذریعے روانہ ہوئے۔ راستے میں ایک دکان دیکھ کر جاوید نے ایک میٹریس، چادر، منرل واٹر کا ایک کین اور کھانے کی بہت سی چیزوں کے ساتھ موم بتی کا ایک بنڈل بھی خرید لیا۔

"سوری یار!" جاوید نے کہا۔ "اس فلیٹ کا قبضہ ابھی ملا ہے اس لیے وہاں ضرورت کی کوئی بھی چیز نہیں ہے۔ تم لوگوں کو کچھ تکلیف تو ہو گی لیکن اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔"

مراد نے ہنستے ہوئے اس کی پیٹھ پر ایک دھپ لگا دی۔

☆☆☆

نوتعمیر فلیٹ کا وہ کمرا اس وقت ایسا نہیں تھا کہ وہاں قیام کیا جائے۔ در و دیوار پر رنگ و روغن تو نیا تھا لیکن فرش پر رنگ کے دھبے اور جگہ جگہ سوکھے ہوئے بجری اور سیمنٹ کے ڈھیر تھے۔ دروازے بھی نئے تھے لیکن گرد میں اٹے ہوئے تھے۔

جاوید کہیں سے ایک بیلچہ اور جھاڑو لے آیا اور آدھے گھنٹے میں ان لوگوں نے اس کمرے کو اس قابل بنا دیا کہ وہاں بیٹھا جا سکے۔ فرش پر میٹریس اور چادر بچھانے کے بعد تانیہ اس پر بیٹھ گئی۔

جاوید نے ان لوگوں سے کہا۔ "میں اب چلتا ہوں کیونکہ تمہارے بابا سائیں اور تانیہ کے پاپا سب سے پہلے مجھ سے ہی رابطہ کریں گے۔"

اسی وقت جاوید کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے اسکرین پر نظر دوڑائی۔ پھر بولا۔ "تمہارے بابا سائیں کی کال ہے۔ اب ذرا خاموش رہنا۔" یہ کہہ کر اس نے کال موصول کر لی۔ "جی بابا سائیں! السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔" بابا سائیں کا لہجہ اکھڑا ہوا تھا۔ "بابا، یہ مراد تمہارے گھر تو نہیں آیا ہے؟"

"مراد؟ نہیں بابا سائیں۔" جاوید نے کہا۔ "میں ابھی کچھ دیر پہلے تو وہاں سے آیا ہوں۔ خیریت تو ہے بابا سائیں؟ آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں؟"

"خیریت نہیں ہے بیٹا!" بابا سائیں نے کہا۔ "مراد گھر سے کہیں چلا گیا ہے۔ تمہیں ضرور معلوم ہو گا کہ وہ کہاں گیا ہے۔"

"میں کیا بتا سکتا ہوں بابا سائیں؟" جاوید نے کہا۔ "کسی دوست کے پاس چلا گیا ہو گا۔ وہ بچہ تو نہیں ہے کہ..."

"دیکھو جاوید! مجھ سے جھوٹ مت بولو۔" بابا سائیں کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "سچ سچ بتا دو کہ مراد کہاں ہے؟ صرف تم ہی

ڈارلنگ! پارٹی بہت اچھی رہی لیکن رات بھر مجھے گھر کی..... یعنی تمہاری یاد ستاتی رہی

جانتے ہو کہ وہ کہاں جا سکتا ہے۔"

"میں نے بتایا نا بابا سائیں کہ..."

"مجھے نہیں بتاؤ گے تو پولیس پوچھے گی۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ مراد کہیں چلا جائے اور تمہیں معلوم نہ ہو۔" یہ کہہ کر بابا سائیں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

"ابے یار! مروا دیا نا..." جاوید نے کہا۔ "اب تیرے بابا سائیں مجھ پر کتے چھوڑ دیں گے۔ ان سے بچا تو پولیس کی چھترول۔"

"ارے مرد بن یار!" مراد نے ہنس کر کہا۔ "اب بابا سائیں ایسے بھی نہیں ہیں۔"

"ہاں، تو نے جو سلوک ان کے ساتھ کیا ہے اس کے بعد وہ مجھ پر کیا، تجھ پر بھی کتے چھوڑ دیں گے۔ میں تو یار..."

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا کیونکہ سیل فون کی گھنٹی ایک بار پھر بجنے لگی تھی۔

جاوید نے سیل فون کی اسکرین پر نظر ڈالی اور بولا۔ "لیجیے، یہ دوسری مصیبت! تانیہ کے پاپا کی کال ہے۔" پھر اس نے سیل فون کان سے لگا لیا اور بولا۔ "السلام علیکم انکل!"

"وعلیکم السلام!" بریگیڈیئر صاحب پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولے۔ "تانیہ کہاں ہے؟"

"تانیہ؟" جاوید نے انجان بن کر پوچھا۔ "میری تو اس سے کل صبح ملاقات ہوئی تھی انکل! خیریت تو ہے؟"

"زیادہ بھولے مت بنو جاوید!" اکرام صاحب نے اسے جھڑک دیا۔ "تانیہ گھر سے چلی گئی ہے۔ وہ ایک پرچہ لکھ

www.pkdigest.com

کر چھوڑ گئی ہے کہ میں مراد کے ساتھ جا رہی ہوں۔ مجھے ڈھونڈنے کی کوشش مت کیجیے گا۔"

"میں ابھی مراد کو کال کرتا ہوں اور اس سے..."

"اس حرامزادے کا سیل فون بند ہے۔ تانیہ نے بھی اپنا فون بند کر رکھا ہے۔ تم بتاؤ کہ مراد اس وقت کہاں ہے؟"

"انکل! مراد اپنے گھر کے علاوہ اور کہاں ہو سکتا ہے۔ دو ڈھائی گھنٹے پہلے اس سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ وہ اپنے بنگلے ہی پر تھا۔"

"دیکھو جاوید! مجھے سچ سچ بتا دو کہ وہ دونوں اس وقت کہاں ہیں؟" بریگیڈیئر صاحب بپھر کر بولے۔ "مجھے نہیں بتاؤ گے تو پولیس خود ہی تم سے معلوم کر لے گی۔ میں نہیں چاہتا کہ پولیس ہم پر تھرڈ ڈگری استعمال کرے۔"

"انکل! اگر آپ کو یقین نہیں ہے تو یہی کر کے دیکھ لیں۔" جاوید نے کہا۔ "آپ آرمی کے اتنے سینئر آفیسر رہے ہیں اور آپ سچ اور جھوٹ نہیں پرکھ سکتے؟"

بریگیڈیئر اکرام نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

جاوید اپنا سر پکڑ کر میز پر بیٹھ گیا اور بولا۔ "تمہاری دوستی تو مجھے بہت مہنگی پڑ رہی ہے مراد! میں تمہارے بابا سائیں اور تانیہ کے پاپا کے درمیان سینڈوچ بن جاؤں گا بلکہ سینڈوچ کیا، میں تو چکی کے ان دو پاٹوں کے درمیان پس کر رہ جاؤں گا۔ میرے خیال میں اب میں بھی چلوں۔ اب تک تم دونوں کے گھروں سے میرے گھر ٹیلی فون آ چکا ہوگا اور میری تلاش شروع ہو چکی ہوگی۔" اس نے جیب سے سیل فون نکالا اور کسی کا نمبر ڈائل کرنے کے بعد بولا۔ "ہاں راشد، میں جاوید بول رہا ہوں۔ یار! میں ایک مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ تفصیل تجھے بعد میں بتاؤں گا۔ بس یہ سمجھ لے کہ میں شام کو تقریباً ساڑھے پانچ بجے سے اب تک تیرے ہی ساتھ ہوں۔ اس وقت سوا دس بجے ہیں۔ میں اب تیرے پاس سے روانہ ہو رہا ہوں۔ تفصیلی بات ہے یار، بعد میں بتاؤں گا۔" یہ کہہ کر جاوید نے رابطہ منقطع کر دیا۔

"یہ راشد وہی ہے جو کالج میں ہمارا کلاس فیلو تھا اور اب اے ایس پی ہے؟"

"ہاں یار یہ وہی راشد ہے۔ کم سے کم ایسے موقع کے لیے اتنا مضبوط گواہ تو ہونا چاہیے۔" پھر وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "میں اب چلتا ہوں۔ تم لوگ بھولے سے بھی اپنا سیل فون آن مت کرنا۔ پولیس اسے ٹریک بھی کر سکتی ہے۔ کل میں تم دونوں کے لیے دوسرے سم کارڈز لے آؤں گا۔ ہاں، دروازہ اندر سے بند کر لینا اور جب تک میری آواز نہ سنو، دروازہ مت کھولنا۔ ویسے خطرے سے نمٹنے کے لیے تمہارے پاس دو دو ریوالور موجود ہیں۔" یہ کہہ کر جاوید وہاں سے چلا گیا۔

☆☆☆

وہ گھر پہنچا تو بنگلے کے پورچ میں جدید ماڈل کی لینڈ کروزر دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ یہ گاڑی وڈیرے شہباز کی تھی، پھر اس کی نظر سیاہ ہنڈا سوک پر پڑی۔ وہ اس گاڑی کو بھی پہچانتا تھا۔ وہ تانیہ کے والد کی گاڑی تھی۔

اس نے اپنی گاڑی ان گاڑیوں کے پیچھے روکی اور ہمت کر کے ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا۔

ڈرائنگ روم میں حسبِ توقع وڈیرا شہباز اور بریگیڈیئر صاحب دونوں ہی موجود تھے۔ جاوید کے والد اضطراب کے عالم میں ٹہل رہے تھے۔

جاوید کو دیکھتے ہی وہ لپک کر آگے بڑھے اور سخت لہجے میں بولے۔ "یہ میں کیا سن رہا ہوں جاوید؟ بتا، تانیہ اور مراد کہاں ہیں؟"

"میں پہلے بھی انکل اور بابا سائیں کو بتا چکا ہوں کہ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ وہ دونوں کہاں ہیں۔"

"سچ سچ بتا دے کہ وہ دونوں کہاں ہیں؟" وڈیرا شہباز، جاوید کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ "ورنہ مجھے زبان کھلوانا بھی آتی ہے۔"

"شہباز صاحب!" جاوید کے والد سرد لہجے میں بولے۔ "یہ آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں؟"

"سجاد صاحب! میں جب کسی سے محبت کرتا ہوں تو ٹوٹ کر محبت کرتا ہوں اور نفرت کرتا ہوں تو وہ بھی اتنی ہی شدید ہوتی ہے۔ میرے اپنے بیٹے نے مجھ پر ہتھیار اٹھا لیا، وڈیرے شہباز خان پر... جس کے نام کی دہشت سے لوگ لرزتے ہیں۔ پھر یہ جاوید میرے لیے کیا چیز ہے؟"

"ٹھیک ہے بابا سائیں۔" جاوید نے کہا۔ "آپ اگر مجھے پولیس کے حوالے کرنا چاہتے ہیں تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔"

"تم یہ بتاؤ کہ شام سے اب تک تم کہاں تھے؟" اس مرتبہ شہباز خان کے لہجے میں کرختگی قدرے کم تھی۔

"میں شام تک تو آپ کے بنگلے ہی پر تھا۔ وہاں سے میں اپنے ایک دوست راشد کے پاس چلا گیا۔ وہیں مجھے اطلاع ملی کہ مراد اور تانیہ گھر سے غائب ہیں۔"

"اور یہ راشد کون ہے اور کیا کرتا ہے؟"

"راشد اس وقت اے ایس ایسٹ ہے اور میرا کالج کے زمانے کا دوست ہے۔"

"جاوید سے تو پوچھ گچھ بعد میں کیجیے گا، مجھے چوبیس گھنٹے کے اندر اندر تانیہ چاہیے۔" بریگیڈیئر اکرام نے بپھر کر کہا۔

"آرام سے بات کریں بریگیڈیئر صاحب۔" شہباز خان نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "یہ آپ کی رجمنٹ نہیں ہے جہاں آپ اونچی آواز میں بات کریں گے۔ میں بھی تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے اپنا بیٹا چاہیے جسے آپ کی بیٹی ورغلا کر کہیں لے گئی ہے۔"

"شہباز خان!" اکرام صاحب گرج کر بولے۔

اسی وقت شہباز خان کے گارڈز نے اپنی رائفلیں شانوں سے اتار لیں۔ بریگیڈیئر صاحب کے ساتھ آنے والے سیکیورٹی گارڈز بھی ہتھیار لے کر الرٹ ہو گئے۔

"ایک بات کان کھول کر سن لیں بریگیڈیئر صاحب!" شہباز خان نے تلخ لہجے میں کہا۔ "وہ دونوں مجھے کہیں مل گئے تو میں ان دونوں کو اپنے ہاتھوں سے گولی ماروں گا۔"

"میری بھی ایک بات ذہن میں بٹھا لیں۔" اکرام صاحب نے کہا۔ "میں بھی ان دونوں میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

اسی وقت جاوید کے والد سجاد صاحب کو ایک ملازم نے اطلاع دی۔ "پولیس انسپکٹر آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"پولیس!" شہباز خان نے حیرت سے کہا۔ "پولیس یہاں کہاں سے آ گئی؟"

"پولیس کو میں نے بلوایا ہے۔" سجاد صاحب نے تلخ لہجے میں کہا پھر وہ ملازم سے بولے۔ "جاؤ پولیس انسپکٹر کو یہیں بلا لاؤ۔"

"میں اس کیس میں پولیس کی مداخلت نہیں چاہتا تھا۔" شہباز خان نے کہا۔ "لیکن اب آپ نے پولیس کو بلا ہی لیا ہے تو پھر یونہی سہی۔"

پولیس انسپکٹر نے روایتی انداز میں پوچھا۔ "ون فائیو پر کس نے ٹیلی فون کیا تھا؟"

"میں نے ٹیلی فون کیا تھا۔" سجاد صاحب نے کہا۔ "لیکن اب حالات نارمل ہیں۔ مجھے شبہ ہوا تھا کہ میرے گھر میں کوئی کود آیا ہے۔"

"آپ کو میرے ساتھ پولیس اسٹیشن چلنا پڑے گا۔" انسپکٹر نے کہا۔

"بابا، تمہارا ایس ایس پی کون ہے؟" شہباز خان نے رعونت سے پوچھا۔ "اس سے ذرا میری بات کراؤ۔ میں وڈیرا شہباز خان ہوں اور تمہارا ایس ایس پی مجھے اچھی طرح جانتا ہوگا۔ وہ نہ ملے تو ڈی آئی جی یا آئی جی سے بات کرا دو۔ تم میرے دوست کو پولیس اسٹیشن لے جاؤ گے؟"

"سوری سر!" انسپکٹر جلدی سے بولا۔ "یہ محض ضابطے کی کارروائی تھی۔" یہ کہہ کر وہ ایک مرتبہ پھر معذرت کر کے چلا گیا۔

"بریگیڈیئر صاحب!" شہباز خان نے کہا۔ "میں ایک دفعہ پھر آپ کو بتا دوں کہ وہ دونوں مجھے جہاں بھی مل گئے، میں انہیں ختم کر دوں گا۔"

"چاہتا تو میں بھی یہی ہوں۔" اکرام صاحب دانت پیس کر بولے۔ "میں بھی ان دونوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"میرے آدمی پورے شہر میں ان دونوں کو تلاش کر رہے ہیں۔" شہباز خان نے کہا۔

"میں نے بھی شہر سے باہر جانے والے ہر راستے کی ناکا بندی کرا دی ہے۔" اکرام صاحب نے کہا۔ "بس اسٹینڈ، ریلوے اسٹیشن، ائرپورٹ اور کراچی سے نکلنے والے ہر راستے پر اس وقت میرے آدمی پھیلے ہوئے ہیں۔"

"جاوید بیٹا!" شہباز خان نے کہا۔ "مجھے حیرت ہے کہ تجھے نہیں پتا؟"

"بابا سائیں! مجھے اگر معلوم ہوتا تو میں آپ لوگوں سے کیوں چھپاتا؟ مراد نے تو اس سلسلے میں مجھ سے کوئی بات ہی نہیں کی تھی۔ میں تو اسے بہت خوش گوار موڈ میں چھوڑ کر آیا تھا۔ آپ ہی نے تو بتایا تھا کہ یہ سب اچانک ہو گیا۔"

"تم بھی اسے اپنے طور پر تلاش کرو۔" اکرام صاحب نے کہا۔ "تم تو اس کے تمام دوستوں اور ٹھکانوں سے واقف ہو گے۔"

"آپ نہ بھی کہتے تو میں مراد کو ضرور ڈھونڈتا۔ مشکل تو یہ ہے کہ ان دونوں کے سیل فون بھی بند ہیں۔"

☆☆☆

بریگیڈیئر اکرام ماجدہ بیگم پر چیخ رہا تھا۔ "یہ تمہاری ہی ڈھیل کا نتیجہ ہے کہ اس لڑکی نے پورے خاندان کی عزت داؤ پر لگا دی۔ اب احتشام کو بھی تم ہی سنبھالنا۔ تم جانتی ہو کہ وہ غصے کا کتنا تیز ہے۔ مجھے تو ڈر ہے کہ وڈیرے شہباز خان کے آدمیوں سے اس کا تصادم نہ ہو جائے۔"

"میں احتشام کو سمجھانے کی کوشش کروں گی۔" ماجدہ بیگم نے کہا۔

"اس کے باوجود میری یہ بات لکھ رکھو کہ اگر اسے تانیہ اور مراد کہیں نظر آ گئے تو وہ انہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔ بیٹی تو جان سے جائے گی ہی، بیٹے سے بھی ہاتھ دھونا پڑیں گے۔" اکرام نے کہا۔ "اس لڑکی کی وجہ سے رسوائی اور جگ

www.pkdigest.com

ہنسائی تو ہو ہی رہی ہے، اب مزید تباہی آئے گی۔''

''ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں؟'' ماجدہ بیگم نے ہول کر کہا۔ ''احتشام کوئی ناسمجھ بچہ نہیں ہے۔''

''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔'' اکرام نے کہا۔ ''وہ بچہ نہیں ہے بلکہ خوددار اور باغیرت بھائی ہے۔''

''احتشام کل آرہا ہے نا! انشاء اللہ تانیہ اس سے پہلے ہی مل جائے گی۔''

بریگیڈیئر اکرام کے چہرے پر تشویش، فکرمندی، غصے اور صدمے کے ملے جلے تاثرات تھے۔

☆☆☆

تانیہ اور مراد اسی کمرے میں موجود تھے۔ تانیہ بہت پریشان نظر آرہی تھی۔ اس نے مراد سے کہا۔ ''مراد! ہم ایسے چوروں کی طرح کب تک یہاں چھپے رہیں گے؟''

''تھوڑا سا صبر کرلو تانیہ! ہم کراچی میں کورٹ میرج نہیں کر سکتے۔ یہاں تو کورٹ میں جانے کا مطلب یہ ہے کہ خودکشی کرنا۔ باہر نکلتے ہی ہم بابا سائیں یا تمہارے پاپا کی گولیوں کا نشانہ بن جائیں گے۔ تمہیں یاد ہے نا کہ جاوید کیا کہہ رہا تھا؟''

''تو پھر کیا ہم اسی کھنڈر میں موت کا انتظار کرتے رہیں؟ آج کسی وقت احتشام بھائی بھی آجائیں گے اور ہمیں تلاش کرنے کی کوششیں بھی تیز ہو جائیں گی۔ تم جانتے ہو کہ احتشام بھائی ایس ایس جی میں ہیں۔ وہ ہماری تلاش کے لیے ذاتی طور پر ملٹری انٹیلی جنس کی مدد بھی لے سکتے ہیں۔ پھر... پھر کیا ہوگا؟''

مراد بھی فکرمند ہو گیا۔ ''تم ٹھیک کہتی ہو۔'' اس نے کہا۔ ''ملٹری انٹیلی جنس والوں کو سب سے پہلے جاوید پر شبہ ہوگا۔ ان لوگوں نے ایک دفعہ جاوید کو اٹھا لیا تو پھر وہ اگلی پچھلی تمام باتیں اگل دے گا۔''

اسی وقت مراد کے سیل فون کی بیل بجنے لگی۔ جاوید نے رات ہی ان دونوں کو نئے سم کارڈز لا دیے تھے۔ ان کا نمبر صرف جاوید کے پاس تھا۔

مراد نے سیل فون کان سے لگا لیا۔ ''ہاں جاوید!''

''یہاں حالات بہت خراب ہیں۔'' جاوید نے کہا۔ ''تانیہ کے بھائی احتشام نے کراچی کے کور کمانڈر کے ذریعے تانیہ کے اغوا کی رپورٹ درج کرا دی ہے۔ پولیس نے تمہارے بابا سائیں سے بھی پوچھ گچھ کی ہے۔ وہ بہت بپھرے ہوئے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں ان لوگوں میں خون خرابے کی نوبت نہ آجائے۔ باقی میں اب تمہارے پاس نہیں آؤں گا۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ کچھ لوگ میری بھی نگرانی کر رہے ہیں۔''

''تم بھی ہمیں اس نمبر سے کال مت کرو۔ ہو سکتا ہے کہ تمہاری لینڈ لائن اور سیل فون دونوں آبزرویشن پر ہوں۔ ہماری فکر مت کرو۔ ہمیں کوئی پرابلم نہیں ہے۔ اچھا خدا حافظ... اپنا خیال رکھنا اور اب ہمیں نئے نمبر سے کال کرنا۔ اس سے پہلے ایس ایم ایس کے ذریعے بتا دینا کہ یہ تمہارا ہی نمبر ہے ورنہ میں یا تانیہ تمہاری کال موصول نہیں کریں گے۔''

رابطہ منقطع کرنے کے بعد اس نے تانیہ کو بتایا کہ جاوید کیا کہہ رہا تھا۔

''مراد!'' تانیہ نے تشویش ناک لہجے میں کہا۔ ''ہم ان لوگوں سے نہیں چھپ سکتے۔ کب تک چھپے رہیں گے؟ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں گھر واپس چلی جاؤں۔''

''کیا؟'' مراد حیرت سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''تم... تم گھر واپس جاؤ گی؟''

''ہاں مراد! اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے، ضرور جاؤ۔'' مراد نے سنجیدگی سے کہا پھر جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا ریوالور نکال لیا۔

مراد کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر تانیہ بُری طرح چونک اٹھی۔

مراد نے ریوالور اس کی طرف بڑھا دیا اور بولا۔ ''جانے سے پہلے مجھے اپنے ہاتھوں سے گولی مار دینا۔''

تانیہ چند لمحے تک اسے دیکھتی رہی، پھر بُری طرح سسک سسک کر رونے لگی۔ ''میں کیا کروں مراد؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے۔ ہم دونوں کے گھر والے ہمارے دشمن ہو گئے ہیں۔ اس شہر بلکہ اس ملک کی زمین ہم پر تنگ ہو گئی ہے اور اگر یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا تو وہ دونوں آپس میں ٹکرا جائیں گے، پھر... پھر کیا ہوگا مراد؟''

''اب جو بھی ہو۔'' مراد نے کہا۔ ''میں اب پیچھے ہٹنے والا نہیں ہوں۔''

''ہم تو اتنے مجبور ہیں کہ اس کھنڈر سے باہر بھی نہیں نکل سکتے۔ جاوید بھی اب یہاں نہیں آئے گا۔ پانی بھی ختم ہو گیا ہے اور کھانے کا سامان بھی۔''

''تم اس کی فکر مت کرو تانیہ! میں آج رات کو باہر جاؤں گا اور ضرورت کی ہر چیز لے آؤں گا۔''

''نہیں مراد!'' تانیہ نے ہول کر کہا۔ ''باہر موت ہماری گھات میں ہے۔ میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔''

''اگر موت ہی مقدر ہے تانیہ تو وہ تو یہاں بھی

آجائے گی لیکن وہ موت بہت دردناک ہوگی۔ بھوک اور پیاس سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے سے بہتر ہے کہ میں آسان موت کو گلے لگاؤں۔''

''پھر میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔'' تانیہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''مریں گے تو دونوں ساتھ ہی مریں گے۔''

''اچھا اس وقت کھانے پینے کی کیا پوزیشن ہے؟'' مراد نے کہا۔

''کھانے کی ہر چیز ختم ہو گئی ہے، صرف باسی ڈبل روٹی کے کچھ توس اور جیلی کی ایک شیشی ہے۔ پانی اگر احتیاط سے خرچ کیا تو وہ کل صبح تک پورا ہو جائے گا۔''

اسی وقت مراد کے سیل فون کی بیل بجنے لگی۔ وہ جاوید کی کال تھی۔ وہ نئے نمبر سے کال کر رہا تھا۔ اس سے پہلے اس نے ایس ایم ایس کر دیا تھا۔

''ہاں جاوید!'' مراد نے تشویش سے پوچھا۔

''حالات بہت مخدوش ہیں۔'' جاوید نے کہا۔ ''انکل اکرام اور بابا سائیں کے آدمی سائے کی طرح میرے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ ان دونوں ہی کو یقین ہے کہ میں تم دونوں کے موجودہ ٹھکانے سے واقف ہوں۔''

''پھر... کیا ہم... یہیں سسک سسک کر دم توڑ دیں؟''

''ایسی بھی کیا مایوسی؟'' جاوید مسکرا کر بولا۔ ''میں نے راشد سے اس سلسلے میں بات کی تھی... وہ...''

''تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو؟'' مراد نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''راشد کیا اتنا ہی قابل اعتبار ہے؟''

''راشد میرا اسکول کے زمانے کا دوست ہے۔ تم بھی کالج میں اس کے ساتھ پڑھتے ہو۔ تم اس پر بھی اتنا ہی اعتبار کر سکتے ہو جتنا مجھ پر۔ پھر تم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ راشد نے اگر زبان کھولی تو میں بھی تو مارا جاؤں گا۔'' پھر وہ کچھ توقف کے بعد بولا۔ ''اب میری بات غور سے سنو۔ ابھی تھوڑی دیر میں راشد وہاں آئے گا۔ میں نے اسے ایڈریس اچھی طرح سمجھا دیا ہے۔ تمہیں جس چیز کی بھی ضرورت ہو، وہ مجھے لکھوا دو۔ وہ ایک گھنٹے میں تم تک پہنچ جائے گی۔''

''اب تم نے اسے شریک کر ہی لیا ہے تو لکھو۔''

''ہاں، مراد! راشد دروازے پر تین دفعہ دستک دے گا پھر کہے گا، بابا بھوکے کو تین روٹیاں تو کھلا دو۔ یہ گویا ہمارا کوڈ ہے۔ راشد ہی تمہیں شہر سے نکالنے کے انتظامات بھی کر رہا ہے۔ بس اب بے فکر ہو جاؤ۔''

☆☆☆

تانیہ اور مراد میٹرس پر ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر لیٹے ہوئے تھے۔ نقاہت سے ان کا بُرا حال تھا، اوپر سے مچھروں نے ان پر دھاوا بول دیا تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں صرف ایک موم بتی جل رہی تھی۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی لیکن دستک صرف ایک ہی مرتبہ ہوئی تھی اور انداز خاصا غیر مہذب تھا۔

مراد نے پھرتی سے پھونک مار کے موم بتی بجھا دی اور اپنے دونوں ریوالور نکال کر دروازے کے نزدیک دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے تانیہ کو باتھ روم میں جانے کا اشارہ دیا۔ وہ بے آواز قدموں سے باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔

دستک ایک مرتبہ پھر ہوئی اور اس مرتبہ پہلے سے بھی زیادہ زوردار تھی۔ لگتا تھا کہ آنے والا یا تو نشے میں ہے یا پھر پولیس کا آدمی ہے۔

''یہ دروازہ کیوں نہیں کھول رہا ہے؟'' باہر سے ایک کرخت آواز گونجی۔

''کہیں چرس کے نشے میں ٹُن تو نہیں ہو گیا؟'' دوسری آواز سنائی دی۔

اس سے مراد کو اندازہ ہوا کہ آنے والا ایک نہیں بلکہ ایک سے زیادہ ہیں۔

پھر ایسا لگا جیسے ان لوگوں نے باہر انتہائی طاقت ور ٹارچ روشن کی ہو۔ پھر پہلی آواز سنائی دی۔ ''دھت تیرے کی۔ یہاں تو تالا پڑا ہوا ہے۔''

''ابے یہی فلیٹ تھا یا کوئی دوسرا تھا؟'' دوسرے آدمی نے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ وہ آگے والا بلاک تھا۔''

''اب چل یہاں سے۔'' دوسرے آدمی نے کہا۔ ''تیری ان ہی حرکتوں کی وجہ سے ہم لوگ مارے جائیں گے۔''

اسی وقت سیڑھیوں پر قدموں کی آواز سنائی دی۔ آواز نچلے فلور سے آرہی تھی لیکن مراد کا تو پورا وجود اس وقت مجسم کان بنا ہوا تھا۔

''ابے بھاگ یہاں سے۔'' دوسرا آدمی گھبرا کر بولا۔ ''مجھے تو یہ پولیس والا لگ رہا ہے۔ اس نے ٹارچ بھی جلا رکھی ہے اور کندھے پر رائفل بھی ہے۔'' پھر وہ چونک کر بولا۔ ''ابے ادھر نہیں، سامنے والے کوریڈور میں بھاگ، وہاں ایک دوسرا زینہ بھی ہے۔ ہم لوگ وہاں سے نکل جائیں گے۔'' پھر وہ دونوں بہت عجلت میں وہاں سے روانہ ہو گئے۔ انہوں نے حتی الامکان بے آواز بھاگنے کی کوشش کی تھی لیکن مراد کے کان انہی کی آوازوں پر لگے ہوئے تھے۔

ان کے جانے کے بعد سناٹا چھا گیا۔

www.pkdigest.com

پھر تقریباً دس بارہ منٹ بعد تالے میں چابی گھومنے کی آواز آئی اور دروازے پر تین دفعہ مخصوص انداز میں دستک دی گئی اور آنے والا بولا۔ ''بھوکے کو تین روٹیاں کھلا دو بابا!''

مراد نے ہچکچاتے ہوئے دروازہ کھول دیا لیکن وہ خود دروازے کی اوٹ میں دیوار سے چپکا کھڑا رہا۔

آنے والے نے پھرتی سے دروازہ بند کیا اور بولا۔

''میں راشد ہوں مراد! اب تم سامنے آجاؤ۔'' اس نے محدود روشنی والی ٹارچ روشن کی اور موم بتی جلا دی۔

مراد بے اختیار اس سے لپٹ گیا۔ اس کا جسم پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔

''ثانیہ بی بی! آپ بھی باہر آجائیں۔'' پھر وہ ہنس کر بولا۔ ''مراد! جاوید سے بات ہونے کے باوجود تمہارے خوف کا یہ عالم ہے۔ تم ایسے تو نہیں تھے بلکہ کالج میں تو تم بات بات پر آدمی سے بھڑ جاتے تھے۔''

''یار! ابھی تم سے پہلے کسی اور نے بھی دروازے پر دستک دی تھی۔ وہ دو آدمی تھے۔ ان کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ وہ کسی اور فلیٹ کے دھوکے میں ادھر آنکلے ہیں۔''

''اچھا چھوڑو ان باتوں کو، اپنا سامان سمیٹو اور میرے ساتھ چلو۔ اس قید خانے میں رہ کر تو تمہارا حلیہ ہی بگڑ گیا ہے۔ لگتا ہے تم دو دن سے نہائے بھی نہیں ہو؟''

''کیسا نہانا... یہاں تو دو دن سے ہم نے منہ تک نہیں دھویا ہے۔''

''چلو جلدی اپنا سامان سمیٹو۔ بس یہ میٹرس یہیں چھوڑ دو۔''

ثانیہ نے جلدی جلدی اپنے ہینڈ بیگ اور مراد کے سوٹ کیس میں سارا سامان بھر دیا۔

''لیکن راشد! باہر بابا سائیں اور بریگیڈیئر صاحب کے آدمی کتوں کی طرح ہماری بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ ہم...''

''تم لوگ اس وقت میری سرکاری گاڑی میں جاؤ گے۔ اس پر اسسٹنٹ کمشنر کی سرکاری نمبر پلیٹ بھی لگی ہے۔ کس کی جرأت ہے کہ میری گاڑی کی تلاشی لے سکے۔''

راشد ان لوگوں کو وہاں سے گلشن اقبال کے ایک بنگلے میں لے گیا۔

وہاں ضروریات زندگی کی ہر چیز تھی۔ ثانیہ اور مراد کو لگا جیسے وہ جہنم سے نکل کر جنت میں آگئے ہوں۔

''آپ فریش ہو جائیں، کھانا تیار ہے اور کسی بھی قسم کا تکلف مت کیجیے گا۔'' راشد نے مسکرا کر کہا۔ ''یہ میں تم سے نہیں ثانیہ بھابی سے کہہ رہا ہوں۔'' اس نے ہنستے ہوئے مراد سے کہا۔ ''میں نے آپ کی روانگی کا انتظام بھی کر دیا ہے۔ کل رات کو آپ دونوں کراچی سے باہر ہوں گے۔''

وہ فریش ہو کر ڈرائنگ روم میں آئے تو راشد کسی رسالے کی ورق گردانی میں مصروف تھا۔ وہ مسکرا کر بولا۔ ''یہ ہوئی نا بات، اب جلدی سے کھانا کھالیں۔ میں بھی آپ لوگوں کے انتظار میں بھوکا بیٹھا ہوں۔''

اچانک انٹر کام کی گھنٹی کی آواز سن کر ثانیہ اور مراد بُری طرح چونک اٹھے۔

راشد نے انہیں پُرسکون رہنے کا اشارہ کیا اور انٹر کام کا ریسیور اٹھالیا۔ ''ہاں گلاب خان! کون؟... بات کراؤ... اچھا تم ہو... ریسیور گارڈ کو دو... گلاب خان... انہیں اندر بھیج دو۔''

''کون ہے؟'' مراد تشویش بھرے انداز میں بولا۔

''جاوید ہے یار!'' راشد ہنس کر بولا۔ ''تم اتنے پریشان کیوں ہو گئے؟''

تھوڑی دیر بعد جاوید اندر داخل ہوا اور بولا۔ ''یار! تم دونوں کے گھر والوں نے جینا حرام کر دیا ہے۔ ہر وقت ایک دو آدمی سائے کی طرح میرے ساتھ رہتے ہیں۔ میں نے بھی آج انہیں ایسا ڈاج دیا ہے کہ زندگی بھر یاد رکھیں گے۔''

''کوئی خاص بات؟'' راشد نے پوچھا۔

''خاص بات یہ ہے کہ تھلیں انتظامیہ نے اپنے طور پر ایک خفیہ ایجنسی کی خدمات حاصل کر لی ہیں اور اب تم دونوں کی تلاش میں مزید سرگرمی پیدا ہو گئی ہے۔ ہاں، بابا سائیں نے تمہارے بارے میں اطلاع دینے والے کے لیے دس لاکھ روپے کا انعام بھی رکھا ہے۔''

''میں نے کل شام تک انہیں کراچی سے باہر نکالنے کا بندوبست کر لیا ہے۔'' راشد نے کہا۔ ''پشاور کے ایک شوروم کے لیے دو گاڑیاں کراچی سے ایک ٹرالر میں جا رہی ہیں۔ مراد اور ثانیہ انہی میں سے ایک گاڑی میں موجود ہوں گے۔ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوگی۔''

کچھ دیر بعد راشد اور جاوید وہاں سے چلے گئے۔

ان لوگوں نے دوسرا دن بھی بیزاری اور خوف میں گزارا۔

رات کو راشد آیا اور بولا۔ ''ثانیہ بھابی! آپ نے پیکنگ تو کر لی ہوگی؟ بس چلنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ ٹرالر روانہ ہونے ہی والا ہے۔''

''لیکن ٹرالر کا ڈرائیور... وہ بھی تو...'' مراد نے کچھ کہنا چاہا۔

راشد نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''وہ میرا خاص آدمی ہے۔ اس کمپنی میں اسے جاب بھی میں نے ہی دلوائی ہے۔ وہ یہاں بھی میرا بہت احسان مند ہے۔''

''راشد بھائی! دس لاکھ روپے چھوٹے لوگوں کے لیے بہت بڑی رقم ہوتی ہے۔ اگر اس نے...''

''اس کی آپ فکر مت کریں اور چلنے کی تیاری کریں۔''

☆☆☆

ثانیہ اور مراد ٹرالر پر چڑھی ہوئی ایک گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ڈرائیور کا نام شاہ زیب تھا۔ وہ اپنی باتوں سے سچا اور کھرا آدمی لگ رہا تھا۔

اس نے ثانیہ اور مراد سے کہا۔ ''آپ دونوں اس آگے والی گاڑی میں بیٹھ جائیں۔ ہاں، کوئی چیک پوسٹ آئے تو آپ لوگ گاڑی میں نیچے کی طرف چھپ جایئے گا۔ ویسے تو اس کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔''

پھر ٹرالر یکساں رفتار سے چلنے لگا۔ نہ جانے کتنی دیر گزر گئی۔ مراد نے ثانیہ کو آواز دی لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر مراد کی بھی آنکھ لگ گئی۔

اچانک ٹرالر ایک جھٹکے سے رکا تو مراد کی آنکھ کھل گئی۔ ٹرالر کے اندر گہری تاریکی اور سناٹا تھا۔ باہر سے بھی کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ اس بند ڈبے میں اب مراد کا دم گھٹنے لگا تھا۔ ٹرالر کی چھت پر چھوٹا سا ایک روشن دان تھا جس میں سے تازہ ہوا آرہی تھی۔ لگتا ہے ہوا کا یہ بندوبست مویشیوں کی نقل و حمل کی وجہ سے کیا گیا ہو۔

پھر باہر سے کسی کے کھانسنے کی آواز آئی۔ مراد نے پھرتی سے دونوں ریوالور نکال لیے اور گاڑی سے اتر کے ٹرالر کے دروازے کے پاس کھڑا ہو گیا۔ باہر صبح کاذب کا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ پھر اسے شاہ زیب کی شکل دکھائی دی۔

اس نے آہستہ سے کہا۔ ''صاحب! آپ جاگ رہے ہیں؟''

''ہاں شاہ زیب! کوئی خاص بات؟''

''ایک گھنٹے بعد ہم ملتان پہنچ جائیں گے۔ میں آپ کو ایسی جگہ اتاروں گا جہاں سے آپ کو کوئی سواری مل سکے۔''

''ٹھیک ہے یار!'' مراد نے کہا۔

''ہاں، آپ کو کھانے یا پانی کی ضرورت تو نہیں ہے؟''

''شکریہ شاہ زیب! ہم پانی کا کولر اور کھانے کی چیزیں ساتھ لے کر چلے تھے۔ ہاں اگر سگریٹ مل جائے تو...''

''میں تو بہت سستا سگریٹ پیتا ہوں صاحب!'' شاہ زیب نے کہا۔

''وہی چلے گا۔'' مراد نے کہا۔

شاہ زیب نے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر اسے دے دیا اور دروازہ بند کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ تیاری کر لیں۔ بس ہم ملتان پہنچنے ہی والے ہیں۔''

اس کے جانے کے بعد مراد گاڑی کی طرف آگیا۔ ان کی باتوں سے ثانیہ بھی بیدار ہو گئی تھی۔ وہ خوف زدہ لہجے میں بولی۔ ''کیا ہوا مراد؟ کہیں...''

''نہیں، کوئی بات نہیں۔ ڈرائیور بتا رہا تھا کہ ایک گھنٹے بعد ہم ملتان پہنچ جائیں گے۔ وہ ہمیں ملتان میں چھوڑ دے گا۔ تم اپنا سامان سمیٹ لو اور جاوید جو برقع لے کر آیا تھا، وہ پہن لو۔''

☆☆☆

شاہ زیب نے انہیں ایسی جگہ اتار دیا جہاں انہیں آسانی سے ٹیکسی مل سکتی تھی۔ جانے سے پہلے وہ مراد سے گلے ملا، ثانیہ کو سلام کیا اور روانہ ہو گیا۔

اب اچھا خاصا دن نکل آیا تھا۔ ان کے پاس صرف ایک سوٹ کیس تھا۔ واٹر کولر اور دوسری چیزیں انہوں نے ٹرالر ہی میں چھوڑ دی تھیں۔

وہاں سے لاری اڈا شاید زیادہ دور نہیں تھا کیونکہ کچھ لوگ اپنا سامان اٹھائے ہوئے جا رہے تھے۔

مراد نے ثانیہ سے کہا۔ ''پہلے میرا ارادہ تھا کہ ہم ایک دن ملتان میں قیام کریں گے لیکن اب میں سوچ رہا ہوں کہ وقت ضائع کیے بغیر بس کے ذریعے لاہور چلتے ہیں۔''

''لاہور میں رہیں گے کہاں؟'' ثانیہ نے فکر مندی سے پوچھا۔ وہ جدید طرز کے سیاہ برقعے میں بھی اچھی لگ رہی تھی۔

''لاہور میں میرا کالج کے زمانے کا ایک دوست ہے۔ اس کے والد بڑے صنعت کار ہیں۔ میرے پاس اس کا سیل نمبر ہے۔ میں اس سے رابطہ کرتا ہوں۔ اگر وہ نہ ملا تو پھر ہم لاہور کے کسی چھوٹے سے ہوٹل میں قیام کریں گے اور وہیں کورٹ میرج کر لیں گے پھر کچھ اور سوچیں گے۔''

☆☆☆

مراد نے سیل فون جیب سے نکالا، پھر بولا۔ ''شٹ! جمال کا نمبر تو میری پرانی سم میں ہے لیکن کوئی بات نہیں۔ وہ سم بھی میرے پرس میں موجود ہے۔''

اس نے نئی سم نکال کر ڈرتے ڈرتے پرانی سم لگائی اور تیزی سے جمال کا نمبر نکال لیا۔ اس نے وہ نمبر ثانیہ کو بتایا۔ ثانیہ نے اسے اپنے سیل فون میں محفوظ کر لیا۔ مراد نے ایک بار پھر پرانی سم نکال کر سیل فون میں نئی سم لگائی۔

''اب چلو بھی۔'' ثانیہ جھنجلا کر بولی۔ ''اس برقعے میں

www.pkdigest.com

میرا دم گھٹ رہا ہے۔"

"دم تو ابھی مزید گھٹے گا۔" مراد نے سوٹ کیس اٹھا کر چلتے ہوئے کہا۔ "آپ اگر اپنا یہ چاند سا مکھڑا نقاب میں چھپا لیں تو بہتر ہے ورنہ اس برقعے کا فائدہ ہی کیا ہے؟"

تانیہ نے ایک جھٹکے سے نقاب گرا لیا۔

مراد کے اندازے کے مطابق لاری اڈا وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ لاہور جانے والی بس بھی تیار ہی تھی۔

بس میں اطمینان سے بیٹھ کر مراد نے جمال کا نمبر ملا لیا۔

دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی، پھر کسی کی غنودہ آواز سنائی دی۔ "ہیلو!"

"جمال! میں مراد بول رہا ہوں؟"

"کون مراد؟"

"اوئے پپے، تو میرا نام بھی بھول گیا؟" جمال نے ہنس کر کہا۔

"ارے وڈیرا سائیں... کیسے ہو؟ آج ہم غریبوں کا خیال کیسے آ گیا... وہ بھی اتنی صبح صبح؟"

"ابے یہ صبح ہے؟" مراد نے کہا۔ "اور اگر تو غریب ہے تو اللہ اس پورے ملک کو تجھ جیسا غریب کر دے۔ اچھا سن، میں لاہور آ رہا ہوں۔"

"کب؟" جمال شاید اچھل کر بیٹھ گیا تھا۔ "کس فلائٹ سے؟"

"ابے فلائٹ سے نہیں بلکہ میں بس سے لاہور آ رہا ہوں۔ دو تین گھنٹے میں پہنچ جاؤں گا۔"

"بس سے کیوں؟ اور تو اس وقت کہاں ہے تاکہ مجھے اندازہ تو ہو کہ تو کب تک لاہور پہنچے گا۔"

"بس ابھی ملتان سے روانہ ہوئی ہے۔ ہاں، ایک بات اور سن لے... اگر بابا سائیں یا کسی کا ٹیلی فون بھی آئے تو انہیں میرے بارے میں کچھ مت بتانا۔"

"لیکن یار! بات کیا ہے؟" جمال نے پوچھا۔

"لمبی بات ہے۔ وہیں آ کر بتاؤں گا۔" یہ کہہ کر مراد نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

"یہ جمال قابلِ بھروسا تو ہے نا؟" تانیہ نے تشویش بھرے انداز میں پوچھا۔

"نا قابلِ بھروسا لوگوں سے میری دوستی نہیں ہوتی۔" مراد نے کہا۔ "اور اگر ہو بھی جائے تو زیادہ دن چلتی نہیں ہے۔ جمال مری کے ہاسپٹل میں میرے ہی کمرے میں رہتا تھا۔"

پھر ان دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ مراد البتہ بہت محتاط تھا۔ وہ ہر اسٹاپ پر چڑھنے والے مسافروں کا بہت غور سے جائزہ لیتا تھا کہ کہیں ان میں سے کوئی بابا سائیں یا بریگیڈیئر صاحب کا کوئی آدمی نہ ہو۔

بس نے انہیں دوپہر ایک بجے تک لاہور پہنچا دیا۔

لاہور کے لاری اڈے پر بھی مراد بہت ہراساں اور پریشان تھا۔ اسے ہر شخص پر بابا سائیں یا اکرام صاحب کے کسی آدمی کا گمان ہو رہا تھا۔ وہ جلد از جلد وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ یہی حالت تانیہ کی بھی تھی لیکن برقعے میں ہونے کی وجہ سے اس کے چہرے کی گھبراہٹ اور سراسیمگی پوشیدہ تھی۔

مراد نے ٹیکسی کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں پھر اسے ایک خالی ٹیکسی نظر آ ہی گئی۔

وہ ٹیکسی کی طرف بڑھا۔ ٹیکسی ڈرائیور اس وقت کچھ کھانے میں مصروف تھا۔ "ٹیکسی خالی ہے؟" مراد نے پوچھا۔

"بالکل خالی ہے باؤ جی! آپ بتاؤ کدھر جاؤ گے؟"

"تم مجھے کسی..."

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا کیونکہ پیچھے سے کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

ایک لمحے کو مراد کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ آخر بابا سائیں یا اکرام صاحب کے آدمیوں نے اسے تلاش کر ہی لیا تھا۔

وہ بوکھلا کر پلٹا، اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی جیب سے ریوالور بھی نکالنا چاہا تھا لیکن پیچھے مڑنے کے بعد اس کے اوسان کچھ بحال ہوئے۔ وہ جمال تھا۔

"واہ یار!" جمال نے کہا۔ "مجھے دو گھنٹے تک یہاں انتظار کرانے کے بعد خود ٹیکسی میں جا رہے ہو؟"

"میرا خیال تھا کہ کہیں قیام کرنے کے بعد تجھے کال کروں گا۔" مراد نے کہا۔ "مجھے کیا معلوم کہ تو میرے لیے یہاں انتظار کر رہا ہوگا؟ بسوں کے ٹائمنگ تو فکس نہیں ہوتے نا۔"

"اچھا زیادہ باتیں مت بنا، چل گاڑی میں بیٹھ۔" پھر وہ چونک کر بولا۔ "تیرا سامان کہاں ہے؟"

"سامان کیا یار! ایک سوٹ کیس اور ہینڈ بیگ ہے۔ تیری گاڑی کہاں ہے؟"

جمال نے سفید رنگ کی ایک ہنڈا سِوِک کی طرف اشارہ کیا۔

"تو ڈکی کھول، میں سامان لے کر آتا ہوں۔" یہ کہہ کر مراد اس طرف بڑھ گیا جہاں تانیہ سامان سمیت موجود تھی۔

مراد کے ساتھ تانیہ کو دیکھ کر جمال کچھ ٹھٹکا مگر اس وقت کچھ نہیں بولا۔ اس نے سامان ڈکی میں رکھنے کے بعد مراد کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ مراد نے گاڑی کی عقبی نشست کا دروازہ کھول کر تانیہ کو بٹھایا، پھر خود بھی پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا۔

جمال نے گاڑی کا انجن اسٹارٹ کیا اور گاڑی آگے بڑھ گئی۔

مین روڈ پر آنے کے بعد جمال بولا۔ "مراد! یہ خاتون کون ہیں؟"

"میری ہونے والی بھابی ہے۔" مراد نے بتایا، پھر اس نے مختصراً جمال کو سب کچھ بتا دیا۔

"او بھائی! تیرے چکر میں کہیں میں بھی نہ مارا جاؤں۔ تو ایک مغویہ کو لے کر گھوم رہا ہے۔"

"مغویہ؟" مراد نے ناگواری سے کہا۔

"پولیس میں تو ان لوگوں نے اغوا کا پرچہ درج کرایا ہوگا نا؟" جمال نے کہا۔

"دونوں طرف سے کسی نے بھی پولیس میں باقاعدہ رپورٹ درج نہیں کرائی ہے۔ دونوں فریقوں نے ذاتی طور پر پولیس اور دوسری ایجنسیوں سے رابطہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے لوگ خود بھی ہماری تلاش میں ہیں۔ ہاں، اگر تجھے کسی بھی قسم کا خوف ہے تو ہمیں یہیں اتار دے۔"

"لعنت ہے میں بھائی کی موجودگی میں تجھے گالیاں بھی نہیں دے سکتا۔ تو نے مجھے اتنا ہی کم ظرف سمجھا ہے؟ اب تو بے فکر ہو جا۔ یہاں کوئی تجھے ٹیڑھی نظر سے دیکھ بھی نہیں سکتا۔ اچھا ہوا تو نے تفصیل بتا دی۔ اب میں تجھے اپنے گھر نہیں بلکہ اپنے گلبرگ کے ٹھکانے پر لے جاؤں گا۔"

جمال انہیں وہاں سے گلبرگ لے گیا۔ اس کا وہ بنگلا بھی خاصا وسیع و عریض تھا۔ صدر دروازے پر مسلح گارڈ بھی موجود تھا۔ جمال کی گاڑی دیکھ کر اس نے پھرتی سے گیٹ کھول دیا۔

"یہاں تجھے کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی۔ ابھی تھوڑی دیر میں یہاں ایک ملازمہ اور دو گارڈز مزید آ جائیں گے۔" پھر وہ تانیہ سے بولا۔ "بھابی! اب اس لفافے سے باہر آ جائیں۔ یہاں کسی بھی قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ہاں، فریج میں کھانے پینے کی چیزیں بھی موجود ہیں۔ آپ لوگ فریش ہو جائیں اور کھانا کھا لیں۔ میں کچھ ضروری کام نمٹا کر شام تک یہاں آؤں گا۔"

اس تمام عرصے میں تانیہ کے چہرے پر پہلی دفعہ مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

"شکریہ۔" مراد نے کہا۔ "تمہارے چہرے پر مسکراہٹ تو آئی۔"

☆☆☆

"دیکھیے بریگیڈیئر صاحب!" شہباز خان نے رعونت بھرے انداز میں کہا۔ "اگر آج شام تک مجھے میرا بیٹا نہ ملا تو میں جو کچھ کروں گا، آپ نے اس کا تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔"

"اپنی آواز نیچی رکھو شہباز خان!" کیپٹن احتشام نے سرد لہجے میں کہا۔ "تمہارا بیٹا میری بہن کو اغوا کر کے لے گیا ہے۔ یہی بات میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ اگر شام تک تانیہ مجھے نہیں ملی تو میں آپ کے گھر کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔"

"تم... تم میرے گھر کی اینٹ سے اینٹ بجاؤ گے؟ اپنے قد سے بڑی باتیں مت کرو کپتان صاحب! تم میرے ہی گھر میں کھڑے ہو کر مجھے دھمکی دے رہے ہو۔ مجھے... وڈیرے شہباز خان کو... اڑے بابا پریل!" اس نے اپنے ایک آدمی کو آواز دی۔

اس کی آواز کے ساتھ ہی شہباز خان کے آدمیوں نے اپنی رائفلیں اکرام اور احتشام پر تان لیں۔

بریگیڈیئر اکرام حقارت سے مسکرایا اور بولا۔ "آپ سے یہی امید تھی۔ اور ان کھلونوں سے مجھے مت ڈرائیں۔ میں نے زندگی بھر اسی قسم کے کھلونوں سے کھیلا رہا ہوں۔ میں نے دو جنگیں لڑی ہیں۔ یہ تو بہت معمولی کھلونے ہیں شہباز صاحب! میں نے تو اس سے سو گنا طاقتور ہتھیار استعمال کیے ہیں اور بے شمار دشمنوں کو ٹھکانے لگایا ہے۔ جان لینا یا دینا میرے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے۔"

"بس بابا بس!" شہباز خان نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ "یہ ہماری روایت کے خلاف ہے کہ ہم گھر آئے ہوئے مہمانوں کے ساتھ زیادتی کریں ورنہ اتنی جرأت تو بابا تمہارے کسی بڑے افسر میں بھی نہیں ہوگی کہ وہ ہم سے اس انداز میں بات کرے۔ آپ جائیں بریگیڈیئر صاحب اور مراد کو میرے حوالے کریں ورنہ ہماری دوسری ملاقات آپ کے گھر پر ہوگی اور وہ ملاقات اتنی اچھی نہیں ہوگی۔"

"تو پھر ایک بات میری بھی سن لیں شہباز صاحب!" بریگیڈیئر صاحب نے تلخ لہجے میں کہا۔ "ہمیں فوج میں یہ سکھایا جاتا ہے کہ اگر کوئی تم پر حملہ کرے تو اس کا منہ توڑ جواب دو۔ ہاں، اب آئیں تو میری بیٹی کو ساتھ لے کر آئے گا۔ مجھے ہر قیمت پر اپنی بیٹی چاہیے۔" یہ کہہ کر بریگیڈیئر اکرام اور احتشام تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے باہر نکل گئے۔

"سائیں! یہ دو ٹکے کا آدمی آپ کے سامنے اتنی بات بول گیا۔ کہیں تو ابھی اسے باہر نکلتے ہی ٹھکانے لگا دوں؟" پریل نے کہا۔

"بکواس بند کر۔" شہباز خان گرج کر بولا۔ "اور اتنا ہی کرتب تجھ سے کہا جا رہا ہے۔ اب تم سب دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" وڈیرا پھر دہاڑا۔

www.pkdigest.com

وہ سب تیزی سے باہر نکل گئے۔

☆☆☆

مراد کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ اس کے چہرے پر افسردگی کے گہرے تاثرات تھے۔

تانیہ تھوڑی دیر اسے غور سے دیکھتی رہی پھر بولی۔ ''مراد! کیا بات ہے؟ اب کوئی نئی پریشانی پیدا ہوگئی ہے یا اتنا بڑا قدم اٹھا کر پچھتا رہے ہو؟''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے تانیہ!'' مراد نے کہا۔

''پھر کیا بات ہے؟ ابھی کچھ دیر پہلے تو تم بہت خوش تھے۔ کیا جمال نے کوئی اطلاع دے دی ہے یا...''

''ایسا کچھ بھی نہیں ہے تانیہ!'' مراد نے کہا۔ ''مجھے اس وقت بہت شدت سے اپنا بھائی کمال یاد آرہا ہے۔ اس کے دل میں کیا کیا ارمان تھے میری شادی کے۔ وہ مجھ سے ٹوٹ کر محبت کرتا ہے تانیہ! نہ جانے اس کا کیا حال ہوگا؟ دادی نہ جانے کس حال میں ہوں گی؟''

''میں بھی محبت کرنے والے رشتے چھوڑ کر آئی ہوں مراد!'' تانیہ نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ ''پاپا میرے بغیر کھانا نہیں کھاتے تھے۔ میرے پیر میں کانٹا بھی چبھ جاتا تھا تو وہ بے چین ہو جاتے تھے۔ امی میرے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھیں اور احتشام بھائی... وہ تو صدمے سے ادھ موئے ہو گئے ہوں گے لیکن مجھے اپنے فیصلے پر کوئی پچھتاوا نہیں ہے۔'' تانیہ بُری طرح رونے لگی۔ ''اب تو میرے لیے سب کچھ تم ہی ہو مراد! ہاں، اگر تمہیں اپنے فیصلے پر پچھتاوا ہے تو اپنی دنیا میں لوٹ جاؤ۔''

''تم نے تو باقاعدہ مجھے طعنے دینا شروع کر دیے۔ کون سی دنیا میں لوٹ جاؤں؟ جہاں موت میری گھات میں ہے... بابا سائیں جتنے شفیق باپ ہیں، اتنے ہی سنگ دل جاگیردار بھی ہیں۔ اور اب وہاں صرف وڈیرے شہباز خان سے میرا سامنا ہوگا جو مجھے دیکھتے ہی گولیوں سے بھون دے گا۔ اپنی جھوٹی انا، عزت اور آن بان کی خاطر وہ مجھے گولی مارنے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کریں گے۔ اگر ان سے بچ بھی گیا تو تمہارے پاپا اور بھائی میری گردن اڑا دیں گے۔ میری دنیا تو اب تم ہی ہو تانیہ! اب تو تمہارے ہی ساتھ جینا اور تمہارے ہی ساتھ مرنا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے مراد کی آواز بھرا گئی اور اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

''آئی ایم سوری مراد! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ ہم دونوں ایک ہی کشتی میں سوار ہیں، پھر ایک دوسرے پر احسان کیوں جتائیں... چلو اب مسکرا دو۔''

مراد بے اختیار مسکرانے لگا۔

کچھ دیر خاموشی رہی پھر تانیہ نے کچھ سوچ کر کہا۔ ''مراد! تم کمال پر کتنا اعتماد کرتے ہو؟''

''جتنا اعتماد مجھے جاوید پر ہے، جمال پر ہے، اس سے دگنا اعتماد مجھے کمال پر ہے۔''

''تو پھر تم اس سے ٹیلی فون پر بات کیوں نہیں کر لیتے؟ تمہارا دل بھی ہلکا ہو جائے گا اور کمال بھی مطمئن ہو جائے گا۔''

''گڈ آئیڈیا!'' مراد نے خوش ہو کر کہا۔ ''میں اس سے سیل فون پر بات کروں گا لیکن ابھی اسے یہ نہیں بتاؤں گا کہ ہم لوگ کہاں ہیں۔''

''تم نے تو اب تک جاوید سے بھی رابطہ نہیں کیا۔'' تانیہ نے کہا۔

''آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ جب آپ باتھ روم میں تھیں تو جاوید کی کال آئی تھی۔ اس سے تفصیل سے بات ہو چکی ہے۔ وہ یہاں آنا چاہ رہا تھا لیکن میں نے اسے سختی سے منع کر دیا کہ فی الحال کراچی نہ چھوڑے اور وہاں کے حالات پر نظر رکھے۔ ویسے وہ بے چارہ بھی ہماری وجہ سے عذاب میں پڑ گیا ہے۔ اگر راشد کی گواہی نہ ہوتی تو پولیس اس کی خفیہ ایجنسی کے لوگ یا پھر بابا سائیں کے آدمی اس کی کھال کھینچ رہے ہوتے۔''

''اچھا تم کمال سے بات کرلو۔''

کمال کا سیل نمبر تو مراد کے ذہن میں محفوظ تھا۔ اس نے فوراً ہی کمال کا نمبر ملا لیا۔ دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی، پھر کمال کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو!''

''کمال سائیں؟'' مراد نے آواز بدل کر کہا۔

''ہاں، ماں کمال آہیاں، تو ہاں کیر تھا گالہایو؟'' (ہاں میں کمال ہوں، آپ کون بول رہے ہیں؟)

''کمال! میرا نام مت لینا۔ میں...''

''ادا مراد!'' کمال کی آواز خوشی سے لرزنے لگی۔ ''آپ کہاں ہیں، خیریت سے تو ہیں؟''

''بے وقوف آدمی... میں نے کہا تھا کہ میرا نام مت لینا۔''

''میں اس وقت آم کے باغ میں ہوں اور آس پاس کوئی بھی نہیں ہے۔'' کمال نے کہا۔ ''آپ کہاں ہیں ادا؟''

''کمال! میں خیریت سے ہوں لیکن ابھی یہ نہیں بتا سکتا کہ کراچی میں کہاں ہوں۔''

''ادا! آپ کو مجھ پر بھی بھروسا نہیں ہے؟ مجھے تو بتا

دیں۔ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں، آپ کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں مر جاؤں گا کمال! ...نہیں کھولوں گا۔''

''صبر کر کمال! میں تجھے بہت جلد بتا دوں گا کہ میں کہاں ہوں؟''

''بھاجائی کیسی ہے۔ وہ کہاں ہے؟''

''بھاجائی بھی خیریت سے ہے... وہ بھی میرے ساتھ ہے۔''

''ادا مراد! بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ بھاجائی کے بھائی نے ذاتی طور پر کسی خفیہ ایجنسی کی خدمات حاصل کی ہیں۔ کیپٹن احتشام خود بھی ایس ایس جی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس نے باضابطہ طور پر تو نہیں لیکن ذاتی طور پر دو تین خفیہ ایجنسیوں کو ملوث کر لیا ہے۔ بابا سائیں نے بھی رپورٹ لکھائے بغیر کرمنل برانچ کے ڈی آئی جی کو اس کام پر لگا دیا ہے۔ ادا! تم ابھی کراچی سے باہر نکلنے کے بارے میں سوچنا بھی مت۔''

''تم فکر مت کرو۔ ہم بالکل محفوظ ہیں۔ یہ لوگ زندگی بھر مجھے تلاش نہیں کر پائیں گے۔ ہاں، تم دادی کا بہت خیال رکھنا لیکن انہیں بھی یہ مت بتانا کہ میری تم سے بات ہوئی ہے۔ میرا یہ نمبر اپنے پاس محفوظ کرلو۔ تم صرف کسی ایمرجنسی میں مجھے کال کرسکتے ہو، ممکن ہے تمہارا سیل فون بھی ٹریکنگ پر ہو۔''

''ٹھیک ہے ادا! میں محتاط رہوں گا۔ بھاجائی کو میری طرف سے سلام کہنا۔''

''تم بھی دادی کا خیال رکھنا، اچھا خدا حافظ!'' یہ کہہ کر مراد نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

''اب کیوں رو رہے ہو؟'' تانیہ نے حیرت سے کہا۔ ''ویسے بھی تم جیسے مضبوط مرد کی آنکھوں میں آنسو کچھ اچھے نہیں لگتے۔''

''میں رو رہا ہوں؟'' مراد جھینپ کر بولا۔ ''شاید کمال کی آواز سن کر میں خود پر قابو نہیں رکھ سکا۔ تم چاہو تو تم بھی اپنے گھر بات کرلو۔''

''تاکہ وہ لوگ کال ٹریس کر کے سیدھے لاہور کا رخ کریں۔ میرا بھائی بھی تمہارے بابا سائیں سے کم نہیں ہے۔ میں ان... کی بہت لاڈلی بہن ہوں لیکن اس وقت تو وہ کیپٹن احتشام ہوں گے۔ ان سے بات کرنے کا مطلب یہ ہے کہ خود کو ان کے حوالے کرنا۔'' پھر وہ کچھ سوچ کر سنجیدگی سے بولی۔ ''مراد! میں نے اپنی سب کشتیاں جلا دی ہیں۔ میں اب تمہارے رحم و کرم پر ہوں۔''

''ایسا کیوں سوچتی ہو؟'' مراد نے کہا۔ ''سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ ماں باپ اور بہن بھائی زیادہ دیر تک ناراض نہیں رہتے۔''

اسی وقت جمال لوٹ آیا اور بولا۔ ''میں نے سب بندوبست کر دیا ہے۔ لاہور کے ایک معروف بیرسٹر سے بات کر لی ہے۔ تانیہ بھابی کی طرف سے خودمختاری کا حلف نامہ وہی بیرسٹر پیش کرے گا۔ کورٹ سے اجازت ملتے ہی تم دونوں کی شادی ہو جائے گی۔ بس ایک دن ...ار کرلو۔ پھر کسی میں جرأت نہیں ہوگی کہ آنکھ اٹھا کر تم لوگوں کی طرف دیکھ بھی سکے۔ وہ بیرسٹر اتنا معروف اور بااثر ہے کہ اس کا نام سن کر ہی پولیس کے بڑے بڑے افسران کو پسینا آجاتا ہے۔ وہ ایسے چھوٹے موٹے کیس لیتا نہیں ہے لیکن میں نے اسے مجبور کیا کہ وہ یہ کیس ہاتھ میں لے۔ اگر خدانخواستہ بعد میں بھی کچھ گڑبڑ ہوئی تو وہ بیرسٹر اس سے نمٹ لے گا۔''

☆☆☆

کیپٹن احتشام تھکا تھکا سا گھر میں داخل ہوا۔ اکرام صاحب اس کا مرجھایا ہوا چہرہ دیکھ کر ہی سمجھ گئے کہ وہ ناکام لوٹا ہے۔

احتشام جھنجلا کر بولا۔ ''پاپا! سمجھ میں نہیں آتا کہ ان دونوں کو زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔''

''کراچی بہت بڑا شہر ہے بیٹا! وہ دونوں نہ جانے شہر کے کس کونے میں دبکے ہوئے ہیں۔''

''پاپا! میرا خیال ہے کہ مراد، تانیہ کو اپنے گوٹھ لے گیا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ پولیس میں باضابطہ طور پر مراد اور وڈیرے شہباز کے خلاف تانیہ کے اغوا کی رپورٹ درج کرا دوں اور وڈیرے کے گوٹھ کا سرچ وارنٹ لے لوں۔''

''تم کیا مزید رسوائی اور جگ ہنسائی چاہتے ہو؟ فرض کرو کہ وہ وڈیرے شہباز کے گوٹھ میں ہے اور مراد نے اس کے ساتھ کورٹ میرج کر لی ہے تو پھر تم کیا کرو گے؟ یا تمہارے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی وڈیرا ان دونوں کو اندرونِ سندھ کے کسی اور گوٹھ میں منتقل کر دے تو کیا کرو گے؟ ویسے مجھے یقین ہے کہ وڈیرے کو اب تک مراد کے بارے میں علم نہیں ہے۔ وہ اتنا بپھرا ہوا ہے کہ اگر مراد یا تانیہ میں سے کوئی بھی اس کے سامنے آگیا تو وہ اسے گولی مار دے گا۔''

''پھر پاپا! آپ ہی بتائیں، میں کیا کروں؟ کیا یونہی ہاتھ پہ ہاتھ رکھے بیٹھا رہوں؟''

''تم فکر مت کرو احتشام! میں نے کور کمانڈر کراچی سے ذاتی طور پر ملاقات کر کے اس سے مدد کی درخواست کی

www.pkdigest.com

ناشتے کی میز پر جمال بھی موجود تھا۔ ناشتے کے بعد اس نے کافی پیتے ہوئے اپنے بریف کیس سے ایک لفافہ نکالا اور مراد کے حوالے کردیا۔

"یہ کیا ہے جمال؟" مراد نے پوچھا۔

"یہ تم لوگوں کا ہنی مون گفٹ ہے۔ تم لوگ ہنی مون پر مری، سوات اور کاغان جارہے ہو۔ میں نے تمام انتظامات کردیے ہیں۔"

"لیکن جمال بھائی! میں... باہر..."

"ارے چھوڑیں بھابی!" جمال نے ہنس کر کہا۔ "اب آپ لوگ میاں بیوی ہیں اور کوئی بھی آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ آپ ابھی اپنے والد سے ٹیلی فون پر بات کریں اور انہیں بتادیں کہ میں نے شادی کرلی ہے۔ اس لیے پلیز۔ اب مجھے میری زندگی جینے دیں اور مجھے تلاش کرنے کی کوشش نہ کریں۔ اتنی ہمت ہے تو ابھی بات کریں ورنہ زندگی بھر یونہی ڈر ڈر کر، سہم سہم کر جینا ہوگا۔" اس نے اپنی جیب سے سیل فون نکال کر تانیہ کو دیا۔ "اگر آپ کو کوئی خدشہ ہے تو میرے سیل فون سے بات کریں۔ وہ لوگ میرا نمبر ٹریس کریں گے تا... میں ان سے نمٹ لوں گا۔"

"ابھی سوچنے کے لیے مجھے کچھ وقت دیں۔ میں آج ہی اپنے والدین سے بات کرلوں گی۔"

جمال کچھ دیر بیٹھ کر چلا گیا۔

اچانک مراد کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے سیل فون کی اسکرین پر نظر ڈالی اور چونک کر کہا۔ "کمال... یہ اس وقت کیوں کال کررہا ہے؟" اس نے سیل فون کان سے لگالیا۔ "ہاں کمال! سب خیر تو ہے؟"

"خیریت نہیں ہے ادا مراد! دادی کی حالت بہت خراب ہے۔ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"کمال! میں نے کہا تو ہے کہ..."

"ادا مراد! میں آج ہی آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ مجھے اپنا پتا بتائیں۔"

"لیکن کمال..."

"کوئی لیکن ویکن نہیں ادا مراد! اگر آپ نے مجھے اپنا پتا نہ بتایا تو آپ مجھے ہمیشہ کے لیے کھودیں گے۔"

"ایسی باتیں کیوں کرتا ہے کمال! او کے، ایڈریس لکھو لیکن ایک بات کا دھیان رکھنا۔ تمہاری بُو سونگھتا ہوا بابا سائیں کا کوئی کتا بھی تمہارے پیچھے نہ آجائے۔" پھر اس نے کمال کو پتا لکھوادیا۔

"او مائی گاڈ!" کمال نے کہا۔ "وہ لوگ آپ کو کراچی میں تلاش کررہے ہیں اور آپ لاہور میں بیٹھے ہیں۔ میں آج شام تک لاہور پہنچ جاؤں گا۔"

"لیکن کمال! میری بات تو سنو۔ میں..."

"نہیں ادا مراد! اب ساری باتیں وہیں پہنچ کر کروں گا۔" یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کردیا۔

جب مراد نے تانیہ کو بتایا کہ کمال آرہا ہے تو وہ ڈر گئی۔

"مراد! کہیں بابا سائیں نے زبردستی تو اس سے ہمارا پتا معلوم نہیں کرلیا؟"

"کمال ایسا نہیں ہے تانیہ کہ وہ گن پوائنٹ پر کسی کو میرے بارے میں بتادے۔" مراد نے پُریقین لہجے میں کہا۔ "وہ مرجائے گا لیکن اپنی زبان نہیں کھولے گا۔"

☆☆☆

کمال گھر میں داخل ہوتے ہی مراد سے لپٹ گیا اور بچوں کی طرح رونے لگا۔ "ادا! آپ مجھے بھی چھوڑ کر آگئے۔ آپ کو میرا بھی خیال نہ آیا؟"

"ارے یار! تم تو لڑکیوں کی طرح آنسو بہانے لگے۔ تمہاری بھابی کیا کہے گی کہ چھ فٹ کا ایک مرد بچوں کی طرح رورہا ہے۔"

کمال نے ہتھیلی کی پشت سے اپنے آنسو صاف کرلیے اور جھوم کر تانیہ کو سلام کیا۔

تانیہ نے اس کے سلام کا جواب دیا اور سوچنے لگی کہ کمال واقعی مراد کو بہت چاہتا ہے۔

"اچھا اب تو جلدی سے فریش ہوجا، لمبا سفر کرکے آیا ہے۔" مراد نے کہا۔

"ادا! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ میں کیا گوٹھ سے پیدل آیا ہوں؟ ہوائی جہاز میں آیا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ باتھ روم میں چلا گیا۔

تانیہ نے اس دوران میں اس کے لیے چائے کے ساتھ ساتھ خاصا اہتمام کرڈالا۔

کمال نہا دھو کر باتھ روم سے نکلا تو خاصا نکھرا نکھرا لگ رہا تھا۔

چائے پینے کے بعد کمال نے سنجیدگی سے کہا۔ "ادا! میں نے بابا سائیں کو راضی کرلیا ہے۔ میں آپ کو اور بھابی کو لینے آیا ہوں۔"

"نہیں کمال! بابا سائیں مجھے کبھی معاف نہیں کرسکتے۔ تو چاہتا ہے کہ میں ان کے ہاتھوں مارا جاؤں تو تیرے ساتھ ضرور چلوں گا۔"

"کیسی باتیں کرتے ہیں ادا مراد!" کمال نے کہا۔

"دادی کی حالت بہت خراب ہے۔ انہیں ایک دفعہ دل کا دورہ پڑچکا ہے۔ اماں تو بالکل گم صم ہوکر رہ گئی ہیں۔ ماروی بھی آپ کو یاد کرکے بہت روتی ہے۔ میں نے بابا سائیں سے وعدہ لیا ہے کہ حویلی میں بھابی کو وہی عزت دی جائے گی جو بڑی بہو کا حق ہے۔"

"اور بابا سائیں راضی ہوگئے؟"

"راضی کیسے نہیں ہوتے۔ میں انہی کے کہنے پر آپ کو لینے آیا ہوں۔ میں نے انہیں بتادیا ہے کہ حویلی میں آپ کے ساتھ یا بھابی کے ساتھ کوئی بدسلوکی ہوئی تو میں اپنی جان دے دوں گا۔ بابا سائیں نے اماں اور دادی کے سامنے قسم کھا کر وعدہ کیا ہے کہ انہوں نے آپ کو معاف کردیا۔ اب آپ چلنے کی تیاری کریں۔"

"نہیں کمال!" تانیہ نے سراسیمہ ہوکر کہا۔ "یہ کوئی چال بھی تو ہوسکتی ہے۔ بابا سائیں ہمیں وہاں بلاکر..."

"بھابی!" کمال نے سنجیدگی سے کہا۔ "آپ شاید ہمارے خاندان کی روایات سے واقف نہیں ہیں۔ ہمارے بڑے اگر دشمن کو بھی زبان دے دیتے ہیں تو پھر اسے معاف کردیتے ہیں۔ ادا مراد تو ان کا بیٹا ہے... ان کا خون۔ میں نے انہیں راتوں کو ادا مراد کے لیے روتے دیکھا ہے۔ آپ کہہ رہی ہیں کہ یہ ان کی چال ہوگی۔"

"کمال ٹھیک کہہ رہا ہے تانیہ!" مراد نے کہا۔ "بابا سائیں ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو دھوکے سے دوسروں پر وار کرتے ہیں۔ وہ تو اپنے دشمنوں کو بھی للکار کر مارتے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم نے گوٹھ جانے کا فیصلہ کرلیا ہے؟" تانیہ نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

"میں نہیں بلکہ ہم گوٹھ جائیں گے۔" مراد نے کہا۔ "مجھے بابا سائیں کی زبان پر پورا اعتبار ہے، چلو گی نا میرے ساتھ؟"

"میں تو اپنی کشتیاں جلا ہی چکی ہوں۔ تم اگر آگ میں چھلانگ لگانے کو کہو گے تو بھی لگادوں گی۔"

"واہ بھابی! یہ ہوئی نا بات۔"

کمال ہنس کر بولا۔ "آپ تمام پریشانیاں بھول جائیں اور چلنے کی تیاری کریں۔"

اسی وقت جمال بھی آگیا۔ جب مراد نے اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کیا تو وہ ہتھے سے اکھڑ گیا۔ "نہیں مراد! میں تجھے وہاں جانے کا مشورہ نہیں دوں گا۔"

کمال نے بہ مشکل تمام اسے سمجھایا پھر جب تانیہ نے بھی کمال کی تائید کی تو جمال بے بس ہوگیا۔

"دیکھو مراد! تم وہاں جاتو رہے ہو لیکن کسی بھی قسم کا خطرہ محسوس کرو تو فوراً مجھے اطلاع دے دینا۔"

"اس کی نوبت نہیں آئے گی جمال بھائی!" کمال نے کہا۔ "میں اس سے پہلے ہی ادا مراد اور بھابی کو بہ حفاظت گوٹھ سے نکال دوں گا۔"

"جیسی تمہاری مرضی مراد!" جمال نے کہا۔ "میرے گھر کے دروازے ہمیشہ تمہارے لیے کھلے رہیں گے۔ ویسے بھی اب یہ گھر تمہارا ہے۔ جب ضرورت محسوس کرو، واپس آجانا۔"

☆☆☆

وہ لوگ ہوائی جہاز کے ذریعے لاڑکانہ گئے۔ وہاں کمال کی لینڈ کروزر پہلے سے موجود تھی۔ اس کے ساتھ ہی دوسری گاڑی میں شہباز خان کے گارڈز تھے۔ مراد کے گوٹھ کا فاصلہ سڑک کے ذریعے وہاں سے تقریباً ڈیڑھ سو کلومیٹر تھا۔ دونوں گاڑیاں تیز رفتاری سے گوٹھ کی طرف روانہ ہوگئیں۔

آنے والے لمحات کے خوف سے تانیہ کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔

پھر اس نے سوچا کہ اب جو ہوگا، وہ دیکھا جائے گا۔ قسمت میں اگر یہیں موت لکھی ہے تو یہی سہی۔ اس موقع پر اسے جاوید سے سنا ہوا ایک شعر یاد آرہا تھا۔

کبھی عشق کرو اور پھر دیکھو، اس آگ میں جلتے رہنے سے
کبھی دل پر آنچ نہیں آتی، کبھی رنگ خراب نہیں ہوتا

☆☆☆

انٹیلی جنس آفیسر خاور نے تانیہ کو دیکھا اور چونک اٹھا۔ اس نے دوبارہ غور سے اسے دیکھا۔ وہ مسکراتی ہوئی لینڈ کروزر میں سوار ہورہی تھی۔ وہ تانیہ اور مراد کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ اس ائرپورٹ پر کیپٹن احتشام نے اس کی ڈیوٹی لگائی تھی کہ اگر تانیہ یا مراد میں سے کوئی بھی وہاں آئے تو فوراً اطلاع دی جائے۔ یہ ڈیوٹی اسے ڈپارٹمنٹ کی طرف سے نہیں دی گئی تھی بلکہ احتشام نے ذاتی حیثیت میں اسے وہاں تعینات کیا تھا۔ نکلے سے تو وہ چھٹی پر تھا۔

اس نے فوراً سیل فون نکالا اور کیپٹن احتشام کا نمبر ڈائل کردیا۔

احتشام نے دوسری ہی بیل پر کال ریسیو کرلی۔ "ہاں خاور! کوئی خاص بات؟"

جواب میں خاور نے اسے تفصیل سے تانیہ کی لاہور سے آمد اور لینڈ کروزر میں روانگی کے بارے میں بتایا۔

"کیا وہ لوگ مراد اور تانیہ کو گن پوائنٹ پر لے جارہے تھے؟" احتشام نے پوچھا۔

www.pkdigest.com

"نوسر!" خاور نے فوراً جواب دیا۔ "وہ دونوں تو بہت ہنسی خوشی اور اپنی مرضی سے گاڑی میں بیٹھے تھے۔"

"ٹھیک ہے۔"

"کس کا فون تھا؟" بریگیڈیئر اکرام نے پوچھا۔ تانیہ اور مراد کا نام سن کر وہ بھی چونک اٹھا تھا۔

"پاپا! اب تانیہ کو بھول جائیں۔" احتشام نے کہا۔ "وہ اپنی مرضی سے مراد کے ساتھ گوٹھ جا چکی ہے۔"

"اب ہم لوگ صرف اس کے لیے دعا ہی کر سکتے ہیں۔" اکرام نے کہا۔

"ایسی بات بھی نہیں ہے پاپا!" احتشام نے کہا۔ "میں اب بھی اس گوٹھ کی اینٹ سے اینٹ بجا سکتا ہوں لیکن جب تانیہ خود ہی موت کے منہ میں جانے کو تیار ہے تو جائے۔"

ماجدہ بیگم یہ سن کر بُری طرح رونے لگیں۔ "میری بچی نہ جانے کس حال میں ہوگی اور کس مجبوری کے تحت وہاں گئی ہوگی۔"

"کوئی مجبوری نہیں تھی اسے ماجدہ بیگم!" اکرام نے کہا۔ "اس راستے کا انتخاب اس نے خود ہی کیا ہے۔"

"تو کیا ہم اسے اسی طرح لاوارث چھوڑ دیں؟" ماجدہ بیگم نے کہا۔

"وہ ہمیں اپنا وارث سمجھے تب نا! اس کے باوجود میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تانیہ کی طرف سے ہلکا سا اشارہ بھی ہوا تو میں اسے گوٹھ سے نکال لاؤں گا۔" احتشام نے کہا۔ "بس فی الحال اسے بھول جائیں۔ تانیہ جیسے لوگ ٹھوکر لگنے کے بعد ہی سنبھلتے ہیں۔" احتشام کے لہجے میں افسردگی تھی۔

☆☆☆

گوٹھ کی گلیاں پھولوں سے سجی ہوئی تھیں۔ گلی کے دونوں سروں پر گاؤں کے مرد، عورتیں اور بچے تھے جو مراد کی لینڈ کروزر پر گلاب کی پتیاں نچھاور کر رہے تھے۔ گوٹھ کے ہر فرد کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔

"یہ سب تم نے کیا ہے نا؟" تانیہ نے ہنس کر کمال سے پوچھا۔ اس کا خوف خاصی حد تک زائل ہو چکا تھا۔

"میں بھاجائی کو لے کر آؤں اور اتنا بھی نہ کروں!" کمال نے مسکرا کر جواب دیا۔

ان کی گاڑیاں جب حویلی کے صدر دروازے کے پاس پہنچیں تو ڈھول کی تھاپ پر گوٹھ کے مرد اور عورتیں رقص کر رہے تھے۔ ان کی گاڑی پھولوں اور پتیوں سے ڈھک چکی تھی۔

ایک گارڈ نے آگے بڑھ کر لینڈ کروزر کا دروازہ کھول دیا۔ پہلے مراد گاڑی سے نیچے اترا، پھر تانیہ شرماتی لجاتی گاڑی سے باہر آئی۔ اچانک فضا گولیوں کی آواز سے گونج کر رہ گئی۔ تانیہ نے سہم کر مراد کا ہاتھ تھام لیا۔

"گھبراؤ مت!" مراد مسکرایا۔ "گوٹھ والے اپنی خوشی کا اظہار کر رہے ہیں۔ وہ نئی دلہن کا استقبال کر رہے ہیں۔"

گوٹھ کی ایک عورت نے تانیہ کو سرخ دوپٹا اوڑھا دیا اور اسے پھولوں سے لاد دیا گیا۔

کمال اس کے گلے میں ڈالے جانے والے ہار لے کر اپنے ایک ملازم کو پکڑاتا رہا۔

حویلی کی رونق کے آخری سرے پر وہ انسان کھڑا تھا جس نے زندگی میں پہلی دفعہ بیٹے کے سامنے اپنی انا کی شکست تسلیم کی تھی۔ وہ شہباز خان تھا۔ اس نے بڑھ کر بے تابی سے مراد کو گلے لگا لیا۔ مراد کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

پھر کمال کے اشارے پر تانیہ نے آگے بڑھ کر شہباز خان کو سلام کیا۔

"وعلیکم السلام!" اس نے سرد مہری سے کہا اور تانیہ کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ "ہمیشہ خوش رہو۔" لیکن اس کے لہجے میں کھوکھلاپن تھا جسے تانیہ، کمال اور مراد نے بھی محسوس کیا۔

"بابا... پہلے اپنی اماں اور دادی سے مل لو۔ وہ تمہارے لیے بہت پریشان تھیں۔"

مراد، تانیہ کو لے کر دادی کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ اچانک یوں اٹھ کر بیٹھ گئیں جیسے کبھی بیمار ہی نہ ہوئی ہوں۔ وہ دیوانہ وار مراد کی پیشانی اور چہرے پر پیار کر رہی تھیں اور کہتی جا رہی تھیں۔ "مجھے چھوڑ کر کہاں چلا گیا تھا؟ اب تو مجھے چھوڑ کر کبھی نہیں جائے گا نا؟"

"نہیں دادی! اب میں کبھی نہیں جاؤں گا۔ آپ اپنی بہو سے تو مل لیں۔"

تانیہ نے آگے بڑھ کر انہیں سلام کیا تو جواب میں انہوں نے ہزاروں دعائیں دیں اور مراد سے کہا۔ "مراد پتر! بہو تو ہیرا ہے ہیرا! چاند کا یہ ٹکڑا تو نے کہاں سے ڈھونڈا؟"

"بس دادی مل گیا۔" مراد ہنس کر بولا۔ پھر اس نے تانیہ سے کہا۔ "آؤ ذرا اماں سے بھی مل لیں۔"

مراد، اماں کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ بُری طرح روتی ہوئی مراد سے لپٹ گئی اور اس کا سر اور پیشانی چومنے لگی۔

پھر تانیہ نے اماں کو سلام کیا تو اس نے سرد مہری سے جواب دیا اور شہباز خان کی طرح دکھاوے کے لیے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور بولی۔ "سدا سہاگن رہو، ہمیشہ خوش رہو۔"

پھر شوخ سی ایک لڑکی پہلے مراد کی گردن میں جھولی، پھر تانیہ سے لپٹ گئی۔ وہ تانیہ کی نند مارو ہی تھی۔

اس حویلی میں صرف تین افراد نے تانیہ کو نظر انداز کیا تھا، شہباز خان، نواز خان اور شہباز خان کی بیوی اور مراد کی ماں نور بانو۔

تانیہ نے وہاں پہنچ کر سکھ کا سانس لیا ورنہ اس کا خیال تھا کہ گوٹھ پہنچتے ہی مراد کو اور اسے قید کر دیا جائے گا یا انہیں گولیوں سے بھون دیا جائے گا۔ مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ جہاں تک اماں اور شہباز خان کی بے اعتنائی کا سوال تھا تو وہ اپنی محبت اور خدمت سے ان کا دل جیت سکتی تھی۔ وہ اس بات پر سو فیصد یقین رکھتی تھی کہ جو دلوں کو فتح کر لے، وہی فاتحِ زمانہ!

مارو ہی نے اسے اس کے کمرے میں پہنچا دیا۔ مراد اپنے دوستوں اور مزارعوں سے ملنے کے بعد رات گئے واپس آیا۔

تانیہ اس کے انتظار میں جاگ رہی تھی، اس نے کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ وہ مراد کو دیکھتے ہی بیڈ سے اٹھی اور بولی۔ "کھانا لاؤں آپ کے لیے؟"

"کھانا!" مراد نے کہا۔ "یہ کھانے کا وقت ہے؟"

"یہی بات اگر میں آپ سے پوچھوں کہ یہ آنے کا وقت ہے تو؟" تانیہ شوخ لہجے میں بولی۔

"میں نے کھانا کھا لیا ہے۔" وہ بیڈ کی طرف بڑھتے ہوئے بولا پھر چونکا۔ "کیا تم نے اب تک کھانا نہیں کھایا؟"

"میری بات چھوڑیں۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"اچھا یار! جاؤ لے آؤ کھانا... میں نے بھی دو تین گھنٹے پہلے کھایا تھا، اب تک تو ہضم بھی ہو گیا ہوگا۔"

کھانے کے بعد مراد نے تانیہ سے کہا۔ "مجھے تو اب اکثر زمینوں پر جانا ہوگا۔ کبھی ہاریوں کے آپس میں جھگڑے نمٹانے کے لیے دیر تک باہر رہنا ہوگا۔ تم میرا انتظار مت کیا کرو اور کھانا کھا لیا کرو۔ ہاں اگر کھانے کے وقت میں بھی موجود ہو تو ہم مل کر ایک ساتھ کھانا کھا لیں گے۔"

تانیہ نے اسے شاکی نظروں سے دیکھا لیکن بولی کچھ نہیں۔

☆☆☆

مراد، شہباز خان اور کچھ دوسرے افراد اوطاق میں بیٹھے تھے۔ اسی وقت نواز خان وہاں آیا اور افسردگی سے بولا۔ "ادا سائیں! کورٹ نے ہمارے خلاف فیصلہ دے دیا۔ اب زمین کے اس ٹکڑے کا قبضہ وڈیرے عابد کو دینا ہی پڑے گا۔"

"نہیں بابا! ایسے کیسے قبضہ دے دیں گے۔ ہم ہائی کورٹ میں جائیں گے، ضرورت پڑی تو سپریم کورٹ میں بھی جائیں گے۔ یہ ہماری عزت کا سوال ہے بابا... وڈیرے شہباز خان کی عزت کا سوال!"

"بابا سائیں!" مراد نے پوچھا۔ "وہ زمین کتنی ہے جس کے لیے اتنے برسوں سے مقدمہ چل رہا ہے؟"

"مراد پتر! بات زمین کی نہیں، ہماری آن کی ہے۔ وہ زمین تو مشکل سے چار، پانچ ایکڑ ہوگی لیکن اس کی وجہ سے میرے چار بہترین آدمی مارے جا چکے ہیں۔ چھ آدمی اب بھی زخمی حالت میں اسپتال میں پڑے ہیں۔"

"بابا سائیں! اس جھگڑے میں وڈیرے عابد کا بھی تو نقصان ہوا ہوگا؟"

"تو کیا سمجھتا ہے کہ میں نے اس کے آدمیوں کو چھوڑ دیا ہوگا؟ اس کے پانچ چھ آدمی مارے گئے ہیں، اس سے زیادہ زخمی ہیں۔ مراد مینا! اس مقدمے میں جانی نقصان کے ساتھ ساتھ مجھے بہت زیادہ مالی نقصان بھی اٹھانا پڑا ہے۔ اب تک میں وکیلوں کو بیس لاکھ روپے دے چکا ہوں۔ میں اتنی آسانی سے اسے زمین کا قبضہ کیسے دے دوں گا۔"

"بابا سائیں! اس مقدمے کو چلتے ہوئے پندرہ سال تو گزر چکے ہیں۔ ابھی تک ہمیں حاصل کیا ہوا ہے؟ وڈیرے عابد کی دشمنی، خون خرابا... مقدمے بازی!"

"یہ سب تو وڈیروں کے مشغلے ہوتے ہیں مراد پتر! تو نے بچپن سے لے کر اب تک شہر میں تعلیم حاصل کی ہے۔ تجھے تو ہماری روایات اور رسم و رواج کا بھی پتا نہیں ہے۔"

"بابا سائیں! میرے پاس ایک حل ہے۔ ہم ہائی کورٹ میں جانے کے بجائے اگر زمین کا وہ ٹکڑا وڈیرے عابد کو تحفے کے طور پر دے دیں تو اسے زیادہ شرمندگی ہوگی۔ یوں برسوں کی یہ دشمنی بھی ختم ہو جائے گی اور..."

"بس بابا بس!" شہباز خان نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا۔ "تو شہر میں رہ کر بالکل بزدل ہو گیا ہے۔ تجھ میں جاگیرداروں والی وہ آن بان ہی نہیں ہے۔ اپنے چھوٹے بھائی کمال کو دیکھ، تعلیم اس نے بھی حاصل کی ہے لیکن میں نے اسے شہر نہیں بھیجا۔ وہ ہمیشہ میرے ساتھ رہا ہے۔ تو نے اس کا رعب اور دبدبہ دیکھا ہے؟"

"بابا سائیں! بات بزدلی کی نہیں ہے بلکہ..."

"بس چپ ہو جا مراد!" نواز خان بھتا کر بولا۔ "ہمارے دادا سردار ایاز خان نے ایک کتے کی خاطر چھ آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ یہ تو پھر زمین کا معاملہ ہے۔"

www.pkdigest.com

"چاچا سائیں! کیا اس وقت یہاں کوئی قانون نہیں تھا... کیا پولیس اور عدالتیں نہیں تھیں؟"

"بابا! وہ انگریزوں کا دور تھا۔ پولیس بھی تھی اور قانون بھی۔ لیکن یہ قانون ہم جیسے جاگیرداروں کے لیے نہیں ہوتا۔ آج بھی اس علاقے میں آنے والا نیا صوبیدار (ایس ایچ او) سب سے پہلے سلام کرنے حویلی پر حاضری دیتا ہے۔"

"بابا سائیں! تو پھر زمین کے اس ٹکڑے کے لیے اتنا خون خرابا کیوں ہو رہا ہے؟"

"تو نہیں سمجھے گا۔" نواز خان نے کہا۔ "بابا جن لوگوں سے جھگڑا ہے، وہ بھی کوئی معمولی لوگ نہیں ہیں۔ وہ بھی ہماری ٹکر کے جاگیردار ہیں۔ ایسے موقعوں پر پولیس خاموش تماشائی بن جاتی ہے اور خانہ پری کے لیے دونوں فریقوں کے آدمیوں کو گرفتار کرلیتی ہے۔"

"تو اپنا دماغ مت کھپا، تجھے صبح زمینوں پر بھی جانا ہے۔ تجھے بھی معلوم تو ہو کہ ہماری زمین کتنی ہے اور کہاں تک ہے۔" شہباز نے کہا۔

☆☆☆

تانیہ ٹیلی فون کرنے کے لیے ڈرائنگ روم میں گئی کیونکہ ٹیلی فون سیٹ وہیں رکھا تھا۔ مراد نے اسے سمجھایا تھا کہ وہ اپنی امی سے بات کرے اور انہیں بتا دے کہ میں یہاں بالکل خیریت سے ہوں اور اگر آپ چاہیں گی تو بہت جلد آپ سے مل بھی لوں گی۔

وہ ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کر رہی تھی کہ مراد کی ماں تیزی سے کمرے میں داخل ہوئی اور ریسیور اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔

"مجھے ایک ضروری ٹیلی فون کرنا ہے اماں!" تانیہ نے جھنجلا کر کہا۔

"حویلی کی کسی بھی عورت کو ٹیلی فون کرنے کی اجازت نہیں ہے۔" اماں نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ "تم نے کبھی ماروی کو یا مجھے... ٹیلی فون کے پاس بھی دیکھا ہے؟"

"لیکن مجھے ایک ضروری کال کرنا ہے اماں! میں..."

اسی وقت شہباز خان کمرے میں داخل ہوا اور کہنے لگا... "سن چھوری! ہم تجھے صرف مراد کی وجہ سے برداشت کررہے ہیں ورنہ کبھی کا حویلی سے اٹھا کر باہر پھینک چکے ہوتے۔"

"بابا سائیں! میں..."

"بس چھوری! زیادہ بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے خاندان میں لڑکیوں کو بڑوں کے سامنے بولنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔"

تانیہ پیر پٹختی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

"سائیں! اس چھوری کے مزاج ہی نہیں ملتے۔" نور بانو نے بپھر کر کہا۔ "چار اکھر (لفظ) کیا پڑھ لیے ہیں کہ اس کا دماغ ساتویں آسمان پر پہنچ گیا ہے۔"

"اسے سمجھاؤ کہ اس حویلی کی روایات کیا ہیں اور لڑکیاں یہاں کیسے رہتی ہیں؟" شہباز خان نے ناگواری سے کہا۔ "میں تو کمال سے کیے ہوئے وعدے کی وجہ سے مجبور ہوں ورنہ اس لڑکی کو دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اتر آتا ہے۔ اس کے باپ نے بھی میری جو توہین کی ہے، میں اسے بھی کبھی نہیں بھول سکتا۔"

تانیہ اپنے کمرے میں آگئی اور اپنی توہین پر اس کے آنسو بہنے لگے۔

ماروی اس کے کمرے میں داخل ہوئی تو اسے روتا دیکھ کر چونک اٹھی...... "کیا ہوا بھاجائی! کیا ادا مراد نے کچھ کہہ دیا؟"

"نہیں ماروی! وہ بے چارے کیا کہیں گے۔ یہ حویلی نہیں بلکہ قید خانہ ہے۔ سونے کے اس پنجرے میں میرا دم گھٹنے لگا ہے ماروی! پہلے بابا سائیں نے میرا سیل فون چھینا اب گھر کے ٹیلی فون سے بھی فون کرنے پر پابندی لگادی۔"

"بھاجائی! یہ تو اس حویلی کی روایت ہے۔ گھر کی کسی بھی عورت کو ٹیلی فون کرنے کی آزادی ہے، نہ آنے والا فون موصول کرنے کا اختیار۔ اس حویلی میں رہو گی تو اس ماحول کی عادی ہو جاؤ گی۔"

"میں اس حویلی میں نہیں رہوں گی ماروی۔" تانیہ نے کہا۔ "کمال تو بڑے بڑے وعدے کرکے مجھے یہاں لایا تھا۔ اب اس کے وعدے کیا ہوئے؟ کئی دن سے اس کی شکل بھی نظر نہیں آئی۔"

"بھاجائی! آپ پریشان نہ ہوں۔" ماروی نے کہا۔ "کل سومل، رانو اور نوری بھی آرہی ہیں۔ سومل اور رانو میری خالہ زاد ہیں اور نوری ماما کی بیٹی ہے۔ پھر ہم لوگ خوب ہلا گلا کریں گے۔ زمینوں پر گھومنے جائیں گے۔ آم کے باغوں کی سیر کریں گے اور نہر میں تیریں گے۔ آپ کو تیرنا آتا ہے بھاجائی؟"

"ہاں، مجھے سوئمنگ بھی آتی ہے اور شوٹنگ بھی۔ کیا ہم شکار بھی کرسکتے ہیں؟"

"آپ شکار کرسکتی ہیں بھاجائی؟" ماروی حیرت اور خوشی سے بولی۔

"ہاں... میں پاپا اور بھیا کے ساتھ اکثر شکار پر جاتی تھی۔ میں نے تو اپنے شوق سے تھری ناٹ تھری اور ریوالور چلانا بھی سیکھا ہے اور میرا نشانہ بھی برا نہیں ہے۔"

"پھر تو بہت مزہ آئے گا بھاجائی۔" ماروی نے کہا۔ "بس وہ لوگ آجائیں پھر ہم گھومنے پھرنے کا پروگرام بنائیں گے۔"

"لیکن ماروی! کیا بابا سائیں اس کی اجازت دے دیں گے؟"

"بھاجائی! سال میں ایک دفعہ تو ہم لڑکیوں کو باہر گھومنے کی اجازت ملتی ہے۔ ہمارے ساتھ بابا سائیں اور ماما کے بیس پچیس گارڈز ہوتے ہیں۔ ان میں سے کچھ جیپوں پر اور کچھ گھوڑوں پر ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ خوف ناک قسم کے شکاری کتے بھی ہوتے ہیں اور وہ علاقہ میلوں تک غیر مردوں کے لیے ممنوعہ ہوتا ہے جہاں ہم لوگ پکنک مناتے ہیں۔"

تانیہ بھی یہ سن کر خوش ہوگئی کہ کچھ ہی دیر کے لیے سہی، اسے گھٹن سے نجات تو ملے گی۔

دوسرے دن سومل، رانو اور نوری بھی آگئیں۔ تینوں ہی بے مثال حسن کی مالک تھیں لیکن اس گھٹن زدہ ماحول نے ان کی خود اعتمادی کو ختم کردیا تھا۔ اس کے باوجود نوری اچھی ذہین، حاضر جواب اور شوخ لڑکی تھی۔ وہ تانیہ سے جلد ہی بے تکلف ہوگئی۔ [illegible] بہت پہلے آگئی تھی۔

سومل البتہ اس سے دور دور تھی۔ پھر اس کی وجہ بھی تانیہ کی سمجھ میں آگئی۔ گھر کے بزرگوں کی مرضی تھی کہ مراد اور سومل کی شادی ہو۔ سومل بھی شاید مراد کو پسند کرتی تھی لیکن ان دونوں کے بیچ میں اچانک تانیہ آگئی تھی۔ وڈیرا شہباز خان، مراد کی شادی مریم سے کرنا چاہتا تھا اس لیے اس نے سنجیدگی سے کبھی سومل کے رشتے پر غور نہیں کیا تھا۔

دوسرے دن علی الصباح ماروی نے تانیہ کو جگادیا اور بولی۔ "بھاجائی! تیار ہوجاؤ۔ گاڑیاں تیار ہیں اور ہم لوگ نکلنے والے ہیں۔"

اپنا گھر چھوڑنے کے بعد یہ پہلا موقع تھا جب تانیہ نے مکمل پرسکون کا سانس لیا۔ اس نے نہر میں تیراکی بھی کی اور اپنی نشانے بازی سے دوسری لڑکیوں کے ساتھ ساتھ حویلی کے ان ملازمین کو بھی حیران کردیا جو ان کی خدمت کے لیے خصوصی طور پر ان کے ساتھ آئے تھے۔

سورج غروب ہونے کے بعد خواتین کے اس قافلے کی واپسی ہوئی۔

واپس پہنچ کر تانیہ کو معلوم ہوا کہ مراد بھی زمینوں پر گیا ہوا ہے۔

"مراد ہمیں تو کہیں نہیں ملے؟" تانیہ نے ماروی سے پوچھا۔

"بھاجائی! ہماری زمین تو دور دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ ادا مراد کسی دوسری طرف گئے ہوں گے۔ وہ بھی رات تک یا صبح واپس آجائیں گے۔"

اسی وقت باہر سے زور زور سے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ان میں سب سے زیادہ نمایاں آواز نواز خان کی تھی۔ وہ بلند آواز میں کہہ رہا تھا۔ "ادا سائیں! اب اس وڈیرے عابد کی اتنی جرأت ہوگئی ہے کہ وہ سرعام ہم پر آوازیں کستا ہے۔ اس کے آدمی ہمارا مذاق اڑاتے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی اس نے مجھ پر مقدمے کے حوالے سے طنز کیا تھا۔ میں نے بھی اس کا گریبان پکڑ لیا۔"

"بابا کوئی فائرنگ وغیرہ تو نہیں ہوئی... کوئی مارا تو نہیں گیا؟" شہباز خان فکرمندی سے بولا۔ "اب پہلے والی بات نہیں ہے بابا! عدالتیں آزاد ہیں۔ وہ حکومت کے دباؤ میں نہیں ہیں۔"

"اگر مولوی ابراہیم بیچ میں نہ آجاتا تو وڈیرا میرے ہاتھوں مارا جاتا ادا سائیں! میں نے اسے خبردار کردیا ہے کہ اگر اس نے میرے راستے میں آنے کی کوشش کی تو میں اسے گولی ماردوں گا۔"

"اپنے غصے پر قابو رکھ نواز! تیری یہ دھمکی وہاں موجود ہر آدمی نے سنی ہوگی۔ اب وڈیرا عابد اگر کسی اور کے ہاتھوں بھی مارا گیا تو پولیس کا شک تجھ پر جائے گا۔ وہ کوئی بے بس ہاری نہیں بلکہ وڈیرا ہے۔ آج کل ان کی گدی ویسے بھی چڑھی ہوئی ہے۔ اس کے مامے کا ایک بیٹا منسٹر بھی ہے۔"

"ہوا کرے ادا سائیں! میں ڈرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ وہ اگر میری بے عزتی کرے گا تو میں اسے چھوڑوں گا نہیں، چاہے بعد میں مجھے پھانسی ہی پر کیوں نہ چڑھنا پڑے۔"

"یہ کس قسم کے لوگ ہیں ماروی؟" تانیہ نے نواز کی بات سن کر کہا۔ "زمین کا وہ منحوس ٹکڑا نہ جانے کتنی جانوں کی بھینٹ لے چکا ہے اور مزید نہ جانے کتنی جانیں لے گا۔"

"بھاجائی! یہ سب تو چلتا رہتا ہے۔ میں تو بچپن سے ہی یہ خون خرابا اور مقدمے بازی دیکھتی آئی ہوں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ یہ ان لوگوں کا روز کا معمول ہے بلکہ بابا سائیں تو اسے جاگیرداروں کا مشغلہ کہتے ہیں۔"

☆☆☆

www.pkdigest.com

رات کے شاید تین بجے کا عمل تھا جب نواز خان سراسیمگی کے عالم میں حویلی میں داخل ہوا۔ وہ سیدھا شہباز خان کے کمرے میں پہنچا اور اسے بیدار کر دیا۔ نور بانو بھی اٹھ گئی۔

''بابا! اب کیا قیامت آ گئی ہے؟''

''اداسائیں! میں ابھی اپنے دوست عارف کے گوٹھ سے واپس آ رہا تھا۔ راستے میں مجھے وڈیرا عابد نظر آ گیا۔ اس کی گاڑی شاید پنکچر ہو گئی تھی۔ وہ بھی اکیلا ہی تھا۔ میں نے اسے للکارا اور اس کے سنبھلنے سے پہلے اس پر فائر کر دیا۔''

''کیا مطلب ہے نواز! تو نے اسے مار دیا؟'' شہباز خان کے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔

''میں اسے صرف زخمی کرنا چاہتا تھا لیکن وہ عین وقت پر جھک گیا اور میرے ریوالور کی گولی اس کے سینے میں لگ گئی۔ وہ تو اسی وقت مر گیا تھا اداسائیں!''

''میں نے تجھ سے کہا بھی تھا کہ ہوش سے کام لے مگر تیری سمجھ میں نہیں آیا۔''

''اداسائیں! میں ابھی اور اسی وقت یہاں سے نکل رہا ہوں۔''

اسی وقت کمال ان کی آوازیں سن کر آ گیا اور دروازے پر رک گیا۔

''تیرے کہیں جانے سے یہ مسئلہ تو حل نہیں ہوگا بلکہ تو زندگی بھر پولیس سے چھپتا پھرے گا۔ تو نے بہت سے لوگوں کے سامنے وڈیرے عابد کو جان سے مارنے کی دھمکی دی تھی۔ سب سے بڑا گواہ تو مولوی ابراہیم ہی ہے۔ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولے گا۔ بابا! اب تیری جان بچانے کا صرف ایک ہی حل ہے۔''

''وہ کیا ادا؟''...... نواز خان نے حیرت سے پوچھا۔

''بابا! اپنے خاندان کی کسی لڑکی کو قتل کر کے اس کی لاش وڈیرے عابد کی لاش کے ساتھ ڈال دو اور اسے کاروکاری کا کیس بنا دو۔'' شہباز خان کے لہجے میں سفاکی تھی۔

''اپنے گھر کی لڑکی کو؟'' نواز خان نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں بابا... دیر مت کرو۔ اس وقت گھر میں ماروی ہے، موِل ہے، دراتو ہے، نوری ہے۔ تو کسی کو بھی وہاں لے جا کر قتل کر دے۔''

''گھر کی لڑکی کو کیوں؟'' نور بانو کے لہجے میں نفرت تھی۔ ''وہ تنہا کی تانیہ کس دن کام آئے گی؟''

''ہاں بابا! یہ ٹھیک ہے۔ اس طرح اس سے جان بھی چھوٹ جائے گی۔'' شہباز خان نے کہا۔ ''موقع بھی اچھا ہے۔ مراد بھی زمینوں پر ہے۔ جاؤ بابا... جلدی کرو۔''

تانیہ کا نام سن کر کمال پہلے ہی وہاں سے بھاگتا ہوا تانیہ کے کمرے میں پہنچ گیا۔ تانیہ گہری نیند میں تھی۔ کمال نے اسے جھنجوڑ کر اٹھا دیا۔

''کک... کیا ہوا کمال؟''

''بھاجائی! جلدی کرو، نکلو یہاں سے... چاچاسائیں تمہیں مارنے آ رہا ہے۔''

''مجھے مارنے؟'' تانیہ نے حیرت سے کہا۔

''یہ باتوں کا وقت نہیں ہے بھاجائی!'' کمال نے کہا۔ ''چلو، میرے ساتھ آؤ۔ ادھر سے نہیں، ادھر کھڑکی سے باہر کودو۔''

تانیہ سراسیمگی کے عالم میں کھڑکی سے باہر کود گئی۔ اس کے پیچھے کمال بھی کودا اور بولا۔ ''بھاگو بھاجائی، بھاگو!'' وہ تانیہ کا ہاتھ پکڑ کر اندھیرے میں دوڑنے لگا۔ بھاگتے بھاگتے اس نے اپنا ریوالور بھی نکال لیا تھا۔ وہ اندھیرے میں گرتے پڑتے بھاگے جا رہے تھے۔

اچانک کمال کو پتھر سے ٹھوکر لگی اور وہ اوندھے منہ گر پڑا۔ اس کا ہاتھ تانیہ کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ چیخ کر بولا۔ ''بھاگو بھاجائی! رکو مت، میری فکر مت کرو۔ تمہاری جان خطرے میں ہے۔''

تانیہ پھر اندھا دھند دوڑنے لگی۔

☆☆☆

نواز خان، تانیہ کے کمرے میں پہنچا تو کمرا خالی تھا۔ اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ پھر باتھ روم کے دروازے پر دستک دی اور بولا۔ ''تانیہ... تانیہ بیٹا! کیا تم اندر ہو؟''

کوئی جواب نہ آیا۔ اس نے باتھ روم کا دروازہ دھکیلا تو وہ کھل گیا۔ اندر اندھیرا تھا۔ اس نے لائٹ جلائی لیکن باتھ روم بھی خالی تھا۔

وہ جھنجلا کر دوبارہ کمرے میں آیا۔ اچانک اس کی نظر کھلی ہوئی کھڑکی پر پڑی۔ اس نے ٹارچ کی تیز روشنی ڈالی تو اسے کھڑکی کے عین نیچے ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑے اور پیروں کے نشانات دکھائی دیے۔ وہ غرا کر بولا۔ ''بھاگ گئی بدبخت! لیکن بھاگ کر کہاں جائے گی؟''

پھر وہ بھنّا کر کمرے سے باہر نکلا اور شہباز خان کو بتایا کہ تانیہ فرار ہو گئی ہے۔

''بابا! جاؤ اس کا پیچھا کرو... وہ زیادہ دور نہیں گئی ہو گی۔ وہ نہیں ملی تو پھانسی کا پھندا تیری گردن میں ہوگا۔'' پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ''بابا، یہ کام تجھے اکیلے ہی کرنا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ حویلی کا کوئی بھی آدمی اس کا گواہ ہو... اب جا اور اسے تلاش کر کے گولی مار دے۔''

ماروی نے بھی شہباز خان کی یہ بات سن لی تھی۔ وہ نواز خان کی بلند آواز سے بیدار ہو گئی تھی۔ نواز خان تیزی کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔ ماروی اضطراب کے عالم میں ٹہلنے لگی۔ نیند اس کی آنکھوں سے اڑ گئی تھی۔ وہ عالم اضطراب میں ٹہلتی ہوئی باہر لان میں نکل آئی۔ وہاں بالکل سناٹا تھا، صرف گیٹ پر گارڈز تھے۔ وہ بھی خاموش تھے۔ بس کبھی کبھی ان میں سے کسی کے کھانسنے کی آواز آ جاتی تھی۔

اسی وقت کوئی گاڑی گیٹ پر آئی۔ گاڑی پورچ میں رکی تو ماروی خوش ہو گئی۔ وہ مراد کی لینڈ کروزر تھی۔

ماروی جھپٹ کر اس کے پاس پہنچی اور جلدی جلدی اسے پوری بات بتا دی۔

مراد غصے سے کانپنے لگا۔ ''چاچاسائیں کس طرف گیا ہے؟'' اس نے بپھر کر پوچھا۔

''وہ بیلے کے علاقے میں گیا ہے اور وہاں گاڑی نہیں جا سکتی۔ وڈیرے عابد کی لاش جنگل کے دوسرے سرے پر پڑی ہے۔''

مراد نے اپنا ریوالور نکالا اور دوڑتا ہوا باہر نکل گیا۔ وہ اندھیرے میں اندھا دھند بھاگ رہا تھا۔

اس کا بچپن انہیں جنگلوں میں بھاگتے دوڑتے گزرا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ راستہ کہاں ہموار ہے اور کہاں گڑھے ہیں۔ اس کی رفتار بہت تیز تھی۔

دس منٹ کے بعد اسے ایک ہیولا سا نظر آیا۔ اس کے قد و قامت اور چال ڈھال سے مراد نے اندازہ لگایا کہ وہ نواز خان ہے۔

اس نے چیخ کر کہا۔ ''چاچاسائیں! رک جاؤ چاچاسائیں!''

جواب میں فائر کا دھماکا ہوا اور گولی مراد کے پاس سے گزر گئی۔

مراد نے بھی جھنجلا کر اس سائے پر فائر کر دیا۔

نواز نے پھر فائر کیا۔ اس مرتبہ قسمت نے مراد کا ساتھ نہیں دیا اور گولی اس کے بائیں بازو میں اتر گئی۔ اس کا بایاں بازو بے جان ہو کر جھولنے لگا لیکن اس نے ہمت نہ ہاری۔ مسئلہ تانیہ کی زندگی کا تھا۔ اس نے پھر فائر کیا۔ جواب میں اسے نواز خان کی چیخ سنائی دی۔ نواز خان یا تو اس کی گولی سے مارا گیا تھا یا پھر زخمی ہو گیا تھا۔

مراد پھر اندھا دھند آگے کی طرف دوڑا۔ یہی اس کی غلطی تھی۔ اس مرتبہ گولی اس کے سینے میں پیوست ہو گئی۔ اسے دھچکا سا لگا۔ وہ لڑکھڑایا اور اوندھے منہ گر گیا، پھر جسم کی پوری قوت مجتمع کر کے چیخا۔ ''تانیہ!'' اس کے بعد اس نے پھر اٹھنے کی کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہیں ہو سکا اور اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ وہ تانیہ کو بچانے کی خاطر اپنی زندگی ہار بیٹھا تھا۔

نواز خان کے پیر میں گولی لگی تھی اس لیے اس کی رفتار کچھ کم ہو گئی تھی۔ اس نے اپنی پگڑی پھاڑ کر زخم پر باندھ لی۔ اس طرح خون بہنا فوری طور پر بند ہو گیا۔ وہ ایک مرتبہ پھر گرتا پڑتا آگے کی طرف بھاگنے لگا۔

☆☆☆

تانیہ اندھا دھند بھاگ رہی تھی لیکن اسے راستوں کا کچھ اندازہ نہیں تھا۔ وہ کئی دفعہ پتھروں سے ٹکرا کر اوندھے منہ گری تھی۔ اس کے پیروں سے چپل بھی کہیں نکل گئی تھی اور پیروں میں کانٹوں کی وجہ سے زخم پڑ گئے تھے۔ اس کا جسم بھی کانٹے دار جھاڑیوں کی وجہ سے لہولہان ہو گیا تھا لیکن وہ گرتی پڑتی بھاگی جا رہی تھی۔

اچانک ایک دھماکا ہوا اور اسے ایسا لگا جیسے اس کی دائیں ران میں انگارے سے بھر گئے ہوں۔ وہ الٹ کر گری تو کسی سے ٹکرا گئی۔

اسی وقت نواز خان نے ٹارچ روشن کی تو تانیہ کو کسی آدمی کی لاش نظر آئی۔ اس کے نزدیک ہی اس کا ریوالور پڑا ہوا تھا۔ وہ وڈیرے عابد کی لاش تھی۔ موت نے اسے ریوالور استعمال کرنے کی مہلت ہی نہیں دی تھی۔

نواز خان نے تانیہ پر پھر فائر کیا لیکن وہ کروٹ کے بل لڑھک گئی۔ اس کے ساتھ ہی وڈیرے عابد کا ریوالور اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ پھر اس سے پہلے کہ نواز مزید فائر کرتا، تانیہ نے نشانہ لیا اور نواز خان پر فائر کر دیا۔ گولی اس کے سینے میں پیوست ہو گئی۔ ٹارچ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گئی۔

تانیہ نے ٹارچ اٹھائی اور اس کی روشنی میں نواز خان کا جائزہ لیا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں اور وہ زندگی سے ناتا توڑ چکا تھا۔ تانیہ تھکے تھکے انداز میں وہاں سے روانہ ہو گئی۔

☆☆☆

سپاہی اللہ بخش اس وقت تھانے کے گیٹ پر تھا جب ایک عورت وہاں پہنچی۔ اس کے ایک ہاتھ میں ریوالور اور دوسرے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ اس کے بال الجھے ہوئے تھے اور لباس تار تار تھا، جسم لہولہان تھا۔ سب سے زیادہ خون اس کی ران سے بہہ رہا تھا۔

اس نے اللہ بخش سے کہا۔ ''میں نے وڈیرے نواز

www.pkdigest.com

خان کو قتل کر دیا ہے۔ مجھے گرفتار کر لو۔"

☆☆☆

دوسری صبح شہباز خان پر قیامت بن کر ٹوٹی۔ اس کا بڑا بیٹا مراد مارا جا چکا تھا، بھائی بھی زندگی ہار بیٹھا تھا اور کمال بُری طرح زخمی تھا۔ اسے بھی پولیس ہی نے اسپتال پہنچایا تھا۔ انسپکٹر لاشاری اس وقت شہباز خان کے سامنے بیٹھا تھا۔

وہ شہباز خان سے کہہ رہا تھا۔ "سائیں! آپ کی بہو کا بیان ہے کہ اس نے صرف ایک قتل کیا ہے۔ ہمیں موقع سے ایک لاش اور بھی ملی ہے۔ وڈیرے عابد کی لاش۔ سوال یہ ہے کہ اسے کس نے قتل کیا ہے؟"

"بابا! یہ معلوم کرنا تو تم لوگوں کا کام ہے۔" وڈیرے نے کہا۔

"سائیں! وہاں سے کچھ فاصلے پر ہمیں آپ کا چھوٹا بیٹا زخمی حالت میں ملا ہے اور اس سے کچھ فاصلے پر آپ کے بڑے بیٹے کی لاش ملی ہے۔"

"بابا! یہ سب معلوم کرنا تم لوگوں کا کام ہے۔ میرا ذہن اس وقت کام نہیں کر رہا ہے۔"

"ہم نے آپ کی بہو کو بھی اسپتال پہنچا دیا ہے۔ وہ بھی زخمی ہے اور خون بہت زیادہ بہہ گیا ہے۔" پھر انسپکٹر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ "سائیں! اب اجازت دیں۔ ضرورت پڑی تو آپ کو پھر زحمت دوں گا۔"

☆☆☆

احتشام نے اخبار میں تانیہ کے بارے میں پڑھا، پھر کئی ٹی وی چینلز نے بھی وہ خبر نشر کی۔ وہ بے چین ہو گیا اور فوری طور پر گوٹھ جانے کی تیاری کرنے لگا۔

وہ گوٹھ پہنچا تو مراد کا سوئم ہو رہا تھا۔ کمال وہیل چیئر پر بیٹھا تھا۔ اس موقع پر پولیس نے پیرول پر تانیہ کو بھی کچھ دیر کے لیے رہا کر دیا تھا۔ وہ بھی وہیل چیئر پر تھی۔ وہ احتشام سے لپٹ کر اس بُری طرح روئی کہ پوری حویلی میں ایک مرتبہ پھر صفِ ماتم بچھ گئی۔

احتشام نے بہ مشکل تمام اسے خاموش کرایا اور بولا۔ "تمہارا کیس ہر لحاظ سے مضبوط ہے تانیہ! میں تمہیں رہا کرا لوں گا... پھر میں تمہیں اپنے ساتھ ہی شہر لے جاؤں گا۔"

"نہیں بھائی جان!" تانیہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "میں اس گوٹھ سے کہیں نہیں جاؤں گی۔ اس گوٹھ کی مٹی میں میرا پیار دفن ہے۔ ہاں اس کی نشانی ضرور مجھ میں پرورش پا رہی ہے۔ میں اس کے سہارے زندگی گزار دوں گی۔"

وڈیرے شہباز کو جب یہ اطلاع ملی کہ تانیہ ماں بننے والی ہے تو وہ خوشی سے پاگل ہو گیا۔ وہ تانیہ کے سامنے پہنچا اور اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ "بیٹی! مجھے معاف کر دے۔ میں تیرا گناہ گار ہوں۔"

تانیہ نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور روتے ہوئے بولی۔ "بابا سائیں! آپ تو مجھے گناہ گار کر رہے ہیں۔ آپ میرے مراد کے باپ ہیں تو میرے بھی باپ ہوئے نا... اور کوئی باپ اپنے بچوں سے معافی مانگتا ہے؟"

☆☆☆

چند مہینے بعد کورٹ نے تانیہ کو باعزت بری کر دیا۔ اس نے اپنے دفاع میں نواز خان پر گولی چلائی تھی۔ اس کی زخمی ٹانگ سے برآمد ہونے والی گولی بھی نواز خان کے ریوالور سے چلائی گئی تھی اور وڈیرے عابد کے جسم سے برآمد ہونے والی گولی بھی اسی کے ریوالور سے چلائی گئی تھی۔

بری ہونے کے بعد تانیہ گوٹھ پہنچی تو گوٹھ والوں نے اس کا والہانہ استقبال کیا۔ ان میں وڈیرا شہباز خان پیش پیش تھا۔ کمال بھی بہت خوش تھا۔ اس نے تانیہ سے کہا۔ "بھابی! مجھے افسوس ہے کہ میں اپنا وعدہ نبھا نہ سکا۔"

"ارے، تم کیوں شرمندہ ہو؟ تم نے تو مجھے بچانے کے لیے اپنی جان داؤ پر لگا دی تھی۔ اگر تم نہ ہوتے تو شاید مجھے رسوائی کی موت نصیب ہوتی۔ تم نے تو اپنا فرض پوری طرح نبھایا ہے کمال!"

☆☆☆

چند مہینے بعد تانیہ نے شہر کے سب سے مہنگے اسپتال میں ایک خوب صورت بچے کو جنم دیا۔ وہ بچہ ہو بہو مراد کی تصویر تھا۔

شہباز خان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ اس نے کہا۔ "اس بچے کا نام تانیہ خود رکھے گی۔"

تانیہ نے چند لمحے غور کیا پھر مسکرا کر بولی۔ "اس کا نام مراد ہے بابا سائیں! یہ میری بھی مراد ہے اور آپ کی بھی اور اس سے بڑھ کر یہ میرے پیار کی نشانی ہے۔"

اس موقع پر بریگیڈیئر اکرام، احتشام اور ماجدہ بیگم بھی موجود تھیں۔ ان سب کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے، سوائے تانیہ کے۔ اس کے چہرے پر خوشی بھی تھی اور مراد کی جدائی کا غم بھی۔ وہ اگر اس موقع پر ہوتا تو شاید خوشی سے پاگل ہی ہو جاتا۔ پھر اس نے سر جھٹک کر سوچا۔ "اب یہی میرے لیے مراد ہے، میرا مراد۔" اس نے مراد کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

تجسس و اسرار کی آمیزش کے ساتھ لمحہ بہ لمحہ رنگ بدلتی مہماتی کہانی

کچھ جاوداں لمحے ..... درمیان میں چاہے کتنے ہی ماہ و سال بیت جائیں ..... معطر و تر و تازہ رہتے ہیں ..... اور کچھ لمحات ایسے بھی ہوتے ہیں جو خاموشی سے ان ادوار میں دھکیل دیتے ہیں جنہیں انسان ہر ممکن طور پر بھولنا چاہتا ہے ..... ماضی کے ایک ایسے ہی خوبی واقعے سے وابستہ حادثے کا ماجرا

تحریک

محمد عفان آزاد

وہ تینوں اپنے موٹیل سے نکل کر باہر کی کھلی فضا میں آئے تو ان کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔ آج ان کا ارادہ ساحل کی طرف جانے کا تھا۔ موٹیل سے باہر نکلتے ہی انہوں نے تیزی سے ساحل کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ شاید انہیں ڈر تھا کہ کہیں ممی ڈیڈی میں سے کوئی انہیں آواز دے کر واپس نہ بلا لے۔ اس پارٹی کی قیادت ایک چودہ سالہ لڑکا کر رہا تھا جبکہ اس کی دو بہنیں جن کی عمریں بالترتیب بارہ اور گیارہ برس تھیں، اس کے پیچھے پیچھے چل رہی تھیں۔ اسٹیوگلین دیکھنے میں ہی پُراعتماد اور پُرجوش نظر آتا تھا جبکہ اس کی دونوں بہنوں میں ایسی کوئی خصوصیت نہیں تھی۔ موسم خوش گوار تھا اور دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ وہ بڑے بڑے پتھروں کی ایک قطار کے پاس سے گزرے جو سمندر میں دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اب وہ کئی میل لمبے ساحل تک پہنچ چکے تھے جہاں بہت کم لوگ آتے تھے حالانکہ موٹیل اس جگہ سے زیادہ دور نہیں تھا۔

"لگتا ہے یہاں بھوت رہتے ہیں۔" بارہ سالہ مارگریٹ نے تیس فٹ اونچے ٹیلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو

www.paksociety.com

درختوں سے گھرا ہوا تھا۔ ”ہمیں واپس چلنا چاہیے۔“

”یہ تمہارا وہم ہے۔“ اسٹیو نے بیزاری سے کہا حالانکہ وہ جگہ خود اسے بھی پسند نہیں آئی تھی۔ ”سنسان ہونے کی وجہ سے ایسا لگ رہا ہے۔“

”پھر یہاں آنے کی کیا ضرورت ہے؟“ مارگریٹ نے اسی لہجے میں کہا۔

”ممکن ہے کہ ہمیں یہاں کوئی ایسی چیز نظر آجائے جو پہلے کسی نے نہ دیکھی ہو۔“

”مثلاً؟“

”کچھ بھی مل سکتا ہے... جیسے کوئی نایاب موتی، سیپیاں، نوٹوں سے بھری بوتل وغیرہ وغیرہ۔“

”میں کوئی سو مرتبہ مختلف ساحلوں پر جا چکی ہوں لیکن مجھے آج تک ایسی کوئی چیز نہیں ملی۔“ مارگریٹ منہ بناتے ہوئے بولی۔

اسٹیو اس سے پہلے کبھی کسی ساحل پر نہیں گیا تھا لیکن وہ اس کا اعتراف لڑکیوں کے سامنے نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اپنی بات اوپر رکھنے کی خاطر بولا۔ ”کیا تم کبھی اس ساحل پر آئی ہو؟“

”نہیں۔“

”پھر تو تمہیں ضرور یہاں کی سیر کرنی چاہیے۔“ یہ کہہ کر وہ اس اعتماد کے ساتھ آگے بڑھ گیا کہ دونوں لڑکیاں بھی اس کی تقلید کریں گی۔ این تو فوراً ہی اس کے پیچھے چل پڑی، البتہ مارگریٹ نے کچھ تامل کیا پھر اسے بھی ان کا ساتھ دینا پڑا۔

وہ ساحل کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ پہلے ان کی رفتار تیز تھی پھر ریت نے ان کے پیروں کو پکڑنا شروع کر دیا تو ان کی رفتار بھی آہستہ ہو گئی اور وہ بھاری قدموں کے ساتھ گھسٹنے لگے۔ تقریباً بیس منٹ بعد اسٹیو نے بھی تسلیم کر لیا کہ یہ سفر بے کار ہی ثابت ہو رہا ہے۔ انہیں ابھی تک کوئی ایسی چیز نہیں ملی تھی جسے وہ اپنے ساتھ لے جاتے۔

ایک ڈھلواں ٹیلے کی اونچائی پر پہنچ کر وہ رک گیا۔ اس کے سامنے سمندر میں تین بڑی چٹانیں ایک قطار میں کھڑی تھیں اور پانی سے باہر ان کی بلندی کم از کم ڈیڑھ سو فٹ تھی۔ ان سے ٹکرا کر سمندر کی لہریں بڑی اور خوفناک ہو جاتی تھیں۔

”مجھے تو بوریت ہو رہی ہے۔“ مارگریٹ نے شکوہ کیا۔

”مجھے اندازہ ہے۔“ اس نے مارگریٹ کے خیال کی نفی نہیں کی اور بولا۔ ”ہم واپس جائیں گے۔“

لڑکیاں ٹیلے سے نیچے اترنے لگیں تو وہ بولا۔ ”ایک منٹ ٹھہرو۔ میرے جوتوں میں ریت چلی گئی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ اپنے دائیں پیر کا جوتا اتارنے کے لیے جھکا لیکن اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور سیدھا نیچے ریت میں جا گرا۔

خاموشی کا ایک لمحہ آیا۔ یوں لگا جیسے ہر شے ساکت ہو گئی ہو۔ کہیں سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ دونوں لڑکیاں خوف کے عالم میں اپنی جگہ جامد کھڑی تھیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ معاملے کی تہ تک پہنچیں یا مدد کے لیے دوڑ لگا دیں۔ پھر انہیں اسٹیو کی چیخ سنائی دی۔ وہ خوف اور دہشت کے عالم میں چیخ رہا تھا۔ لڑکیوں نے فوراً ہی موٹیل کی جانب دوڑ لگا دی۔

آدھے گھنٹے بعد دو گاڑیاں اس مقام پر پہنچ گئیں۔ این ان کے ساتھ تھی جبکہ مارگریٹ نے دوبارہ وہاں آنے سے انکار کر دیا تھا۔ دوسری گاڑی میں ان کا باپ بھی مددگار اسٹاف کے ہمراہ آیا تھا۔

”وہ... وہ...“ این نے تین چٹانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ ٹیلا ان چٹانوں کے بالکل سامنے تھا۔ موٹیل کے منیجر نے فوراً ہی گاڑی سے چھلانگ لگا دی اور ٹیلے کی طرف دوڑا۔ اسے وہاں ایک بہت بڑا گڑھا نظر آیا جو ریت کے نیچے پھسل جانے کی وجہ سے بن گیا تھا۔

اس نے زور سے آواز لگائی۔ ”اے لڑکے! کیا تم نیچے موجود ہو؟“

”ہیلپ پلیز!“ اسے لڑکے کی آواز سنائی دی۔ موٹیل کا منیجر آگے کی طرف جھکا اور نیچے دیکھنے لگا۔ اسے اندھیرے میں بھی لڑکے کا زرد چہرہ نظر آ رہا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ وہ لڑکے کا چہرہ نہیں بلکہ ایک ڈھانچا تھا۔

☆☆☆

شیرف چک چیمبرلین نے اپنی گاڑی جائے وقوعہ سے کئی فٹ دور کھڑی کی جسے پولیس نے زرد رنگ کے ٹیپ سے بلاک کیا ہوا تھا۔ چیمبرلین کے ساتھ فارینسک آرکیالوجسٹ روبی شیپرڈ بھی تھی۔ اس نے نیلے رنگ کی شرٹ اور بلیو جینز پہن رکھی تھی اور کاندھے پر بیگ لٹک رہا تھا جس میں اس کا سیل فون، نوٹ بک اور دیگر ضروری اشیا موجود تھیں۔

”کیا سمندر کی لہروں کی وجہ سے یہ ڈھانچا باہر آ گیا؟“ اس نے وہاں موجود ڈپٹی شیرف ہینسی سے پوچھا۔

”نہیں، سمندر کی لہروں نے ریت میں شگاف نہیں ڈالا بلکہ یہ کام لڑکے نے کیا ہے۔“

”لگتا ہے یہ جگہ ریت سے دوبارہ بھر گئی ہے اور یہاں کل کے مقابلے میں زیادہ ریت نظر آ رہی ہے۔“

چیمبرلین نے ہینسی کو بتایا کہ روبی صرف اس کشتی کو شناخت کرنے کے لیے یہاں آئی ہے۔ اس کی بات سن کر

ہینسی نے اسے غور سے دیکھا اور بولا۔ ”تم اس بارے میں پہلے ہی اندازہ لگا چکے ہو۔“

”ہمارا بھی یہی خیال ہے۔“ روبی نے صرف اتنا کہا اور خاموش ہو گئی جبکہ ہینسی منتظر تھا کہ وہ کچھ اور بھی کہے گی۔

چیمبرلین اس کی بے چینی کو بھانپتے ہوئے بولا۔ ”وہ تصدیق کیے بغیر ایک لفظ بھی نہیں کہے گی۔“

”میں تمہاری بے چینی کو سمجھتی ہوں لیکن ہمیں پہلے یقین کر لینا چاہیے۔“ روبی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تصدیق کا مطلب تصدیق ہی ہوتا ہے۔ محض اندازوں کی بنیاد پر کوئی نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا۔ اوریگن کوسٹ پر تو کافی پرانے تباہ شدہ ڈھانچے موجود ہیں۔“

”ٹھیک کہا تم نے۔“ ڈپٹی نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ”دو ہزار سات کے آخر میں یہ ڈھانچے ریت سے باہر آ گئے تھے۔“

”ایسا عموماً اس وقت ہوتا ہے جب سمندر کی لہریں غیر معمولی طور پر بلند اور غضب ناک ہوں۔ ایسے میں وہ ساحل کی بہت سی ریت اپنے ساتھ بہا کر لے جاتی ہیں۔“

وہ دونوں تباہ شدہ ڈھانچے کو دیکھ رہے تھے جبکہ روبی اس کا بغور معائنہ کر رہی تھی۔ اس نے اپنا فیتہ نکال کر کئی جگہوں کی پیمائش کی اور اپنی چھوٹی سی نوٹ بک میں کچھ لکھتی رہی۔

”وہ لڑکا اب کس حال میں ہے؟“ روبی نے چیمبرلین سے پوچھا۔ ”کیا ابھی تک وہ اسپتال میں ہی ہے؟“

”نہیں۔ وہ اپنے والدین کے ساتھ ہے۔ وہ لوگ اپنی چھٹیاں مختصر کر کے آج پورٹ لینڈ واپس جا رہے ہیں۔ لڑکے پر تو ابھی تک کپکپی طاری ہے۔“

”آدھ گھنٹے تک دو ڈھانچوں کے ساتھ رہنا کوئی معمولی بات نہیں۔ وہ تو گڑھے سے باہر نکلنے کے قابل بھی نہ تھا۔ شکر کرو کہ وہ اپنا ذہنی توازن نہیں کھو بیٹھا۔“

”مجھے شبہ ہے کہ وہ کچھ عرصے تک اسی ڈراؤنے خواب کے زیر اثر رہے گا۔“

”ہاں، شاید وہ ساری زندگی اس ڈھانچے کو نہیں بھلا سکے گا جس کے ماتھے پر گولی سے سوراخ ہو گیا تھا۔“

روبی بولی۔ ”میں اندر جانا چاہتی ہوں۔“

”ہم نے وہاں سے سب چیزیں نکال لی ہیں۔“ چیمبرلین بولا۔ ”چینی کے بکسوے، انگوٹھیاں، ایئر رنگس، بٹن، قلم، سگریٹ لائٹر اور ایسی تمام اشیا۔ اب وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔“

”میں اندر سے اس کی پیمائش کرنا چاہتی ہوں۔“

وہ بڑی احتیاط سے کشتی کے گلے ہوئے لکڑی کے تختوں پر چڑھے اور اسے اندر آنے میں مدد دی۔ جب وہ اپنا کام ختم کر چکی تو باہر آنے کے لیے اسے ایک بار پھر ان کی مدد کی ضرورت پیش آئی۔ اس نے اپنی نوٹ بک کا مطالعہ کیا اور نوٹس کا موازنہ ان مندرجات سے کرنے لگی جو وہ پہلے ہی سیلم میں موجود ریکارڈ سے حاصل کر چکی تھی۔ اس دوران وہ دونوں اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرتے رہے۔

روبی نے ایک نظر دوبارہ نوٹ بک پر ڈالی اور کہنے لگی۔ ”اس کشتی کی لمبائی ساڑھے اٹھارہ فٹ اور گہرائی چار فٹ تھی اور اس میں ایک سو پینتیس ہارس پاور کی موٹر لگی ہوئی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ ہم اس کشتی کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔“

”میں کچھ سمجھا نہیں۔ تم کس کشتی کی بات کر رہی ہو؟“ چیمبرلین الجھتے ہوئے بولا۔

”فاکا نامی کشتی ایڈمرکا ونٹی سے غائب ہو گئی تھی۔ وہ اولڈ پورٹ سے نکلی ہی تھی کہ بندرگاہ پر غیر متوقع طور پر ہوا چلنے لگی۔ اس کشتی پر دو افراد سوار تھے جنہیں دوبارہ کبھی نہیں دیکھا گیا اور سب یہی سمجھے کہ وہ دونوں کشتی سمیت طوفان کی نذر ہو گئے۔ میں سیلم فون کر کے ان دونوں کے نام معلوم کرتی ہوں۔ اس طرح تمہیں ان ڈھانچوں کی شناخت کرنے میں آسانی ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ تم ڈینٹل ریکارڈ سے بھی

بذریعہ ڈاک
خواتین و حضرات گھر بیٹھے داخلہ لیں
انگلش لینگویج کورس	ایئر ہوسٹس	ہومیو اکنامکس	بیوٹی پارلر کورس
ریفریجریشن ایئر کنڈیشننگ	ایئر ٹکٹنگ	بیوٹیک فیشن	آٹو سروسنگ
ریڈیو ٹی وی کی ڈی کی ریپیئرنگ	الیکٹریشن	ڈرافٹس مین	ڈرائنگ پینٹنگ
اسکول ٹیچنگ میتھڈ	صحافت	فوٹو گرافی	انٹیریئر ڈیکوریشن

اسپوکن انگلش	شمسی توانائی	مہر سازی	سلائی کٹنگ	حکمت	اردو ادب

موبائل ریپیئرنگ	لائبریرین	کمپیوٹر	کوکنگ بیکنگ	لیڈیز ٹیلرنگ

انگلش کیلیگرافی	میڈیکل ایڈ	آرٹ پینٹنگ	ڈینٹل ٹیکنیشن
پولٹری ڈیری فارمنگ	بیوٹی پروڈکٹس	فلاور میکنگ	پبلک ریلیشن آفیسر

اسلام آباد اکیڈمی
1237

تصدیق کر سکتے ہو۔''

''یہ کتنا پرانا واقعہ ہے؟ وہ کشتی کب روانہ ہوئی تھی؟''

''مارچ انیس سو اناسی میں فانٹا، اولڈ پورٹ سے روانہ ہوئی تھی۔''

☆☆☆

''ناقابلِ یقین۔'' نارمن فینوک بس اتنا ہی کہہ سکا۔ ''واقعی یہ سب کچھ ناقابلِ یقین ہے۔''

تریسٹھ سالہ نارمن آرام کرسی میں دھنسا ہوا شیرف چیمبرلین کے سامنے بیٹھا تھا۔ نارمن کا یہ چھوٹا سا مکان جنوب مشرقی پورٹ لینڈ کی فوسٹر روڈ کے بغلی بلاک میں واقع تھا۔ نارمن کا قد اور وزن درمیانہ تھا اور اس وقت اس نے بلیو جینز کے ساتھ اسپورٹس شرٹ پہن رکھی تھی۔ شاید اسے کم عمر نظر آنے کا شوق تھا۔

''انہیں قتل کیا گیا۔'' نارمن نے کمرے کے قالین پر نظر جماتے ہوئے کہا۔ ''ہم سب یہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ ایک نہ ایک دن وہ دونوں ضرور واپس آئیں گے لیکن یہ کسی کے گمان میں بھی نہ ہوگا کہ جیتے جاگتے انسانوں کے بجائے ان کے مُردہ ڈھانچے ملیں گے۔''

''ڈینٹل ریکارڈ سے اس کی تصدیق کل ہی ہوئی تھی۔'' چیمبرلین نے کہا۔ ''میں صبح سویرے ہی تمہیں بتانے چلا آیا۔ گھر تو آسانی سے مل گیا تھا لیکن کوئی بھی یہ نہیں بتا سکا کہ تم کہاں کام کرتے ہو۔ لہٰذا مجھے یہیں رک کر تمہارا انتظار کرنا پڑا۔''

''میں برن سائڈ پر واقع ایک ویڈیو اسٹور چلا رہا ہوں۔ میں نے ریڈیو پر سنا تھا کہ فشنگ بیچ پر کوئی کشتی ملی ہے لیکن کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ فانٹا ہوگی۔ ہم سب یہ فرض کر چکے تھے کہ وہ سمندر میں ڈوب چکی ہے۔''

''تم نے آخری بار اپنی بیوی کو کب دیکھا تھا؟'' چیمبرلین نے ایک چبھتا ہوا سوال کیا۔

''جس صبح فانٹا روانہ ہوئی تھی۔ سات مارچ انیس سو اناسی کی صبح ساڑھے آٹھ بجے میں نے اسے آخری بار دیکھا تھا۔ وہ آرچی رینڈل کے ساتھ وہیل مچھلی دیکھنے جا رہی تھی۔ اس پر ہمارا جھگڑا بھی ہوا تھا لیکن وہ چلی گئی۔ اس کے بعد میں نے اسے نہیں دیکھا۔ میرا بلکہ ہم سب کا خیال تھا کہ جو سمندری طوفان اس روز ساحل سے ٹکرایا تھا، وہ فانٹا کو بھی ساتھ بہا کر لے گیا۔ آرچی اور میلیسا بھی اس طوفان کی نذر ہو گئے۔ کوسٹ گارڈ نے دو دن تک انہیں سمندر میں تلاش کیا لیکن فشنگ بیچ کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا اور نہ ہی اس کی کوئی معقول وجہ نظر آتی تھی۔''

چیمبرلین کو یاد آیا کہ اس جگہ موٹیل بننے سے پہلے یہ ساحل بالکل الگ تھلگ ویرانے کا منظر پیش کرتا تھا اور شاید ہی وہاں کوئی جاتا ہو۔ سمندر کے کنارے ابھری ہوئی چٹانوں کی وجہ سے جہاز اور کشتیاں ساحل سے دور ہی رہتے تھے۔ ایسے میں اگر کوئی کشتی طوفانی تھپیڑوں کی وجہ سے ساحل پر آ گئی ہوگی تو اس پر کسی کی نظر نہیں گئی ہوگی اور سمندر کی لہروں کے ذریعے آنے والی ریت میں وہ کشتی چھپتی چلی گئی ہوگی۔

''اس کشتی کے غائب ہونے کی کوئی تحقیقات نہیں ہوئی تھی؟'' چیمبرلین نے پوچھا۔

''ان دنوں ایڈمز کاؤنٹی کا شیرف ہینک اینگلسٹیل ہوا کرتا تھا۔ اس نے ضابطے کی کارروائی پوری کرنے کے لیے متعلقہ لوگوں سے تھوڑی بہت پوچھ گچھ کی اور معاملہ ختم ہو گیا۔ ویسے بھی سب جانتے تھے کہ اس کشتی کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا ہوگا لیکن اب لگ رہا ہے کہ وہ سب غلطی پر تھے۔ اس کے علاوہ اس انشورنس کمپنی نے بھی اپنے طور پر تحقیقات کی تھی جہاں سے اس کشتی کا انشورنس کروایا گیا تھا۔ اس کا نام ہینڈر گرافٹ تھا لیکن ان کی تحقیقات بھی محض خانہ پُری کے لیے ہی تھی۔''

''اس کشتی کا بیمہ کتنے میں ہوا تھا؟''

''کشتی کا نہیں بلکہ آرچی کا انشورنس ہوا تھا۔'' نارمن نے بتایا۔ ''ہم سب پارٹنرز تھے اور ہر ایک نے ایک لاکھ [illegible] کا بیمہ کروا رکھا تھا کیونکہ [illegible] میں اس طرح کے حادثے ہو سکتے ہیں۔ ہمیں بینک سے قرض لینا تھا اور اس کے لیے شرط تھی کہ سب پارٹنرز اپنا بیمہ کروائیں۔ آرچی کی موت کے بعد یہ رقم اس کے وارثوں کو مل گئی۔ جہاں تک کشتی کا تعلق ہے تو میں یہ نہیں جانتا کہ انشورنس کمپنیاں ایسی کشتیوں کا بیمہ کرتی بھی ہیں یا نہیں۔''

''ایسی کشتی سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''آرچی نے یہ کشتی ان نقشوں اور ڈرائنگز کی مدد سے خود بنائی تھی جو اس نے کیلی فورنیا کی ایک کمپنی سے خریدے تھے۔ وہ کشتی واقعی بہت خوب صورت تھی اور آرچی اسے کئی بار کھلے سمندر میں بھی لے کر گیا تھا۔ کبھی کوئی مسئلہ نہیں ہوا لیکن شاید اس میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی تھی جبھی تو وہ طوفان میں ڈوب گئی۔ لیکن اب اندازہ ہو رہا ہے کہ کشتی میں کوئی خرابی نہیں تھی بلکہ کسی تیسرے آدمی کے سوار ہو جانے کی وجہ سے یہ حادثہ پیش آیا۔''

''تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ وہ کون ہو سکتا تھا؟''

''نہیں۔''

''کیا تمہاری بیوی کا بیمہ ہوا تھا؟''

''نہیں۔''

''اس روز تم کہاں تھے؟''

''گیارہ بجے سے پانچ بجے تک میں کام پر تھا۔ باقی وقت گھر پر ہی گزارا۔''

''تم اتنی دیر سے کام پر جاتے تھے؟''

''ان دنوں کاروبار مندا جا رہا تھا۔ اس لیے پارٹنرز میں سے صرف میں ہی اس روز کام پر گیا تھا۔ اسی وجہ سے آرچی نے بھی چھٹی کر لی۔''

چیمبرلین نے اس سے کاروبار کی نوعیت کے بارے میں پوچھا تو نارمن نے بتایا کہ اس سمیت چار پارٹنرز نے مل کر ایک فرم قائم کی تھی جو جاپان سے ویڈیو ٹیپ ریکارڈر امپورٹ کیا کرتی تھی۔ وہ چاروں یعنی نارمن، آرچی، کرٹس لارسن اور مارٹن سینوے، اوریگن انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کے زمانے کے ساتھی تھے۔ ان میں سے صرف نارمن ہی شادی شدہ تھا۔

''میں نے میلیسا سے اس وقت شادی کی جب وہ اپنے بوائے فرینڈ سے جھگڑا کر کے واپس آ گئی تھی۔'' نارمن نے بتایا۔ ''لیکن شادی کے کچھ ہی عرصے بعد اس نے دوسرے لوگوں سے دوستیاں شروع کر دیں۔''

''ایک پارٹنر کے غائب ہونے کے بعد کمپنی کا کیا بنا؟'' چیمبرلین نے پوچھا۔

''شروع شروع میں مشکل پیش آئی۔ خاص طور پر کساد بازاری کے زمانے میں لیکن ہم اس صورتِ حال سے نکل آئے۔ پھر 1991ء میں اس سے بھی زیادہ بُرے حالات پیش آئے تو ہم نے کمپنی کو فروخت کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہمارے حصے میں دس دس لاکھ ڈالرز آئے۔ میں پورٹ لینڈ چلا آیا اور ڈویژن اسٹریٹ پر اپنا ویڈیو اسٹور کھول لیا لیکن 2001ء میں کساد بازاری کی وجہ سے اسے بند کرنا پڑا۔ دیوالیا ہونے سے بچنے کے لیے میں نے اپنی ساری جائداد فروخت کر دی اور واجبات ادا کرنے کے بعد یہ چھوٹا سا مکان خرید لیا۔ حال ہی میں اس کی قسطیں پوری ہوئی ہیں۔''

''آرچی رینڈل سے تمہارے تعلقات کیسے تھے؟''

''جتنا عرصہ ہمارا ساتھ رہا، اس دوران تعلقات ٹھیک ہی تھے۔'' نارمن نے وضاحت کی۔ ''ہماری ملاقات انسٹی ٹیوٹ میں ہوئی تھی۔ وہ اپنے کام میں ماہر تھا اور اسی وجہ سے اپنے آپ کو اہم سمجھنے لگا تھا۔ جب اس نے میلیسا سے تعلقات بڑھانا شروع کیے تو ہماری دوستی میں تلخی آ گئی۔''

''کیا کسی اور کے ساتھ بھی رینڈل بدمزاجی سے پیش آتا تھا؟''

''میرا خیال ہے کہ ہم سب ہی تھوڑے بہت بدمزاج تھے۔ وہ کچھ زیادہ ہی اکھڑ تھا اور جانے سے ایک روز پہلے اس کا ولفورڈ ہیرس سے جھگڑا بھی ہوا تھا۔''

''یہ ولفورڈ ہیرس کون تھا؟''

''ہماری کمپنی کا ایک ملازم اور وقوعہ والے روز وہ کام پر نہیں آیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسے مشینری کی بہت سمجھ بوجھ تھی لیکن اس کے ساتھ ہی وہ پرزے چوری کرنے میں بھی ماہر تھا۔ ہمیں اس وقت یہ بات معلوم نہیں تھی۔ فانٹا کے حادثے کے چند ہفتوں بعد لارسن نے اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا اور نوکری سے نکال دیا۔ وہ تو اسے جیل بھیجنا چاہ رہا تھا لیکن اس میں ہماری بدنامی تھی، خصوصاً بینک پر اچھا تاثر قائم نہ ہوتا اور وہ یہی سمجھتے کہ ہماری کمپنی میں چور کام کرتے ہیں اور اسے وہ ہماری کمزور کاروباری مہارت سمجھتے۔''

''اب ہیرس کہاں رہتا ہے؟''

''مجھے اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔'' نارمن کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔

''اور تمہارے سابقہ پارٹنرز کہاں ہیں؟''

''لارسن تو یہیں پورٹ لینڈ میں ویسٹ ہلز پر رہتا ہے جبکہ مارٹن کی رہائش پورٹ ٹاؤن سینڈ واشنگٹن میں ہے۔ میں تمہیں ان دونوں کے پتے اور فون نمبرز دے سکتا ہوں لیکن میری ان سے ملاقات حادثے کے دوسرے روز ہی ہوئی تھی۔''

''کیا اس روز ہیرس بھی کام پر آیا تھا؟''

نارمن نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''لیکن کوئی ملازم ہفتے والے دن کام نہیں کرتا۔''

☆☆☆

چیمبرلین نے پہلے کرٹس لارسن سے ملنے کا پروگرام بنایا۔ بعد میں اس کا ارادہ پورٹ ٹاؤن سینڈ جا کر مارٹن سے ملاقات کرنے کا تھا۔ لارسن کا عالی شان گھر دوسرے مکانوں کے مقابلے میں ممتاز نظر آ رہا تھا۔ وہ کم از کم پانچ ہزار فٹ پر پھیلا ہوا دو منزلہ مکان تھا۔ اس کے پورچ میں 2009ء کی سلور کیڈی لاک کھڑی تھی۔ چیمبرلین کا استقبال ایک باوردی خادمہ نے کیا اور اسے ایک سجے سجائے کمرے میں لے گئی۔ دو منٹ بعد لارسن بھی آ گیا۔

''تمہاری آمد میرے لیے حیرت کا باعث ہے۔'' لارسن گمبھیر آواز میں بولا۔ ''میں جب ایڈمز کاؤنٹی میں رہتا تھا تو شاید ہی کبھی وہاں کا شیرف مجھ سے ملنے آیا ہو۔ خیر یہ بتاؤ کہ میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

''مینگل بیچ پر ایک کشتی ملی ہے جسے آرچی رینڈل کی فانا کے طور پر شناخت کرلیا گیا ہے۔''

لارسن کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ وہ نارمن کے مقابلے میں زیادہ حیران نظر آرہا تھا۔ چیمبرلین نے اسے ڈھانچوں کے ملنے اور ان کی شناخت کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ وہ یہ سب کچھ سننے کے بعد چند منٹ تک خاموش بیٹھا رہا پھر آہستہ سے بولا۔

''اتنے سال گزر جانے کے بعد یہ سب کچھ ناقابلِ یقین لگتا ہے۔''

''مجھے معلوم ہوا ہے کہ میلیسا کی شادی سے پہلے تمہارے اس کے ساتھ تعلقات تھے؟''

''ہاں، ہماری منگنی ہوگئی تھی۔ پھر کسی معمولی سی بات پر ہمارے درمیان اختلافات پیدا ہوگئے پھر اس نے نارمن سے شادی کرلی لیکن وہ اس کے ساتھ بھی خوش نہیں تھی اور بہت جلد اس سے بیزار ہوگئی۔''

''تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟''

''اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ بہت ہی بور شخص ہے۔ تھوڑے عرصے بعد ہی اس نے آرچی کے ساتھ ساتھ مجھ پر بھی ڈورے ڈالنا شروع کردیے۔ وہ واقعی بہت خوب صورت تھی۔ سنہرے بال، نیلی آنکھیں اور دلکش جسمانی خطوط... جنہیں دیکھ کر کسی بھی مرد کا دل دھڑکنا بھول جائے۔ آرچی نے اس کی پیش قدمی کا جواب دیا گوکہ اس سلسلے میں اس کا نارمن سے ٹکراؤ بھی ہوگیا تھا۔''

''اور تم؟'' چیمبرلین نے پوچھا۔

''ہرگز نہیں۔ میں نارمن کو ناراض کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ممکن ہے کہ ایسی صورت میں ہماری پارٹنرشپ ہی ختم ہو جاتی۔ میں نے تو اس کی شادی کے بعد ہی سے تعلق ختم کرلیا تھا اور ان دنوں ایک اور لڑکی کیرن ٹیلر سے میرا رومانس چل رہا تھا... بلکہ مجھے یقین ہے کہ فانا کے غائب ہونے سے پہلے ہی میں اسے پروپوز کرچکا تھا۔''

''اس لڑکی نے تمہارا پروپوزل قبول کرلیا تھا؟''

''ہماری شادی بائیس سال قائم رہی پھر طلاق ہوگئی جبکہ میری دوسری شادی صرف دو سال ہی چل سکی۔''

''جس دن فانا غائب ہوئی تم کہاں تھے؟''

''میں اس روز گھر پر ہی تھا کیونکہ کاروبار مندا چل رہا تھا۔ اس لیے ہم نے فیصلہ کیا کہ صرف نارمن اور دو ملازمین جمعے والے دن کام پر آئیں گے۔ میں نے وہ سارا دن ایک کتاب پڑھنے میں گزار دیا۔''

''اس کی گواہی کون دے گا کہ تم اس روز گھر پر ہی تھے؟''

لارسن نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔

''مجھے یقین ہے کہ تمہیں انشورنس کی کچھ رقم ملی ہوگی؟''

''ہم سب کے حصے میں تھوڑی بہت رقم آئی تھی لیکن ہم نے وہ سب پیسے آرچی کی فیملی کو دے دیے۔''

''تمہیں ولفورڈ ہیرس کا نام یاد ہے جو تمہارے یہاں کام کرتا تھا؟''

''میں اس چور کو کیسے بھول سکتا ہوں۔ اس نے ایک ایسے وقت میں غبن کیا جب ہمیں ایک ایک پینی کی ضرورت تھی۔ کیا آرچی اور میلیسا کے ساتھ جو حادثہ پیش آیا تھا، اس میں ہیرس کا بھی کوئی ہاتھ تھا؟''

''مسٹر لارسن! میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' چیمبرلین نے کہا۔ ''میں نے اس کے بارے میں اس لیے پوچھا کہ مسٹر نارمن نے جن تین ملازمین کا تذکرہ کیا، ان میں سے صرف وہی اس روز چھٹی پر تھا۔''

لارسن نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے وہ جمعہ اور اس کے بعد آنے والا ہفتہ اچھی طرح یاد ہے۔ دو ساتھیوں کی جدائی کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اس کے بعد ہمیں کوسٹ گارڈ، شیرف اور انشورنس ایجنسی کے سوالوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس لیے ان دو دنوں میں جو کچھ ہوا، وہ سب میرے ذہن میں ہے۔ البتہ یاد نہیں کہ ہیرس اس جمعے کو کام پر آیا تھا یا نہیں۔ اب تو حاضری رجسٹر بھی ضائع ہوچکا ہوگا لیکن اگر نارمن کا یہ کہنا ہے کہ وہ اس روز کام پر نہیں آیا تھا تو پھر یہ ٹھیک ہی ہوگا۔''

اس کی یہ بات سن کر چیمبرلین کے لیے یہ جاننا ضروری ہوگیا کہ ہیرس زندہ بھی ہے یا نہیں۔ اور اگر زندہ ہے تو اس کا قیام کہاں پر ہے۔

''مجھے ایک بات اور یاد آرہی ہے۔'' لارسن بولا۔ ''اس واقعے سے ایک روز پہلے آرچی اور ہیرس میں کسی بات پر بحث ہوئی تھی لیکن مجھے اس کی وجہ معلوم نہیں۔''

''کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ ہیرس اب کہاں ہوگا؟'' چیمبرلین نے ہوا میں تیر چلایا۔

''اس واقعے کو چالیس برس گزر چکے ہیں۔ شیرف اور مجھے کچھ معلوم نہیں کہ اب وہ کہاں ملے گا۔ زندہ بھی ہے یا مرکھپ گیا۔''

''وہ کیا کام کرتا تھا؟''

''اس کے ذمے ویڈیو ٹیپ ریکارڈر کی مرمت کا کام تھا۔ ان دنوں یہ ریکارڈر بہت جلدی خراب ہوجاتے تھے۔

اس کی عمر بیس سال تھی اور وہ ایک آٹو مکینک کا بیٹا تھا۔ اس نے اپنے باپ سے ہی یہ کام سیکھا تھا۔ اس نے کچھ عرصہ ویت نام میں بھی فوجی خدمات انجام دیں اور وہاں رہ کر اپنے تجربے میں اضافہ کیا۔ وہ اپنے کام میں ہوشیار تھا لیکن اس پر بھروسا نہیں کیا جاسکتا تھا۔''

☆☆☆

مارٹن نے چیمبرلین کے ساتھ بڑی سرد مہری کا مظاہرہ کیا۔ ''اتنے سالوں بعد تم گڑے مردے اکھاڑنے چلے آئے؟ آخر چالیس سال پہلے یہ ڈھانچے کیوں نہیں دریافت ہوئے تھے؟''

''لگتا تو یہی ہے کہ جہاں تلاش کرنا چاہیے تھا وہاں کوئی نہیں گیا۔'' چیمبرلین نے تحمل سے جواب دیا۔ ''اور یہ لاشیں ریت کی تہ میں دب گئیں۔''

''مگر تم یہ سب کچھ مجھے کیوں بتا رہے ہو؟'' مارٹن نے بیزاری سے کہا۔ ''میرا ان دونوں میں سے کسی کے ساتھ کوئی خونی رشتہ نہیں تھا۔ آرچی میرا دوست اور بزنس پارٹنر تھا جبکہ میلیسا کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتا۔''

''میں تمہیں بتانے نہیں بلکہ کچھ سوالات پوچھنے آیا ہوں۔ آرچی کے ڈھانچے میں ایک گولی کا سوراخ ملا ہے جبکہ میلیسا کے سینے اور پیٹ پر گولیاں ماری گئی تھیں۔''

مارٹن کا چہرہ زرد ہوگیا۔ اس نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ ''ان دونوں کو مارنے والا کون تھا؟ وہ تو یہاں سے اکیلے ہی گئے تھے اور ان کے ساتھ کوئی تیسرا شخص نہیں تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ انہوں نے خود ہی اپنے آپ کو مار دیا ہو؟''

''نہیں۔ ہمیں وہاں سے کوئی گن نہیں ملی۔ مارنے والا اپنا ہتھیار ساتھ ہی لے گیا۔ یقیناً کشتی پر کوئی تیسرا شخص بھی موجود ہوگا۔ کیا تم نے اس کشتی کو والڈ پورٹ سے روانہ ہوتے وقت دیکھا تھا؟''

''نہیں۔ اس روز میں نے سارا وقت گھر پر بیٹھ کر اور ٹی وی دیکھتے ہوئے گزارا۔ میں نے اس جمعے کو چھٹی کی تھی۔ دفتر میں صرف نارمن اور دو ملازمین موجود تھے اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، اس روز انہوں نے صرف دس ڈالر کا بزنس کیا تھا۔''

''کیا کوئی شخص یہ تصدیق کرسکتا ہے کہ اس روز تم گھر پر ہی تھے؟''

''یہ چالیس سال پرانی بات ہے اور میرا خیال ہے کہ شاید ہی کوئی اس کی تصدیق کرسکے۔ البتہ شیرف ایکسل نے ہم سب سے اس روز کے معمولات کے بارے میں پوچھا تھا۔ اس وقت کسی کے ذہن میں بھی نہیں تھا کہ ان دونوں کو قتل کردیا گیا ہے۔ ہم سب یہی سمجھ رہے تھے کہ ان کی کشتی طوفان میں ڈوب گئی۔''

چیمبرلین نے اس سے مقتولین کے ساتھ تعلق کی نوعیت جاننا چاہی تو اس نے بتایا کہ آرچی سے اس کی پرانی جان پہچان تھی جبکہ میلیسا سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اسے بس اتنا ہی معلوم تھا کہ وہ لارسن کی گرل فرینڈ رہ چکی تھی اور اس سے علیحدگی اختیار کرنے کے بعد نارمن سے شادی کرلی۔ لیکن وہ اپنے شوہر سے مطمئن نہیں تھی اور اس نے آرچی سے پینگیں بڑھانا شروع کردی تھیں جبکہ لارسن بھی اس میں دوبارہ دلچسپی لینے لگا تھا۔

''تمہارا مطلب ہے کہ لارسن اس کی جانب بڑھ رہا تھا جبکہ میلیسا کی جانب سے کوئی پیش رفت نہیں ہوئی تھی۔''

''میرا خیال ہے کہ وہ دونوں سے ہی فلرٹ کررہی تھی۔ میں جانتا ہوں کہ دونوں ہی اس میں دلچسپی لے رہے تھے۔ وہ واقعی بہت خوب صورت تھی لیکن میں اسے ان دونوں کی حماقت ہی کہوں گا کہ وہ اپنے پارٹنر کی بیوی پر ڈورے ڈال رہے تھے۔ اگر وہ مجھ سے فلرٹ کرتی تو میں بھی اس کی حوصلہ افزائی نہ کرتا۔''

''کیا اس وقت تک لارسن کی اپنی ہونے والی بیوی سے منگنی نہیں ہوئی تھی؟''

مارٹن نے سر ہلایا اور بولا۔ ''اس واقعے کے چند ہی دنوں بعد لارسن نے شادی کرلی لیکن اس وقت تک ان کی منگنی نہیں ہوئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ میلیسا کی موت سے کیرن کی شادی کا راستہ ہموار ہوگیا۔ شاید لارسن اپنے آپشنز کھلے رکھنا چاہتا تھا۔ اسے توقع ہوگی کہ وہ میلیسا کو دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائے گا اگر وہ نارمن سے طلاق لے لے لیکن میلیسا کے لاپتا ہوجانے کے بعد اس نے کیرن ٹیلر سے شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس نے کبھی اپنی بیوی سے اتنی محبت کی ہو جتنی کہ وہ میلیسا سے کرتا تھا۔ گوکہ ان کے دو بچے بھی ہوئے اور دس سال پہلے ان کے درمیان طلاق ہوئی لیکن مجھے ان کے درمیان گرم جوشی کبھی نظر نہیں آئی۔''

''لارسن نے دوسری شادی کب کی؟'' چیمبرلین نے پوچھا۔

''طلاق دینے کے بعد اس نے فوراً ہی اینا اوڈل سے شادی کرلی جبکہ اس کی تیسری بیوی ٹیفنی تھی جس سے اس کا ایک پانچ سالہ بیٹا بھی ہے۔''

www.pkdigest.com

”تمہیں یاد ہے کہ مارچ انیس سو انتہر میں تمہاری کمپنی میں کون کون لوگ کام کر رہے تھے؟“

”ہاں۔ ہمارے پاس دو نوجوان لڑکے اور ایک درمیانی عمر کا شخص تھا۔ لڑکوں کے نام ویس ریسی اور ولفورڈ ہیرس تھے... جبکہ درمیانی عمر والا پال کف مین ہمارے ساتھ برسوں سے کام کر رہا تھا۔“

”تمہیں یاد ہے کہ اس حادثے سے ایک دن پہلے ہیرس اور آرچی میں کسی بات پر تکرار ہوئی تھی؟“

”ہاں، یہ بات مجھے نارمن نے بتائی تھی لیکن جھگڑے کی وجہ معلوم نہیں ہوسکی۔“

”تمہیں معلوم ہے کہ ان دنوں ہیرس کہاں ہے؟“

مارٹن نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ ہمارے یہاں سے نکالے جانے کے بعد کہاں گیا۔ البتہ کف مین کے بارے میں سنا تھا کہ وہ اب بھی اولڈ پورٹ میں ہی رہتا ہے۔ اسی طرح مجھے ویس ریسی کے ٹھکانے کے بارے میں بھی کچھ معلوم نہیں۔“

چیمبرلین کے پاس مزید پوچھنے کے لیے کچھ نہ تھا لہٰذا اس نے اجازت چاہی۔ مارٹن اسے باہر تک چھوڑنے آیا۔

اس رات ڈنر کرنے کے بعد وہ بہت دیر تک اپنے کمرے میں بیٹھا اب تک کی تحقیقات پر غور کرتا رہا۔ وہ ابھی تک یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ آرچی اور میلیسا کو کیوں قتل کیا گیا اور قاتل کون تھا؟ کیا اس کشتی میں کوئی تیسرا شخص بھی موجود تھا لیکن وہ کشتی اتنی چھوٹی تھی کہ اس میں کسی تیسرے شخص کے لیے چھپنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ یقیناً کسی نے آخری لمحات میں کشتی پر پہنچ کر ان دونوں کو قتل کیا ہوگا۔ وہ شخص کون ہوسکتا ہے؟ چیمبرلین کے ذہن میں کئی تصویریں بنتی اور بگڑتی رہیں اور وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے ہی سوگیا۔

☆☆☆

دوسری صبح وہ اپنے دفتر پہنچا تو انڈر شیرف بل ویٹ لینڈ نے اپنی نوٹ بک کھول کر ان تینوں ملازمین کے بارے میں معلومات بیان کرنا شروع کر دیں جن کے نام مارٹن نے بتائے تھے۔ پال کف مین ریٹائرڈ زندگی گزار رہا تھا اور ان دنوں کوز بے میں مقیم تھا۔ بل نے اس کا فون نمبر اور گھر کا پتا حاصل کر لیا تھا۔ ویس ریسی، مسوری کے قصبے لبرٹی میں رہائش پذیر تھا جبکہ ہیرس کے بارے میں ملنے والی معلومات بڑی دلچسپ تھیں۔ وہ چوری کے الزام میں تین بار گرفتار ہو چکا تھا اور ان دنوں سان ڈیاگو کی کسی ورکشاپ میں کام کر رہا تھا۔ بل نے اس کا فون نمبر اور پتا بھی حاصل کر لیا تھا۔

”سب سے پہلے تو میں ایکلس سے ملنا چاہوں گا۔ اس کے بعد فون پر کف مین اور ریسی سے بات کروں گا اور سب سے آخر میں ہیرس سے ملنے سان ڈیاگو جاؤں گا۔ اس سے بالمشافہ پوچھ گچھ بہت ضروری ہے کیونکہ ایک دن پہلے ہی اس کا آرچی سے جھگڑا ہوا تھا۔ میں اس کے چہرے کے تاثرات سے ہی بہت کچھ جان سکوں گا۔“

بل کے جانے کے بعد اس نے ایکلس کا نمبر ملایا لیکن اس کے پوتے نے بتایا کہ وہ مچھلیاں پکڑنے گیا ہے اور سوموار سے پہلے اس کی واپسی ممکن نہیں۔ اس نے دوسرا فون کف مین کو کیا۔ اس نے بڑے تلخ لہجے میں جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”میں اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکتا جو چالیس سال پہلے شیرف ایکلس کو بتا چکا ہوں۔ میں اس روز گیارہ بجنے میں دس منٹ تک اپنی بیوی کے ساتھ گھر پر ہی تھا۔ پھر میں نے دن کا بقیہ حصہ کام پر گزارا۔ اس کی تصدیق ایکلس نے میری بیوی اور پڑوسیوں سے بھی کر لی تھی۔“

ریسی نے بھی فون پر یہی بتایا کہ وہ اس وقت اپنے دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ بورڈنگ ہاؤس میں ناشتا کر رہا تھا۔ اس طرح چیمبرلین کو ان دونوں سے کوئی کام کی بات معلوم نہ ہوسکی۔ اب اس کی اگلی منزل سان ڈیاگو تھی۔ وہاں پہنچ کر اس نے مقامی پولیس سے رابطہ کیا اور ایک آفیسر مونیکا راس اسے ہیرس کے گھر تک لے گئی۔ دروازہ ہیرس نے ہی کھولا تھا اور جب چیمبرلین نے اپنا تعارف ایڈمز کاؤنٹی کے شیرف کے طور پر کروایا تو اس کی آنکھوں میں حیرت کی لہر ابھری۔ اس نے کچھ جھجکتے ہوئے انہیں اندر آنے کی دعوت دے دی۔ ہیرس نے انہیں بیئر اور سگریٹ پیش کیے جسے انہوں نے شکریے کے ساتھ لوٹا دیا۔ ہیرس نے اپنے لیے ایک سگریٹ سلگایا اور گہرا کش لیتے ہوئے بولا۔

”میں نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ کوئی مجھ سے اس موضوع پر بات کرنے کے لیے آئے گا کیونکہ میں صرف ان کے یہاں کام کرتا تھا اور اس کشتی سے میرا کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ اس نے بلیو پرنٹس کی مدد سے خود ہی بنائی تھی۔“

”تم اس روز کہاں تھے؟“ چیمبرلین نے پوچھا۔

”میں اس روز چھٹی پر تھا۔ اس لیے وقت گزاری کے لیے ساحل پر چلا گیا جہاں سارا دن سیپیاں اور مونگے چننے میں گزار دیا۔ انہیں گفٹ شاپ پر بیچ کر مجھے کچھ پیسے مل جاتے تھے۔“

”کیا کوئی شخص یہ گواہی دے سکتا ہے کہ تم اس روز اولڈ پورٹ کے ساحل پر موجود تھے؟“

ہیرس مسکراتے ہوئے بولا۔ ”یہ کوئی ایسی مصروفیت نہیں تھی جس کے لیے مجھے گواہوں کی ضرورت پڑتی۔ کوئی بھی یہ گواہی نہیں دے سکتا اور نہ ہی مجھے جائے وقوعہ سے اپنی غیر حاضری ثابت کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر تم سمجھ رہے ہو کہ ان دونوں کے قتل سے میرا کوئی تعلق ہے تو یہ غلط ہے۔ مجھے تو اب ٹی وی کے ذریعے معلوم ہوا ہے کہ وہ قتل کر دیے گئے تھے۔“

”میرے پاس شک کرنے کی ایک وجہ ہے۔“

”شاید میرے مجرمانہ ریکارڈ کی وجہ سے تم ایسا کہہ رہے ہو جبکہ حقیقت یہ ہے کہ 1983ء کے بعد میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ اس سے پہلے صرف ایک بار چوری کے الزام میں پکڑا گیا تھا۔ میں کسی کو قتل کرنے کے بارے میں تو سوچ بھی نہیں سکتا۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے میلیسا کے ڈوب جانے کا بہت افسوس ہوا تھا اور اب یہ جان کر مزید دکھ ہوا کہ اسے قتل کیا گیا تھا۔“

”دراصل میرے شک کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وقوعہ سے ایک روز پہلے تمہارا آرچی کے ساتھ جھگڑا ہوا تھا؟“

”ہاں مجھے یاد ہے۔ اس نے مجھ پر الزام لگایا تھا کہ میں نے جان بوجھ کر ایک ویڈیو گیم مرمت کے دوران خراب کر دیا تھا۔ اس بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ میرے خیال میں ایک خرابی پیدا ہوگئی تھی جو کسی بھی کھیل میں ہوسکتی تھی اور میں یہی بات اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔“

”کیا اسے یہ معلوم تھا کہ تم کمپنی سے چیزیں چراتے ہو؟“

”اگر اسے یہ بات معلوم ہوجاتی تو وہ مجھے پولیس کے حوالے کر دیتا۔ یہ بات کسی کو معلوم نہیں تھی اور لارسن کو بھی اس وقت پتا چلا جب وہ کمپنی کا اسٹاک چیک کر رہا تھا۔ آرچی کا ان معاملات سے کوئی تعلق نہ تھا اور میں اسے اتنی چھوٹی سی بات پر قتل نہیں کرسکتا تھا۔ ویسے بھی وہ کشتی اتنی چھوٹی تھی کہ اس میں کسی تیسرے آدمی کے چھپنے کی گنجائش نہیں تھی۔“

”گویا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ آرچی کے ساتھ کشتی پر نہیں گئے تھے؟“

”ہرگز نہیں۔ میں قسم کھا سکتا ہوں۔“

”تمہارے خیال میں کشتی پر سوار ہونے والا تیسرا شخص کون ہوسکتا ہے؟“

”کاش، میں تمہیں بتا سکتا۔“ ہیرس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ”بظاہر تو نارمن پر ہی شبہ کرنا چاہیے لیکن دوسرے پارٹنرز بالخصوص لارسن کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ حالانکہ مجھے اس کا احسان مند ہونا چاہیے کہ اس نے چوری کے الزام میں مجھے پولیس کے حوالے نہیں کیا لیکن سچ تو یہ ہے کہ وہ غصے کا بہت تیز ہے اور ایسا ہی شخص کسی کو قتل کرسکتا ہے۔“

☆☆☆

سان ڈیاگو سے واپس آنے کے بعد چیمبرلین نے ایکلس سے ملنے کا قصد کیا۔ وہ اس وقت اپنے گھر میں واقع ووڈ ورک شاپ میں موجود تھا۔ اس نے چیمبرلین کا استقبال خندہ پیشانی سے کیا اور بولا۔ ”میں تمہیں اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکتا جتنا تمہیں معلوم ہے کیونکہ ہم نے اس واقعے کی کچھ زیادہ تحقیقات نہیں کی تھی۔ میرے علاوہ کوسٹ گارڈز، نارمن اور آرچی کے گھر والے بھی یہی سمجھ رہے تھے کہ ان کی کشتی طوفان میں ڈوب گئی۔“

”کیا تمہارا ابھی یہی خیال ہے کہ ان دونوں کے علاوہ کشتی پر کوئی تیسرا شخص نہیں تھا؟“

”جہاں تک میرے علم میں ہے کہ کشتی پر سوار ہونے سے پہلے آرچی نے میرین میجر کلے برگ سے ملاقات کی تھی۔ ان دونوں کی گفتگو میلیسا کے آنے تک جاری رہی تھی۔ اس کے کشتی پر سوار ہوتے ہی آرچی نے کلے کو خدا حافظ کہا اور کشتی پر چڑھ گیا۔ اس کے بعد کلے اپنے شیڈ میں چلا گیا۔ مجھے یاد نہیں کہ وہ کتنی دیر وہاں رہا۔ شاید پانچ یا دس منٹ لیکن جب وہ واپس آیا تو کشتی روانہ ہوچکی تھی۔ اس کا مطلب یہی ہوسکتا ہے کہ اگر کوئی تیسرا شخص کشتی میں سوار ہوا تو وہ اسی وقفے کے دوران ہوا ہوگا جب کلے اپنے شیڈ میں گیا تھا۔“

چیمبرلین نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ”اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اس وقفے کے دوران کوئی تیسرا شخص کشتی میں سوار ہوا پھر اس نے ان دونوں کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ اس کے بعد وہ کشتی کو جیننگز بیچ کی طرف لے گیا۔ اس دوران سمندر میں طوفان آگیا اور کشتی ساحل کی ریت میں دھنس گئی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قاتل کہاں گیا؟ کیا اس نے اپنے فرار کے لیے کسی گاڑی کا بندوبست کر رکھا تھا؟“

”مجھے اس بارے میں شبہ ہے۔ ہائی وے سے اس سڑک کی لمبائی تین میل ہے جو جیننگز بیچ کی طرف جاتی ہے اور اس کے بعد بھی آدھے میل کا فاصلہ پگڈنڈی کے ذریعے طے کرنا ہوتا ہے۔ یہ ساحل اولڈ پورٹ سے صرف اٹھارہ میل کے فاصلے پر ہے۔ کوئی بھی مرد یا عورت ایک رات میں یہ مسافت پیدل طے کرسکتے ہیں خاص کر نارمن جیسے صحت مند شخص کے لیے تو یہ کوئی مشکل نہیں تھا۔“

”تمہارا شبہ نارمن پر ہے؟“

ایکلس نے کندھے اچکائے اور بولا۔ ”اس کے علاوہ

اور کون ہو سکتا ہے؟ ایک شخص اس کی بیوی کو کشتی کی سیر کرانے لے گیا جس سے اس کی شادی کو ابھی سال بھی نہیں ہوا تھا۔ کیا کسی رقیب کو قتل کرنے کے لیے یہ محرک کافی نہیں ہے؟"

"لیکن وہ تو اس روز کام پر موجود تھا؟"

"ہاں۔ میں جانتا ہوں لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ جب وہ لوگ سیر سے واپس آئے ہوں تو نارمن ساحل پر ان کا انتظار کر رہا ہو اور اس وقت اس نے ان دونوں کو قتل کر دینے کے بعد کشتی کو ٹینگل بیچ پر چھوڑ دیا ہو اور خود وہاں سے واپس اولڈ پورٹ آ گیا ہو۔"

چیمبرلین کا خیال تھا کہ قاتل صبح کے وقت ہی ان دونوں کے ساتھ کشتی پر سوار ہو گیا ہو گا۔ اس نے اس امکان پر غور نہیں کیا کہ کشتی کے واپس آنے کے بعد بھی یہ واردات ہو سکتی تھی۔ ایسٹل کا اندازہ درست بھی ہو سکتا تھا لیکن ابھی منظر نامہ واضح نہیں ہوا تھا۔ ابھی یہ غور کرنا باقی تھا کہ قاتل وہاں سے شہر تک واپس کیسے آیا ہو گا؟

"کرٹس لارسن کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"اس کی گرل فرینڈ نے مجھے بتایا تھا کہ اس روز سہ پہر میں وہ کافی دیر تک اس سے باتیں کرتی رہی۔ وہ گھر پر ہی موجود تھا۔"

چیمبرلین حیران ہوتے ہوئے بولا۔ "اس نے مجھے یہ بات نہیں بتائی بلکہ اس کا کہنا تھا کہ اس کے پاس جائے واردات سے دور رہنے کا کوئی عذر نہیں ہے۔"

"شاید وہ نہیں چاہتا ہو گا کہ تم اس کی گرل فرینڈ کو پریشان کرو۔ ویسے بھی چالیس سال بعد اسے موقع واردات سے دور رہنے کا ثبوت پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"اب تو واقعی مجھے اس کی گرل فرینڈ سے ملنا ہو گا۔" چیمبرلین نے اٹھتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

کیرن ٹیلر اسے دیکھتے ہی سمجھ گئی کہ وہ فائنا کے سلسلے میں پوچھ گچھ کرنے آیا ہے۔ کیرن کی عمر ساٹھ سال تھی لیکن وہ اپنی عمر سے کافی کم نظر آ رہی تھی۔ اس نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "اندر آ جاؤ شیرف!"

چیمبرلین اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "تمہیں اس دن کے بارے میں کچھ یاد ہے؟"

"کچھ زیادہ نہیں۔ میں آرچی یا میلیسا سے زیادہ واقف نہیں تھی۔ میری ملاقات صرف کرٹس سے تھی۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ اس روز میں ڈیوٹی پر تھی اور میں نے کرٹس کو کئی بار اس کے گھر اور دفتر فون کیا لیکن بات نہ ہو سکی۔ پھر کام سے فارغ ہونے کے بعد میں اس کے گھر گئی تو وہ وہاں بھی نہیں تھا۔ میری اس سے ملاقات دوسرے روز ہوئی۔"

"لیکن ایسٹل نے تو مجھے بتایا ہے کہ تمہاری اس روز سہ پہر میں لارسن سے فون پر کافی دیر تک بات ہوئی تھی۔ کیا اس طرح تم یہ ثابت کرنا چاہ رہی تھیں کہ لارسن جائے واردات سے دور تھا؟"

"ہاں، میں نے اسے یہی کہا تھا۔"

"کیوں؟ تم نے جھوٹ کیوں بولا؟"

"اگر میں ایسا نہ کہتی تو کرٹس کا جھوٹ کھل جاتا۔ اس نے اپنے پارٹنرز کو یہی بتایا تھا کہ وہ گھر پر رہے گا جبکہ وہ خفیہ طور پر ایک الیکٹرونک کمپنی میں انٹرویو دینے گیا تھا لیکن اسے حسبِ توقع تنخواہ کی پیشکش نہیں ہوئی لہٰذا اس نے وہ آفر ٹھکرا دی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے دوسرے پارٹنرز کو یہ بات معلوم ہو لہٰذا اس کے جھوٹ کو چھپانے کے لیے مجھے بھی جھوٹ بولنا پڑا۔"

"کیا تمہیں اس کی بات پر یقین تھا؟"

"اس نے مجھے کئی سال بعد اصل حقیقت بتائی جب وہ مجھے طلاق دے رہا تھا... کہ اس روز وہ کسی ایجنٹ سے ملنے نہیں گیا بلکہ ایک طوائف کے ساتھ تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے اتنے عرصے بعد یہ بات بتانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟"

"جب اگلے روز تمہاری اس سے ملاقات ہوئی تو تم نے اس میں کوئی خاص بات محسوس کی؟"

"مجھے لگا کہ اس کے پیروں میں کچھ تکلیف ہے۔"

"کیسی تکلیف؟" چیمبرلین نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"لگتا تھا جیسے اس کے پیروں پر سوجن آ گئی ہو۔"

چیمبرلین سوچ میں پڑ گیا۔ ٹینگل بیچ سے شہر کا فاصلہ اٹھارہ میل تھا اور اگر کوئی شخص پیدل یہ فاصلہ طے کرے، تب بھی اس کے پیروں پر سوجن نہیں آ سکتی... بشرطیکہ اس نے نامناسب جوتے نہ پہن رکھے ہوں۔

"اس زمانے میں مسٹر لارسن کس قسم کے جوتے پہنا کرتے تھے؟"

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "میں نے کبھی غور نہیں کیا۔ یقیناً وہ عام قسم کے جوتے ہی ہوں گے۔"

اچانک ہی اس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ "تمہارا خیال ہے کہ لارسن نے ان دونوں کو قتل کیا ہو گا؟"

"تمہیں جوتوں کے بارے میں کچھ یاد آیا؟" چیمبرلین اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

"نہیں... کچھ نہیں۔" وہ ہکلاتے ہوئے بولی۔

"اگر اس نے ان دونوں کو قتل کیا تھا تو تم بھی شریکِ جرم ہو گئیں کیونکہ تم نے ایسٹل سے جھوٹ بولا کہ اس سہ پہر تم اس سے ٹیلی فون پر باتیں کرتی رہیں۔ قانون کے ہاتھ بہت لمبے ہوتے ہیں۔ ہم بہت جلد اصل قاتل اور اس کی مدد کرنے والوں تک پہنچ جائیں گے۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور کھڑکی کی جانب چل دی۔ ایک منٹ تک باہر دیکھتی رہی پھر اس نے بولنا شروع کیا۔

"ہماری شادی بائیس سال تک قائم رہی۔ میں جانتی تھی کہ اس کے دوسری عورتوں سے تعلقات ہیں حالانکہ شروع میں وہ ایسا نہیں تھا اور مجھ سے بہت محبت کرتا تھا۔ پھر 1990ء میں اس نے کھل کر اپنا اوڈل سے ملنا شروع کر دیا۔ اس پر ہمارا کئی بار جھگڑا بھی ہوا پھر وہ غیر ملکی دورے پر چلا گیا۔ واپس آیا تو بہت پُرسکون اور مطمئن تھا۔ دوسری صبح اس نے بتایا کہ وہ مجھے طلاق دے رہا ہے۔ یہ اطلاع دیتے وقت اس کے چہرے سے خوشی جھلک رہی تھی۔ شاید اس لمحے میں نے زندگی میں پہلی بار اس سے شدید نفرت محسوس کی۔"

چیمبرلین خاموشی سے سن رہا تھا۔ وہ منتظر تھا کہ شاید اس کہانی میں سے کوئی کام کی بات نکل آئے۔ وہ اس کی جانب مڑی اور ایک گہرا سانس لیتے ہوئے بولی۔ "وہ یقیناً ٹینگل بیچ ہی گیا ہو گا۔ یہ بات پہلے میری سمجھ میں نہیں آئی تھی لیکن اب سمجھ رہی ہوں۔ اس نے مجھ سے شادی اسی لیے کی تھی کہ میں اس کے خلاف گواہی نہ دے سکوں۔"

چیمبرلین اس کی باتیں دلچسپی سے سن رہا تھا لیکن ابھی تک ایسا کوئی اشارہ نہیں ملا تھا جسے لارسن کے خلاف ثبوت کے طور پر استعمال کیا جا سکے۔

"میں نے خبروں میں سنا ہے کہ سمندر کی لہریں ساحل پر آ جائیں تو ٹینگل بیچ کی ریت دلدل کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔"

"ہاں... یہ صحیح ہے۔"

"فائنا کے غائب ہو جانے کے فوراً بعد کرٹس نئے ڈیک شوز خرید کر لایا حالانکہ اس کے پاس پہلے سے ڈیک شوز تھے۔ لیکن شادی کے بعد میں نے وہ پرانے جوتے کبھی نہیں دیکھے۔ اب میں اس کی وجہ سمجھ رہی ہوں اور جان گئی ہوں کہ پرانے جوتوں کے ساتھ کیا ہوا۔ وہ نیلے رنگ کے تھے اور ان کا نمبر گیارہ تھا۔"

☆☆☆

اس پولیس کار پر کوئی سرکاری نشان نہیں تھا اور اسے سادہ کپڑوں میں ملبوس ایک پچاس سالہ سراغ رساں چلا رہا تھا جبکہ اس کے برابر والی سیٹ پر چیمبرلین بیٹھا ہوا تھا۔ سراغ رساں کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ پورٹ لینڈ کی سڑکوں سے بخوبی واقف ہے، بالکل اسی طرح جیسے چیمبرلین کو اولڈ پورٹ کی سڑکوں سے شناسائی تھی۔ گو کہ انہوں نے سلور کیڈی لاک کار کو نظروں میں رکھنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ بہت آگے نکل گئی تھی جس پر ان دونوں میں سے کسی کو بھی پریشانی نہیں تھی... کیونکہ انہیں اس کار کی منزل کا علم تھا اور وہ اس بارے میں اتنے پُراعتماد تھے کہ سراغ رساں نے اپنے اسکواڈ میں شامل پیچھے آنے والی گاڑی کو فون کر کے کہا کہ وہ کرٹس لارسن کی اگلی منزل کے بارے میں معلوم کرے۔ انہیں یقین تھا کہ وہ اپنے ذاتی طیارے کے ذریعے بیرونِ ملک پرواز کرے گا۔

وہ ابھی ائرپورٹ کے گیٹ پر ہی تھے کہ سراغ رساں کے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ایک منٹ فون پر بات کی اور چیمبرلین کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"وہ میکسیکو جا رہا ہے۔ شاید وہاں سے وہ برازیل یا کسی ایسی جگہ جائے گا جن کے ساتھ ہمارا تحویلِ مجرمین کا معاہدہ نہ ہو۔"

"بہت خوب۔" چیمبرلین نے کہا۔ "اس کا یہ پلان بھی ایک قسم کا ثبوت ہی ہے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے... جو شخص کروڑوں ڈالر کا بزنس کرتا ہو، وہ اس معاملے کو ویکیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دے گا؟"

"تم کچھ بھی کہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ 1990ء تک اسی خوف میں مبتلا رہا کہ کشتی نہیں ظاہر نہ ہو جائے اور جب اس کی بے چینی حد سے بڑھ گئی تو وہ خود اس کشتی کا انجام دیکھنے ٹینگل بیچ گیا لیکن اسے وہاں کچھ نظر نہ آیا اور اسے یقین آ گیا کہ وہ کشتی سمندر میں ڈوب چکی ہے۔"

"اس نے اتنا انتظار کیوں کیا؟" سراغ رساں بولا۔ "اسے چاہیے تھا کہ اسی وقت کشتی کو سمندر میں ڈبو دیتا جب اس نے ان دونوں کا قتل کیا تھا۔"

"اگر وہ اچھا تیراک ہوتا اور اس کے پاس لائف جیکٹ ہوتی، تب بھی یہ کام اتنا آسان نہیں تھا کیونکہ چٹانوں سے ٹکرا کر سمندر کی لہروں میں شدت آ جاتی ہے اور اس روز تو ویسے بھی طوفان آیا ہوا تھا۔ ایسے میں کسی اچھے سے اچھے تیراک کے بچنے کا بھی کوئی امکان نہ تھا۔"

سراغ رساں نے کار روکی اور فون پر کسی کو ہدایات دیں کہ انہیں اس جگہ کے بارے میں بتایا جائے جہاں لارسن کا جہاز کھڑا ہے۔ چیمبرلین نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "دو عشروں تک شدید ذہنی دباؤ میں رہنے کے بعد وہ اچانک ہی اس سے آزاد ہو گیا کیونکہ اسے یقین ہو گیا تھا کہ

www.pkdigest.com

کشتی سمندر میں ڈوب چکی ہے۔ اس نے اپنی بیوی کو طلاق دے کر دوسری عورت سے شادی کرلی اور عیش و آرام کی زندگی گزارنے لگا۔ پھر اچانک ہی تین بچے اس جگہ تک پہنچ گئے جہاں کشتی اور مقتولین کے ڈھانچے ریت میں دفن تھے۔ اس طرح وہ ایک بار پھر عذاب میں مبتلا ہوگیا۔''

اسی اثنا میں سراغ رساں کو فون پر ڈنگری کی لوکیشن کے بارے میں اطلاع ملی تو اس نے مزید نفری طلب کرلی اور سات منٹ بعد ایک پیٹرول کار مع دو باوردی افسران وہاں پہنچ گئی۔ اس کے بعد انہوں نے گاڑیوں کا رخ ڈنگری کی جانب کردیا۔

لارسن جہاز میں بیٹھ چکا تھا البتہ اس کے دو عدد سوٹ کیس ابھی تک رن وے کے فرش پر رکھے ہوئے تھے۔ چیمبر لین کے ساتھ باوردی پولیس والوں کو دیکھ کر اس کے چہرے پر زردی پھیل گئی۔ ایک لمحے کے لیے چیمبر لین کو یوں لگا جیسے وہ بے ہوش ہوجائے گا۔

''میرا خیال ہے کہ آج صبح تم نے ٹی وی پر خبریں دیکھ لی ہوں گی؟'' چیمبر لین اس کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔ ''میڈیا نے کشتی کی دریافت سے بڑھ کر اس جوتے کو زیادہ توجہ دی ہے۔''

لارسن نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔

''وہ جوتا بالکل محفوظ حالت میں ملا تھا۔ یہاں تک کہ اس کا رنگ بھی نہیں اڑا۔ گوکہ نیلے رنگ کے جوتے میں کوئی خاص بات نہیں لیکن گیارہ نمبر کا جوتا بہت کم استعمال ہوتا ہے۔''

لارسن اب بھی کچھ نہ بولا بس اس کی جانب دیکھتا رہا۔

''ہمارے پاس ایک شہادت موجود ہے جس کے مطابق کشتی غائب ہونے سے پہلے تمہارے پاس نیلے رنگ کا گیارہ نمبر کا جوتا تھا لیکن بعد میں وہ نظر نہیں آیا۔''

''یقیناً یہ بات کیرن نے تمہیں بتائی ہوگی؟''

''میرا اندازہ ہے کہ جب تم ٹینگل بیچ پر پہنچے تو ساحل کی ریت نمی کی وجہ سے دلدل کی شکل اختیار کرچکی تھی۔ تم نے کشتی سے چھلانگ لگا کر پگڈنڈی کی طرف دوڑنے کی کوشش کی لیکن تمہارا ایک جوتا گیلی ریت میں دھنس گیا اور تم اسے دوبارہ تلاش نہ کرسکے۔ اندھیرا پھیل چکا تھا اور تیز ہوا کے ساتھ بارش ہورہی تھی۔ لہٰذا تم نے اولڈ پورٹ کی جانب ایک یا شاید دونوں جوتوں کے بغیر ہی چلنا شروع کردیا۔ دوسرے دن کسی کو بھی کشتی پر تمہاری موجودگی کا علم نہ ہوسکا کیونکہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کشتی کو ساحل پر کھڑا کردیا گیا ہے لیکن اب ہمیں یہ بات معلوم ہوگئی ہے اور میرے آدمیوں نے اس جگہ کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد گیارہ نمبر کا نیلے رنگ کا جوتا بھی تلاش کرلیا ہے۔''

لارسن اب بھی کچھ نہ بولا۔ چیمبر لین پُراعتماد لہجے میں اس پر دباؤ بڑھا رہا تھا تاکہ اس سے حقیقت اگلوا سکے ورنہ کوئی بھی ہوشیار وکیل لارسن کو بڑی آسانی سے بچا سکتا تھا اور اسے اس بات کی تہ تک پہنچنے میں بھی دیر نہ لگتی کہ جو جوتا انہیں ملا تھا، وہ درحقیقت شیرف کے کہنے پر اس کے ڈپٹی ہیلسی نے ریت میں دبایا تھا۔

''یہ بات ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ تم نے اپنے آپ کو کشتی پر کس طرح چھپایا؟ وہ اتنی زیادہ بڑی تو نہ تھی؟''

''میں نے اپنے آپ کو چھپایا نہیں تھا۔'' لارسن بے اختیار بول اٹھا۔ ''میں ان کے ساتھ اسی وقت شامل ہوگیا تھا جب وہ جانے کی تیاری کررہے تھے۔''

اسی وقت چیمبر لین کو اندازہ ہوگیا کہ لارسن اس کے بچھائے ہوئے جال میں پھنس گیا ہے لہٰذا اس نے خاموشی اختیار کرلی تاکہ لارسن اپنی بات مکمل کرسکے۔ ''وہ مجھے اپنے ساتھ نہیں لے جانا چاہ رہے تھے لیکن میں نے اس کی پروا نہیں کی۔ میں میلیسا کو دوبارہ حاصل کرنا چاہ رہا تھا کیونکہ یہ بات ہر شخص کو معلوم تھی کہ وہ لارسن کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''کافی دیر تک سب کچھ ٹھیک ٹھاک رہا۔ آرچی کا سلوک شریفانہ تھا جبکہ میلیسا ہم دونوں سے فلرٹ کررہی تھی۔ کئی گھنٹے گزرنے کے بعد میلیسا نے اچانک ہی ایک ایسی بات کہہ دی جو اسے نہیں کہنی چاہیے تھی۔ پھر آرچی نے بھی کچھ ایسی ہی باتیں کیں تو مجھ سے برداشت نہ ہوا۔ میں نے آرچی کا پستول اٹھایا اور اسے گولی ماردی۔''

''پھر تم نے اپنا جرم چھپانے کے لیے میلیسا کو بھی مار دیا؟'' چیمبر لین نے کہا۔

''نہیں۔ میں کبھی ایسا نہ کرتا۔''

''پھر تم نے اسے کیوں مارا؟''

لارسن نے اس سوال پر اسے حیرت سے دیکھا اور بولا۔ ''اس کے مارے جانے کا محرک بھی وہی تھا جس کے تحت میں نے آرچی کو قتل کیا۔ میں اسے دیوانہ وار چاہتا تھا لیکن اس کی بات پر مجھے غصہ آگیا اور فوری اشتعال کے تحت میں نے اسے بھی گولی ماردی۔ وہ اگر زندہ رہتی تو مجھے جیل جانا پڑتا اور وہ کسی اور کے ساتھ زندگی بسر کرتی جو مجھے گوارا نہیں تھا۔''

''جیل تو تم اب بھی جاؤ گے۔'' چیمبر لین بولا۔ ''میں تمہیں ان دونوں کو قتل کرنے کے الزام میں گرفتار کرتا ہوں۔''

لارسن نے اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھادیے اور بولا۔ ''کم ازکم یہ اطمینان تو ہوگا کہ اب مجھے ستانے والا کوئی نہیں ہے۔''

☆

دماغ فروش

مختار آزاد

دولت انسان کی ضرورت ہے یہ بات سمجھنے میں آتی ہے...... مگر فی زمانہ دولت ہر شخص کا مطمح نظر بنتی جارہی ہے...... بساط سے بڑھ کر کسی بھی شے کی خواہش رفتہ رفتہ ہوس میں مبتلا کردیتی ہے ---- اور پھر اس کے حصول کے لیے نت نئے طریقے ایسی راہوں کا مسافر بنا دیتے ہیں جہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں رہتا...... دولت کے لیے انسانوں کا شکار کرنے والے سفاک شکاریوں کی لرزا خیز داستان، جنہوں نے موت کو منفعت بخش کاروبار میں تبدیل کردیا تھا

اس فرض شناس پولیس افسر کی سرگرمیاں جو ہر صورت معاشرے سے جرم کا خاتمہ چاہتا تھا

وہ سرد ترین رات تھی۔ کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ ہوا اتنے زور سے چل رہی تھی کہ اس کی شائیں شائیں سے دل دہل رہا تھا۔ اس سیاہ ترین رات میں گریگن کافی دور سے پیدل چلا آرہا تھا۔ اس کی منزل ایک گھر تھا۔ جس کی نشانی قطار کی صورت، سڑک کے کنارے لگے چنار کے درخت تھے۔ اسے ان ہی درختوں کی تلاش تھی۔ درختوں کی اس قطار کے اختتام پر ایک جھیل تھی لیکن جس گھر میں گریگن کو جانا تھا، وہ جھیل سے چند قدم کے فاصلے پر، ان درختوں کی قطار کے بالکل سرے پر واقع گھر تھا۔ اس سرد ترین رات میں سڑک بالکل سنسان تھی۔ آدم نہ آدم زاد ماسوائے اس ایک راہ گیر کے۔ ہر کوئی اپنے گھر کے اندر کمبل میں دبکا ہوا تھا۔ جبکہ گریگن بدستور آگے کی جانب بڑھتا رہا۔

کافی دور تک پیدل چلتے رہنے کے بعد گریگن کو قطار میں لگے چنار کے درخت نظر آنے لگے۔ ان درختوں کی شاخیں کافی بڑی اور نیچے کی جانب جھکی ہوئی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ زمین کو چھونے کی کوشش کررہی ہیں۔ درختوں کے گھنے پن کے باعث کھمبوں پر لگے بلب کی روشنی کو سڑک تک پہنچنے میں رکاوٹ پیش آرہی تھی۔ عجیب سا خوفزدہ کردینے والا ماحول تھا۔

سڑک کے جس کنارے پر وہ چل رہا تھا، اس ہاتھ پر مکانات بنے ہوئے تھے۔ اسے تین منزلہ مکان نمبر چھیالیس کی تلاش تھی۔ آخرکار اسے مطلوبہ مکان نظر آگیا۔ مکان کے اندر روشنی ہورہی تھی۔ البتہ باہر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ وہ مکان کے احاطے کا گیٹ عبور کرکے داخلی دروازے پر پہنچا اور

www.pkdigest.com

دروازے پر لگی گھنٹی بجادی۔

سردی کے مارے اس کے دانت بج رہے تھے۔ اس نے جینز اور ڈینم کی شرٹ کے اوپر جیکٹ اور اس کے اوپر اوور کوٹ پہن رکھا تھا لیکن پھر بھی لہو جما دینے والی ٹھنڈ اس کی ہڈیوں میں اتر رہی تھی۔ اس نے دونوں بازو سینے پر باندھ رکھے تھے۔ سرد ہوا نے پورے راستے اس کے چہرے پر تھپیڑے برسائے تھے۔ اس کی شدید خواہش تھی بس وہ جلدی سے آتشدان کے سامنے جا کر بیٹھ جائے۔ اگر کچھ دیر ایسے ہی رہا تو اس کا جسم مفلوج ہو جائے گا۔ گھر کے اندر سے کھانے کی اشتہا انگیز خوشبوئیں آ رہی تھیں۔ لگتا تھا کہ کچن میں مصالحے دار گوشت بھونا جا رہا ہے۔ یہ خوشبو اس کی بھوک کو جگا رہی تھی۔

جب کافی دیر بعد بھی اندر سے کوئی جواب نہ ملا تو اس نے ایک بار پھر گھنٹی بجائی۔

''کون ہے؟'' تھوڑی دیر بعد دروازے پر لگے انٹر کام سے کسی خاتون کی آواز سنائی دی۔ کریگن نے انٹر کام کے جوابی بٹن کو دبایا۔

''میرا نام فریک کریگن ہے اور میں مسز میلری سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''اندر آ جائیں۔'' چند لمحوں کے بعد اندر سے اسی خاتون کی آواز انٹر کام پر دوبارہ گونجی۔ ''وہ کچن میں ہیں۔ بس تھوڑی ہی دیر میں باہر آ جائیں گی۔ آپ اندر تشریف لے آئیں۔''

اس کے بعد دروازہ کھل گیا۔ یہ دروازہ بجلی کے خودکار لاک سے منسلک تھا۔ خاتون نے انٹر کام آف کرتے ہی بٹن دبا کر دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی وہ اندر کی طرف لپکا۔

یہ وسیع و عریض مکان تھا۔ اس کا طرزِ تعمیر قدیم یورپی انداز کا تھا۔ اس طرزِ تعمیر کو بویہائی طرزِ تعمیر کہا جاتا ہے۔ جب کریگن اندر داخل ہوا تو سامنے ہی ایک بڑا سا ہال تھا۔ وہ سیدھا آتش دان کی طرف لپکا اور اس کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے اوور کوٹ کے بٹن کھولنے لگا۔ باہر شدید سردی تھی لیکن اندر کا موسم خاصا گرم تھا۔ آتش دان میں دہکتے ہوئے لکڑی کے گٹھوں نے اس کے جسم کو تھوڑی ہی دیر میں گرما دیا۔ ہال میں بھی کھانے کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں تک پہنچنے کے لیے کریگن کافی مسافت پیدل طے کر کے آیا تھا۔ اس کا کھایا پیا سب ہضم ہو چکا تھا۔ اب یہ انواع و اقسام کے کھانوں سے اٹھنے والی خوشبو کی لپٹیں اس کے پیٹ میں تلاطم بپا کر رہی تھیں۔

''میں نے انہیں بتا دیا ہے کہ آپ ان کا انتظار کر رہے ہیں۔'' تھوڑی دیر میں ایک نحیف لڑکا اس کے پاس آیا اور خوشدلی سے کہنے لگا۔ ''وہ کچن میں ہیں۔ کھانا تیار ہو رہا ہے۔ بس ذرا سی دیر میں وہ فارغ ہو کر سیدھی یہیں آتی ہیں۔''

''کیا تم مسز میلری کے بیٹے ہو؟'' کریگن نے سوال کیا۔

''جی نہیں۔ میں ان کی بہن کا بیٹا ہوں۔ میرا نام جیک ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

''تو پھر صحیح معنوں میں یہ آپ لوگوں کا فیملی بزنس ہوا۔'' کریگن نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ مما، پاپا، میری بہن اور خود میں... ہم سب مل کر آنٹی میلری کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔'' جیک نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ''ویسے زیادہ تر کام مما، پاپا اور آنٹی کرتے ہیں۔ بس ہم ان کی مدد کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہم ان کی اچھی طرح مدد کر پاتے ہیں۔'' اس نے مسکرا کر کریگن کی طرف دیکھا۔

''بہت خوب۔ اچھی بات ہے۔ ہمیں کام کرنا چاہیے۔ محنت میں عظمت ہے۔'' کریگن نے جیک کی تعریف کی تو اس کا چہرہ پھول اٹھا۔

کریگن اور جیک اس وقت جس ہال میں بیٹھے تھے، اس کے اطراف سے متعدد راہداریاں گزر رہی تھیں۔ ہال کے مرکز سے آہنی رنگت کی لکڑی کی تنگ سی سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں جن پر نہایت نفاست سے قالین بچھے ہوئے تھے۔ اوپر قطار میں کمرے بنے ہوئے تھے۔ ان کمروں سے باتوں اور موسیقی کی آوازیں آ رہی تھیں لیکن کوئی شخص اب تک کریگن کو دکھائی نہیں دیا تھا، سوائے ان دو ویٹرز کے جو ایک سے دوسرے کمرے میں آ جا رہے تھے۔

کریگن چہار اطراف کا گہری نظروں سے جائزہ لے رہا تھا اور جیک اس کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔

''وہ ہے آفس...'' جیک نے ایک طرف اشارہ کیا۔ یہ ایک تنہا سا کونہ تھا جس میں ایک راہداری بنی ہوئی تھی۔ ''دفتری کام کاج وہیں سرانجام دیے جاتے ہیں۔'' جیک نے اپنی بات مکمل کی۔

کریگن اٹھ کر دفتر والے حصے کی طرف بڑھا۔ یہ دفتر گھر کے جس حصے میں واقع تھا، اس کی بیرونی دیوار کے پاس برج تھا۔ دفتر نہایت خوبصورتی سے سجا ہوا تھا۔ اخروٹ کی لکڑی سے بنی الماریوں میں قرینے سے فائلیں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک شیلف میں انہیں ملنے والی شیلڈز، سرٹیفکیٹس اور دوسرے اعزازات سجے ہوئے تھے۔

ابھی وہ دفتر کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ ایک چھوٹے قد

کی عورت کمرے میں داخل ہوئی۔

''مسز میلری... مجھے یقین ہے آپ فریک کریگن ہیں۔'' ملگجے بالوں، اور چشمہ لگائی ہوئی خاتون نے مسکراتے ہوئے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ اس نے بھی ویسا ہی لباس پہنا ہوا تھا، جیسا اس کے بھانجے جیک نے پہن رکھا تھا۔ یہ یہاں کام کرنے والوں کا مخصوص لباس تھا شاید۔ کریگن نے دل میں سوچا اور کہا۔

''جی ہاں... میں فریک کریگن ہوں۔ آپ مجھے کریگن بھی کہہ سکتی ہیں۔ بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔''

''مجھے بھی۔'' یہ کہتے ہوئے وہ میز کے پیچھے رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ میز پر رکھے لیمپ سے ہلکی سبز روشنی پھیل رہی تھی۔ جس نے دفتر کے ماحول کو خاصا پُرسکون بنا دیا تھا۔ بیٹھتے ہی وہ کام کی بات پر آ گئی۔

''آپ اپنی بوڑھی ماں کے رہنے کے لیے کسی مناسب جگہ کی تلاش میں ہیں؟''

''جی... بالکل یہی بات ہے۔''

''آپ کو یہاں کا پتا کس نے بتایا؟'' مسز میلری نے سوال کیا۔

''مسز ہارڈی نے آپ کا حوالہ دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کی والدہ یہاں بہت خوش رہتی تھیں۔''

''اوہ... ویسے آپ کی ماں کی عمر کتنی ہے؟'' مسز میلری نے ایک اور سوال کر دیا۔

''ان کی عمر تہتر برس ہے لیکن اس عمر میں بھی وہ بالکل چاق و چوبند ہیں۔ انہیں دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ پچھتر ساٹھ برس سے اوپر کی ہوں گی۔ بہت خوبصورت ہیں میری مما اس عمر میں بھی۔'' کریگن دلچسپی سے اپنی ماں کی شخصیت کے بارے میں مسز میلری کو بتا رہا تھا۔ ''بات یہ ہے کہ ہم جس گھر میں رہتے ہیں، وہ ہمارا آبائی گھر ہے۔ ہم وہیں پیدا ہوئے تھے۔ میری مما نے پوری زندگی اسی گھر میں گزار دی۔ گھر میں ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔ میں خود اس بات کا خیال رکھتا ہوں کہ مما کو وقت بے وقت اگر کسی چیز کی ضرورت پڑے تو وہ انہیں فوراً مل جائے۔''

''تو آپ انہیں یہاں کیوں بھجوانا چاہتے ہیں؟'' مسز میلری کا سوال مناسب تھا۔

''بات یہ ہے گھر میں سارا دن کوئی بڑا نہیں ہوتا ہے۔ ہم لوگ کاموں کی وجہ سے دن بھر گھر سے باہر رہتے ہیں اور مما گھر پر اکیلی رہ جاتی ہیں۔ ان کے گھر پر اکیلے رہنے کے سبب ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا ہے کہیں خدانخواستہ انہیں کوئی حادثہ نہ پیش آ جائے۔ ویسے مما کو لوگوں سے باتیں کرنے کا بھی بہت شوق ہے۔ اب گھر پر دن بھر تو کوئی رہ نہیں سکتا۔ ایسے میں وہ کس سے باتیں کر کے اپنا دل بہلائیں۔ مجھے تو اب یہ ڈر بھی رہنے لگا ہے کہ اگر اس طرح وہ اکیلی رہتی رہیں تو کہیں ذہنی دباؤ کا شکار نہ ہو جائیں۔ اس لیے میں یہاں حاضر ہوا ہوں۔'' کریگن نے تفصیل سے اپنے یہاں آنے کا مدعا بیان کر ڈالا۔

''میرے خیال میں تو وہ اب تک ذہنی دباؤ کا شکار ہو چکی ہیں۔ ویسے انہیں یہاں ٹھہرانے کا فیصلہ کرنے سے پہلے مجھے ایک بار ان سے ملنا ہوگا۔ کیا ان سے ملاقات ہو سکتی ہے؟''

''کیوں نہیں، بالکل... جب آپ چاہیں۔ بہتر تو یہ ہے کہ جتنا جلد آپ ان سے مل سکتی ہیں، مل لیں۔ میرے خیال میں یہ زیادہ مناسب ہوگا۔'' کریگن نے مسز میلری کی بات کے جواب میں کہا اور پھر پوچھا۔

''آپ انہیں یہاں ٹھہرانے کے لیے ماہانہ کتنی رقم لیں گی؟''

''اس سے پہلے کہ میں انہیں یہاں رکھنے کے اخراجات اور دیگر باتیں بیان کروں۔ میں ان سے ملنا چاہوں گی۔ یہ باتیں تو ہو ہی جائیں گی۔'' مسز میلری نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''میرے پاس آپ کا موبائل نمبر ہے۔ میں آپ کو جلد ہی فون کر کے گھر پر ملنے کے لیے آتی ہوں۔''

''بہت بہتر۔''

مسز میلری کے پیچھے پیچھے کریگن بھی دفتر کے کمرے سے باہر نکل آیا۔

باہر جانے کا دروازہ ہال سے ہو کر گزرتا تھا۔ ہال میں کھونٹی پر لٹکے اوور کوٹ اور ہیٹ کو اٹھا کر جب وہ واپسی کے لیے ہال سے گزر رہا تھا تو اس نے نوٹ کیا کہ باہر پورچ میں کھلنے والے دروازے پر سادہ الارم لگا ہوا ہے۔ اس کا اندازہ تھا کہ یہ الارم گھر سے باہر کی طرف کھلنے والے ہر دروازے پر لگے ہوئے ہوں گے۔ شاید اس لیے کہ اگر کوئی شخص یہ جاننا چاہتا ہے کہ گھر سے اگر کوئی باہر قدم رکھے تو اسے علم ہو جائے۔

مسز میلری اسے پورچ تک چھوڑنے کے لیے آئی تھیں۔ آتے ہوئے اس کی نظر دروازے کے بغل میں بنے ایک کمرے پر پڑی۔ یہ کمرا بطور لاؤنج استعمال ہوتا ہوگا مگر اس وقت یہ خالی تھا۔ کریگن نے ایک ہی نظر میں لاؤنج کا اچھی طرح جائزہ لے لیا۔ یہاں دو ٹیبل رکھی ہوئی تھیں۔ ایک پیانو تھا۔ دیوار گیر شیلف میں قرینے سے کتابیں رکھی گئی تھیں۔ آرام دہ صوفے اور کرسیاں تھیں۔

www.pkdigest.com

''اچھا مسز میلری، بہت شکریہ وقت دینے کا۔ امید ہے کہ آپ سے جلد ملاقات ہوگی۔'' کرنگین نے الوداعی مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں... امید ہے کہ ہم بہت جلد ملیں گے۔''

''گڈ بائے...'' کرنگین واپسی کے لیے اسی سنسان راستے پر، سرد ہواؤں کے تھپیڑے کھاتا ہوا آگے بڑھنے لگا، جن سے گزر کر وہ یہاں تک پہنچا تھا۔

☆☆☆

کرنگین مقامی پولیس کا ایک افسر تھا۔ چند سال قبل وہ ایک ملزم کو گرفتار کرنے کے لیے اس کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ دوڑتے دوڑتے وہ سڑک پر کچھ اس رُخ سے گرا کہ اس کے سر پر شدید چوٹ آئی اور وہ بے ہوش ہوگیا۔ جب اسے ہوش آیا تو پتا چلا کہ وہ دو دن تک دنیا و مافیہا سے غافل رہا ہے۔ کچھ عرصہ اسپتال میں رہنے کے بعد وہ صحت یاب ہوکر ڈیوٹی پر لوٹ آیا۔

اس حادثے سے بظاہر کرنگین صحت یاب ہوگیا تھا لیکن دماغ پر لگنے والی چوٹ کے بعد سے اس کے رویے میں تبدیلیاں آنی گئیں۔ اس کے ذہن میں یہ بات جڑ پکڑ رہی تھی کہ اگر معاشرے سے جرم کا خاتمہ کردیا جائے تو ہر قسم کی سماجی برائیاں ختم ہوسکتی ہیں۔ پہلے تو یہ خیال دماغ میں کچھ دیر تک کلبلانے کے بعد اِدھر اُدھر ہوجاتا لیکن آہستہ آہستہ اس خیال نے دماغ پر مکمل طور پر قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد سے کرنگین کا اپنے کام میں انہماک بڑھتا چلا گیا۔ یوں حادثے کے بعد آنے والے چند مہینوں میں ہی اس نے اپنی جان پر کھیل کر درجنوں مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچایا۔

☆☆☆

''ہائے کرنگین... کیا ہورہا ہے۔'' جیکب نے کرنگین کی میز پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ اس وقت وہ پولیس اسٹیشن میں اپنی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا اور کسی ملزم کی فائل پڑھ رہا تھا۔

''ارے تم... کچھ خاص کام نہیں کررہا ہوں۔ سناؤ، چھٹیاں کیسی گزریں؟'' جیکب کو دیکھ کر کرنگین نے خوشی کا اظہار کیا۔ وہ دونوں بہت قریبی دوست تھے۔

''بہت عمدہ... پچھلے مہینے کے دوران تم نے جو کارنامے سرانجام دیے ہیں، ان پر جو ڈی ڈی رپورٹ بنی ہے، وہ دیکھی تھی کل رات۔ بھئی تم نے تو کمال کردیا۔''

''شکریہ۔ بچے اور کیتھی کا کیا حال ہے؟''

''یار تم شادی کرلو تاکہ پتا چلے کہ فیملی کے ساتھ چھٹیاں گزارنے کا مزہ کیسا ہوتا ہے۔'' جیکب نے بے تکلفی سے کہا۔

''میں جانتا ہوں کہ فیملی کے ساتھ چھٹیاں گزارنے کا اپنا الگ ہی لطف ہے مگر اس کے لیے شادی کرنا ضروری نہیں۔ میں نے اپنی ماں اور بہن کے ساتھ بہت تفریح کی ہے چھٹیوں کے دنوں میں۔'' کرنگین مسکراتے ہوئے بولا۔

''ویسے میں نہیں چاہتا کہ جو میرے پاس فالتو وقت ہے وہ میں اپنی ماں کے بجائے کسی اور کے ساتھ شیئر کروں۔ اس لیے تم اپنی بکواس بند کرو۔ آئندہ شادی کرنے کا مشورہ مت دینا۔'' کرنگین کے لہجے میں ہلکی سی پیار بھری خفگی تھی۔

ابھی دونوں دوستوں کی بحث وتکرار جاری تھی کہ شیرف راجر کمرے میں داخل ہوا۔ وہ ذرا جلدی میں لگ رہا تھا۔ کمرے میں آتے ہی اس نے آواز دی۔

''مسٹر کرنگین... جلدی سے میرے کمرے میں آجاؤ۔''

یہ سنتے ہی وہ تیزی سے اٹھا اور شیرف کے کمرے کی طرف چل دیا۔

''بیٹھو۔'' شیرف نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ جونہی وہ کرسی پر بیٹھا شیرف نے کہنا شروع کیا۔

''کوئی ہفتہ بھر پہلے کی بات ہے۔ مجھے لومڑیوں کے ایک شکاری نے اطلاع دی تھی کہ اس نے جنگل کے قریب ..... ایک پرانے اور اجاڑ مکان میں کچھ لوگوں کو مشکوک حالت میں دیکھا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ شام کے وقت وہ جنگل سے لوٹ رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ وہاں ایک پرانی اسٹیشن ویگن آکر رکی۔ اس میں سے چار آدمی اترے اور پچھلے حصے سے انہوں نے ایک اسٹریچر نکالا۔ اس شکاری کا خیال تھا کہ وہ کوئی لاش ہوگی، جسے یہ لے کر اندر چلے گئے۔''

یہ کہنے کے بعد شیرف رکا تو کرنگین جلدی سے بولا۔

''پھر اس نے اور کیا کچھ دیکھا؟''

''کچھ نہیں۔'' شیرف نے جواب دیا۔ ''شکاری کہتا ہے کہ شام ڈھل رہی تھی۔ اندھیرا بڑھتا جارہا تھا لیکن وہ چاروں آدمی باہر نہیں آئے۔ جب اندھیرا بہت زیادہ ہوگیا تو اس نے انتظار کرنے کے بجائے واپسی کی راہ لی اور دوسرے دن مجھ سے مل کر تمام حالات بیان کردیے۔''

''پچھلے ہفتے کی بات ہے۔ اس دن سے اب تک کیا ہوا ہوگا؟''

''بڑے ذہین ہو۔'' شیرف نے کرنگین کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا۔ ''میں نے اس اطلاع کے بعد اس شکاری کی باقاعدہ ڈیوٹی لگائی کہ وہ اگلے چند دن تک اس جگہ کی چھپ کر نگرانی کرے اور روزانہ فون پر مجھے اس کی رپورٹ دیا کرے۔ تو مسٹر کرنگین۔ اس ایک ہفتے کے دوران

میں ایک بات ثابت ہوگئی۔''

''وہ کیا؟'' کرنگین نے تجسس بھرے لہجے میں پوچھا۔

''سنسان جنگل کے کنارے پر واقع وہ بھوت بنگلا واقعی مجرموں کا اڈا ہے۔ اب ہمیں پتا چلانا ہے کہ وہ کون ہیں؟ ان کی مجرمانہ سرگرمیوں کی نوعیت کیا ہے اور جب یہ سب کچھ پتا چل جائے تو پھر ان سب کو رنگے ہاتھوں گرفتار کرنا ہے بمع ثبوت۔'' یہ کہہ کر شیرف چند لمحوں کے لیے خاموش ہوا اور پھر کہنے لگا۔

''کرنگین... یہ کام تم کرو گے۔ مجھے امید ہے کہ یہ کام تم خوش اسلوبی سے سرانجام دے لوگے۔''

''آپ درست کہہ رہے ہیں۔ میں تیار ہوں۔''

''تو ٹھیک ہے۔ یہ ہے اس کیس کی فائل۔'' شیرف نے اپنے سامنے رکھی فائل کرنگین کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

دو ہفتے گزر گئے۔

کرنگین تن دہی سے گھنے جنگل کے کنارے اس اجاڑ مکان کی نگرانی کر..... رہا تھا۔ اس دوران اس نے نہ تو یہاں پر کسی کو آتے دیکھے اور نہ ہی جاتے۔ کوئی ایسی بات محسوس نہیں کی جو غیر معمولی ہو۔ اس دوران رات کے اندھیرے میں وہ دو بار اس گھر کے اندر چوروں کی طرح گھس کر اس بات کا یقین کرچکا تھا کہ جب مجرم اس گھر میں موجود ہوں گے تو وہ کن کن جگہوں سے ان کی سرگرمیوں کو دیکھ سکتا ہے۔

شکاری کا بہروپ دھارے، گھوڑے پر سوار، کندھے پر دوناں والی بندوق... اس حلیے کے کسی شخص کو دیکھ کر یہ کہنا مشکل ہوگا کہ وہ شکاری نہیں، پولیس والا ہے۔ یہ بات کرنگین کے حق میں تھی ورنہ پولیس کا سن کر کون مجرم اپنے ٹھکانے پر لوٹے گا۔

اس شام جنگل کا چکر لگانے کے بعد کرنگین جنگل میں اپنی مخصوص جگہ پر لومڑ اور درختوں کے درمیان سے دوربین نکال کر ویران مکان اور اس کے اطراف کا جائزہ لے رہا تھا کہ اچانک اس نے گاڑی کی آواز سنی۔ آواز کی سمت دوربین موڑی تو ایک پرانی اسٹیشن ویگن نظر آئی۔ وہ سست رفتاری سے چلتی ہوئی مکان کے احاطے میں داخل ہورہی تھی۔ گاڑی دیکھتے ہی کرنگین کے کان کھڑے ہوگئے۔ 'وہ لمحہ آگیا' جس کا انتظار تھا۔' کرنگین نے زیرلب کہا۔

گاڑی رکتے ہی چار درمیانی عمر کے افراد باہر نکلے۔ پچھلے دروازے کو کھول کر انہوں نے ایک اسٹریچر باہر نکالا۔ اسٹریچر پر شاید لاش بندھی ہوئی تھی۔ وہ چاروں اسٹریچر کو گھسیٹتے ہوئے مکان میں داخل ہوگئے۔ یہ دیکھ کر کرنگین گھوڑے سے اترا اور ایک درخت سے اس کی لگام باندھ کر آہستہ آہستہ اس جانب بڑھنے لگا جہاں سے وہ اس مکان کے احاطے میں داخل ہوسکتا تھا۔ کرنگین کو جانے کی جلدی نہیں تھی۔ شکاری کی اطلاع کے مطابق جب اس نے پہلی بار چار مشکوک لوگوں کو اس مکان میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا تو اس وقت شام ہورہی تھی لیکن اچھی خاصی روشنی باقی تھی... اندھیرا چھا جانے تک ان چاروں میں سے کوئی ایک شخص بھی باہر نہیں نکلا۔ اس لیے کرنگین کو اندازہ تھا کہ اسے دیکھ لیے جانے کا نہ تو کوئی خطرہ تھا اور نہ ہی مشکوک افراد کو واپس جانے کی کوئی جلدی ہوگی۔ اس لیے وہ بڑے سکون کے ساتھ مکان کی طرف بڑھتا رہا لیکن درختوں کی اوٹ میں۔

تھوڑی دیر بعد وہ مکان کے احاطے میں داخل ہوچکا تھا۔ چند لمحوں میں ہی وہ اس جگہ تک پہنچ گیا۔ جہاں سے وہ گھر کے مرکزی ہال کا اندرونی منظر دیکھ سکتا تھا۔

کرنگین نے کھڑکی کی جھری سے اندر نظر ڈالی تو چار افراد کرسیوں پر بیٹھے باتیں کررہے تھے۔ ایک کونے میں بجلی سے چارج ہونے والی بڑی سی ٹارچ سے روشنی پھیل رہی تھی۔ جس سے ہال میں ہلکی سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس روشنی میں صرف ایک مشکوک شخص کا چہرہ کسی حد تک صاف نظر آرہا تھا۔ اس کے دوسرے ساتھی اس رُخ پر بیٹھے تھے کہ ان کی پیٹھ اس کھڑکی کی طرف تھی جس سے کرنگین ان چاروں کو دیکھ رہا تھا۔

''میرے خیال میں اب ہمارا کام جم گیا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اپنے بھاؤ بھی بڑھا دیں۔ مجھے تو اب یہ معاوضہ بہت کم لگنے لگا ہے۔'' یہ بات اس شخص نے کہی جس کا دھندلا چہرہ کرنگین کو کسی حد تک نظر آرہا تھا۔

''تیری ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جو بھاؤ مل رہا ہے، اس پر ہم یہ کام آخری بار کررہے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں مارشل یہ ڈلیوری دیتے ہی اپنے نئے ریٹ انہیں بتا دو کہ لینا ہے تو لو ورنہ ان کی اپنی مرضی۔ ہمارے پاس اب کئی اور گاہک بھی ہیں۔''

''کون سے گاہک ہیں؟'' ان میں سے ایک نے یہ سن کر ہنستے ہوئے کہا۔

''کہنے میں کیا حرج ہے۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ اب یہ باتیں بند کرو اور کام کرو۔ کئی گھنٹے لگ جائیں گے کام میں۔ کیا تمہیں ذرا بھی فکر نہیں

www.pkdigest.com

ہے۔'' اس شخص نے اٹھتے ہوئے کہا، جسے مارشل کے نام سے مخاطب کر کے معاوضہ بڑھوانے کا مطالبہ پیش کیا جا رہا تھا۔

''ارے اٹھو بھئی۔ کون کمبخت پوری رات پیٹ میں چوہے دوڑانا پسند کرے گا۔'' ان میں سے ایک نے کہا اور اٹھ کر ٹارچ اپنے ہاتھ میں لی۔ چاروں ایک دوسرے کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے سامنے والے کمرے میں داخل ہو گئے۔

کریگن کو ان چاروں کی باتوں سے یہ اندازہ تو ہو گیا تھا کہ یہ جو بھی کام کر رہے ہیں، وہ غیر قانونی ہے۔ اگرچہ مجرم اس کی آنکھوں کے سامنے تھے لیکن وہ انہیں پکڑنے میں جلد بازی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

کریگن سوچ رہا تھا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے موجود یہ لوگ ہی صرف اس جرم کے ذمے دار نہیں ہو سکتے، وہ جرم جس کی نوعیت سے وہ خود اب تک ناواقف ہے۔ یہ ڈلیوری دینے اور کام مکمل کرنے میں صرف ہونے والے کئی گھنٹوں کی بات کر رہے تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ جو سامان ڈلیور کرنا تھا وہ تیار حالت میں انہیں نہیں ملتا ہے۔ اسے حتمی شکل یہ لوگ دیتے ہیں۔ یعنی اس جرم کے تین کردار ہیں۔ پہلا وہ جو انہیں سپلائی آرڈر دے رہا ہے۔ تیسرا وہ جو خام مال مہیا کر رہا ہے اور درمیان میں ہیں یہ چار لوگ یا پھر ہو سکتا ہے کہ چار سے زیادہ ہوں۔ ان کے کئی اور ساتھی ہوں۔ جو یہاں تک پہنچنے میں ان کی معاونت کرتے ہوں یا ڈلیوری کے وقت ان کے ساتھ ہوتے ہوں۔

کریگن نے دماغ سے کام لیا۔ وہ چاہتا تو اسی وقت ایک وائرلیس کر کے پولیس بلوا لیتا اور چاروں گرفتار ہو جاتے مگر اب وہ چاہتا تھا کہ صرف ان چاروں کو ہی نہیں، اس جرم کی جڑ تک کو گرفتار کر کے کیفرِ کردار تک پہنچائے۔ اس لیے اس نے مکان کے اندر جانے کا فیصلہ کیا۔ اسے یہ سن کر اطمینان ہو گیا تھا کہ وہ چاروں اندر ہیں اور مزید کئی گھنٹوں تک ان کے باہر آنے کا کوئی امکان نہیں۔ دوسرا یہ کہ اندر اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ اس لیے فوری طور پر اسے دیکھ لیے جانے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

یہ سوچ کر کریگن بڑے سکون سے اٹھ کر کھڑا ہوا۔ اس نے جوگرز پہنے ہوئے تھے۔ اس لیے قدموں کی چاپ کا پیدا ہونا ممکن نہیں تھا۔ اس وقت باہر بھی اندھیرا چھا چکا تھا۔ اس کی جیب میں پنسل لائٹ تھی لیکن وہ احتیاط کے طور پر اسے استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کریگن دن کی روشنی میں جب اس مکان کا جائزہ لینے کے لیے کئی روز پہلے یہاں آیا تھا۔ تب ہی وہ امکانی طور پر یہ طے کر چکا تھا اگر مکان کے اندر داخل ہونا پڑے تو وہ کس راستے سے اندر داخل ہو گا۔ اس کے باوجود بھی وہ نہایت احتیاط سے قدم آگے بڑھا رہا تھا تا کہ زمین پر بکھرے ہوئے کاٹھ کباڑ سے اس کا پاؤں نہ ٹکرائے اور کوئی ایسی آواز پیدا نہ ہو جس سے اندر موجود مشکوک لوگوں کے کان کھڑے ہو جائیں۔ سو وہ پھونک پھونک کر ایک ایک قدم اٹھاتا رہا اور آگے بڑھتا رہا۔

مکان کے ہال میں وہ داخل ہوا اور اندازے سے کمرے کے اس دروازے کی طرف بڑھنے لگا جس کے اندر وہ چاروں گئے تھے۔ اس نے دروازے سے کان لگائے لیکن اندر مکمل طور پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کسی چیز کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ چار پانچ منٹ تک اندر کی ٹن گن لینے کی کوشش کرتا رہا مگر جب یقین ہو گیا کہ اندر کوئی نہیں ہے تو پھر اس کو حیرت ہوئی۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ چاروں اسی کمرے میں گئے تھے۔'' اس نے سوچا۔

اچانک اس کے دماغ میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا اور اس نے جیکٹ کے اندر ہاتھ ڈال کر بغلی ہولسٹر میں لگے اپنے سروس ریوالور کو نکالا۔ اس کا سیفٹی لاک کھولا اور ریوالور کو مستعدی سے ہاتھ میں پکڑ کر دروازے کو آہستہ آہستہ اندر کی طرف دھکیلنے لگا۔ دروازہ اندر سے کھلا ہوا تھا۔ کریگن پوری طرح تیار تھا۔ اگر اندر کوئی شخص موجود ہے اور اس نے دروازہ کھلنے پر کوئی ہوشیاری کی تو وہ اس پر قابو پا سکتا تھا مگر جب دروازہ کھلا تو اندر مکمل خاموشی اور اندھیرا تھا۔ کریگن دروازہ کھل جانے کے بعد بھی اس کی اوٹ میں دبکا رہا۔ کچھ دیر بعد جب اسے یقین ہو گیا کہ واقعی اندر کوئی نہیں تو وہ گھٹنوں کے بل آگے بڑھا۔

حیرت انگیز طور پر کمرا واقعی خالی تھا۔ ایک بات تو طے تھی کہ وہ چاروں اسی کمرے میں داخل ہوئے تھے مگر سوال یہ تھا اندر داخل ہونے کے بعد وہ باہر نکلے نہیں تو پھر گئے کہاں؟

یہ کمرا خاصا بڑا اور مستطیل تھا۔ وہ گھٹنوں کے بل چلتا ہوا ہاتھوں سے فرش پر پڑے قالین کو ٹٹول رہا تھا۔ آخر اسے جواب مل ہی گیا کہ وہ لوگ کہاں گئے ہیں۔ فرش پر سے ایک جگہ پر قالین پلٹا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ سے ٹٹولا تو یہ لکڑی کا چوکور ڈھکن نکلا۔ یہ ڈھکن اس سیڑھی والے راستے کے اوپر تھا، جو تہ خانے کو جاتی تھیں۔

''تو وہ لوگ تہ خانے میں ہیں۔'' کریگن نے زیرِ لب کہا اور ڈھکن اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ اتنی آہستگی سے ڈھکن ابھار رہا تھا کہ ہلکی سی بھی آواز نہ پیدا ہو۔ کوئی چھ انچ اوپر تک جب اس نے ڈھکن اٹھا لیا تو اندر نظر ڈالی۔ واقعی یہ

تہ خانے کا راستہ تھا اور نیچے لکڑی کی بنی سیڑھیاں کافی دور تک جا رہی تھیں۔ یہ بات اس نے ہاتھ سے ٹٹول کر محسوس کی۔

سیڑھیوں پر مکمل اندھیرا چھایا ہوا تھا اور کریگن یہ بات نہیں جانتا تھا کہ یہ سیڑھیاں کتنے آگے تک گئی ہیں۔ یہ جاننے کے لیے اس نے ڈھکن کو مزید کچھ اور اوپر اٹھایا اور جب نیچے جھانکا تو سیڑھیوں کے اختتام پر اسے دودھیا روشنی دکھائی دی۔ یہ روشنی کمرے کے اندر روشن تھی اور کمرے سے چھن چھن کر سیڑھیوں کے اس حصے پر پڑ رہی تھی۔ یہ دودھیا روشنی کافی تیز تھی۔ اتنی تیز جیسے کسی اسپتال کے آپریشن تھیٹر کی لائٹیں ہوتی ہیں۔

کریگن چاہ رہا تھا کہ وہ سیڑھیوں کے آخری سرے تک جا کر یہ دیکھے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے لیکن اسے اس بات کا بھی احساس تھا کہ اندر جانا خطرناک ہو سکتا ہے۔ یہ سوچ کر اس نے سیڑھیوں کا ڈھکن نہایت آہستگی سے، کوئی آواز پیدا کیے بغیر بند کیا اور دبے پاؤں چلتا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا۔

کریگن کو اندازہ تھا کہ ابھی مشکوک افراد مزید ایک ڈیڑھ گھنٹے مصروف رہیں گے۔ کریگن اب جلدی میں تھا۔ وہ جلد از جلد انہیں رنگے ہاتھوں پکڑنا چاہتا تھا۔ جس طرح بنا آہٹ پیدا کیے وہ کمرے سے باہر نکلا، اسی طرح خاموشی سے مکان کے اندر سے بھی نکل آیا۔ مکان سے کافی دور ہٹ کر اس نے اپنا وائرلیس سیٹ نکالا اور شیرف سے رابطہ کر کے پیغام دیا۔

شیرف فوراً وائرلیس پر آ گیا۔

''بولو، کیا خبر ہے۔''

''سب تیار ہے۔ پولیس پارٹی کو بغیر سائرن اور بنا لائٹ والی گاڑیوں کے ساتھ لے کر فوراً یہاں پہنچو۔ مکان سے کافی دور سائڈ میں کھڑی کرنا اور پھر پیدل چل کر مکان تک پہنچنا... اوور۔''

''ٹھیک ہے کریگن۔ کچھ اور...''

''مکان کے احاطے میں داخل ہو کر خاموشی سے اسے چاروں جانب سے گھیر لینا اور کم از کم پانچ کمانڈوز مکان کے اندر داخل ہوں گے۔ وہ بھی خاموشی سے، بنا روشنی۔ اندھیرے میں دیکھنے والے چشمے سب کے پاس ہونے چاہئیں۔ میں ہال میں انتظار کروں گا اور چھاپے والی جگہ تک رہنمائی بھی۔''

''ٹھیک ہے۔ ہم آدھے گھنٹے میں وہیں ہوں گے۔'' شیرف نے پُرجوش لہجے میں جواب دیا۔

''سنو، پولیس سرجن، ویڈیو کیمرا اور فوٹو گرافر بھی ہونے چاہئیں۔''

''پولیس سرجن کیوں؟'' شیرف نے پوچھا۔

''یہاں پہنچو گے تو جواب مل جائے گا۔'' کریگن نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ یہ سب ساتھ ہوں گے۔ تم فکر نہ کرو۔ بس ہم آدھا گھنٹے میں پہنچ رہے ہیں۔ اور کچھ...''

''اوور۔'' یہ کہتے ہی کریگن نے وائرلیس آف کر دیا۔

اسے اب انتظار کرنا تھا پولیس پارٹی کے یہاں پہنچنے کا۔ ابھی آدھا گھنٹا بھی نہیں گزرا تھا کہ پولیس پارٹی پہنچ گئی۔

کریگن کی رہنمائی میں تین پولیس کمانڈوز تہ خانے میں اترے۔ ان کے پیچھے پولیس سرجن اور فوٹو گرافر تھے۔ کریگن اندر ہونے والی واردات کی تصاویر کے ساتھ ساتھ ویڈیو فلم بھی بنوانا چاہتا تھا۔

جب تہ خانے میں پولیس داخل ہوئی تو اندر کا ماحول دیکھ کر وہ سب حیران رہ گئے۔ تہ خانہ کسی اسپتال کے آپریشن تھیٹر کی عکاسی کر رہا تھا۔ بڑی سی میز کے اوپر بڑی بڑی لائٹیں روشن تھیں جنہیں گیس سلنڈر سے چلنے والے جنریٹر سے بجلی فراہم کی جا رہی تھی۔ چاروں مشکوک افراد نے سرجن کے لیے مخصوص سبز لبادے پہنے ہوئے تھے۔ ان کے ناک اور منہ پر نقاب تھی۔ سر پر سفید ٹوپی چڑھی ہوئی تھی۔

آپریشن ٹیبل پر ایک آدمی لیٹا ہوا تھا اور یقیناً اب تک زندہ تھا کیونکہ اسے آکسیجن لگی ہوئی تھی۔ اس کے پاؤں سے گردن تک سفید چادر پڑی ہوئی تھی۔ پولیس پارٹی پر پہلی نظر اس شخص کی پڑی جو اپنے ہاتھوں میں آلاتِ جراحی کی ٹرے تھامے کھڑا ہوا تھا۔ اس کا منہ عین سیڑھیوں کی جانب تھا۔ پولیس پر نظر پڑتے ہی اس کے ہاتھوں سے ٹرے چھوٹ کر فرش پر گر پڑی اور پھر آپریشن تھیٹر میں موجود باقی تینوں 'ڈاکٹر' بھی گھبرا گئے۔ پولیس کمانڈوز نے چند لمحوں میں ہی چاروں کی مشکیں کس لیں۔

''سرجن... تم جلدی سے دیکھو۔ یہ لوگ اس انسان کے ساتھ کیا کر رہے تھے؟'' کریگن زور سے چیخا۔ یہ سنتے ہی سرجن آگے بڑھا اور دوسرے ہی لمحے اس کے منہ سے چیخ نکلی۔

''او میرے خدا...''

''یہ سنتے ہی کریگن بھی ٹیبل کی طرف بڑھا اور جو کچھ دیکھا وہ کسی بھی کمزور دل شخص کے ہوش اڑا دینے کے لیے کافی تھا۔ سامنے ٹیبل پر ایک بوڑھی عورت لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی ناک میں آکسیجن کی نلکی تھی اور برابر لگی مشین بتا رہی تھی کہ اس کے دل کی دھڑکنیں چل رہی ہیں۔ اس کی کھوپڑی کھلی ہوئی تھی اور اس کا دماغ باہر نکلا ہوا تھا۔

''یہ کیا ہو رہا تھا یہاں۔'' شیرف دھاڑا۔

www.pkdigest.com

''سب سے پہلے ہمیں اس عورت کو بچانا ہے۔'' سرجن چلایا۔

''تمام حالات بیان کر کے ایمبولینس اور ڈاکٹر کو بلوایا جائے۔'' شیرف نے چلا کر حکم دیا۔

یہ جگہ شہر کے مرکزی اسپتال سے کافی دور تھی اور جب تک ایمبولینس یہاں پہنچتی، تب تک وہ بڑھیا عورت اس جہاں سے گزر گئی۔

ایمبولینس کے ذریعے بڑھیا کی لاش کو اسپتال منتقل کیا گیا۔ فوٹوگرافر نے تصاویر کھینچیں اور تمام واقعات کی تفصیل سے وڈیو بنائی تاکہ بعد میں عدالت کے سامنے بطور ثبوت پیش کیا جاسکے، نیز تفتیش میں بھی مدد مل سکے لیکن جب ملزمان کو لے جانے کی باری آئی تو کریگن کے دماغ میں فوراً خیال آیا۔

''شیرف... میرا خیال ہے کہ آٹھ دس پولیس کمانڈوز کے علاوہ باقی نفری کو یہاں سے واپس بھیج دیا جائے۔ صرف دو کمانڈوز یہاں ہال میں رہیں اور باقی خفیہ طور پر مکان کو بدستور گھیرے میں رکھیں۔''

''میں تمہاری بات نہیں سمجھا۔'' شیرف نے اچنبھے سے کہا۔

''بات یہ ہے کہ جس ڈلیوری کی بات یہ لوگ کررہے تھے، وہ تھی دماغ کو جسم سے نکال کر ان جرائم پیشہ گروہ کے حوالے کرنا، جن کے لیے یہ کام کرتے ہیں۔ میرے خیال میں اس وقت موقع ہے۔ ان چاروں کے ساتھ ان لوگوں کو بھی گرفتار کیا جاسکتا ہے جن کے لیے یہ کام کرتے ہیں۔''

''وہ کیسے؟'' شیرف نے سوال کیا۔

''میرا منصوبہ یہ ہے کہ...'' یہ کہہ کر کریگن نے تفصیل سے اپنا منصوبہ شیرف کو بتانا شروع کیا۔

''بہت ہی اعلیٰ...'' کریگن کا منصوبہ سن کر شیرف نے فخر سے کہا۔ ''تم تو بہت دور کی سوچتے ہو۔ کیا ہی کہنے۔ ہم تو مجرم پکڑنے آئے تھے۔ ان کے باپ بھی مل جائیں تو سونے پر سہاگا۔''

تھوڑی دیر بعد پکڑے جانے والا ایک شخص جو اس کو قابو میں رکھتے ہوئے اپنے موبائل فون سے ایک نمبر ملا رہا تھا۔

''ہیلو... ہاں ہوگن میں مارشل بول رہا ہوں۔ پارسل تیار ہے۔ بس ایک مشکل آن پڑی ہے۔''

''کیا ہوا؟'' دوسری طرف سے پوچھا گیا۔ موبائل کا اسپیکر آن تھا اور ہوگن کی باتیں سب سن رہے تھے۔

''ہماری اسٹیشن ویگن کی کرینک شافٹ ٹوٹ گئی ہے۔ اب ہم ڈاک خانے کے باہر کھڑے ہیں۔ تم جلدی سے آؤ اور پارسل لے جاؤ... ہاں وہ معاوضہ بھی لیتے آنا۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ میں فوراً پہنچ رہا ہوں۔''

''سنو، ڈاک خانے سے.... کافی پہلے گاڑی کی ہیڈ لائٹس آف کردینا۔ کہیں کوئی دیکھ نہ لے۔''

''ٹھیک ہے۔ تم انتظار کرو۔ میں بس نکل رہا ہوں یہاں سے۔''

یہ کہہ کر ہوگن نے لائن آف کی تو اس کے ساتھ ہی کریگن کے منصوبے کا پہلا مرحلہ ختم اور دوسرا شروع ہوگیا۔ باہر موجود پولیس کی تمام گاڑیوں کو جنگل میں ایسے کھڑا کروادیا گیا کہ کسی کی نظر ان پر نہ پڑسکے۔ یہی وجہ تھی کہ احتیاطاً ہوگن کو بھی گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس بند رکھنے کی ہدایت کی گئی تھی تاکہ وہ زمین پر گاڑیوں کے ٹائروں کے نشانات سے چوکنا نہ ہوجائے۔

کوئی پون گھنٹے کے بعد ایک لینڈ کروزر جیپ مکان کے احاطے میں داخل ہوئی۔ اس وقت مارشل اور اس کے تینوں ساتھی بالکل نارمل حالت میں اسٹیشن ویگن سے کافی فاصلے پر کھلے احاطے میں کھڑے تھے۔ پولیس نے ان کی ہتھکڑیاں کھول دی تھیں لیکن وہ چاروں نشانہ بازوں کی زد پر تھے۔ ان میں سے اگر کوئی ایک بھی خلاف ہدایت حرکت کرتا تو اس کی موت یقینی تھی۔ ایک جانب اندھیرے میں بیٹھا ہوا کیمرامین نائٹ وژن کیمرے کی مدد سے وڈیو بنا رہا تھا۔

جیپ کے رکتے ہی اس میں سے ایک ادھیڑ عمر شخص ڈرائیونگ سائڈ کا دروازہ کھول کر باہر نکلا۔

''مارشل تم نے تو مروا دیا۔ اندھیرے میں ڈرائیونگ کروادی مجھ سے۔'' گاڑی سے باہر آنے والے شخص نے زور سے ہنستے ہوئے کہا۔ یہ ہوگن تھا۔

''تمہارا پارسل پہنچانے کے لیے نکل رہے تو ریورس کرتے ہوئے کرینک شافٹ ٹوٹ گئی۔ اب ایسے میں کیا کرسکتا تھا میں۔'' مارشل نے قدرے سکون سے جواب دیا۔

''چلو ٹھیک ہے۔ یہ پارسل لاؤ۔'' ہوگن نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بڑے سے لفافے کو مارشل کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

مارشل نے جیسے ہی اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھرماس کو ہوگن کے ہاتھ میں تھمایا۔ پورا احاطہ روشنی میں نہا گیا۔ ایک لمحے کو تو ہوگن کچھ نہیں سمجھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ بھاگتا، ایک کمانڈو نے اسے اپنے ہاتھوں کے شکنجے میں جکڑ کر ہتھکڑیاں لگادیں۔

ادھر پولیس پارٹی ملزموں کو گرفتار کر کے لے جارہی تھی تو ادھر کریگن جنگل میں جارہا تھا اپنے گھوڑے کو لینے۔ اس نے گھوڑے کے ساتھ اتنے دن بتائے تھے کہ اب اس سے

پیار ہوگیا تھا۔ ویسے بھی گھوڑوں سے محبت تو کریگن کے خون میں شامل تھی۔ آخر کو کریگن کے پردادا ٹیکساس کے ایک مشہور کاؤبوائے تھے۔

☆☆☆

رات کے دو بج رہے تھے جب شیرف اور کریگن ایک فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ میں بیٹھے پیزا سے پیٹ میں دوڑتے چوہوں کو بھگانے میں مصروف تھے۔

''ویسے کریگن تم نے آج خوب کارروائی کی۔ تمہاری جگہ میں ہوتا تو ان چاروں کی مشکیں کس کر لے آتا اور پھر تفتیش کی روشنی میں باقی کارروائی کرتا۔ تم نے تو یک نہ شد دو شد والا معاملہ کرڈالا۔ جرم کرنے اور کروانے والے ایک ساتھ گرفتار۔''

''اصل مجرم ابھی پکڑے جانے ہیں۔'' کریگن نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ہیں...؟'' شیرف کے چہرے پر حیرت چھاگئی۔

''ابھی یہ پتا چلانا باقی ہے کہ یہ لوگ جن زندہ انسانوں کے دماغ نکالتے تھے، انہیں کہاں سے لے کر آتے تھے؟ ابھی اس کیس کی یہ کڑی غائب ہے۔ جب یہ کڑی مل جائے گی۔ تب ہی کیس مکمل طور پر حل ہوجائے گا۔''

''واہ...'' شیرف نے تالیاں بجاتے ہوئے کہا۔ ''تم تفتیش ماہر سراغرساں کی طرح کرتے ہو، مجرم کمانڈو کی طرح پکڑتے ہو اور کیس کو ذہین وکیل کی طرح پیش کرتے ہو۔''

''شکریہ اس تعریف کا مگر شیرف...'' کریگن نے سنجیدگی سے کہی جانے والی اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

''مگر کیا؟'' شیرف نے گھبرا کر پوچھا۔

''صرف تعریف... وہ بھی ایک پیزا کے ساتھ۔ اب ایک پیزا اور خالی تعریف سے تو پیٹ نہیں بھر سکتا۔''

یہ سن کر شیرف نے زوردار قہقہہ لگایا اور فوراً چلا کر کہا۔ ''ایک لارج چکن اسپائسی پیزا... فوراً۔''

☆☆☆

اگلے دو تین روز کیس کے حوالے سے کافی اہم تھے۔ ملزمان سفید پوش تھے۔ یہ کوئی عادی مجرم نہیں تھے کہ پولیس کے سامنے ڈٹے رہتے۔ ویران مکان کے تہ خانے سے گرفتار ہونے والے چاروں ملزمان دماغی امراض کے لیے قائم شہر کے ایک بڑے اسپتال میں بطور ٹیکنیشن اور میل نرس، آپریشن تھیٹر میں خدمات سرانجام دیتے تھے۔ مارشل ان میں سب سے زیادہ تجربہ کار تھا۔ گروہ کا سرغنہ بھی وہی تھا۔ اس کے علاوہ مارٹن، جمی اور نارمن تھے۔ ہوگن پیشہ ور

اسمگلر تھا۔ ہیرے، سونے اور منشیات سے لے کر انسانی اسمگلنگ اور جسمانی اعضا کی خرید و فروخت تک کا دھندا کرتا تھا۔ وہ پہلے بھی کئی بار پکڑا جاچکا تھا۔ کئی بار اس نے قید کاٹی مگر پھر بھی نہیں سدھر سکا۔ باقی دیگر چاروں ملزمان کا پولیس ریکارڈ بالکل صاف تھا۔

دوران تفتیش ملزمان نے بتایا کہ وہ گزشتہ چھ ماہ سے یہ دھندا کررہے تھے۔ انہوں نے یہ کام ہوگن سے تعارف کے بعد شروع کیا تھا۔ وہی اس دھندے کی بنیاد بنا۔

مارشل کا کہنا تھا کہ ''چند ماہ پہلے وہ چاروں ایک دن بار میں موج مستی کررہے تھے۔ یہ ویک اینڈ تھا۔ اس دن ہوگن بھی وہیں تھا۔ یہیں ان چاروں کی ہوگن سے پہلی ملاقات ہوئی۔ باتوں باتوں میں ہوگن نے ان لوگوں سے پیشہ پوچھا اور جب انہوں نے بتایا کہ وہ آپریشن تھیٹر میں ٹیکنیشن ہیں تو اس نے خوشی کا اظہار کیا۔ آہستہ آہستہ وہ کرید کرید کر ان سے تمام ذاتی معلومات حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے چاروں سے ان کے فون نمبر اور پتے لے لیے۔ پھر دو ہفتوں کے بعد اس کا فون آیا کہ ہم آج شام وہیں ملتے ہیں جہاں پہلی بار ملے تھے۔ یوں ایک بار پھر بار میں ان کی ملاقات ہوئی۔''

مارشل کا دعویٰ تھا کہ ''ہوگن نے اس ملاقات میں ہم چاروں کو پیشکش کی کہ اگر وہ انہیں ایک چھوٹا سا آپریشن تھیٹر بنادے تو کیا وہ اس کے لیے زندہ انسان کا دماغ جسم سے علیحدہ کر کے اسے چند گھنٹوں کے لیے محفوظ رکھنے جیسی خدمات سرانجام دے سکیں گے۔ مارشل کا کہنا تھا کہ یہ کام ہم چاروں کے لیے ناممکن تھا مگر اس نے ہر آپریشن کے عوض ایک لاکھ ڈالر کی پیشکش کی اور وہ بھی ہاتھ کے ہاتھ۔ ادھر دماغ والا تھرماس اس کے ہاتھ میں پہنچا، ادھر پیسہ ہماری جیب میں۔ ایک لاکھ ڈالر کی چکاچوند نے ہم سب کی آنکھیں چندھیادی تھیں۔ یوں گزشتہ چھ ماہ سے اب تک وہ دس لوگوں کا دماغ نکال کر ہوگن کے حوالے کرچکے تھے اور گیارھواں دماغ پیش کرنے ہی والے تھے کہ پکڑے گئے۔''

دوران تفتیش جب کریگن نے سوال کیا کہ دماغ نکالنے کے بعد لاش کا کیا کرتے تھے تو جمی نے بتایا۔ ''یہ سب کام ہوگن کے ذمے تھے۔ ہم صرف دماغ نکالتے، لاش گاڑی میں ڈالتے اور باقی وہ یہ گاڑی اس کے حوالے کردیا کرتے تھے۔''

''مگر تمہیں تمہارا شکار کیسے ملتا تھا؟'' کریگن کا خیال تھا کہ یہ بدقسمت لوگ وہ تھے جو لاوارث ہوں گے۔ انہیں یہ

www.pkdigest.com

اغوا کر کے لاتے ہوں گے۔ اسی لیے غائب ہونے پر نہ تلاش نہ پولیس رپورٹ۔ مگر مارشل کا جواب کریگن کو چونکا گیا۔

''یہ افراد ہمیں ایک ادھیڑ عمر عورت مہیا کرتی تھی۔ ہم اسے تھریسا کہتے تھے۔'' مارشل نے سیدھے سادے لفظوں میں جواب دیا۔

''کیا اس عورت سے تم نے رابطہ کیا تھا یہ کام کرنے کے لیے؟'' کریگن نے پوچھا۔

''نہیں... ہمیں ہوگن نے بتایا تھا کہ جب مال چاہیے ہوگا۔ تب ایک تھریسا نامی عورت تم سے رابطہ کرے گی۔ وہ جہاں بلائے گی، تم اسٹیشن ویگن لے کر چلے جانا۔ بندہ مل جائے گا۔'' مارشل نے جواب دیا۔

''اس کا فون نمبر؟''

''ہمارے فون پر اس کا نمبر نہیں آتا تھا۔ وہ ہمیں خود فون کر کے اکثر ہائی وے سے نیچے، دریا والے جنگل کی طرف بلاتی تھی۔''

''اس کا حلیہ کیسا ہے؟''

''کوئی فائدہ نہیں اس سوال کا۔'' مارٹن نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔ ''وہ خود کہتی تھی کہ اگر تم مجھے کہیں اور دیکھ لو تو کبھی بھی پہچان نہیں سکتے کیونکہ میں یہاں روپ بدل کر آتی ہوں۔ میرا روپ اور نام دونوں نقلی ہیں۔''

''پھر بھی دیکھنے میں کیسی تھی وہ؟'' کریگن نے کریدا تو مارشل بتانے لگا۔

''وہ ادھیڑ عمر کی تھی اور سر پر اسکارف ہوتا، جس میں سے اس کے سنہری بالوں کی لٹ جھلکتی تھی۔ پھولے پھولے سے گال، تنگ پیشانی، درمیانہ قد اور کوٹ پہنے ہوئے۔ آنکھوں پر سائھ کی دہائی کے فیشن والا بڑے بڑے گول شیشوں کا دھوپ کا چشمہ۔''

ان چاروں کے بیانات تفصیلی طور پر لیے جانے کے بعد کریگن اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ سب سچ بول رہے ہیں۔ دولت نے انہیں جرم میں ملوث کر دیا تھا مگر یہ جرائم پیشہ نہیں تھے۔ مگر پھر بھی ان چاروں سے جرم سرزد ہو چکا تھا۔ اس لیے ان پر قتل، لاش کی بے حرمتی، اغوا کے جرم میں اعانت اور جسمانی اعضا کی غیر قانونی فروخت میں مدد دینے کا مقدمہ قائم کیا گیا۔

ہوگن پیشہ ور مجرم تھا اور رنگے ہاتھوں ثبوتوں کے ساتھ پکڑا گیا تھا، لہٰذا اسے یقین تھا کہ وہ اس بار نہیں بچ سکے گا۔ جب کریگن نے تفتیش کے لیے اسے کمرے میں طلب کیا تو اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ واقعی اس بار اس کے بچنے کے آثار نہیں تھے۔ اس کا جرم نہایت مکروہ اور سنگین تھا۔

''مجھے تم سے صرف دو باتیں معلوم کرنی ہیں۔'' کریگن نے ابھی یہیں تک کہا تھا کہ ہوگن بول اٹھا۔

''آپ جو کچھ پوچھیں گے، وہ سب کچھ سچ سچ بتاؤں گا۔ آپ میرا اعتبار کریں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے گلے پر شہادت کی انگلی اور انگوٹھا رکھتے ہوئے قسم کھائی۔

''ٹھیک ہے تو پھر سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ تم اب تک اس طرح کتنے آدمیوں کا دماغ نکال چکے ہو؟''

''یہ گیارھویں بدقسمت تھی۔ اس بڑھیا کے علاوہ چار عورتوں اور چھ مردوں کا آپریشن کیا ہے۔'' ہوگن نے کانپتے ہونٹوں سے کہا۔

''کتنے عرصے سے یہ دھندا چل رہا ہے؟''

''پچھلے چھ ماہ سے۔''

''اوسطاً ہر ماہ دو دماغ۔'' کریگن نے ہنکارا بھرتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں۔''

''تم یہ دماغ کس کو دیتے تھے یا پھر تمہیں اس کام کے لیے کس نے رکھا تھا؟'' کریگن نے مطمئن انداز میں کہا جیسے کہ وہ سب کچھ پہلے سے جانتا ہو۔

کریگن کے سوال کے جواب میں ہوگن نے جو نام لیا وہ سن کر کریگن کے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ تن کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ چند لمحوں کے بعد وہ ہوگن کے چہرے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ''اس شخص نے تمہیں اس کام کی ذمے داری دی تھی؟'' اس کے لہجے میں تذبذب نمایاں تھا۔

''بالکل سچ... فی دماغ تین لاکھ ڈالر کا معاوضہ طے ہوا تھا۔ ہر بار اس نے فوراً ادائیگی کی تھی۔''

''اس دماغ کا کیا کرتے ہیں وہ لوگ؟''

''یہ تو وہی جانتا ہوگا۔ البتہ ایک بار میں نے پوچھا تھا تو کہنے لگے کہ یہ انسانیت کی خدمت کے لیے ہے۔ ہم یہ کام انسانیت کے لیے کر رہے ہو۔ خیر مجھے پیسے مل جاتے تھے۔ سو میں نے پھر کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ وہ اس کا کیا کرتے ہیں؟''

''چلو وہ تو انسانیت کی خدمت کر رہا تھا مگر انسانیت کی اس خدمت کے لیے تم انسانوں کو کہاں سے لاتے تھے؟''

''تھریسا کے ذریعے۔ یہ عورت مجھے بنکاک کے ایک بار میں کئی سال پہلے ملی تھی۔ اس نے کئی بار پہلے بھی میرے لیے کام کیا تھا۔''

''اس کا کچھ اتا پتا؟''

''کچھ معلوم نہیں۔ ایک تو وہ خود کو میک اپ آرٹسٹ بتاتی ہے۔ کہتی ہے کہ وہ ہالی ووڈ میں بھی کام کر چکی ہے۔ دوسرا یہ کہ وہ بہروپ بدلنے کی ماہر ہے۔ ہمیشہ ایک نئے حلیے میں ملتی ہے۔''

''لیکن تم اس سے رابطہ کیسے کرتے تھے؟'' کریگن نے سوال کیا۔

''ای میل کے ذریعے۔ اس نے ایک ای میل ایڈریس دیا ہوا تھا۔ جب ضرورت ہوتی تھی۔ میں اسے ای میل کرتا اور وہ مجھ سے فون پر رابطہ کر لیتی تھی۔ اس کام میں بھی ایسے ہی رابطہ کیا تھا۔''

''کیا وہ نیویارک میں ہی رہتی ہے؟''

''کہتی تو یہی ہے۔''

''اچھا اس کا ای میل ایڈریس، جس نام سے تم اسے بلاتے تھے وہ اور اپنا ای میل ایڈریس پاس ورڈ کے ساتھ بتاؤ۔'' ہوگن نے اسے سب تفصیلات بتا دیں۔ کریگن ایک نوٹ بک پر یہ معلومات لکھتا رہا۔

''تم لاش کا کیا کرتے تھے؟''

''ویرانے میں گاڑ دیتے تھے لاوارثوں کو۔''

''وہ جھیل یاد ہے جہاں تم نے ان بدقسمتوں کو دفنایا تھا؟''

''جی ہاں... میں آپ کو وہاں لے جا سکتا ہوں۔'' ہوگن نے پیشکش کی۔

گرفتاری کے چوبیس گھنٹے گزر جانے کے بعد ملزمان کو عدالت میں پیش کر دیا گیا۔

جس صبح ملزمان کو عدالت میں پیش کیا گیا تھا، اسی دوپہر کو دواؤں کا خریدار بھی پکڑا گیا۔ یہ سمپسن تھا، امریکا کی ایک بہت بڑی دوا ساز کمپنی کا مالک۔ اس کی کمپنی میں کئی سائنسداں دواؤں پر تحقیق کے لیے ملازم رکھے گئے تھے۔ سمپسن نے اعتراف کیا کہ اس کے دواساز ایسی دوا کی تیاری میں مصروف ہیں جو بڑھاپے کے سبب یادداشت کی کمزوری کو موثر طور پر دور کر سکے۔ اس مقصد کے لیے اس کے سائنسداں اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ انہیں ساٹھ سال اور اس سے زائد العمر کے ایسے افراد کے دماغوں کی ضرورت ہے، جن کے جسم سے دماغ زندہ حالت میں نکالا گیا ہو۔

سمپسن کا کہنا تھا کہ اس کام کے لیے تلاش بسیار کے بعد ہوگن سے ملاقات ہوئی۔ ''اس نے صرف تین لاکھ ڈالر میں یہ کام کرنے کی حامی بھری۔ ورنہ تو اس کام کے لیے میں دس لاکھ ڈالر دینے کو بھی تیار تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس تحقیق کے فارمولے کے بعد جو دوا تیار ہوتی، اس کا فارمولا خفیہ رکھتا۔ یادداشت کا مرض پوری دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق میں صرف ایک سال میں پانچ ارب ڈالر کما سکتا تھا۔''

یہ سب کچھ جان کر تو کریگن کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ دولت انسان کو کیسے کیسے ناچ نچاتی ہے۔

اب تک یہ کیس بڑی حد تک حل ہو چکا تھا۔ کریگن بوڑھے انسان فراہم کرنے والی تھریسا کا پتا نہیں چل رہا تھا۔ کریگن نے ہوگن کے ای میل اکاؤنٹ سے اسے کئی ای میلز کیں مگر جواب ندارد۔ وہ عورت شاید ضرورت سے بہت زیادہ چالاک تھی۔ اس کو علم ہو گیا تھا کہ کھیل ختم ہو چکا ہے۔

شدید تلاش کے باوجود جب تھریسا کا پتا نہ چل سکا تو اس نے کیس کا چالان عدالت میں پیش کر دیا۔

عدالت نے کریگن کی درخواست پر تھریسا کی تلاش کے لیے مہلت دے دی تھی۔ فاضل جج کا کہنا تھا کہ تھریسا کی عدم موجودگی کے باعث بھی یہ مقدمہ چل سکتا ہے اور مجرم اپنے کیفر کردار تک پہنچ سکتے ہیں۔ تاہم کیس میں تھریسا مفرور ملزمہ ہے اور اس پر گرفتاری کے بعد انہی دفعات کے تحت مقدمہ چلایا جائے گا۔

مقدمہ کئی ماہ تک چلتا رہا۔ پورے ملک میں اس کا شہرہ ہوا اور آخر تمام ملزمان کو تین تین بار عمر قید کی سزائیں سنا کر زندگی بھر کے لیے جیل کی اونچی اونچی دیواروں کے پیچھے نیم تاریک کھولیوں میں ڈال دیا گیا۔

اس دوران میں ذرائع ابلاغ میں کریگن کو بھی خوب شہرت ملی لیکن اس نے ہمیشہ اپنی تصاویر اخبارات میں چھپنے یا ٹی وی انٹرویو دینے سے اجتناب کیا۔ کریگن یہ نہیں چاہتا تھا کہ راہ چلتے لوگ اسے پہچاننے لگیں۔ وہ گمنام رہنا چاہتا تھا سو وہ ایسا کرتا رہا۔

اگرچہ کریگن اس کیس کو داخل دفتر کر کے چین کی بنسی بجا سکتا تھا لیکن وہ مجرموں کو انجام تک پہنچانے کے باوجود اب تک بے چین تھا۔ اس کا خیال تھا کہ تھریسا نامی جس عورت کا تذکرہ ہوگن اور دیگر ملزمان نے کیا ہے، اس کے نہ پکڑے جانے تک اس کیس کو بند نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے بہت کوششیں کیں کہ کسی طرح مرنے والوں کے ورثا کا ہی علم ہو جائے تاکہ کچھ سراغ مل سکے مگر گیارہ بوڑھے اور بوڑھیاں ایسے بدقسمت تھے کہ کوئی ان کا وارث بننے کے لیے نہیں آیا۔ کریگن نے ہوگن کی نشاندہی پر مدفون لاشیں نکلوا کر ان کا ڈی این اے ٹیسٹ کروانے کے بعد، مذہبی رسومات کے بعد

www.pkdigest.com

باعزت طریقے سے سپردِ خاک کروا دیا تھا لیکن ان کے وارث کون تھے؟ یہ کہاں سے تھریسا کے پیچھے پڑے تھے؟ ان سوالوں کے جواب تشنہ تھے۔

انہی سوچوں میں ڈوبا ہوا کریگن ایک شام جب گھر پہنچا تو حسبِ سابق ماں لاؤنج میں بیٹھی سوئٹر بُن رہی تھیں۔ سوئٹر بُننا ان کا دلچسپ مشغلہ تھا۔

میری بھی گھر آچکی تھی۔ میری، کریگن کی چھوٹی بہن تھی۔ وہ آرٹسٹ تھی اور پبلشنگ ہاؤس میں بچوں کی کتابوں کے لیے کارٹون بنایا کرتی تھی۔

”ہائے مما!“ گھر میں گھستے ہی کریگن نے مسکرا کر کہا تو ماں نے بیٹھے بیٹھے ہاتھ ہلائے۔

”آج بہت خوش لگ رہی ہیں آپ۔“ کریگن نے ماں سے کہا۔

”کیوں نہیں، آج میری بہت پرانی سہیلی آئی تھی مجھ سے ملنے۔“ ماں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”کہاں رہتی ہیں وہ؟“

”ایک پرائیویٹ اولڈ ایج ہوم میں...... اس کا ڈرائیور ہی اسے چھوڑنے اور لینے کے لیے آیا تھا۔“ ماں کی بات سنتے ہی اسے ایک آئیڈیا سوجھا۔ اس کے بعد ماں بولتی رہیں اور وہ ہوں ہاں تو کرتا رہا لیکن حقیقت میں وہ اپنی ہی سوچ میں ڈوبا رہا۔

دوسرے دن صبح پولیس اسٹیشن پہنچتے ہی اس نے تمام سرکاری اور نجی اولڈ ایج ہوم کی فہرست منگوائی۔ چند روز میں ہی اس نے پتا چلا لیا کہ گزشتہ چھ ماہ کے دوران نیویارک کے تمام سرکاری اور نجی تحویل میں چلنے والے اولڈ ایج ہوم سے کوئی بھی شخص پُراسرار طور پر غائب نہیں ہوا ہے۔ جو لوگ انتقال کر گئے تھے، انہیں یا تو ورثا کے حوالے کیا گیا یا پھر ادارے نے ہی ان کی تدفین کا اہتمام کیا۔ یہ سارے بیماری میں مرے تھے...... وہ تمام افراد اسپتال میں داخل تھے اور وہیں انہوں نے زندگی کی آخری سانسیں لی تھیں۔

کریگن کا خیال تھا کہ تھریسا ہی جس بہروپ عورت کا تذکرہ ہوگن اور اس کے ساتھیوں نے کیا تھا، وہ یقیناً کوئی اولڈ ایج ہوم چلاتی ہے۔ وہیں سے وہ زندہ لوگ مارشل کے حوالے کرتی تھی۔ اس کی نسبت سڑک سے کسی بے گھر کو اٹھا کر مارشل کے ہاتھوں میں تھمانا زیادہ مشکل تھا۔ یہ خیال اسے اس وقت آیا جب اس کی مما نے اپنی ایک پرانی سہیلی سے ملاقات کی کہانی سنائی۔ بس تب سے وہ سمجھ رہا تھا کہ بہت جلد تھریسا کا اصل روپ دنیا کے سامنے ہوگا اور وہ خود سلاخوں کے پیچھے ہوگی۔

☆☆☆

کئی دن ہو چکے تھے لیکن مسز میلری نے اس کے گھر آکر ماں سے ملاقات کے لیے فون نہیں کیا تھا۔ اس دن بھی وہ بیٹھا ہوا ہرٹن کیس کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اچانک موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ یہ مسز میلری کی کال تھی۔

”ہائے میڈم، کیسی ہیں آپ؟“ فون اٹینڈ کرتے ہی اس نے نہایت خوش اخلاقی سے پوچھا۔

رسمی کلمات کے بعد وہ کہنے لگا۔ ”مجھے آپ کے فون کا انتظار تھا۔ مجھے آپ کے یہاں کا ماحول بہت پسند آیا۔ اس لیے میں نے کسی دوسرے ادارے سے رابطہ ہی نہیں کیا۔ ویسے آپ کی طرف سے تو میں مایوس ہی ہو گیا تھا۔“

”میں نے یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ کل شام میں آپ کے گھر آرہی ہوں۔“ مسز میلری نے جواب دیا۔

”بہت بہت شکریہ۔“ کریگن اپنے لہجے سے ایسا ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا جیسے اس کے سر سے کوئی بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔

”ٹھیک ہے تو پھر کل شام پانچ بجے ملتے ہیں۔“

”جی بالکل، شکریہ۔“

اس شام وہ دیر تک اپنی ماں کے ساتھ بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ اچانک کہنے لگا۔ ”مما! اگر کچھ عرصے کے لیے آپ کو پرائیویٹ اولڈ ایج ہوم میں رہنا پڑے تو؟“

یہ سنتے ہی ماں بھڑک گئیں اور لعن طعن کرنے لگیں۔ یہ خاندان قدامت پسند تھا۔ اس لیے ماں کو یہ سن کر دھچکا لگا۔

”میں نے تو کبھی تمہاری تربیت ایسے نہیں کی تھی کہ تم مجھے اولڈ ایج ہوم بھیجنے کا سوچ بھی سکو۔“ ماں باقاعدہ رو رہی تھیں۔

انہیں دیکھ کر کریگن انہیں منانے لگا۔ جب وہ ذرا خاموش ہوئیں تو اس نے بات شروع کی۔

”اصل بات یہ ہے کہ مجھے آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔ بات یہ ہے کہ......“ اس نے سارا مدعا تفصیل سے بیان کر دیا۔ یہ سن کر وہ ہنسنے لگیں۔

”یہ بات تھی تو پہلے ہی کہہ دیا ہوتا۔ میں خوامخواہ رو رہی۔“ انہوں نے ہلکی سی چپت اس کے گال پر لگاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

دوسرے دن شام کو جب مسز میلری گھر آئی تو ماں بیٹے نے نہایت گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا۔

چائے پی جا رہی تھی جب مسز میلری نے ماں کا انٹرویو شروع کیا۔ ان کے سوالات کا محور صحت کے معاملات تھے اور

یہ بات کریگن نے خاص طور پر محسوس کی تھی۔ کچھ دیر تک سوال و جواب کا سلسلہ جاری رہا۔

”مسٹر کریگن۔ ہم انہیں اپنے ہاں ٹھہرانے پر تیار ہیں۔“ چائے کا کپ میز پر رکھتے ہی مسز میلری نے کہا۔

”بہت شکریہ آپ کا۔ میں انہیں کب لے کر آؤں؟“

”کل ہمارا ڈرائیور انہیں اور سامان... لے جانے کے لیے یہاں آئے گا۔ آپ بھی ساتھ آجائیں۔ البتہ ہماری دو شرائط ہیں۔“ مسز میلری بولی۔

”وہ کیا؟“ کریگن نے پوچھا۔ اس کے چہرے پر اچانک پریشانی کے آثار نظر نمودار ہو گئے۔

”پہلی شرط یہ کہ محترمہ موبائل فون اپنے ساتھ نہیں رکھ سکیں گی۔ دوسری یہ کہ آپ صرف سنیچر کو ان سے ملنے کے لیے آیا کریں گے۔“

”مجھے منظور ہے۔“ ماں خوش دلی سے بولیں۔ ”مجھے موبائل فون سے خود بہت چڑ ہے۔“

”ہاں ہاں... مجھے بھی صرف سنیچر ہی فارغ ملتا ہے۔“ کریگن نے بھی خوشی خوشی کہا۔

”بس ایک بات ہے۔ وہ میں نے ابھی تک آپ کو نہیں بتائی تھی۔“ کریگن نے آہستگی سے کہا تو مسز میلری چونک گئی۔

”کیا بات ہے؟“

”مما کو روڈ فیسنگ سائڈ پسند ہے۔ اگر کوئی کمرا ایسا ہو جس سے سڑک نظر آتی ہو تو زیادہ بہتر ہوگا۔“

”یہ بھی بھلا کوئی بات ہوئی۔ ایسا ہی کمرا خالی تھا، جسے ہم نے آپ کی مما کے لیے بک کر دیا۔“ وہ ہنس کر بولی۔

”اور کوئی بات...؟“

”نہیں۔ اب کوئی بات نہیں۔ میں تو ڈر رہا تھا کہ یہ سن کر کہیں آپ انکار نہ کر دیں۔“ کریگن نے نہایت بھولپن سے کہا۔

”تو پھر ٹھیک ہے۔ کل آپ ان کے ساتھ آجائیں تو پے منٹ وغیرہ کے معاملات اور دیگر دفتری خانہ پُری کر لیں گے۔“ مسز میلری نے کہا تو کریگن نے اقرار میں سر ہلایا۔

”ٹھیک ہے تو پھر میں چلتی ہوں۔“

وہ مسز میلری کو ان کی گاڑی تک چھوڑنے آیا اور جب تک ان کی گاڑی نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی وہ الوداعی انداز میں ہاتھ ہلاتا رہا۔

دوسرے دن صبح کے دس بج رہے تھے جب ڈرائیور انہیں لے جانے کے لیے پہنچا۔ سب تیار تھے۔ چند منٹوں میں ہی سارا سامان گاڑی میں رکھ دیا گیا۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد ہی وہ پہنچ گئے۔

مسز میلری ان کی منتظر تھیں۔ ماں کو ان کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ یہ کمرا اس عمارت کے بائیس کمروں میں سے ایک تھا۔ کمرے کی ایک کھڑکی پورچ میں کھلتی تھی۔ جہاں سے نہ صرف باہر کی سڑک اور جھیل صاف دکھائی دیتی تھی بلکہ کوئی گھر میں آئے یا باہر جائے، ممکن ہی نہیں تھا کہ اس کھڑکی میں بیٹھے شخص کو وہ نظر نہ آسکے۔ البتہ دن کا ہونا یا پورچ میں بلب کا روشن ہونا شرط تھا۔

”ویسے آپ کو... سرکاری امداد تو ملتی ہوگی اس کارِ خیر کے لیے؟“ کاغذی خانہ پُری کے بعد جب کریگن رقم ادا کر رہا تھا تو اس نے پوچھا۔

”جی نہیں۔“ مسز میلری نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”یہ گھر چند ایسے مخیّر حضرات کی مالی امداد پر قائم ہے جو گمنام رہنا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ یہ ادارہ اپنی مدد آپ کے تحت انسانیت کی خدمت کرتا رہے۔ اسی لیے ہم نے سرکاری امداد کے لیے خود کو رجسٹرڈ نہیں کروایا ہے۔ ویسے جو فیس ہم وصول کرتے ہیں وہ اخراجات کے مقابلے میں چالیس فیصد کم ہے۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ کارِ خیر کے لیے تو کم از کم ہمیں حکومت کے بجائے اپنے وسائل کی طرف دیکھنا چاہیے۔“ کریگن نے خوشدلی سے کہا تو مسز میلری معنی خیز انداز میں مسکرا دی۔

☆☆☆

ماں کو اولڈ ایج ہوم میں منتقل کیے ہوئے تین ماہ گزر چکے تھے۔ کریگن ہر سنیچر کی صبح باقاعدگی کے ساتھ ان سے ملنے کے لیے جاتا تھا۔ گھنٹا، ڈیڑھ گھنٹا وہ ان کے ساتھ کمرے میں بیٹھا اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہتا۔ پھر وہ انہیں وہیل چیئر پر بٹھا کر جھیل کی سیر کروانے کے لے جاتا۔ وہ اپنے ساتھ لنچ لے کر آتا تھا۔ دونوں جھیل کے کنارے لنچ کرتے اور پھر واپس لوٹ آتے۔ ماں کو ان کے کمرے میں پہنچا کر وہ اجازت لیتا۔

اس عرصے میں کریگن کو اپنی ماں سے کوئی کارآمد معلومات حاصل نہیں ہوئیں۔ ان کا کہنا تھا کہ میلری کو اس نے ہمیشہ گھر پر ہی دیکھا ہے۔ ایک بار بھی وہ گھر سے باہر نہیں گئی۔

اس دن دفتر میں سر تھامے وہ سوچ رہا تھا کہ کیا کبھی تھریسا کو پکڑ بھی سکے گا یا نہیں۔ اچانک اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ گھنٹی سے اس کے سوچنے کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ اس نے موبائل اٹھایا تو ماں کا پیغام تھا۔

”میلری ابھی ابھی آسمانی رنگ کی شیورلیٹ میں گھر سے نکلی ہے۔ اس نے اپنی کار کی پچھلی سیٹ پر جارج کو بٹھایا

www.pkdigest.com

ہوا ہے۔ وہ خود گاڑی چلا رہی ہے۔'' اس کے بعد کار کا نمبر لکھا ہوا تھا۔

پیغام پڑھتے ہی اس نے جلدی سے وائرلیس اٹھایا اور سینٹرل پولیس آفس کے کنٹرول روم کو پیغام دیا'' کام شروع۔''

وائرلیس پیغام ملنے کے ایک منٹ کے اندر اندر میلری کی کار ٹریس کرلی گئی۔ جسے کمپیوٹر اسکرین پر مانیٹر کیا جارہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں کریگن بھی کنٹرول روم میں پہنچ گیا۔ کریگن نے کئی مہینے پہلے سے یہ انتظامات کررکھے تھے اور اب وہ لمحہ آگیا تھا جس کے انتظار میں سب دن گن گن کر کاٹ رہے تھے۔

شہر کی مختلف سڑکوں سے ہوتی ہوئی میلری کی کار ہائی وے پر پہنچی۔ آدھا گھنٹے تک ہائی وے پر سفر کے بعد وہ دائیں ہاتھ پر ایک چھوٹی سڑک پر مڑگئی۔ کچھ دیر بعد اس کی گاڑی ایک فارم ہاؤس میں داخل ہورہی تھی۔ جیسے ہی وہ کار فارم ہاؤس کی عمارت کے پورچ پر پہنچی تو ایک سیاہ فام تنومند مگر بوڑھا شخص باہر نکلا۔ اس نے دونوں ہاتھ کمر پر باندھ رکھے تھے۔

اسی اثنا میں مسز میلری گاڑی سے باہر آکر جارج کی طرف کا دروازہ کھول چکی تھی۔ جیسے ہی جارج باہر نکلنے لگا، سیاہ فام شخص آگے بڑھا اور دائیں ہاتھ سے اسے سہارا دے کر باہر نکالنے لگا۔ اس کا بایاں ہاتھ بدستور کمر کے پیچھے تھا۔ جارج جیسے ہی باہر نکل کر اپنے قدموں پر کھڑا ہوا سیاہ فام شخص نے کمر کے پیچھے بندھا ہاتھ سیدھا کیا اور جارج کی پیٹھ کے پیچھے سے ہاتھ کو گھماتا ہوا اس کے بائیں بازو تک لے گیا اور اس میں ہتھکڑی گھونپ دیا۔ ہتھکڑی لگاتے ہی اس نے بوڑھے جارج کو دونوں بازوؤں میں بھر کر اپنے سینے سے چمٹالیا۔ چند لمحوں کے بعد جارج کا سر جھولنے لگا۔ تو ان دونوں نے مل کر اسے پہلے کی طرح پچھلی سیٹ پر بٹھادیا۔

مسز میلری نے اپنا ہینڈ بیگ کھولا اور ایک لفافہ نکال کر سیاہ فام کے ہاتھ میں پکڑادیا۔ بیگ گاڑی میں ڈال کر وہ سیاہ فام کے ساتھ مکان کے اندر چلی گئی۔ تقریباً بیس منٹ بعد جب وہ لوٹی تو اس کا حلیہ ہی بدل چکا تھا۔

سر پر اسکارف۔ آنکھوں پر بڑے بڑے گول سیاہ شیشوں کا چشمہ...

''اوہ میرے خدا۔'' کریگن اتنی زور سے چیخا کہ سب اس کی طرف دیکھنے لگے مگر اس لمحے وہ سب سے بے خبر تھا۔ ''میرا خیال بالکل درست تھا۔ یہ تو وہی حلیہ ہے جیسا مارشل نے بیان کیا تھا۔ یہی ہے تھریسا۔'' کریگن بہت پُرجوش تھا۔

''ہمیں ہر حال میں جارج کو زندہ بچانا ہے۔''

یہ کہہ کر وہ مختلف علاقوں میں گشت پر موجود پولیس گاڑیوں کو الرٹ رہنے کی ہدایت دینے لگا۔

فارم ہاؤس سے نکلنے کے بعد میلری کی کار ایک بار پھر ہائی وے کی طرف جارہی تھی۔ ہائی وے پر پہنچ کر اس نے مخالف لین پر گاڑی ڈال دی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ واپس اپنے گھر جارہی ہے لیکن تھوڑا آگے جانے کے بعد وہ دریا کی طرف جانے والی سمت میں مڑگئی۔

یہ دیکھتے ہی کریگن کا ماتھا ٹھنکا۔ اسے پھر مارشل کا بیان یاد آگیا کہ تھریسا دریا والے بنگلے کے کنارے ڈلیوری دیتی تھی۔

کریگن ایک بار پھر وائرلیس پر ہدایات جاری کرنے لگا۔

تقریباً پندرہ منٹ کے بعد ایک بار پھر میلری کی کار ہائی وے پر تھی۔ اس بار بھی اس کا رخ شہر کی طرف تھا۔

جیسے ہی میلری کی کار جنگل سے نکل کر ہائی وے پر ابھی دو تین کلومیٹر تک ہی آگے بڑھی ہوگی کہ پولیس کی کئی گاڑیاں اور ان کے پیچھے پیچھے ایک ایمبولینس دریا والے راستے پر مڑنے لگیں۔ کچھ ہی دیر میں پولیس نے سامنے سے آنے والی ایک پرانی ویگن کو روک کر اس میں سوار تینوں افراد کو قابو میں کرلیا۔ تینوں کو ہتھکڑیاں لگا کر گاڑیوں میں بٹھادیا گیا۔ ویگن کے پچھلے حصے سے جارج کو نکال لیا گیا۔ اس کی سانس چل رہی تھی لیکن وہ بے ہوش تھا۔ اسے ایمبولینس کے ذریعے اسپتال بھجوادیا گیا۔

رات کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا جب مسز میلری کی کار پورچ میں داخل ہوئی۔ کریگن اور شیرف راجر جان بوجھ کر ایسی جگہ کھڑے تھے کہ جہاں ان پر روشنی نہ پڑسکے۔ جیسے ہی میلری کار سے باہر آئی۔ کریگن فوراً ان کے سامنے آگیا۔ ''شام بخیر میڈم۔'' وہ مسکرا کر بولا تو مسز میلری کہنے لگی۔

''مرے تم... اس وقت۔ تمہیں یاد نہیں کہ آج جمعرات ہے۔''

''جی مجھے بہت اچھی طرح یاد ہے لیکن میں معاملے نہیں آپ سے ملنے آیا ہوں۔'' کریگن نے کہا تو شیرف بھی سامنے آگیا۔

''ہم آپ کو گرفتار کرنے اور آپ کے گھر کی تلاشی لینے کے لیے آئے ہیں۔'' شیرف کو دیکھتے ہی اس کا چہرہ پیلا پڑگیا۔ شیرف وردی میں تھا جبکہ کریگن نے جینز اور پوری آستین کی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس لیے میلری کریگن کو تو نہ پہچان سکی لیکن شیرف کی وردی نے اس کے ہوش اڑادیے۔

''مگر کیوں۔ میں نے کیا جرم کیا ہے؟'' میلری اپنے حواس... قابو میں رکھنے کی کوشش کررہی تھی لیکن اس کی زبان اور چہرہ اس کے الفاظ کا بالکل ساتھ نہیں دے رہے تھے۔

''ہم سب کچھ آپ کو بتادیں گے مگر پہلے یہ پہن لیجیے اور گھر کی تلاشی دے دیں۔ اس کے بعد آپ سب کچھ خود جان جائیں گی۔'' یہ کہتے ہوئے شیرف نے ان کی کلائیاں موڑ کر پیچھے کیں اور ان میں ہتھکڑیاں لگادیں۔ وہ اس کو بازو سے پکڑ کر باہر سڑک کی طرف لے جارہے تھے۔ کریگن نے ہدایت کی تھی کہ پولیس گاڑیاں سڑک کے باہر رہیں گی اور میلری کو اس طرح گرفتار کیا جائے گا کہ گھر کے اندر رہنے والے کسی فرد کو اس کارروائی کا علم نہ ہوسکے۔

''مگر گھر کی تلاشی... پھر مجھے آپ باہر کیوں لے جارہے ہیں؟'' میلری نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

''گھر کی تلاشی لینے کے لیے۔ ویسے ہماری پولیس آپ کے گھر تک پہنچ چکی ہے اور سیاہ فام کو بھی پکڑ چکی ہے۔'' یہ سنتے ہی وہ تیم بے ہوش ہوکر کریگن کے بازوؤں میں جھولنے لگی۔

فارم ہاؤس کی تلاشی میلری کی موجودگی میں لی گئی۔ یہاں ایک کمرے سے سوانگ رچانے کا تمام سامان مل گیا۔ طرح طرح کے رنگ دار بالوں والی وگیں ایک الماری میں نہایت قرینے سے رکھی ہوئی ملی تھیں۔ میک اپ کا سامان، کپڑے اور ایک تجوری بھی تھی۔ یہ الیکٹرونک تجوری تھی جس کا کوڈ میلری کو معلوم تھا۔ اس میں آٹھ لاکھ ڈالر کی نقدی، سونا اور ہیرے رکھے ہوئے تھے۔ پولیس نے کاغذی کارروائی مکمل کرکے سارا سامان اپنے قبضے میں لے لیا۔ جس سیاہ فام کو گرفتار کیا گیا تھا، وہ میلری کا محبوب اور اس کے جرائم کا شراکت دار تھا۔ اس کا نام سام تھا۔ وہ پہلے ہی سے پولیس کار میں بیٹھا اپنی محبوبہ کی آمد کا منتظر تھا۔

☆☆☆

میلری نے آخری واردات جن کے لیے کی تھی، وہ بھی گرفتار ہوچکے تھے۔

قصہ مختصر یہ کہ ان میں سے دو کنگن میڈیکل کالج اسپتال کے جونیئر ڈاکٹر تھے اور تیسرا وہاں کا ایک چوکیدار تھا۔ ان دونوں ڈاکٹروں کو ایک انسانی گردے کی تلاش تھی۔ یہ گردہ ایک ایسی متمول پارٹی خریدنا چاہتی تھی جو اس کام کے لیے بھاری معاوضہ ادا کرنے کو تیار تھی۔ چوکیدار کی ملاقات میلری سے انٹرنیٹ چیٹنگ پر ہوئی اور باتوں باتوں میں جسمانی اعضا کی بات چل نکلی۔ جب میلری نے اس موضوع میں دلچسپی ظاہر کی تو چوکیدار نے بتایا کہ اس کے اسپتال کے دو ڈاکٹر، جن سے اس کی اچھی سلام دعا ہے۔ آج کل ایک انسانی گردے کی تلاش میں ہیں۔ اس پر میلری نے بتایا کہ وہ یہ کام کرسکتی ہے لیکن بھاری معاوضہ لے گی۔ یوں بات آگے بڑھی اور تیس ہزار ڈالر پر معاملہ طے پاگیا۔ ڈاکٹروں اور چوکیدار نے فوراً اعترافِ جرم کرلیا۔ جس پارٹی نے گردہ مانگا تھا، دراصل وہ گردے ناکارہ ہوجانے کے بعد ڈائیلیسز پر زندہ اپنے باپ کے لیے گردہ دینے والے ڈونر کو تلاش کررہے تھے۔

خیر یہ معاملہ فوراً ہی حل ہوگیا لیکن میلری کے چہرے پر پڑے نقاب کو اٹھانے کے لیے جب کریگن نے اس سے تفتیش شروع کی۔ پہلے تو اس نے مان کر ہی نہ دیا۔ آخر کئی گھنٹوں کے بعد اس نے اقرارِ جرم کرلیا۔

میلری کے بیان کے مطابق اس کا اصل نام ازابیلا فرینڈز ہے۔ دورانِ تفتیش اس نے بتایا کہ وہ ستر کی دہائی کے شروع میں ایک بڑی اداکارہ بننے کی خواہش لے کر ہالی ووڈ پہنچی۔ لیکن چھوٹے موٹے کرداروں کے سوا، اسے پانچ برس تک کوئی ڈھنگ کا کردار نہیں مل سکا۔ تنگ آکر وہ میک اپ آرٹسٹ کی اسسٹنٹ بن گئی۔

ہالی ووڈ میں اس نے اپنی زندگی کے کئی سال عسرت میں بسر کیے۔ اسے امیر بننے کی آرزو تھی لیکن اسے نظر آرہا تھا کہ وہ یونہی ایک دن مرجائے گی اور سرکاری اہلکار اس کی لاش کو لاوارث قرار دے کر دفن کردیں گے۔

ایک دن شام کو جب وہ بار میں اپنا غم غلط کررہی تھی تو اس کی ملاقات سام سے ہوئی۔ یہ ملاقاتیں بڑھتی گئیں۔ حتیٰ کہ وہ ایک دن سام کے فلیٹ پر ہی رہنے کے لیے آگئی۔ سام ایک جرائم پیشہ شخص تھا۔ اس کی سنگت میں وہ بھی جرم کی دنیا میں اترنے لگی۔ وہ سام کے ساتھیوں کا بہروپ بدلتی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ کبھی کسی واردات میں نہیں پکڑے گئے۔ سام کی دلچسپی بینک لوٹنے میں تھی۔ ایک مرتبہ وہ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا لیکن کسی نہ کسی طرح پولیس کی تحویل سے خود کو چھڑا کر فرار ہوگیا۔ سام کو بہروپ سے نفرت تھی اور اسے پہچان لیا گیا۔ اس لیے انہوں نے لاس اینجلس کو چھوڑ دیا اور نیویارک چلے آئے۔ یہاں شہر سے بہت دور مضافات میں انہوں نے ایک گھر خریدا اور وہاں رہنے لگے۔

ایک دن نیویارک کے ایک کافی شاپ میں ایک رحمدل بوڑھے شخص سے اس کی ملاقات ہوئی جو ایک اولڈ ایج ہوم بنا کر اپنے جیسے بوڑھوں کی خدمت کرنا چاہتا تھا۔ میلری نے اس کو شیشے میں اتارا اور وہ گھر خرید لیا، جہاں اب بھی ان کا اولڈ ایج ہوم قائم ہے۔

وہ بوڑھا شخص تو تھوڑے ہی دنوں میں نمونیے کا شکار ہو کر چل بسا۔ اس کی موت کے بعد وہ اس جائداد کی وارث

www.pkdigest.com

بن گئی۔ اس نے اس ہوم کو چلانے کے لیے اپنی چھوٹی بہن جینی، اس کے شوہر اور بچوں کو بھی ریاست میری لینڈ سے نیویارک بلوالیا اور یوں سب عزت کی زندگی بسر کرنے لگے۔

"یہ ہوم گزشتہ بارہ سال سے چل رہا ہے۔ شروع میں تو سب کچھ ٹھیک تھا لیکن ایک بار میری ملاقات ایسے پرانے ملاقاتی سے ہوگئی جس کا میک اپ اس وقت کیا کرتی تھی، جب وہ واردات کے لیے جاتا تھا۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ اگر میں مددگروں تو ہم بہت سی دولت کما سکتے ہیں۔ اس کا کہنا تھا، وہ بوڑھے جو صحتمند ہیں مگر مرنے کے قریب ہیں۔ ہم ان کے جسمانی اعضا فروخت کرکے بھاری مال بنا سکتے ہیں۔ مجھے بھی دولت کی ہوس تھی۔ سو اس کی بات میرے دل کو لگی۔ کچھ عرصے تک تو میں نے اس کے ساتھ مل کر کام کیا لیکن ایک رات جب وہ شراب کے نشے میں دھت تیز رفتاری سے کار چلاتے ہوئے ہائی وے پر سے گزر رہا تھا کہ حادثے کا شکار ہوگیا۔ اس کی موت کے بعد میں تنہا کام کرتی رہی۔ اس طرح میں گزشتہ آٹھ برس سے اس مکروہ کاروبار میں ہوں اور اب تک درجنوں افراد کو فروخت کرچکی ہوں۔ البتہ میری بہن اور بہنوئی بے گناہ اور معصوم ہیں۔"

"جن لوگوں کو فروخت کیا جاتا تھا، ان کا انتخاب کیسے کرتی تھیں؟" کرسٹن نے تفصیلی بیان سننے کے بعد پوچھا تو وہ کہنے لگی۔

"جن لوگوں کی اولادیں یا رشتے دار سال بھر تک اپنے بزرگ سے رابطہ نہیں کرتے تھے، میں انہیں از خود لاوارث قرار دے دیتی تھی۔ ان کے رشتے داروں کے دیے گئے پتوں پر جا کر تصدیق کرتی تھی کہ آیا اب بھی وہ لوگ وہاں رہتے ہیں یا نہیں۔ ان کے لکھوائے گئے رابطہ نمبروں پر فون کرتی اور جب سب جگہ سے جواب منفی میں ملتا تو پھر میرے مطابق ایسا شخص فروخت کے لیے سب سے مناسب ہوتا تھا۔"

"کبھی ایسا ہوا کہ تم نے کسی شخص کو مرنے کے لیے فروخت کردیا ہو اور اس کے بعد اس کے وارث آگئے ہوں؟" کرسٹن نے پوچھا۔

"ہاں ہوا ہے مگر صرف ایک بار۔ ہوا یہ تھا کہ ایک شخص کو میں نے فروخت کردیا تو اس کے تین ماہ بعد ایک لڑکی اس سے ملنے کے لیے چلی آئی۔ جو خود کو اس شخص کی سب سے چھوٹی بیٹی بتاتی تھی۔ میں نے یہ کہہ کر اسے مطمئن کردیا کہ اس کے والد کافی عرصہ پہلے انتقال کرگئے تھے۔ جب ان کا اتا پتا نہ ملا تو ہم نے انہیں دفنا دیا۔ یہ سن کر وہ کچھ دیر تک روتی رہی۔ جب میں نے کہا میں تمہیں ان کی قبر تک لے چلتی ہوں تو اس نے یہ کہہ کر انکار کیا کہ دیر ہوگئی ہے۔ میرا ہوائے فرینڈ انتظار کررہا ہوگا۔ ویسے بھی قبر پر جانے کا کیا فائدہ۔"

بڑی دلدوز سچائی تھی، ازابیلا فرینڈز عرف میلری کی باتوں میں۔

میلری کیس کا چالان جب عدالت میں پیش کیا گیا تو جج سے پولیس نے استدعا کی کہ اس کے اولڈ ایج ہوم کا نام کارروائی سے حذف کردیا جائے تاکہ وہاں رہنے والوں پر اس کا کوئی اثر نہ پڑے۔ عدالت نے انسانی ہمدردی کی بنیاد پر یہ استدعا منظور کرلی۔

میلری اور سام مجرم ثابت ہوئے۔ میلری کو عدالت نے ایک سو چار برس قید کی سزا اور سام کو عمر قید کی سزا دی گئی۔ میلری کی آخری واردات میں شامل ڈاکٹروں کو غیر قانونی راستہ اختیار کرنے پر پریکٹس کے لیے ان کے اجازت ناموں پر دو سال کی پابندی لگا دی گئی۔ انہیں یہ نرم سزا اس لیے دی گئی تھی کہ وہ ابھی ناتجربہ کار تھے۔ ان کے سامنے پورا کیریئر تھا، تاہم چوکیدار کو پانچ برس کی قید ہوئی۔

☆☆☆

'برین کیس' اپنے منطقی انجام کو پہنچا تو کرسٹن نے بھی اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ اگرچہ اس کا یہ فیصلہ محکمۂ پولیس کے لیے ایک بہت بڑا دھچکا تھا۔ وہ اپنا قابل افسر کھونا نہیں چاہتے تھے لیکن کرسٹن کو اب اس پیشے سے ہی چڑ ہوگئی تھی۔ وہ پیشہ جہاں اتنی بھیانک سچائیاں آپ کی نظروں کے سامنے ہوتی ہیں تو کلیجا خون کے آنسو رونے لگتا ہے۔ اسے آئی بی نے ایک اعلیٰ عہدے کی پیش کش کی لیکن اس نے یہ بھی قبول نہ کی۔

جین، اس کا شوہر اور بیٹے بیٹیاں آج کل ازابیلا عرف مسز میلری کا اولڈ ایج ہوم چلا رہے ہیں۔ اب وہاں ہال میں ہر وقت بوڑھے بوڑھیوں کی چوپالیں بھی رہتی ہیں۔ لگتا ہے کہ جیسے ان لوگوں میں زندگی اور زندہ رہنے کی امنگ دوبارہ لوٹ آئی ہے۔ البتہ اب اس ادارے کو سرکاری امداد بھی ملتی ہے اور یہاں رہنے والوں کے ورثا سے کوئی رقم وصول نہیں کی جاتی۔

'برین کیس' کے باعث کرسٹن کو جو شہرت ملی اس کی بدولت اب اس کے نام پر اس ادارے کو امریکا بھر سے مالی امداد ملتی ہے۔ پولیس سے استعفیٰ دینے کے بعد اب کرسٹن ہی اس اولڈ ایج ہوم کا ایڈمنسٹریٹر ہے۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ ہی یہاں پر رہتا ہے اور اس کی بہن بھی کبھار آکر یہاں رہنے والے بزرگوں کے ساتھ مل کر خوب ہلا گلا کرتی ہے۔

اس کی عمر چوبیس سے زیادہ کی نہیں تھی۔

لیکن ایک بہت بڑا فرض اس کے شانوں پر ڈال دیا گیا تھا۔ گاؤں کی اکلوتی مسجد میں امامت کا فرض۔ یہ فرض باپ کی موت کے بعد خود بخود اس کی طرف منتقل ہوگیا تھا۔

یہ ایک چھوٹی سی مسجد تھی۔ اس کی تعمیر میں لال اینٹیں اور مٹی کا استعمال کیا گیا تھا۔ اس کے باپ نے اپنے ہاتھوں سے یہ مسجد تعمیر کی تھی۔ مسجد ایک چبوترے پر بنائی گئی تھی۔

چبوترے کے برابر میں ایک کوٹھری تھی۔ یہ کوٹھری اس نے اپنے اور بیٹے کے رہنے کے لیے بنائی تھی۔ دنیا میں شہاب الدین کے سوا اس کا کوئی نہیں تھا۔

بیوی کی موت کے بعد اس نے شہاب الدین کو ماں اور باپ دونوں کا پیار دیا تھا۔ شہاب الدین کو قرآن کی تعلیم دی تھی۔ اس کے علاوہ گاؤں کے واحد اسکول سے اس نے شہاب الدین کو آٹھویں تک تعلیم بھی دلوادی تھی۔

ان کا گزر بسر چھوٹی سی دکان سے ہوا کرتا۔

یہ کھانے پینے کی چیزوں کی دکان تھی۔ غیاث الدین رزق حلال پر تکیہ کرنے والا ایک مخلص اور سچا انسان تھا۔ اس نے گاؤں میں مسجد کی تعمیر کے ساتھ ساتھ یہ اعلان کردیا تھا۔

سیلاب آنے اور پانی اتر جانے کے بعد رونما ہونے والے مسائل و کیفیات کی کرب ناک تصویر کشی

دلی کیفیات اور جذباتی وابستگی کے لیے ہزار ہا ملاقاتیں ضروری نہیں..... فقط ایک ملاقات دور تک چلی جاتی ہے..... ایک ایسے ہی شخص کی زندگی کے لمحات جو اچانک ہی عدو جزر کا شکار ہوگئے۔

سیلاب کے بعد

منظر امام

pkdigest.com

"دیکھو بھائیو! میں اس مسجد کی خدمت کروں گا، اذانیں دوں گا، نمازیں پڑھاؤں گا لیکن اس کے ساتھ ہی میرے ساتھ بھی پیٹ لگا ہوا ہے۔ میرا بیٹا بھی ہے۔ اس گاؤں میں میرا کوئی کاروبار نہیں ہے اور نہ میری کوئی زمین ہے... اور میں تم لوگوں سے چندہ بھی نہیں لینا چاہتا۔ یہ پسند نہیں کروں گا کہ گاؤں کے ہر گھر سے میرے لیے کھانا آیا کرے... نہیں، ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا۔"

"تو پھر مولوی صاحب! تمہارا گزارہ کیسے ہوگا؟"

"اس کے لیے میں نے یہ سوچا ہے کہ پورا گاؤں مجھے تھوڑے تھوڑے پیسے دے گا۔" غیاث الدین نے کہا۔ "اطمینان رکھو، یہ پیسے قرض ہوں گے جو میں ایک ایک پائی کر کے واپس کر دوں گا۔"

"لیکن پیسوں کا کرو گے کیا مولوی صاحب؟"

"مسجد کے ساتھ کریانے کی ایک دکان کھول لوں گا۔ میرا خدا برکت دے گا اور آہستہ آہستہ تم لوگوں کا... اُدھار واپس کرتا جاؤں گا۔"

پورے گاؤں نے اس جذبے کو بہت سراہا۔ یہ پہلا مولوی تھا جس نے اس قسم کی بات کی تھی۔ ورنہ مولوی تو دوسروں کے گھروں کی طرف آس لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔

بہر حال گاؤں والوں نے مدد کی۔ غیاث الدین نے کریانے کی دکان کھول لی۔ لوگ اس کی دکان سے بھی خریدنے لگے۔ اس طرح یہ سلسلہ شروع ہوگیا۔

گاؤں زیادہ بڑا نہیں تھا۔

مسجد کے بعد دور دور کچھ کچے پکے مکانات تھے۔ ان کے بعد کھیتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ دائیں طرف ایک راستہ جاتا تھا جس پر گاؤں کا بازار تھا۔ ضروریات کی دکانیں تھیں۔ ان سے کچھ فاصلے پر گاؤں کا واحد اسکول تھا۔ اس گاؤں کی آبادی سات آٹھ ہزار کی تھی۔ اس لحاظ سے اسے آس پاس کے دوسرے گاؤں سے بڑا خیال کیا جاتا تھا۔

غیاث الدین کا بیٹا شہاب الدین بہت خوب صورت نوجوان تھا۔ گورے رنگ پر سیاہ داڑھی اور نکلتا ہوا قد۔ نہ جانے گاؤں کی کتنی گوریوں نے اسے اپنے دلوں میں بسا رکھا ہوگا لیکن وہ خدا کا بندہ یا تو مسجد میں ہوتا یا مسجد کے ساتھ والی دکان میں بیٹھا رہتا۔

گاؤں کی عورتیں صرف اس کو دیکھنے کی خاطر اس کی دکان سے سودا لیا کرتی تھیں۔ پھر یہ ہوا کہ غیاث الدین کا انتقال ہوگیا۔

باپ کی موت کے بعد ساری ذمے داری شہاب پر آگئی۔ اپنے رزق کے لیے دکان چلاتا اور گاؤں والوں کو نماز پڑھاتا تھا۔

وہ چھوٹی سی مسجد کی چھت پر چڑھ کر جب اذانیں دیا کرتا تو گاؤں والے مسجد کی طرف دوڑے چلے آتے تھے۔ سب یہی کہا کرتے تھے کہ اس کی آواز میں اس کے باپ کی اذان سے زیادہ سوز ہے۔

شہاب الدین کے لیے اس کا باپ ہی جیسے پوری کائنات تھا۔ اس نے اپنی ماں کی صورت بھی نہیں دیکھی تھی۔ کوئی بھائی نہیں... کوئی بہن نہیں... کوئی رشتے دار نہیں تھا۔

صرف باپ اور یہ مسجد... یہ دکان... یہ چھوٹا سا گاؤں یا اس سے پہلے جب وہ اسکول میں پڑھا کرتا تو کتابیں اس کے ساتھ ہوا کرتیں۔ وہ کبھی کبھی اسکول کے ہیڈ ماسٹر کے پاس آنے والا پرانا اخبار بھی پڑھ لیا کرتا۔ اس کے علاوہ وہ اور کچھ نہیں جانتا تھا۔

اس کی دکان میں آنے والی لڑکیاں اسے اچھی لگتی تھیں۔ لڑکیاں اسے دیکھتی تھیں۔ کوئی شوخ قسم کی لڑکی ایک آدھ جملہ بھی اچھال دیتی... لیکن وہ خود گردن جھکائے ہولے ہولے مسکراتا رہتا تھا۔

وہ بھی انسان تھا، نوجوان تھا۔ وہ بھی زندگی کے ان لطیف جذبوں کی لذت سے آشنا تھا۔ لیکن اس میں اتنی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ خود کسی سے بات کرے۔

جب تک باپ زندہ تھا، باپ کا احترام تھا اور اب باپ کی موت کے بعد اس پر مسجد کا احترام بھی فرض ہوگیا تھا۔ بہت اہمیت تھی اس کی۔ گاؤں کے بڑے بوڑھے تک اس کے پیچھے کھڑے ہو کر نمازیں ادا کرتے اور اسے امام صاحب، امام صاحب کہا کرتے تھے۔

پھر وہ کس طرح کسی لڑکی سے یہ کہہ سکتا تھا کہ تم مجھے اچھی لگتی ہو؟ میں تم کو حاصل کرنا چاہتا ہوں، تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اسے گاؤں والوں پر غصہ بھی آیا کرتا تھا۔ کیا انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ جوان ہو چکا ہے۔ اس نے بچپن سے اب تک مسجد کی خدمت کی ہے۔ اس کا کوئی عزیز رشتے دار بھی نہیں ہے تو کیا یہ گاؤں والوں کا فرض نہیں بنتا تھا کہ وہ اس کی شادی کا سوچیں۔ گاؤں کی کسی لڑکی سے اس کا رشتہ لگا دیں لیکن شاید وہ تو اسے انسان ہی نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا خیال ہوگا کہ وہ صرف مسجد کا امام ہے... بس اس کے علاوہ وہ اور کچھ نہیں ہے۔

مسجد سے کچھ فاصلے پر جہاں سے مکانوں کے سلسلے شروع ہوتے تھے، وہاں مٹی کا ایک بہت بڑا چبوترہ بنا دیا گیا

تھا۔ یہ چبوترہ گاؤں والوں کے لیے بیٹھک کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔

عشا کی نماز سے فارغ ہو کر گاؤں کے کچھ لوگ چبوترے پر آ کر بیٹھ جاتے اور اِدھر اُدھر کی باتیں شروع ہو جاتیں۔ موضوعات بھی بہت محدود ہوا کرتے۔

مویشیوں کی دیکھ بھال۔ فلاں کی بھینس بیمار ہوگئی ہے۔ فلاں کی گائے کے ساتھ یہ ہوگیا ہے۔ اس سال فصل اچھی یا خراب ہوئی ہے... یا فلاں کی شادی فلاں سے ہو رہی ہے۔

بس اسی قسم کی باتیں ہوا کرتیں۔ کبھی کبھی شہاب الدین بھی اس محفل میں شامل ہو جاتا۔ اس وقت وہ دین کی باتیں بتایا کرتا۔ یہ باتیں اس نے اپنے مرحوم باپ سے سیکھی تھیں یا ان چند کتابوں سے جو اس کا باپ ترکے میں اس کے لیے چھوڑ گیا تھا۔

پچھلے کچھ دنوں سے اس چبوترے پر کچھ ایسی باتیں ہو رہی تھیں جن کی وجہ سے پورا گاؤں خوف اور پریشانی کے عالم میں تھا۔ ایک زبردست قسم کا سیلاب گاؤں کی طرف بڑھا آ رہا تھا۔

اس پورے گاؤں میں ایک ہی ٹیلی ویژن تھا۔ سب لوگ اسی پر خبریں دیکھا اور سنا کرتے۔ آئے دن خبر آتی کہ آج فلاں گاؤں سیلاب میں بہہ گیا۔ آج فلاں گاؤں کے لوگوں نے گاؤں چھوڑ دیا ہے۔ اتنے کھیت ڈوب گئے۔ اتنے جانور مر گئے ہیں۔ غرضیکہ اس سیلاب نے چاروں طرف خوف اور دہشت کی فضا قائم کر دی تھی۔

گاؤں کے لوگ گاؤں چھوڑنے کی باتیں کر رہے تھے جبکہ کچھ لوگوں کا یہ خیال تھا کہ سیلاب اس طرف نہیں آئے گا کیونکہ اس گاؤں میں جوگی بابا کا مزار ہے اور وہ اس گاؤں کے رکھوالے ہیں۔ وہ آنے والے سیلاب کو روک لیں گے۔

ایک شام سرکاری گاڑی آگئی۔ ایک آدمی بھونپو پر اعلان کرتا پھر رہا تھا۔ "گاؤں والو... گاؤں چھوڑ دو۔ صرف دو گھنٹے بعد سیلاب کا بہت بڑا ریلا اس طرف آ رہا ہے۔ گاؤں چھوڑ کر چلے جاؤ۔"

اس اعلان کے بعد پورے گاؤں میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔

یہ لوگ شہاب الدین کے پاس آئے۔ "امام صاحب! جلدی کرو... نکلو یہاں سے۔"

"نہیں بھائیو! مجھے کہاں جانا ہے۔ میں اس مسجد کو خالی کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟"

"مسجد کی فکر اوپر والا کرے گا۔ تم اپنی زندگی بچاؤ۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آج تک ایسا نہیں ہوا کہ اس مسجد میں اذان نہ ہوئی ہو۔" اس نے کہا۔ "یہ مسجد میری ذمے داری ہے بھائی... تم لوگ نکل جاؤ... تمہارے ساتھ بیوی بچے ہیں... میری فکر نہیں کرو۔"

کسی کے پاس اس سے بحث کرنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ سب اسے چھوڑ کر اپنے اپنے گھر کی طرف دوڑ گئے۔

اندھیرا ہو چلا تھا۔

چاند ذرا جلدی نکل آیا تھا لیکن شہاب الدین کو اس کی روشنی بہت اداس سی معلوم ہو رہی تھی جیسے چاندنی رو رہی ہو۔ گاؤں کے کسی مکان میں کہیں روشنی نہیں ہو رہی تھی۔

شہاب الدین نے دکان سے کھانے پینے کی بہت سی چیزیں لے کر مسجد کی چھت پر پہنچا دیں۔ چولہا اور کچھ برتن بھی پہنچا لیے۔ یہ سارا کام اس نے بہت اطمینان سے کیا تھا۔

اسے کہیں نہیں جانا تھا اس لیے دوسرے لوگوں کی طرح اسے جلدی نہیں تھی۔

مکانوں کی طرف سے عورتوں اور بچوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ایک وحشت کا سا عالم تھا۔ اس نے بھی اپنی لالٹین روشن نہیں کی تھی۔ مٹی کا تیل بہت تھوڑا سا تھا۔ آنے والے بُرے وقتوں کے لیے اسے بچا کر رکھنا تھا۔

وہ وظیفے پڑھتے پڑھتے چھت پر ہی سو گیا۔

ساری رات عجیب عجیب خواب اسے پریشان کرتے

اہم انتباہ

جملہ اشتہارات (جن کے مندرجات سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں ہوتا) نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ مشتہرین کے لیے ادارے کی معرفت آنے والی ڈاک ضایع کر دی جاتی ہے، قارئین رابطے یا معلومات کے لیے براہ راست مشتہرین سے رجوع کریں۔ اس ضمن میں کسی نقصان یا شکایت کی صورت میں جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی کوئی اخلاقی یا قانونی ذمے داری نہیں ہوگی۔

www.pkdigest.com

رہے۔ کبھی یہ دیکھتا کہ پوری مسجد بہتی ہوئی چلی جارہی ہے۔ کبھی آسمان سے سانپوں کی بارش ہونے لگی ہے۔

پھر اس کی آنکھ سانپوں کی پھنکار سے کھل گئی۔

اس کے چاروں طرف سانپ پھنکار رہے تھے۔ وہ گھبرا کر اٹھ گیا۔ وہ مسجد کی چھت پر تھا اور ہر طرف پانی ٹکریں مار رہا تھا۔ مسجد کی دیواروں سے... دروازے سے... کھڑکیوں سے... مکانوں سے۔ وہ اندھیرے میں پانی تو نہیں دیکھ رہا تھا لیکن یہ چاروں طرف سانپ کی طرح پھنکاریں لینے والی آواز پانی کی تھی۔

پانی بہت غصے میں تھا۔

شہاب الدین نے جلدی جلدی وظیفہ پڑھنا شروع کر دیا۔ گاؤں کی طرف بالکل خاموشی تھی۔ خاموشی اور اندھیرا... بلا کا اندھیرا... اور بلا کی خاموشی!

شہاب الدین نے اندازہ لگایا کہ فجر کا وقت ہو گیا ہے۔ وہ بالٹی میں پانی اور لوٹا وغیرہ پہلے ہی چھت پر لے آیا تھا۔ اسے اذان دینی تھی۔ پھر خیال آیا کس کے لیے اذان دے گا؟ کون ہے سننے والا؟ شاید گاؤں تو خالی ہو چکا ہوگا پھر بھی اس نے وضو کر کے اذان دینی شروع کر دی۔ اس اذان میں اسے ایسا کیف اور سرور ملا کہ جس کا بیان نہیں ہو سکتا۔ اسے ایسا لگا جیسے اس کا باپ مولوی غیاث الدین اس کی اذان سننے کے لیے چلا آیا ہو۔

اس کی آواز سن کر خوش ہو رہا ہو۔ شہاب الدین نے پورے سوز کے ساتھ اذان دی اور خود اقامت کہہ کر نماز ادا کر لی۔ ابھی تھوڑی بہت روشنی ہو چلی تھی۔

اس روشنی میں اسے جو کچھ دکھائی دیا، وہ بہت حیرت انگیز اور بھیانک تھا۔ ہر طرف پانی... سوائے پانی کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ پورے گاؤں پر جیسے کسی نے پانی کی چادر بچھا دی تھی۔

انتہائی تیز ریلا... درخت اور مویشی اس ریلے میں بہتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ پورا گاؤں خالی ہو چکا تھا۔ دور دور تک سوائے پانی کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔

خود مسجد کی محرابوں تک پانی آ چکا تھا۔ اس ویرانے میں یا تو وہ مسجد تھی... یا پھر وہ خود تھا۔

☆☆☆

دو دن اسی طرح گزر گئے۔

یہ دو دن اس کی زندگی کے بہت بھیانک دن تھے۔ اس نے عقل مندی کی تھی کہ کھانے پکانے کی کچھ چیزیں اور چولہا وغیرہ مسجد کی چھت پر لے آیا تھا۔ اس لیے اس طرف سے اسے کوئی تکلیف نہیں ہوئی تھی۔

لیکن پانی کی بپھری ہوئی آوازوں اور غصے میں بھرے ہوئے انداز نے اسے بُری طرح خوف زدہ کر رکھا تھا۔ ان دو دنوں کے دوران وہ پانچوں وقت اذانیں دیتا رہا تھا۔ شاید پانی میں بہتا ہوا کوئی شخص اس کی اذان سن کر مسجد کی طرف آ نکلے۔

لیکن کون آتا؟ آبادیوں کو تو پانی نے اپنے اندر سمو لیا تھا۔

اس گاؤں کی طرف بچانے والے بھی نہیں آئے تھے۔ البتہ اس نے فضا میں منڈلانے والے ہیلی کاپٹر ضرور دیکھے تھے۔ جو شور مچاتے ہوئے اس کے سر کے بہت اوپر سے گزر گئے تھے۔

پھر تیسری صبح اس نے کسی کو دیکھ لیا۔

کسی نے درخت کا ایک کھوکھلا تنا مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ وہ تنا اسے اِدھر اُدھر بہائے لیے جا رہا تھا۔ وہ تنا مسجد کی دیواروں کی طرف آ رہا تھا۔

شہاب الدین حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اس تنے سے کوئی عورت یا لڑکی چمٹی ہوئی تھی اور وہ ابھی زندہ تھی۔ وہ اپنے ہاتھ پاؤں ہلا رہی تھی۔

شہاب الدین کو اپنا انسانی فریضہ یاد آ گیا... جس نے کسی ایک شخص کی جان بچائی اس نے گویا پوری انسانیت کو بچا لیا۔

اس نے انسانیت کو بچانے کے لیے پانی میں چھلانگ لگا دی۔

ذرا سی کوشش اور جدوجہد کے بعد وہ اس لڑکی کو مسجد کی چھت تک لے آنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ لڑکی ہوش میں تھی لیکن بہت نڈھال ہو رہی تھی۔

اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اس کا پورا جسم بھیگا ہوا تھا۔ کپڑے اس کے بدن سے چپک کر رہ گئے تھے۔ شہاب الدین کو پہلی بار کچھ عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ اس کی کنپٹیاں گرم ہونے لگی تھیں۔

ایک خوب صورت لڑکی اس کے سامنے تھی اور دور دور تک کوئی بھی نہیں تھا۔ اس نے لاحول پڑھتے ہوئے اپنے سر کو جھٹکا دیا اور ایک چادر اٹھا کر لڑکی کے اوپر ڈال دی۔

لڑکی صرف اسے دیکھے جا رہی تھی۔ شاید ابھی تک اس کے اوسان بحال نہیں ہوئے تھے۔ اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن پھر کانپ کر رہ جاتی۔ شاید وہ خوف زدہ تھی۔

شہاب الدین نے اس کا خوف دور کرنے کی کوشش کی۔ ''تم پریشان نہ ہو۔ میں تمہیں پانی سے نکال کر لایا ہوں۔ تم کسی طرف سے بہتی ہوئی اس طرف آ نکلی تھیں۔''

لڑکی نے اس کی بات سن لی لیکن خود اس نے کچھ نہیں کہا۔ شہاب الدین نے مزید کہا۔ ''میرا نام شہاب الدین ہے۔ یہ جو مسجد ہے نا... میں اس مسجد کا امام ہوں۔ ٹھہرو، میں تمہارے لیے چائے بناتا ہوں۔''

''چائے کا سامان کہاں سے لاؤ گے؟'' پہلی بار لڑکی نے کوئی بات کی۔

''وہ سب ہے میرے پاس۔ سیلاب سے پہلے میں بہت سی چیزیں چھت پر لے آیا تھا۔ چولہا بھی ہے۔''

کچھ دیر بعد اس نے چائے بنا کر لڑکی کے سامنے رکھ دی۔ ''ہاں اب بتاؤ... کہاں سے بہتی ہوئی آ رہی ہو؟'' اس نے پوچھا۔

چائے پینے کے بعد لڑکی نے اپنے آپ کو بہتر محسوس کیا۔ وہ مسجد کی منڈیر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی تھی۔ شہاب الدین کی دی ہوئی چادر اس کے بدن کے گرد لپٹی ہوئی تھی۔

وہ ایک خوب صورت لڑکی تھی۔ اس کے خوب صورت بال ابھی تک گیلے تھے۔ کچھ اس کی پیشانی سے چپکے ہوئے تھے۔

''میں نصیب آباد سے بہتی ہوئی آ رہی ہوں۔'' لڑکی نے بتایا۔

''وہ تو بہت دور ہے۔'' شہاب الدین نے کہا۔

''ہاں، بہت دور... مجھے نہیں معلوم کہ یہ کون سی جگہ ہے۔'' لڑکی بول رہی تھی۔ ''لیکن میں نہ جانے کتنے گھنٹوں تک پانی میں بہتی رہی ہوں۔''

''اس گاؤں کو جوگی نگر کہتے ہیں۔'' شہاب الدین نے بتایا۔ ''پورا گاؤں یہاں سے جا چکا تھا۔ صرف میں اکیلا رہ گیا ہوں۔''

''اور تمہارے گھر والے؟'' لڑکی نے پوچھا۔ ''ماں باپ، بھائی بہن وغیرہ۔''

''نہیں، میرا کوئی نہیں ہے۔'' شہاب الدین نے بتایا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ ''اچھا ہے کہ میرا کوئی نہیں ہے۔ ورنہ اس سیلاب میں سب کے لیے پریشان ہوتا رہتا۔ ارے فلاں نہ جانے کہاں رہ گیا۔ ہائے... وہ تو نظر نہیں آ رہا۔''

شہاب الدین کو اس وقت خود پر حیرت ہو رہی تھی۔ پہلی بار وہ کسی لڑکی سے اس طرح کھل کر باتیں کر رہا تھا۔ وہ تو مردوں سے بھی زیادہ باتیں نہیں کیا کرتا تھا۔

''پتا نہیں... میرے گھر والوں کا کیا حال ہوگا؟'' لڑکی نے ایک گہری سانس لی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ ''ماں باپ، بھائی بہن سب ہی تھے۔ پھر یہ سیلاب آ گیا۔ راتوں رات آیا تھا۔ ہم سب سو رہے تھے۔ اس لیے کچھ نہیں معلوم ہو سکا کہ کون کہاں چلا گیا۔ وہ لوگ زندہ بھی ہیں یا نہیں۔'' لڑکی اب رونے لگی تھی۔

''نہیں نہیں... پریشان نہ ہو۔'' شہاب الدین نے اس کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کی۔ ''ہو سکتا ہے ان لوگوں نے کسی کیمپ میں پناہ لے لی ہو... یا کسی کے گھر میں پناہ لی ہو۔ جیسے تم یہاں بہتی ہوئی چلی آئی ہو اور سلامت ہو... ہو سکتا ہے کہ اسی طرح وہ بھی زندہ اور سلامت ہوں۔ انسان کو خدا سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔''

پھر اچانک اس کے اندر کا مولوی جاگ اٹھا۔ اس نے خدا کی ذات پر یقین اور بھروسے پر پورا خطبہ دے دیا تھا۔ اس کی پڑھی ہوئی کتابیں پہلی بار اس طرح اس کے کام آ رہی تھیں۔

لڑکی بہت دلچسپی سے اس کی باتیں سنتی رہی۔ شہاب الدین کی تقریر کا یہ اثر تو ضرور ہوا کہ لڑکی خاموش ہو گئی تھی۔

''تم نے اپنا نام تو بتایا نہیں؟'' شہاب الدین نے پوچھا۔

''میرا نام شگفتہ ہے۔'' لڑکی نے بتایا۔ ''میٹرک تک پڑھا ہے میں نے۔ ابا نے کہا تھا کہ مجھے خوب پڑھائیں گے پھر یہ سیلاب آ گیا۔ نہ جانے کہاں ہوں گے ابا۔'' لڑکی پھر اداس ہونے لگی تھی۔

شہاب الدین نے اس کا دل بہلانے کے لیے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں لیکن اس کا ذخیرہ جلد ہی ختم ہو گیا۔ اس کے پاس سنانے کے لیے کچھ بھی نہیں رہا تھا۔

پھر اسے خیال آیا کہ اب تو عصر کا وقت ہو گیا ہے۔ پھر لڑکی بھوکی ہوگی۔ اس نے جلدی جلدی دو چار روٹیاں بنائیں اور اچار کے ساتھ لڑکی کے سامنے رکھ دیں۔ ''معاف کرنا، اس وقت میں تمہارے لیے یہی کر سکتا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''ان حالات میں یہی بہت ہے۔'' لڑکی دھیرے سے بولی۔ ''میں تو اپنی زندگی کی طرف سے مایوس ہو گئی تھی۔''

''اللہ بچانے والا ہے۔ اچھا اب میں اذان دے کر نماز پڑھ لوں۔''

''اس ویرانے میں اذان کی کیا ضرورت ہے؟'' لڑکی نے حیرت سے پوچھا۔

''مجھے تو اپنا فرض پورا کرنا ہے نا۔''

شہاب الدین نے اذان دے کر نماز پڑھ لی۔ اس دوران لڑکی نے روٹیاں کھا لی تھیں۔

''ہمارا کیا ہوگا؟'' لڑکی نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

''خدا بہتر کرے گا۔'' شہاب الدین نے کہا۔ ''فی الحال تو ہم مسجد کی چھت سے نہیں اتر سکتے۔ ہر طرف سوائے

www.pkdigest.com

پانی کے اور کچھ نہیں ہے۔"

انہوں نے وہ رات وہیں گزاری۔

چاروں طرف بپھرا ہوا ریلا۔ انتہائی پرہول سناٹا اور اندھیرا۔ صرف پانی کے تھپیڑوں کی آوازیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے پانی ان دونوں کو زندہ سلامت دیکھ کر غصے سے پھنکار رہا ہو۔

یہ رات شہاب الدین کے لیے بہت بڑے امتحان کی رات تھی۔ اس پرہول خاموشی میں ایک جوان اور خوب صورت لڑکی اس کے ساتھ تھی۔ اسے اپنے نفس پر قابو رکھنا تھا۔ یہی اس کا امتحان تھا۔

عشا کی نماز سے فارغ ہوکر دونوں بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اس بار لڑکی ہی زیادہ بولتی رہی تھی۔ اس نے اپنے بارے میں بہت سی باتیں بتائیں۔

اپنے شوق، اپنی دوستوں، اپنی پڑھائی... وہ نہ جانے کیا کیا بولتی رہی۔ شہاب الدین کو اس کی باتوں میں بہت مزہ آرہا تھا۔ اسے یہ سب کچھ بہت اچھا لگ رہا تھا۔

نہ جانے ذہن کے کسی گوشے سے ایک خواہش بیدار ہونے لگی۔ کاش، یہ سب کچھ اسی طرح رہے۔ یہ سیلاب اسی طرح قائم رہے۔ چاروں طرف پانی ہی پانی۔ جانے کا کوئی راستہ نہ ہو... اور وہ دونوں اسی مسجد کی چھت پر زندگی گزار دیں۔

لاحول ولا۔ اس نے زور زور سے اپنے سر کو جھٹکنا شروع کر دیا۔ وہ یہ سب کچھ سوچنے لگا ہے۔ یہ کیسی فضول خواہش ہے؟ اب دونوں کے درمیان خاموشی تھی۔ پھر اس نے خاموشی سے گھبرا کر پوچھا۔ "کیا تمہاری شادی ہوچکی ہے؟"

"نہیں۔" لڑکی نے دھیرے سے جواب دیا۔ "ابھی نہیں... اور تم؟"

"میں نے اپنے بارے میں بتایا نا کہ میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔" شہاب الدین نے کہا۔

پھر خاموشی اور اس خاموشی کے دوران دونوں کو نیند آگئی تھی۔ دوسری صبح نہ جانے کیا ہوا کہ شاید پہلی بار اس مسجد سے فجر کی اذان بلند نہیں ہوئی۔

شہاب الدین کو اتنی گہری نیند آئی تھی کہ سورج کی کرنوں نے اسے جگایا۔ وہ استغفار پڑھتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ لڑکی ابھی تک بے خبر سو رہی تھی۔ شہاب الدین کو فجر کی اذان نہ دینے کا افسوس ہو رہا تھا۔

نماز کے بعد وہ بہت دیر تک خدا سے اپنی اس کوتاہی کی معافی مانگتا رہا۔ لڑکی بھی کچھ دیر بعد اٹھ بیٹھی۔ اس نے منہ ہاتھ دھو کر کچھ کہے بغیر چولہا سنبھال لیا تھا۔

شہاب الدین کو پہلی بار ایسی طمانیت کا احساس ہو رہا تھا کہ کوئی لڑکی اس کے لیے روٹیاں بنا رہی تھی، چائے بنا رہی تھی۔

لڑکی نے کانچ کی جو چوڑیاں پہن رکھی تھیں، ان کی چھن چھن بھی اس کے کانوں کو بہت بھلی لگ رہی تھی۔ ناشتے سے فارغ ہوکر دونوں پھر سیلاب کی باتیں کرنے لگے۔ "یہ پانی اترتا ہوا نظر نہیں آرہا۔" لڑکی نے دور تک نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔

"ہاں اور اس طرف کوئی بچانے والا بھی نہیں آیا۔"

"تو کیا ہم اسی طرح یہیں بیٹھے رہیں گے؟"

"مجبوری ہے۔ پانی میں ہم کہاں تک جا سکتے ہیں؟" شہاب الدین نے کہا۔ "پانی کو تو دیکھو۔"

"خدا کی پناہ! بہت ہی زور ہے پانی میں۔ میں تو تنکے کی طرح بہہ نکلی تھی۔"

پھر خاموشی۔ شاید ان دونوں کی سمجھ میں نہیں آرہا ہوگا کہ وہ اب کیا کہیں۔ پھر لڑکی نے اپنے گاؤں کی کہانی شروع کر دی۔ لوگوں کے بارے میں بتانے لگی۔ کون کیا کرتا ہے، کون کس طرح کا ہے۔

پھر اس نے ایک محبت کی کہانی سنائی کہ ایک دفعہ ان کے گاؤں کی ایک لڑکی اور ایک لڑکے نے شادی میں ناکام ہوکر ایک ساتھ کنوئیں میں چھلانگ لگا دی تھی۔ پھر ان دونوں کی لاشیں نکالی گئی تھیں۔ پورا گاؤں ان دونوں کے لیے سوگوار تھا۔

پھر اس نے شہاب الدین سے پوچھا۔ "کیا تم نے کسی سے محبت کی ہے؟"

یہ ایک عجیب سوال تھا۔ شہاب الدین کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ زندگی میں پہلی بار اس سے ایسا سوال کیا گیا تھا اور سوال کرنے والی بھی ایک لڑکی تھی۔ ایک خوب صورت لڑکی جو مسکرا کر اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"نہیں۔ میرے ساتھ ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا۔" اس نے بتایا۔

"کیوں، کیا اس گاؤں میں لڑکیاں نہیں تھیں؟"

"بہت سی تھیں لیکن مجھے اس طرح سوچنے اور دیکھنے کا وقت ہی نہیں ملا۔ میری دنیا کیا ہے۔ یہی مسجد یا پھر وہ دکان جہاں میں جا کر بیٹھ جاتا ہوں۔ اذانیں دیتا ہوں۔ نمازیں پڑھاتا ہوں... اور ایسوں سے محبت کون کرتا ہے؟ میں تو ایک

زندگی گزار رہا ہوں جیسے مسجد کے صحن میں لگا ہوا نیم کا اکیلا درخت۔ جس کا کوئی ساتھی نہیں ہے۔"

"اوہ۔" لڑکی خاموش ہوگئی۔

اس کی خاموشی شہاب الدین کو بے چین کرنے لگی۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا، بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ جیسے... سنو، تم نے مجھ سے یہ بات کیوں پوچھی؟ تمہارے دل میں کیا ہے؟ یوں ہی پوچھ لی ہے یا پھر کوئی اور بات ہے؟

وہ اتنا بدحواس سا ہوگیا تھا کہ وہ یہ سوال لڑکی سے بھی نہیں کر سکا۔ اصولاً اسے بھی پوچھنا چاہیے تھا۔ شاید لڑکی نے یہ سوال کرکے اسے کسی قسم کا اشارہ دیا تھا۔

لیکن اس سے کچھ نہیں پوچھا گیا۔ وہ نماز کے وقت کا بہانہ کرکے لڑکی کے پاس سے ہٹ گیا۔

ان کی وہ رات بھی اسی طرح گزری۔ اتنا ضرور ہوا تھا کہ دونوں کے درمیان بے تکلفی سی ہوگئی تھی۔ رات کا کھانا بھی لڑکی نے بنایا تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ اعلان کیا تھا۔ "آٹا ختم ہوگیا ہے۔ اب روٹیاں کہاں سے آئیں گی؟"

ایک بار پھر شہاب الدین کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی شادی ہوچکی ہو اور اس کی بیوی اس سے کہہ رہی ہو کہ جاؤ آٹا ختم ہوگیا ہے۔ بازار سے جا کر لے آؤ۔

آٹا بھی ایک مسئلہ تھا۔ شہاب الدین جانتا تھا کہ دکان میں آٹے کی دو بوریاں رکھی ہوئی تھیں لیکن اب وہ کسی قابل نہیں رہی ہوں گی۔ پانی نے آٹے کو برباد کر دیا ہوگا۔

اب یہ نیا سوال سامنے آگیا تھا کہ اب کیا ہوگا؟

لیکن یہ سوال زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکا۔ دوسری صبح نیوی کی ایک کشتی ان دونوں کو بچانے کے لیے آگئی تھی۔

☆☆☆

وہ دونوں ایک کیمپ میں آگئے تھے۔

یہ کیمپ وہاں سے کچھ فاصلے پر مدن پور میں بنایا گیا تھا۔ بہت سے لوگ تھے۔ لٹے پٹے۔ آس پاس کے گاؤں دیہات کے لوگ جن کے پاس زندگی گزارنے کے لیے کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ سیلاب نے ان سے سب کچھ چھین لیا تھا۔

وہ خالی ہاتھ رہ گئے تھے۔

شہاب الدین مسجد چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ نیوی کی کشتی انہیں بچانے نہیں بلکہ اس کے خوب صورت خوابوں کو برباد کرنے کے لیے وہاں آئی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ شگفتہ بھی انکار کر دے۔ وہ ان لوگوں کے ساتھ نہ جائے لیکن شگفتہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ "چلو... تم یہاں نہیں رہ سکتے۔"

"دیکھو، میں چلا گیا تو مسجد ویران ہو جائے گی۔"

"تم زندہ رہے تو مسجد کو پھر سے آباد کر لو گے۔" شگفتہ نے کہا۔ "میں بھی تو جا رہی ہوں نا... آؤ۔"

وہ اس لڑکی کی ضد کے سامنے مجبور ہوگیا تھا۔

کیمپ میں سیکڑوں لوگ تھے۔ بہت بڑا کیمپ تھا۔ شہاب الدین کو وہ مسجد یاد آرہی تھی۔ وہ لمحے یاد آرہے تھے جب اس کے اور اس لڑکی کے سوا وہاں کوئی نہیں تھا۔

شگفتہ دوسری عورتوں میں اپنے گھر والوں کو تلاش کرنے لگی۔ شہاب الدین ایک طرف جا کر بیٹھ گیا تھا۔ ایک یا ڈیڑھ گھنٹے کے بعد شگفتہ ایک نوجوان کا ہاتھ پکڑے اس کے سامنے لے آئی۔ "امام صاحب! یہ نصیر ہے۔" اس نے بتایا۔ "اپنے ہی گاؤں کا ہے۔ اس سے میری منگنی ہوئی ہے۔"

شہاب الدین کو ایسا لگا جیسے سیلاب کا ایک بہت بڑا ریلا اس کے وجود سے آ کر ٹکرا گیا ہو۔ اس کی روح، اس کا دل، اس کا دماغ، اس کی امیدیں، اس کی امنگیں سب کی سب تنکوں کی طرح بہتی چلی جا رہی ہوں۔

"مبارک ہو۔" وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔ "تمہارے اپنے تمہیں مل گئے۔"

"جی امام صاحب! میرے گھر والے بھی دوسرے کیمپ میں ہیں۔" شگفتہ نے بتایا۔ "میں نصیر کے ساتھ وہیں جا رہی ہوں۔ ہم لوگ آپ سے ملنے ضرور آئیں گے۔ سیلاب اتر جائے۔"

"نہیں بی بی... اب یہ سیلاب کبھی نہیں اترے گا۔" شہاب الدین نے دھیرے سے کہا۔ "جاؤ، تم اپنے گھر والوں کے پاس واپس چلی جاؤ۔ وہ لوگ تمہارے انتظار میں ہوں گے۔"

"اچھا امام صاحب... خدا حافظ۔" شگفتہ کے منگیتر نے اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

اب وہاں کچھ بھی تو نہیں رہ گیا تھا۔

اس کیمپ میں کئی بچھڑے ہوئے ایک دوسرے سے مل رہے تھے لیکن شہاب الدین کا کون تھا۔ کوئی بھی نہیں۔ اسی رات اس نے بپھرے ہوئے پانی میں چھلانگ لگا دی۔

وہ اپنے گاؤں کی طرف واپس جا رہا تھا۔ اس مسجد کی طرف جا رہا تھا جہاں دو دنوں سے اس کی اذان کی آواز نہیں گونجی تھی۔

لیکن اس مسجد میں پھر اس کی اذان کی آواز کبھی نہیں گونج سکی۔ پانی اتر جانے کے بعد لوگوں کو شہاب الدین کی لاش مسجد کی ایک دیوار کے پاس پڑی ہوئی مل گئی تھی۔

www.pkdigest.com

ان عاشق پرواتوں کا ماجرا جو خاص جولکارتے اور للکارنے کے دھنی تھے

للکار

طاہر جاوید مغل

زمانۂ قدیم سے عاشق وہ غبارِ خاک ہے جو یہاں سے وہاں
اڑتا پھرتا ہے۔ خودداری اور انا کو بالائے طاق رکھ کر کوئے
یار کے طواف میں محو رہتا ہے...... مگر آج عشق کی اقدار میں
تبدیلی...... وقت کی ضرورت اور حالات کا تقاضا ہے...... جس نے
عشق کا منظر نامہ بدل ڈالا ہے...... کرداروں میں بھی تبدیلی آچکی
ہے...... سر پھرے عاشق نے اب ایسے شخص کا روپ دھارا جو اپنے
جذبے اور شعور سے کام لے کر محبت اور محبت کے ساتھ ساتھ
دیگر فرائض و منصب کو بھی پیش نظر رکھتا ہے...... ایسے ہی
عاشقوں کے گرد گھومتی داستان۔ محبت جہاں ایک عاشق عشق
پیشہ ہے...... عشق میں اس کی زندگی کی سب سے بڑی سچائی
اور قدر ہے...... جبکہ دوسرے عاشق کا مطمع نظر مختلف ہے
زندگی اور دنیا کی وسعت نے اس کے قلب و نظر...... عقل و
شعور اور جذب عشق میں کشادگی کو بھر دیا ہے......
کائنات کا ہر مسئلہ اس کے پیش نظر...... ایک للکار ہے

نویں قسط

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ایک شرمیلا اور کم گو نوجوان تھا۔ ثروت میری محبت اور منگیتر تھی۔ ہم اپنی شادی کا انتظار گھڑیاں گن گن کر کر رہے تھے۔ لیکن پھر ایک طوفان آیا۔ سیٹھ سراج کے اوباش بیٹے واجد عرف واجی نے ایک چھوٹی سی بات سے مشتعل ہو کر ثروت کو اغوا کر لیا۔ ثروت بخیریت گھر واپس تو آ گئی لیکن اس کے ماتھے پر ایک ایسا داغ لگ گیا جس نے نہ صرف اس کے والدین کی جان لی بلکہ اسے اور اس کے گھر والوں کو خاموشی سے ملک چھوڑنے پر بھی مجبور کر دیا۔ میں جدائی کی آگ میں تڑپ تڑپ گیا۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ ثروت کہاں ہے۔ اسی دوران میں اپنے گھر کے قریب سیٹھ سراج اور اس کے غنڈوں سے میرا سامنا ہو گیا اور انہوں نے درجنوں لوگوں کے سامنے مجھے بری طرح زدوکوب کیا۔ میری حساس طبع کے لیے یہ سب کچھ نہایت جان کن تھا۔ میں خودکشی کا سوچنے لگا لیکن پھر میری ملاقات ایک خوش باش ہمہ صفت شخص عمران دانش سے ہوئی۔ عمران ایک انوکھا کردار تھا۔ اس نے پتا چلایا کہ ثروت کو اغوا کرنے والے واجی کا باپ سیٹھ سراج نوادرات کی اسمگلنگ میں ملوث ہے۔ میرا اور ثروت کا بدلہ چکانے کے لیے عمران ہاتھ دھو کر سیٹھ سراج کے پیچھے پڑ گیا۔ جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ سیٹھ سراج لال کوٹھیوں میں رہنے والی ایک دبنگ عورت میڈم صفورا کے لیے کام کرتا ہے۔ یہ لوگ ٹیکسلا، ہڑپہ وغیرہ سے نوادرات حاصل کرتے تھے۔

میڈم صنوبرا کی چھوٹی بہن نادیہ بڑی بے باک لڑکی تھی۔ وہ عمران پر بری طرح فریفتہ ہوگئی۔ عمران سرکس کا ایک مقبول فن کار بھی تھا۔ وہ سرکس میں اپنے شوق کی خاطر کچھ نہایت خطرناک کھیل بھی کھیلتا تھا۔ اس نے یہ جان لیوا کھیل مجھے بھی دکھائے۔ وہ میرے اندر بھی زندگی کی امنگ ترنگ اور جوش پیدا کرنے کا خواہاں تھا۔ اسی دوران میں عمران اور اس کے دوست اقبال نے ایک مجید منصور نامی غنڈے کا سراغ لگایا۔ مجید منصور کو پکڑنے کے بعد عمران نے اس سے سوال جواب کیے تو پتا چلا کہ وہ بھی میڈم صنوبرا کے لیے کام کرتا ہے۔ ایک ایڈووکیٹ ابرار صدیقی سے بھی اس کا دوستانہ تھا۔ ابرار صدیقی کے پاس مہاتما بدھ کا کوئی نادر مجسمہ تھا جسے میڈم صنوبرا ہر صورت خریدنا چاہتی تھی مگر صدیقی بیچنے کو تیار نہیں تھا۔ کچھ اور نامعلوم لوگ بھی اس مجسمے کے پیچھے تھے۔ مجید منصور نامی شخص کی ہلاکت پر... جنگ کی بنا پر میڈم صنوبرا نے عمران کو اغوا کرالیا۔ میں اور اقبال بھی میڈم کی دسترس میں چلے گئے۔ وہاں عمران نے اپنی خوش بیانی سے صنوبرا کو قائل کرلیا کہ وہ اس کا مطلوب مجسمہ ابرار صدیقی کی تحویل سے نکال لائے گا۔ اس نے واقعی یہ کام انتہائی خوش اسلوبی سے کیا کہ میڈم اش اش کر اٹھی۔ تاہم میڈم کی چھوٹی بہن نادیہ بدستور عمران کے پیچھے تھی اور اسے حاصل کرنے کے لیے ہر ہتھکنڈا آزما رہی تھی۔ عمران کی توجہ اپنی گرل فرینڈ شاہینہ کی طرف تھی جس کی وجہ سے رقابت پروان چڑھ رہی تھی۔ نادیہ نے عمران کی سرد مہری کا انتقام لینے کے لیے ہمارے ایک دوست سلیم کو بے دردی سے مار دیا۔ سلیم کی دردناک موت کا بدلہ عمران نے سرکس کے ایک کھیل کے دوران میں حیران کن طریقے سے لیا۔ اس نے نادیہ کو اس طرح سے گولی ماری کہ درجنوں تماشائیوں میں سے کسی کو شک تک نہیں ہوسکا۔ نادیہ شدید زخمی ہوگئی۔ میری بے وقوفی اور کم ہمتی کی وجہ سے نادیہ کے زخمی ہونے کا پول کھل گیا۔ عمران نے مجھے ان افراد کی گرفت سے چھڑایا۔ میں نے عمران کو بتایا کہ مجھ سے کتنی بڑی غلطی ہوچکی ہے۔ میں نے عمران کو پہلی بار تھوڑا پریشان دیکھا۔ وہ سمجھ گیا کہ میڈم صنوبرا بہن کا انتقام لینے کے لیے شعلہ جوالا بن جائے گی۔ اور یہی ہوا۔ میڈم کے ہرکاروں سیٹھ سراج اور شیرے وغیرہ نے میرا اور عمران کا پیچھا کیا۔ اس خوفناک تعاقب کے نتیجے میں عمران کے سینے پر رائفل کا پورا برسٹ لگا اور وہ ایک ڈیک نالے کے تاریک پانیوں میں اوجھل ہوگیا۔ میں جانتا تھا کہ میڈم صنوبرا اب میری ماں، بہن اور بھائی کے لیے خطرہ بنے گی۔ میں انہیں بچانے کے لیے ڈیفنس کی ایک کوٹھی میں پہنچا۔ کچھ ہی دیر بعد میڈم صنوبرا کے لوگ دندناتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ میں نے اپنی بہن فرح اور بھائی عاطف کو تو موقع سے بھگا دیا، خود والدہ کے ساتھ وہاں سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ پکڑا گیا۔ سفاک سیٹھ سراج اور شیرے نے میری والدہ کو مجبور کردیا کہ وہ موت کو گلے لگائیں۔ ماں کی المناک موت نے میرے ہوش و حواس چھین لیے۔ میں ماں کے جسد خاکی تک پہنچنے کے لیے چلاتا ہوا سیڑھیاں اتر رہا تھا کہ گر گیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک اجنبی جگہ پایا۔ میرے دماغ میں عجیب دھند بھری تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں ایک طویل عرصے بعد ہوش میں آیا ہوں۔ میں والدہ کو پکارتا ہوا ایک گھنے جنگل میں بھٹکتا رہا۔ یہاں مجھے ایک راجپوت لڑکی سلطانہ ملی۔ اس نے مجھے یہ بتا کر حیران کیا کہ وہ میری بیوی ہے۔ بارش سے بچنے کے لیے ہم ایک کھوہ میں چلے گئے۔ سلطانہ کا تعاقب کرتا ہوا ایک ہارون نامی شخص کھوہ میں پہنچا اور سلطانہ کی کلہاڑی سے زخمی ہوکر بے ہوش ہوگیا۔ میں نے سلطانہ کے ساتھ مل کر اس شخص کو باندھ دیا۔ ہم اس کھوہ سے نکل گئے۔ راستے میں باشو نام کا ایک گونگا شخص بھی ایک شیر خوار بچے سمیت ہم سے مل گیا۔ سلطانہ نے مجھے بتایا کہ یہ میرا اور اس کا بچہ ہے۔ پھر مجھ پر یہ حیرت ناک انکشاف ہوا کہ میں پاکستان میں نہیں بلکہ انڈیا میں اتر پردیش کی ایک دور دراز ریاست میں ہوں اور آج مجھے [illegible] کے بعد ہوش میں آیا ہوں۔ سب کچھ میرے لیے ناقابل یقین تھا۔ حیرت کی شدت سے میرا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ سلطانہ مجھے ایک مسلمان بزرگ عبدالحق صاحب کے پاس لے آئی۔ ہم ان کے گھر میں پناہ گزیں ہوئے۔ مجھے پتا چلا کہ اس جگہ کو بھانڈیل اسٹیٹ کہا جاتا ہے۔ یہاں دو بڑی آبادیاں ہیں زرگاں اور ڈل پالی۔ زرگاں میں حکم جی کا اختیار چلتا ہے۔ حکم جی ایک عیاش اور بے انصاف شخص ہے۔ سلطانہ اس کی دستبرد سے بچنے کے لیے اسٹیٹ کی دوسری بڑی آبادی ڈل پالی میں آگئی ہے۔ یہاں حکم جی کا چھوٹا بھائی کار مختار تھا۔ اسے چھوٹے سرکار کہا جاتا تھا لیکن یہاں مجھ سے ایک غلطی ہوئی۔ میں نے چھوٹے سرکار کے اہل کاروں کے سامنے سلطانہ کو اپنی بیوی ماننے سے انکار کردیا۔ سلطانہ کو پناہ ملنے کا امکان معدوم ہوگیا۔ چھوٹے سرکار کے اہل کار اسے پکڑ کر اپنے ساتھ لے گئے۔ مجھے عبدالحق کے ایک ساتھی ڈاکٹر چوہان نے بتایا کہ سر کی چوٹ کے سبب میری یادداشت بری طرح متاثر ہے۔ میں پچھلے دو برس کی باتیں بالکل بھولا ہوا ہوں۔ ابھی میں اور چوہان باتیں کر ہی رہے تھے کہ جنگل کی طرف سے کسی جانور کی آواز آئی۔ یہ آواز دراصل چھوٹے سرکار کے چھوٹے بھائی کنور یا ہو کے باغی کی تھی جو بستی میں گھس آیا تھا۔ اور اس نے ایک نوجوان کو زخمی کردیا تھا۔ بعد میں چھوٹے سرکار نے اپنے بھائی کو مروادیا۔ بہرحال مجھے چھوٹے سرکار کی عدالت میں پیش کیا گیا اور بعد ازاں مجھے اور سلطانہ کو حکم جی کے لوگوں کے حوالے کردیا گیا۔ میں نے راستے میں بھاگنے کی کوشش کی مگر حیرت انگیز طور پر پکڑا گیا۔ زرگاں میں مجھے گوڈا پہنچایا گیا جبکہ سلطانہ کو بھی الگ کردیا گیا۔ یہاں میری میڈم صنوبرا سے ملاقات ہوئی۔ پھر مجھے گوڈا سے نکال کر جارج کی رہائش گاہ پہنچا دیا گیا۔ وہاں مجھ سے اصطبل میں کام لیا جانے لگا۔ ایک روز مجھے جارج کی رہائشی عمارت میں موجود لفٹ نما کمرے میں بند کردیا گیا اور مجھے کرنٹ لگایا گیا۔ یہ منظر ایک کھڑکی کے ذریعے سلطانہ نے بھی دیکھا۔ پھر جارج نے مجھے [illegible] کی پیشکش کی اور مجھے بہت سے مواقع [illegible] مگر میں اپنی کم ہمتی کی وجہ سے کچھ نہ کرسکا۔ سلطانہ نے جارج کے آگے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ اس نے مجھے وہاں سے بھیج دیا اور خود وہیں رک گئی۔ میرا یہ سوچ کر برا حال ہونے لگا۔ میں بہت رویا اور پھر عمران کے کہے ہوئے الفاظ یاد آئے۔ میں مارو یا مرجاؤ کا عہد کرتے ہوئے اٹھا اور باہر نکل کھڑا ہوا۔ میں نے دو گارڈز کو زخمی کیا۔ دو کتوں کو ہلاک کر ڈالا۔ میرے سینے میں آتش آگ تھی۔ ہاتھ میں رائفل تھی۔ میں تابڑ توڑ بے پروا باہر کھڑی گھوڑا گاڑی کی طرف بڑھا اور ہر طرف خطرے کے مخصوص الارم بجنا شروع ہوگئے تھے۔ میں وہاں سے بھاگ نکلا۔ گھڑ سوار میرے تعاقب میں تھے اور میں جنگل میں بھٹکتا رہا۔ رات میں نے ایک درخت پر گزاری۔ دوسرے دن صبح اچانک میرا تعاقب کرنے والے آ پہنچے۔ یہ چار افراد تھے۔ میں نے اچانک فائرنگ کردی۔ دو افراد فرار ہوگئے جبکہ دو موت کے گھاٹ اتر گئے۔ میں انہی افراد کے ایک گھوڑے پر وہاں سے روانہ ہوگیا۔ مگر مجھے پھر اپنے تعاقب میں کچھ لوگ نظر آئے۔ پھر میں بھاگتے بھاگتے ایک غار میں پہنچ گیا۔ وہاں مجھے چوہان اور دیگر لوگ مل گئے جو وہاں چھپے ہوئے تھے۔ انہوں نے جارج گورا کے خلاف بغاوت کردی تھی۔ سلطانہ بھی یہیں تھی۔ اس کی حالت خراب تھی۔ میں وہاں کے تین افراد کے ساتھ خاموشی سے جارج کو قتل کرنے کے ارادے سے نکل پڑا مگر جارج نے اپنا راستہ بدل دیا۔ اس کے

بجائے حکم جی کے اہلکاروں سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ وہاں فائرنگ ہوئی اور ہمارا ایک ساتھی اور حکم جی کے اہلکار مارے گئے۔ پھر ہم نے جارج کی سوتیلی بہن ماریا کو اغوا کرلیا جو ایک شادی میں شرکت کے لیے اپنی حویلی کے پاس آئی ہوئی تھی۔ ہم ماریا کو لے کر وہاں سے نکلے۔ ہم نے ایک نہر کے پاس پہنچ کر کشتی میں سفر کیا۔ اس کشتی میں ہمیں ایک عجیب الخلقت آدمی ملا جس کا ایک ہاتھ اور ٹانگ کٹی ہوئی تھی اور وہ نشے میں تھا۔ اس کی حالت خراب تھی۔ ہم اسے بھی اپنے ساتھ لے آئے۔ ہمارا ساتھی اسحاق ماریا کو مار کر اپنا بدلہ لینا چاہتا تھا مگر ہم لوگوں نے سمجھا بجھا کر اسے اس عمل سے روکا۔ ہم واپس غار میں پہنچ گئے جہاں ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ماریا کو جہاں باندھ کر رکھا گیا تھا، وہ وہاں سے غائب تھی۔ پھر اچانک فائر ہوا اور فیروز لڑکھڑا کر گرا۔ کوئی تاریکی میں سے نکل کر بھاگا۔ وہ ماریا تھی۔ میرے سینے میں چنگاریاں سی بھر گئیں۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمایئے

میں اس کے پیچھے لپکا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اس کے ہاتھ میں کوئی بڑا ہتھیار نہیں۔ شاید پستول یا ماؤزر ہے۔ وہ پلٹ کر مجھ پر گولی چلا سکتی تھی لیکن میں ہر خطرے سے بے نیاز تھا۔ ابھی میں اس سے دس پندرہ قدم دور تھا کہ وہ حسب اندیشہ پلٹی۔ اس نے فائر کیا لیکن نشانہ چوک گیا۔ اسی دوران میں وہ کسی شے سے ٹکرا کر گرتی۔ میں نے اس پر چھلانگ لگائی اور اسے چھاپ لیا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا جو ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ وہ پوری طرح میرے بوجھ کے نیچے دب گئی۔ انور خاں اور احمد وغیرہ بھی بھاگتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ ان کے عقب میں ڈاکٹر چوہان تھا۔ اس کے ہاتھ میں بڑے سائز کی ٹارچ تھی۔

ماریا کو بے بس کردیا گیا۔ وہ بری طرح ہانپ رہی تھی اور ہمیں تحکمانہ انداز میں نتائج کی دھمکیاں دے رہی تھی۔ "باسٹرڈ! تم کو پتا نہیں کہ تم کیا کر رہا ہے۔ تم کو بہت برا نتیجہ بھگتنا پڑیں گا۔ تم لائف اور ڈیتھ کے درمیان لٹک جائے گا...."

اسحاق نے اسے چند تھپڑ مارے تو اس کا ہیجان قدرے کم ہوا اور اس نے رونا شروع کردیا۔ اس کے ایک پاؤں میں زنجیر بدستور موجود تھی اور جب وہ بھاگ رہی تھی تو وہ اس کے ساتھ ہی گھسٹ رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بھاگتے ہوئے لنگڑا رہی تھی۔

اسحاق اور احمد اسے تقریباً گھسیٹتے ہوئے واپس مرکزی جگہ پر لائے۔ فیروز دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی بائیں ٹانگ ران پر سے دبا رکھی تھی۔ گولی ران میں لگی تھی اور خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ اپنے دوست کی یہ حالت دیکھ کر اسحاق کا غصہ سوا ہوگیا۔ وہ گالیاں دیتا ہوا ماریا پر پل پڑا۔ اس نے اسے نیچے گرادیا۔ اس کے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ اس کا بالائی جسم بالکل عریاں ہوگیا۔ وہ چلا رہی تھی اور "ہیلپ ہیلپ" پکار رہی تھی۔ اسحاق اپنی ہیجانی کیفیت میں شاید اسے بالکل ہی برہنہ کرڈالتا لیکن میں اور ڈاکٹر چوہان آڑے آئے۔ میں نے اسحاق کو تقریباً گھسیٹ کر ماریا سے پیچھے ہٹایا۔ چوہان نے اسے جسم ڈھانپنے کے لیے چادر دی۔

میں نے کہا۔ "اسحاق! اگر ہم بھی ایسا ہی کریں گے تو پھر ان میں اور ہم میں فرق کیا رہ جائے گا؟"

وہ غضب ناک لہجے میں بولا۔ "آنکھ کا بدلہ آنکھ، کان کا بدلہ کان ہے۔ یہ سفید ناگن کسی رعایت کی حق دار نہیں ہے۔ اس کا سر تمہیں کچل دینا چاہیے۔"

"دیکھو، تم یہ بھول رہے ہو کہ ہم اس سے کیا فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں، ہم اسے زندہ رکھ کر جارج کو کہیں زیادہ تکلیف دے سکتے ہیں۔"

میں نے اسحاق کو بمشکل سنبھالا۔ اس سلسلے میں انور خاں اور احمد نے بھی میری مدد کی۔ ہم اسحاق کو ماریا سے دور لے گئے۔ چوہان زخمی فیروز کو دیکھنے میں مصروف تھا۔

اسحاق ذرا ٹھنڈا ہوا تو ہم ماریا کی طرف متوجہ ہوئے۔ سب سے پہلے اس کے لیے لباس کا انتظام کیا گیا۔ زنانہ لباس ملنا تو یہاں مشکل تھا، مجبوراً مردانہ لباس سے ہی کام چلایا گیا۔ پاجامے کرتے پر مشتمل یہ لباس اس سامان میں موجود تھا جو چوہان اپنے ساتھ لایا تھا۔ ماریا چونکہ لمبی تڑنگی تھی، یہ لباس اس کے جسم پر پورا آگیا۔ ہم نے بڑی احتیاط سے اس کے ہاتھ پاؤں دوبارہ باندھ دیے۔

ہاتھ پاؤں تو پہلے بھی باندھے گئے تھے لیکن ماریا نے بڑی ہوشیاری دکھائی تھی۔ اس کے ہاتھ ساڑی کے کپڑے سے باندھے گئے تھے۔ ماریا نے موم بتی کے شعلے سے اس کپڑے ....کو جلایا تھا اور ہاتھ آزاد کرلیے تھے۔ اس کوشش میں اس کی کلائیوں پر چند زخم بھی آئے تھے۔ بعدازاں اس نے پاؤں کی زنجیر ایک طرف سے کھول لی تھی۔ دراصل اس زنجیر کو لاک کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا اور اسے رسی کی طرح دو گرہیں دینے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ گرہیں ماریا نے کھول لیں۔ چھوٹے سائز کا پستول حیرت انگیز طور پر ماریا کے پاس پہلے سے ہی موجود تھا۔ یہ لیڈی پستول اس کے لباس میں ہی چھپا ہوا تھا۔ جب ہم نے ماریا کو پکڑا تھا تو اس خیال سے اس کی تلاشی نہیں لی تھی کہ وہ منگنی میں ایک تقریب میں شرکت

www.pkdigest.com

کے لیے آئی ہوئی تھی۔ وہاں اسلحے کا کیا کام تھا۔ ویسے بھی اس کے عورت ہونے کی وجہ سے ہم نے جامہ تلاشی لینا ضروری نہیں سمجھا تھا مگر اب پتا چل رہا تھا کہ یہ غلطی تھی۔ شکر کا مقام تھا کہ اسحاق نے راستے میں ماریا سے کسی طرح کی رعایت نہیں کی تھی اور اس کے ہاتھ پشت پر باندھے رکھے تھے، ورنہ کئی موقعے ایسے آئے تھے جب وہ بہ آسانی ہمیں اپنے اس ننھے منے لیکن طاقتور پسٹل سے شوٹ کرسکتی تھی۔

اب ہماری سمجھ میں یہ بات آگئی تھی کہ یہ لڑکی ہماری توقع سے زیادہ خطرناک ہے۔ احمد نے زنجیر کے لیے ایک چھوٹے سے تالے کا انتظام کرلیا۔ اس کے علاوہ طے ہوا کہ ہم اس لڑکی کو ہر وقت اپنی نگاہوں کے سامنے رکھیں گے۔

چوہان نے بڑی مہارت سے ایک تیز دھار خنجر سے نشتر کا کام لیا۔ فیروز نے بھی بہت برداشت اور حوصلے کا ثبوت دیا۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر اس کی ران میں سے پسٹل کی گولی نکال لی گئی۔ کچھ اینٹی سیپٹک دوائیں چوہان کے چھوٹے سے بیگ میں ہر وقت موجود رہتی تھیں۔ ان کی مدد سے فیروز کی مرہم پٹی کردی گئی۔

احمد نے کہا۔ ''فیروز بھائی! آپ کے بچنے سے دہری مسرت ہورہی ہے۔ آپ بچ گئے اور آپ کی قیمتی گواہی بھی بچ گئی۔''

''اسی لیے کہتا ہوں کہ اس گواہی سے جتنی جلدی فائدہ اٹھا سکتے ہو اٹھالو۔ اگر کوئی انتظام ہوجاوے تو میں ابھی چھوٹے سرکار کے پاس چلنے کو تیار ہوں۔''

''خیر، اب ایسی جلدی بھی نہیں۔ رات ہولینے دو۔ اندھیرا ہوتے ہی نکل چلیں گے۔'' چوہان نے کہا۔

''اور اگر اندھیرا ہونے سے پہلے میرے ساتھ کچھ اور ہوگیا تو؟'' فیروز نے کہا۔

''میں سمجھ رہا ہوں۔'' چوہان نے اثبات میں سر ہلا کر فیروز کو تعریفی نظروں سے دیکھا۔ ''تمھیں اپنی جان کی نہیں اپنی گواہی کی فکر ہے۔ گھبراؤ مت۔ تمہاری جان اور گواہی دونوں اب سلامت رہیں گی۔''

''میں موہن کمار کو پھانسی کے تختے پر دیکھنا چاہتا ہوں۔ ہارون کے قتل میں سب سے بڑا مجرم وہی بدذات ہے۔ اس نے بے رحمی کی انتہا کی ہے۔ ہارون حکم جی کا وفادار تھا۔ ان کے لیے درجنوں بار اپنا جیون خطرے میں ڈال چکا تھا۔ اس کی قربانیوں کا موہن کمار کی طرف سے یہ صلہ ملا۔ جب وہ زخمی تھا، مرہم اور دوا کے لیے ترس رہا تھا اور اس کھوہ میں اپنے کسی ساتھی کا انتظار کر رہا تھا، موہن کمار نے اپنا راستہ سیدھا کرنے کے لیے اسے بے دردی سے قتل کردیا۔ اور یہ قاتل موہن کمار اب بھی حکم جی کی ناک کا بال ہے۔ اگر ہارون کے ساتھ یہ سب کچھ ہوسکتا ہے تو حکم جی کے کسی وفادار کا جیون محفوظ نا ہیں ہے...'' فیروز بولتا چلا جارہا تھا۔ اس کے سینے میں جیسے آگ بھڑک رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اب اسے اپنی گواہی کی اہمیت کا احساس ہوا ہے اور وہ جلد از جلد یہ گواہی چھوٹے سرکار کے کانوں تک پہنچا دینا چاہتا ہے۔ میرا اپنا دل بھی یہی کہہ رہا تھا کہ اگر یہ اہم گواہی چھوٹے سرکار تک پہنچ گئی تو وہ ضرور اسے متاثر کرے گی۔ وہ ایک انصاف پسند شخص تھا اور یہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ عدالت میں اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ اس کا بے لاگ رویہ مجھے یاد تھا...

سرنگ کے ایک نیم تاریک گوشے میں اسحاق اور انور خاں میں کسی بات پر بحث ہورہی تھی۔ گاہے بہ گاہے ان کی آواز قدرے بلند بھی ہوجاتی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس بحث میں میرا نام بھی بار بار آرہا ہے۔ کچھ دیر بعد فیروز اور چوہان بھی اس بحث میں شریک ہوگئے۔ اس خیال سے کہ الفاظ مجھ تک نہ پہنچیں، ان چاروں نے اپنی آوازوں کو دبا رکھا تھا۔ صرف اسحاق ہی تھا جو کسی وقت بھڑک کر بولتا تھا اور اس کے الفاظ مجھے سنائی دے جاتے تھے۔ اس نے فیروز کی کسی بات کے جواب میں تیز لہجے میں کہا۔ ''ہم کو چاہیے کہ سچ کو سچ مان لیں اور اس کے ساتھ یہ بھی مان لیں کہ اس وجہ سے ہم سب خطرے میں ہیں۔''

جواب میں چوہان نے کچھ کہا۔ اسحاق کی بھڑکیلی آواز پھر سنائی دی۔ ''آپ پڑھے لکھے لوگ ہو۔ ظاہر ہے آپ نے پڑھے لکھوں والی بات ہی کرنی ہے مگر جو کچھ سامنے نظر آرہا ہے اس کو ہم کیسے جھٹلاویں گے اور اگر جھٹلاویں گے تو اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی چلاویں گے...''

کچھ دیر تک یہ تکرار جاری رہی، اسی دوران میں عجیب الخلقت شخص اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی اکلوتی ٹانگ گھٹنے پر سے موڑ کر زنجیر میں باندھ دی گئی تھی اس لیے وہ کھڑا نہیں ہوسکتا تھا۔ اس نے سرنگ کی ناہموار دیوار سے ٹیک لگالی اور سوئی ہوئی نظروں سے ہماری طرف دیکھنے لگا۔ اس کے انداز میں عجیب سی لاتعلقی اور ناراضی تھی۔ اس کے بازو پر انمٹ روشنائی سے لکھا ہوا نام ہمارے لیے اب بھی ناقابل فہم تھا۔ یہ بارڈے یا باردوے پڑھا جاتا تھا۔ اس کے آگے انگریزی کی

کا حرف جی یا پھر جے لکھا ہوا تھا۔

وہ انگریزی میں بولا۔ ''مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟ مجھے میرے گھر سے کیوں نکالا ہے؟ مجھے واپس لے جاؤ۔ میں کہیں اور مرنا نہیں چاہتا۔ مجھے واپس لے جاؤ۔''

چوہان بولا۔ ''ہم تمھیں کسی گھر سے نہیں لائے، کشتی میں سے لائے ہیں۔ تم اس بدبودار کشتی کو اپنا گھر کہہ رہے ہو؟''

''ہاں، وہی میرا گھر ہے۔ مجھے وہاں لے جاؤ...'' وہ کراہا پھر بری طرح کھانسنے لگا۔ کھانستے کھانستے بولا۔ ''میرا گلا بالکل خشک ہوگیا ہے۔ مجھے تھوڑی سی شراب دو۔'' اس کی آواز گلے میں اٹک رہی تھی۔

چوہان نے احمد کو اشارہ کیا۔ وہ ایک گلاس میں پانی لے آیا۔ عجیب الخلقت شخص نے ایک گھونٹ بھرا پھر کلی کردی اور گلاس ایک طرف جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''یہ کیا بدبودار چیز لے آئے ہو۔ مجھے شراب دو... میری سانس رک رہی ہے۔ جلدی کرو۔''

مجھے یاد آیا کہ کشتی میں جہاں ہم نے اس شخص کو پایا تھا، وہاں پر ''رم'' کی بہت سی بوتلیں بکھری ہوئی تھیں۔ لگتا تھا کہ یہ شخص شراب کا زبردست رسیا ہے۔ [illegible] اب اس کی بگڑی حالت [illegible] تھی۔ یہاں شراب موجود نہیں تھی۔ یہاں پناہ لینے والے تقریباً سب ہی مسلمان تھے اور اس لت سے دور تھے۔ چند منٹ کے اندر ہی اس شخص کی بری حالت ہوگئی۔ اس کا مدقوق جسم لرزنے لگا اور سانس جیسے اس کی پسلیوں بھرے سینے میں اٹکنے لگی۔ وہ بار بار بس ایک ہی بات کہہ رہا تھا۔ ''میں اپنے گھر واپس جانا چاہتا ہوں۔ میں کہیں اور مرنا نہیں چاہتا۔''

چوہان کے متعدد بار پوچھنے کے بعد اس نے فقط اتنا بتایا کہ اس کا نام باروندا ہے اور وہ طویل عرصے سے اس مچھلیاں پکڑنے والی کشتی کے اندر رہ رہا ہے۔ اس رہائش کے لیے اور شراب، خوراک وغیرہ کے لیے اس نے ادھیڑ عمر ملاح سیوک رام کو معقول معاوضہ دیا ہوا ہے۔ وہ غصیلے لہجے میں بولا۔ ''میں جانتا ہوں کہ اس حرامی سیوک نے مجھ سے دھوکا کیا ہے۔ اس نے مجھے کشتی سے نکالنے کے لیے یہ سارا ڈھونگ رچایا ہے۔ تم سارے کرائے کے ٹٹو ہو۔ تم نے اس حرامی سیوک سے پیسے لیے ہیں...''

اس کے منہ میں جو آرہا تھا، وہ بول رہا تھا اور بار بار اٹھنے کی کوشش کرتا تھا۔ یہ کوشش اس کی بندھی ہوئی ٹانگ کی وجہ سے ناکام ہوجاتی تھی۔

وہ اپنی ''گھر بدری'' کے لیے ملاح سیوک رام کو مورد الزام ٹھہرا رہا تھا۔ وہ جانتا نہیں تھا کہ سیوک رام تو خود گن پوائنٹ پر رہا ہے اور اسے اپنی تمام کشتیوں سے ہاتھ دھونے پڑے ہیں۔ انور خاں ابھی تک اس باروندا نامی شخص کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ اسے پہچاننے کی کوشش کررہا ہے۔ انور خاں انگریزی نہیں جانتا تھا۔ اس نے چوہان کے توسط سے باروندا سے چند سوال پوچھے تاہم ان سے بھی کوئی نتیجہ اخذ نہیں ہوا۔ انور خاں نے فیروز سے مخاطب ہوکر بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔ ''مجھے شک ہے کہ ڈیڑھ دو سال پہلے میں نے اس بندے کو درگاں میں کہیں دیکھا ہے۔ شاید راج بھون میں ہی دیکھا ہے۔ کوئی خاص موقع تھا شاید۔ ہوسکتا ہے کہ ساتویں کے جشن کا ہی ہلا گلا ہو۔''

باروندا نامی اس شخص کا شور شرابا جب زیادہ بڑھ گیا تو ڈاکٹر چوہان نے سلطانہ کی طرح اسے بھی معقول مقدار میں افیون کھلا دی اور لمبا لیٹنے پر مجبور کردیا۔ باروندا کو زبردستی افیون کی خوراک دینے کے لیے ڈاکٹر چوہان، اسحاق اور انور خاں کو کافی زور آزمائی کرنا پڑی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ شخص ننگی

کچھ یادیں......کچھ باتیں
سسپنس کے صفحات پر قارئین کے لیے ایک خوبصورت تحفہ
''معراج رسول صاحب''
سے ایک خوشگوار ملاقات کا احوال
آپ سب کے بے حد اصرار پر
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
کے بانی کی دلچسپ اور ہمہ گیر گفتگو
پر مشتمل انٹرویو اگلے ماہ ملاحظہ کریں

www.pkdigest.com

زمین پر پڑا خراٹے لے رہا تھا۔ زور آزمائی کی وجہ سے اس کا لنگوٹ عریانی کی حد تک کھسک گیا تھا۔ ڈاکٹر چوہان نے یہ لنگوٹ پوری طرح کھول کر دوبارہ سے اس کے مدقوق جسم پر باندھ دیا۔

باروندا والا یہ ہنگامہ ختم ہوا تو توجہ پھر اس بحث و مباحثے کی طرف چلی گئی جو کچھ دیر پہلے انور خان اور اسحاق کی گفتگو سے شروع ہوا تھا۔ چوہان کے چہرے پر گہری سنجیدگی نظر آرہی تھی۔ وہ مجھے ایک طرف لے گیا۔ ہم سرنگ کی اسی حجرہ نما جگہ پر جا بیٹھے جہاں تین دن پہلے فیروز اور اس کے دونوں ساتھیوں نے جارج گورا کو جان سے مار دینے کا منصوبہ ترتیب دیا تھا۔ کسی بھی طرح کی اہم گفتگو کے لیے یہ بڑی محفوظ جگہ تھی۔ یہاں چھوٹی سی لالٹین روشن تھی اور زمین پر چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ اس چٹائی پر سیل کی ہلکی سی بو تھی۔

ہم آمنے سامنے بیٹھ گئے تو میں نے چوہان سے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ میرے بارے میں کوئی خاص بات چیت ہوئی ہے۔''

''کچھ ایسا ہی ہے۔'' چوہان نے کہا۔

''شاید اسحاق نے مجھ پر کچھ اعتراضات کیے ہیں؟''

چوہان نے میری سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ایک بات بتاؤ میرو تو... میرا مطلب ہے تابش! اس بارے میں تمہارا اپنا کیا خیال ہے؟ میری بات سمجھ رہے ہو نا تم؟ یہ جو حکم جی کے لوگ سائے کی طرح تمہارے پیچھے رہتے ہیں اور تم کسی جگہ بھی ان سے محفوظ نہیں ہو... اس کے پیچھے کیا وجہ ہے؟''

کچھ دیر پہلے ہونے والی بحث کے موضوع کے بارے میں میرا اندیشہ درست نکلا تھا۔ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ڈاکٹر چوہان! کیا میں یہ سمجھوں کہ اب تمہارے ذہن میں بھی جادو ٹونے والی باتیں آنا شروع ہو گئی ہیں؟''

''نہیں تابش! میں چاہوں بھی تو اس انداز سے نہیں سوچ سکتا۔ لیکن... کچھ لوگ ایسا سوچ رہے ہیں اور اپنی جگہ شاید وہ بھی ٹھیک ہیں۔ اب تک جو کچھ ہوتا آیا ہے اس کی وجہ سے اچھے بھلے بندے کا ذہن چکرا سکتا ہے۔ پھر جن لوگوں کے ذہنوں نے ایسی باتوں کو پہلے سے قبول کر رکھا ہو، وہ تو اور زیادہ متاثر ہو سکتے ہیں۔ اب اس اسحاق ہی کو لو۔ یہ بندہ پہلے سے تعویذ گنڈے اور عملیات وغیرہ پر وشواس رکھتا ہے۔ اب جب یہ تمہارے بارے میں سوچتا ہے تو اس کے دل میں عجیب سے اندیشے پیدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک اندیشہ یہ بھی ہے کہ تمہاری وجہ سے ہم یہاں اس سرنگ میں بھی محفوظ نہیں ہیں۔ حکم جی کے ہرکارے کسی بھی وقت تمہارا سراغ لگاتے ہوئے یہاں پہنچ جائیں گے۔''

''میں نے تو پہلے ہی یہ کہا تھا کہ مجھے یہاں سے جانے دیں۔ آپ سب لوگوں نے مجھے زبردستی روکا تھا۔''

''ہم اب بھی تمہیں زبردستی روکیں گے۔ یہ بات دل سے نکال دو کہ میں تمہیں یہاں سے جانے دوں گا... لیکن بات یہ ہے تابش کہ ہمیں حقیقت کی تہ تک پہنچنا چاہیے۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو تم؟''

چوہان خالی خالی نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ اس کا ذہن جیسے کسی دور دراز کے سفر پر روانہ تھا۔ چھوٹی لالٹین کی مدھم روشنی اس حجرہ نما جگہ کو نیم روشن کر رہی تھی۔ کچھ فاصلے پر فیروز اور احمد وغیرہ باتوں میں مصروف تھے۔ ان کی آواز اس شاخ در شاخ سرنگ میں ہولے ہولے گونج رہی تھی۔ اس سرنگ سے باہر دھیرے دھیرے شام اتر رہی تھی اور شام کی سیاہی میں سے تھوڑا تھوڑا حصہ سرنگ کو بھی ملنا شروع ہو گیا تھا۔

چوہان نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ ''کیا تم دو منٹ کے لیے اپنی قمیص اتار دو گے؟''

''کیا دیکھنا چاہتے ہو؟''

''کچھ نہیں، تم قمیص تو اتارو۔'' چوہان لالٹین کو میرے بالکل پاس لاتے ہوئے بولا۔

میں نے قمیص اتار دی۔ وہ اپنا چہرہ میرے سینے کے بالکل نزدیک لے آیا اور بہت غور سے کچھ دیکھنے لگا۔ وہ میری جلد پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ بڑے دھیان سے وہاں کچھ تلاش کر رہا تھا... پھر اس نے پنڈلیوں پر سے میرے پاجامے کو اونچا کیا اور گھٹنوں سے اوپر تک معائنہ شروع کر دیا۔

''کچھ مجھے بھی بتاؤ۔'' آخر میں نے زچ ہو کر کہا۔

وہ ذرا پیچھے ہٹ گیا اور دیوار سے ٹیک لگا کر بولا۔ ''تابش! مجھے کئی دنوں سے ایک شک ہے۔ حکم جی اور جارج جیسے لوگوں سے کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ ان لوگوں نے تمہارے جسم کے اندر کچھ چھپا دیا ہو، جس کی وجہ سے انہیں ہر جگہ تمہاری موجودگی کا پتا چل جاتا ہو۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''تمہیں پتا ہی ہو گا، جدید ٹیکنالوجی آج کل کیا کیا کرشمے دکھا رہی ہے۔ جنگلی اور سمندری حیات پر ریسرچ کرنے والے لوگ جانوروں کے جسم میں چھوٹی چھوٹی چپس رکھ دیتے ہیں۔ یہ چپس سیٹلائٹ کو سگنلز دیتی ہیں اور ان سگنلز کے ذریعے جانوروں کو گھنے جنگل اور گہرے سمندر میں بھی دوبارہ کھوج لیا جاتا ہے۔''

میرے پورے جسم میں سنسناہٹ کی لہریں دوڑ گئیں۔ چوہان نے ایک انوکھا نکتہ بیان کیا تھا۔ میں نے اس سے پہلے اس انداز میں سوچا ہی نہیں تھا۔ میں نے حیرت کے سمندر میں غوطے کھاتے ہوئے سوچا... تو کیا واقعی میں اپنے جسم میں کوئی ''CHIP'' لیے پھر رہا ہوں جو حکم جی کے اہل کاروں کو میری لوکیشن کی خبر دیتی رہتی ہے؟

چوہان بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ چپ چھوٹے سے آپریشن کے ذریعے جانور کے جسم میں رکھی جاتی ہے یا پھر اسے ایک ایسا کالر پہنا دیا جاتا ہے جس میں چپ موجود ہوتی ہے۔ عین ممکن ہے کہ حکم جی اور جارج وغیرہ یہ طریقہ ان قیدیوں پر استعمال کرتے ہوں جنہیں وہ ہر صورت اس اسٹیٹ کی حدود میں رکھنا چاہتے ہیں۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا تم؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''میں نے سنا ہے کہ ماریا کا شوہر سرجن ہے اور جارج کا گہرا دوست بھی ہے۔'' اپنے لہجے میں حیرت کی لہر خود مجھے بھی محسوس ہو رہی تھی۔

''ہاں، میرا اپنا ذہن بھی اسی رخ پر سوچ رہا ہے۔'' چوہان نے فوراً کہا۔ ''یہ بات عین ممکن ہے کہ قیدیوں کے اندر چپ رکھی جاتی ہو اور یہ کام ماریا کا شوہر [illegible] انجام دیتا ہو۔ میں نے اس سے پہلے بھی اندازہ لگایا ہے کہ یہ لوگ یہاں اسٹیٹ میں بڑی رازداری سے مختلف کاموں کے لیے جدید ٹیکنالوجی استعمال کرتے ہیں۔ یہ کام جارج اور اس کے دو چار ساتھیوں کے ذمے ہے لیکن مقامی لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لیے اور ان کی توہم پرستی سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایسے کاموں کا سہرا حکم جی کے سر باندھ دیا جاتا ہے۔ مقامی لوگ چونکہ حکم جی کو روحانی پیشوا بھی مانتے ہیں اس لیے انہیں فوراً وشواس ہو جاتا ہے کہ فلاں کام حکم جی نے اپنی اندرونی شکتی کی مدد سے کیا ہے۔ مثال کے طور پر یہ قیدیوں والا معاملہ ہی دیکھ لو۔ یہاں کے سادہ لوح لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ ان قیدیوں کو جادو کے ذریعے ''کیل'' دیا گیا ہے اور وہ یہاں سے نکل نہیں سکتے۔''

میں نے پہلی بار اپنے جسم کو تشکیکی نظروں سے دیکھا۔ اگر واقعی میرے اندر کوئی ''چپ'' وغیرہ رکھی گئی تھی تو پھر اس کا کوئی نشان ہونا چاہیے تھا اور اگر یہ چپ گہرائی میں نہیں تھی، بالائی جلد کے نیچے تھی تو پھر ٹٹولنے سے اسے محسوس بھی کیا جا سکتا تھا۔ میں چکر میں پڑ گیا۔

چوہان بولا۔ ''ایسا کرتے ہیں کہ میں تھوڑی دیر کے لیے باہر چلا جاتا ہوں۔ وہاں موڑ پر کھڑا ہو کر میں یہ دھیان رکھوں گا کہ کوئی اس طرف نہ آنے پائے۔ تم اپنے سارے کپڑے اتار لو اور بڑے دھیان سے دیکھو کہ کہیں کوئی کٹ وغیرہ کا نشان تو نہیں۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ چوہان اٹھ کر باہر چلا گیا۔ میں نے خود کو بے لباس کیا اور جہاں جہاں تک میری نگاہ جاتی تھی، خوب اچھی طرح اپنی جلد کا جائزہ لیا۔ جسم کو ٹٹول کر اور دبا کر بھی کسی چیز کی موجودگی کا اندازہ لگانے کی کوشش کی لیکن کچھ حاصل نہیں ہوا۔ جسم پر جو چند ایک زخم مندمل ہو چکے تھے، ان کے نیچے بھی کچھ چھپایا جا سکتا تھا... لیکن اگر ایسا ہوتا تو پھر ٹٹولنے اور دبانے سے کچھ نہ کچھ محسوس ہونا لازمی تھا۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد چوہان واپس آگیا۔ وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کٹ کا نشان تو کہیں نہیں۔ نہ ہی کہیں کوئی اسٹیچنگ وغیرہ ہے۔''

میں نے پاجامہ پہن لیا تھا لیکن بالائی جسم ابھی تک عریاں تھا۔ وہ باریک بینی سے ایک بار پھر میری کمر اور کندھوں وغیرہ کا معائنہ کرنے لگا۔ یہ بات بالکل سامنے کی تھی۔ اگر چوہان کی تھیوری درست ہے اور میرے جسم میں واقعی کوئی چیز رکھی گئی ہے تو پھر جسم پر سرجری کا نشان ہونا چاہیے تھا۔ دو ڈھائی سال میں تو اس طرح کا نشان معدوم نہیں ہو سکتا۔

شام سے ذرا پہلے جب میں چٹائی پر لیٹا تھا اور اسی معاملے پر غور کر رہا تھا، اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ جسم میں ایک جگہ ایسی بھی ہوتی ہے جہاں سرجری کے نشان چھپ سکتے ہیں۔ اگر سر میں کسی جگہ کٹ لگایا جائے یا اسٹیچنگ کی جائے تو بعد ازاں بال اسے مکمل طور پر ڈھانپ لیتے ہیں۔ یہ خیال ذہن میں آتے ہی میں نے اپنے سر کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔

''کیا بات ہے، سر درد کر رہا ہے؟'' میرے قریب لیٹے چوہان نے پوچھا۔

''نہیں، میں ایک شک نکالنا چاہتا ہوں۔ ذرا میرے ساتھ آؤ۔'' میں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں پھر اسی حجرے کی طرف چل دیے۔ عجیب الخلقت باروندا ایک طرف پڑا سو رہا تھا۔ ماریا سر گھٹنوں میں دیے بیٹھی تھی۔ اس کے پاؤں زنجیر میں لپٹے ہوئے تھے۔ ہم قریب سے گزرے تو اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن ہم سنی ان سنی کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ میں اپنے ساتھ ایک ٹارچ

www.pkdigest.com

لے آیا تھا۔ حجرہ نما جگہ پر پہنچ کر میں نے ٹارچ چوہان کے ہاتھ میں تھمائی اور اس سے کہا کہ وہ میرے سر کا معائنہ کرے۔

چوہان نے ٹارچ کی تیز روشنی میں میرے سر کو دیکھنا شروع کیا۔ جب وہ گدی کی طرف آیا تو اس کی انگلیاں ایک دم ٹھٹک گئیں۔ گدی پر نیچے کی طرف جہاں سے سر کے بال شروع ہوتے ہیں، اسے کچھ نظر آیا تھا۔ ''اوہ گاڈ!'' اس نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ''یہاں کچھ ہے۔ ایک، دو، تین... ہاں، تین ٹانکے ہیں۔''

اس نے سر کے پیچھے اس نرم جگہ کو چند بار زور سے دبایا اور پھر لرزتے لہجے میں بولا۔ ''میرا خیال ہے تابش... ہم نے ڈھونڈ لیا ہے۔ یہاں گوشت کے نیچے کچھ ہے... کیا تمہیں محسوس ہو رہا ہے؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر گدی کے پُرگوشت حصے پر رکھا اور میری انگلیوں کی پوروں کو کچھ محسوس کرانے کی کوشش کی۔ میں فوری طور پر تو کوئی اندازہ نہیں لگا سکا لیکن اتنا احساس ضرور ہوا کہ یہاں کچھ ہے۔

ٹارچ کی روشنی میں چار پانچ منٹ کے بغور معائنے کے بعد چوہان نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''ہمارا اندازہ درست نکلا ہے تابش! یہاں کچھ نہ کچھ موجود ہے۔ یہ چیز تھوڑی سی گہرائی میں پلانٹ کی گئی ہے اور اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ...'' وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

''چپ کیوں ہو گئے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ''اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ اسے آسانی سے نکالا نہ جا سکے۔''

آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کے لہجے میں اندیشے جھلک دکھانے لگے۔ اس جھلک نے مجھے بھی متاثر کیا۔ واقعی اگر کوئی شے یہاں موجود تھی اور ہم اسے آسانی سے نکال بھی نہیں سکتے تھے تو پھر مسئلہ گمبھیر تھا۔

''اب کیا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''کچھ کہا نہیں جا سکتا۔'' چوہان کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔ ''اگر یہ چیز یہاں تمہارے جسم کے اندر موجود ہے تو پھر... ہم یہاں محفوظ نہیں ہیں۔ حکم جی کے اہل کار اس چپ کے سگنل پکڑ کر کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتے ہیں۔''

ایک دم میرے ذہن میں ایک نیا خیال آیا، میں نے کہا۔ ''ایک بات غور کرنے کی ہے ڈاکٹر چوہان... میں اس سرنگ میں کئی راتیں گزار چکا ہوں اور اب تک کا یہ سارا وقت بخیریت ہی گزرا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس زمین دوز سرنگ میں میرا پتا چلانا مشکل ہو۔ میرا مطلب ہے کہ اگر میرے جسم میں واقعی کوئی چپ موجود ہے تو پھر زیرزمین اس کے سگنل کمزور بھی تو پڑ سکتے ہیں یا ویسے ہی ختم ہو سکتے ہیں۔''

چوہان کی آنکھیں چمک اٹھیں، وہ بولا۔ ''تم نے سچ کی بات کی ہے۔ یہ جگہ جہاں ہم بیٹھے ہیں، زمین کی سطح سے کم از کم سو فٹ نیچے ہے۔ اور شاید... یہی وجہ ہے کہ یہاں تمہارا کھوج نہیں لگایا جا سکا۔''

اس نے ایک بار پھر ٹارچ پکڑی اور مزید توجہ کے ساتھ میری گردن کے پچھلے حصے کا معائنہ کرنے میں مصروف ہو گیا۔ تین چار منٹ کے بعد اس کی لرزتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''ننانوے فیصد امکان اس بات کا ہے کہ ہم معاملے کی تہ تک پہنچ گئے ہیں۔ یہاں تمہارے اندر کوئی سگنل دینے والا ڈیوائس رکھا گیا ہے اور یہ ایک چپ ہی ہے۔''

''کیا ہم کسی طرح اسے نکال سکتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''تمہارا یہ سوال غور طلب ہے۔ چھوٹا موٹا آپریشن تو میں خود کر سکتا ہوں لیکن اگر یہ چیز زیادہ گہرائی میں ہے اور ریڑھ کی ہڈی کو چھو رہی ہے تو پھر مشکلات ہو سکتی ہیں۔''

''میرا تو خیال ہے کہ تم ابھی کوشش کرو۔'' میں نے کہا۔

''نہیں، اتنی جلدی نہیں۔ اور ویسے بھی اتنی جلدی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بات تو تقریباً طے ہے کہ اس سرنگ میں تم محفوظ ہو۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو حکم جی کے کارندے بہت پہلے یہاں ہلا بول چکے ہوتے۔''

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی فیروز بھی لنگڑاتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ اس کے چہرے سے پریشانی ہویدا تھی۔ اس نے کہا۔ ''اسحاق اب احمد اور انور بھائی کو بھی اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ تابش کی وجہ سے ہم سب مشکل میں پڑ جائیں گے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر تابش کو چھوٹے سرکار نے قل پانی میں پناہ دے دی ہے تو پھر اسے فوراً وہاں چلے جانا چاہیے۔''

چوہان نے کہا۔ ''یہاں کچھ نئی باتیں سامنے آئی ہیں فیروز! اور یہ بات بھی سمجھ میں آ گئی ہے کہ اس سرنگ میں ہم تابش کے ساتھ بھی بالکل محفوظ ہیں۔''

''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟'' فیروز نے پوچھا۔

جواب میں چوہان نے فیروز کو سب کچھ بتا دیا۔ میرے جسم کے اندر کسی چپ کے بارے میں جان کر فیروز ششدر رہ گیا۔ پہلے تو اسے اس بات پر یقین نہیں آیا لیکن جب ساری تفصیل اس کے سامنے آئی تو وہ ہماری باتوں کو اہمیت دینے پر آمادہ ہو گیا...

وہ لرزاں آواز میں بولا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ وہ باقی قیدی بھی جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ حکم جی کے سحر کے اثر میں ہیں، در اصل اسی طرح سے جکڑے گئے ہیں؟''

''اس میں شبے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔'' چوہان نے کہا۔ ''ان قیدیوں میں سے کوئی اگر فرار ہونے کی کوشش کرتا ہے تو سگنل پکڑنے والے آلے کے ذریعے اس کا پیچھا کیا جاتا ہے اور وہ جہاں کہیں بھی ہو، دھر لیا جاتا ہے۔ تابش کے ساتھ بھی بالکل ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔ یہ جب بھی زرگاں کی حدود سے نکلا ہے، فوراً اس کا پیچھا کیا گیا ہے اور یہ جہاں کہیں بھی گیا ہے اس کو گھیر لیا گیا ہے۔''

''ایک بات اور بھی سمجھ میں آ رہی ہے۔'' فیروز نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ ''کسی بھاگنے والے کو جب بھی پکڑا جاتا تھا، پکڑنے والے تیواری لال اور ڈیوڈ ہی ہوتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کو اس کام کی خاص طور پر تربیت دی گئی ہو۔ ڈیوڈ تو جارج گورا کا قریبی ساتھی ہے اور بہت ہنرمند بھی سمجھا جاتا ہے۔''

''بالکل ایسا ہو سکتا ہے۔'' چوہان نے تائید کی۔ ''عین ممکن ہے کہ ان لوگوں کے پاس سگنل ریسیو کرنے والا ڈیوائس اور انٹینا وغیرہ موجود ہو۔ اس کی مدد سے وہ کسی بھی جگہ پر اپنے شکار کو ڈھونڈ لیتے ہوں۔''

''لیکن یہ یاد رہے [illegible] لوگ ان باتوں پر [illegible] کریں گے؟ جیسے یہ اسحاق ہے۔ اس کو پورا یقین ہے کہ حکم جی جادو ٹونے اور عملیات کا ماہر ہے۔ وہ ایسے کام کر سکتا ہے جو عام لوگ نہیں کر سکتے۔ اس کے دل میں عجیب طرح کا خوف بیٹھا ہوا ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ ہم آسانی سے اس خوف کو نکال سکیں گے۔''

''سچ کی اپنی ایک طاقت ہوتی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ خود کو منوا لیتا ہے۔ اگر ہم کوشش کریں گے اور حکم جی کی سازشوں کے مناسب ثبوت دیں گے تو لوگ بھی حقیقت کو تسلیم کرنا شروع کر دیں گے۔'' چوہان نے وثوق سے کہا۔

ابھی ہماری گفتگو جاری تھی کہ سرنگ کے دہانے کی طرف کھٹ پٹ سنائی دی۔ پھر گھنٹیاں سی بجنا شروع ہو گئیں۔ ہم نے اپنی رائفلیں سنبھالیں اور دہانے کی طرف لپکے۔ خطرے کا احساس میرے دل کو طوفانی رفتار سے دھڑکا دیا کرتا تھا لیکن آج کل ایسا نہیں ہو رہا تھا۔ آج کل اس طوفانی دھڑکن کے بجائے سنسنی کی ایک لہر سی سراپا میں دوڑتی تھی اور دل میں مرنے یا مار دینے کی امنگ پیدا ہوتی تھی... ہاں، موسم بدل چکے تھے۔ حبس اور گھٹن کی ایک طویل مدت نے بالآخر دل و دماغ کو ایک آشوب سے آشنا کر دیا تھا۔

ہم تقریباً دوڑتے ہوئے دہانے پر پہنچے۔ یہاں چند بکریاں نظر آئیں۔ وہ جیسے زبردستی اس قدرتی سرنگ میں گھس آئی تھیں۔ سانولے رنگ کا ایک ادھیڑ عمر چرواہا انہیں واپس لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ تیرہ چودہ سال کا ایک لڑکا بھی تھا۔ بکریوں کے گلے میں بندھی ہوئی پیتل کی گھنٹیوں کی آواز پوری سرنگ میں گونج رہی تھی۔

چرواہے کو دیکھ کر چوہان ٹھٹک گیا اور بولا۔ ''میں اسے جانتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ یہ اتفاق سے یہاں نہیں آیا۔ یہ کوئی چکر ہے۔''

احمد دہانے کی نگرانی پر موجود تھا۔ وہ چرواہے سے الجھ رہا تھا۔ چوہان تیزی سے ان دونوں کے پاس پہنچا۔ ادھیڑ عمر چرواہے نے چوہان کو دیکھا۔ یوں لگا کہ وہ بھی اسے پہچانتا ہے لیکن اس نے کچھ ظاہر نہیں کیا۔ چوہان اور چرواہے میں چند جملوں کا تبادلہ ہوا۔ پھر وہ دونوں ایک گوشے میں چلے گئے۔ کم عمر لڑکا بکریوں کو سمیٹ کر دہانے کے قریب ہی کھڑا ہو گیا۔ شکل سے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ چرواہے کا بیٹا ہے۔ دونوں کا لباس دھوتی، کرتے اور پگڑی پر مشتمل تھا۔

چوہان اور چرواہے کے درمیان پانچ دس منٹ بات ہوئی پھر چوہان چرواہے کو لے کر ہمارے پاس آ گیا۔ چرواہے نے [illegible] سے ایک کھردری سی [illegible] رکھی تھی۔

چوہان نے مستی آمیز لہجے میں چرواہے کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''اس کا نام نریندر سنگھ ہے۔ یہ در اصل چھوٹے سرکار کے مصاحب خاص مراد شاہ صاحب کی طرف سے ایک خاص پیغام لے کر آیا ہے۔'' پھر چوہان نے اس چرواہے نریندر سنگھ سے کہا کہ وہ اپنی زبان سے سب کچھ بتائے۔

نریندر سنگھ کا رنگ سانولا تھا۔ اس نے سرمہ لگا رکھا تھا۔ اس کی مہندی لگی داڑھی دھول مٹی سے اٹی ہوئی تھی۔ اس نے ایک ایسی مقامی زبان میں بولنا شروع کیا جس کے بہت کم الفاظ میری سمجھ میں آ رہے تھے۔ بہرحال فیروز، اسحاق اور انور خاں وغیرہ اس کی بات خوب اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ اس گفتگو کے دوران میں انہوں نے دو چار سوال بھی نریندر سے کیے۔ آخر میں فیروز نے مجھے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ''مراد شاہ صاحب اور چھوٹے سرکار کو معلوم ہو چکا ہے کہ ہم جارج کی بہن ماریا کو اٹھا کر یہاں سرنگ میں لے آئے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ ہمارا یہ فعل کافی سخت ہے اور ہم اس کی مذمت کرنے پر مجبور ہیں... لیکن وقت اور موقع محل کے لحاظ سے یہ فعل ٹھیک بھی ہے کیونکہ ماریا کی وجہ سے کسی حد

www.pkdigest.com

تک جارج وغیرہ کو لگام ڈالی جا سکتی ہے۔ چھوٹے سرکار اور مراد شاہ صاحب کا کہنا یہ ہے کہ ہم ماریا کو اپنے پاس رکھیں اور اس کے ذریعے جارج وغیرہ سے کچھ باتیں منوانے کی کوشش کریں۔ لیکن ہماری یہ کارروائی اس طرح ہونی چاہیے کہ یہ ہمارا اپنا ہی کام نظر آوے... اور اس کا الزام عمل پاتی والوں پر بالکل دھرا نہ جا سکے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نا ہیں کہ ہم اس کام میں بے آسرا ہو دیں گے۔ ہمیں اندر خانے چھوٹے سرکار کی حمایت و ہمدردی حاصل رہے گی اور جس طرح ہو سکا، وہ ہماری مدد بھی کریں گے۔''

یہ بڑی غیر متوقع صورتِ حال تھی۔ بہرطور اس سے چھوٹے سرکار کی فہم و فراست بھی سامنے آ رہی تھی۔ وہ اپنے بڑے بھائی سے کھلم کھلا ٹکر لیے بغیر اس کی ناانصافی و من مانی کا زور توڑنا چاہ رہا تھا۔

چوہان نے کہا۔ ''لگتا ہے کہ چھوٹے سرکار حکم جی کی چالبازیوں کا مقابلہ حکمتِ عملی سے کرنا چاہ رہے ہیں اور اب بھی ان کی خواہش ہے کہ کھلم کھلا تصادم سے بچا جائے۔ انہوں نے کہا ہے ممکن ہے کہ کسی وقت انہیں ہمارے خلاف سخت رویہ اختیار کرنا پڑے لیکن اگر ایسا ہوا تو یہ صرف دکھاوے کے لیے ہوگا اور ہمیں اس سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''اس کا کیا مطلب ہے؟'' احمد نے پوچھا۔ ''کیا چھوٹے سرکار بھی ماریا کو چھڑوانے کے لیے ہم پر کسی طرح کا دباؤ ڈالیں گے؟''

''ہاں، کوئی اس قسم کی صورتِ حال ہو بھی سکتی ہے۔'' چوہان نے کہا۔

چرواہے نریندر نے رازداری کے انداز میں دائیں بائیں دیکھا پھر اپنے کندھے سے لگی ہوئی گٹھڑی ہمارے سامنے رکھ دی۔ اس نے گٹھڑی کی گرہ کھولی۔ گٹھڑی کے اوپر جامن کے پتے، چوکر اور گڑ وغیرہ کی چھوٹی چھوٹی پوٹلیاں تھیں۔ ان پوٹلیوں کے نیچے دو تین بڑی خاص چیزیں تھی۔ ایک فوجی طرز کی طاقتور دوربین تھی۔ ایک اسنائپر گن تھی جس کو کھول کر تین چار ٹکڑوں میں رکھا گیا تھا۔ اس پر بھی چھوٹی ٹیلی اسکوپ لگی ہوئی تھی۔ ایک چھوٹا سا لکڑی کا بکس تھا۔ اس میں مرہم پٹی کا سامان تھا۔ کچھ اینٹی بیتھک اور دیسی دوائیں بھی بکس میں موجود تھیں۔

نریندر سنگھ نے مقامی زبان میں چوہان سے کچھ کہا۔ چوہان نے اس کا ترجمہ کرتے ہوئے مجھے بتایا۔ ''نریندر بتا رہا ہے کہ چھوٹے سرکار اور مراد شاہ صاحب یہ چاہتے ہیں کہ ہم اب ماریا کے اغوا کو راز میں نہ رکھیں اور اس کی ذمے داری قبول کریں۔''

''اس کی وجہ؟'' میں نے پوچھا۔

''وجہ وہی ہے جو ہمارے ذہن میں بھی آئی تھی۔ زرگاں میں حکم جی نے سلطانہ کے والد اور بیمار بھائی کو پکڑ لیا ہے۔ وہ اس وقت جارج کی جیل میں ہیں۔ ان کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی زرگاں کے مختلف علاقوں سے پچاس ساٹھ لوگ پکڑے گئے ہیں۔ ان پر جارج کے گھر کے سامنے مظاہرہ کرنے، گولی چلانے اور توڑ پھوڑ مچانے کا الزام ہے۔ یہ سب کے سب مسلمان ہیں۔ ان میں انور خاں کے تین چار رشتے دار بھی شامل ہیں۔ اگر ہم ان سب لوگوں کی جان بچانا چاہتے ہیں تو اس کا طریقہ ایک ہی ہے۔ ہم اعلان کر دیں کہ ماریا ہمارے پاس ہے اور اس کی زندگی تب ہی محفوظ رہ سکتی ہے جب حراست میں لیے گئے لوگوں کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔''

''تو اس کا مطلب ہے کہ ہمیں حکم جی تک یہ پیغام پہنچانا ہوگا کہ لڑکی ہمارے پاس ہے اور اس کا کوئی ثبوت بھی دینا ہوگا؟'' احمد نے کہا۔

''بالکل، اب یہ ضروری ہو گیا ہے۔'' انور خاں نے گفتگو میں حصہ لیا۔

''پیغام کس طرح پہنچایا جائے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کے لیے کوئی بندہ ڈھونڈنا ہوگا جو پیغام رسانی کر سکے اور اس کی جان کو بھی کوئی خطرہ نہ ہو۔'' انور خاں نے کہا۔

''کیا ہم اپنے اس ٹھکانے کو اب بھی خفیہ رکھیں گے؟'' اسحاق نے پوچھا۔

''ہمیں ایسا کرنا تو چاہیے لیکن میرے خیال میں اب ہم کر نہیں سکیں گے۔'' چوہان بولا۔ ''جب پیغام رسانی شروع ہو گی تو پھر اس ٹھکانے کو چھپایا نہیں جا سکے گا۔ ویسے بھی چھوٹے سرکار اور مراد صاحب کی طرف سے اطلاع ہے کہ حکم جی کے کارندے اس سرنگ کے آس پاس پہنچ چکے ہیں اور چپے چپے پر ہماری تلاش ہو رہی ہے۔ وہ لوگ کسی بھی وقت سرنگ کا کھوج لگا سکتے ہیں۔''

نریندر سنگھ اب جلدی جانے کی فکر میں تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ یہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک بارشی جھیل ڈوئل کے کنارے پر رہتا ہے اور اسی علاقے میں بھیڑ بکریاں چراتا ہے۔ اس نے کہا کہ اسے جیسے جیسے موقع ملے گا، وہ چھوٹے سرکار کا پیغام ان تک پہنچانے کی کوشش کرے گا۔

وہ کافی تناؤ بھری اور پُرجوش رات تھی۔ ماریا کی صورت میں ہمارے پاس ایک ایسا تُرپ کا پتا آیا تھا جس سے ہم حکم جی جیسے شخص کے سینے چھلنی کر سکتے تھے۔ چھوٹے سرکار اور مراد صاحب نے برملا ہمیں یقین دلایا تھا کہ زرگاں والے ماریا کی جان کا خطرہ کسی بھی صورت مول نہیں لیں گے۔ اب اسحاق کو بھی احساس ہو رہا تھا کہ اگر وہ ماریا کو مار ڈالتا تو یہ کتنا بڑا نقصان ہوتا۔ آدھی شب کے وقت لالٹینوں کی مدھم روشنی میں ہم ساتھیوں کے درمیان پھر طویل گفتگو ہوئی۔ اس میں آئندہ کا لائحہ عمل تیار کیا گیا۔ سب سے اہم سوال یہ تھا کہ حکم جی تک یہ پیغام کس طرح پہنچایا جائے کہ ماریا ہمارے پاس ہے اور اس کے بدلے میں ہمارے مطالبے یہ ہیں۔ احمد نے اس سلسلے میں اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ کام میں کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ حکم جی اور جارج مجھے کوئی نقصان نا ہیں پہنچائیں گے۔ میرے پیچھے میری برادری کا ہاتھ ہے اور سب جانتے ہیں کہ حکم جی کے سپاہیوں میں میری برادری کے لوگن خاص عہدوں پر ہیں۔''

''لیکن ہم چاہتے ہیں کہ اس پیغام رسانی کے لیے کوئی غیر جانب دار بندہ استعمال کیا جائے اور تم غیر جانب دار نہیں ہو۔'' چوہان نے کہا۔

''اس جنگل میں آپ کو ایسا غیر جانب دار کون ملے گا جو اچھی طرح سے ہمارا پیغام بھی پہنچا سکے؟''

اس سے پہلے کہ احمد اور چوہان میں تکرار شروع ہو جاتی، انور خاں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''پیغام بر چننے سے زیادہ ضروری یہ بات ہے کہ پہلے ہم اپنا مورچا مضبوط کر لیں۔ ہمارے پاس اتنا انتظام ہونا چاہیے کہ ہم اس لڑکی کے ساتھ آٹھ دس یا پندرہ بیس روز بھی اس سرنگ میں گزار سکیں۔''

''ہمارے پاس پانی اور خشک لکڑیوں کی کمی ہے۔ باقی چیزیں تو گزارے لائق موجود ہیں۔'' چوہان نے بتایا۔

''ٹھیک ہے۔ پانی اور لکڑی کا انتظام کیا جائے اور اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ ہم دہانے کا اچھی طرح جائزہ لیں اور اس جگہ کو ایک اچھے مورچے کی شکل دے دیں۔'' انور خاں نے کہا۔

کسی کو انور خاں کی بات سے اختلاف نہیں تھا۔ اگلے دو تین گھنٹے اسی انتظام و انصرام میں گزارے گئے۔ کچھ برتنوں اور چند بڑے شاپرز میں کچھ پانی جمع کیا گیا۔ اس کے علاوہ سرنگ کے دہانے پر اندر کی طرف لکڑی کے چند بڑے تختے رکھ کر ایک محفوظ آڑ بنائی گئی۔ اس آڑ میں کم از کم تین رائفل بردار پوزیشن لے سکتے تھے۔ یہاں سے نشیب میں بھی کافی آگے تک نگاہ رکھی جا سکتی تھی۔ اس سے پیچھے قریباً پچاس قدم کے فاصلے پر ایک اور مورچا بنایا گیا۔ ہنگامی حالت میں اسے دوسری دفاعی لائن کے طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا۔ دوربین کے بہتر استعمال کے لیے دہانے سے باہر ایک آڑ تلاش کر لی گئی۔ اس مورچا بندی میں انور خاں نے اہم کردار ادا کیا۔ لڑائی بھڑائی کے معاملات میں اس کا تجربہ کافی وسیع لگتا تھا۔

رات آخری پہر ہم نے کچھ دیر کے لیے آرام کیا۔ ہم اپنے ساز و سامان سمیت اب دہانے کے قریب ہی قیام پذیر ہو گئے تھے۔ میں، چوہان اور اسحاق سرنگ کی گہرائی میں تھے۔ میرے گہرائی میں رہنے کی وجہ وہی چپ والا معاملہ تھا۔ میری آنکھ ایک شور کی وجہ سے کھلی۔ یہ شور دہانے کی طرف سے سنائی دے رہا تھا۔ گھوڑوں کی ٹاپیں تھیں اور گھڑ سواروں کی بلند آوازیں تھیں۔ لگتا تھا کہ وہ دہانے سے باہر چاروں طرف چکرا رہے ہیں۔ انور خاں دہانے کی طرف سے بھاگتا ہوا ہماری طرف آیا۔ اس نے آتے ساتھ ہی لالٹین بجھا دی اور ہیجانی لہجے میں بولا۔ ''یہ حکم جی کے لوگ ہی ہیں۔ میں نے آوازوں سے پہچان لیا ہے۔ ان کی تعداد چالیس پچاس سے کم نہیں ہے۔ یہ سب مسلح ہیں اور ان کے پاس بڑی ٹارچیں ہیں۔ نریندر سنگھ نے ٹھیک ہی کہا تھا، یہ لوگ جنگل کا چپا چپا چھان رہے ہیں۔''

اسحاق بھڑک کر بولا۔ ''میں نے جو بات کہی تھی وہ آپ لوگن کی سمجھ میں نا ہیں آئی تھی... اب آپ نے دیکھ لیا نا کہ یہ لوگن یہاں پہنچ گئے ہیں۔''

''تم نے غلط کہا تھا اسحاق... اور تم اب بھی غلط کہہ رہے ہو۔'' چوہان نے پُرزور لہجے میں کہا۔ ''ان لوگوں کے یہاں پہنچنے کا تابش سے کوئی تعلق نہیں۔ خود کو خوامخواہ واہموں کا شکار نہ کرو۔ حکم جی کے کارندوں کی ٹولیاں ہر جگہ بھٹک رہی ہیں اس لیے یہاں بھی پہنچ گئی ہیں۔''

اسحاق نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر منہ بنا کر رہ گیا۔

دس پندرہ منٹ اسی طرح شدید تناؤ میں گزر گئے۔ حکم جی کے کارندے اس سرنگ کے دہانے تک نہیں پہنچ سکے لیکن وہ یہاں سے گئے بھی نہیں۔ وہ اس علاقے کے بارے میں اپنی پوری تسلی کر رہے تھے۔ آخر گھوڑوں کی بکھری ٹاپیں اور گھڑ سواروں کی آوازیں ایک جگہ جمع ہوئیں۔ آثار سے اندازہ ہوا کہ وہ لوگ اب آگے روانہ ہو رہے ہیں۔ کچھ

www.pkdigest.com

ہی دیر بعد وہ وہاں سے چل پڑے۔ گھوڑوں کی ٹاپیں دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگیں۔ چوہان نے سوالیہ انداز میں اسحاق کی طرف دیکھا۔ جیسے خاموشی کی زبان میں اس سے پوچھ رہا ہو... اب کیا خیال ہے؟ حکم جی کے جادو کا زور ان گھڑسواروں کو سرنگ کے اندر کیوں نہیں لایا؟

ظاہر ہے کہ اگر چوہان یہ سوال پوچھتا بھی تو اسحاق کے پاس اس کا جواب موجود نہیں تھا... انور خاں نے تیز لہجے میں کہا۔ ''اب ہم کو فیصلہ کرنا ہے۔ ہم ان کو اپنے بارے میں بتانا چاہتے ہیں یا نہیں؟''

سب خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ یہ نازک فیصلہ تھا۔ خود کو عافیت سے نکال کر شدید خطرے میں ڈالنے والی بات تھی لیکن اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا... بلکہ ہم اس حوالے سے پیغام بر بھیجنے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ جب تک ہم اپنے پاس ماریا کی موجودگی کا اعلان نہ کرتے حکم جی اور جارج سے کوئی مطالبہ کیسے منوا سکتے تھے؟ انور خاں بولا۔ ''لگتا ہے کہ تم سب کے لیے یہ فیصلہ کافی مشکل ثابت ہو رہا ہے۔ چلو اگر تم چاہتے ہو تو سب کی طرف سے میں ہی فیصلہ کیے دیتا ہوں۔''

اس کے ساتھ ہی انور خاں نے اپنی رائفل کا رخ دور دہانے کی طرف کیا اور اوپر تلے تین چار فائر کر دیے۔ رات کے سناٹے میں دھماکوں کی آواز جنگل میں دور تک گونجی۔ اس بات میں شبے کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی کہ یہ آواز گھڑسواروں کے جتھے تک بھی پہنچی ہو گی۔ ''چلو، اب اپنی اپنی پوزیشن سنبھالو۔'' انور خاں نے پکار کر کہا۔

ہم سب دہانے کی طرف دوڑے اور اپنی اپنی طے شدہ جگہ پر بیٹھ گئے۔ فیروز چونکہ زخمی تھا اس لیے وہ اپنی رائفل کے ساتھ ماریا اور بارومدا کے قریب موجود رہا۔ ماریا کے ہاتھ پاؤں بدستور بندھے ہوئے تھے اور وہ کسی شکار کیے ہوئے پرندے کی طرح پگی زمین پر پڑی تھی۔ پچھلے بیالیس گھنٹوں میں وہ اپنی تمام شان و شوکت، نفاست اور نخوت سمیت عرش سے فرش پر آ گئی تھی۔ اس کے دمکتے چہرے پر کیچڑ سوکھ کر سفیدی مائل ہو چکا تھا اور اس کے نازک پاؤں زخم زخم تھے۔ وہ یہ پاؤں ہلاتی بھی تھی تو سسک اٹھتی تھی۔ احمد نے اس کے نیچے چٹائی بچھانا چاہی تھی مگر اسحاق نے سختی سے منع کر دیا تھا۔ وہ جارج کی اس خودسر بہن کو تھوڑی سی رعایت یا عزت دینے کو بھی تیار نہیں تھا۔

ہم دہانے پر پہنچے اور رائفلیں سونت کر تیار ہو گئے۔ ہمارے اندازے کے عین مطابق گھڑسوار رک گئے تھے اور اب واپس آ رہے تھے۔ جلد ہی ان کے گھوڑوں کی ہنہناہٹ اور ان کی اپنی آوازیں ہمارے کانوں تک پہنچنے لگیں۔ ''کون ہے یہاں... کون ہے؟'' ایک کرخت دار آواز گونجی۔

مجھے پہچاننے میں دشواری نہیں ہوئی۔ یہ موہن کمار ہی کی آواز تھی۔ وہ لوگ سرنگ کے اردگرد گھوم رہے تھے لیکن ابھی تک دہانہ ڈھونڈنے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے۔ انور خاں نے دلیرانہ قدم اٹھاتے ہوئے اپنی ٹارچ روشن کی اور اس کی روشنی دہانے کی طرف پھینکی۔ اب موہن کمار اور اس کے گھڑسواروں کے لیے دہانے کا کھوج لگانا مشکل نہیں رہا۔ وہ چاروں طرف سے سمٹ کر یوں دہانے کی طرف آئے جیسے مقناطیس کی طرف لوہا چون آتا ہے۔ ان گنت ٹارچیں سرنگ کے دہانے کے اردگرد چمکنے لگیں۔

موہن کمار گرجا۔ ''کون ہو تم لوگ؟''

انور خاں نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ''کہنے کو تو ہم تمہارے باپ ہوتے ہیں لیکن لوگ ہمیں شہنشاہ کہتے ہیں۔''

تاریکی میں سے موہن کمار کی آواز ابھری۔ ''اگر میں غلطی نہ ہیں کر رہا تو تم انور خاں ہو۔ میں یہاں اس کھوہ میں تمہاری آواز سن کر حیران ہوں۔''

''ابھی تمہیں اور حیران ہونا ہے موہن کمار... اتنی حیرت داخل ہونے والی ہے تمہارے دماغ کے اندر کہ تمہاری حیرت دانی ایک دم چوڑی ہو جائے گی اور ہو سکتا ہے کہ پھٹ بھی جائے۔'' انور خاں ہر قسم کے تناؤ سے بالکل آزاد نظر آتا تھا۔ وہ دہانے پر اندر کی طرف لکڑی کے تنوں کے عقب میں کھڑا تھا جبکہ موہن کمار دہانے کے سامنے بیس تیس میٹر کی دوری پر تھا۔

''تم سامنے آؤ انور خاں اور مجھے بتاؤ کہ تمہارے ساتھ اور کون کون ہے؟''

''میرے ساتھ بڑے خاص لوگ ہیں موہن کمار... وہ سامنے آئیں گے تو تمہاری سٹی گم ہو جائے گی۔''

''پہیلیاں نہ بجھواؤ انور خاں۔ تم جانتا ہیں ہو کہ تم لوگن کے لیے حالات کتنے سنگین ہو چکے ہیں۔ تم نے غداری کی ہے، جس تھالی میں کھایا ہے اسی میں چھید کیا ہے۔ وہاں زرگاں میں جارج صاحب کی کوٹھی پر جو کچھ ہوا ہے، اس کے سب سے بڑے ذمے دار تم ہو... لیکن... لیکن... اگر تم خود کو قانون کے حوالے کر دو... تو اب بھی تم سے رعایت ہو سکت ہے۔ حکم جی اب بھی تمہارے ساتھ نرمی کا معاملہ کر سکت ہیں۔''

''نرمی کا معاملہ تو تمہارے حکم جی کو کرنا ہی پڑے گا اور رعایتیں بھی دینی پڑیں گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اب تمہارے

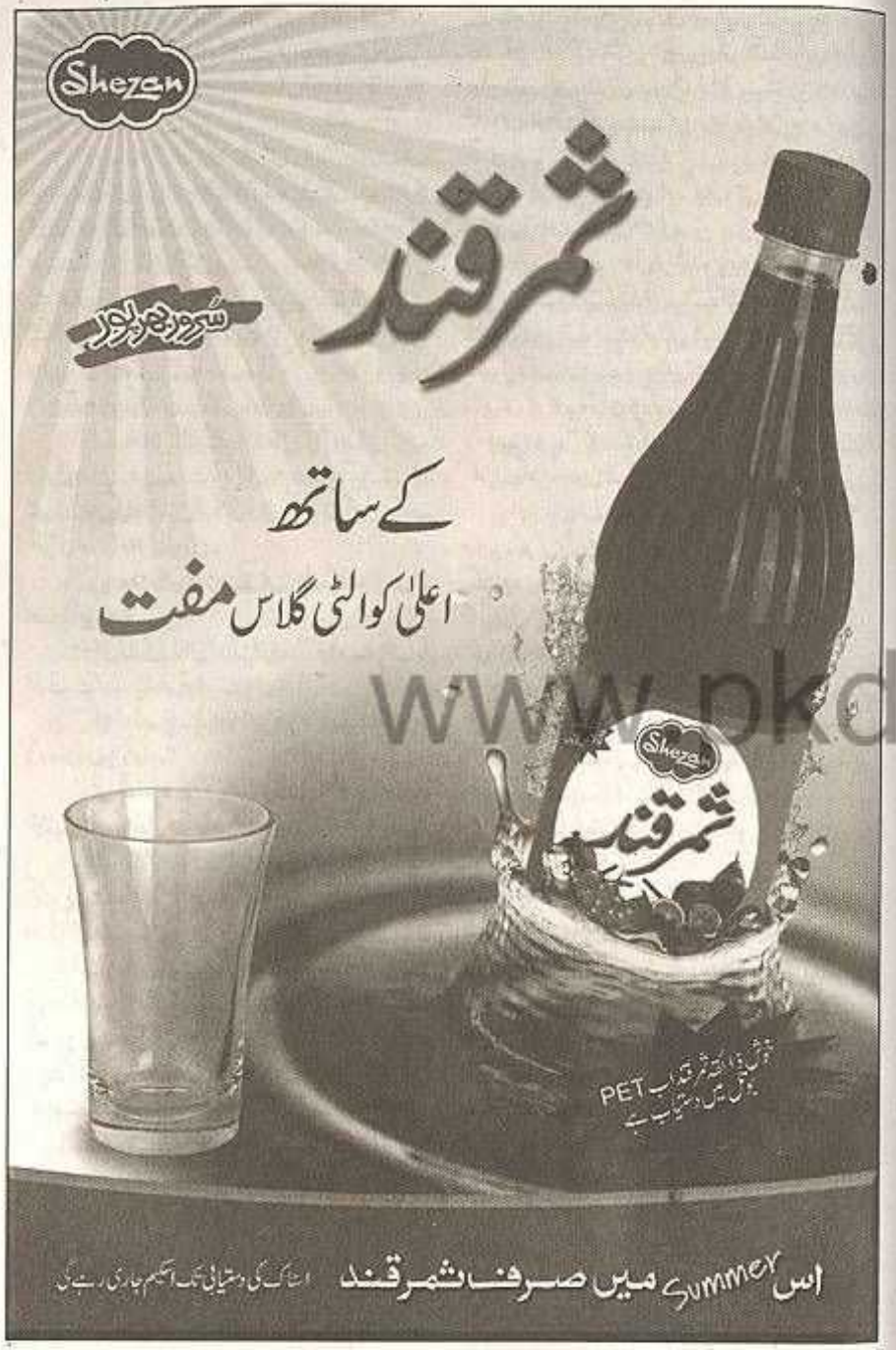

www.pkdigest.com

حکم جی اور جارج گورا کے بیٹوے ہمارے ہاتھوں میں ہیں۔ زیادہ زور لگاؤ گے تو ان کی گردنیں گڑک ہو جائیں گی۔“

”تم کیا بک رہے ہو... ہوش میں تو ہو؟“ موہن کمار نے پوچھا۔

انور خاں انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ”تمہارے گورا صاحب کی بہن ماریا اس وقت ہمارے قبضے میں ہے۔ اس کا جیون بس اسی صورت میں محفوظ رہے گا جب گورا اور حکم ہمارے حکم کے مطابق چلیں گے۔ اور یہ خالی خولی دھمکی نہیں ہے موہن کمار! ہم ماریا کو مارنے کے لیے اتنے ہی تیار ہیں جتنے تم اپنی اگلی سانس لینے کے لیے تیار ہو۔ اور میں تمہیں بتا دوں، اس سلسلے میں ہمیں آزمانے کی کوشش نہ کرنا۔ ماریا کی لاش کے سوا اور کچھ نہیں ملے گا... کچھ بھی نہیں۔“

آخری الفاظ کہتے کہتے انور خاں کی آواز میں عجیب درندگی در آئی۔ دہانے سے باہر ایک دم سناٹا چھا گیا۔ تاریکی میں ٹارچوں کی روشنیاں تو چمکتی رہیں لیکن کہیں کوئی حرکت نظر آئی اور نہ آواز سنائی دی۔

”کیا ہوا موہن کمار! سکتے میں چلے گئے ہو یا دل کا دورہ پڑ گیا ہے؟“

موہن کمار کی لرزاں آواز ابھری۔ ”تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ ماریا صاحبہ تمہارے پاس ہیں؟“

”کیا ثبوت چاہتے ہو؟ اس کا ہاتھ کاٹ کر بھیجوں، ناک کاٹوں یا کچھ اور؟“

”تم... تم اپنے لہجے کو بدلو انور خاں۔“ موہن کمار نے شپٹائے ہوئے انداز میں کہا۔

”اب لہجے نہیں بدل سکتے موہن کمار! اب پانی سر سے گزر چکا ہے۔ اب حکم جی سے اور اس کے پالتو کتوں سے ہماری کھلی جنگ ہے۔“

ایک بار پھر دہانے سے باہر سناٹا چھا گیا۔ اسحاق آگے آیا اور گرجا۔ ”موہن کمار! جا کر اپنے آقا کو بتا دے کہ اس کے پاپوں کا گھڑا بھر چکا ہے۔ اب یہ گھڑا بیچ چوراہے پر ٹوٹے گا اور سارا سنسار دیکھے گا۔ اب اسے اور اس کے ٹولے کو بھاگنے کے لیے راستہ نہیں ملے گا۔ ہم انہیں چن چن کر ماریں گے اور اس راجواڑے کو ان کے گندے وجود سے پاک کر دیں گے۔“

”لگتا ہے کہ تم سب نشے میں ہو اور اسی نشے کی حالت میں مارے جاؤ گے۔“

”ہم ہوش میں ہیں... اور اب تم لوگوں کے ہوش میں آنے کا وقت ہے۔“ انور خاں گرجا۔ ”جو کچھ تم نے سلطانہ کے ساتھ کیا ہے، وہ ہم بھی جارج گورے کی بہن کے ساتھ کر سکتے تھے... اور ایک بار نہیں بیسیوں بار کر سکتے تھے لیکن وہ بچی ہوئی ہے... ہاں، اس کی جان شدید خطرے میں ہے اور یہ خطرہ تب ہی ٹل سکتا ہے جب حکم اور جارج غیر مشروط طور پر ہماری کچھ باتیں مانیں گے۔“

”تم بکواس کر رہے ہو۔ کہاں ہیں ماریا صاحبہ؟“ موہن کی آواز تاریکی میں ابھری۔

انور خاں نے اسحاق کو اشارہ کیا۔ وہ بپھرا ہوا گیا اور ماریا کو گھسیٹ کر دہانے کے قریب لے آیا۔ دہانے کے بالکل پاس پہنچ کر اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ایک خم دار خنجر کی تیز نوک اچانک ماریا کے بازو میں اتار دی۔ اس کے عریاں بازو میں خنجر کا یہ انجکشن کارگر رہا۔ وہ بُری طرح چلائی اور ”ہیلپ ہیلپ“ پکارنے لگی۔ اس کی یہ آوازیں یقیناً باہر کھڑے گھڑ سواروں تک بھی پہنچیں۔

انور خاں نے پکار کر کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ اپنی میم صاحبہ کے پُرجوش نعرے تم نے اچھی طرح سن لیے ہوں گے۔ وہ یہاں بہت خوش ہیں اور اس طرح کے نعرے اکثر لگاتی رہتی ہیں۔ اگر تم چاہو تو اس طرح کے مزید نعرے بازی بھی تمہیں سنائی جا سکتی ہے۔“

چند لمحے تک گہرا سناٹا رہا پھر موہن کمار کے کسی ساتھی کی نہایت بوکھلائی آواز سنائی دی۔ ”اگر یہ واقعی ماریا صاحبہ ہیں تو تم لوگ ان جانتے نہیں ہو کہ اپنے لیے کتنی بڑی مصیبت کو دعوت دے چکے ہو۔ تم لوگوں کی بدنصیبی پر ترس آ رہا ہے۔“

”یہ واقعی تمہاری میم صاحبہ ہی ہے۔“ انور خاں نے تاؤ دلانے والے لہجے میں کہا۔ ”اور عنقریب ہم اسے زمین پر بکری کی طرح لٹا کر کند چھری سے ذبح کرنے والے ہیں۔ لیکن ہم چاہتے ہیں کہ اس سے پہلے تم ایک دفعہ اپنے والد صاحبان یعنی حکم جی اور جارج سے بات کر لو۔“

اسحاق نے ایک اور چرکہ ماریا کے بازو پر لگایا۔ وہ پھر دردناک انداز میں چلائی۔ ”پلیز ہیلپ... پلیز... یہ مجھے مار ڈالیں گے۔“

یہی وقت تھا جب دو افراد اپنی میم صاحبہ کے لیے بے تاب ہو کر دہانے کی طرف بڑھے۔ انور خاں نے بے دریغ برسٹ چلایا۔ ان دونوں افراد کے قدموں کے آس پاس چنگاریاں بکھر گئیں۔ وہ بوکھلا کر پیچھے ہٹے۔ انور خاں بے رحم لہجے میں دہاڑا۔ ”کسی دھوکے میں نہ رہنا موہن! ہم مرنے اور مارنے کے لیے بالکل تیار ہیں۔ اگر کوئی حماقت فرماؤ گے تو کل شام تک تمہاری چتا کے پھول تیار ہو چکے ہوں گے۔“

”کک... کیا چاہتے ہو تم؟“ موہن کمار کی مری مری آواز سنائی دی۔

”چاہتے تو بہت کچھ ہیں۔ اور انسان کی چاہتیں کبھی پوری نہیں ہوتیں، لیکن فی الحال ہماری دو چار معصوم سی خواہشیں تمہارے حکم جی اور اس کے لعنتی بچے جارج کو پوری کرنی ہوں گی۔“

”تم نے جو کچھ کہنا ہے سامنے آ کر کہو۔“ موہن کمار کا نامعلوم ساتھی غصیلی آواز میں بولا۔

”سامنے بھی آ جائیں گے۔ فی الحال ہمارے سروں پر خون سوار ہے۔ ہمارے منتھے نہ ہی لگو تو اچھا ہے۔ اچھے بچوں کی طرح جو کہتے ہیں، وہ سنو اور اپنے دونوں والد صاحبان کو جا کر بتاؤ۔“

”جو بکواس کرنا چاہتے ہو جلدی کرو۔“ موہن کمار نے کہا۔

”ہم تمہیں صرف دو دن دیتے ہیں۔ سلطانہ کے والد اور بھائی کو پوری حفاظت کے ساتھ قل پانی پہنچا دو۔ ہمارے پاس پچاس ناموں کی ایک فہرست ہے۔ ان لوگوں میں سے زیادہ تر جارج گورا کی جیل میں ہیں۔ ان کو فوراً رہا کر کے یہاں ہمارے پاس پہنچایا جائے۔ زرگاں کے راج بھون میں ہونے والی ساری خرمستیاں رکیں، خاص طور سے جشن بہاراں اور ساتویں کا جشن ختم کرنے کا فی الفور اعلان کیا جائے۔ جارج گورا کو فوری طور پر جیلر کے عہدے سے ہٹایا جائے۔“

”مجھے پھر شک ہو رہا ہے کہ تم نشے میں ہو۔ تم اپنی اوقات میں رہ کر بات نہیں کر رہے ہو۔“ ایک بار پھر موہن کمار کی آواز ابھری۔

”اپنی اپنی اوقات کا پتا ہم سب کو بہت جلد چلنے والا ہے۔ فی الحال تم لی بے بچے بنو اور جو کچھ تمہیں کہا گیا ہے اپنے بزرگوں تک پہنچاؤ۔ بڑوں کے معاملے میں چھوٹے بچے بولیں تو ان کو مرغا بنا دیا جاتا ہے۔“

”ناموں کی فہرست کہاں ہے؟“ موہن کمار نے پوچھا۔

انور خاں نے فہرست نکال کر ہماری طرف دیکھا۔ ”کون جائے گا؟“ اس نے پوچھا۔

”میں جاؤں گا۔“ سب سے پہلے میں نے جواب دیا۔

اسحاق اور چوہان نے مجھے روکنا چاہا لیکن میں اپنا حوصلہ آزمانے پر تلا ہوا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے مجھے کوئی نیا نیا اختیار ملا ہے اور میں اس اختیار کو عمل میں لا کر اپنی بے جگری کو پرکھنا چاہتا ہوں۔ میں نے انور خاں کے ہاتھوں سے ناموں والی فہرست لی اور سرنگ کے دہانے سے باہر نکل آیا۔ ایک عجب سنسنی کا احساس ہوا۔ میں جانتا تھا کہ میری طرف درجنوں رائفلیں اٹھی ہوئی ہیں، بہت سی خوں خوار نگاہیں مجھ پر مرکوز ہیں اور میرے ساتھ کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا ہے۔ اس ہو سکنے اور نہ ہو سکنے کے درمیان کی کیفیت بڑی مزے دار تھی۔ میری نگاہوں میں عمران کا چہرہ گھومنے لگا۔ وہ بھی جب کوئی پُرخطر کام کرتا تھا، اس کے چہرے پر بھی ایسی ہی لذت آمیز کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ میں سینہ تان کر آگے بڑھا۔ رائفل میرے کندھے سے جھول رہی تھی۔ تاریکی میں سے ایک سایہ نکل کر میرے روبرو آیا۔ اپنے ڈیل ڈول اور شکل سے یہ کافی خطرناک شخص لگتا تھا۔ اس نے بھی اپنی رائفل کندھے سے لٹکا رکھی تھی۔ میں نے ناموں کی فہرست والا کاغذ اسے تھمایا اور انور خاں کی ہدایت کے مطابق کہا۔ ”ہمارے چاروں مطالبے اس کاغذ کی پشت پر لکھے ہوئے ہیں۔“

اس شخص نے چھیننے والے انداز میں کاغذ میرے ہاتھ سے لے لیا۔ میں نے انور خاں کی دی ہوئی ایک طلائی چوڑی اس کی طرف بڑھائی۔ ”یہ تمہاری میم صاحبہ کی نشانی ہے۔ جا کر اپنے بڑوں کو دکھا دینا۔“

اس شخص نے چوڑی مجھ سے لی اور ایک شعلہ فشاں نگاہ مجھ پر ڈال کر واپس چلا گیا۔

اس کی آنکھوں میں، مجھے دیکھنے کے بعد بے پناہ حیرت امڈ آئی تھی۔ یقیناً وہ مجھے پہچانتا تھا اور اسے ہرگز امید نہیں تھی کہ میں بھی انور خاں اور اسحاق وغیرہ کے ساتھ اسی سرنگ میں پایا جاؤں گا۔

موہن کمار نے تاریکی میں سے پکار کر کہا۔ ”انور خاں! تو آگ سے کھیل رہا ہے۔ اس سے تجھے ایک بُری موت کے سوا اور کچھ نہیں ملے گا۔“

”ہم موت کے لیے بالکل تیار ہو کر آئے ہیں موہن... سمجھ لے کہ اپنے کفن اپنے سروں سے باندھے ہوئے ہیں اور اپنا کہا سنا معاف کرایا ہوا ہے۔ اگر قبریں نصیب ہو گئیں تو ٹھیک ہے، نہ بھی ملیں تو کوئی پروا نہیں۔ لیکن ایک بات پتھر پر لکیر سے موہنے! مرنے سے پہلے ہم تمہاری اس میم صاحبہ کو ذبح ضرور کریں گے۔“

اسحاق نے کہا۔ ”اور یہ مت سمجھنا موہنے کہ ہم سودے بازی کر رہے ہیں۔ ہم تو اس میم کا سر اتارنے سے پہلے صرف حجت پوری کر رہے ہیں... یاد رکھ اگر ہمارے ان

www.pkdigest.com

مطالبوں میں سے کسی مطالبے کا کوئی چھوٹا سا حصہ بھی تیرے حکم جی کو قبول ناہیں ہوا تو پھر یہ میم مرے گی اور یہ کوئی اچھی موت ناہیں ہووے گی۔"

اسحاق کے لہجے کی درندگی محسوس کر کے موہن کمار کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ انور خاں بولا۔ "چلو اب پھوٹ جاؤ یہاں سے۔ اس میم کو بچانے کے لیے تم لوگوں کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ اور جاتے جاتے آخری بار سن لو۔ اگر زرگاں کی طرف سے یا ٹل پانی کی طرف سے ہمارے خلاف کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی گئی تو ہم دوسرا موقع نہیں دیں گے۔ اس معاملے کو فوراً انجام تک پہنچا دیں گے۔"

انور خاں نے ٹل پانی کا نام جان بوجھ کر لیا تھا۔ اس طرح وہ حکم جی وغیرہ کو باور کرانا چاہتا تھا کہ ماریا فرگوسن کے اغوا والے معاملے سے چھوٹے سرکار یا اس کے ساتھیوں کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

اسی دوران میں ماریا نے پھر واویلا شروع کر دیا۔ وہ انگلش اور گلابی اردو میں پتا نہیں کیا کچھ بول رہی تھی۔ اس کی آواز میں جھلاہٹ آمیز بے چارگی تھی اور کرب تھا۔ ڈاکٹر چوہان نے قریب جا کر اس کی بات سنی اور واپس آ کر انور خاں کو بتایا۔ "وہ کہہ رہی ہے، میری ماں بلڈ پریشر کی مریضہ ہے۔ موہن کمار وغیرہ میری ماں کو میرے بارے میں کچھ نہ بتائیں۔ اس کے علاوہ وہ اپنے لیے ٹوتھ پیسٹ، برش، صابن اور کپڑوں کا ایک جوڑا منگوانا چاہتی ہے۔"

اسحاق پھنکارا۔ "کوئی ضرورت ناہیں حرامزادی کے لیے یہ چیزیں منگوانے کی۔ یہ اسی طرح رہے گی جس طرح ہم رہیں گے۔ ہاں، ایک جوڑا منگوا سکتی ہے یہ۔"

انور خاں نے اسحاق کو نرمی سے سمجھایا۔ وہ نیم رضامند ہو گیا اور منہ بنا کر دوسری طرف چلا گیا۔ انور خاں نے ماریا کا پیغام بلند آواز میں موہن کمار اور اس کے ساتھیوں تک پہنچا دیا۔

تاریکی میں موہن کمار اور اس کے تقریباً چار درجن ساتھیوں کا واضح ردعمل سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ تاہم اتنا اندازہ ہو رہا تھا کہ ان میں سے کچھ لوگ جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ ہم پوری طرح چوکس تھے۔ لکڑی کے تنوں کے پیچھے ہم نے پوزیشنیں لی ہوئی تھیں۔ انگلیاں رائفلوں کے ٹریگرز پر تھیں۔ اسحاق نے ہینڈ گرینیڈز والا تھیلا بھی ہمارے پاس رکھ دیا تھا۔ اس نے پانچ دس منٹ صرف کر کے مجھے بڑی اچھی طرح سمجھایا تھا کہ ہینڈ گرینیڈ کو کس طرح اور کس پوزیشن میں استعمال کیا جاتا ہے۔ بہرحال، ابھی تک مجھے یقین نہیں تھا کہ میں بوقتِ ضرورت اچھے طریقے سے اس بارودی گولے کو پھینک سکتا ہوں۔ اسحاق خود رائفل بدست ماریا کے سر پر موجود تھا۔ مجھے پتا تھا کہ خطرے کے وقت وہ ماریا کو شوٹ کرنے میں ایک سیکنڈ کی دیر نہیں لگائے گا... بلکہ اس بات کا بھی اندیشہ تھا کہ وہ خطرے کے پوری طرح سامنے آنے سے پہلے ہی ماریا کی زندگی کا چراغ گل کر دے۔

وہ بڑے تناؤ کے لمحے تھے لیکن آخر وہ گزر گئے۔ ہمیں اندازہ ہوا کہ ان چار درجن گھڑسواروں میں سے دس پندرہ گھڑسوار یہاں سے روانہ ہو رہے ہیں۔ امکان تھا کہ موہن کمار بھی روانہ ہونے والوں میں شامل ہو گا۔ باقی افراد دہانے کے اردگرد پوزیشنیں سنبھالنے لگے۔ ان کی ٹارچوں کے روشن دائرے چاروں طرف حرکت کر رہے تھے۔

کچھ دیر بعد سپیدۂ سحر نمودار ہونے لگا۔ جنگل میں شب بیدار جانوروں کی آوازیں معدوم ہونے لگیں۔ دہانے کے اردگرد کے نشیب و فراز دھیرے دھیرے نمایاں ہو گئے۔ بظاہر دہانے کے اردگرد کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن ہم جانتے تھے، دو تین درجن مسلح افراد یہاں موجود ہیں اور ان کی رائفلوں کے رخ اس دہانے کی طرف ہیں۔ بہرحال، اب ان مسلح افراد کی جانب سے اچانک ہلا بولے جانے کا خطرہ ٹل گیا تھا۔ اگر انہوں نے ایسا کچھ کرنا ہوتا تو اجالا پھیلنے سے پہلے پہلے کرتے۔

ماریا کراہنے لگی۔ "ہام کو بہت تکلیف ہوتا۔ ہام کا ہاتھ کھول دو۔"

"تا کہ تمہارے شیطانی دماغ کو پھر کوئی چالاکی دکھانے کا موقع مل سکے۔" اسحاق نے اس کی پشت پر ایک ٹھوکر رسید کرتے ہوئے کہا۔

وہ رونے لگی۔ انور خاں نے کہا۔ "چلو اس کے ہاتھ آگے کی طرف باندھ دو۔ اس نے کھانا دانا بھی تو کھانا ہو گا۔"

اسحاق پہلے تو جز بز نظر آیا پھر اس نے ماریا کے ہاتھ پشت کی جانب سے کھول کر سامنے کی طرف باندھ دیے۔

"ہام کا منہ بہت کڑوا ہوتا۔ ہام پیسٹ کرتا مانگتا۔" وہ منمنائی۔

اسحاق پھنکارا۔ "یہ تیرے پیو کا ہاتھ روم ناہیں ہے۔ یہ جنگل ہے۔ یہاں اگر تو نے پیسٹ کرنی ہے تو پھر وہی کرنی ہو گی جو زرگاں کی ساری غریب آبادی کرتی ہے۔"

پاس ہی چولہے کی راکھ پڑی تھی۔ اسحاق نے اس میں سے چند کوئلے نکالے۔ انہیں ماریا کے سامنے رکھا پھر انہیں رائفل کے دستے سے پیس کر باریک کیا اور بولا۔ "یہ ہے وہ پیسٹ جو ہم لوگ کرت ہیں۔ آج تو بھی یہی کر۔"

وہ تعجب سے اسحاق کو دیکھنے لگی۔

"ایسے دیدے کیا پھاڑت ہے... چل انگلی پر لگا اس کوئلے کو اور دانت صاف کر۔" ماریا اپنی جگہ بے حرکت بیٹھی رہی۔ اسحاق نے جھپٹ کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑے۔ اس کی ایک انگلی کو پسے ہوئے کوئلے میں تھتھڑا اور یہ انگلی زبردستی اس کے منہ میں گھسا دی۔ "چل کر یہ پیسٹ... چل کر... ناہیں تو منہ پھاڑ ڈالوں گا تیرا۔"

ماریا چلانے لگی۔ انور خاں نے مداخلت کر کے اسحاق کو پیچھے ہٹایا اور اسے گھور کر بولا۔ "تم ایک ٹھیک کام بھی غلط طریقے سے کرتے ہو اور وہ غلط لگنے لگتا ہے۔" پھر وہ ماریا سے مخاطب ہو کر بولا۔ "میم صاحب! یہ کوئلہ بڑے کام کی چیز ہے۔ اس کا رنگ کالا ہے تو کیا ہوا۔ ہر کالی چیز بُری نہیں ہوتی اور نہ ہر سفید چیز اچھی ہوتی ہے۔ آپ اس کو دانتوں پر مل کر دیکھیں، یہ آپ کی ولایتی ٹوتھ پیسٹ کی کمی کو بڑی حد تک پورا کرے گا۔"

"دس کول؟ واٹ نان سینس۔" ماریا نے تیوری چڑھائی۔

"یہ نان سینس نہیں ہے میم صاحب! اس سے تو ہم لوگ بڑے کام لیتے ہیں۔ اس سے ہماری عورتیں برتن مانجھتی ہیں۔ کہیں زخم لگ جائے تو اس کو پیس کر خون بند کیا جاتا ہے۔ اس سے دانت چمکائے جاتے ہیں۔ کئی طرح کی دواؤں میں ڈالا جاتا ہے۔"

انور خاں نے اپنے مخصوص ہلکے پھلکے انداز میں کافی کوشش کی لیکن ماریا دانت صاف کرنے پر راضی نہیں ہوئی۔ اس نے پانی سے بس چند کلیاں کرنے پر اکتفا کیا۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ پچھلے تقریباً بارہ پہر سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ لیکن فی الوقت ہمارے پاس کھانے کے لیے خشک چنوں، مکئی کے بھٹوں اور گڑ وغیرہ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

جب کھانے کے نام پر یہ چیزیں ماریا کے سامنے رکھی گئیں تو اس نے ایک بار پھر ناک بھوں چڑھائی۔ وہ انگلش اور چائنیز کھانے کھانے والی لڑکی اس خشک راشن پر کیسے منہ مار سکتی تھی۔ "اب کھاتی کاہے ناہیں ہو؟" اسحاق نے پھر آنکھیں نکال کر پوچھا۔

"یہ ہام ناہیں کھا سکتا۔"

"تمہارا تو باپ بھی کھائے گا۔" اسحاق نے کہا اور زبردستی مکئی کا بھٹا اس کے ہاتھ میں دیا۔

اس نے بھٹا دور پھینک دیا اور چلائی۔ "ناہیں کھائے گا... ناہیں کھائے گا۔ ہام کو اکیلا چھوڑ دو۔" اس کی آنکھوں سے چنگاریاں چھوٹنے لگی تھیں۔

چند لمحے کے لیے لگا کہ اسحاق اس سے پھر مار پیٹ شروع کر دے گا مگر اسی دوران میں انور خاں نے معاملہ سنبھال لیا۔ اس نے کھانے پینے کی اشیا ماریا کے سامنے سے ہٹا کر ایک طرف رکھ دیں۔ "میم صاحب! جب تم کو زیادہ بھوک لگے گی تو یہی چیزیں ڈبل روٹی، کیک، پیسٹری اور فرائی انڈے سے زیادہ مزے دار لگیں گی... اگر یقین نہیں تو آزما کر دیکھ لینا۔" پھر انور خاں نے اسحاق کو آنکھوں سے اشارہ کیا کہ وہ شانت رہے۔ یہ خود ہی ٹھیک ہو جائے گی۔

عجیب الوضع بارونا ابھی تک سرنگ کے اندرونی حصے میں موجود تھا۔ میں نے اندر جا کر اسے ناشتا کرایا۔ اس کا نشہ ٹوٹا ہوا تھا اور وہ مسلسل شراب کی ڈیمانڈ کر رہا تھا... اس کے علاوہ وہ جلد از جلد اس کہنہ سال کشتی میں بھی واپس جانا چاہتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ جس طرح شراب کے لیے تڑپ رہا ہے، اسی طرح اس کشتی کے لیے بھی تڑپ رہا ہے۔ معلوم نہیں تھا کہ اس کشتی سے اس کا کیا ناتا ہے۔ اس کے ساتھ میری ہمدردی صرف اتنی تھی کہ مجھے اس میں اپنے بچھڑے یار عمران کی ہلکی سی جھلک نظر آئی تھی۔ لیکن اب میں سوچ رہا تھا کہ کہیں میں نے اسے یہاں لا کر غلطی تو نہیں کی؟ وہ ان شرابیوں میں سے لگتا تھا جو نشے کے بغیر جاں بلب ہو جاتے ہیں۔ اگر اسے کچھ ہو جاتا تو اس کا ذمے دار میں ہوتا۔ وہ لاغر اور بیمار نظر آتا تھا۔ اس کی جلد سیاہی مائل ہو چکی تھی۔

بارونا کو ناشتا کرانے کے بعد میں سرنگ کے ایک گوشے میں تنہا بیٹھ گیا۔ میری بے چین روح پھر پھڑپھڑا رہی تھی۔ مجھے میرے اپنے یاد آ رہے تھے۔ میرے گلی کوچے... میری دھوپ چھاؤں... میرے موسم... اور وہ چہرہ جو شاید میرے اب تک زندہ رہنے کا جواز تھا۔ میں اپنے ہاتھ سے ہولے ہولے اپنی گردن کے عقبی حصے کو سہلا رہا تھا۔ چوہان کو یقین تھا کہ مجھے قید کرنے والوں نے یہاں میرے جسم میں کچھ رکھا ہوا ہے۔ کچھ ایسا جو فوراً میری نشان دہی کرتا ہے اور میرے نگراں آندھی طوفان کی طرح مجھ تک آن پہنچتے ہیں۔ میرا اپنا دل بھی اب گواہی دینے لگا تھا۔ چوہان کے خیال کی تائید کرنے لگا تھا۔ ورنہ وہ سب کچھ کیسے ہو سکتا تھا جو اب تک ہوا۔ میرا دل چاہا کہ میرے پاس کوئی تیز دھار چاقو ہو۔ میں ابھی اپنی گردن کے عقبی حصے کو چیر ڈالوں۔ وہ شے باہر نکال پھینکوں جو میرے پاؤں کی زنجیر بنی ہوئی تھی۔ آزاد

www.pkdigest.com

زمینوں تک پہنچنے کے لیے میری ہر کوشش کو ناکام کر دیتی تھی۔

ایک عجیب سی بے چینی کسی گاڑھے دھوئیں کی طرح میرے سینے میں بھرنے لگی اور میرا دم گھٹنے لگا۔ یہی وقت تھا جب میں نے جواں سال بھکشو ہیمش کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ اس کا ٹوٹا ہوا بازو گلے میں جھول رہا تھا۔ اس کی مٹھی میں کوئی شے دبی ہوئی تھی۔ وہ ننگے پاؤں تھا۔ وہ دوستانہ انداز میں میرے قریب ہی بیٹھ گیا۔ اس نے مٹھی کھولی۔ اس میں چاندی کی ایک باریک سی زنجیر تھی۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ جاتے جاتے تمہاری بیوی سلطانہ نے دی تھی۔ کہتی تھی کہ میں تم تک پہنچا دوں۔''

ایک دم مجھے یاد آیا کہ چاندی کی یہ مہین سی زنجیر میں نے سلطانہ کے پاس دیکھی تھی۔ میں نے ہیمش سے پوچھا۔ ''وہ یہ مجھے کیوں دے گئی ہے؟''

''اس کا پتا تو تمہیں ہوگا۔'' ہیمش بولا۔ وہ کچھ دیر تک جواب طلب نظروں سے مجھے دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''وہ یہاں سے جاتے وقت بہت پریشان تھی۔ مسلسل رو رہی تھی اور دائیں بائیں دیکھ رہی تھی۔ یقینی بات ہے کہ وہ تمہیں ڈھونڈ رہی تھی۔ اس نے مجھ سے بھی پوچھا لیکن میں کیا بتاتا۔ مجھے خود پتا نہیں تھا کہ تم، فیروز اور اسحاق وغیرہ اچانک کہاں نکل گئے ہو۔ اس نے مجھے یہ زنجیر دی اور کہا کہ میں تمہیں دے دوں۔''

میں نے خاموشی سے زنجیر کرتے کی جیب میں ڈال لی۔ نہ جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ اس زنجیر سے میرے اور سلطانہ کے تعلق کی کوئی دیرینہ وابستہ ہے لیکن کیا ''یاد'' ہے؟ مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ ہیمش کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔ ''وہ تمہیں بہت چاہتی ہے مہروز! وہ ان عورتوں میں سے ہے جو جب شادی شدہ ہو جاتی ہیں تو پھر ان کا شوہر ہی ان کے لیے سب کچھ ہوتا ہے۔ اس نے تمہاری رکھشا کے لیے بہت دکھ جھیلے ہیں مہروز! اور اب بھی اس کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے، وہ تمہارے جیون کی رکھشا کرتے ہوئے ہی ہوا ہے۔ اب اسے تمہارے سہارے اور پریم کی سخت ضرورت تھی لیکن افسوس کہ اب تم اس کے ساتھ نا ہیں ہو۔''

''لیکن... میں کیا کروں ہیمش! میں اس کے لیے ہمدردی تو رکھتا ہوں لیکن اسے اپنی بیوی نہیں سمجھ سکتا۔ یہ میرے بس میں ہی نہیں ہے۔''

''مگر مہروز! اگر تم...''

''ایک منٹ ہیمش۔'' میں نے ہیمش کی بات کاٹی۔ ''مجھے میرے نام سے پکارو۔ میں مہروز نہیں تابش ہوں۔ اگر کوئی مہروز تھا بھی تو وہ بس ایک دھوکا تھا اور وہ دھوکا ختم ہو چکا ہے۔''

میرے حتمی لہجے کو محسوس کر کے ہیمش بجھ سا گیا۔

''ٹھیک ہے مہروز... م، میرا مطلب ہے تابش! تم اپنے اندر کے حالات کو بہتر سمجھتے ہو۔ اپنے بارے میں جو فیصلہ تم خود کرو گے، وہی اچھا ہوگا۔ میں نے تو بس ایک امانت تمہارے حوالے کرنی تھی۔''

اسی دوران میں دہانے کی طرف سے ماریا فرگوسن کے چلانے چنگھاڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔ شاید کسی بات پر اسحاق سے پھر اس کی تکرار ہو گئی تھی۔ وہ بڑے غصیلے لہجے میں کچھ کہہ رہی تھی۔ بیچ بیچ میں اسحاق یا انور خاں کی آواز بھی سنائی دے جاتی تھی۔ ہیمش بولا۔ ''میرا خیال ہے، اب یہ جان گئی ہے کہ اس کی جان ہمارے لیے بہت قیمتی ہے۔ ہم اس کے ذریعے اپنی شرطیں منوانا چاہتے ہیں۔ اس لیے فوری طور پر اس کی جان نا ہیں لیں گے۔ اسی لیے اب یہ ہر بات پر اڑ رہی ہے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے، حکم جی اور جارج وغیرہ اس کی رہائی کے لیے ہماری شرطیں ماننے پر آمادہ ہو جائیں گے؟''

''آشا تو ہے کہ ایسا ہو جائے گا۔ اصل میں یہ ایک بہت بڑا کام ہوا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ ماریا کا یہاں پہنچ جانا۔ شاید تم لوگ جارج گورا کو مارا بھی دیتے تو اسٹیٹ میں اتنا تہلکہ نا ہیں مچتا جتنا اب مچے گا۔ بہت کھلبلی مچی ہوگی اور ابھی اور مچے گی۔ یہ نہ صرف جارج کی بہن ہے بلکہ اسٹیل کی چہیتی بیوی بھی ہے۔ کہتے ہیں کہ ماریا کی ماں لندن میں ایک بہت بڑی جائداد کی مالک ہے۔ اس جائداد کی وجہ سے بھی اسٹیل صاحب نے اپنی بیوی کو آنکھ کا تارا بنا رکھا ہے۔ انہوں کی بہت زیادہ محبت اور توجہ نے اس لڑکی کو بہت خودسر بنا رکھا ہے۔ کسی وقت تو لگتا ہے کہ یہ خود کو زمین کی شے ہی نا ہیں سمجھتی... تمہیں وہ پگوڈا میں آگ لگنے والا واقعہ یاد ہے؟'' ہیمش نے کہا۔

''نہیں... مجھ کو کچھ یاد نہیں۔''

''تم بہت خاص باتیں بھی بھول چکے ہو۔ اس واقعے میں تمہاری جان بڑی مشکل سے بچی تھی۔ سب لوگن جانت ہیں کہ وہ آگ ماریا کی وجہ سے ہی لگی تھی۔''

''ماریا کی وجہ سے؟''

''ہاں، یہ میم صاحبہ ایک روز پگوڈا کی سیر کے لیے گئی تھیں۔ ان کے گارڈز نے ان کی آمد کے وقت پگوڈا کو

زبردستی عام لوگن سے خالی کرایا۔ عبادت کرنے والے کئی گھنٹے تک پگوڈا سے باہر دھوپ میں کھڑے رہے۔ وہ عبادت کا خاص دن تھا۔ تمام بڑے گرو حضرات عبادت میں مصروف تھے۔ اس لیے جب ماریا پگوڈا میں آئی تو وہ اس کے استقبال کے لیے نہ آ سکے۔ پگوڈا کے خادموں نے ماریا کی موجودگی میں ایک دو تیج باتیں بھی کہہ دیں۔ ماریا نے ان سب کا بہت بُرا منایا اور پانچ دس منٹ کے اندر پگوڈا سے واپس چلی گئی۔ اس واقعے کے صرف دو دن بعد رات کے وقت اچانک پگوڈا کے سیڑھیوں والے حصے کی طرف زبردست آگ بھڑک اٹھی۔ بہت سے لوگوں کو پورا وشواس ہے کہ یہ آگ ماریا نے ہی لگوائی تھی۔ اس کا کوئی کارندہ پجاری کے روپ میں اندر آیا تھا اور چراغوں کے تیل والے پیپے الٹ کر انہیں آگ دکھا دی تھی۔ اس آگ میں ہمارے ایک بہت پیارے گرو نروانی جل کر بھسم ہو گئے تھے۔ تم دو بھکشوؤں سمیت آگ میں بُری طرح گھر گئے تھے۔ ان دنوں تمہارے دونوں پاؤں رسی کی ایک بیڑی میں رہتے تھے۔ تم چل تو سکتے تھے لیکن بھاگ نا ہیں سکتے تھے... تمہیں یاد ہے جب میں نے تمہیں آوازیں دی تھیں اور کہا تھا کہ تم اپنا کمبل لپیٹو اور دوڑ کر آگ میں سے گزر جاؤ۔ اس وقت میں بھول گیا تھا کہ تم دوڑ نا ہیں سکو گے۔ تمہیں یاد ہے؟''

''نہیں... مجھے کچھ یاد نہیں۔ اور تم مجھے یاد بھی نہ کراؤ۔ ایسی باتیں سوچ کر میرا دماغ پھٹنے لگتا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں نا ہیں یاد کراتا لیکن میں تمہیں ماریا کی ہٹ دھرمی اور بے رحمی کے بارے میں بتا رہا ہوں۔ اس لڑکی نے ایک چھوٹی سی غلطی کی سزا میں پگوڈا کے ایک حصے کو جلا کر خاکستر کروا ڈالا تھا۔ کئی قیمتی نوادرات ضائع ہوئے۔ ایک بزرگ پجاری کے پران چلے گئے اور تم سمیت تین بندوں کی جان شدید خطرے میں پڑ گئی۔ یہاں ایک بار پھر سلطانہ کی بات کرنی پڑ جاوت ہے۔ جب آگ لگنے کے بعد سب لوگن پگوڈا سے بھاگ گئے تھے اور میں بھی وہاں نا ہیں ٹھہر سکا تھا، سلطانہ بھاگتی ہوئی وہاں پہنچی۔ مجھے وہ منظر آج بھی اچھی طرح یاد ہے۔ اس نے ایک کمبل بھگو کر اپنے گرد لپیٹا ہوا تھا۔ وہ آگ کے درمیان میں کھڑی تھی اور پکار رہی تھی... ''اندر لوگ ہیں۔ ان کی مدد کرو۔ ان کو بچاؤ۔'' پھر میں نے ڈاکٹر چوہان کو دیکھا تھا۔ اس نے بھی ایسے ہی ایک بھیگا ہوا کمبل اپنے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ سامنے والے دروازے کی طرف سے نکلنے والا راستہ آگ نے بالکل بند کر دیا تھا۔ وہ دونوں آگ میں سے گزر کر پہلو والے دروازے تک پہنچے۔ اس دروازے کو باہر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔ انہوں نے یہ کنڈی کھولی۔ دونوں بھکشو تو دوڑتے ہوئے آگ میں سے گزر گئے لیکن تم دوڑ نا ہیں سکتے تھے۔ تمہیں سلطانہ اور چوہان نے اپنے درمیان رکھا اور کمبلوں میں چھپا لیا۔ چوہان کے کمبل کو آگ لگ گئی تھی۔ وہ تمہیں چھوڑنے پر مجبور ہو گیا لیکن سلطانہ تمہارے ساتھ چپٹی رہی اور تمہیں باہر نکال لائی۔ وہ ایک بہادر ماں کی بہادر بیٹی ہے تابش! اس روز اس نے ثابت کیا تھا کہ حوصلہ مندی اور جی داری صرف مرد کا ورثہ ہی نا ہیں ہووت ہے۔ اس روز لوگن سلطانہ کی ہمت پر اش اش کر اٹھے تھے۔''

ایک بار پھر سلطانہ کا اجڑا اجڑا چہرہ میری نگاہوں میں گھومنے لگا اور مجھے محسوس ہوا کہ میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس کے آنسو پونچھنا چاہتا ہوں لیکن وہ جا چکی تھی اور جاتے جاتے اپنے گلے کی چین مجھے دے گئی تھی۔ خبر نہیں کہ ایسا کرنے سے اس کا کیا مطلب تھا۔ شاید یہ چین میں نے ہی اسے دی ہو اور اس کے ساتھ کوئی وعدہ منسلک ہو اور وہ جاتے جاتے یہ وعدہ ختم کر گئی ہو۔

بھکشو ہیمش نے ماریا کی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ پورے زرگاں میں سب سے زیادہ نخرے والی میم مشہور ہے۔ چھوٹی چھوٹی غلطی پر اپنے ملازموں کے ساتھ بڑی سختی سے پیش آوت ہے۔ پچھلے سال اس نے اپنی ایک ملازمہ کے ساتھ اس قدر مار پیٹ کروائی تھی کہ اس کی آنکھ ضائع ہو گئی تھی اور بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ ملازمہ کا دوش صرف اتنا تھا کہ اس نے غلطی سے میم صاحبہ کے بستر پر اُن دھلی چادر بچھا دی تھی۔ اور اسی سال عید سے پہلے اس نے ایک ملازم لڑکے کو چھ دن بھوکا پیاسا ایک کمرے میں بند رکھا تھا۔ لڑکے کا دوش یہ تھا کہ اس نے ماریا کے پالتو افریقن طوطوں کو تکلیف پہنچائی تھی۔ وہ صرف چند گھنٹوں کے لیے ان کے پنجروں میں خوراک ڈالنا بھول گیا تھا۔ شاید تمہیں یہ سن کر حیرانی ہو کہ یہ لڑکا بعد میں بھی کچھ کھا پی نا ہیں سکا اور چند ہفتے بیمار رہ کر مر گیا۔''

''اس کے خلاف کسی نے آواز نہیں اٹھائی؟''

''اسحاق کی بہن بھی تو زہر کھا کر مر گئی تھی۔ سب کو پتا تھا کہ وہ کیوں مری ہے۔ اس کی موت پر بھی تو کسی نے آواز نا ہیں اٹھائی تھی لیکن جب آواز نا ہیں اٹھائی جاتی تو اس کا مطلب یہ تو نا ہیں ہوتا نا کہ لوگن کے دلوں میں غم اور غصہ بھی نا ہیں ہے۔ یہ اندر ہی اندر پلتا رہتا ہے، بڑھتا رہتا ہے اور پھر ایک روز اس کی طاقت اتنی زیادہ ہو جاوت ہے کہ کوئی

www.pkdigest.com

شے اس کا راستہ نہیں روک سکتی۔''

یہ اَن پڑھ پختون اپنے سیدھے سادے انداز میں بڑی فلسفیانہ بات کر رہا تھا... اس کی بات میں بہت وزن تھا۔ میں اپنا تجزیہ کرتا تو میری صورتِ حال بھی تو اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔ میں نے ایک عرصے تک بے پناہ دباؤ جھیلا تھا، بے شمار جسمانی و ذہنی اذیت برداشت کی تھی۔ مجھے ذلت و شرمندگی کے پانی میں غرق کر دیا گیا تھا۔ میں اس پانی میں نیچے اور نیچے جاتا گیا لیکن آخر کار میرے پاؤں زمین سے چھو گئے اور میں اوپر ابھرنا شروع ہو گیا۔ اس بھانڈیل اسٹیٹ کے کمزور لوگوں کے پاؤں بھی اب شاید زمین سے لگ گئے تھے۔ ان کے تیور بدلے ہوئے تھے۔ اب وہ کہنہ قدروں کی دیواریں توڑ دینے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ایسی دیواریں توڑنے کے لیے قربانیاں دینا پڑتی ہیں اور شاید یہ قربانیاں دینے اور تکلیفیں برداشت کرنے کا موسم ہی تھا۔

میرا دھیان ایک بار پھر سلطانہ کی طرف چلا گیا۔ میرا دل اس کے لیے غم سے بھر گیا۔ اس کی نقرئی چین میری مٹھی میں دبی ہوئی تھی۔ مجھے لگا کہ یہ چین تپ گئی ہے اور میرے ہاتھ کو جلانے لگی ہے۔ میں نے چین پھر جیب میں ڈال لی۔

قدموں کی چاپ سنائی دی۔ یہ انور خاں اور ڈاکٹر چوہان تھے۔ انور خاں نے بتایا۔ ''دہانے کے آس پاس چالیس سے کم بندے نہیں ہیں۔ انہوں نے پوزیشنیں لے رکھی ہیں اور پوری طرح چوکس ہیں۔''

''تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟'' ہمیش نے پوچھا۔

''پریشانی کی بات یہ ہے کہ ہم فیروز کو جلد از جلد پار پہنچانا چاہتے تھے تاکہ وہ چھوٹے سرکار کے سامنے موہن کمار وغیرہ کے خلاف گواہی دے سکے لیکن اب یہ ممکن نہیں۔ یہ لوگ کسی کو باہر نہیں جانے دیں گے۔ اگر کوئی جائے گا بھی تو اسے یرغمال بنا لیں گے۔''

''تو پھر کیا کرنا چاہیے؟'' میں نے پوچھا۔

''وقت کا انتظار۔'' انور خاں نے جواب دیا۔

''اگر تم سمجھتے ہو کہ میں اس سلسلے میں کسی طرح کی مدد کر سکتا ہوں تو میں تیار ہوں۔'' میں نے دل کی گہرائی سے پیشکش کی۔

انور خاں کا چہرہ چمک گیا۔ ''تمہارے اتنا کہنے سے ہی میرا حوصلہ ڈبل ہو گیا ہے لیکن ابھی کسی طرح کا رسک لینے کی ضرورت ہمیں نہیں ہے۔''

اچانک دہانے کی طرف سے ایک بار پھر ماریا کے چلّانے کی آوازیں آنے لگیں۔ چوہان نے کہا۔ ''وہ کیڑے مکوڑوں کی وجہ سے پریشان ہے۔ اب اس کے لیے یہاں کیڑے مار دوا کا انتظام کون کرے؟''

انور خاں یہ کہتے ہوئے اٹھ گیا۔ ''میں جا کر دیکھوں، کہیں اسحاق اس سے پھر مار پیٹ شروع نہ کر دے۔''

رات کو ہم نے باری ٹھہرا لی۔ آدھی رات تک فیروز، اسحاق اور ہمیش نے دہانے کی پہرے داری کرنا تھی۔ میں نے بھی ان کے ساتھ شامل ہونا تھا۔ آدھی رات کے بعد ہم نے سو جانا تھا اور انور خاں، چوہان اور احمد نے پوزیشن سنبھال لینی تھی۔

پروگرام کے مطابق ہم آدھی رات تک جاگتے رہے۔ جنگل جانوروں کی آوازوں سے گونجتا رہا۔ ان آوازوں میں گاہے بگاہے لیپارڈ یعنی تیندوے کی دور افتادہ آواز بھی شامل ہو جاتی تھی۔ تاہم ہمیں ان آوازوں سے زیادہ انسانی آہٹوں سے خطرہ تھا۔ ہم پر شب خون مارا جانا خارج از امکان نہیں تھا۔ ہمیں معلوم تھا کہ حکم جی کے پاس خطرناک لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ ان میں رنجیت پانڈے جیسا شخص بھی شامل تھا۔ بڑے پگوڈا میں میڈم صفورا نے مجھے اس شخص کے بارے میں تھوڑا بہت بتایا تھا۔ بھانڈیل اسٹیٹ کے جو پانچ نہایت خطرناک کمانڈوز [illegible] مجھے پاکستان سے انڈیا واپس لانے کے لیے گئے تھے، ان کا سربراہ یہی رنجیت پانڈے تھا۔ وہ انڈین اسپیشل فورسز کا ایک سابقہ افسر تھا اور کہا جاتا تھا کہ وہ اپنے دشمنوں کے لیے موت کا دوسرا نام ہے۔

گاہے بگاہے دہانے کا گھیراؤ کرنے والوں کی مدھم آوازیں ہمارے کانوں تک پہنچ جاتی تھیں۔ کبھی کوئی چاپ ابھرتی تھی۔ کبھی کوئی رائفل کاک ہونے کی آواز کانوں میں پڑتی تھی۔ رات قریباً ایک بجے ہم نے انور، چوہان اور احمد کو جگا دیا۔ ان کی چٹائیوں پر ہم سونے کے لیے لیٹ گئے۔ ماریا بھی ایک طرف بندھی پڑی تھی۔ خبر نہیں کہ سو رہی تھی یا جاگ رہی تھی۔ وہ ہٹ کی پکی نکلی تھی۔ ابھی تک اس نے کچھ بھی کھایا نہیں تھا۔ وہ شاید غنودگی کی حالت میں تھی۔ میں تھکا ہوا تھا، کچھ ہی دیر بعد سو گیا۔ میں کسی کے ہلانے سے جاگا۔ مجھے ہمیش نے جگایا تھا۔ وہ میرے پہلو میں لیٹا ہوا تھا۔ لالٹین بجھ چکی تھی اور اس حصے میں گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ''کیا ہے؟'' میں نے ہمیش سے پوچھا۔

''وہ دیکھو، میم صاحبہ کیا کر رہی ہے؟'' ہمیش نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

میں نے دیکھا اور چونک گیا۔ ماریا کا ہیولا صاف نظر

آ رہا تھا۔ وہ تاریکی میں رینگتی ہوئی اس تھیلے تک پہنچی تھی جس میں بھنے ہوئے چنے، گڑ اور بھنے وغیرہ رکھے تھے۔ وہ تھیلے کو ٹٹول رہی تھی۔ ساتھ ساتھ چور نظروں سے دہانے کی طرف بھی دیکھ رہی تھی۔ پھر ہم نے آوازیں سنیں جن سے اندازہ ہوا کہ وہ چنے چبا رہی ہے۔ سچ کہتے ہیں کہ بھوک انسان کو بہت کچھ کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

اگلی صبح انور خاں نے کھانا پکانے کے لیے ایک چولہا تیار کر لیا تھا۔ روٹی پکانے والا ایک توا بھی چوہان دیگر سامان کے ساتھ لے کر آیا تھا۔ انور خاں ایک ہرفن مولا شخص کی طرح تھا۔ وہ زبردست اسلحہ شناس تھا۔ اس نے میری کیچڑ زدہ بھیگی ہوئی رائفل کو بالکل ٹھیک ٹھاک کر دیا تھا۔ چرواہا زبیندر سنگھ جو دور مار رائفل لے کر آیا تھا، وہ ٹکڑوں میں تھی۔ انور نے اسے بھی منٹوں میں جوڑ کر تیار کر لیا تھا۔ اس میں لیڈر شپ کی خصوصیات موجود تھیں۔ وہ لوگوں کو اکٹھا کرنا اور ان کے جھگڑے نمٹانا جانتا تھا۔ اب میں دیکھ رہا تھا کہ اسے کھانا پکانے میں بھی زبردست مہارت حاصل ہے۔ ہمیش نے آٹا گوندھا۔ انور خاں نے آلو کا سالن تیار کیا اور ساتھ زبردست پراٹھے بنائے۔

معقول کھانا ہمیں کئی دنوں بعد نصیب ہوا اور یہ انور خاں ہی کے مرہونِ منت تھا۔ انور خاں نے ایک پراٹھا، کچھ سالن اور دودھ ماریا کے سامنے بھی رکھا۔ ماریا کی آنکھوں میں بھوک چمک رہی تھی مگر اس سے پہلے کہ وہ کھانے کی طرف ہاتھ بڑھاتی اسحاق اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اس نے کھانا ماریا کے سامنے سے اٹھا لیا۔ ''ہم اس کی سیوا کرنے اور اس کے سامنے کھانے کی ٹرے سجانے کے لیے اسے یہاں نہیں لائے۔ یہ اپنا کھانا خود پکاوے گی بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ یہ پکاوے اور ہمیں بھی کھلاوے۔''

''چلو چھوڑو یار! ابھی تو کھانے دو اسے۔'' انور خاں نے پھر مداخلت کی۔

اسحاق جھنجلا گیا۔ ''انور بھائی! اگر تم نے اس طرح اس کتیا کے ناز نخرے دیکھنے ہیں تو پھر مجھ کو بولنا پڑے گا۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ اس نے آج تک ہم کو اور ہماری عورتوں کو ذلیل و خوار کیا ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ ہم اب تک اس کو لٹکا کر اس کی گردن کو دو فٹ لمبا کر چکے ہوتے لیکن اگر ہم نے یہ نہیں کیا تو پھر ہم اس کی مہمان نوازیاں بھی نہیں کریں گے۔''

''لیکن اسحاق...''

''نہیں انور بھائی۔'' اسحاق نے تیزی سے انور کی بات کاٹی۔ ''میں سچ کہتا ہوں، مجھ سے یہ سب برداشت نہیں ہوتا۔ میرے دل پر آرے چل جاوت ہیں۔ مجھے اپنی بہن کا مرنا یاد آ جاوت ہے۔ میں اس کو گولی مار دوں گا اور خود کو بھی مار لوں گا۔'' اسحاق کے لہجے میں تپش بڑھتی جا رہی تھی۔

اس تپش کو محسوس کر کے انور خاں ایک دم مسکرا دیا۔ شاید یہ اس کی عادت تھی اور یہ بہت اچھی عادت تھی۔ جب صورتِ حال گمبھیر ہوتی تھی اور تناؤ بڑھ جاتا تھا تو وہ ایک دم مسکراتا تھا اور اپنا لب و لہجہ تبدیل کر لیتا تھا۔ اس کے ایسا کرنے سے لگتا تھا کہ پوری صورتِ حال اور صورتِ حال کے سارے اسباب اچانک بدل گئے ہیں۔

انور خاں نے اپنی رائفل ایک طرف رکھی اور ماریا کے قریب بیٹھ گیا۔ وہ اپنے سامنے سے کھانا اٹھائے جانے پر سخت بھنائی ہوئی تھی۔ انور خاں نے اس کے ہاتھ کھول دیے اور بولا۔ ''چلو، اس میں برائی ہی کیا ہے؟ اپنا کھانا تم خود بنا لو۔ کسی کا احسان لینا کون سی اچھی بات ہے۔''

احسان والی بات شاید ماریا کے دل کو لگی۔ ویسے بھی وہ پچھلے قریباً ساٹھ گھنٹے سے بھوکی تھی۔ رات کو اس نے تھوڑے سے چنے ضرور کھائے تھے لیکن یہ خشک چنے اس کے گلے میں پھنس گئے تھے اور وہ دیر تک کھانسنے کے بعد بے سدھ ہو کر لیٹ گئی تھی۔ اب نقاہت کے سبب اس کا رنگ لٹھے کی طرح سفید ہو چکا تھا اور ہاتھ پاؤں میں لرزش نظر آتی تھی۔ انور خاں نے اسے سہارا دے کر چولہے کے نزدیک پہنچایا اور گندھا ہوا آٹا اس کے قریب رکھ دیا۔ وہ سخت جھنجلائی ہوئی نظر آتی تھی... جیسے یہ ثابت کرنا چاہتی ہو کہ وہ اتنی ناکارہ نہیں۔ اپنا کام خود کر سکتی ہے۔ انور خاں نے چولہے میں آگ جلا دی۔ توا پہلے ہی اوپر رکھا ہوا تھا... ماریا اپنے لیے روٹی بنانے لگی۔ یہ عمل اس کی توقع سے زیادہ مشکل ثابت ہوا۔ چار پانچ منٹ کی کوشش میں وہ پہلی روٹی بھی توے پر نہیں ڈال سکی۔ اس کے ہاتھ لتھڑ گئے اور بہت سا آٹا ضائع ہوا۔ بالآخر جو ایک روٹی اس نے توے پر ڈالی بھی، وہ عجیب نقشے کی تھی اور وہ بھی توے سے چپک کر رہ گئی۔ ایک دم ماریا جھلا کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے خشکے والی تھالی دور پھینک دی اور انگریزی میں سب کو صلواتیں سنانے لگی۔

اسحاق نے اسے بالوں سے پکڑ کر جھنجوڑا۔ ''حرامزادی! آج تک تو پکی پکائی کھاتی رہی ہے۔ نوکروں کی فوج تیرے نخرے، چوچلے اٹھانے کے لیے تیرے آگے پیچھے گھومتی رہی ہے۔ آج تجھے پتا چلا ہووے گا کہ تو اس قابل

www.pkdigest.com

تا ہیں کہ اپنے بل بوتے پر اپنا پیٹ بھی بھر سکے۔ لعنت ہے تیرے مال دولت پر۔''

وہ ایک بار پھر رونے لگی۔ شاید چیزیں اٹھا اٹھا کر بھی پھینکنا شروع کر دیتی لیکن اب وہ اسحاق کی شعلہ مزاجی سے ڈرتی بھی تھی۔ انور خاں نے اسحاق کو سمجھا بجھا کر پیچھے ہٹایا اور خود ایک روٹی پکا کر ماریا کو دی۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ نہیں کھائے گی لیکن کچھ ہی دیر بعد یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ وہ کھا رہی ہے۔ اس کے پاؤں بدستور زنجیر میں تھے۔

اسحاق تڑخ کر بولا۔ ''انور بھائی! آج تم نے اپنی من مانی کر لی ہے لیکن اس کے بعد نا ہیں۔ یہ جب تک مرنے سے بچی ہوئی ہے، اپنا کام خود کرے گی... بلکہ اس کو ہمارے کام بھی کرنے پڑیں گے۔ میں نے اس کی گردن کو ہمیشہ اکڑا ہوا دیکھا ہے۔ اگر یہ اب بھی اکڑی رہی تو پھر میں اس کو توڑ دوں گا۔ میں سچ کہتا ہوں، توڑ دوں گا۔''

اگلے روز دوپہر سے کچھ دیر بعد معلوم ہوا کہ زرگاں سے کچھ لوگ یہاں پہنچے ہیں۔ پھر معلوم ہوا کہ ان لوگوں میں حکم جی کا خاص مشیر گرومودان اور جارج گورا کا بہنوئی یعنی ماریا کا شوہر اسٹیل بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ بھاری مقدار میں اسلحہ اور تازہ دم سپاہی بھی موقع پر پہنچائے گئے تھے۔ ہمیں دہانے کے اردگرد تازی گھوڑے، بوکیر کتے اور ایک عدد جیپ بھی نظر آئی۔ یہ جیپ نہایت دشوار راستوں سے گزار کر پتا نہیں کیسے یہاں پہنچائی گئی تھی۔

ایک شخص نے دہانے کے سامنے آ کر اعلان کیا کہ گرو مودان اور اسٹیل صاحب بات چیت کرنا چاہتے ہیں۔ ہماری طرف سے جو لوگ بات کرنا چاہتے ہیں، وہ باہر آ جائیں یا پھر ہمیں اندر آنے کی اجازت دی جائے۔

انور خاں اور چوہان وغیرہ نے مشورہ کیا۔ دونوں صورتوں میں خطرہ موجود تھا۔ بہتر تھا کہ درمیانی راستہ اختیار کیا جائے۔ فیصلہ ہوا کہ سرنگ کے دہانے سے پندرہ بیس گز آگے درختوں کے درمیان بات چیت ہو اور اس گفتگو کے دوران میں دونوں طرف سے کسی طرح کی کوئی کارروائی نہ کرنے کا عہد کیا جائے۔ دس پندرہ منٹ کے اندر شرائط طے ہو گئیں۔ فیصلہ ہوا کہ انور خاں یہیں سرنگ میں رہے گا جبکہ چوہان اور فیروز آگے جا کر بات کریں گے۔ فیروز زخمی تھا، اس کے باوجود وہ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس کے اندر جو آگ جل رہی تھی، اس نے اسے اضافی توانائی دے دی تھی۔

سہ پہر ہونے والی تھی۔ درختوں کے سائے طویل ہو رہے تھے۔ چوہان اور فیروز اپنی رائفلیں کندھوں سے لٹکائے باہر نکلے۔ دوسری طرف سے سرخ لباس میں گرو مودان اور اسٹیل نمودار ہوئے۔ گرومودان چھوٹے قد کا فربہ اندام شخص تھا جبکہ اسٹیل چھریرے جسم اور نہایت اونچی ناک والا دراز قد انگریز تھا۔ سنگین صورت حال کے باوجود اسٹیل کے انداز میں بلا کا اعتماد تھا... وہ ان انگریزوں میں سے تھا جو جب تیسری دنیا کے ملکوں میں آتے ہیں تو نسلی برتری اور اپنی شان و شوکت کا احساس مستقل طور پر ان کے چہروں سے چپک جاتا ہے۔

وہ لوگ چند بلند قامت درختوں کے درمیان بیٹھ گئے اور بات چیت شروع ہوئی۔ یہ ایسی جگہ تھی کہ دونوں طرف کے رائفل بردار گفتگو کرنے والوں پر نظر رکھ سکتے تھے... انور خاں اپنی پوزیشن پر بالکل چوکس تھا۔ اس کے ہاتھ میں طاقتور اسنائپر گن تھی اور انگلی لبلبی پر تھی۔ وہ کسی بھی گڑبڑ کی صورت میں ایک ثانیے کے اندر ایکشن لے سکتا تھا۔ اسحاق مسلسل ماریا کے سر پر موجود تھا۔ ہمارے درمیان یہ طے تھا کہ اگر حکم جی کے کارندوں کی طرف سے کسی طرح کی کارروائی کی گئی تو ہم ماریا کو شوٹ کر دیں گے۔ انور خاں، احمد اور میں دہانے پر پوزیشنیں سنبھالے ہوئے تھے۔ ہم نے صورت حال پر عقابی نگاہ رکھی ہوئی تھی۔

درختوں کے نیچے ہونے والی گفتگو دس پندرہ منٹ ہی جاری رہ سکی۔ دونوں طرف برہمی نظر آ رہی تھی۔ اسٹیل بار بار ایک کاغذ چوہان کے سامنے لہرا رہا تھا اور بلند آواز میں بول رہا تھا۔ دوسری طرف چوہان بھی ترکی بہ ترکی جواب دے رہا تھا۔ یہ گفتگو تلخ کلامی پر ہی ختم ہوئی۔ جب چوہان اور فیروز واپس آنے لگے تو گرومودان نے ایک تھیلا چوہان کو دیا۔ اس تھیلے میں ماریا کی ضروریات کا سامان تھا۔

''کیا ہوا؟'' انور خاں نے چوہان سے پوچھا۔

''ابھی ان میں بہت اکڑفوں ہے۔ دماغ درست ہونے میں ابھی کچھ ٹائم لگے گا۔''

''کیا کہتے ہیں؟'' انور خاں نے پوچھا۔

''وہ صرف ایک مطالبہ مان رہے ہیں۔ سلطانہ کے والد اور بیمار بھائی کو حفاظت کے ساتھ غل پانی پہنچانے پر تیار ہیں۔''

''اور جو پچاس بندوں کی فہرست دی تھی؟''

''ان کا کہنا ہے کہ ان میں سے کم، پندرہ بیس ہمارے پاس موجود ہیں اور وہ ایسے لوگ ہیں جن پر سنگین قسم کے کیس ہیں۔ انہیں اس طرح چھوڑا نہیں جا سکتا۔''

''بکواس کرتے ہیں۔'' انور خاں بھنکارا۔ ''میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ پچاس کے پچاس لوگ حکم جی کے قبضے میں ہیں۔ ان کو اس وقت بدترین تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہو گا۔'' انور خاں نے چوہان سے پوچھا۔

''جارج گورا کو سزا دینے کے بارے میں کیا کہا گیا ہے؟''

''گرومودان کا کہنا ہے کہ جارج کے خلاف اگر ہمارے پاس کوئی ٹھوس ثبوت اور گواہی ہے تو پیش کی جائے۔ اس کے خلاف اسی طرح کارروائی ہو گی جس طرح اسٹیٹ کے کسی عام بندے کے خلاف ہو سکتی ہے... اور اگر الزام ثابت ہوئے تو پھر سزا بھی ملے گی۔''

انور خاں نے دانت پیس کر حکم جی اور اس کے مشیروں کو ایک غائبانہ گالی دی اور بولا۔ ''جس عورت کی عزت خراب کی جاتی ہے اس کی گواہی سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے... اور پھر ایک دو نہیں، سیکڑوں لوگوں نے سلطانہ کو جارج کے گھر سے اجڑی پجڑی حالت میں برآمد کیا ہے۔ اس سے بڑی گواہی اور کیا ہو گی؟ لیکن یہ لوگ جانتے ہیں کہ قانون کے محافظ بھی اپنے ہیں، عدالت بھی اپنی اور قاضی بھی اپنے۔ یہ دن دہاڑے ہزاروں لوگوں کے سامنے بھی کسی کو ناحق قتل کریں گے تو پھر بھی کسی نہ کسی شق کی وجہ سے بچ جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ سینہ تان کر قانون کی بات کرتے ہیں۔ انہیں خبر نہیں کہ جب قانون، انصاف نہیں کرتا تو پھر کچھ اور راستے نکلتے ہیں، کچھ اور طرح کی عدالتیں لگتی ہیں... اور شاید اب ایسی ہی عدالتیں لگیں گی۔'' انور خاں کی آواز غیظ سے پھٹ رہی تھی۔

''تم نے آخر میں کیا کہا ہے؟'' اسحاق نے چوہان سے پوچھا۔

''میں نے انہیں چوبیس گھنٹے کی مہلت اور دی ہے۔ میں نے کہا ہے کہ اس کے بعد ہم ماریا کی زندگی کی ضمانت نہیں دے سکیں گے۔''

''اس بیگ میں کیا ہے؟'' انور خاں نے پوچھا۔

چوہان نے کینوس کے بیگ کی زپ کھولی۔ یہ کافی بڑا بیگ تھا۔ اس میں ماریا کے استعمال کی چیزیں تھیں۔ ایک شال، کپڑوں کا ایک جوڑا۔ ٹوتھ پیسٹ، صابن، تولیا، پرفیوم، شراب، بسکٹ، نیچے بچھانے کے لیے ایک خاص قسم کی میٹ اور اس طرح کی دیگر اشیا۔

اسحاق نے بھی یہ چیزیں دیکھیں اور اس کا چہرہ سرخی مائل ہو گیا۔ ''میں اسے یہ سب کچھ استعمال نا ہیں کرنے دوں گا۔'' وہ دانت پیس کر بولا۔ ''یہ اسی طرح رہے گی جس طرح ہم رہیں گے۔ وہی کھاوے گی جو ہم کھاویں گے۔ یہ آسمان سے نا ہیں اتری ہوئی... ہماری ہی طرح ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئی ہے۔ میں یہ سب کچھ جلا دوں گا۔ اس کے سامنے جلا کر راکھ کر دوں گا۔'' وہ ایک دم بپھر گیا۔

اس نے تھیلا پکڑا اور جلتے ہوئے چولھے کی طرف بڑھا۔ انور خاں لپک کر گیا۔ ''کیا کرتے ہو اسحاق! کچھ ہوش کی بات کرو۔ یہ چیزیں کل ہمارے کام آ سکتی ہیں اور ان میں دوائیاں بھی ہیں۔ کیا پتا ہمیں اس لڑکی کے لیے ان دوائیوں کی ضرورت ہی پڑ جائے...''

اس نے اسحاق کے ہاتھ سے بیگ لینا چاہا لیکن اسحاق نے نہیں چھوڑا۔ وہ سخت لہجے میں بولا۔ ''پہلے تم کو وعدہ کرنا ہو گا انور بھائی... دواؤں کے علاوہ ان میں سے کوئی شے اس حرامزادی کے لیے استعمال نا ہیں ہووے گی۔''

''ٹھیک ہے، میں وعدہ کرتا ہوں۔'' انور خاں نے کہا اور تھیلا اسحاق سے لے لیا۔

ماریا ایک گوشے میں بیٹھی سب کچھ دیکھ اور سن رہی تھی۔ ماحول میں سخت تناؤ پایا جا رہا تھا۔ دہانے سے باہر حکم جی کے اہل کاروں کی نفری بہت بڑھ گئی تھی۔ اب ضرورت اس امر کی تھی کہ ہم بھی زیادہ چوکسی کا مظاہرہ کریں۔

اچانک شور سنائی دیا لیکن یہ شور دہانے کی طرف سے نہیں اندرونی حصے کی طرف سے تھا۔ وہاں ابھی تھوڑی دیر پہلے میں بارونڈا کے زخموں پر مرہم وغیرہ لگا کر آیا تھا۔ اس کی اگلوٹی ٹانگ کو انور نے دہرا کر کے زنجیر سے باندھ دیا تھا۔ اب یہ ٹانگ کھل نہیں سکتی تھی۔ میں نے اس کی دبلی پتلی پنڈلی کے زخم پر دوا لگانے کے لیے اس کی زنجیر کو تھوڑا سا ڈھیلا کیا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ تھوڑی سی ڈھیل اس شخص کے لیے کافی زیادہ ثابت ہو گی اور وہ ایک ہنگامہ کھڑا کر دے گا۔

ہم آوازوں کی سمت دوڑے۔ عجیب الخلقت بارونڈا ایک لکڑی کے سہارے تیزی سے ایک سمت دوڑا جا رہا تھا۔ احمد اس کے پیچھے تھا اور انگریزی میں پکار رہا تھا۔ ''رک جاؤ... میں کہتا ہوں رک جاؤ۔''

ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے احمد نے بارونڈا کو دبوچ لیا۔ ہمارا خیال تھا کہ اب بارونڈا احمد کی گرفت میں بے بس ہو گیا ہے۔ احمد اسے آسانی سے سنبھال لے گا مگر ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ بارونڈا نے جنونی انداز میں چلاتے ہوئے زور مارا اور خود کو احمد کی گرفت سے چھڑا لیا۔ احمد لڑکھڑا کر پیچھے گیا اور دوبارہ بارونڈا کی طرف بڑھا۔ تب بارونڈا نے

www.paksociety.com

اپنی بیسا کھی کو لاٹھی کی طرح استعمال کیا اور اس کی دھکیل سے ایک بار پھر احمد کو لڑکھڑانے پر مجبور کر دیا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ احمد سے مقابلے پر آمادہ ہے۔ احمد کوئی عام آدمی نہیں تھا۔ وہ ایک پروفیشنل لڑاکا تھا۔ وہ کراٹے میں الٰہ آباد کا چیمپئن تھا اور کئی اہم مقابلوں میں حصہ لے چکا تھا۔ اس کے لیے بارونڈا جیسے معذور و مدقوق شخص پر غالب آنا قطعی مشکل نہیں تھا۔ اس نے بھنا کر کھڑے کھڑے ایک زوردار لات بارونڈا کے منہ پر رسید کی۔ وہ ڈکراتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا۔ یوں لگا کہ اس کی ایک آدھ ہڈی ٹوٹ گئی ہوگی، مگر کچھ بھی تھا اس شخص کی سخت جانی ہم بدبودار کشتی میں دیکھ چکے تھے۔ میری اور اسحاق کی کئی سخت ضربات وہ بہ آسانی جھیل گیا تھا۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ وہ چوٹ کھا کر مردہ چھپکلی کی طرح گرا ضرور لیکن پھر اپنے اکلوتے پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ یہاں احمد سے اندازے کی غلطی ہوئی یا شاید اسے غلطی نہیں کہنا چاہیے۔ احمد کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو بارونڈا جیسے لاغر و مدقوق شخص کے سامنے اسی طرح کا ردِعمل ظاہر کرتا۔ احمد نے تیزی سے آگے بڑھ کر بارونڈا کو گردن سے دبوچنا چاہا۔ بارونڈا نے اس کی ناف پر گھٹنے کی ضرب لگائی پھر اس کے جبڑے پر ایک کارگر مکا رسید کر کے دوبارہ بھاگ کھڑا ہوا۔

احمد کے لیے یقیناً یہ صورتِ حال سبکی اور طیش کا باعث تھی۔ وہ ایک مانا ہوا فائٹر تھا۔ وہ اپنی طرف سے اب تک اس لاغر شخص کو رعایت دیتا رہا تھا۔ اس نے جھپٹ کر بارونڈا کو ایک بار پھر دبوچ لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان دونوں میں زبردست جدوجہد شروع ہو گئی۔ آنے والے دو تین منٹ بے حد حیرت ناک تھے۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں ہوا۔ لاغر بارونڈا نے نہ صرف احمد کا ڈٹ کر مقابلہ کیا بلکہ آخر میں اچانک اس کا پلڑا بھاری ہو گیا۔ اس نے بڑی تیزی سے احمد کے دو تین وار بچائے، پھر دفعتاً کراٹے کے ہی انداز میں گھوم کر لات چلائی۔ اس کی ایڑی احمد کی کنپٹی کے آس پاس کہیں لگی۔ اس سے پہلے کہ احمد اس ضرب سے سنبھل سکتا، اس کی بیسا کھی نے ایک بار پھر لاٹھی کا کام کیا۔ اس کی بھرپور ضرب احمد کی پیشانی پر لگی، احمد پشت کے بل دیوار سے ٹکرایا اور تکلیف کی شدت سے دہرا ہو گیا۔

اسحاق نے اپنی ٹرپل ٹو رائفل سیدھی کی اور صرف آٹھ دس فٹ کے فاصلے سے بارونڈا کو نشانے پر لے لیا۔

”خبردار... شوٹ کر دوں گا۔“ وہ چلایا۔

میں نے بھی رائفل بارونڈا کی طرف سیدھی کر لی۔ اس موقع پر وہ مزید ”اپنی ٹیلنٹسی“ دکھانے کی کوشش کرتا تو ہم یقیناً اس پر گولی چلا دیتے۔ جان سے نہ بھی مارتے تو زخمی ضرور کر دیتے۔ وہ ایک دم بیٹھ گیا اور دیوار سے ٹیک لگا کر انگریزی میں دہائی دینے لگا۔

”مجھے شراب دو۔ نہیں تو میں مر جاؤں گا۔ میری موت کی ذمے داری تم پر ہوگی۔“ پھر وہ سب کو مشترکہ گالیاں دینے لگا اور اس بات پر صلواتیں سنانے لگا کہ ہم اسے اس کے گھر سے نکال کر کیوں لائے ہیں۔

وہ اس خستہ حال سڑی ہوئی کشتی کو اپنا گھر قرار دے رہا تھا۔ انور خاں بھی وہاں پہنچ گیا۔ وہ بھی بارونڈا اور احمد کی لڑائی کے آخری مناظر دیکھ چکا تھا۔ ہم سب کی طرح اس کی آنکھوں میں بھی تعجب تھا۔ انور اردو میں بولا۔ ”یارو! اس کی ٹانگیں قبر میں لٹکی ہوئی ہیں پھر بھی اس نے احمد کو لمبا لٹا دیا ہے۔ اگر یہ خدائی خوار صحت مند ہوتا تو کیا کرتا؟“

انور خاں اس بات پر مجھ سے تھوڑا سا خفا بھی ہوا کہ میں نے مرہم پٹی کے وقت اس کی زنجیر تھوڑی سی ڈھیلی کر دی تھی۔ میں نے اپنی اس غلطی کو تسلیم کیا۔ بارونڈا کو دبوچ کر ہم نے ایک بار پھر اس کی اکلوتی ٹانگ کو دہرا کیا اور اسے زنجیر میں کسا۔ چونکہ ہم زیادہ تھے اس لیے بارونڈا کوئی خاص مزاحمت نہیں دکھا سکا۔ اسے دبوچتے وقت میں نے اس کے بدن بھر کے جسم کی عجیب سی سختی کو محسوس کیا۔ مجھے لگا کہ اس کی ہڈیوں پر کسی انسان کی نہیں کسی بھینسے کی کھال منڈھی ہوئی ہے۔ سوکھی سڑی ہونے کے باوجود وہ جلد اپنے اندر عجیب سا کھردرا پن رکھتی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ یہ بظاہر مدقوق و بیمار شخص کئی ایک سخت ضربات آسانی سے سہہ گیا تھا۔

احمد کا نچلا ہونٹ پھٹ گیا تھا۔ ایک ہاتھ کے پنجے پر بھی گہری چوٹ آئی تھی۔ چوہان نے کہا۔ ”آؤ میرے ساتھ، میں تمہاری بینڈیج کر دوں۔“

احمد لنگڑاتا ہوا اس کے ساتھ چل دیا۔ وہ بھی واضح طور پر حیران نظر آ رہا تھا۔ میں بھی ان کے ساتھ چل دیا۔

”یار! یہ کیا بلا ہے؟“ چوہان نے پوچھا۔

”مجھے امید نہیں تھی کہ یہ اتنا سخت جان نکلے گا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ کسی وقت مارشل آرٹ کا ٹھیک ٹھاک کھلاڑی رہا ہے۔ دفاع اور حملے کی ہر باریکی کو سمجھتا ہے یہ۔“ احمد کے لہجے میں بدستور حیرت موجزن تھی۔

”وہاں کشتی میں بھی اسحاق نے اسے بری طرح مارا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”دو چار ٹھوکریں میں نے بھی لگائی تھیں۔ لگتا تھا کہ ہم کسی جیتے جاگتے بندے کو نہیں، لکڑی کے پتلے کو مار رہے ہیں۔ اس وقت یہ سخت نشے میں تھا۔ ہم نے سمجھا تھا، شاید نشے کی وجہ سے یہ ساری چوٹیں جھیل گیا ہے۔“

”اس کا کوئی اتا پتا معلوم ہونا چاہیے۔ پھر ہی کوئی جانکاری ہو سکتی ہے اس کے بارے میں۔“ انور خاں نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔

انور خاں جب بھی بارونڈا کے بارے میں کوئی بات کرتا تھا یا اس کی طرف دیکھتا تھا تو مجھے لگتا تھا کہ وہ اس کے بارے میں کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ شاید وہ اس سے پہلے بھی بارونڈا کو کہیں دیکھ چکا تھا۔

ڈاکٹر چوہان نے احمد کی مرہم پٹی کر دی۔ احمد عجیب گومگو کی کیفیت میں تھا۔ ایک طرح کی شرمندگی بھی اسے محسوس ہو رہی تھی تاہم اس شرمندگی پر حیرت اور الجھن کے تاثرات غالب تھے۔

چوہان نے کہا۔ ”اپنی شکل و صورت اور لہجے سے یہ شخص نیپالی کا لگتا ہے لیکن جہاں تک میری جانکاری ہے، نیپالی تو مارشل آرٹس کے کوئی ایسے شوقین نہیں ہوتے...“

”ڈاکٹر چوہان! مجھے آپ کی بات سے اتفاق نہیں۔“ احمد نے کہا۔ ”کھٹمنڈو وغیرہ میں، میں نے خود کک باکسنگ اور کراٹے وغیرہ کے بڑے بڑے کلب دیکھے ہیں۔ اور پھر آپ یہ کیوں بھول رہے ہیں کہ جیکی جیسا خوفناک فائٹر جس نے یورپ تک تہلکہ مچایا تھا اور امریٹ فائٹنگ میں ایشیائی چیمپئن مانا جاتا تھا، نیپال سے ہی تعلق رکھتا تھا۔“

مارشل آرٹس میں جیکی کا نام تو میں نے بھی سن رکھا تھا۔ لاہور میں جب گاہے بگاہے مجھ پر مارشل آرٹ کا جنون سوار ہوتا تھا اور میں نئے سرے سے اپنے پرانے کلب میں جانا شروع کرتا تھا تو پھر مارشل آرٹ کی سرگرمیوں کے حوالے سے بہت سی خبریں میرے کانوں تک بھی پہنچا کرتی تھیں۔ پاکستان میں کیا ہو رہا ہے، بین الاقوامی مقابلے کہاں کہاں منعقد ہو رہے ہیں، کون کون سے بڑے کھلاڑی ابھر کر سامنے آ رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ مارشل آرٹس سے متعلق رسائل و جرائد بھی کلب میں آتے تھے جو معلومات میں اضافے کا سبب بنتے تھے۔

ہمارے درمیان کچھ دیر تک عجیب الخلقت بارونڈا کے بارے میں بات ہوتی رہی... پھر انور خاں نے ہمیں دہانے کی طرف بلا لیا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہم اپنے مورچے سے زیادہ دور نہ جائیں۔ اور وہ ٹھیک ہی کہتا تھا، حالات ہمیں اس کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔ احمد بھی اپنی پوزیشن پر میرے برابر آ کر بیٹھ گیا لیکن وہ چپ چپ تھا۔ وہ واضح طور پر ہزیمت محسوس کر رہا تھا۔ فنِ حرب اس کی شناخت تھا اور آج ایک لاغر شخص نے اس فن میں اسے نیچا دکھایا تھا۔

شام کے وقت میں سرنگ کے عقبی حصے میں گیا تو یہاں دھپ دھپ کی آوازیں آئیں۔ آگے جا کر دیکھا تو احمد پسینے میں شرابور مشق میں مصروف تھا۔ دو دن پہلے اس نے ایک بیگ میں ریتلی مٹی بھر کر اسے سرنگ کی چھت سے لٹکا دیا تھا اور صبح کے وقت اس پر پنچ آزمائی کرتا تھا لیکن آج وہ چونکہ تاؤ میں تھا اس لیے شام کے وقت بھی لگا ہوا تھا۔ میں اس کو نیڈ بیگ پر گھونسے برساتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس کی گھونسوں میں جان تھی۔ جو ضربات وہ نیڈ بیگ کو لگا رہا تھا، وہ واقعی ایک چیمپئن کی ضربات نظر آتی تھیں۔ اس کا اسٹیمنا بھی قابلِ تعریف تھا۔

میں اسے دیکھتا رہا۔ پھر میں نے اسے بتایا کہ میں بھی کراٹے میں دلچسپی رکھتا ہوں اور لاہور میں کئی سال تک ایک کلب سے منسلک رہا ہوں۔ ہم جب باتیں کر رہے تھے، تھوڑے ہی فاصلے پر موجود بارونڈا نے ایک بار پھر واویلا شروع کر دیا۔ وہ شکستہ آواز میں سب کو گالیاں دے رہا تھا اور اپنے لیے شراب طلب کر رہا تھا۔ انگریزی کے علاوہ وہ گاہے بگاہے نیپالی میں بھی بولنے لگتا تھا۔ اس کی نیپالی سننے کے بعد اب اس میں شک شبے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ وہ نیپال سے ہی تعلق رکھتا ہے۔

میں اس کے قریب جا بیٹھا۔ وہ انگریزی میں بولا۔ ”اپنی یہ رائفل یہاں... یہاں میرے دل پر رکھو اور گولی چلا دو۔ میں اب جلدی مرنا چاہتا ہوں۔ شراب کے بغیر میرے لیے سانس لینا بھی مشکل ہو رہا ہے۔ تم سب کے سب اپنے بال بچوں سمیت جہنم میں جاؤ گے... کیونکہ تم نے ایک بندے کو جیتے جی جہنم میں ڈال دیا ہے۔“

میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر ہولے سے کہا۔ ”تم تسلی رکھو۔ میں رات کو تمہارے لیے کچھ نہ کچھ کروں گا۔ لیکن شور شرابا کرتے رہو گے تو پھر کچھ نہیں ہو سکے گا۔“

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ”تم شراب کی بات کر رہے ہو؟“

”کہا ہے نا آہستہ بولو۔“ میں نے اسے سرگوشی میں ڈانٹا۔

وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔

رات کو پھر دوسرے پہر تک ہماری ڈیوٹی تھی۔ یعنی میں، فیروز، اسحاق اور مہیش۔ ایک بجے کے قریب ہم سونے کے لیے لیٹ گئے۔ میرے پہلو میں مہیش جلد ہی سو گیا لیکن میں جاگتا رہا۔ کچھ دیر بعد میں اٹھا اور اس تاریک گوشے میں پہنچ گیا جہاں کینوس کا بڑا بیگ رکھا تھا۔ اسی بیگ میں آج

www.pkdigest.com

ماریا فرگوسن کے لیے ضروری اشیا آئی تھیں۔ ان ضروری اشیا میں، میں نے اعلیٰ درجے کی شراب کی دو بوتلیں بھی دیکھی تھیں۔ میں نے بغیر کوئی آواز پیدا کیے ایک بوتل نکالی اور سرنگ کے اس عقبی حصے میں پہنچ گیا جہاں ایک چٹائی پر ایک بازو اور ایک ٹانگ والا بارونڈا دراز تھا۔ میرے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ اس لالٹین کی روشنی میں بارونڈا کسی بچھوے کی طرح حقیر اور بے جان نظر آرہا تھا لیکن اس بچھوے کے اندر جو ہلکی چمک سی تھی، اس کا مشاہدہ آج سہ پہر ہم نے کیا تھا۔

مجھے دیکھ کر بارونڈا کی نقاہت بھری آنکھیں چمک اٹھیں۔ پھر جب اس کی نگاہ میرے ہاتھ میں پکڑی بوتل پر پڑی تو وہ یوں اٹھ کر بیٹھ گیا جیسے اسے کسی طاقتور اسپرنگ نے دھکیلا ہو۔ میں جانتا تھا کہ وہ بلانوش ہے اور اگر میں نے بوتل اسے تھمائی تو ہوسکتا ہے کہ وہ تھوڑی دیر میں ہی اسے ختم کر ڈالے۔ ''مجھے دو۔ میرا گلا بالکل خشک ہو رہا ہے۔'' وہ تڑپ کر بولا۔

''لیکن تمہیں صرف اتنی ہی پینی ہوگی جس سے تمہارا کام چل جائے۔ میرے پاس صرف ایک ہی بوتل ہے۔''

وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے بولا۔ ''مجھے دو... میں مر رہا ہوں۔'' اس کی بے تابی دیدنی تھی۔

میں نے اسے گلاس میں ڈال کر دی۔ وہ اپنے اکلوتے ہاتھ سے غٹاغٹ چڑھا گیا اور ایک بار پھر کسی بھکھنگے کی طرح میلا کچیلا گلاس میرے سامنے کر دیا۔ میں نے دوبارہ اس کا گلاس بھرا۔ وہ یہ بھی سانس لیے بغیر پی گیا۔ وہ بالکل ''نیٹ'' پی رہا تھا اور یوں لگتا تھا کہ پانی پی رہا ہو۔ تیسرے پیگ کے بعد اس کی طبیعت کچھ بحال ہوگئی۔ اس نے اپنا سر پیچھے کی طرف پھینک دیا اور آنکھیں بند کرلیں۔ اسے نشہ چڑھنا شروع ہوگیا تھا۔ لالٹین کی روشنی میں اس کے چہرے کا دایاں رخ نظر آرہا تھا۔ اسی رخ میں عمران کے چہرے کی جھلک تھی۔ میں بے ساختہ اس کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ مجھے عمران کی مسکراہٹ یاد آئی۔ اس کی آواز، اس کے بالوں کا اسٹائل... میرا دل دکھ سے بھر گیا۔ وہ جا چکا تھا... اس خونی رات میں ڈیک ڈے کے قاتل پانی نے اسے نگل لیا تھا۔

کچھ دن پہلے نگوڈا میں میڈم صفورا نے بھی یہی بتایا تھا کہ وہ عمران کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ یعنی وہ مجھے عمران کے بارے میں کوئی اچھی خبر نہیں سنا سکی تھی۔ لیکن پتا نہیں کیوں... کسی وقت میرا دل پکار پکار کر یہ کہنے لگتا تھا کہ میں اسے ضرور دیکھوں گا۔ کم از کم ایک بار ضرور دیکھوں گا۔ کہیں نہ کہیں... کسی نہ کسی جگہ، کسی چمکیلی صبح کو، کسی سرمئی شام کو یا کسی ویسی ہی تاریک رات کو جب اسے آخری بار دیکھا تھا۔ اس خیال کی کوئی بھی وجہ نہیں تھی لیکن یہ ایک دیوانی آس بن کر میرے دل میں پیوست رہتا تھا۔ رات کے اس پہر جب چار سو خاموشی تھی، اس سرنگ سے باہر جنگل میں جانوروں کی آوازیں گونجتی تھیں اور کبھی کبھی دہانے کی طرف آسمانی بجلی کی چمک دکھائی دیتی تھی... وہاں بیٹھے بیٹھے میرے دل کی کیفیت عجیب ہوگئی اور یہ کیفیت اکثر طاری ہو جاتی تھی۔ بچھڑنے والے اتنی شدت سے یاد آتے تھے کہ دل کی رگیں ٹوٹنے لگتی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ جانکاہ خیال دل میں پیدا ہوتا تھا کہ میں واپس لوٹنے میں بہت دیر کر چکا ہوں۔ دو ڈھائی سال کا عرصہ میں نے مکمل بے خبری میں گزار دیا ہے، حالانکہ اس وقت کا ایک ایک لمحہ میرے لیے بے حد قیمتی تھا۔

میں جاگتا رہا۔ میری بے تابی بڑھتی رہی۔ میں اٹھ کر سرنگ میں ٹہلنے لگا... جسم جیسے بخار میں پھنک رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ ساری دیواریں توڑ کر سارے ناتوں سے منہ موڑ کر آندھی طوفان کی طرح یہاں سے نکل جاؤں۔ سامنے ہی وہ سینڈ بیگ جھول رہا تھا جس پر احمد ایکسرسائز کرتا تھا۔ اپنے اندر بھڑکتی ہوئی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے میں اس سینڈ بیگ کے ساتھ مصروف ہوگیا۔ مارشل آرٹس کے حوالے سے میں نے جو کچھ سیکھا تھا وہ میرے اندر موجود تھا۔ بس اس پر وقت کی گرد پڑی ہوئی تھی۔ میں نے سینڈ بیگ پر طبع آزمائی شروع کی تو جیسے وقت کی پڑی ہوئی گرد صاف ہونے لگی۔ سب کچھ تازہ ہوگیا اور میں محسوس کر رہا تھا کہ یہ تازگی کچھ اور طرح کی ہے۔ گئے برسوں میں بھی میں سینڈ بیگ کے ساتھ بہت وقت گزار چکا تھا لیکن آج کی ملاقات کچھ اور طرح کی تھی۔ اس ملاقات میں وہ بے پناہ حرارت بھی شامل تھی جو پچھلے چند ہفتوں میں میرے اندر پیدا ہوئی تھی۔ اس حرارت کے کچھ ماخذ تھے۔ اپنی ماں کا مرا ہوا چہرہ... عمران کے سینے پر لگتا ہوا رائفل کا برسٹ... سیٹھ سراج کا منحوس چہرہ... اور پھر آخری منظر... جو شاید اپنی تازگی کی وجہ سے سب سے زیادہ تکلیف دیتا تھا... جارج گورا کے بیڈروم کا بند ہوتا دروازہ اور اس کے پیچھے اوجھل ہوتا سلطانہ کا زرد چہرہ۔

میں سینڈ بیگ پر اندھادھند گھونسے اور ٹھوکریں برساتا چلا گیا۔ میری لگائی ہوئی ضربات کی آواز سرنگ میں دور تک جارہی تھی لیکن میرے ساتھیوں میں سے کوئی نہیں آیا۔ کچھ تو سو رہے تھے اور جو جاگ کر پہرا دے رہے تھے، انہوں نے یہی سمجھا کہ شاید احمد اپنی ورزش میں مصروف ہے۔ میں جب ہانپ جاتا تو تھوڑی دیر کے لیے رک جاتا۔ سانس بحال ہوتی

تو پھر زور آزمائی شروع کر دیتا۔

اچانک مجھے محسوس ہوا کہ کوئی میرے قریب اندھیرے میں موجود ہے اور مجھے دیکھ رہا ہے۔ میں نے آنکھیں سکیڑ کر دیکھا اور حیران ہوا۔ وہ بارونڈا تھا۔ وہ گھسٹتا ہوا یہاں پہنچا تھا اور نہ جانے کب سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ ''تم یہاں؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''ہاں... اگر تم مجھے اپنی بوتل میں سے ایک بڑا پیگ اور پلا دو تو میں تمہیں تمہارے اس مارشل آرٹ کے بارے میں ایک بڑے کام کی بات بتاؤں گا۔'' وہ انگریزی میں بولا۔

''پہلے بتاؤ کہ تم یہاں کیسے پہنچے؟'' میں نے جیب سے چھوٹی ٹارچ نکال کر اس کا ننگ دھڑنگ جسم دیکھا۔ اس کی ٹانگ بدستور زنجیر میں جکڑی ہوئی تھی۔

''اس بات کو چھوڑو۔ پیاسا کنوئیں کے پاس پہنچ ہی جاتا ہے۔'' شراب پینے کے بعد اس کی آواز کی لڑکھڑاہٹ کافی کم ہوگئی تھی اور وہ قدرے توانا بھی نظر آتا تھا...

''تم مجھے کام کی بات کیا بتاؤ گے؟ کیا تمہارا تعلق فائٹنگ آرٹ سے رہا ہے؟''

''بس تھوڑا بہت۔ کھٹمنڈو میں استاد کھلاڑیوں کو دیکھتا رہا ہوں۔ تم مجھے چند گھونٹ دو، میں تمہیں کچھ شاندار ٹپس دوں گا۔'' وہ للچانے والے انداز میں بولا۔

پتا نہیں کیوں میں اس سے ہمدردی محسوس کرتا تھا۔ عمران کی شباہت کی جھلک بھی ایک وجہ ہوسکتی تھی لیکن شاید اس کے علاوہ بھی کچھ تھا۔

میں نے اسے ایک درمیانے سائز کا پیگ اور دیا۔ یہ پیگ اس نے ذرا تحمل سے پیا اور خاصا مسرور نظر آنے لگا۔ اس کے اندر کی بے پناہ تشنگی اور جھلاہٹ بھی قدرے کم نظر آنے لگی۔ وہ اپنے لنگوٹ کے اندر اپنی دبلی پتلی رانوں کو کھجاتے ہوئے بولا۔ ''دیکھو... تم جب مکا چلاتے ہو تو اس میں صرف اپنے بازو اور کندھے کی طاقت استعمال کرتے ہو۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ تم اپنی طاقت کا صرف چوتھا پانچواں حصہ استعمال کرتے ہو۔ تمہارے مکے میں تمہارے پورے جسم کی طاقت استعمال ہونی چاہیے۔ پاؤں سے لے کر سر تک پورے جسم کی۔''

وہ خود کو زمین پر کھسکاتا ہوا سینڈ بیگ کے پاس پہنچ گیا پھر اس نے مجھے سینڈ بیگ پر مکا چلا کر دکھایا۔ ''اس طرح۔'' وہ بولا۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچا تھا لیکن واقعی میں نے محسوس کیا کہ اس کے مکے میں کوئی بات ہے۔

اس نے جیسے ہانپ کر دیوار سے ٹیک لگالی۔ ذرا دیر کھانستا رہا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے ماہرانہ انداز میں بولا۔ ''توازن... فائٹنگ آرٹ میں توازن کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ میں تمہیں دیکھ رہا تھا۔ جب تم ضرب لگاتے ہو تو یہ تصور کر لیتے ہو کہ یہ ضرب تمہارے مقابل کو ضرور لگے گی۔ سینڈ بیگ کی حد تک تو یہ سوچ درست ہے لیکن جب تمہارا مدمقابل متحرک ہوتا ہے تو پھر کوئی ضرب اس کو لگتی ہے، کوئی نہیں لگتی۔ تم جس انداز میں ضرب لگاتے ہو، وہ خطا ہونے کی صورت میں تمہارے توازن کو بری طرح بگاڑ دے گی اور ہوشیار مدمقابل اس سے فوراً فائدہ اٹھائے گا۔''

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ شراب ملنے کے بعد وہ بالکل بدلا ہوا شخص نظر آتا تھا۔ لگتا تھا کہ یہ بری شے اس کے جسم میں پہنچ کر اثر دکھا رہی تھی۔ وہ بڑے یقین سے بولا۔ ''اگر تم مقابلوں میں حصہ لیتے رہے ہو تو مجھے یقین ہے کہ تمہارے سر کے پچھلے حصے اور دائیں کندھے پر ضرور سخت چوٹیں آئی ہوں گی اور اس کی وجہ یہی توازن کی کمی ہے۔''

میں ایک دم سناٹے میں رہ گیا۔ بارونڈا نے یہ بات سو فیصد درست کہی تھی۔ کلب اور انٹر کلب مقابلوں میں اکثر میرے دائیں کندھے پر چوٹ لگ جاتی تھی۔ ایک ایسی ہی چوٹ کی وجہ سے ایک مرتبہ میں ایک فائنل مقابلے میں تڑپتے تڑپتے رہ گیا تھا۔ یہ کئی برس پرانی بات تھی۔

میں تعجب سے اس عجیب وضع مدقوق شخص کی طرف دیکھنے لگا... میں نے کہا۔ ''تم کہتے ہو کہ تم کھٹمنڈو میں استاد کھلاڑیوں کے مقابلے دیکھتے رہے ہو... انہیں دیکھ دیکھ کر تمہیں خود بھی تو کھیلنے کا شوق پیدا ہوا ہوگا؟''

''ہاں، کسی وقت میں خود بھی کھیلتا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''نیپال کے ایک کھلاڑی جیکی کا نام بہت مشہور ہوا تھا۔ ہمارے کلب میں ''انٹرنیشنل کراٹے پلیئرز'' کے ساتھ جیکی کی تصویر بھی لگی ہوئی تھی۔ کیا تم نے کبھی اس کو بھی دیکھا؟''

''ہاں ہاں جیکی... وہ تو نیپال کا چمکتا ستارہ تھا۔ اس نے تھائی اور جاپانی فائٹرز کے چھکے چھڑا دیے تھے۔ زبردست کھلاڑی... زبردست کھلاڑی تھا۔'' وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔

''اب وہ کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اب وہ نیپال چھوڑ چکا ہے۔ ویسے بھی اب وہ اس فیلڈ میں نہیں ہے۔''

www.pkdigest.com

''تمہارا مطلب ہے کہ وہ مارشل آرٹ کو خیر باد کہہ چکا ہے؟''

''نہیں۔'' اس نے سر کو دائیں بائیں ہلایا۔ اس کے لمبے بال اس کے چہرے پر جھولنے لگے۔ ''جو شخص ایک بار بچپن کے ساتھ مارشل آرٹ سے منسلک ہو جاتا ہے، وہ پھر کبھی بھی اسے مکمل طور پر نہیں چھوڑ سکتا۔ ناٹ ایٹ آل۔ اور جنگلی تو ایسا شخص ہے جس کے خون میں یہ آرٹ رچ بس چکا ہے... وہ اس کے علاوہ کچھ اور سوچ ہی نہیں سکتا۔ وہ بڑا انوکھا شخص ہے۔''

''اگر کوئی شخص اس سے ملنا چاہے تو؟'' میں نے پوچھا۔

''میں... میں تمہیں اس کا مکمل پتا بتا سکتا ہوں۔ یہ پتا... یہ پتا شاید ہی کسی کو معلوم ہو۔ لیکن اس کے لیے... اس کے لیے... تمہیں تھوڑی سی اور مہربانی کرنا پڑے گی۔'' اس نے دور کونے میں رکھی ہوئی وات 69 کی بوتل کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

''تم حد سے بڑھ رہے ہو۔'' میں نے کہا۔

وہ ہنسا اور چہرے کے جھاڑ جھنکاڑ بالوں میں سے اس کے میلے دانت جھلک دکھانے لگے۔ میں نے اسے پہلی بار ہنستے ہوئے دیکھا تھا۔ ''تم حد کی بات کر رہے ہو... اور حد تو ابھی شروع بھی نہیں ہوئی۔ لیکن مجبوری ہے، تم دو ڈبل پیگ اور دے دو تو میرا گزارہ ہو جائے گا۔''

''اسپرٹ نے تمہارا بیڑا غرق کر دیا ہے... اور پیو گے تو تمہاری ہڈیاں بھی کھوکھلی ہو کر ٹوٹنے لگیں گی۔''

''بھئی تو میں چاہتا ہوں کہ یہ ہڈیاں جلد ٹوٹنا شروع ہو جائیں۔'' اس نے بے پروائی سے کہا پھر بری طرح کھانسنے لگا۔ کھانستے کھانستے دہرا ہو گیا۔ ''دیکھو... میرا پہلا نشہ بھی غارت ہو رہا ہے۔ اگر میں دو پیگ اور لگا لوں گا تو میرا پہلا نشہ بھی بچ جائے گا اور میری آخری راتوں کی یہ رات بھی تھوڑی سی خوب صورت ہو جائے گی۔ اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس کے بدلے میں تمہیں نیپال کے اکلوتے ''سپر اسٹار مارشل'' کا پتا بھی بتاؤں گا۔'' وہ شستہ انگریزی میں بات کر رہا تھا۔

میں کچھ دیر سوچتا رہا، پھر میں نے بوتل اٹھائی اور قریباً نصف گلاس بھر کر اس کے سوکھے سڑے ہاتھ میں تھما دیا۔ یہ گلاس اس نے غٹاغٹ چڑھا جانے کے بجائے گھونٹ لے لے کر پیا۔ اس کے نیم مردہ چہرے پر عجیب سی تمتماہٹ آتی جا رہی تھی۔ حسب وعدہ مجھے دوسرا گلاس بھی دینا پڑا۔ اب بوتل میں فقط تین چار انچ شراب ہی باقی رہ گئی تھی... بوتل میں نے ایک طرف چھپا دی۔ میرا خیال تھا کہ وہ عام شرابیوں کی طرح ساتھ میں کچھ کھانے کے لیے بھی مانگے گا لیکن اس نے کچھ نہیں مانگا۔ شاید اس کی سانسوں کی ڈور بس شراب کے ساتھ ہی بندھی ہوئی تھی۔

وہ دوسرے گلاس میں سے نصف ''آگ'' اپنے اندر انڈیل چکا تو میں نے کہا۔ ''تم مجھے جنگلی کے بارے میں کچھ بتانے جا رہے تھے۔''

''تم... اس سے ملنا... چاہتے ہو؟'' وہ لڑکھڑاتی آواز میں بولا۔

''ہو سکتا ہے کہ کسی وقت ایسا موقع آ ہی جائے۔''

وہ عجب ترحم آمیز آواز میں بولا۔ ''تم کہتے ہو کہ تمہارے کلب میں جنگلی کی تصویر لگی ہوئی تھی، کیا تم اس تصویر کو غور سے دیکھا کرتے تھے؟''

''ہاں... لیکن تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''میرا مطلب ہے کہ اگر کبھی جنگلی تمہارے سامنے آئے تو تم اسے پہچان سکتے ہو؟''

''میرا خیال ہے کہ پہچان سکتا ہوں۔''

''لیکن میرا خیال ہے کہ تم دھوکا کھا جاؤ گے۔ وقت کے ساتھ چہرے بہت بدل جاتے ہیں۔''

''تم کیا کہنا چاہتے ہو؟'' میں نے بری طرح چونک کر پوچھا۔

''میں کہتا ہوں کہ تم دھوکا کھا جاؤ گے۔ جیسے دوسرے دھوکا کھا جاتے ہیں۔ جنگلی ان کے سامنے ہوتا ہے لیکن وہ اسے پہچان نہیں سکتے۔'' لالٹین کی زرد روشنی میں وہ عجیب ڈرامائی انداز میں میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اچانک مجھے لگا کہ میرے بدن کا سارا خون تیز رفتاری سے میرے سر کی طرف دوڑ پڑا ہے۔ پورے جسم پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ میں ساکت نظروں سے بارونڈا کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ اس کے لمبے بالوں اور چہرے کے جھاڑ جھنکاڑ میں مجھے کچھ جانے پہچانے خدوخال نظر آئے۔

وہ اپنے بدنما دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے پُردرد انداز میں مسکرایا۔ ''ہاں... تم میرے بتائے بغیر ہی ٹھیک جگہ پر پہنچ گئے ہو۔ جنگلی تمہارے سامنے ہے۔ نیپال کا درخشندہ ستارہ، ایشیائی چیمپئن، انٹرنیشنل کرائے سپر اسٹار، اسٹریٹ فائٹنگ کا بادشاہ۔ ہاں ہاں، وہ سب کچھ میں ہی ہوں۔''

''لیکن... یہ... کیسے ہو سکتا ہے؟''

''یہ دنیا ہے۔ یہاں سب کچھ ہو سکتا ہے۔ جہاں تم جی جیسے شیطان ہوں، جہاں جارج اور اسٹیل جیسے بھیڑیے ہوں، وہاں سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن تمہیں ان چکروں میں پڑنے کی ضرورت نہیں... بالکل ضرورت نہیں۔''

میں ہکا بکا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ مجھے وہ مناظر یاد آئے جب اسحاق اور میں اسے بدبودار کشتی میں بری طرح پیٹ رہے تھے اور وہ ہماری ضربوں کو حیران کن آسانی سے جھیل رہا تھا اور پھر یہاں اس سرنگ میں آج صبح کا واقعہ نگاہوں میں تازہ ہوا۔ جواں سال صحت مند احمد اس لاغر معذور کو دست بدست لڑائی میں زیر کرنے میں ناکام رہا تھا۔

وہ نشے کی ترنگ میں بولا۔ ''اگر تم مجھ سے آٹوگراف لینا چاہتے ہو تو تمہیں مایوسی ہوگی۔ دراصل میں بائیں ہاتھ سے لکھتا تھا اور میرا بایاں ہاتھ کاٹ دیا گیا ہے۔ ہاں، اگر تم میرا انٹرویو لینا چاہو تو لے سکتے ہو۔ تم یہ انٹرویو کسی اخبار یا ٹی وی چینل کو دے کر بہت پیسے بنا سکتے ہو۔ جنگلی کے آخری انٹرویو کے طور پر یہ بڑی شہرت پائے گا۔ ہاں، میں سچ کہہ رہا ہوں۔'' وہ ایک بار پھر کھانسنے لگا۔

میں نے اس کے برہنہ بازو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہاں تمہارے بازو پر تو تمہارا نام بارونڈا لکھا ہوا ہے۔''

''لیکن بارونڈا کے آگے'' بے'' بھی تو لکھا ہوا ہے۔ یہ جنگلی کے لیے ہے۔ میرا پیدائشی نام بارونڈا ہے لیکن جس نام نے شہرت پائی وہ جنگلی ہے۔''

میں حیرت آمیز تجسس سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس مشہور و معروف شخص سے میری ملاقات بھانڈیل اسٹیٹ کے اس جنگل کی اس زمین دوز سرنگ میں ہوگی اور اس حال میں ہوگی... یہ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا تمہارا بازو... اور ٹانگ کاٹے گئے تھے؟''

''تو تمہارا کیا خیال ہے، میں نے شوقیہ انہیں اپنے جسم سے علیحدہ کر دیا تھا؟''

''لل... لیکن... میرا مطلب ہے کہ تم تکم اور جارج کا نام لے رہے ہو... کیا یہ کام انہوں نے کیا ہے؟''

''دیکھو دوست! میں نے دو پیگ کے بدلے میں تمہیں جو کچھ بتانے کا وعدہ کیا تھا، وہ میں نے بتا دیا ہے۔ اگر تم کچھ اور پوچھنا چاہو گے تو پھر اس کے لیے تمہیں کچھ اور مہیا کرنی پڑے گی۔ ویسے بہتر تو یہی ہے کہ اس موضوع کو مت چھیڑو۔ تمہارا دل دکھے گا اور میرا تو بہت زیادہ دکھے گا۔ دیکھو، کتنی پیاری رات ہے، ہوا ٹھنڈی ہے۔ باہر سے جنگلی

کون کہتا ہے کہ؟
اولاد نہیں ہو سکتی
آج بھی لاکھوں گھرانے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں۔ مایوسی گناہ ہے۔ انشاء اللہ اولاد ہوگی۔ خاتون میں کوئی اندرونی پرابلم ہو یا مردانہ جراثیم کا مسئلہ۔ ہم نے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک خاص قسم کا بے اولادی کورس تیار کیا ہے۔ جو آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھلا سکتا ہے۔ آپکے گھر میں بھی خوبصورت بیٹا پیدا ہو سکتا ہے۔ آج ہی گھر بیٹھے فون پر تمام حالات سے آگاہ کر کے بذریعہ ڈاک وی پی VP بے اولادی کورس منگوائیں۔
المُسلم دارالحکمت رجسٹرڈ (دواخانہ)
ضلع وشہر حافظ آباد۔ پاکستان
0300-6526061
0547-521787
فون اوقات
صبح 9 بجے سے رات 11 بجے تک
آپ ہمیں صرف فون کریں
دوائی آپ تک ہم پہنچائیں گے

پھولوں کی خوشبو بھی آرہی ہے۔ یہ سنو... یہ سنو۔ کہیں دور شاید کوئی چیتا چیخ رہا ہے۔"

میں خاموش رہا۔ وہ خود ہی بولا۔ "تم کہو گے، چیتا چیختا نہیں، چلاتا اور چنگھاڑتا ہے لیکن مجھے تو اس وقت چیختا ہی لگ رہا ہے۔ ہر شے خوب صورت ہے۔ یہ سرنگ بھی اب اتنی بُری نہیں لگ رہی۔ میرا خیال ہے کہ باہر چاند بدلیوں میں سے جھانک رہا ہوگا۔ کاش! میں اس وقت اپنے گھر میں ہوتا، اپنی کشتی میں... کیا تم کسی طرح اپنی کشتی تک جانے میں میری مدد کر سکتے ہو؟ تم مجھے اپنے سارے ساتھیوں میں سے بہتر لگے ہو۔ تم میری زبان بھی سمجھتے ہو۔ شاید میرے دل کی زبان بھی کچھ کچھ تمہاری سمجھ میں آرہی ہو۔ میں اپنی کشتی میں واپس جانا چاہتا ہوں۔ میری زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔ کسی بھی وقت کام ختم ہو سکتا ہے۔ میں اپنی کشتی میں مرنا چاہتا ہوں۔ اگر تم مجھے میری کشتی اور میری شراب تک پہنچا دو تو میں..." تو میں..." وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

شاید وہ کہنا چاہتا تھا کہ میں زندگی بھر تمہارا احسان مند رہوں گا لیکن پھر اسے خیال آیا ہوگا کہ ابھی وہ اپنی زندگی کے مختصر ترین ہونے کا ذکر کر چکا ہے۔

اچانک دہانے کی طرف سے بلند آوازیں سنائی دیں۔ ان میں نمایاں آواز انور خاں کی تھی۔ وہ چلانے والے انداز میں کچھ کہہ رہا تھا۔ یہ خطرے کی گھنٹی تھی۔ میں نے بارومدا کو وہیں نیڈ بیگ کے قریب چھوڑا۔ بوجھل اور رائفل تھامی۔ قریباً پچاس ساٹھ میٹر کا فاصلہ طے کر کے میں تیزی سے دہانے پر پہنچ گیا۔ یہاں صورتِ حال واقعی تشویش ناک تھی۔ انور خاں ایک بالکل بدلا ہوا شخص نظر آرہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ وہ سرتاپا ایک جنگجو پٹھان تھا۔ اس نے ماریا کو سر کے بالوں سے بری طرح جکڑا ہوا تھا اور اپنی رائفل کی نال اس کے سر سے لگا رکھی تھی۔ وہ ماریا کو بالکل سرنگ کے دہانے پر لے آیا تھا۔ انور خاں اور ماریا دونوں کا رخ باہر کی طرف تھا۔

انور خاں دہاڑ رہا تھا۔ "پیچھے ہٹ جاؤ... میں کہتا ہوں پیچھے ہٹ جاؤ... نہیں تو سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ ابھی ختم ہو جائے گا۔"

جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ دہانے سے باہر حکم جی کے مسلح گارڈز نے پیش قدمی کی کوشش کی ہے۔ وہ دہانے کے عین سامنے قریباً پندرہ میٹر کی دوری پر دو بڑے پتھروں کے پیچھے پوزیشن لینے کی کوشش میں تھے۔

انور خاں نے ہوائی فائر کیا۔ اس کے ساتھ ہی ماریا کو دھکیل کر دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ فائر کی آواز سے ماریا چلّا کر رہ گئی۔ انور خاں گرجا۔ "میں صرف پانچ تک گنوں گا... تم لوگ واپس نہیں گئے تو میں اسے گولی مار دوں گا۔"

دوسری طرف سے آواز آئی۔ "ہم تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"بات کرنا چاہتے ہو تو پہلے پیچھے جاؤ۔ ہم کوئی ہوشیاری نہیں چلنے دیں گے... میں پھر کہتا ہوں، ابھی تمہارے سامنے سب کچھ ختم ہو جائے گا۔" انور خاں کی آواز میں ایسی دہاڑ تھی کہ اردگرد کی ہر شے لرزتی محسوس ہوئی۔

ماریا دیوار سے لگی ہوئی تھی۔ وہ دہشت زدہ آواز میں پکاری۔ "خدا کے لیے پیچھے چلے جاؤ۔ یہ مجھے مار ڈالے گا۔"

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا مگر انور خاں نے سنی ان سنی کر دی۔ وہ بلند آواز میں وقفے وقفے سے بولا۔ "ایک... دو... تین..."

ماریا پھر چلّائی۔ "چلے جاؤ... واپس چلے جاؤ۔"

ہم نے صاف دیکھا کہ پتھروں کے پیچھے سے مسلح گارڈز اٹھے اور الٹے قدموں چلتے پیچھے ہٹنے لگے۔ مدھم چاندنی میں ان کی موومنٹ اور ان کے ہاتھوں کا جدید اسلحہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔

وہ جب تک نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو گئے انور خاں، ماریا کو دبوچے اپنی جگہ بالکل الرٹ کھڑا رہا۔ اس کے عقب میں احمد تھا۔ شورسن کر اسحاق اور فیروز بھی اٹھ کر آگئے تھے۔ ان سب کی رائفلوں کا رخ باہر کی طرف تھا۔

دو چار منٹ بعد یہ ہنگامہ سرد پڑ گیا۔ انور خاں نے سب کو تفصیل بتائی کہ کس طرح اسے اور چوہان کو درختوں کے پیچھے حرکت محسوس ہوئی اور کس طرح وہ الرٹ ہوئے... ماریا کو دہانے سے ہٹا کر دوبارہ اس کی جگہ پر پہنچا دیا گیا۔ احمد پوری طرح چوکس اس کے سر پر کھڑا رہا۔

اس واقعے کے بعد کوئی بھی سونے کے لیے نہیں گیا۔ ڈاکٹر چوہان مسلسل ٹیلی اسکوپ آنکھوں سے لگائے اپنی پوزیشن پر بیٹھا ہوا تھا۔ ہمیش نے خشک دودھ سے چائے بنائی۔ چائے پیتے ہوئے ہم باتوں میں مصروف رہے۔ ایک زبردست تناؤ کے بعد سب کے اعصاب قدرے پُرسکون تھے۔ میں نے انور خاں اور چوہان کو بتایا کہ مدقوق نیپالی بارومدا اور اصل کون ہے۔

میرے انکشاف نے سب کو حیران کیا پھر ایک دم انور خاں کے چہرے کے تاثرات بدلے۔ اس نے چائے کی پیالی ایک طرف رکھی اور دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے لرزاں

آواز میں بولا۔ "اوہ خدایا... اسی لیے میں بار بار سوچ رہا تھا کہ اس بندے کی شکل اور آواز کی وجہ سے کچھ یاد کیوں آرہا ہے۔ اب میں سب کچھ جان گیا ہوں... سب کچھ جان گیا ہوں۔"

"کیا مطلب؟" چوہان نے پوچھا۔

"میں نے اس بندے کو دو سال... تقریباً دو سال پہلے راج بھون میں دیکھا تھا۔ اس نے پتلون قمیص پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں بڑی چمک دار سیاہ جوتی تھی اور شاید ٹائی بھی لگا رکھی تھی۔ ہاں، بہت اسمارٹ اور چاق و چوبند نظر آتا تھا۔ راج بھون کے بڑے ہال میں شاید کوئی پارٹی تھی۔ کافی لوگ جمع تھے۔ میں نے وہاں اس بندے کو پہلی بار دیکھا تھا۔ میں نے موہن کمار سے اس کے بارے میں پوچھا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ یہ ایک چیمپئن فائٹر ہے۔ جوڈو کراٹے کا بہت بڑا کھلاڑی ہے۔ ہاں، مجھے سب کچھ یاد آرہا ہے۔"

"اس کی راج بھون میں آمد کا مقصد کیا تھا؟" چوہان نے ٹیلی اسکوپ سے نظریں ہٹاتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے موہن کمار سے یہی سوال کیا تھا لیکن اسے پتا نہیں تھا۔ بعد میں موہن کمار کے بھائی نے بتایا تھا کہ جارج گورا صاحب کی بہن کو مارشل آرٹ وغیرہ سیکھنے کا شوق ہے۔ اس بندے کو بھاری معاوضہ دے کر اسی کام کے لیے یہاں بلایا گیا ہے۔ یہ جارج گورا صاحب کی بہن کو ٹریننگ دینے کے علاوہ حکم جی کے ذاتی گارڈز کے دستے کو بھی ٹریننگ دے گا۔ اس ٹریننگ کے لیے حکم جی اپنے گارڈز کے دستے میں سے ایک سو بندے چنیں گے۔ مجھے وہ ساری باتیں اب اچھی طرح یاد آرہی ہیں۔"

چوہان نے ٹیلی اسکوپ ایک طرف رکھتے ہوئے بے حد حیران لہجے میں پوچھا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ یہ بندہ ماریا فرگوسن کو سکھشا دینے کے لیے یہاں آیا تھا؟"

"صرف ماریا کو سکھشا دینے کے لیے نہیں... حکم جی کے ذاتی گارڈز کو ٹریننگ کرنے کے لیے بھی۔ اس بندے سے ان دونوں کاموں کا معاوضہ طے ہوا تھا... مجھے ٹھیک سے تو پتا نہیں لیکن اندازہ ہے کہ یہ بہت بھاری معاوضہ رہا ہوگا... لیکن پھر..."

"پھر کیا؟" چوہان نے پوچھا۔

"کچھ دن تو یہ بندہ راج بھون میں نظر آیا تھا پھر اچانک ہی اوجھل ہو گیا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب زیادہ بارشوں کی وجہ سے بڑی ندی کے دو بند ٹوٹ گئے تھے اور اسٹیٹ میں زبردست سیلاب آگیا تھا۔ نل پانی میں بھی کافی

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ
اکتوبر 2010ء..... کچھ غم اور کچھ خوشیوں کے رنگ
عذاب آب
سیلاب کے ریلے اور..... دلخراش واقعات کی جھلک.....
آخری صفحات پر عبدالرب بھٹی کے قلم کی نشتر زنی
طاق نسیاں سے
ابتدائی صفحات کا ایک مخصوص رنگ اور تاریخ کا اپنا ہی ایک ایسا ڈھنگ، جسے بار بار پڑھنے کو دل چاہے.....
تو پھر پڑھیے اور معلومات میں اضافہ کیجیے۔
حسرت آدریس
ذہن کے تاریک گوشوں کو روشن کر دینے والی لازوال داستانیں..... رضوانہ ساجد کے قلم کی روانی
واپسی
تحیر، تجسس اور عشق کے دلفریب لمحات مشتمل پل پل رنگ بدلتی طویل داستان... محی الدین نواب کے قلم کا جادو
صفحہ کالک
سسپنس سے بھرپور مجرم کی ہوشیاریوں اور ملک صفدر حیات کی حاضر دماغی کا دلچسپ قصہ
اس کے علاوہ اناڑی، محفل شعر و سخن، آپ کے خط
کاشف زبیر، مریم کے خان، ثمر عباس، ڈاکٹر شیر شاہ سید، منظر امام اور سلیم انور کی دلچسپ تحاریر
اور وہ سب کچھ جو آپ سسپنس میں دیکھنا چاہتے ہیں!
دیر نہ کیجیے تازہ شمارہ فوری حاصل کیجیے

www.pkdigest.com

نقصان ہوا تھا۔ دونوں بھائیوں نے وقتی طور پر رنجشیں بھلا دی تھیں اور ایک دوسرے کے علاقے میں امدادی کاموں کے لیے رضا کار بھیجے تھے۔ میں بھی ڈیڑھ دو ماہ تک دن رات مصروف رہا تھا۔ انہی دنوں میں یہ بندہ کہیں اوجھل ہوا تھا۔ بعد میں جب حالات ٹھیک ہو گئے تو میں نے ایک دو دفعہ موہن کمار سے پوچھا۔ اس نے بتایا کہ وہ واپس چلا گیا ہے۔''

چوہان نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''لیکن وہ واپس نہیں گیا تھا۔ وہ یہیں پر تھا... اور بری حالت میں تھا۔''

''ہاں، یہ گہرا چکر معلوم ہوتا ہے۔'' انور خاں نے چائے کا گھونٹ بھر کر کہا۔ انور کسی داستان گو کی طرح ہمارے درمیان بیٹھا تھا اور ہم ہمہ تن اس کی طرف متوجہ تھے۔ پھر وہ ایک دم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ یقین کرنا چاہتا ہوں کہ یہ وہی ہے۔''

انور خاں نے مجھے بھی ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ میں اس کے ساتھ چل دیا۔ ایک نسبتاً کشادہ جگہ پر چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ایسی ہی ایک کھردری چٹائی پر ماریا پہلو کے بل پڑی تھی۔ رات کے وقت اسحاق اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف موڑ کر نائیلون کی رسّی سے باندھ دیتا تھا۔ وہ اسے کسی طرح کی رعایت دینے کو تیار نہیں تھا اور اب ہم بھی سمجھتے تھے کہ ماریا رعایت کی مستحق نہیں ہے۔ فیروز کی ٹانگ پر گولی کا زخم اس کا ثبوت تھا... انور خاں میرے پہلو میں چلتے ہوئے بولا۔ ''اس بندے کو یہ معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ ہم اسے پہلے سے جانتے ہیں۔''

''آپ بے فکر رہو۔'' میں نے کہا۔

ہم اس جگہ پر پہنچے جہاں باروندا کسی کیچوے کی طرح سمٹ سمٹا کر لیٹا ہوا تھا۔ وہ سو رہا تھا۔ اس کے منہ سے الکحل کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔

''اسے شراب کہاں سے ملی؟'' انور خاں نے پُرحیرت سرگوشی کی۔

''یہ وہ شراب ہے جو ماریا کے لیے آئی تھی۔'' میں نے بھی مدھم لہجے میں جواب دیا۔

لالٹین کی روشنی میں انور خاں نے قریب سے بغور باروندا کا چہرہ دیکھا اور پھر پیچھے ہٹ آیا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر اثبات میں سر ہلایا۔ انور کا مطلب تھا کہ یہ وہی ہے۔

ہم بہ غور اس کے کٹے ہوئے بازو اور ٹانگ کا جائزہ لیتے رہے۔ ٹانگ کو ران پر سے کاٹا گیا تھا۔ بہ مشکل چھ سات انچ ران، جسم کے ساتھ موجود تھی۔ بازو کہنی کے اوپر سے کٹا ہوا تھا۔ یہ دونوں زخم یقیناً ڈیڑھ دو سال پرانے تھے۔ ٹانگ کا زخم تو بالکل مندمل ہو چکا تھا لیکن کہنی کے زخم کے ساتھ کوئی مسئلہ تھا۔ یہاں ہلکی پھلکی سی پٹی بندھی ہوئی تھی اور کسی دوا کی بو بھی آتی تھی۔

ہم خاموشی سے واپس لوٹ آئے۔ راستے میں انور خاں نے کہا۔ ''پتا چل رہا ہے کہ یہ حکم جی کے ظلم کا ایک اور شاہکار ہے۔ لیکن یہ اس حال تک پہنچا کیسے... اور پچھلے دو سال میں رہا کہاں ہے؟''

میں نے کہا۔ ''یہ تھوڑا تھوڑا مجھ سے کھل رہا ہے۔ اگر کہیں سے شراب مل جائے تو میں اس سے سب کچھ اگلوا سکتا ہوں۔''

''شراب کی ایک اور بوتل ماریا والے بیگ میں موجود ہوگی۔''

''ہو سکتا ہے کہ اتنی سے کام نہ چلے۔ یہ بلانوش ہے۔ پانی کی طرح پی جاتا ہے۔''

''یہ تو اس کی حالت سے ہی ظاہر ہے... بہرحال اگر اور کی ضرورت پڑے تو ہم باہر سے بھی منگوا سکتے ہیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ ماریا کو چاہیے۔''

شام سے ذرا پہلے میں ایک بار پھر باروندا کے پاس جا بیٹھا۔ اس بار جاپانی واڈکا کی چم چم کرتی بوتل اور گلاس میرے پاس تھے۔ باروندا کا نشہ ٹوٹے اب کئی گھنٹے ہو چکے تھے۔ بوتل دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ میں اس کے لیے تھوڑا سا ہنٹر بیف بھی لایا تھا۔ یہ بیف بھی ماریا کے سامان میں ہی آیا تھا۔

کل والا عمل پھر شروع ہوا اور تین چار گلاس ''سیال آتش'' اپنے اندر انڈیلنے کے بعد باروندا جنگلی پھر ترنگ میں آ گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے ایک مُردہ مرتے مرتے پھر زندہ ہو گیا ہے۔ وہ پھر اپنی کشتی کو یاد کرنے لگا اور میری منت کرنے لگا کہ میں اس کی مدد کروں اور اسے واپس کشتی میں پہنچا دوں۔ اسے یہ بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ہم اسے پکڑ کر یہاں کیوں لے آئے ہیں اور اس سے کیا چاہتے ہیں۔

میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ اسے یہاں پکڑ کر لانے والا میں ہوں کیونکہ اس کی صورت میں مجھے اپنے ایک بہت ''پیارے'' کی جھلک نظر آئی تھی۔ لیکن اگر میں اسے یہ بتاتا تو وہ مجھے اپنی مصیبت کا ذمے دار قرار دے سکتا تھا۔ لہٰذا میں اس حوالے سے خاموش رہا۔ میں نے اسے صرف اتنا بتایا کہ حکم کے غیر ملکی دوست جارج گورا نے ایک مسلمان لڑکی پر ظلم

کیا ہے۔ اس ظلم کے نتیجے میں زرگاں کے بہت سے لوگوں نے بغاوت کر دی ہے۔ ہم بھی ان باغیوں میں شامل ہیں اور پناہ کے لیے یہاں ان پانی کے نواح میں چھپے ہوئے ہیں۔

میری اس گفتگو کا باروندا پر اچھا اثر ہوا لیکن اگر میں یہ سمجھتا تھا کہ وہ بھی اس حوالے سے کچھ بولے گا تو یہ امید پوری نہیں ہوئی۔ لگتا تھا کہ اسے اپنی کشتی اور کشتی میں رکھی ہوئی شراب کے علاوہ کسی شے سے کوئی غرض ہی نہیں ہے۔ اس کو ابھی تک اس سوال کا جواب بھی نہیں ملا تھا کہ ہم اسے یہاں کیوں لائے ہیں؟

میں نے اسے بتایا۔ ''تم بے ہوش ہو گئے تھے۔ ہمیں ڈر لگا تھا کہ کہیں اسی بے ہوشی میں تمہاری جان نہ چلی جائے۔ ہم وہاں رک بھی نہیں سکتے تھے۔ اس لیے ہمارے لیڈر انور خاں کو یہ مناسب محسوس ہوا کہ تمہیں ساتھ لے لیا جائے۔''

''بہت بُرا کیا۔ میں جتنی جلدی فارغ ہو جاتا اتنا ہی اچھا تھا۔'' وہ فارغ کو مرنے کے معنی میں استعمال کر رہا تھا۔ اس کے لہجے میں اداسی تھی۔

''لگتا ہے تمہیں بھی حکم اور اس کے ساتھیوں کی طرف سے بہت اذیت اٹھانی پڑی ہے۔'' میں نے اسے اکسایا۔

''نہیں، کوئی اذیت نہیں۔'' وہ عجیب انداز سے مسکرایا۔ ''تم نے وہ مقولہ نہیں سنا... محبت میں گزاری ہوئی چند گھڑیاں، بے محبت زندگی کے سو برسوں سے بہتر ہوتی ہیں... نہیں، کوئی اذیت نہیں۔'' اس نے اپنا سر دائیں بائیں ہلایا تو اس کے بال چہرے پر جھولنے لگے۔

میں اس کے پاس بیٹھا رہا۔ باتیں کرتا رہا۔ وہ پیاز کے چھلکوں کی طرح تہ در تہ تھا۔ اس کے اندر جھانکنا آسان نہیں لگتا تھا۔ میں اسے گھیر گھار کر ایک پوائنٹ پر لایا لیکن وہ ایک دم پلٹا کھا گیا۔ شراب کے نشے میں ہاتھ لہرا کر بولا۔ ''چھوڑو ان باتوں کو۔ ایسی باتیں تو تم کسی کے ساتھ بھی کر سکتے ہو۔ دیکھو، تمہارے سامنے ایک چیمپئن بیٹھا ہوا ہے۔ ایک سپر اسٹار انٹرنیشنل فائٹر۔ تم مارشل آرٹ میں دلچسپی رکھتے ہو... اور میں تمہیں جو کچھ بتا سکتا ہوں وہ روئے زمین پر اور کوئی نہیں بتا سکتا۔ ہرگز نہیں بتا سکتا۔ مجھ سے فائدہ اٹھا لو... میں اب زیادہ دیر رہنے والا نہیں ہوں۔''

وہ اپنے مرنے کی بات بڑے تواتر اور یقین سے کر رہا تھا۔

''تم اتنے مایوس کیوں ہو؟ تم اس قدر بیمار نہیں کہ زندگی کی طرف پلٹ ہی نہ سکو۔''

اس نے میری بات کو یکسر نظر انداز کر دیا جیسے سنا ہی نہ ہو۔ سامنے ہیڈ بیگ کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''مجھے کھڑا ہونے میں مدد دو۔''

میں نے ایسا ہی کیا۔ اس کی ٹانگ انور خاں کی ہدایت کے مطابق بدستور زنجیر میں تھی اور کھنٹے سے مربی ہوئی تھی۔ وہ سرگوشی میں بولا۔ ''میری یہ ٹانگ کھول دو۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ کوئی ایسی حرکت نہیں کروں گا جس سے کسی کو نقصان پہنچے یا تمہیں شرمندگی ہو۔''

میں تذبذب کا شکار ہو گیا۔ اگر یہ چند روز پہلے کی بات ہوتی تو شاید میں ایسا رسک کبھی نہ لیتا۔ لیکن اب دل و دماغ کی کیفیت کچھ اور تھی۔ مجھے خطرات ہیچ محسوس ہونے لگے تھے۔ اگر دل میں کوئی اندیشہ ابھرتا بھی تھا تو میں خود کو سمجھاتا تھا۔ موت سے بڑھ کر تمہارے لیے کیا بُرا ہوگا... اور یاد رکھو کہ تم خود کو موت کے لیے آمادہ کر چکے ہو۔

میں نے جنگلی کی زنجیر کھول دی۔ اس نے میرا سہارا چھوڑ دیا اور اپنی اکلوتی ٹانگ پر کھڑا ہو گیا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں بیساکھی نما لکڑی تھی۔ اس نے اپنی مٹھی بھینچی اور عجیب انداز میں بولا۔ ''طاقت اس مٹھی میں نہیں، یہاں ہوتی ہے یہاں... دماغ کے اندر... اگر دماغ میں طاقت نہیں تو پھر یہ مٹھی چاہے ایک پہلوان کے جسم کا حصہ ہو، وہ کمزور ہی رہتی ہے۔ دوسری صورت میں مجھ جیسا لاغر آدمی بھی ہیڈ بیگ مار کر مکا پھاڑ سکتا ہے... بس سوری۔ مکا مار کر ہیڈ بیگ پھاڑ سکتا ہے۔ اگر تم چاہو تو میں تمہیں مظاہرہ کر کے دکھا سکتا ہوں۔''

''دکھاؤ۔'' میں نے کہا۔

اس نے آہستہ آہستہ مٹھی بھینچی جیسے انگلی کے ایک ایک جوڑ کو علیحدہ علیحدہ موڑ رہا ہو۔ پھر اس نے آنکھیں بند کیں۔ کچھ دیر تک اپنے خیالات کو مرتکز کرتا رہا۔ تب اس نے اپنی بیساکھی اور ٹانگ پر اچھلتے ہوئے ہیڈ بیگ کو مکا رسید کیا۔ ہیڈ بیگ پھٹا تو نہیں لیکن ضرب اتنی زوردار تھی کہ وہ دور تک گیا اور واپس آیا۔

''ونڈر فل۔'' میں نے بے ساختہ کہا۔ ''تمہاری جسمانی حالت کو دیکھتے ہوئے یہ ضرب کافی زوردار ہے۔''

''یہ ضرب میں نے اپنے جسم کی طاقت سے نہیں، دماغ کی طاقت سے لگائی ہے۔ میری ساری ذہنی توانائی اس ضرب میں لگی ہے اور جب ذہنی توانائی لگتی ہے تو جسمانی توانائی خود بخود لگتی ہے۔ چلو، اب تم خود کوشش کرو۔''

اگلے چار پانچ منٹ میں، میں نے باروندا جنگلی کی ہدایات کے مطابق کچھ ضربیں لگائیں اور مجھے لگا کہ اس شخص

www.pkdigest.com

کی باتوں میں وزن ہے۔
وہ بولا۔ ''آج میں تمہیں دو کام کی باتیں بتاتا ہوں۔ اگر تم ان کو یاد رکھو گے تو یہ عمر بھر تمہارے کام آئیں گی... بولو یاد رکھو گے؟''
''بالکل رکھوں گا۔'' میں نے کہا۔ مجھے اس شخص سے اب واقعی عقیدت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ وہ چند دن میں مرنے والا ہے اور میں نے ان آخری دنوں میں اسے ایک ویرانے میں بہترین شراب فراہم کرکے اس کو مسرور کیا تھا۔
وہ بولا۔ ''انسان کے بنیادی خوف دو ہی ہوتے ہیں۔ ذہنی تکلیف اور جسمانی تکلیف۔ تم کسی خطرناک غنڈے سے دوبدو لڑتے کیوں نہیں ہو؟ تمہیں ڈر ہوتا ہے کہ وہ تمہیں مارے گا۔ تم پر کوئی ہتھیار استعمال کرے گا جس سے تمہیں تکلیف ہوگی۔ دوسرا خوف ذہنی تکلیف کا ہے۔ اگر وہ تمہیں مارے گا یا تم سے گالم گلوچ کرے گا یا تمہیں تھرتھر کانپنے پر مجبور کردے گا تو لوگ یہ منظر دیکھیں گے اور تم شدید شرمساری کا شکار ہو جاؤ گے۔ اگر ہم ان دو بنیادی خوفوں پر کنٹرول کرلیں تو ہم کسی بھی بڑے سے بڑے خطرے کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہوسکتے ہیں۔ بس ہم یہ طے کرلیں کہ ہم جسمانی تکلیف کو جھیلیں گے... اور اگر کہیں شرمندگی اور پسپائی کا سامنا کرنا پڑا تو بھی جھیلیں گے...''
''تمہاری باتیں دل کو لگ رہی ہیں۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔
''اگر نہ لگیں گی تو یہ تمہارا ہی نقصان ہوگا۔'' وہ شاہانہ بے نیازی سے بولا۔ ذرا توقف کرکے اس نے گلاس میں بچی کھچی شراب اپنے اندر انڈیلی اور بولا۔ ''اب میں تمہیں جسمانی تکلیف کو برداشت کرنے کا ایک خاص الخاص گر بتاتا ہوں۔ اس گر کو سمجھ لوگے تو ڈھیر سے ڈھیر جسمانی تکلیف تمہارے جسم سے دور ہو جائے گی۔ تمہیں درد نہیں ہوگا یا ہوگا تو بہت کم ہوگا۔ تم ایک نئے انسان بن جاؤ گے۔ ذرا سوچو اگر انسان کو درد نہ ہو تو وہ کیا کچھ نہیں کرسکتا۔''
ایک دم مجھے پھر وہ کشتی والا منظر یاد آگیا۔ اسحاق نے جیکی کو دیوانہ وار مارا تھا اور اس نے بس ایک دو بار کراہنے کے سوا کچھ نہیں کیا تھا۔ کیا واقعی... اسے بھی درد نہیں ہوتا؟ جیکی میں میری دلچسپی ایک دم بڑھ گئی۔ جیکی نے جو دونوں باتیں کی تھیں، وہ میرے دل کو لگی تھیں... اور اب اس کی یہ تیسری بات بھی جیسے دل میں کھب گئی تھی۔
وہ ابھی تک لنگوٹ میں تھا۔ مجھے اس کا سارا جسم لالٹین کی روشنی میں دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے رگ پٹھوں اور سوکھی سڑی جلد میں عجیب سی سختی تھی۔ وہ کہنے لگا۔ ''اگر میں نے تمہیں سب کچھ آج ہی بتا دیا تو تم کل کس تشریف میں شوق لاؤ گے۔''
''شاید تم کہنا چاہتے ہو کہ کس شوق میں تشریف لاؤ گے؟''
''ہاں ہاں۔ یہی کہنا چاہ رہا ہوں۔ کبھی کبھی میں فقرے میں لفظ الٹے بول جاتا ہوں۔ تم خود ہی ٹھیک کرلیا کرو۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ باقی بات کل ہوگی اور اگر تم "69" ہی کی ایک بوتل لاسکو تو کیا بات ہے۔''
''چلو میں وعدہ کرتا ہوں کہ کل تمہارے لیے وہی لاؤں گا جو کہا ہے لیکن اپنی بات ادھوری نہ چھوڑو۔ مجھے الجھن رہے گی۔''
''آہ ادھوری بات۔'' اس نے عجیب لہجے میں کہا۔ ''باتیں تو کبھی مکمل نہیں ہوتیں اور نہ کام مکمل ہوتے ہیں۔ ایک کے بعد دوسری خواہش پھر تیسری۔ انسان کو کہیں نہ کہیں رکنے کے لیے تیار رہنا چاہیے اور جہاں سے آگے نہ جاسکے وہاں خوشی سے رک جائے۔ باقی کی خواہشوں کو دل سے نکال دے۔''
میں نے کہا۔ ''تم ایک چیمپئن فائٹر ہو لیکن تمہاری باتیں فلاسفروں جیسی ہیں۔ لگتا ہے کہیں گہری چوٹ کھائی ہے تم نے۔''
''تم مجھے کریدنے کی کوشش کررہے ہو۔ مجھے یہ بات بالکل پسند نہیں اور... شراب کے بغیر تو بالکل بھی پسند نہیں۔'' وہ مسکرایا تو اس کے میلے دانت نمایاں ہوگئے۔
اس کا مطمع نظر سمجھتے ہوئے میں نے بوتل کی باقی شراب بھی اس کے حوالے کردی۔ اس نے بوتل کو ندیدوں کی طرح اپنے سینے سے لگالیا۔ میں نے اس کی اکلوتی ٹانگ پھر سے زنجیر میں باندھ دی تھی۔ مجھے اس سے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہو رہا تھا تاہم میں انور خاں کی ناراضگی مول لینا نہیں چاہتا تھا۔
تھوڑی سی اور پی کر وہ پوری ترنگ میں آگیا۔ میرے پوچھے بغیر ہی بولا۔ ''مجھے اسی جرم کی سزا ملی ہے جو بہت عام ہے۔ جو ہمیشہ سے بہت عام رہا ہے۔ جس کو کوئی روک سکا ہے نہ روک سکے گا۔ مجھے پیار ہوگیا تھا۔ ایک دم... بہت تیزی سے۔ بالکل طوفانی پیار...''
''کس سے؟''
''جس سے نہیں ہونا چاہیے تھا۔''
''یہ کیا بات ہوئی؟''
''یہی تو بات ہے۔ پیار وہیں ہوتا ہے جہاں نہیں ہونا چاہیے۔''
''کون لڑکی تھی؟'' میں نے پوچھا۔
''یہ وہ سوال ہے جس کا جواب کوئی بھی سچا عاشق نہیں دیتا۔''
''حکم جی کے خانوادے سے تھی؟''
''یہی سمجھ لو۔''
''پھر کیا ہوا؟''
''وہی جو ہوتا آیا ہے۔ میں نے خود کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی لیکن سنبھال نہیں سکا۔ میں نے خود کو بہت سمجھایا کہ تم ایک ٹیچر کی حیثیت سے اس اسٹیٹ میں آئے ہو۔ تمہیں اس کے لیے بہت معاوضہ دیا گیا ہے۔ عزت اور آسائش دی گئی ہے۔ یہ کام نہ کرو۔ یہ لوگ جتنے مہربان ہیں، اتنے ہی سخت بھی ہیں۔ بہت ظالم بن جائیں گے۔ لیکن تمہیں پتا ہے نا، ہونی ہو کر رہتی ہے۔''
''میرے دماغ میں ایک سوال پیدا ہو رہا ہے اگر تم برا نہ مناؤ تو پوچھوں؟''
''تم نے شراب پلا کر میری رات کو رنگین کیا ہے... پوچھو۔''
''کہیں یہ وہی لڑکی تو نہیں جسے تم سکھانے کے لیے یہاں اسٹیٹ میں آئے تھے؟ میرا مطلب ہے کہ جارج کی بہن ماریا فرگوسن؟''
''تم فاؤل پلے کر رہے ہو۔ میں نے کہا ہے نا، کوئی بھی سچا پیار کرنے والا اپنے محبوب کا نام زبان پر نہیں لاتا۔''
''چلو ٹھیک ہے، میں نہیں پوچھتا۔ لیکن تمہارا پیار کس قسم کا تھا؟''
''یہ وہ پیار تھا جو آندھی کی طرح اٹھتا ہے اور طوفان کی طرح دماغ پر اور دل پر چھا جاتا ہے۔ اس میں ہر طرح کی طلب اپنی پوری شدت کے ساتھ موجود ہوتی ہے۔ یہ پیار کرنے والوں کو اپنے ساتھ بہا کر لے جاتا ہے۔ کہیں پاؤں نہیں جمنے دیتا... کچھ سمجھنے میں نہیں آنے دیتا۔ ہم بھی راج بھون میں بس دو چار ملاقاتوں میں ایک دوسرے کے اس قدر قریب آگئے تھے کہ لگتا تھا برسوں کے شناسا ہیں۔ چند گھڑیاں بھی ایک دوسرے کے بغیر گزارنا مشکل ہوگیا تھا۔''
''وہ بہت خوب صورت تھی؟''
''مجھے اس کا پتا نہیں لیکن وہ میرے لیے دنیا کی خوب صورت ترین لڑکی تھی اور میں اس کے لیے محبوب ترین شخص۔ اس کی منگنی ہوچکی تھی۔ اس کا ہونے والا شوہر اسے چاہتا تھا اور شاید وہ بھی اسے ناپسند نہیں کرتی تھی لیکن میں نے تمہیں بتایا ہے نا، یہ وہ تیز بہاؤ والا پیار تھا جو کہیں پاؤں نہیں جمنے دیتا۔ میں بھی راج بھون میں ہی رہ رہا تھا۔ ہمارے پاس ایک دوسرے کو دیکھنے اور ملنے کے بہت سے مواقع تھے۔ ایک دن میں نے اس سے کہا۔ 'ہمارا راز بہت جلدی کھل جائے گا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوگا، وہ بہت برا ہوگا۔' مگر اس نے ہنس کر ٹال دیا اور پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ ایک دن اس کے چچا نے ہمیں دیکھ لیا... اور پھر پتا نہیں کس طرح یہ بات اور بھی کئی لوگوں تک پہنچ گئی۔''
''اس کا مطلب ہے کہ وہ ہندو تھی اور جہاں تک میری جانکاری ہے، ابھی دو چار لوگوں کی فیملیاں راج بھون میں رہتی ہیں جو حکم کے قریبی مشیروں اور مصاحبوں میں شامل ہیں۔''
''تم مجھے شرلاک ہومز کا دیسی ایڈیشن لگ رہے ہو۔ اسی طرح چھوٹی چھوٹی باتوں سے نتیجے نکالتے ہو۔''
''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ مجھے تھوڑا بہت بتادو تاکہ مجھے نتیجے نکالنے کے لیے مغز ماری نہ کرنی پڑے۔''
''بتا تو رہا ہوں۔''
''میرا مطلب ہے کہ اس لڑکی کے بارے میں کچھ بتاؤ، وہ کون تھی؟''
''اب وہ کسی اور کی ہے، اس کے بارے میں بات کرنا اچھا نہیں لگتا۔''
''تم نے خود ہی کہا ہے کہ پھر یہ بات پھیل گئی تھی اور کئی لوگوں تک پہنچ گئی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ کوئی ایسا راز نہیں رہا۔''
''تم ہوشیار واقع ہوئے ہو۔ وکیلوں کی طرح بحث کرلیتے ہو۔ لیکن تم یہاں اس منحوس اسٹیٹ میں کیسے آپھنسے ہو۔ اور... مجھے لگتا ہے کہ تم انڈین بھی نہیں ہو... کیا تم انڈین ہو؟''
''نہیں... پاکستانی... بس کچھ حادثات نے یہاں پہنچا دیا ہے۔''
''اوہ، ونڈرفل... پاکستانی۔'' وہ خوش ہو کر بولا۔ اس نے مجھ سے مصافحہ کیا۔
''نیپال اور پاکستان میں بہت کچھ مشترک ہے۔ ہم دنیا کی بلندترین چوٹیوں کے 'مالک' ہیں۔ ایورسٹ، کے ٹو، نانگا پربت، ملکہ پربت اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ۔ ہمارے ہاں دنیا کے بہترین قدرتی مناظر اور پہاڑی سلسلے ہیں۔ ہم نے بہت اچھے کھلاڑی پیدا کیے ہیں... اور پھر ایک اور بات... ہم دونوں ملکوں کو ایک بڑا زبردست ہمسایہ بھی ملا ہے۔ بہت محبت کرنے والا، بہت ہمدرد... اور امن پسند...

www.pkdigest.com

ایسا ہمسایہ ہو تو پھر جنت میں جانے کے لیے مرنے کی ضرورت بھی نہیں رہتی۔ دنیا ہی بہشت بن جاتی ہے۔" وہ حسبِ عادت طنزیہ لہجے میں بات کر رہا تھا۔

کچھ دیر وہ اس موضوع پر بات کرتا رہا۔ پھر میں نے اسے یاد دلایا کہ ہم موضوع سے ہٹ رہے ہیں۔ وہ مجھے اپنی محبوبہ کے بارے میں کچھ بتانے جا رہا تھا۔

اس نے ایک گہری سانس لی تو اس کے سینے کی پسلیاں نمایاں تر ہو گئیں۔ لالٹین کی زرد روشنی میں اس کا سایہ سرنگ کی کھردری دیوار پر جھول رہا تھا، جیسے سائے نے جیکی سے بھی زیادہ پی رکھی ہو اور اسے بیٹھنا مشکل ہو رہا ہو۔ جیکی نے کہا۔ "تم وعدہ کرو کہ کم از کم میرے مرنے تک یہ بات اپنے تک ہی رکھو گے۔"

میں نے کہا۔ "میں وعدہ کرتا ہوں کہ کبھی بھی یہ بات کسی تک نہیں پہنچاؤں گا۔"

وہ کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر بولا۔ "وہ جارج کی بہن ماریا کی گہری سہیلی شکنتلا ہے۔ میری شاگرد تو ماریا تھی لیکن دھیرے دھیرے شکنتلا بھی مجھ سے سکھشا لینے لگی تھی۔ اس کے بال بہت لمبے تھے، وہ ہمیشہ ساڑی پہنتی تھی۔ میں نے ایک دن اس سے کہا... جوڈو کراٹے سیکھنے کے لیے ساڑی سے اچھا لباس اور کوئی نہیں ہے۔ بس اس میں ایک خرابی ہے کہ ساڑی والی پلیئر کراٹے کھیلتے ہوئے کسی کو کک نہیں مار سکتی، صرف فلائنگ کک مار سکتی ہے کیونکہ فلائنگ کک میں دونوں ٹانگیں اکٹھی ماری جاتی ہیں... میری بات سمجھ کر وہ بہت ہنسی... ہنستے ہوئے اس کے دانت یمن کے موتی دکھائی دیتے تھے۔ اگلے روز وہ ماریا کی طرح ٹراؤزر پہن کر آ گئی۔ وہ ماریا کی طرح سنجیدہ نہیں تھی۔ بس شغل کے لیے آجاتی تھی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہم دونوں کے درمیان ایک ایسا "لنک" بنا کہ باقی ساری باتیں، سارے لوگ پس منظر میں چلے گئے۔ بس ہم دونوں رہ گئے اور ہماری پیاسی نظریں جو ہر پل ایک دوسرے کو تلاش کرتی تھیں۔ شکنتلا کے پتا اشوک ساہنی حکم جی کے خاص مشیر تھے۔ ایک دوسرے اہم مشیر رام گوپال کے ساتھ عرصے سے ان کی خاموش جنگ چل رہی تھی۔ اشوک ساہنی اس جنگ میں اپنے حریف کو نیچا دکھانا چاہتے تھے۔ اس کے لیے انہیں اس سے بہتر طریقہ کوئی اور نہیں مل سکتا تھا کہ وہ شکنتلا کو حکم جی سے بیاہ کر اس کے سسر بن جائیں۔ اشوک ساہنی کی خوش قسمتی یہ تھی کہ شکنتلا اپنے الھڑپن اور خوب صورتی کی وجہ سے حکم جی کو پسند تھی۔ درحقیقت اشوک ساہنی نے اپنے منصب اور درجے کو بڑھانے کے لیے ہی یہ فیصلہ کیا تھا ورنہ شکنتلا اپنے ہونے والے شوہر سے قریباً دس بارہ برس چھوٹی تھی... اور اس سے پہلے بھی شوہر صاحب کی کئی بیویاں اور رکھیلیں وغیرہ تھیں جن میں اس کی چہیتی اور منہ چڑھی بیوی رتنا دیوی بھی شامل تھی۔"

بات کرتے کرتے جیکی کو کھانسی کا دورہ پڑا اور اس کا پورا ڈھانچا دہل کر رہ گیا۔ میں نے اسے پانی پلانا چاہا لیکن اس نے شراب کی طرف ہاتھ بڑھایا اور دو گھونٹ لے کر قدرے شانت ہو گیا۔

کچھ دیر خاموش رہ کر اس نے سلسلۂ کلام جوڑا اور بولا۔ "مجھے یہ ماننا چاہیے کہ اس معاملے میں زیادہ پیش قدمی میری طرف سے ہی ہو رہی تھی... شکنتلا پہلے تو بچنے کی کوشش کرتی رہی لیکن پھر وہ بھی بے بس ہو گئی۔ یہ بڑی حیران کن کروٹ تھی۔ بے شک اس کی "بے جوڑ شادی" ہو رہی تھی اس کے باوجود وہ حکم جی کو ناپسند نہیں کرتی تھی۔ اپنے ماتا پتا کی پسند کو وہ اپنی پسند سمجھتی تھی۔ اس کے نزدیک حکم جی ایک روحانی شخصیت بھی تھے جن کی عزت تکریم اور خوشی کا خیال رکھنا سب کا فرض تھا۔ لیکن دوسری طرف وہ بے پناہ طاقت سے میری محبت کے مقناطیس کی طرف بھی کھنچتی چلی جا رہی تھی۔ یہ سب کچھ ڈیڑھ دو ماہ کے اندر اندر ہی ہوا تھا۔"

جیکی نے چند لمحے توقف کیا اور اپنی پچکی آنکھوں سے ماضی میں جھانکتے ہوئے بولا۔ "وہ چاندنی رات تھی۔ بڑی خوش گوار ہوا چل رہی تھی۔ میں نے شکنتلا کو راج بھون کی چھت پر بلایا تھا۔ ہم سنگِ مرمر کی جالیوں والی ایک برساتی میں ایک دوسرے کی بانہوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ مجھے یاد ہے میں اس مہ جبیں پر جھکا ہوا تھا، اس کے لمبے بال سنگِ مرمر کے چبوترے پر دور تک بکھرے ہوئے تھے۔ وہاں کسی کی آمد کا امکان نہیں تھا لیکن اچانک ہم پر بجلی سی گر پڑی۔ ہم نے اشوک ساہنی صاحب کو دیکھا۔ اپنی بیٹی کو اس حالت میں دیکھ کر وہ سکتے میں رہ گئے پھر ایک دم گھومے اور خاموشی سے نیچے چلے گئے۔ شکنتلا کی بری حالت تھی۔ وہ اپنی اوڑھنی کو درست کرتے ہوئے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس بات کا پتا ہمیں کئی دن بعد چلا کہ اشوک ساہنی صاحب کو آگاہ کرنے والی شکنتلا کی انگریز سہیلی ماریا ہی تھی۔ اس نے یار مار کا کردار ادا کیا تھا۔

"شکنتلا پر پابندیاں لگا دی گئیں۔ ہمارے ملنے کے راستے بند ہو گئے۔ ہم جو چند گھڑیاں بھی ایک دوسرے کے بغیر نہیں گزار سکتے تھے، ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ تڑپ گئے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ ہمارا ملنا ممکن نہیں اور اگر میں ایک ٹیچر

اور ٹرینر کی حیثیت سے یہیں اسٹیٹ میں رہا تو میری جان کے ساتھ ساتھ شکنتلا کی زندگی کو بھی شدید خطرہ لاحق ہو جائے گا اور یہ مجھے ہرگز منظور نہیں تھا۔ میں نے یہاں سے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ جلد ہی کسی طرح شکنتلا کو بھی اس فیصلے کے بارے میں معلوم ہو گیا۔ وہ بہت روئی تھی۔ ان دنوں اس کا دودھیا گلابی رنگ سرسوں کی طرح زرد ہو چکا تھا۔ میں اس سے آخری بار ملنا چاہتا تھا اور شاید وہ بھی آخری بار ملنا چاہتی تھی۔ ہمارے درمیان ایک آخری ملاقات طے ہوئی۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ وہی کپڑے پہن کر آئے جن کپڑوں میں، میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا... وہ اپنی ایک سہیلی کی بیمار والدہ کی عیادت کے بہانے کوشلی چلی گئی... شاید تمہیں پتا ہی ہو کوشلی، زرگاں کی ایک نواحی آبادی ہے۔ یہاں سے جنگلی علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔"

"نہیں، میں اس بارے میں نہیں جانتا۔"

"شکنتلا وہاں پہنچی اور میں بھی حکم جی کے "نائٹ واچرز" سے بچ بچا کر وہاں پہنچ گیا۔ مجھے یاد ہے، وہ پورے چاند کی رات تھی۔ چاند کبھی نکل آتا، کبھی بدلیوں میں چھپ جاتا تھا۔ ہم ایک باغیچے میں ملے تھے۔ وہاں مولسری اور رات کی رانی کے پھول تھے۔ کچنار اور نیم کے گھنے پیڑوں میں ہم ایک دوسرے کی بانہوں میں سما گئے۔ وہ ٹوٹ کر روئی اور میری آنکھیں بھی تر ہو گئیں۔ اس نے کہا مجھے بھولنا نہیں۔ میں بھی جہاں ہوں گی، تمہیں یاد کروں گی۔ تمہارے لیے پرارتھنا کروں گی۔ صبح شام کے بدلتے رنگوں میں، نئے موسموں میں اور تہواروں میں تمہاری صورت میری نگاہوں کے سامنے رہے گی۔ میں نے کہا... میں دل میں ایک کانٹا لے کر یہاں سے جا رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں یہ زخم ہمیشہ رستا رہے گا۔ مجھے بہت خون رلائے گا۔ بس یہ دعا کرنا کہ یہ ناسور بن کر مجھے زندہ در گور نہ کر دے...

"ہم نے وہ سب باتیں کیں جو جدا ہو جانے والے پریمی کسی آخری ملاقات میں ایک دوسرے سے کرتے ہیں۔ لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ وہاں کچھ اور فیصلہ ہو چکا تھا۔ جب شکنتلا آخری بار میرے گلے لگ کر چلی گئی اور میں بھی رخ موڑ کر دوسری طرف روانہ ہو گیا، مجھے لگا کہ وہ رک گئی ہے اور مڑ کر مجھے دیکھ رہی ہے۔ میں مڑ کر نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن شک اتنا شدید تھا کہ مجھے دیکھنا پڑا... ہاں وہ واقعی رک گئی تھی اور دیکھ رہی تھی۔ کچنار، نیم اور مولسری کے پیڑوں کے درمیان وہ چاندنی میں نہائی ہوئی کھڑی تھی اور کوئی آسمانی مخلوق لگ رہی تھی۔ کوئی اپسرا یا پھر کوئی داستانی شہزادی... جس نے مڑ کر دیکھا تھا اور پتھرا گئی تھی۔ اور وہی نہیں میں بھی پتھرا گیا تھا۔ ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر ایک دوسرے کی طرف لپکے اور دوبارہ لپٹ گئے۔ وہ جیسے میرے جسم کا حصہ بن گئی، میرے اندر پیوست ہو گئی۔ میں نے ٹوٹے ہوئے دل فگار لہجے میں کہا... میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکوں گا شاکن۔ وہ ہچکیاں لے کر روتے ہوئے بولی... تو پھر مجھے یہاں سے لے چلو... کہیں بہت دور... جہاں کوئی میری خبر نہ پا سکے...

"اور پھر وہ ہوا جو ہم نے سوچا بھی نہیں تھا، جو ہمارے سان گمان میں بھی نہیں تھا۔ ہم جو، ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے منہ موڑنے کے لیے آئے تھے، ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر اس باغیچے سے نکل گئے۔ اسی حالت میں جس حالت میں تھے۔ ہم گھنے جنگل میں گھس گئے... اندھا دھند بھاگتے رہے اور چلتے رہے۔ ہمیں لگ رہا تھا کہ ہم ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر اسی طرح دنیا کے دوسرے کنارے تک جا سکتے ہیں۔ میں جب شکنتلا سے ملنے کوشلی میں آیا تھا تو میں نے احتیاط کے طور پر ایک پسٹل اپنے کپڑوں میں رکھ لیا تھا۔ اب اس خطرناک جنگل میں یہی پسٹل ہمارے پاس واحد ہتھیار تھا۔ مگر عجیب بات تھی، کوئی خوف نہیں تھا... ہم ایک دوسرے کے گلے لگ کر بہ آسانی موت کو گلے لگا سکتے تھے۔ سچ کہتے ہیں کہ پیار دیوانہ ہوتا ہے۔"

وہ خاموش ہو گیا۔ اس کی ماضی میں جھانکتی ہوئی آنکھیں جیسے پیار کی دیوانگی کو دیکھنے لگیں۔ میلے کچیلے لنگوٹ میں وہ ننگ دھڑنگ بیٹھا تھا۔ اس کے سر اور داڑھی کے جھاڑ جھنکاڑ بال اسے کسی تارک الدنیا سادھو کے روپ میں پیش کر رہے تھے۔ اب وہ شراب کے لیے زیادہ بے تابی بھی نہیں دکھا رہا تھا، اس کا مطلب تھا کہ وہ پورے سرور میں ہے۔ دہانے کی طرف سے ماریا کے کھانسنے کی مدھم آواز سنائی دی... وہ شاید سو رہی تھی۔ بارونا جیکی کو ابھی تک معلوم نہیں تھا کہ اس کی کہانی کا ایک اہم کردار ماریا اسی سرنگ میں اس کے ساتھ موجود ہے۔

"کیا تمہارا پیچھا نہیں کیا گیا؟" میں نے لالٹین کی لو ذرا اونچی کرتے ہوئے پوچھا۔

وہ مسکرایا۔ "نہیں کیا گیا اور اگر کیا بھی جاتا تو دو چار آدمی تو میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ میرے پاس پسٹل تھا اور اس کی کوئی تین درجن گولیاں تھیں۔ میں نے بہت سا مارشل آرٹ گھول کر پیا ہوا تھا اور میرے بدن میں بجلیاں کوندتی تھیں۔ میں دو چار بندوں کی ہڈیاں تو خالی ہاتھ بھی توڑ

www.pkdigest.com

سکتا تھا۔ ہم آدھی رات تک جنگل میں بھاگتے رہے اور پھر اس ندی پر پہنچ گئے جو ''کچے'' کے پاس سے گزرتی ہے۔ وہاں گھاٹ پر بہت سی چھوٹی بڑی کشتیاں موجود تھیں۔ ایک نئی ٹور کشتی مجھے اچھی لگی۔ اس کے اوپر سائبان تھا اور اس کا نیلا رنگ چمکیلا تھا۔ ملاح اور مچھیرے اپنی جھونپڑیوں میں سو رہے تھے۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا، اس خاموشی میں بس کبھی کبھی لہریں کشتیوں سے ٹکراتی تھیں اور مدھم سی آواز پیدا ہوتی تھی۔ کشتی کے اندر بہت سے پھل اور کھانے پینے کی اشیا لدی ہوئی تھیں۔ کشتی کا مالک ایک اشرف نامی نوجوان تھا۔ وہ علی الصباح یہ سامان لے کر یہاں سے روانہ ہو رہا تھا۔ اسے اسٹیٹ ہی کی ایک جاگیر زہرہ آباد تک جانا تھا۔ ہم نے نوجوان سے معقول کرایہ طے کیا اور اسے کہا کہ وہ ہمیں بھی زہرہ آباد لے جائے لیکن شرط یہ تھی کہ وہ ابھی رات کے اندھیرے میں روانہ ہوگا۔ وہ مان گیا۔ ہم اس کے ساتھ ندی کے بہاؤ پر چل دیے۔ نوجوان سمجھ گیا تھا کہ ہم پریمی جوڑا ہیں اور کہیں پناہ کے لیے گھوم رہے ہیں۔ اس نے ہمیں آفر کی کہ اگر ہم کچھ دن کے لیے اس کی اس کشتی میں رہنا چاہیں تو رہ سکتے ہیں۔ اس کے لیے ہم اسے معقول کرایہ دے دیں۔ میں نے اس سے کہا کہ اگر ہم ابھی اور اسی وقت اس سے یہ کشتی خریدنا چاہیں تو پھر؟ پہلے تو وہ نہیں مانا لیکن جب میں نے اسے کشتی کی قیمت سے تقریباً ڈھائی گنا زیادہ رقم آفر کی تو اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ اس نے کرنسی نوٹوں کو لالٹین کی روشنی میں ایک ایک کر کے بڑے دھیان سے دیکھا اور پھر ایک جگہ کشتی کے تالوں کی چابیاں ہمارے حوالے کر کے نیچے اتر گیا۔ اس کا سارا سامان بھی کشتی کے اندر ہی رہا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ صبح کے ملگجے اندھیرے میں کہیں گم ہو گیا۔

''اب یہ خوب صورت کشتی ہماری تھی۔ ہم ایک بانس نما چپو کی مدد سے اسے جس طرف چاہے لے جا سکتے تھے... اور ہم تاریک جنگل میں اسے بہت دور تک لے گئے۔ پھر ندی میں سے ایک اور شاخ پھوٹی۔ یہ شاخ ہمیں تیزی سے اپنے ساتھ بہاتی ہوئی ایک نامعلوم مقام پر لے گئی۔ یوں لگتا تھا کہ یہاں ہمارے اور جنگلی حیات کے سوا اور کوئی نہیں... اور نہ ہی کوئی کبھی یہاں پہنچا ہے۔ یہاں پانی پر ہزارہا کنول تیرتے تھے۔ ان پھولوں کے درمیان آبی پرندوں کی مستیاں تھیں۔ جنگل سے موروں کی ''میں آؤں... میں آؤں'' سنائی دیتی تھی اور شاخوں پر رنگ برنگے طوطے چہکتے تھے۔ ہم نے کشتی کو ایک خاموش کنارے پر ٹھہرا دیا۔''

ذرا توقف کر کے بارونڈا جیکی نے دو گھونٹ لیے۔ اس کی آنکھوں میں یادوں کے خوش رنگ جگنو چمک رہے تھے۔ وہ بولا۔ ''میں ان دنوں شراب نہیں پیتا تھا۔ ہاتھ بھی نہیں لگاتا تھا لیکن مجھے اتنا نشہ تھا جو اس وائٹ 69 کی دس بوتلیں ایک ساتھ پی لینے سے بھی نہیں ہو سکتا... نہیں ہو سکتا۔ اور اس نشے کی بات ہی کچھ اور تھی۔ اس میں خوشبو تھی، آنسو تھے اور ان آنسوؤں کی نمی سے خوشیوں کی کلیاں چٹکتی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ وہ جگہ قدرت نے روزِ ازل سے ہمارے لیے ریزرو کر رکھی تھی۔ ہماری محبت کے لیے... ہمارے ملن کے لیے۔ ہم زمان و مکاں ... کے احساس سے بالکل بے نیاز ہو کر ایک دوسرے میں کھو گئے۔ ہجر کی بے رحم سختیوں نے طلب کی شدت کو انتہا پر پہنچایا تھا اور اب طلب کی اس انتہا نے سرشاری اور کیف کا ایک جہاں آباد کر دیا۔ ہم یوں ملے کہ پیار کے سوا کچھ باقی نہ رہا۔ ہاں میرے دوست! بھی زمین اس طرح دیوانہ وار آسمان سے نہ ملی ہوگی، کبھی بہاروں نے اس طرح ویران باغوں پر یلغار نہ کی ہوگی... اور نہ کبھی تابڑ توڑ بارش نے اس طرح صحراؤں کو جل تھل کیا ہوگا۔ میں شاعر نہیں ہوں لیکن کبھی کبھی میرا دل چاہتا تھا کہ ان روز و شب کے بارے میں شاعری کروں... اگر میں ایسا کر سکتا تو وہ شاعری بے مثال ہوتی۔ وقت اسے مٹا سکتا اور نہ بھلا سکتا۔''

بارونڈا جیکی کی گدلی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ وہ کچھ دیر کے لیے جیسے ان روز و شب میں کھو گیا۔ ان لمحوں میں وہ واقعی ایک چیمپئن فائٹر کم اور ایک شاعر زیادہ نظر آیا...

''پھر کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔ میں چاہتا تھا کہ نشہ اترنے سے پہلے پہلے وہ اپنی کہانی ختم کر لے۔

اس نے گہری سانس لی اور کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔ ''ہم اس کشتی میں پورے سات روز رہے۔ شگفتلا کے شباب نے مجھے سیراب کر دیا اور میری انوکھی محبت کی شدت نے اسے ہر نگر بھلا دی... ہم نے کشتی کا کچھ سامان تو چرندوں پرندوں کو تحفے کے طور پر پیش کر دیا تھا اور کچھ کشتی کے ایک گوشے میں سمیٹ دیا تھا۔ ہم کشتی کے چھوٹے سے ڈیک کو سونے کے لیے استعمال کرتے تھے اور تیز بارش کے وقت بیسمنٹ میں چلے جاتے تھے۔ وہاں نیچر کے سوا ہمیں دیکھنے والا اور کوئی نہیں تھا... اور کبھی کبھی لگتا تھا کہ نیچر بھی ہماری ہم مزاج ہو گئی ہے۔ ایک دن سرخ بالوں والا ایک بہت بڑا ریچھ ندی میں اتر آیا اور کشتی کی طرف بڑھا۔ میں نے پستول نکال لیا لیکن وہ کچھ دیر تک ہمارا جائزہ لینے کے بعد واپس چلا گیا۔ ایک رات پانی میں تیرنے والا ایک سانپ ہمارے ساتھ کشتی پر موجود رہا لیکن اس نے ہمیں کوئی نقصان نہیں

پہنچایا۔ خوراک کی خوشبو مختلف چرندوں کو ہمارے قریب لے آتی تھی اور ہم انہیں مایوس نہیں کرتے تھے۔ میں جانتا تھا کہ ہم تادیر محفوظ نہیں رہ سکتے۔ ہمیں تلاش کرنے والے اس جنگل میں ہر طرف پھیلے ہوں گے اور وہ بہت جلد اس دور افتادہ گوشے تک بھی پہنچ جائیں گے۔ شگفتلا بھی یہ جانتی تھی لیکن ہم ان باتوں کے بارے میں سوچنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ ہم نے طے کر رکھا تھا کہ جب وقت آئے گا، دیکھا جائے گا۔ شگفتلا چاہتی تھی کہ اگر ایسا وقت آ گیا تو میں اپنے ہاتھ سے اسے گولی مار دوں۔ لیکن میں اسے زندہ رکھنا چاہتا تھا، زندہ دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے طور پر ایک پلان بنا رکھا تھا اور میں نے اس سے وعدہ لے رکھا تھا کہ اگر برا وقت آ گیا تو وہ میری ایک بات ضرور مانے گی۔

''اور پھر ایک رات وہ برا وقت آ گیا تھا۔ ہم دونوں کشتی میں لیٹے تھے۔ تاریک آسمان پر تاروں کی بساط بچھی ہوئی تھی۔ ہم سوچ رہے تھے کہ کیا اس کشتی کو چھوڑ کر جنگل میں راستہ بنانے کی کوشش کرنا ٹھیک رہے گا؟ اچانک کچھ آوازیں ہوا پر تیر کر ہم تک پہنچیں۔ یہ پانی پر چپو پڑنے کی آوازیں تھیں، کچھ لوگ بلند آواز میں بول رہے تھے۔ پھر میں نے دور نیم تاریکی میں تین کشتیوں کو دیکھا۔ یہ لوگوں سے بھری ہوئی تھیں۔ کشتیوں کی بناوٹ دیکھتے ہی مجھے یقین ہو گیا کہ یہ محکمہ ہی کے لوگ ہیں اور ہمیں ڈھونڈتے ہوئے یہاں آ پہنچے ہیں۔ ابھی وہ کچھ فاصلے پر تھے، میرے ذہن میں جو پلان تھا میں اس پر عمل کر سکتا تھا۔ اب شاید تمہیں میری بات سن کر حیرانی ہو لیکن میں تمہیں جو بتا رہا ہوں سچ بتا رہا ہوں۔''

''مجھے یقین ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ اپنی جھاڑ جھنکاڑ داڑھی کھجاتے ہوئے بولا۔ ''میں ایک دم شگفتلا پر پل پڑا۔ میں نے اس کے کپڑے پھاڑ دیے، اس کے منہ پر زوردار تھپڑ مارے، اس کے جسم کو نوچ لیا۔ وہ گر پڑی۔ وہ حیرت اور صدمے سے گنگ تھی۔ بس وہ اتنا ہی کہہ پا رہی تھی جیکی... جیکی۔ میں نے اسے اوندھا کیا اور اس کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے۔ چند دن پہلے جنگل میں بھاگنے کے دوران میں اس کے بازوؤں پر زخم آئے تھے، یہ زخم پھر رسنے لگے۔ میں نے اس کا منہ چومتے ہوئے کہا۔ ''شگفتلا! مجھے معاف کر دینا۔ زندگی میں پہلی اور آخری بار تم سے کچھ مانگ رہا ہوں۔ مجھے انکار نہ کرنا اور تم نے وعدہ بھی کر رکھا ہے کہ انکار نہیں کرو گی۔''

''اس کی خوب صورت آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ روتے ہوئے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''وہ لوگ پہنچ رہے ہیں۔ ہم کو پکڑ لیا جائے گا۔ دونوں کو سزا ملنے سے بہتر ہے کہ کوئی ایک بچ جائے۔ میرا بچنا تو بہت مشکل ہے لیکن تم بچ سکتی ہو۔ میری خاطر شاکن... صرف میری خاطر... تم نے ان لوگوں سے یہ کہنا ہے کہ تم اپنی مرضی کے ساتھ نہیں آئی ہو۔ میں تمہیں زبردستی لایا ہوں... پلیز شاکن... انکار نہ کرنا۔''

وہ سرتاپا احتجاج بن گئی۔ وہ دلدوز انداز میں کراہی۔ ''میں ایسا نہیں کر سکتی... کبھی نہیں کر سکتی۔''

''میں نے اس کے خون آلود ہونٹوں کو اپنی ہتھیلی کے ساتھ سختی سے ڈھانپ دیا۔ میں نے اسے بولنے ہی نہیں دیا۔ میں نے اسے اپنے سر کی قسم دی اور اسے لاچار کر دیا، ہاں میرے دوست اسے لاچار کر دیا۔''

جیکی کی آنکھوں میں اب مسرت کے جگنو بجھ چکے تھے، واقعے کی مناسبت سے اب اس کے چہرے سے گہرا اندوہ جھلک رہا تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''ہمیں پکڑ لیا گیا۔ مجھے کشتی پر ہی گرا لیا گیا۔ وہ درجنوں لوگ تھے۔ میں جانتا تھا کہ مزاحمت بے کار ہے۔ انہوں نے میرا پسٹل چھین لیا۔ مجھے اس بری طرح زدوکوب کیا کہ میری ٹانگ کی ہڈی تین جگہ سے ٹوٹ گئی اور ناک منہ سے خون جاری ہو گیا۔ میں وہیں کشتی پر ہی بے ہوش ہو گیا تھا۔

''ہوش آیا تو خود کو زرگاں کی بدنام جیل میں پایا۔ اس جیل کا انچارج جارج گورا جیسا سفاک شخص تھا۔ مجھے ایک زمین دوز کال کوٹھڑی میں رکھا گیا۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ باہر کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ میرا رابطہ فقط ایک شخص سے ہوتا تھا۔ یہ مجھے کھانا پہنچاتا تھا اور پھر خالی برتن لے جاتا تھا۔ میرے جسمانی زخم مجھے دن رات تڑپاتے رہتے تھے۔ پھر ایک دن مجھ پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ جارج گورا بہ نفسِ نفیس میری کوٹھڑی میں آیا۔ اس نے کہا۔ ''موت کی سزا تیرے جرم کے مقابلے میں بہت معمولی ہے۔ تجھے مر مر کر جینا ہوگا۔'' جارج کے ساتھ وہ شخص بھی تھا جو آج کل ماریا کا شوہر ہے... سرجن اسٹیل بریرے۔ وہ کہنے کو سرجن ہے لیکن فطرت میں بے رحم قصاب ہے۔ اس کے پاس ایک بڑا میڈیکل باکس بھی تھا۔ مجھے ایک انجکشن دیا گیا اور میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو میرا بایاں بازو اور دائیں ٹانگ جسم کے ساتھ موجود نہیں تھے۔ مجھ پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ واقعی یہ مر مر کر جینے جیسا تھا۔ میرا فن میری زندگی تھا اور مجھے اس فن سے ہمیشہ کے لیے محروم کر دیا گیا تھا۔ میں اس کال کوٹھڑی میں چھ مہینے تک زندگی اور موت کے درمیان لٹکتا

www.paksociety.com

رہا۔ مجھے ان گنت جسمانی و ذہنی اذیتیں جھیلنا پڑیں... یہاں تک کہ میں جاں بلب ہوگیا۔ مجھے رات کے وقت انتہائی تیز بخار ہونے لگا، اس کے علاوہ میرے بازو کا زخم بھی ٹھیک ہونے میں نہیں آرہا تھا۔ ایک رات سخت بے ہوشی کی حالت میں مجھے جیل کے شفاخانے میں پہنچایا گیا۔ میں اس شفاخانے میں قریباً ایک ماہ رہا۔ یہاں سکیورٹی کا وہ انتظام نہیں تھا جو جیل میں تھا۔ میرے پہرے پر صرف دو افراد ہوتے تھے۔ وہ دونوں ہندو تھے۔ وہ دیوالی کی رات تھی۔ زبردست آتش بازی کی وجہ سے کچھ ہوائیاں شفاخانے کے اندر آگریں اور شفاخانے کے ایک حصے میں آگ بھڑک اٹھی۔ بھگدڑ مچ گئی۔ میرے دونوں پہرے دار تہوار کی وجہ سے اندھادھند پیے ہوئے تھے۔ میں نے ان کی مدہوشی اور آشفتگی کا فائدہ اٹھایا اور ایک خطرناک کوشش کر کے شفاخانے سے نکل گیا۔"

اس نے ایک بار پھر توقف کر کے میری طرف دیکھا اور دیوار سے ٹیک لگا کر بولا۔ "اگر تفصیل میں جاؤں گا تو یہ روداد طویل ہو جائے گی۔ مختصر یہ کہ فرار کے بعد میں تین ماہ تک ایک مہربان پارسی عورت کے گھر میں چھپا رہا۔ وہ گھر میں شراب تیار کرنے کا کام کرتی تھی۔ وہیں پر مجھے شراب کی لت بھی لگی۔ وہیں پر مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ شگفتلا اب کس حال میں ہے۔ کیا تم جاننا چاہو گے کہ اس کے ساتھ کیا ہوا؟"

"کیوں نہیں۔"

"وہ حکم کی پتنی نہیں بن سکی... لیکن پھر بھی حکم نے اسے چھوڑا نہیں۔ وہ حکم کی پسند تھی اور وہ اس کے ساتھ "سونے" کا تہیہ کیے ہوئے تھا۔"

"میں تمہاری بات نہیں سمجھا۔"

جیکی کے چہرے پر عجیب طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ "حکم جیسے لوگ ارادے کے بڑے پکے ہوتے ہیں۔ وفاداری ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے اور یہ وفاداری ہوتی ہے اپنی حرص اور خواہش کے ساتھ۔ اپنے اعلیٰ مقصد تک پہنچنے کے لیے ایسے لوگ وہ ہر نیک کام کر گزرتے ہیں جو ان کے بس میں ہوتا ہے... جو کچھ ہو چکا تھا اس کے بعد حکم، شگفتلا کو اپنی پتنی کا درجہ تو نہیں دے سکتا تھا لیکن وہ اس کے پرکشش جسم سے یکسر محروم ہونا بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس کی خوب صورتی اور اس کی بے مثال زلفوں کا اسیر تھا۔ اس نے ایک درمیانی راستہ نکالا۔ شگفتلا کے ڈرے سہمے پتا اشوک ساہنی کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنی بیٹی کو "فیری" بنا دے۔ فیری بننے کا مطلب سمجھتے ہو تم؟"

"نہیں، مجھے اس بارے میں کچھ زیادہ پتا نہیں۔"

"حکم اور اس کے حواریوں نے اپنے عوام کی دنیا اور عاقبت سنوارنے کے لیے بڑا اعلیٰ انتظام کیا ہوا ہے... شاید تم نے ساتویں کے جشن کے بارے میں سنا ہو؟ اس عالی شان جشن کے موقع پر راج بھون میں بڑے "پاکیزہ" قسم کے انتظامات کیے جاتے ہیں۔ یہ انتظامات درحقیقت حکم اور اس کے درویش صفت دوستوں کی خوشی کے لیے ہوتے ہیں۔ یہ درویش صفت لوگ اسٹیٹ کی بہتری کے لیے دن رات محنت کرتے ہیں، اپنا خون جلاتے ہیں۔ اگر یہ ساتویں کے جشن کے موقع پر آٹھ نو روز شراب وغیرہ پیتے ہیں اور لڑکیوں کے ساتھ تفریح وغیرہ کر لیتے ہیں تو ایسا کیا برا کرتے ہیں؟ اور یہ سب کچھ بڑے شفاف طریقے سے ہوتا ہے بھئی۔ پرانے زمانے سے یہ ریت چلی آرہی ہے۔ جشن کے موقع پر راجواڑے میں سے سات رنگوں کے مطابق سات لڑکیاں چنی جاتی ہیں۔ انہیں فیریاں یا اردو میں پریاں کہا جاتا ہے۔ یہ فیریاں پھر راج بھون کے اندر ہی رہتی ہیں۔ انہیں اٹھنے بیٹھنے کے آداب سکھائے جاتے ہیں۔ فنون کی تعلیم دی جاتی ہے جن میں ظاہر ہے کہ ناچ گانے اور موسیقی وغیرہ کو بہت اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ پرانے زمانے کا تو پتا نہیں لیکن آج کل یہ فیریاں حکم کی رکھیلیں ہی بن جاتی ہیں۔ وہ ان میں سے کسی کو بھی اپنے کسی قریبی دوست کے تصرف میں لاسکتا ہے۔ اب شگفتلا بھی ایک فیری کی حیثیت سے حکم کے حرم میں داخل ہو چکی ہے۔ اب اس کی زندگی راج بھون کی اونچی دیواروں کے پیچھے ہمیشہ کے لیے گم ہے۔"

اپنی اندرونی تلخی کو کم کرنے کے لیے اس نے تھوڑی سی مزید "سیال آگ" اپنے معدے میں اتاری اور اپنا سر سرنگ کی کھردری دیوار سے ٹکا دیا۔

میں نے پوچھا۔ "تم اس مچھیرے کی کشتی تک کیسے پہنچے؟ کہیں یہ وہی کشتی تو نہیں..."

"ہاں، یہ وہی کشتی ہے۔" وہ میری بات کاٹ کر بولا۔ "اسی کشتی میں، میں نے اپنی زندگی کے بہترین سات آٹھ روز گزارے تھے۔ یہ کشتی اب پرانی ہو چکی ہے لیکن اس کے ایک ایک نشیب و فراز پر، ہر ہر انچ پر میری محبت کی یادگاریں ہیں۔ اس کشتی کے اندر اب بھی میری شگفتلا کی مہک جذب ہے۔ اس کی حسین سرگوشیاں چھپی ہوئی ہیں۔ اپنی زندگی کے آخری دن گزارنے کے لیے میں نے یہ کشتی ڈھونڈ لی ہے۔ میں اسی کشتی میں مرنا چاہتا ہوں۔ اگر ایسا نہ ہو سکا... ایسا نہ ہو سکا دوست تو میں اپنی زندگی کی ایک بہت بڑی

راحت سے محروم ہو جاؤں گا... اور یہ محرومی مجھے مر کر بھی چین سے نہیں رہنے دے گی... اسی لیے تو کہتا ہوں، میری مدد کرو... مجھے واپس پہنچا دو۔" آخری الفاظ کہتے کہتے اس کی آواز میں التجا کا رنگ آگیا۔

میں نے پوچھا۔ "کیا تم نے کبھی اس اسٹیٹ سے بھاگ جانے کی کوشش نہیں کی؟"

"مجھے لگتا ہے کہ تم یہاں کے جغرافیے اور حالات سے زیادہ واقف نہیں ہو۔ اس اسٹیٹ کو تین طرف سے ایک چوڑے پاٹ والی بہت تیز رفتار ندی نے گھیر رکھا ہے۔ اس ندی کے ساتھ ساتھ نگرانی کا سخت انتظام ہے۔ چوتھی طرف جنگل ہے۔ اس طرف سے بھی اسٹیٹ کے بارڈر کو تقریباً "سیل" کر دیا گیا ہے۔ ویسے بھی میرے جسم کی حالت تو تم دیکھ ہی چکے ہو۔ اس آدھے جسم کے ساتھ میں کہاں تک بھاگ سکتا تھا۔ جب میں پارسی عورت ہوشن کے پاس تھا، میرے دل میں کئی بار آئی کہ ہوشن کی پناہ چھوڑ کر کسی طرف نکل جاؤں۔ ہوشن نے بڑا حوصلہ کر کے مجھے پناہ تو دے دی تھی لیکن وہ ڈرتی بھی رہتی تھی۔ اس کے ڈر کی وجہ یہ وہم ہی تھا کہ حکم جی کے خاص قیدی اس کی گرفت سے نہیں نکل سکتے اور وہ جہاں بھی چلے جائیں، ان کو کھوج لیا جاتا ہے۔ شاید تم نے بھی یہ بات سنی ہو؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میرے سینے میں سرد لہر سی دوڑ گئی تھی۔ میں اسے کیسے بتاتا کہ میں بھی ان خاص قیدیوں میں سے ایک ہوں اور مجھے بھی ایک جدید "جادو" کے ذریعے اس اسٹیٹ کے اندر جکڑ لیا گیا ہے۔

باروندا جیکی نے کہا۔ "اسے حکم کے روحانی کرشموں میں سے ایک کرشمہ کہا جاتا ہے لیکن اس کی اصل حقیقت سے کوئی بھی واقف نہیں۔ کیا تم جادو ٹونے اور عملیات وغیرہ پر یقین رکھتے ہو؟"

"رکھتا بھی ہوں... اور نہیں بھی... اس معاملے میں بہت سے لوگوں کی طرح درمیان درمیان میں ہوں۔" میں نے کہا۔

"بہرحال، میں تمہیں اپنی محسنہ ہوشن کے بارے میں بتا رہا تھا۔ وہ ہر وقت خوفزدہ رہتی تھی کہ کسی دن اس کے گھر کے دروازے پر حکم کے بے رحم ہرکاروں کی دستک ہو جائے گی۔ وہ بے چاری بیمار رہنے لگی تھی۔ پھر ایک روز میں نے بڑی خاموشی سے اس کا گھر چھوڑ دیا۔ میرے پاس دو تین ہفتوں کی خوراک موجود تھی اور ایک دیسی ساخت کا پستول بھی تھا۔ میں کئی روز تک جنگل میں چھپا رہا۔ پھر میری ملاقات چند مچھیروں سے ہوئی۔ میں ان کے پاس رہنے لگا۔ سب سے بڑا مسئلہ زبان کا تھا۔ میں نیپالی اور انگریزی کے سوا کچھ بول نہیں سکتا۔ وہ یہ زبان نہیں سمجھتے تھے۔ بس اشاروں سے گزارہ ہوتا تھا۔ میں بیمار رہتا تھا۔ بازو کا زخم مسلسل رستا رہتا تھا۔ شراب میری سخت ضرورت بن چکی تھی۔ بہرحال، مجھے زندگی سے کوئی گلہ نہیں تھا اور نہ اب ہے۔ میں سو سال زندہ رہ کر بھی شاید وہ کچھ حاصل نہ کر پاتا جو میں نے اس ستائیس اٹھائیس سال کی زندگی میں حاصل کر لیا ہے۔ شگفتلا کے ساتھ گزارے ہوئے دن میرا قیمتی سرمایہ ہیں۔ ان دنوں کی خوب صورت یادوں کے سہارے میں جیتا رہا ہوں اور ان یادوں کے سہارے ہی اب مرنا بھی آسان لگ رہا ہے۔ ان مچھیروں کے ساتھ رہتے ہوئے میرے دل میں یہ خواہش جاگی تھی کہ میں اس نیلی کشتی کو ڈھونڈوں، جس میں، میں نے شگفتلا کے ساتھ وقت گزارا تھا۔ اس سلسلے میں ایک مقامی شخص نے بھی میری مدد کی۔ آخر میں کامیاب ہوا۔ مجھے وہ کشتی مل گئی۔ مچھیروں کے ساتھ رہتے ہوئے میں کام بھی کیا کرتا تھا۔ میرے پاس کچھ رقم جمع تھی اور پستول بھی تھا۔ میں نے یہ سب کچھ کشتی کے موجودہ مالک ملاح سیوک رام کو دے دیا اور اس سے اجازت لے لی کہ میں جب تک زندہ ہوں، اس کشتی میں رہوں گا اور وہ مجھے کھانا اور شراب دیتا رہے گا۔ وہ میری حالت دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ یہ گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔ اس نے اقرار کر لیا۔ تو یہ ہے میری کہانی..."

آخری الفاظ ادا کرتے کرتے جیکی کی سانس پھول گئی اور آواز پھر سے لڑکھڑانا شروع ہو گئی۔ دراصل اب اس کا نشہ ذرا دھیما پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ نشے کے بغیر اس کی وہی حالت ہو جاتی تھی جو کسی نارمل شخص کی نشے میں دھت ہو کر ہو سکتی ہے۔ وہ کسی لاغر کچھوے کی طرح پیوند زمین ہو جاتا تھا اور اس کی آواز ٹوٹ ٹوٹ جاتی تھی۔

اس کی کہانی متاثر کن تھی۔ مجھے اس کہانی نے شاید اس لیے بھی زیادہ متاثر کیا کہ میں خود بھی دل کا روگی بن چکا تھا۔ ثروت میری محبت تھی اور وہ مجھ سے بہت دور چلی گئی تھی... پچھلے دو ڈھائی سالوں میں پلوں کے نیچے سے نجانے کتنا پانی بہہ چکا تھا۔ یہاں سلطانہ مجھے اپنی بیوی بتاتی تھی۔ وہ ایک دلیر لڑکی تھی۔ اس میں کچھ انوکھی باتیں موجود تھیں۔ جیسے یہ کہ وہ کبھی زیور نہیں پہنتی تھی۔ شاید وہ زیور کو عورت کے لیے غلامی و محکومی کی علامت سمجھتی تھی۔ وہ میری زندگی کی خاطر عارضی طور پر سر جارج گورا کے ہاتھوں بے بس تو ہوئی تھی لیکن جہاں تک میں اسے سمجھا تھا، وہ ظلم سہہ کر بھول جانے

www.pkdigest.com

والوں میں سے نہیں تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اسے جب بھی موقع ملے گا، وہ کچھ کر کے رہے گی۔

چند منٹ تک میرے اور بار وندا جیکی کے درمیان اس کی روداد کے بارے میں سوال جواب ہوئے۔ تب میں نے ایک بار پھر اسے سابقہ موضوع کی طرف لانا چاہا۔ میں نے اس کی جلد کو چھوتے ہوئے کہا۔ ''جیکی! تم ایک مختلف شخص ہو۔ تمہارے جیسے چیمپئن فائٹر کو ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔''

''تم... کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''تمہارے اندر جسمانی تکلیف سہنے کی بے پناہ گنجائش ہے۔ اس بیمار حالت میں بھی تم برداشت کے معاملے میں بے مثال ہو۔ تم اس بارے میں مجھے بھی کچھ بتانے جا رہے تھے لیکن پھر درمیان میں تمہاری یہ دلچسپ روداد آگئی۔''

اس نے نفی میں انگلی ہلائی۔ ''میں مرنے والا ضرور ہوں لیکن میری یادداشت زیادہ کمزور نہیں ہوئی۔ میں اب بھی تمہیں بتا سکتا ہوں کہ الزبتھ ٹیلر کے چوتھے شوہر کا نام کیا تھا اور پرل ہاربر کی بندرگاہ پر کس تاریخ کو حملہ ہوا تھا۔'' اس نے چند لمحے توقف کیا اور پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''میں نے تمہیں بتانے کا وعدہ ضرور کیا تھا لیکن آج نہیں کل... کل تم پھر میرے لیے شراب اور بنٹر بیف کا ایک ''ٹین'' لاؤ گے۔ ہم یہاں اس بیڈ کے قریب اطمینان سے بیٹھیں گے اور مارشل مارٹ کے بارے میں بات کریں گے۔''

میں طویل سانس لے کر رہ گیا۔

اگلے روز میری آنکھ دس گیارہ بجے کے قریب کھلی۔ سرنگ کے دہانے پر ایک بار پھر ہنگامہ برپا تھا۔ انور خاں اونچی آواز میں بول رہا تھا۔ دوسری طرف دہانے کے باہر سے کسی اور شخص کے بولنے کی آواز بھی آرہی تھی۔ یہ شخص تھم کے اہل کاروں میں سے تھا اور انور خاں سے زوردار مکالمہ کر رہا تھا۔

اس مکالمے سے پتا چلا کہ انور خاں اور چوہان وغیرہ نے ماریا کے وارثوں کو اٹھارہ گھنٹے کی جو دوسری مہلت دی تھی، وہ بھی اب ختم ہوگئی ہے۔ انور خاں چنگھاڑ رہا تھا۔ ''ہم سمجھ گئے ہیں۔ یہ گھی سیدھی انگلیوں سے نکلنے والا نہیں۔ تم ہمارے پاس اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں چھوڑ رہے کہ اس حرامزادی کو زندگی اور موت کے درمیان لٹکا دیں اور یہ بس اب ہونے ہی والا ہے۔''

دوسری طرف سے بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ ''میں تمہیں پھر پیشکش کرتا ہوں۔ تم مسٹر اسٹیل اور گرومودان کو اپنے پاس ضمانت کے طور پر رکھ لو۔ لیکن میم صاحبہ کو چھوڑ دو۔ اس کے بعد ہم سارا معاملہ بات چیت کے ذریعے طے کر سکتے ہیں۔''

''ہم تمہارے کہنے سے پہلے ہی میم صاحبہ کو چھوڑنے کا فیصلہ کر چکے ہیں لیکن یہ ایک ٹکڑے میں تمہارے پاس نہیں آئے گی۔ تھوڑی تھوڑی کر کے آئے گی۔'' انور خاں نے زہرناک لہجے میں کہا۔ ''پہلے اس کے ہاتھوں کی انگلیاں آئیں گی۔ پھر پاؤں کی... پھر کوئی اور ٹکڑا۔''

''تم خود کو مسلمان کہتے ہو؟'' بھاری بھرکم آواز والے نے کہا۔

''ہاں... ہم مسلمان ہیں... اور اسی لیے اس کی عزت بچی رہی ہے۔ ورنہ یہ بھی مختار راجپوت کی بیٹی کی طرح تاراج ہو چکی ہوتی۔ باقی رہی اس کے ٹکڑوں کی بات... تو انصاف تو یہی کہتا ہے۔ کان کے بدلے کان... آنکھ کے بدلے آنکھ۔ اس کتے جارج نے اپنی جیل میں کتنے لوگوں کو اعضا کاٹ کاٹ کر بے کار کیا ہے؟ آج اس کی بہن کو تھوڑا سا بدلہ چکانا ہوگا۔''

ماریا کے شوہر سرجن اسٹیل کی لڑکھڑاتی آواز ابھری۔ ''دیکھو، تم لوگ اپنے لیے بدترین انجام کو CHOOSE کر رہا ہے۔ ہام تمہارا ڈیمانڈ مان رہا ہے۔ سلطانہ کے بھائی اور قادر کو چھوڑا جا رہا ہے۔ ہام نے آج تمہارا ایک ڈیمانڈ بھی مانا کہ جن 50 لوگوں کا لسٹ تم نے دیا، اس میں سے 25 لوگوں کو ریلیز کر دیا جائیں گا لیکن باقی لوگوں میں سے کچھ تو ایسا ہے جو ہماری کسٹڈی میں نا ہیں... اور دو چار ایسا ہے جن پر بہت سخت کیس ہے۔''

''کیس تو تم پر بھی بہت سخت ہے اسٹیل صاحب۔'' اسحاق پھر دہاڑا۔ ''ایسے کیسوں کے بدلے تمہاری اپنی بچی کو دس بار بھی پھانسی دی جاوے تو کم ہے۔ اور مجھے لگ رہا ہے کہ یہ زیادہ دیر زندہ رہنے والی نا ہیں ہے۔ بس اب گھنٹوں کی نا ہیں منٹوں کی بات ہے۔''

''پانڈے! میری بات سنو۔'' گرومودان نے اپنے کسی ساتھی کو پکارا۔

''آ رہا ہوں سر۔'' پانڈے نے جواب دیا۔ یہ بھاری آواز والا وہی تھا جو انور سے مکالمہ کر رہا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ مجھے یاد آگیا کہ مجھے یہ نام میڈم صفورا نے بتایا تھا۔ ایک لہر سی میرے جسم میں دوڑ گئی۔ یہ رنجیت پانڈے، غالباً تھم کا وہی اہل کار تھا جسے... دشمنوں کے لیے عزرائیل کہا جاتا تھا... اور وہ یہاں پہنچ چکا تھا۔

خطروں کے دائروں میں سفر کرتے جانبازوں کی داستان کے بقیہ واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

بیوی کی تدفین سے فارغ ہو کے سلطان گھر آ گیا۔ وہ تنہائی چاہتا تھا اسی لیے اس نے ملازمہ کو کام پر نہ آنے کی ہدایت کر دی تھی، پورے مکان پر ایک سوگوار خاموشی طاری تھی۔ وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا اپنی بیوی نائلہ آفرین کی تصویر دیکھ رہا تھا، تصویر دیوار پر آویزاں تھی۔ بلاشبہ نائلہ بہت خوب صورت تھی۔ اس نے سوچا... پھر اچانک اس کے دل میں نفرت کی لہریں اٹھنے لگیں۔ اس کا دل چاہا کہ وہ تصویر پر گرم گرم چائے سے بھری پیالی کھینچ مارے۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنی اس خواہش پر قابو پایا۔

اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ سلطان نے چائے کی پیالی میز پر رکھی اور فون اٹھایا، دوسری طرف خفیہ پولیس کا انسپکٹر رضوان گوندل تھا۔

''کوئی نئی بات معلوم ہوئی انسپکٹر صاحب؟'' سلطان نے دریافت کیا۔

''نہیں جناب! ہم اب تک مکمل تاریکی میں ہیں۔'' انسپکٹر رضوان نے جواب دیا۔ ''اگر حالات میں کوئی تبدیلی نہ آئی تو شاید ہم کبھی بھی آپ کی بیوی کے قتل کا معما حل نہ کر سکیں۔ مجرم بہت چالاک ہے۔ اس نے کوئی بھی ایسی غلطی نہیں کی جس سے ہمیں قتل کی تفتیش میں کوئی مدد مل سکے۔''

سلطان کے پتلے پتلے ہونٹوں پر مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ اس نے خشک لہجے میں کہا۔ ''انسپکٹر! میں بہت مصروف آدمی ہوں۔ میرا ارادہ ہے کہ میں اس مکان کو تالا لگا کر کچھ دنوں کے لیے اپنے آبائی گاؤں ٹھٹھہ میں قیام کروں اس لیے...''

''مجھے آپ کے جذبات کا احساس ہے جناب!'' انسپکٹر رضوان نے جلدی سے کہا۔ ''اس وقت میں نے صرف یہ پوچھنے کے لیے فون کیا تھا کہ کیا آپ نے اپنی ڈاک دیکھ لی ہے؟''

سلطان نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔ اس نے سر

اسرار و تحیر کی دھند میں چھپا قاتل...... ایک حیرت انگیز انجام کی مختصر و پراسرار کتھا

بعض باتیں حقیقی ہونے کے باوجود خواب افسانہ اور دھوکا معلوم ہوتی ہیں ...... دھوکے اور فریب سے بنے گئے جال میں الجھ جانے والے سہل پسند شخص کی کہانی

چارکن

عبدالرب بھٹی

www.pkdigest.com

موڑ کر میز پر رکھے ہوئے وہ بے شمار خطوط دیکھے جو اس کے دوستوں اور عزیزوں نے اس کی بیوی کی موت پر بہ طور تعزیت اسے بھیجے تھے۔ اس نے بیوی کی موت کے بعد ایک ہفتے کے دوران میں کئی مرتبہ خطوط کا یہ انبار ٹٹولا تھا کہ کہیں اس میں کوئی کاروباری نوعیت یا کسی اہم قسم کا خط شامل نہ ہو مگر اس نے کوئی تعزیتی خط کھولنے کی زحمت تک گوارا نہیں کی تھی۔

''ابھی تو نہیں دیکھی۔'' سلطان نے مختصر سا جواب دیا۔ ''لیکن اس سے بھلا کیا فرق پڑتا ہے؟''

''ہمیں یقین ہے کہ قاتل نے آپ کو تعزیتی خط ضرور لکھا ہوگا... کیونکہ قاتل کا آپ کے حلقۂ احباب میں شامل ہونا لازمی امر ہے۔ اس نے ضرور آپ کو تعزیتی پیغام بھیجا ہوگا۔ اگر ایسا نہیں کرے گا تو خود کو مشکوک بنا لے گا۔ اتنی بات تو اسے بھی معلوم ہوگی۔''

''ہو سکتا ہے اس نے کوئی خط بھیجا ہو لیکن وہ خط اعتراف نامہ ہرگز نہ ہوگا جسے پڑھ کر ہم اسے گرفتار کرلیں۔'' سلطان نے طنز آمیز تلخی سے کہا۔

''درست ہے آپ کی بات سلطان صاحب!'' انسپکٹر رضوان نے کہا۔ ''لیکن ماضی کے تجربات کے پیش نظر یہ امکان رد نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنے تعزیتی خط میں غلطی سے کوئی ایسی بات لکھ جائے جس سے ہمیں تفتیش میں مدد مل سکے۔ میری خواہش ہے کہ آپ پہلے ڈاک کا مطالعہ کیجیے۔ اس کے بعد میں بھی وہ خطوط پڑھنا پسند کروں گا۔''

''بہتر ہے۔'' سلطان نے... تھکے تھکے سے انداز میں کہا۔ ''...لیکن میں اب بھی اس بات پر یقین نہیں کر سکتا کہ میرا کوئی دوست نائلہ کا قاتل ہو سکتا ہے... اس رات دعوت میں جتنے لوگ مدعو تھے، وہ سب میرے دوست تھے۔ میں ان میں سے ہر شخص کو ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ ان میں سے کوئی بھی ایسا شقی القلب اور بے رحم نہیں ہے جو اتنی سفاکی سے میری بیوی کو قتل کر دے... اور پھر اس کی کوئی وجہ بھی تو ہونی چاہیے۔ خوانخواہ کون کسی کو قتل کرتا ہے؟''

دوسری طرف چند ثانیے کے لیے پُرسوچ خاموشی طاری رہی۔ ''بات یہ ہے کہ پارٹی میں شریک ہونے والے ہر فرد کا بیان یہ تھا کہ وہ سب مختصر ٹولیوں کی صورت میں محوِ گفتگو تھے۔ تھوڑی بہت کاک ٹیل بھی چلی تھی، ممکن ہے کسی نے نشے میں مدہوش ہو کر ایسا بھیانک جرم کر ڈالا ہو...'' انسپکٹر نے نکتہ پیش کیا۔

سلطان کو اپنے دوستوں پر طیش آنے لگا جنہوں نے کاک ٹیل کا بھی ذکر کر ڈالا تھا۔ گزشتہ ہفتے کی رات کو اس نے اپنے گھر پر دعوت کی تھی، دوستوں کے ہمراہ کاک ٹیل کا بھی دور چلا تھا۔ اگر اس کا مکان شہر سے باہر نہ ہوتا تو شاید اس رات محلے والوں کی نیند حرام ہو جاتی، ہر مہمان نے دل بھر کر کاک ٹیل پی تھی اور تقریباً سبھی نشے میں دھت تھے۔ انہوں نے خوب اودھم بھی مچایا تھا۔

انسپکٹر رضوان کہہ رہا تھا... دوسری طرف سے ''ممکنات'' پیش کیے جا رہا تھا۔ ''ممکن ہے کوئی مہمان رات کو کسی وقت مکان سے باہر نکل آیا ہو اور اس نے آپ کی خوب صورت بیوی نائلہ آفرین کو باہر چاندنی میں کسی ویران کنج میں تنہا کھڑے دیکھ لیا ہو اور...''

''انسپکٹر رضوان۔'' سلطان نے تیز لہجے میں اس کی بات کاٹ کے کہا۔ ''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟''

''معافی چاہتا ہوں مگر پولیس کی تفتیش کی گاڑی شک کے ایندھن سے ہی آگے بڑھتی ہے۔ آپ میری بات کا مطلب سمجھ چکے ہیں۔'' انسپکٹر رضوان نے قدرے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ''کیونکہ آپ کی بیوی محض پتھر کی ضرب لگنے سے جاں بحق ہوئی ہیں جو کاری ثابت ہوئی، اس لیے میرے کہنے کا مطلب تھا کہ یہ مجھے اس قسم کا واقعہ لگتا ہے۔ کسی نے موقع غنیمت جان کر نشے کی حالت میں آپ کی بیوی پر بری نیت سے مجرمانہ حملہ کیا اور مقتولہ نے اپنے دفاع میں اس کے ناپاک عزائم کو ناکام بنانا چاہا، جس کی بنا پر قاتل نے غصے میں آکر وہ پتھر دے مارا ہو...''

''آپ کی بات درست ہو سکتی ہے۔'' بالآخر سلطان نے اعتراف کیا۔ پھر بات ختم کرنے کی غرض سے بولا۔ ''ٹھیک ہے میں اپنی ڈاک ضرور چیک کروں گا۔''

یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ اسے شدت سے شراب کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے دیوار میں بنی وائن کیبنٹ سے ایک بوتل نکالی اور گلاس بھر کر اپنی بیوی نائلہ آفرین کی تصویر دیکھتے ہوئے گھونٹ لینے لگا۔ نائلہ کے لبوں پر تبسم تھا۔ اس کی نظریں اپنے شوہر پر جمی ہوئی تھیں۔ سلطان خاں بڑے غور سے اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ اس رات جب نائلہ کی لاش دریافت ہوئی تھی تو لاش کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں تھی۔ وہ مکان کے پچھواڑے کچھ فاصلے پر درختوں کے درمیان ایک صاف جگہ چاندنی میں نہائی ہوئی تھی۔ اس کا لباس تار تار تھا اور سر کے گرد خون کا ایک تالاب سا جما تھا۔ لاش بالکل اس انداز میں پڑی تھی جس طرح سلطان نے اسے چھوڑا تھا۔ اس نے اپنی بیوی کے سر پر پتھر مار کے اسے ہلاک کیا تھا پھر اس کا لباس پھاڑا تھا۔

اس نے سرور میں آنے والی یادیں اپنے ذہن سے جھٹک دیں۔ اب یہ باتیں سوچنے سے کیا فائدہ؟ اس کا منصوبہ

کامیاب رہا تھا۔ حالانکہ یہ منصوبہ اس نے بہت عجلت میں بنایا تھا۔ وہ نائلہ کی لاش کے ساتھ پولیس کو ایک عدد قاتل دینے کا بھی ارادہ رکھتا تھا تاکہ پولیس سے اس کی جان ہمیشہ کے لیے چھوٹ جائے لیکن عین وقت پر منصوبے کے آخری حصے میں کوئی گڑبڑ ہو گئی چنانچہ پولیس کو نائلہ کی لاش ہی مل گئی، اسے قاتل نہیں مل سکا جس کی تلاش سے اب وہ مایوس ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے باوجود پولیس نے اس پر قطعاً شک نہیں کیا تھا۔ یہ بھی ایک طرح سے اس کے منصوبے کی کامیابی کا ثبوت تھا۔

'ہونہہ... ہمارے ملک کی پولیس اتنی دور تک سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتی کہ مجھ پر شبہ کرے۔' اس نے مغرورانہ انداز میں مسکراتے ہوئے سوچا۔

اپنے منصوبے میں کامیاب ہونے کے باوجود وہ یہ ارادہ رکھتا تھا کہ اپنی بیوی کے قاتل کی حیثیت سے تنویر واسطی کو پولیس کے سامنے پیش کر دے۔ اس کا اس نے پورا انتظام بھی کیا تھا۔ اس نے تنویر واسطی کو نائلہ کی لاش کے قریب بے ہوش کر کے ڈال دیا تھا اور جس پتھر سے اس نے نائلہ کو ہلاک کیا تھا، وہ پتھر اس نے بے ہوش تنویر کے ہاتھ میں تھما دیا تھا اور واپس گھر آ گیا تھا۔ اب یہ اس کی بدقسمتی کہ تنویر کو وقت سے پہلے ہی ہوش آ گیا اور جب سلطان اپنے چند دوستوں کے ساتھ نائلہ کو تلاش کرتا ہوا اس جگہ پہنچا تو وہاں صرف نائلہ کی لاش پڑی تھی۔ تنویر واسطی غائب تھا...

اگر تنویر کچھ دیر اور بے ہوش رہتا تو پولیس کو لاش کے ساتھ مجرم بھی مل جاتا اور سارا قصہ وہیں ختم ہو جاتا۔

سلطان نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے گلاس خالی کر کے میز پر رکھ دیا۔

ڈور بیل کی آواز نے سلطان کو چونکا دیا۔ گھنٹی کی آواز بہت دھیمی تھی جیسے کہیں بہت دور بج رہی ہو۔ یہ داخلی دروازے کی گھنٹی نہیں تھی۔ آنے والے نے اندر داخل ہونے کے لیے مکان کا بغلی دروازہ پسند کیا تھا۔ سلطان اس بے وقت ملاقاتی کو کوستا ہوا بغلی دروازے پر پہنچا۔ دروازہ کھولتے ہی اسے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا کیونکہ اس کے سامنے تنویر واسطی کھڑا تھا۔

☆☆☆

تنویر کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ بال الجھے ہوئے تھے۔ شیو بڑھا ہوا اور چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے وہ کسی بھی لمحے رونا شروع کر دے گا۔ سلطان کو دیکھ کر اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''تم نے میرا خط پڑھ لیا سلطان؟''

''کون سا خط؟'' سلطان نے حیرت سے پوچھا۔

''...یہ تم نے اپنی حالت کیا بنا رکھی ہے...؟ اور... تم پچھلے دروازے سے کیوں آئے ہو؟''

تنویر، سلطان کے سوالات نظر انداز کرتا ہوا اندر آ گیا۔ وہ باورچی خانے سے ہوتا ہوا سیدھا ڈرائنگ روم میں آ کر ایک کرسی پر ڈھیر ہو گیا اور اس طرح ہانپنے لگا جیسے بہت دور سے بھاگتا ہوا آ رہا ہو۔ سلطان بھی اس کے پیچھے پیچھے ڈرائنگ روم میں آیا اور قریب کھڑے ہو کر چند ثانیے اسے تیز مگر پُرسوچ نظروں سے گھورتا رہا۔

''میں پوچھتا ہوں یہ سب کیا ہے، تنویر؟''

تنویر واسطی نے رومال سے اپنی عرق آلود پیشانی پونچھی پھر بولا۔ ''سلطان...! میں... میں... تمہاری بیوی... نائلہ کا قتل... قاتل ہوں۔'' تنویر نے اٹکتے ہوئے انکشاف کیا۔

''تم...؟''

''ہاں... میں، کل رات میں نے تمہیں ایک خط بھیجا تھا جس میں سب کچھ لکھ ڈالا تھا، تمہاری حیرت بجا ہے... سلطان! میں خود نہیں جانتا کہ میں نے نائلہ کو کس طرح ہلاک کیا؟ مجھے کچھ نہیں معلوم۔ میں اس وقت نشے میں بالکل مدہوش تھا لیکن قتل جیسے معاملے میں یہ عذر قابلِ قبول نہیں ہوتا۔ مجھے یاد ہے نائلہ وہاں اکیلی چاندنی رات میں ٹہل رہی تھی۔ وہ کس قدر خوب صورت نظر آ رہی تھی... مم... مگر... اُف...'' تنویر نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ اس کے ہاتھ بُری طرح لرز رہے تھے۔

سلطان خاموش رہا۔ یہ خیال تو اس کے ذہن میں آیا ہی نہیں تھا کہ تنویر بھی خود کو نائلہ کا قاتل تصور کرنے لگے گا۔ حالانکہ یہ اس کے منصوبے کا منطقی ردِعمل تھا۔ نشے میں مدہوش آدمی کو جب ہوش آئے گا اور وہ خود کو ایک عورت کی لاش کے قریب پڑا ہوا پائے گا، مستزاد آلۂ قتل بھی اس کے ہاتھ میں ہو تو وہ یہی نتیجہ اخذ کرے گا کہ نشے کی حالت میں خود اسی نے عورت کو ہلاک کیا ہے۔

''مجھے کچھ یاد نہیں آتا۔'' تنویر دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے بڑبڑائے جا رہا تھا...

''...البتہ یہ یاد آتا ہے کہ میں نے نائلہ سے کچھ کہا تھا، اس نے مجھے کچھ جواب دیا تھا پھر میں اس کی طرف بڑھا... اس کے بعد پتا نہیں کیا ہوا؟ پھر معلوم نہیں کب میں نیند سے بیدار ہوا تو نائلہ میرے سامنے مردہ پڑی تھی۔ میں نے اس کے سر پر پتھر مار کر اسے ہلاک کر دیا تھا۔ وہ پتھر اس وقت بھی میرے ہاتھ میں تھا۔''

''تم کس خط کا ذکر کر رہے تھے؟'' سلطان نے اس کی بات نظر انداز کر کے پوچھا۔

www.pkdigest.com

"ہاں... گزشتہ رات جب مجھ سے اپنے ضمیر کی ملامت برداشت نہ ہوسکی اور میری حالت بالکل پاگلوں جیسی ہوگئی تو میں نے تمھیں ایک خط لکھا۔ میں نے اس خط میں اپنے جرم کا اعتراف کیا تھا۔ پھر میں نے فوراً وہ خط لیٹر بکس میں ڈال دیا لیکن خط ڈالنے کے بعد اپنے ارادے کے مطابق میں خودکشی نہ کرسکا... ہاں سلطان! میں اپنے جرم کا اقرار و اعتراف کرنے کے بعد خودکشی کرنا چاہتا تھا، مگر افسوس مجھ میں اتنی ہمت نہ ہوئی کہ میں جرأت کر پاتا...." یہ کہہ کر تنویر نے اپنی جیب سے پستول نکالا اور اسے الٹ پلٹ کر غور سے دیکھنے لگا۔

پستول دیکھ کر سلطان کا خون خشک ہونے لگا۔

"سنو... تنویر! میں نے اب تک تمہارا خط نہیں پڑھا بلکہ میں نے اب تک آنے والی ڈاک ہی نہیں دیکھی ہے۔ تمام خطوط... وہ دیکھو... وہ میز پر اسی طرح بند رکھے ہیں۔"

"سلطان! میں قسم کھاتا ہوں، میں... میں نائلہ کو ہلاک کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ یقین کرو سلطان! یہ بھیانک جرم میں نے ہوش و حواس کے عالم میں نہیں کیا۔" تنویر نے اس کی بات اَن سنی کرتے ہوئے رنج و غم میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔

"... جب مجھے اپنے جرم کا احساس ہوا تو مجھ پر سونا حرام ہوگیا۔ یقین کرو، سلطان! میں اس وقت سے اب تک ایک پل کے لیے بھی نہیں سوسکا۔ کل رات خط لکھنے کے بعد میں خودکشی کرنا چاہتا تھا۔ جب میں رات بھر خودکشی نہ کرسکا تو آج صبح مجھے اپنے بیوی بچوں کا خیال آیا۔ میں نے سوچا کہ اگر میں خودکشی کرلیتا تو میرے بچوں کا مستقبل کیا ہوتا؟ وہ زندگی بھر کسی سے نظریں ملا کر بات کرنے کے قابل نہ رہتے اس لیے اب میں وہ خط واپس لینے آیا ہوں سلطان!"

سلطان کو تنویر کا پستول پکڑنے کا انداز بالکل پسند نہیں آیا۔ اسے یوں لگا جیسے تنویر جذباتیت کے خمار سے نکل کر ہوش میں آنے کے بعد اب پستول کے زور پر اپنا لکھا ہوا اعترافی خط واپس لینا چاہتا ہو۔

"اپنا خط لے جاؤ تنویر!" بالآخر سلطان کو بادل ناخواستہ کہنا پڑا۔ وہ اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہو رہا تھا۔

"ہاں... اسے واپس لے جاؤ اور فوراً تلف کردو۔ یقین کرو دوست، تمہارا یہ راز ہمیشہ میرے سینے میں دفن رہے گا... تم مجھ پر پورا بھروسا کرسکتے ہو۔"

"مجھے بہلانے کی کوشش مت کرو سلطان۔" تنویر نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "مجھے معلوم ہے تم اپنی بیوی سے کتنی محبت کرتے تھے، ظاہر ہے تمہاری کوشش یہی ہوگی کہ تمہاری بیوی کا قاتل کیفر کردار کو پہنچے... مجھے واقعی بہت افسوس ہے سلطان! لیکن تم دیکھ رہے ہو کہ حالات نے مجھے کتنا مجبور کردیا ہے... مجھے اب تمھیں بھی قتل کرنا پڑے گا سلطان! میں مجبور ہوں ایسا کرنے پر...."

"ٹھہ... ٹھہرو... تنویر... تت... تم نائلہ کے قاتل نہیں ہو مجھے پورا یقین ہے۔"

"تم مجھے بہلانے کی کوشش مت کرو، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے نائلہ پر دست درازی کرنے کی کوشش کی تھی اور نائلہ نے مزاحمت بھی کی تھی، جس پر...."

"اس نے مزاحمت نہیں کی تھی۔" سلطان اس کی بات کاٹتے ہوئے چلایا۔ "میں اس وقت وہیں موجود تھا اور درختوں کے پیچھے چھپا ہوا سب دیکھ رہا تھا۔ نائلہ نے تمہاری دست درازی کی حوصلہ افزائی کی تھی پھر تم دونوں وہیں گھاس پر لیٹ گئے تھے... اور پھر تم شراب کی زیادتی کے باعث اچانک بے ہوش ہوگئے۔ نائلہ جھک کر تمھیں بیدار کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس وقت میں نے نائلہ کے سر پر پتھر سے پہلی ضرب لگائی اور جب مجھے یقین ہوگیا کہ وہ مرچکی ہے تو میں نے وہ پتھر تمہارے ہاتھ میں تھما دیا تاکہ دیکھنے والے یہ سمجھیں کہ نائلہ کو تم نے قتل کیا ہے۔"

تنویر کچھ دیر تک فرش کو گھورتے ہوئے سوچوں میں مستغرق رہا پھر اس نے حلق سے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے سر اٹھایا۔

"کاش... میں تمہاری بات پر یقین کرسکتا، سلطان...!" اس نے کہا۔ "...لیکن تم خود سوچو، میں کس طرح یقین کروں؟ کیونکہ وہ پتھر میرے ہاتھ میں تھا۔"

"لیکن وہ پتھر تو میں نے تمہارے...."

"نہیں سلطان... مجھے معلوم ہے کہ ان باتوں سے تمہارا کیا مقصد ہے، اس میں تمہارا بھی کوئی قصور نہیں ہے... اگر تمہاری جگہ میں ہوتا تو میں بھی اس وقت اپنی جان بچانے کے لیے وقتی طور پر قتل کا الزام اپنے سر لینے کی کوشش کرتا.... مجھے بے حد افسوس ہے سلطان! اب میں ایسے دوراہے پر کھڑا ہوں کہ واپس نہیں جاسکتا۔ کاش! میں نے تمھیں وہ خط نہ لکھا ہوتا۔" تنویر نے سلطان کا نشانہ لیا اور گولی چلانے سے پہلے کہا۔ "کاش! اس مصیبت سے نکلنے کا کوئی اور راستہ ہوتا۔"

گولی چلنے سے چند لمحے پہلے تک سلطان یہ سوچتا رہا کہ کاش وہ کسی طرح تنویر کو یہ یقین دلا سکے کہ قاتل تم نہیں ہو میں ہوں۔

آخری ہچکی لینے تک وہ اس مسئلے کا حل تلاش کرتا رہا۔

●●●

قاتل گھنٹی

سیریناراض

دنیا میں کوئی فرد ایسا نہیں جس کی کوئی کمزوری نہ ہو..... ہر شخص کی ذات میں کوئی نہ کوئی سقم ضرور پوشیدہ ہوتا ہے..... کسی کو جلد اپنی خامی کا پتا چل جاتا ہے..... اور کوئی شخص آخری لمحات تک اس کی اسیری میں قید رہتا ہے..... ایک ایسے ہی تنک مزاج شخص کا ماجرا جسے ہر طرح کی گھنٹیوں کی آوازیں الجھن میں مبتلا کر دیتی تھیں۔

حقوق انسانی اور تہذیب کا گڑھ کہلانے والے مغرب کی بدتہذیب شرانگیزیاں

دریائے وائی کیٹو، ہملٹن شہر اور آبادی کے بیچوں بیچ سے گزرتا ہے۔ میں دوپہر کو سٹنگ روم میں بیٹھا، میز پر پاؤں پسارے، شیشے کے پار بہتے ٹھنڈے پانی کو حسرت سے دیکھ رہا تھا۔ کوئی اور دن ہوتا تو میں دوڑتا ہوا جاتا اور دریا میں چھلانگ لگا کر میلوں دور تک تیرتا رہتا... مگر افسوس.... اس دن تو موسم ہی اتنا برا تھا کہ میں سٹنگ روم سے باہر آنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

سخت گرمیوں کے دن تھے۔ میں شہر کے کنارے بنے ہوئے ایک چھوٹے سے بنگلے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ میں یہاں کام کے سلسلے میں تقریباً پندرہ ماہ سے مقیم ہوں۔ یہ بات نہیں ہے کہ مجھے گرمیوں کا موسم اچھا نہیں لگتا۔ بات یہ تھی اس دن سورج آتی آگ برسا رہا تھا کہ مجھے زندگی اجیرن لگنے لگی تھی۔ اس جھلسا دینے والے موسم میں، اگرچہ کمرے میں بیٹھا ہوا تھا لیکن در و دیوار بھی تپش کو کمرے میں آنے سے روکنے میں ناکام

ہو رہے تھے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے اوون میں بیٹھا گوشت کے ٹکڑوں کی طرح بھن رہا ہوں۔ مستزاد یہ کہ گھر کا ائرکنڈیشنر کب کا خراب پڑا ہوا تھا۔ اب ایسے میں نظروں کے سامنے ٹھنڈے پانی کا بہتا دریا ہو تو کس کمبخت کا دل نہیں چاہے گا کہ جا کر اس میں ڈبکی نہ لگائے۔ کم از کم اس اوون نما کمرے میں بیٹھے رہنے سے تو یہ اچھا ہوتا مگر میری ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ اس بھری دوپہر میں باہر نکلوں اور جا کر دریا میں نہاؤں۔ تپتے سورج تلے، سڑک پار کر کے دریا تک پہنچنا اس وقت بہت مشکل کام لگ رہا تھا۔

اچانک بیرونی دروازے پر کسی ملاقاتی نے گھنٹی بجائی۔ ہملٹن میں میرا کوئی واقف کار نہیں تھا۔ کون آگیا ہے اور وہ بھی ایسی آگ برساتی دوپہر میں۔ یہ میرے لیے قطعی غیر متوقع بات تھی۔ اس شدید گرمی میں بنگلے کے بیرونی دروازے تک جانا میرے لیے محال تھا۔ آنے والا شاید بہت بے صبرا تھا۔ اس نے چند سیکنڈ میں دوبارہ گھنٹی بجائی اور دوسری بار تو بیل پر ہاتھ رکھ کر بھول ہی گیا۔

میرے لیے گھنٹی فون کی ہو یا دروازے کی...... گھنٹیوں کی آوازیں مجھے سخت ناپسند ہیں۔ ان آوازوں کو سن کر ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے دماغ پر آرا چلا دیا ہو۔ میں سخت ناگواری اور بیزاری کے عالم میں اٹھا۔ گیٹ پر پہنچا تو ایک نوجوان کھڑا تھا۔

''جی فرمایئے۔ میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟''

میں نے اس اجنبی نوجوان کو دیکھ کر بیزاری سے پوچھا۔

''کیا یہ زیادہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہم اندر چل کر بات کر سکیں؟'' اس نے ہاتھ میں رول کیے ہوئے پمفلٹ کا بنڈل اور کچھ کتابچے اٹھا رکھے تھے۔

''آیئے۔'' میں نے بادل ناخواستہ کہا۔

کمرے میں داخل ہو کر اس نے ہیٹ اتاری اور پانی کا ایک گلاس طلب کیا۔ جب میں پانی لے کر آیا تو وہ صوفے پر بیٹھ چکا تھا۔

''میں ایک ماحولیاتی تنظیم سے وابستہ ہوں اور ہم چاہتے ہیں کہ لوگوں کو علم ہو کہ یہ جو گرمی بڑھ رہی ہے، یہ دنیا بھر کے درجۂ حرارت میں اضافے کی وجہ سے ہے۔'' اس نے پانی پی کر گلاس سائڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

''کیا بکواس ہے؟'' میں نے دل ہی دل میں اجنبی نوجوان پر لعنت بھیجی۔ ''فرمایئے میں آپ کے لیے کیا کرسکتا ہوں؟'' اس قدر گرمی میں، اس کی فضول بات سن کر میرا پارا چڑھ گیا۔

''آپ یہ کرسکتے ہیں کہ اس موسمیاتی تبدیلی کے سبب...'' اس نے ہاتھ بڑھا کر ایک کتابچہ اور پمفلٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ اسی دوران اس کے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس کے فون میں عجیب بے تکی سی ٹون سیٹ تھی۔ یہ بج نہیں رہی تھی بلکہ یوں لگ رہا تھا جیسے دماغ کو سزا کے طور پر ستوائی جا رہی ہے۔ ''سوری۔ پلیز ایک منٹ۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے فون اٹینڈ کرنے کے بجائے کال کرنے والے کا نام پڑھنا شروع کر دیا اور کال اٹینڈ کیے بغیر لائن کاٹ دی۔

''ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ عالمی...'' اس کے موبائل نے ایک بار پھر چنگھاڑنا شروع کر دیا۔

اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ میں نے اس نوجوان کا کیا بگاڑا تھا جو یہ اس جھلساتی دوپہر میں میری زندگی کو اور عذاب بنانے چلا آیا۔ وہ فون اٹینڈ کرتا ہے یا نہیں۔ یہ دیکھے بغیر میں وہاں سے اٹھا اور برابر والے کمرے میں چلا آیا۔ میں نے فریج کھول کر ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی اور منہ سے لگا دی۔ اسی دوران میری نظر سامنے رکھے اس فریم پر پڑی جس میں میری بیٹی کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ یہ فریم میں کیلیفورنیا سے آتے ہوئے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ وہ بن بلایا عذاب جاں فون پر لگا ہوا ہے۔ بہتر ہے کہ جب تک وہ اپنی بکواس [illegible] تصویر [illegible] میں یہ سوچ کر میں اسٹور میں گیا۔ ہتھوڑی اور ایک کیل لے کر واپس آیا تو وہ اجنبی نوجوان خاموش بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا۔

''سوری۔ آپ ذرا فون پر مصروف تھے۔ اس لیے...'' میں نے اپنی بات مکمل بھی نہیں کی تھی کہ اس نے قطع کلامی کی۔

''نہیں نہیں، کوئی بات نہیں۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا...''

''کیا کہہ رہے تھے آپ؟'' میں اس کی پشت پر جا کر کیل ٹھونکنے کے لیے مناسب جگہ تلاش کرنے لگا۔

''میں کہہ رہا تھا کہ عالمی...'' اس کے فون کی گھنٹی ایک بار پھر بجنے لگی۔ اس بار اس نے فون اٹینڈ کرنے کے بجائے اپنی بات جاری رکھی۔ میں اس کے عقب میں کھڑا ہوا تھا اور فون اس کے سامنے والی میز پر رکھا ہوا تھا۔ ہتھوڑی میرے ہاتھ میں تھی اور فون کی گھنٹی ہتھوڑے کی طرح میرے دماغ پر پڑ رہی تھی لیکن وہ فون اٹھانے کے بجائے مجھے دیکھے بنا مستقل بک بک کیے جا رہا تھا۔ میں غصے سے پلٹا۔ میرا دل چاہا کہ اس کے فون پر اتنی زور سے ہتھوڑی ماروں کہ کمبخت ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جائے۔ میں اپنے ارادے میں کامیاب ہونے ہی والا تھا کہ اچانک اس نے سر پیچھے کی طرف گھمایا اور ہتھوڑی فون کے بجائے اس کی کنپٹی پر جا لگی۔

میں نے فون پر دوبارہ ہتھوڑی مارنے کی کوشش کی تو اس نے ایک اور جھٹکا لیا۔ جس سے میرا توازن بگڑ گیا۔ اسی دوران میں معلوم نہیں کس طرح ہتھوڑی میرے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے پر جا پڑی۔ میرا ناخن نیلا پڑ گیا اور کنارے سے ذرا سا خون بھی نکل آیا۔ میں آگے بڑھا اور نوجوان کا جائزہ لینے لگا۔ ہتھوڑی کی ضرب کاری لگی تھی۔ وہ دم توڑ چکا تھا۔

☆☆☆

ہملٹن، نیوزی لینڈ کا ایک چھوٹا شہر ہے۔ میں کیلیفورنیا میں واقع اپنے گھر سے ہزاروں میل دور بحر اوقیانوس کے پار، اس شہر میں بیٹھا ہوا تھا۔ اگر کام کی مجبوری نہ ہوتی تو میں کب کا اس شہر کو خدا حافظ کہہ کر واپس چلا جاتا۔

بات یہ ہے کہ میں پروفیشنل اسکرپٹ رائٹر ہوں اور اس وقت کیلیفورنیا کے مقامی ٹی وی چینل سے جرائم اور پولیس تفتیش پر میرا ٹی وی شو گزشتہ ایک دہائی سے کامیابی سے چل رہا تھا مگر تقریباً چند مہینوں سے اس کی مقبولیت میں کچھ کمی آتی جا رہی ہے۔ آخر میں بھی انسان ہوں۔ کب تک دماغ کی مشین کو چلا چلا کر کامیاب کہانیاں تخلیق کرتا رہوں گا......

یوں کہہ لیں کہ میرے ذہن پر جمود سا طاری ہوتا جا رہا تھا۔

ایک دن میں نے اپنے پروگرام کے پروڈیوسر اور ڈائریکٹر جیکب کے ساتھ [illegible] میٹنگ میں تجویز پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''[illegible] اب بہت ہو چکا۔ [illegible] یہ پروگرام بند کر دینا چاہیے۔''

انہوں نے میری بات سے اتفاق نہیں کیا۔ ان کا خیال تھا کہ شو بہت کامیاب ہے، سوائے حالیہ مہینوں کی چند کمزور اقساط کے۔ اس لیے بجائے اس کے کہ پروگرام بند کر دیا جائے۔ مجھے چند مہینے کیلیفورنیا سے دور کسی نئے شہر میں تبادلۂ آب و ہوا کر کے آرام کرنا چاہیے۔ تاکہ تھکے دماغ کو کچھ آرام مل سکے۔

''تم ایسا کرو کہ نیوزی لینڈ چلے جاؤ۔'' شو کے پروڈیوسر ڈیوڈ نے فوراً پیشکش کی۔ ''وہاں میرا ایک بنگلا ہے۔ تم آرام سے وہاں رہ سکتے ہو۔ چھوٹا سا شہر ہے اور الگ تھلگ ہے اس بنگلے کے سامنے دریا بہتا ہے۔ وہاں تمہارے دماغ کو کافی سکون ملے گا۔''

''ہاں ہاں۔ یہ سب سے بہتر ہے۔ تم ایسا کرو کہ وہیں پر پروگرام کی قسط بھی لکھتے رہنا اور ہمیں فیکس سے بھیج دیا کرنا۔'' ڈائریکٹر جیکب نے فوراً پروڈیوسر کے فیصلے کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

''جیسے آپ سب کی مرضی۔'' میں نے ہتھیار ڈال دیے۔

''تو پھر رضامند ہو؟'' جیکب نے مجھے خاموش دیکھ کر کہا۔

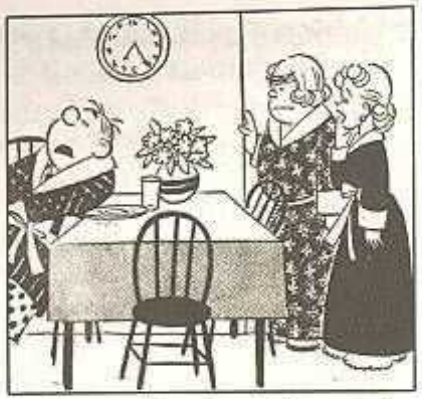

نہیں مم...... ڈیڈ صبح سویرے نہیں اٹھے بلکہ بے خوابی میں ٹہلتے ٹہلتے، رات کو اس کرسی پر ڈھیر ہو گئے ہوں گے

''گھر پر کون سا بیوی بیٹھ کر انتظار کر رہی ہے جو مجھے جانے میں اعتراض ہو سکتا ہے؟''

''تو ٹھیک ہے۔ پھر تم اگلے ہفتے ہی چلے جاؤ۔''

یوں میں ہملٹن چلا آیا۔ جب میں یہاں آیا تو موسم خاصا خوشگوار تھا بلکہ چند روز پیشتر تک موسم قابل برداشت تھا۔ پچھلے تین چار روز سے اتنی گرمی پڑنے لگی تھی۔ اب اس گرمی میں بیٹھا ہوا یہ سوچ رہا ہوں کہ دن کب گزرے گا۔ کب شام ہوگی اور میں چہل قدمی کے لیے باہر نکل سکوں گا؟

☆☆☆

حقیقت یہ ہے اس شو سے پہلے میں ایک ناکام رائٹر تھا۔ برسوں سے لکھتا چلا آ رہا تھا لیکن مجھے کبھی وہ مقام نہیں مل سکا جس کا میں متمنی تھا۔ مختلف رسالوں میں کہانیاں لکھتا، کبھی کبھار مقامی ریڈیو سے اسکرپٹ لکھنے کو مل جاتا۔ کسی اسٹیج شو کے لیے کوئی ڈراما لکھ دیتا۔ بس اسی طرح ہونے والی ہوائی آمدنی پر گزر بسر ہو رہی تھی۔

میں مزاجاً ایک مصنف ہوں۔ اسی لیے آج تک جم کر لکھنے کے سوا کبھی کوئی اور مستقل نوعیت کا کام نہیں کرسکا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ٹی وی شو سے پہلے میری زندگی بہت ہی عسرت میں بسر ہو رہی تھی۔ مدتوں تک ناکامی میں زندگی بسر کرنے کے بعد اس ٹی وی شو سے ہی مجھے کامیابی نصیب ہوئی تھی۔ اسی کی بدولت میری عسرت زدہ زندگی میں بہار آئی تھی۔ دل سے تو میں بھی یہی چاہتا تھا کہ یہ پروگرام چلتا رہے۔ مگر لکھتے لکھتے میرا دماغ اتنا تھک چکا تھا کہ اب نئے نئے آئیڈیاز کی آمد سست ہوتی جا رہی تھی۔ اسی لیے میں نے بنا

www.pkdigest.com

کسی حجت کے فوراً نیوزی لینڈ جانے کی حامی بھر لی تھی۔

کلارا سے میری ملاقات مقامی ریڈیو اسٹیشن پر ہوئی تھی۔ جہاں وہ شوقیہ طور پر بطور اناؤنسر کام کررہی تھی۔ ویسے وہ ایک دواساز کمپنی میں فارماسسٹ تھی۔ ہم دونوں عمر کے اس حصے میں تھے جہاں انسان اپنا مستقبل بنانے کے لیے تگ ودو کرتا ہے۔ سو کلارا بھی یہی سمجھتی تھی کہ بطور رائٹر میں بہت جلد کامیابی حاصل کرلوں گا۔ وہ میری بہت حوصلہ افزائی کیا کرتی تھی۔ ہم اکثر شام کو اکٹھے ڈنر کرتے تھے۔ اس دوران ہم ایک دوسرے کے بہت قریب آتے چلے گئے اور ہم نے شادی کرلی۔

شادی کے بعد کلارا نے ریڈیو کو خیرباد کہہ کر مکمل یکسوئی کے ساتھ اپنی ملازمت پر توجہ دی اور ترقی حاصل کرتی گئی۔ اسی دوران میں ہماری ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ ہم نے اس کا نام جولیا رکھا۔ تقریباً دس برس تک ہم اکٹھے رہے لیکن اب کلارا کو یہ یقین ہو چلا تھا کہ میں زندگی بھر کامیابی حاصل نہیں کرسکتا۔ یہ سوچنے میں وہ حق بجانب تھی۔ ہم جس شاندار فلیٹ میں رہتے تھے، اس کا کرایہ بہت زیادہ تھا۔ اس کے علاوہ کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے کے سو قسم کے اخراجات تھے۔ ایسے میں کب تک وہ اکیلی اپنا، بچی کا اور میرا بوجھ اٹھاتی...

ان حالات میں ایک دن میری بیوی نے اپنا سامان سمیٹا اور میری بیٹی کو ساتھ لے کر مجھے خدا حافظ کہنے آئی۔ اس وقت مجھ سے دور ہونے والی میری چہیتی بیٹی نے میرے گلے میں بانہیں حمائل کردیں اور کہنے لگی۔

”ڈیڈی آپ کب اچھی سی ملازمت کریں گے؟“

میرے پاس بیٹی کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ میں نے آہستگی سے اسے الوداع کہا۔ ”خدا حافظ۔“

بیوی اور بیٹی کے چلے جانے کے بعد میں نے وہ فلیٹ چھوڑ دیا اور شہر کے مضافات میں واقع ایک کمرے کے فلیٹ میں اٹھ آیا۔ اس سے بڑا فلیٹ میری مالی اوقات سے باہر تھا۔ یہ وہ دن تھے جب میں صرف ایک بن اور بنا دودھ والی ایک کپ کافی پر پورا دن بسر کرنے پر مجبور تھا۔ جیسے وہ شب و روز تھے، ان میں یہ کھانا مل جانا بھی غنیمت تھا۔

مجھے اپنی بیٹی سے بہت زیادہ محبت تھی اور ہے۔ پوری دنیا میں ایک وہی ہے جسے میرا خیال رہتا ہے۔ وہ ہر مہینے مجھے فون کیا کرتی ہے۔ اب تو وہ شادی شدہ ہے اور سین ڈیاگو کے ایک شاندار فلیٹ میں اپنے شوہر کے ساتھ رہتی ہے۔ اس نے بزنس کی تعلیم حاصل کی تھی اور اب ایک بہت بڑی تجارتی فرم میں کاروباری مشیر کے طور پر کام کرتی ہے۔

خیر تو میں بتا رہا تھا کہ عمر کی چار دہائیاں گزر جانے کے باوجود میں مسلسل جدوجہد کررہا تھا مگر کامیابی مجھے اپنا دامن پکڑنے ہی نہیں دے رہی تھی۔ یہ کچھ عرصہ پہلے کی بات ہوگی جب ایک ٹی وی ڈائریکٹر نے اپنے نئے شو کے لیے بطور رائٹر میری خدمات حاصل کیں۔ یہ ٹی وی شو ایک بیوٹیشن کے اوپر بنایا جارہا تھا جو چائے کی پتیوں اور ٹیروکارڈ کی مدد سے قتل کے معمے سلجھایا کرتی تھی۔ بیوٹیشن کے مرکزی کردار کے لیے ایک بڑی عمر کی اداکارہ کا انتخاب کیا گیا۔ اس اداکارہ سے میں برینٹ وڈ میں واقع اس کے گھر پر ملا تھا تاکہ کردار کے حوالے سے اس سے بات کرسکوں۔

یہ ملاقات جس کمرے میں ہوئی اس میں سگریٹ کے دھوئیں اور وسکی کی ناقابل برداشت بو پھیلی ہوئی تھی۔ اگرچہ عام طور پر یہ اداکارہ کافی نیک نام تھی لیکن اس دن پتا چلا کہ وہ اس ٹی وی شو کو کیوں کامیاب دیکھنے کی خواہشمند تھی۔

میک اپ سے عاری چہرہ لیے اس بوڑھی ہوتی اداکارہ نے مجھ سے کہا کہ وہ اپنی ڈھلتی عمر کی وجہ ایک ایسا جاندار کردار ادا کرنا چاہتی ہے جو اسے شوبز کی دنیا میں زندہ رکھ سکے۔ اس نے مجھ سے درخواست کی کہ میں ایسا اسکرپٹ لکھوں جس میں اس کی شخصیت ابھر کر سامنے آجائے۔ شو کامیاب ہو یا نہ ہو، وہ کامیاب ہوجائے۔ اس کام کا معاوضہ وہ مجھے نوٹوں کی شکل میں نقد طور پر دے گی۔

دوسرے دن میں نے اداکارہ کی مرضی کے مطابق اسکرپٹ آئیڈیا ڈائریکٹر کو پیش کیا۔ جس میں چائے کی پتیوں اور ٹیروکارڈ کے بجائے لکھا تھا کہ ایک بلی مجرم کے ذہن کو پڑھتی ہے اور وہ بلی اداکارہ کے لبوں سے حقیقت کو بیان کرتی ہے۔ ڈائریکٹر خفا ہوا کہ میں نے پورے پروگرام کی تھیم ہی بدل ڈالی ہے جب کہ میں اصرار کررہا تھا کہ اس نئی تھیم پر ہی شو کیا جائے۔ ہمارے درمیان اس بات پر کافی دیر تک بحث ہوتی رہی۔ ہم اسکرپٹ کے حوالے سے تو کسی نتیجے پر نہیں پہنچے لیکن بات شور شرابے تک ضرور پہنچی۔ اس اہم گفتگو کا اختتام میرے اور ڈائریکٹر کے سامنے کا ایک دانت ٹوٹنے پر ہوا۔

ویسے تو میں طبعاً بہت شریف النفس انسان ہوں۔ میں شراب نہیں پیتا، جوا نہیں کھیلتا۔ فلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہوں۔ حیوانی بہبود کی کوششوں میں این جی اوز کا ساتھ دیتا ہوں لیکن ان سب اچھی باتوں کے باوجود مجھے صرف اس لیے جیل کاٹنی پڑی کہ میں نے حملہ کرکے ڈائریکٹر کا دانت توڑ دیا تھا۔ چند ماہ بعد جیل سے گلو خلاصی ہوئی تو میں

ایک بار پھر سڑک پر آچکا تھا۔

بعد کے برسوں میں کئی کتابیں لکھیں جنہیں پذیرائی نہ مل سکی۔ اس کے نتیجے میں پبلشروں نے اپنے دروازے مجھ پر بند کردیے۔ مختصر کہانیاں لکھیں جو بہت کم چھپتی تھیں۔ بس کبھی کبھار کوئی فرمائشی اسکرپٹ لکھنے کو مل جاتا تو چند دن اچھے کٹ جاتے تھے۔

انہی حالات میں ایک دن میرے ایک دوست کے گھر پر پارٹی تھی۔ وہاں ایک مقامی ٹی وی چینل کے ڈائریکٹر جیکب سے ملاقات ہوئی۔ اس نے میرا نام کہیں پڑھا تھا اور اسے یاد بھی رہ گیا تھا۔ باتوں باتوں میں، میں نے یونہی کہہ دیا۔

”کیوں نہ پولیس کی تفتیش اور جرائم پر مبنی ٹی وی شو بنایا جائے۔“

میری بات اس کے دل کو لگی اور پھر اگلے دو ہفتوں بعد ہم شو کی کاغذی کارروائیوں میں مصروف تھے۔ جیکب نے مجھے بطور اسکرپٹ رائٹر لیا تھا۔ یہ پروگرام ایک سہ ماہی کے لیے تھا مگر اس دوران میں اس نے اتنی شہرت حاصل کرلی کہ ٹی وی چینل کی انتظامیہ نے اسے مزید ایک سہ ماہی کے لیے جاری رکھنے کی منظوری دے دی۔ یہ سلسلہ اتنا بڑھا کہ اب دس برس سے شو جاری ہے، مگر گزشتہ چند ماہ میں اس کی مقبولیت میں جو معمولی فرق آیا ہے اس نے پروڈیوسر اور ڈائریکٹر کو مجبور کردیا کہ وہ تبدیلی آب و ہوا کے لیے کیلیفورنیا سے باہر جانے کی پیشکش کریں۔ اس لیے میں آج کل ہملٹن میں مقیم ہوں۔

ہملٹن کے جس بنگلے میں رہ رہا تھا، اسے آپ باؤنڈری برج سے بھی دیکھ سکتے ہیں۔ یہ بنگلا پچاس کی دہائی میں تعمیر کیا گیا تھا۔ دریا کے کنارے سے تھوڑے فاصلے پر بنے ہوئے اس بنگلے کے چاروں طرف درخت لگے ہوئے تھے۔ جس کی وجہ سے یہ بنگلا، دوسرے بنگلوں سے الگ تھلگ محسوس ہوتا ہے۔

باؤنڈری برج میں ایسی کوئی بات نہیں تھی جو قابل تعریف ہو۔ دریا کے دو کناروں کو ملانے والا یہ عام سا پل تھا جو تین ستونوں پر تعمیر کیا گیا تھا۔ اس دریا پر بنا ہوا یہ واحد پل نہیں، اس جیسے کئی اور چھوٹے بڑے پل ہملٹن سے گزرنے والے دریائے وائی کیٹو پر بنے ہوئے تھے۔ پُل دریا سے خاصا اونچا تھا۔ جسے زیادہ تر پیدل چلنے والے استعمال کرتے تھے، تاہم اس پر سے گاڑیاں بھی گزر سکتی تھیں۔

☆☆☆

خدا خدا کرکے دوپہر ڈھلی۔ میں نے غسل کیا۔ ٹی شرٹ اور شارٹس نکال کر پہنے۔ میں واک کے لیے جانے کی تیاری کررہا تھا۔ باہر دھوپ کی تمازت کافی حد تک کم ہوچکی تھی۔ واک کے سوا مجھے کوئی اور کام نہیں تھا ماسوائے ایک پیکٹ سگریٹ خریدنے کے۔

میں پہلے تو واک باقاعدگی سے نہیں کرتا تھا۔ مگر کچھ عرصے تک جب میری صحت کافی ڈانواں ڈول رہی تو کیلیفورنیا میں میرے ڈاکٹر نے تجویز کیا.... کہ میں ہر شام خالی ذہن کے ساتھ ٹہلنے کے لیے جایا کروں۔ اس نے مجھے سگریٹ نوشی چھوڑنے کی بھی ہدایت کی تھی لیکن میں یہ عادت اب تک نہیں چھوڑ سکا تھا۔ ہاں چہل قدمی کے مشورے پر بدستور عمل ہورہا تھا۔ چہل قدمی کا مشورہ مجھے خاصا مناسب لگا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ایک رائٹر ہوں۔ یہی میری روزی روٹی ہے۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ باقاعدگی سے چہل قدمی کے سبب میرے دماغ پر اس کا کافی اچھا اثر پڑا ہے۔ اس دن بھی میں گھر سے باہر ٹہلنے کے لیے ہی نکلا تھا۔

میں کئی مہینوں سے ہملٹن میں تھا۔ میرا معمول تھا کہ چہل قدمی کے لیے باہر نکلتا اور سڑک پر چلتا ہوا پل تک پہنچتا اور پھر پل عبور کرکے دریا کے دوسرے کنارے پر واقع علاقے میں آجاتا۔ پھر تین چار کلومیٹر تک آگے چلتا ہوا ڈیری نامی جگہ تک پہنچتا۔ وہاں کی کسی ایک دکان سے سگریٹ کا پیکٹ خریدتا اور پلٹ کر واپس گھر کی طرف چل دیتا۔ یہ علاقہ ڈیری اس لیے کہلاتا تھا کہ پورے علاقے میں دودھ، دہی کی خریداری کا یہ واحد مرکز تھا۔ یہاں پیچھے کی طرف بھینسوں کے کئی باڑے بنے ہوئے ہیں۔ اسی لیے یہاں... ہر وقت تازہ دودھ دستیاب ہے۔

اس دن جب میں ڈیری کے قریب رکا اور ایک دکان سے سگریٹ کا پیکٹ خرید کر آگے بڑھنے لگا تو ایک نوجوان... دکھائی دیا۔ یہ میرے آگے آگے بہت ہی بے ڈھنگے طریقے سے جارہا تھا۔ اس کا حلیہ خاصا گندہ تھا۔ سر کے بال کافی بڑھے ہوئے تھے، جسے اس نے چوٹی کی شکل میں پیچھے کی طرف باندھا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی جنگلی بلی کی ادھ کٹی پونچھ ہو۔ اس کے بالوں کو دیکھ کر لگتا تھا کہ کئی ہفتوں سے نہ تو شیمپو کیا گیا ہے اور نہ ہی ان میں کنگھی کی گئی ہے۔ اسے دیکھ کر کہا جاسکتا تھا کہ وہ یا تو واک کرنے کے لیے گھر سے نکلا ہے، یا اپنے لیے منشیات خرید کر پلٹا ہے یا پھر کسی سے لڑنے کے لیے جارہا ہے۔ اس حلیے کے نوجوان کو دیکھ کر کچھ بھی کہا جاسکتا تھا۔ اس نے سیاہ رنگ کی ڈھیلی ڈھالی پرانی سی ٹی شرٹ اور سیاہ رنگ کا سلوٹوں بھرا ہوا شارٹس پہن رکھا تھا۔ ساتھ ہی سر پر سرخ رنگ کی بیس بال کیپ تھی اور کانوں

www.pkdigest.com

میں ہیڈ فون لگا ہوا تھا۔ یہ ہیڈ فون ستر کی دہائی میں تو نیا نیا ہوگا مگر اب وہ نہایت بھدا لگ رہا تھا۔ یہ نوجوان مجھ سے کچھ قریب تھا اور مجھے اس کے ہیڈ فون کے دونوں بڑے بڑے اسپیکرز سے نکلنے والی موسیقی کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ یہ پاپ میوزک تھا۔ جسے سن کر مجھے ایسا لگا کہ کوئی دیہاتی مشین پر تیزی سے مویشیوں کا چارا کتر رہا ہو۔ بے تکی موسیقی اور بے ڈھب نوجوان...

ہم جس فٹ پاتھ پر چل رہے تھے، وہ خاصا تنگ تھا۔ اب تک تو میں اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا لیکن جب میں پل کے قریب پہنچا تو اس کے شارٹس کی پیچھے کی جیب میں رکھے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ ہیڈ فون کی وجہ سے وہ تو گھنٹی کی آواز نہیں سن پا رہا تھا مگر یہ آواز سنتے ہی میری رفتار خود بخود تیز ہوگئی۔ ابھی نوجوان سے آگے نکلنے کی کوشش میں میرا کندھا اس سے ٹکرا گیا۔ میں نے نظریں اٹھا کر اسے معذرت خواہانہ انداز میں دیکھا۔ اس بار اس کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ اس کے چہرے کی شیو بڑھی ہوئی تھی اور کھلے منہ سے پیلے پیلے دانت جھانک رہے تھے۔

”تم...“ اس نے مجھے گالی دی۔

”آئی ایم ویری سوری۔“ میں نے گالی کے باوجود جواب میں شائستگی سے کہا۔ اس وقت ہم تقریباً پل کے وسط تک پہنچ چکے تھے۔ وہ ایک بار پھر میرے آگے آگے چلنے لگا۔ اس دوران میں اس کا موبائل پھر بجا مگر وہی قصہ۔ ہیڈ فون کانوں میں چلا رہا تھا۔ وہ گھنٹی کی آواز کیسے سن سکتا تھا۔ یہ بتانے کے لیے کہ تمہارا فون بج رہا ہے، میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ بات یہ نہیں تھی مجھے اس سے ہمدردی ہو رہی تھی۔ بات یہ تھی کہ اس کے فون کی گھنٹی تیز بج رہی تھی۔ اس کی آواز میرے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح لگ رہی تھی۔ ابھی میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا کہ وہ تیزی سے پلٹا اور ایک بار پھر گالی دے کر آگے بڑھنے لگا۔

فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ اب میرے دماغ کا فیوز اُڑ چکا تھا۔ اس وقت تک ہم پل کے وسط سے آگے نکل آئے تھے۔ میں نے اس کے شارٹس کی پچھلی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ میں چاہتا تھا کہ اس کا موبائل فون نکال کر دریا میں پھینک دوں۔ میں نے اس کی جیب سے موبائل فون نکالا ہی تھا کہ وہ تیزی سے پلٹا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر ہاتھ اٹھاتا، میں نے خود کو اس کے وار سے بچانے کے لیے اسے دھکا دیا۔ وہ پل کی دیوار سے جا ٹکرایا۔ ابھی میں سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ وہ ایک بار پھر مجھ پر جھپٹا۔ میں نے اس سے بچنے کی کوشش کی لیکن اس بار اس کا توازن بری طرح بگڑ گیا اور وہ گھر کے بل پل سے نیچے دریا کی طرف پلٹا اور چند سیکنڈ کے اندر اندر.... چلاتے ہوئے سر کے بل دریا میں جا گرا اور غائب ہوگیا۔ میں نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ دور دور تک کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ نہ آدمی اور نہ ہی کوئی گاڑی۔ چند لمحوں میں یہ سب کچھ ہو گیا تھا۔ میں نے چاروں جانب دیکھ کر اچھی طرح یہ اطمینان کر لیا تھا کہ نوجوان کو مجھ سے لڑتے اور دریا میں گرتے ہوئے کسی نے دیکھا تو نہیں۔ مطمئن ہونے کے بعد میں نے زمین پر گرا ہوا اس کا موبائل اٹھایا۔ چنگھاڑتا ہوا موبائل فون اب خاموش تھا۔ اس نوجوان کی طرح جس کے جسم میں کچھ دیر پہلے تک بجلی دوڑ رہی تھی، مگر اب تک شاید وہ ساکت لاش میں بدل چکا ہوگا... دریائے وائی کیٹو کے سرد پانی میں مردہ مچھلی کی طرح۔

میں نے پہلے ہی بتایا تھا کہ میں مزاجاً شریف انسان ہوں۔ مجھے اس کی موت پر افسوس ہوا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اس کی لاش کی طرح اس کے موبائل کی بے حرمتی نہیں ہونی چاہیے۔ میں نے اس کا موبائل فون اٹھا کر اپنی جیب میں رکھا اور گھر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ گھر پہنچتے ہی میں نے ٹیلی فون اٹھایا اور پولیس اسٹیشن کا نمبر ملانے لگا۔

”ہیلو۔“

”جی میں وائی کیٹو دریا پر واقع فیری پوائنٹ کے قریب واقع گھر سے بول رہا ہوں۔ میں نے ابھی ابھی اپنے گھر کی کھڑکی سے دیکھا ہے کہ ایک نوجوان نے پل پر سے دریا میں چھلانگ لگا دی ہے۔ میرے خیال میں اس شخص نے جس انداز سے دریا میں چھلانگ لگائی ہے، وہ نہانے کے لیے تو کم از کم نہیں ہو سکتی۔ اس نے مکمل لباس پہنا ہوا تھا۔“ فون اٹینڈ ہوتے ہی میں نے بتانا شروع کر دیا۔

”شکریہ۔ آپ اپنا نام پتا بتا دیجیے۔“ ڈیوٹی افسر نے میری بات مکمل ہونے پر کہا۔ اس کے بعد دوسری جانب سے چند گھسے پٹے سوالات پوچھے گئے۔ یعنی مکان نمبر، فون نمبر، سڑک، نام وغیرہ وغیرہ۔ اس کارروائی کا اختتام ہوا تو میں نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

☆☆☆

میرے گھر کی گھنٹی بجی۔ میں گیٹ کے قریب ہی موجود تھا۔ فوراً آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا اور دروازے پر موجود شخص کو اندر آنے کو کہا۔ مجھے اس ملاقاتی کے آنے کی توقع تھی۔

”برائے مہربانی کیا آپ اپنی سگریٹ بجھا سکتے ہیں؟“

سراغ رساں شیفن نے مسکراتے ہوئے کہا۔ یہ شخص چالیس کے پیٹے میں ہوگا۔ عمدہ لباس، سر کے بال شیو کیے ہوئے، قیمتی فریم والی عینک لگائے اس شخص کا لہجہ خاصا نرم تھا۔ جس انداز سے کمرے میں داخل ہوتے ہی..... اس نے مجھے سگریٹ بجھانے کا حکم دیا، بظاہر وہ التجا لگی تھی۔

”کیوں نہیں۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے ایش ٹرے میں اپنی سگریٹ مسل ڈالی حالانکہ ابھی میں نے اس کے صرف دو تین کش ہی لیے تھے۔

”شکریہ۔ مجھے سگریٹ کا دھواں پسند نہیں۔“ اس نے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم سجاتے ہوئے حسب سابق نرم لہجے میں کہا۔

”ٹھیک ہے مسٹر شیفن۔ کوئی بات نہیں۔“ لیکن وہ میرا جواب سننے کے بجائے بڑے سکون سے سامنے والے صوفے کی طرف بڑھ گیا۔ بیٹھتے ہی اس نے صوفے کی پشت سے اپنی پشت ٹکائی اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر مجھے دیکھنے لگا۔ جس طرح وہ صوفے پر براجمان تھا، وہ دیکھ کر تو کسی طور یہ نہیں لگ رہا تھا کہ اسے یہاں سے جانے کی جلدی ہو سکتی ہے۔ وہ بہت مطمئن اور پُرسکون دکھائی دے رہا تھا۔ صوفے پر بیٹھ کر کچھ دیر تک وہ اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑے ہوئے سیاہ رنگ کے موبائل فون کو انگلیوں میں گھماتا رہا اور پھر میری طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

”ہاں تو تم نے کیا دیکھا تھا؟“

”میں نے دیکھا کہ ایک نوجوان نے دریا میں چھلانگ لگائی ہے۔“

”کس جگہ سے وہ دریا میں کودا تھا؟“ شیفن نے کمرے کی اس کھڑکی پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا جہاں سے دریا صاف نظر آ رہا تھا۔

”وہ... وہاں سے۔“ میں نے کھڑکی کے سامنے کھڑے ہو کر ہاتھ سے پل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”کہاں سے؟“ شیفن نے میرے ہاتھ کے اشارے کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔ یہ پوچھتے ہوئے وہ صوفے پر بڑی حد تک ایک طرف کو جھک گیا۔

”وہاں... میں نے دیکھا کہ ایک نوجوان پل پر سے دریا میں چھلانگ لگا رہا ہے۔“ میں نے تفصیل سے بتایا۔

سٹنگ روم کی جس کھڑکی سے میں نے پل کی طرف اشارہ کیا تھا، دراصل اسے کھڑکی کہنا زیادتی ہوگی۔ وہ سیمنٹ سے بنی پختہ دیوار کے بیچوں بیچ ایک شیشے کی دیوار تھی جس سے سامنے کی سڑک اور اس کے بعد پل صاف نظر آ رہا تھا۔

کراچی
ماہنامہ
پاکیزہ

اکتوبر 2010ء کے شمارے کی ایک جھلک

انجم انصار اور **عالیہ بخاری** کے سلسلے وار ناول

زندگی جن باتوں سے عبارت ہے، ان میں سے ایک جذبہ محبت ہے...... محبت جو کبھی زندگی کی تلخ حقیقتوں سے روشناس کراتی ہے...... محبت کے جذبے سے گندھی
شگفتہ بھٹی کی یادگار تحریر

ماضی کے آئینے میں جھلملاتے عکس کو وقت کی دبیز تہیں بھی منعکس ہونے سے نہیں روک سکتیں...... زندگی کے نشیب و فراز میں اپنی منزل کو ڈھونڈتی لڑکی کی کہانی
ذکیہ بلگرامی کا دلچسپ ناول

شادی والدین کی مرضی سے یا اپنی پسند سے جیسے سنجیدہ موضوع پر **شائستہ زریں** کا سروے

مادی دنیا کی ضرورتوں سے قطع نظر ایک آواز ہماری صداقت و سچائی کو ہمارے سامنے بے نقاب کرتی ہے۔ کچھ اسی تناظر میں **قیصرہ حیات** کا ناول

فرحانہ ناز ملک، قانتہ رابعہ، شگفتہ منیر، شمیم ناز صدیقی، نگہت اعظمی، شمیم فضل خالق، غزالہ عزیز، سیما بنت عاصم، تسنیم منیر علوی، شیریں حیدر اور **نیر فہیم عطاری** کی دلچسپ تحریریں

آپ کی آرا و نگارشات سے سجے مستقل سلسلے

کیا آپ نے اس ماہ کا پاکیزہ پڑھا؟ نہیں! کمال ہے!

www.pkdigest.com

پل یہاں سے کوئی سو میٹر کے فاصلے پر ہوگا۔

''جب یہ واقعہ یا یوں کہہ لیں کہ شاید یہ حادثہ ہوا یا شاید قتل ہوا، تو اس وقت تم کہاں بیٹھے ہوئے تھے؟'' شین نے سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔

''میں یہاں بیٹھا تھا، اس کرسی پر۔'' میں نے ہاتھ کے اشارے سے وہ جگہ بتائی۔ ''میری توجہ باہر کی طرف تھی۔ میں نے دیکھا کہ ایک شخص آیا۔ وہ پل کی چھوٹی سی دیوار پر چڑھنے لگا تو میری پوری توجہ اس کی طرف مبذول ہوگئی۔ پھر اس نے پانی میں چھلانگ لگادی۔ اس کے بعد میں نے پولیس کو فون کردیا۔''

شین نے میری بات سن کر اپنے دستی بیگ سے لیپ ٹاپ نکالا اور اسے آن کرکے کچھ ٹائپ کرنے لگا۔ برابر والی میز پر ایک چھوٹی نوٹ بک، کیوی۔ انگلش ڈکشنری اور پولیس مینوئل رکھا ہوا تھا۔ اس نے مینوئل کو پہچان لیا اور میری طرف دیکھنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ شاید یہ جاننا چاہتا ہے کہ ایک عام شہری کی میز پر پولیس مینوئل کا کیا کام ہے؟

''دیکھیے مسٹر شین۔ میں ٹی وی رائٹر ہوں۔'' میں نے وضاحت کی۔ ''ان دنوں میں معروف ٹیلی وژن شو ہمفرے کیمپ کی اقساط لکھ رہا ہوں۔''

میری بات سن کر شین نے اپنے منڈے ہوئے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ہمفرے کیمپ مقبول پروگرام تھا۔ ممکن ہے کہ وہ اس شو کو دیکھ چکا ہو یا اس کے بارے میں پڑھ چکا ہو، میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

''تو تم کتنے عرصے سے نیوزی لینڈ میں رہ رہے ہو؟'' شین کا یہ سوال میرے لیے متوقع تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ اب تک اس نے یہ سوال کیوں نہیں پوچھا تھا۔

''پچھلے تین مہینوں سے۔''

''یہ تمہارے ہاتھ پر کیا ہوا ہے؟'' شین نے میرے انگوٹھے پر بندھی پٹی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''وہ ذرا کیل ٹھونکتے ہوئے ہتھوڑی لگ گئی تھی۔''

''کیا تم امریکی ہو؟'' اس نے دوسرا سوال کیا۔

''ہاں، مگر کیا وہ نوجوان مرگیا ہے؟'' مجھے سب سے زیادہ دلچسپی اس بات کے جاننے میں تھی کہ وہ نوجوان زندہ ہے یا مرگیا؟ میرے دل میں ایک وسوسہ تھا کہ اگر اسے تیرنا آتا ہوگا تو وہ بچ سکتا ہے۔ ایسے میں میرا پھنسنا یقینی تھا اور میں جیل نہیں جانا چاہتا تھا، لیکن یہ کمبخت سراغرساں ابھی تک صاف صاف بتانے پر تیار نہیں تھا کہ اس نوجوان کا کیا ہوا؟

''وہ یونیورسٹی کا طالب علم تھا۔ ہمیں اس کے کپڑوں سے یونیورسٹی کا شناختی کارڈ اور لائبریری کارڈ ملا ہے۔ ہم اب اس حوالے سے تفتیش کررہے ہیں۔'' میرا سوال سن کر شین نے گول مول جواب دیا۔

''کیا وہ مرگیا ہے؟'' میں نے ایک بار پھر اپنا سوال دہرایا۔

''ابھی ہم نے پانی سے اس کا جسم نکالا ہے۔ وہ دریا کے بہاؤ پر کافی آگے تک نکل گیا تھا۔ کوئی دو کلومیٹر دور تک...'' شین نے اس بار بھی میرے سوال کا واضح جواب دینے سے گریز کیا۔

''تو کیا وہ مرگیا ہے؟'' میں نے پھر اپنا سوال دہرایا۔ اس کے گول مول جوابوں کی وجہ سے میں اب اس سے چڑنے لگا تھا۔

''اس کی گردن ٹوٹی ہوئی تھی۔'' اس بار میں نے اس کی پیشانی پر شکنیں پڑتے ہوئے دیکھیں۔ ''تم ایسا کیوں سوچ رہے ہو کہ اس نے خودکشی کی ہے۔'' شین نے بغور میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ویسے تمہارے بیان کے مطابق جب اس نے پل پر سے چھلانگ لگائی تھی تو اس وقت تم نے کسی اور کو اس کے آس پاس دیکھا تھا؟'' شین نے میرے سوال کو نظرانداز کرکے پانسا پھینکا۔

''نہیں... یہ میں نے نہیں کہا تھا۔ میں نے صرف اس کو ہی دیکھا تھا اور وہ بھی اس وقت جب وہ چھلانگ لگانے ہی والا تھا۔ اس کے سوا میں نے کسی کو اس کے آس پاس نہیں دیکھا۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

حادثے کے بعد جب میں گھر واپس آیا تو میں چاہتا تھا کہ باؤنڈری برج پر ہونے والے اس حادثے کو خودکشی کا واقعہ بنا کر پولیس کے سامنے پیش کردوں۔ گھر پہنچتے پہنچتے میرے کہانی کار ذہن نے ساری کہانی بنالی تھی کہ اس حادثے کو کس طرح خودکشی کا رنگ دے کر پولیس کے سامنے داستان سنانی ہے۔ سو میں نے ایسا ہی کیا۔ سب کچھ کہانی کے مطابق ہورہا تھا۔

میری کہانی کے عین مطابق سراغرساں شین آدھمکا۔ میں پولیس کے تفتیشی طریقہ کار کا مینوئل پڑھ چکا تھا۔ اس لیے جانتا تھا کہ پولیس نے وائرلیس پر اس خبر کو نشر کیا ہوگا۔ اس کے بعد پولیس جائے واردات پر پہنچی ہوگی۔ غوطہ خوروں نے دریا میں لاش کی تلاش شروع کردی ہوگی۔ یہ کام ہو چکے تھے۔ اس کے بعد میرے پاس پولیس کے تفتیشی سراغرساں کو پہنچ کر ابتدائی تفتیش کرنا تھی۔ کچھ سوال جواب ہونے تھے اور یہ کام مسٹر شین کر چکے تھے۔ میں نے پولیس اور سراغ رسانی

کے حوالے سے بہت کچھ لکھا تھا۔ اس لیے پولیس کے طریقہ تفتیش سے بھی بہت اچھی طرح واقف تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' شین نے لیپ ٹاپ بند کرتے ہوئے کہا۔ ''فی الوقت اتنا ہی کافی ہے۔ ضرورت پڑی تو پھر ملاقات ہوگی۔'' اس نے میرے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔

''بہت بہتر۔ میں حاضر ہوں۔''

☆☆☆

دوسرے دن میں صبح میں تیار ہوا۔ دھوپ کا چشمہ لگایا، ہیٹ پہنا اور شہر میں گھومنے پھرنے کے لیے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ ذرا سی دیر میں ہی شہر کی مرکزی سڑک وکٹوریہ اسٹریٹ پر پہنچ گیا۔ یہاں مجھے کچرادان کی تلاش تھی۔ اس کے لیے مجھے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی۔ وہ مجھے سامنے ہی نظر آگیا۔ میں نے ہاتھ میں پکڑے بنڈل کو اس میں پھینک دیا۔ یہ وہ پمفلٹ تھے جو موسمیاتی حدت کے بارے میں عوامی شعور اجاگر کرنے کے لیے شائع کیے گئے تھے۔ ان میں لکھا تھا کہ دنیا کا درجہ حرارت بڑھ رہا ہے۔ ''کیا واقعی ایسا ہے؟'' میں نے پمفلٹ پر سرسری نگاہ ڈالتے ہوئے سوچا اور پھر مجھے خیال آیا کہ ''اس پر لعنت بھیجو۔'' میں ایک پمفلٹ کو پڑھ کر... اس کی بنیاد پر اپنی رائے قائم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چونکہ میں نے اس کتابچوں اور پمفلٹوں پر لکھی باتوں کا اعتبار نہیں کیا تھا۔ سو ان کے لیے سب سے مناسب جگہ یہی کچرادان تھا۔

میں دوپہر تک گھوم پھر کر تفریح اور کچھ خریداری کرنا چاہتا تھا۔ میں بینک گیا اور کچھ رقم نکلوائی۔ اس کے بعد مختلف دکانوں سے کھانے پینے کی کچھ چیزیں خریدیں۔ ایک دکان سے بجلی سے چلنے والی آری اور کچھ فالتو بلیڈ خریدے۔ جنرل اسٹور سے روم فریشنر کی ایک درجن بوتلیں لیں۔ پتلے ربر سے بنے وہ دستانے خریدے جنہیں گھر میں کام کاج کے دوران میں ہاتھوں پر پہنا جاتا ہے۔ واپسی پر ایک بک اسٹال پر رکا اور ٹائم میگزین کا تازہ شمارہ خریدلیا۔

گھر پہنچا تو بنگلے کے بیرونی دروازے پر لگے میل باکس میں دوپہر کے مقامی اخبار ''وائی کیٹو ٹائمز'' کا تازہ شمارہ میرا منتظر تھا۔ پہلے صفحے پر ہی کل شام ہونے والے واقعے کی تفصیلی خبر نمایاں طور پر موجود تھی۔ اس خبر سے ہی مجھے پتا چلا کہ ڈوبنے والے نوجوان کا نام ڈکلن تھا۔ وہ مقامی یونیورسٹی سے گریجویشن کررہا تھا اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کے شعبے میں دوسرے سال کا طالب علم تھا۔ اسے موسیقی کا جنون کی حد تک

اسرائیل کے علاوہ

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

ٹورنٹو سے لنڈی کوتل تک

جاسوسی ڈائجسٹ سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 600 روپے

امریکا کینیڈا آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 5500 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 4500 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کردیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہوسکتا ہے

رقم ڈیمانڈ ڈرافٹ، منی آرڈر یا ویسٹرن یونین کے ذریعے بھیجی جاسکتی ہے۔ مقامی حضرات دفتر میں نقد ادائیگی کرکے رسید حاصل کرسکتے ہیں

رابطہ: ثمر عباس

(فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی

فون: 35895313 فیکس: 35802551

www.pkdigest.com

شوق تھا۔ فارغ وقت میں وہ ایک میوزک بینڈ میں گٹار بجایا کرتا تھا۔

میرے نزدیک انفارمیشن ٹیکنالوجی میں گریجویشن کرنے کا مطلب یہ تھا کہ مرنے والا کمپیوٹر کی تعلیم حاصل کر رہا تھا اور مجھے کمپیوٹر سے شدید نفرت تھی۔ اس کے باوجود میرے پاس لیپ ٹاپ موجود تھا۔ ٹی وی انتظامیہ نے یہ لیپ ٹاپ لکھنے کے لیے مجھے دیا تھا مگر میں اسے عام طور پر استعمال نہیں کرتا تھا۔ دوسروں کے نزدیک تو کمپیوٹر کے کئی مصرف ہیں مگر میرے لیے اس کا ایک ہی استعمال تھا اور وہ تھا اس پر لکھنا، لیکن میں خود کو کمپیوٹر پر لکھنے کا عادی نہ بنا سکا۔ صرف کمپیوٹر ہی نہیں، مجھے تو اس طرح کی سب چیزوں سے الجھن ہوتی تھی۔ میرے پاس موبائل فون نہیں تھا۔ فیکس مشین بھی نہیں تھی حتیٰ کہ میرا ای میل اکاؤنٹ بھی نہیں بنا ہوا تھا اور نہ ہی میں اپنی زندگی میں ان سب چیزوں کی کمی محسوس کیا کرتا تھا۔ مجھے ہر اس چیز سے نفرت تھی جس میں گھنٹی بجتی ہو۔ یہ گھنٹی میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو ختم کر دیتی تھی۔ اس سے مجھے ناقابلِ برداشت ذہنی دباؤ کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ پریشر ککر ہو یا موبائل فون، میں اس طرح کی ہر چیز سے خود کو دور رکھتا تھا۔ میرے گھر میں لگے فون میں بھی گھنٹی کی آواز بہت ہی ہلکی تھی۔ ویسے سچ کہوں تو مجھے اس طرح کی ایجادات سے ہی نفرت تھی۔ کمپیوٹر سے تو میں ویسے ہی چڑتا تھا۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں اب تک صرف چار بار انٹرنیٹ استعمال کیا ہے، وہ بھی کھیل کے طور پر۔ ایک بار جب انٹرنیٹ پر میں نے اپنا نام ڈال کر سرچ کیا تو اس نے مجھے بتایا کہ میں ایکرون میں پیدا ہوا اور لڑکپن میں اوہائیو چلا آیا۔ میری عمر اٹھانوے برس ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں ایکرون میں نہیں لا ہونڈا میں پیدا ہوا تھا۔ میں نے ریاست اوہائیو میں بھی قدم بھی نہیں رکھا تھا۔ سب سے بڑا سچ یہ کہ میں ابھی صرف اڑسٹھ برس کا ہوا ہوں۔ بس اس کے بعد میرا دل اس جھوٹی مشین سے اور اچاٹ ہو گیا۔

گھر پہنچ کے میں نے کھانے پینے کی چیزیں کچن میں اور دوسرا سامان اسٹور میں رکھا۔ پورے گھر میں روم فریشنر کا اسپرے کیا۔ اس کے بعد ابھی میں نے کپڑے تبدیل ہی کیے تھے کہ سراغرساں شیفن آ گیا۔

''گڈ آفٹر نون۔ امید ہے کہ تم نے میرے آنے کا برا نہیں منایا ہوگا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا ''دراصل گیٹ کھلا ہوا تھا اس لیے میں نے گھنٹی نہیں بجائی۔'' اب یہ تو میرا دل ہی جانتا ہے کہ اسے کس دل سے خوش آمدید کہا تھا۔

اندر آتے ہی وہ سیدھا اس صوفے پر جا کر بیٹھ گیا جہاں کل بیٹھ کر سوال و جواب کر رہا تھا۔ آج بھی کل کی طرح وہ اپنے ہاتھ کی انگلیوں میں سیاہ موبائل فون کو گھمائے جا رہا تھا۔

''آپ کی تفتیش کہاں تک پہنچی؟'' میں نے اس کے سامنے رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھتے ہوئے سوال کیا۔

''عجیب بات ہے۔ ہمیں اس کا موبائل فون نہیں ملا۔'' شیفن نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ''حالانکہ اس کے دوستوں کا کہنا ہے اس کے پاس موبائل تھا، جو ہر وقت اس کی جیب میں رکھا رہتا تھا۔''

''ہو سکتا ہے کہ اس دن چھلانگ لگاتے ہوئے موبائل اس کی جیب سے گر گیا ہو یا اس دن وہ موبائل اپنے ساتھ رکھنا بھول گیا ہو۔'' میں نے رائے دی۔

''نہیں۔ موبائل اس کے کمرے میں بھی نہیں ہے۔ ہم نے جائے وقوعہ کا اچھی طرح معائنہ کیا ہے، وہ وہاں پر بھی نہیں گرا۔''

''لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے اس دن خودکشی کرنے سے پہلے اس نے اپنا موبائل فون کہیں اور چھوڑ دیا ہو؟''

''مجھے آپ کی بات سے اتفاق نہیں۔ خودکشی کرنے والے کانوں پر لگے ہیڈ فون کو تو نہیں اتار البتہ موبائل فون چھوڑ آیا ہو۔ یہ بات دل کو نہیں لگتی۔'' شیفن نے چھت کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔ ''خیر میں یہ پوچھنے کے لیے حاضر ہوا تھا کہ جب تم نے اسے چھلانگ لگاتے ہوئے دیکھا تو اس کے بعد اس جگہ پر تو نہیں گئے تھے جہاں سے اس نے چھلانگ لگائی تھی۔''

''جی نہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ چلو دیکھتے ہیں، کیا کچھ ہو سکتا ہے۔'' شیفن نے اٹھتے ہوئے کہا۔

اس بات میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ ایک قابل افسر ہے۔ ڈکن کا موبائل فون میرے اسٹور کی الماری میں رکھا ہوا تھا۔ اگر اس کے ہتھے چڑھ جاتا تو مجھے وہ یقیناً پھانسی کے پھندے تک پہنچا دیتا۔ ویسے بھی نیوزی لینڈ کی تاریخ میں کئی مجرموں کو صرف ان کی انگلیوں کے نشانات کی بنیاد پر ہی سزائیں مل چکی ہیں۔ ان کے قانون میں انگلیوں کے نشانات کو ٹھوس ثبوت تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ بات میں نے پولیس مینوئل کے دیباچے میں پڑھی تھی۔

شیفن کے رخصت ہونے کے بعد میں کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ مجھے ابھی ایک بہت بڑا کام کرنا تھا لیکن میں نے اس کام کے کرنے سے پہلے ڈکن کا موبائل فون ٹھکانے لگانے

کا فیصلہ کیا۔ اسٹور میں جا کر فون نکالا تو اس پر اب تک پچاس کال آ چکی تھیں۔ میں نے فون کی گھنٹی پہلے ہی بند کر دی تھی لیکن موبائل فون آن تھا۔ میں نے اس پر لگے نمبروں کی پڑتال کی تو تین نمبر ایسے تھے جو پولیس اسٹیشن کے تھے اور وہ تینوں ڈائریکٹری میں موجود ہیں۔ یقیناً یہی وجہ ہوگی کہ شیفن فون کی تلاش میں تھا۔ میں نے دستانے پہن کر فون کو اچھی طرح رگڑ رگڑ کر صاف کیا۔ پھر اسے ایک پلاسٹک کے تھیلے میں ڈالا۔ فون کافی ہلکا تھا۔ میں نے تھیلے کو وزن دار بنانے کے لیے اس میں چند دوسری اور فالتو چیزیں ڈالیں۔ اسٹور میں اسٹالین کی ایک دبیز ضرب بارہ کی تصویر لکڑی کے فریم میں جڑی ہوئی پڑی تھی۔ وہ بھی میں نے اس تھیلے میں ڈال دی۔ میں نے اس تھیلے میں ہوا بھی بھری تاکہ تھیلا جب دریا میں ڈالوں تو وہ تیرتا ہوا نمایاں رہے اور ڈوبنے کے بجائے کسی ایسے شخص کو مل جائے جو اسے پولیس تک پہنچا دے۔

اس کام سے فارغ ہو کر میں رات ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

اندھیرا ہونے پر میں گھر سے نکلا اور وہ تھیلا دریا میں ڈال آیا۔ یہ کام مکمل ہوا تو مجھے کافی ذہنی سکون ملا۔ اس رات میں نے ایک اور کام سرانجام دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں نے اس رضا کار کی لاش کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے باغیچے میں دفنانے کا فیصلہ کیا تھا، جو مجھے عالمی درجۂ حرارت میں ہونے والی تبدیلیوں کے اثرات سمجھانے کے لیے آیا تھا اور میرے ہاتھوں حادثاتی موت کا شکار ہو گیا تھا۔ اب اس کی لاش باتھ روم میں پڑی ہوئی تھی۔ اگر میں اسے جلد از جلد ٹھکانے نہیں لگاتا تو لاش سے تعفن اٹھنے کا خدشہ تھا۔ ویسے بھی گرمی بہت تھی۔ ایسے میں لاش جلدی خراب ہونے لگتی۔

رات کو میں نے بجلی سے چلنے والی آری سے لاش کے کئی ٹکڑے کیے اور انہیں پلاسٹک کے تھیلوں میں بند کر کے فریزر میں رکھ دیا۔ اس کے بعد غسل خانے کی صفائی کی۔ پورے گھر میں روم فریشنر چھڑکا۔ جب نہانے دھونے سے فارغ ہوا تو آسمان پر صبح کی سفیدی چھا رہی تھی۔

جب میں سو کر اٹھا تو دوپہر کے ڈھائی بج رہے تھے۔ میں نے کچن میں جا کر کافی بنائی اور جب کھانے پینے سے فارغ ہو کر بیٹھک روم میں آ کر بیٹھا تو شام کے پونے چار ہو رہے تھے۔ یہ میرے واک پر جانے کا وقت تھا۔ حسبِ معمول واک پر گیا۔ سگریٹ خریدیں اور گھر لوٹ آیا۔ اس دن کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی اور نہ ہی سراغرساں شیفن آیا۔

اس رات میں سکون سے بیٹھ کر اپنے شوق قسط لکھتا رہا۔

دوسرے دن میں لکھے ہوئے صفحات لے کر شہر کے پوسٹ آفس پہنچا تاکہ اسے جیک کو فیکس کر دوں۔ اسی دوران میں دوپہر ہو گئی۔ مقامی ریستوران میں جا کر کھانا کھایا اور گھر واپس آ کر سونے کے لیے لیٹ گیا۔ شام کو اٹھا اور جب واک پر جانے کے لیے گیٹ سے باہر نکل ہی رہا تھا تو شیفن آ گیا۔

''شام بخیر۔'' میں نے خوش دلی سے اس کا خیر مقدم کیا۔ ''کیسے ہیں آپ؟''

''یہاں سے گزر رہا تھا سوچا کہ آپ سے بھی ملتا چلوں۔'' شیفن کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ ''کہیں جا رہے تھے کیا؟''

''جی ہاں۔ میں شام کو واک پر جاتا ہوں۔''

''اچھی عادت ہے۔ باقاعدگی سے واک کرتے ہو؟''

''جی ہاں۔ کئی مہینے ہو گئے۔ روز شام کو ٹہلنے کے لیے نکلتا ہوں۔'' میں نے ہلکی سی مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے شیفن کو جواب دیا۔

''ارے ہاں، وہ آپ کا انگوٹھا کیسا ہے؟'' شیفن نے اپنی کار کی طرف مڑتے ہوئے کہا تو میں نے اسے انگوٹھا دکھایا۔

''بہت بہتر ہے۔''

میرا منصوبہ تھا کہ کسی طرح جلد سے جلد ڈکن کا معاملہ نمٹے اور شیفن کا میرے ہاں آنا جانا ختم ہو تو فریزر میں رکھی نوجوان کی لاش کے ٹکڑے ٹھکانے لگا کر ہملٹن کو خیرباد کہہ دوں۔ میں عجلت میں یہاں سے نہیں جانا چاہتا تھا تاکہ پولیس کو مجھ پر کسی قسم کا شک نہ ہو۔

دوسرے دن شام کو شیفن پھر آ دھمکا۔

''کہیے، کیا حال ہیں۔ ڈکن کا معاملہ حل ہوا یا نہیں؟''

''فی الحال کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ویسے میں ایک اور معاملہ بھی حل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' شیفن نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

''اب کیا ہوا؟''

''مقامی کالج کا ایک طالب علم اینڈریو غائب ہے کئی دن سے۔ وہ شعبۂ ماحولیات میں گریجویشن کر رہا تھا۔ چند روز پیشتر وہ عالمی حدت کے بارے میں عوامی آگاہی مہم کے سلسلے میں ہاسٹل سے نکلا تھا۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اسے آخری بار اسی علاقے میں دیکھا گیا تھا۔''

شیفن کی بات نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے افسوس کے تاثرات چہرے پر سجاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ ''تمہارا گھر ہر وقت مہکتا رہتا ہے خوشبوؤں سے۔

بڑے شوقین لگتے ہو؟'' اس نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

''بس ایسے ہی۔ اس سے دماغ پر اچھا اثر پڑتا ہے۔'' میں نے عاجزی سے کہا۔

کچھ دیر تک وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا اور پھر اٹھ کر چلا گیا۔ مجھے اب شین سے خوف آنے لگا تھا۔ اگلے دو دن خیریت سے گزرے۔ نہ ہی شین آیا اور نہ ہی کوئی غیر معمولی بات ہوئی، البتہ وائی کیٹو ٹائمز میں اینڈریو کی پُراسرار گمشدگی کی خبریں مسلسل شائع ہو رہی تھیں۔

ایک دن دوپہر کو میں گھر لوٹا تو شین چند پولیس اہلکاروں کے ساتھ گھر سے باہر کھڑا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ آگے بڑھا۔ ''گڈ نون۔'' اس نے مصافحہ کیا اور آگے بڑھ کر ایک پرچہ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ یہ میرے گھر کی تلاشی کا اجازت نامہ تھا جسے پولیس مجسٹریٹ نے جاری کیا تھا۔

''ہمیں افسوس ہے کہ ہمیں تلاشی لینا ہوگی۔'' شین نے کہا۔ ''بات یہ ہے کہ ڈکنز کو چھلانگ لگاتے ہوئے صرف آپ نے دیکھا تھا اور اینڈریو کو بھی آخری بار اسی علاقے میں ہی دیکھا گیا۔ تلاشی صرف آپ کے گھر کی ہی نہیں ہوگی بلکہ پورے بلاک کی ہوگی لیکن سب سے پہلے آپ کے گھر کی تلاشی لینا ہوگی۔ امید ہے آپ تعاون کریں گے۔'' شین نے سپاٹ لہجے میں بات ختم کی۔

میں سمجھ گیا کہ کھیل ختم ہوا۔ اب پردہ گرنے ہی والا ہے۔ میں نے اپنے اعصاب مجتمع کیے اور انہیں مسکراتے ہوئے اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا۔

تھوڑی دیر میں ہی کھیل ختم ہوگیا۔ فریزر کے خانوں میں اینڈریو کی لاش ٹکڑوں کی شکل میں موجود تھی جسے اب ایمبولینس میں رکھا جا رہا تھا۔

''میں آپ کو اینڈریو اور ڈکنز کو قتل کرنے کے جرم میں حراست میں لیتا ہوں۔'' شین نے میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہناتے ہوئے کہا۔

دورانِ تفتیش میں نے شین کو تمام واقعات سچ سچ بتا دیے۔ اور پوچھا۔ ''تم معاملے کی تہ تک کیسے پہنچے؟''

یہ سن کر شین مسکرایا اور کچھ توقف کے بعد بتانے لگا۔

''ہم نے کیلیفورنیا میں تمہاری کمپنی سے رابطہ کر کے تمہارے ڈاکٹر کا پتا چلایا۔ آخر تمہارے ڈاکٹر کا بل ٹی وی انتظامیہ ہی ادا کرتی ہے۔ تمہارے ڈاکٹر نے ہمیں بتایا کہ تمہیں فون کی گھنٹی اور خوشبوؤں سے الرجی ہے۔ اس سے تمہارے ذہن پر دباؤ ہونے لگتا ہے۔ جب میں نے تم سے پوچھا کہ تمہیں خوشبوئیں اچھی لگتی ہیں تو حیرت انگیز طور پر تم نے ہاں میں جواب دیا۔ مجھے اچنبھا ہوا کہ تم نے جھوٹ کیوں بولا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اینڈریو اور ڈکنز دونوں موبائل فون پر گفتگو کے شوقین تھے۔ ان کے بہت سارے دوست تھے جو انہیں کال کرتے رہتے تھے۔ حیرت انگیز طور پر ہمیں اینڈریو کا فون ایک پلاسٹک تھیلے میں بہت سی فالتو چیزوں کے ساتھ ملا۔ تم نے نہایت عمدگی سے فون پولیس تک پہنچانے کا انتظام کیا لیکن اس دوران میں تم نے خیال نہیں کیا اور تمہارے انگوٹھے پر بندھی پٹی بھی انہی چیزوں میں سے ایک کے ساتھ چپکی رہ گئی اور پھر تم تھیلا دریا میں بہا آئے۔ تمہارے منصوبے کے عین مطابق یہ تھیلا آخر ہم تک پہنچ ہی گیا۔'' شین نے تفصیلی جواب دیتے ہوئے بتایا۔ ''اور سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ تم نے اپنے گھر میں جو روم فریشنر استعمال کیا تھا، وہ خاص قسم کا ہے۔'' شین کا آخری جملہ سن کر مجھے جھٹکا لگا۔

''کیا مطلب؟'' میں نے چونک کر سوال کیا۔

''تم نے جو روم فریشنر استعمال کیا تھا وہ نیوزی لینڈ میں ہی تیار ہوتا ہے۔ اس پر لکھی عبارت کیوی زبان میں ہے۔ اگر تم یہ پڑھ لیتے تو اسے چھڑکنے کی حماقت قطعاً نہیں کرتے۔ ویسے تمہارے پاس کیوی سے انگریزی میں ترجمے کی ڈکشنری موجود ہوتی تو تم سمجھ گئے ہوتے۔''

''مگر وہ روم فریشنر۔ کیا خاص بات ہے اس میں؟'' مجھے ابھی تک اپنے سوال کا جواب نہیں ملا تھا۔

''حقیقت یہ ہے کہ یہ اسپرے خاص طور پر قصابوں کی دکانوں اور مذبح خانوں میں استعمال کے لیے بنایا گیا ہے۔ اس کی خاصیت یہ ہے کہ اس کے چھڑکنے سے خون اور گوشت کی بو چند گھنٹوں کے لیے ختم ہو جاتی ہے۔'' شین نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''خیر کھیل ختم ہوا۔ اب میں تمہاری انگلیوں کے نشانات لوں گا، تاکہ تمہارے انگوٹھے پر بندھی پٹی سے اس کا موازنہ کر سکیں۔ مجھے یقین ہے کہ موازنہ سو فیصد درست ثابت ہوگا۔'' شین نے انگلیوں کے نشانات لینے کے لیے درکار ضروری سامان میز پر پھیلاتے ہوئے کہا۔ ''ویسے تمہیں معلوم ہے نیوزی لینڈ کے قانون کی روشنی میں عدالتیں انگلیوں کے نشانات کو سب سے ٹھوس ثبوت تسلیم کرتی ہیں۔''

''جانتا ہوں۔'' میرے لہجے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ یہ منحوس گھنٹی اب میری جان بھی لینے والی ہے۔

واردات کرنے والا ہر شخص اپنے جرم کو معمولی ہی سمجھتا ہے...... مگر بسا اوقات اس کی کڑیاں سنگین نوعیت کے جرم تک پہنچا دیتی ہیں...... معمولی چیزوں کی چوری سے شروع ہونے والی ایک غیر معمولی کہانی

کسی پر اعتبار نہ کرنے والے سراغرساں کو پیش آنے والے پیچیدہ کیس کی روداد

بابر نعیم

بہروپیا

فرسٹ ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر میں بند دروازوں کے پیچھے سترہ پبلک سیفٹی آفیسرز ایک گول میز کے گرد بیٹھے میٹنگ میں مصروف تھے۔ گزشتہ روز کی رپورٹ کے مطابق ہارمونی ہائٹس ڈسٹرکٹ کے تین مکانوں میں چوری کی وارداتیں ہوئی تھیں اور لیفٹیننٹ ہول ڈینارا ان کی تفصیل بتا رہا تھا۔

''اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہ وارداتیں سہ پہر چار بجے کے قریب ہوئی ہیں۔ یہ وہ وقت ہے جب بچے اسکول سے آ چکے ہوتے ہیں جبکہ بڑے اپنے کام سے کچھ دیر بعد واپس آتے ہیں۔ ان گھروں میں کوئی بچہ نہیں ہے اور دونوں میاں بیوی کام پر جاتے ہیں۔ ان تینوں وارداتوں میں چور نے بڑی ہوشیاری سے کسی تار یا کیلی شے کی مدد سے کچن کے دروازے کا تالا کھولا اور کسی قسم کے انگلیوں یا پیروں کے نشان وہاں نظر

www.pkdigest.com

نہیں آئے۔ وہ بہت تیزی سے آیا اور اسی تیزی سے اپنا کام مکمل کر کے چلا گیا۔ وہ بڑے دروازے سے آگے نہیں گیا اور نہ ہی اس نے پورے گھر کی تلاشی لی۔ وہ اپنے ساتھ جو چیزیں لے گیا، ان میں موبائل فون، سی ڈی پلیئر، ڈی وی ڈی پلیئر، ڈیجیٹل کیمرا اور لیپ ٹاپ وغیرہ شامل ہیں۔ اس نے یہ سب چیزیں ایک اسپورٹس بیگ میں رکھیں اور چل دیا۔ کوئی دیکھنے والا یہی سمجھا ہوگا کہ وہ جم جا رہا ہے۔''

ڈینار نے ایک نظر حاضرین پر ڈالی اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''ان تمام وارداتوں میں ایک بات مشترک ہے کہ چور نے ان الیکٹرانک اشیا کے علاوہ کسی اور قیمتی چیز مثلاً جیولری یا پینٹنگ وغیرہ کو ہاتھ نہیں لگایا اور نہ ہی اس نے گھروں میں داخل ہونے کے بعد دروازوں یا الماریوں کے تالے توڑے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ اس علاقے میں رہنے والے برگلر الارم نہیں لگواتے اور نہ ہی انہوں نے اپنے گھروں کے اردگرد باڑھ لگوائی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ سب لوگ عالمی امن اور بھائی چارے پر یقین رکھتے ہوئے دوسروں کے حقوق کا احترام کرتے ہیں۔ اسی لیے چور ایک گھر سے دوسرے گھر بڑی آسانی سے چلے گئے اور اس کے بعد غالباً ان گھروں کے عقب میں واقع جنگل میں غائب ہو گئے۔''

''ہم اس سلسلے میں لوگوں کو موردِ الزام نہیں ٹھیرا سکتے۔'' سراغ رساں سارجنٹ سارٹس اوبرن بولا۔ ''برگلر الارم اور باڑھ، واردات کی نیت سے آنے والے ماہر چوروں کا راستہ نہیں روک سکتے۔''

''تمہیں حقائق کا علم نہیں۔'' ڈینار بولا۔ ''وہ ماہر چور نہیں تھے۔ ان کی عمریں پندرہ برس کے لگ بھگ ہیں اور وہ جائے واردات سے ایک ڈیڑھ میل کے فاصلے پر رہتے ہیں۔''

''ایسا ہو سکتا ہے۔'' اوبرن سے سینئر لیفٹیننٹ سیوتج نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اس واردات میں ایسے لڑکے ملوث ہو سکتے ہیں جو ان چیزوں کے نہ ہونے سے محرومی کا شکار ہوں یا انہیں نشے کی طلب پوری کرنے کے لیے پیسوں کی ضرورت ہو۔''

''وہ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ ان مسروقہ اشیا کو اچھے داموں کہاں فروخت کیا جا سکتا ہے۔'' اوبرن نے کہا۔

☆☆☆

دوسری صبح انجیل وین مونگ، اوبرن سے ملنے چلی آئی۔ اس کا شوہر میرون ایک پیشہ ور فوٹوگرافر تھا اور اسے دستاویزی فلمیں بنانے میں مہارت حاصل تھی۔ وہ سراغ رساں ایجنسیوں اور انشورنس کمپنیوں کے لیے بھی کام کرتا تھا۔ چودہ ماہ قبل وہ اپنے گھر سے کسی کام کے سلسلے میں نکلا اور پھر اسے کبھی نہیں دیکھا گیا اور نہ ہی اس کے بارے میں کوئی خبر ملی۔ اس کی کار ایک دیہاتی علاقے میں ملی۔ گو کہ کسی قسم کی واردات کا ثبوت نہیں ملا لیکن وین مونگ کے کام کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے امکان ظاہر کیا جا سکتا تھا کہ اسے قتل کر دیا گیا ہے۔ گو کہ اس کے ملنے کی امید کم ہو چکی تھی لیکن اوبرن نے ہی اس کے کیس کی ابتدائی تفتیش کی تھی اور اب بھی وہی اس کا انچارج تھا۔ اس لیے انجیل ہر تین چار ہفتے بعد اس سے ملنے چلی آتی۔ اس امید پر کہ شاید اس کے شوہر کے بارے میں کوئی سراغ مل گیا ہو۔ وہ ایک لمبے قد کی عورت تھی اور فونیکس میں ایک آرٹ گیلری چلاتی تھی جہاں وہ اپنے شوہر کی تصویریں نمائش کے لیے رکھتی اور ان کی فروخت سے اپنا گزارہ کر رہی تھی۔ اس کے علاوہ وہ خود بھی تصویریں بناتی تھی۔

اس روز وہ اپنے ساتھ جولیس مینڈلیس کو بھی لے کر آئی تھی جو ایک پرائیویٹ سراغ رساں تھا اور پولیس میں اس کی اچھی خاصی جان پہچان تھی۔ میرون وین مونگ بھی اس کے لیے بھی کام کرتا تھا۔

''گزشتہ ہفتے مجھے دو دن کے لیے میرون کی کار استعمال کرنا پڑی کیونکہ میری اپنی کار سروس کے لیے گئی ہوئی تھی۔ مجھے اس کی کار سے یہ نوٹ بک ملی۔'' پھر انجیل نے وہ نوٹ بک اوبرن کو دکھائی اور اسے کھول کر اس میں رکھے ہوئے ایک کاغذ کی جانب اشارہ کیا جس پر میرون نے آخری بار کچھ لکھا تھا۔

اوبرن نے پنسل سے لکھے ہوئے ان لفظوں پر نگاہ دوڑائی اور سوچنے لگا کہ یہ کاغذ اس تحقیقاتی ٹیم کی نظروں سے کیوں اوجھل رہا جو ایک سال پہلے اس کار کا معائنہ کرتے گئی تھی۔ حالانکہ اس کا امکان بہت کم تھا۔ اس کاغذ پر کوئی تاریخ درج نہیں تھی بس اتنا لکھا تھا۔ ''کوک اوون کی کیسنگٹ فیکٹری برف باری کی وجہ سے واپسی۔''

اس نوٹ بک کے دوسرے صفحات پر نظر دوڑانے سے معلوم ہوتا تھا کہ میرون اس پر اپنے ان کاموں کے بارے میں نوٹس لکھتا تھا جو مکمل ہو چکے تھے یا جن کی وہ پلاننگ کر رہا تھا اور آخری تحریر سے ظاہر ہو رہا تھا کہ غائب ہونے سے پہلے وہ اسی علاقے میں موجود تھا۔ اس نے ہوننگ مین میموریل ہائیک وے کا حوالہ دیا تھا اور اوبرن کے لیے یہی بات سب سے اہم تھی۔

جولیس مینڈلیس نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ''میرون ان دنوں انڈسٹریل آرکیالوجی سے متعلق ایک کتاب پر کام کر رہا تھا اور ایسی فیکٹریوں، کارخانوں، ریلوے ڈپو اور اسٹوریج ٹینک وغیرہ کی تصویریں لے رہا تھا جو بند ہو چکے ہیں یا استعمال میں نہیں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ تحریر بھی ایسی ہی تصویروں کی جانب اشارہ کرتی ہے جو وہ اس کتاب کے سلسلے میں حاصل کرنا چاہ رہا تھا۔'' پھر وہ انجیل سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''انہیں وہ کارڈ بھی دکھاؤ۔''

انجیل نے وہ کارڈ بھی اوبرن کے حوالے کر دیا۔ اس کارڈ کے ایک جانب بے ربطی تحریر میں لکھا ہوا تھا۔ ''ہوننگ مین 1/4 میل۔ کیسنگٹ فیکٹری۔ گرل۔ اندھیرا چھپنے کے بعد۔ رقم کی ادائیگی نقد۔''

اوبرن نے مینڈلیس سے پوچھا۔ ''کیا یہاں کوئی ایسی فیکٹری بھی ہے؟''

''ہاں۔ یہ فیکٹری پائیر اندر روڈ پر واقع ہے اور کئی سال سے بند ہے لیکن اس کی عمارت پر ابھی تک یہ نام لکھا ہوا ہے۔ ہوننگ مین ہائیک وے اس کے برابر سے گزرتا ہے۔ فیکٹری کے عقب میں پہاڑی کی جانب کوک اوون ایک قطار سے بنے ہوئے ہیں۔ میرون اپنی کتاب کے لیے وہاں کی تصویریں لینا چاہتا تھا۔ یہ جگہ وہاں سے صرف دو میل کے فاصلے پر ہے جہاں سے اس کی کار ملی تھی۔''

''کیا تم وہاں جا چکے ہو؟'' اوبرن نے پوچھا۔

''میں وہاں کار سے گیا تھا لیکن سڑک ختم ہونے کے بعد زمین ناہموار ہے۔ اس لیے آگے نہ جا سکا اور ویسے بھی وہ جگہ پرائیویٹ پراپرٹی ہے۔''

''کارڈ پر لکھی اس تحریر سے تم کوئی مطلب نکالنے میں کامیاب ہو سکے؟''

''مجھے وہاں کوئی گرل نظر نہیں آئی۔ صرف پہاڑیاں، جنگل اور گھاس پھوس ہی دیکھنے کو ملا۔''

''میں یہ کارڈ پہلے بھی دیکھ چکی ہوں۔'' انجیل بولی۔ ''گزشتہ سال موسم سرما شروع ہونے سے پہلے کمروں کی صفائی کے دوران یہ کارڈ مجھے ملا تھا اور میں نے میرون کو دکھایا بھی تھا کہ شاید اس نے غلطی سے پھینک دیا ہو۔''

''یقیناً اس کے لیے اس کارڈ کی کچھ اہمیت ہو گی۔ تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ یہ کہاں سے ملا ہوگا؟''

''ہمارے گھر ہونے والی پارٹی میں مہمانوں نے اپنے کوٹ ایک فالتو کمرے میں بستر پر ڈال دیے تھے۔ میرا خیال ہے کہ یہ کارڈ انہی میں سے کسی کوٹ سے گر گیا ہوگا لیکن یہ بتانا مشکل ہے کہ وہ کس کا کوٹ تھا۔''

''کیا تمہارے شوہر نے کبھی تمہارے سامنے اس فیکٹری یا کوک اوون کی تصویریں کھینچنے کا تذکرہ کیا تھا؟'' اوبرن نے پوچھا۔

''نہیں لیکن اس نوٹ بک سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔''

''میں اس فیکٹری کے بارے میں نہیں جانتا۔'' اوبرن نے کہا۔ ''لیکن میرا خیال ہے کہ مجھے خود وہاں جا کر دیکھنا چاہیے۔ تم یہ نوٹ بک اور کارڈ میرے پاس چھوڑ دو۔ بعد میں واپس کر دوں گا۔''

ان لوگوں کے جانے کے بعد اوبرن نے نوٹ بک میں درج تمام اندراجات کا مطالعہ کیا۔ پھر اس نے وہ نوٹ بک فوٹو کاپی کے لیے ایک کلرک کے حوالے کر دی۔ اس کے بعد وہ شہر کا نقشہ نکال کر بیٹھ گیا اور اس نے کنٹری انجینئر کے دفتر بھی اس بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے ٹیلی فون کیا۔ ہیرون کریک کے ساتھ ساتھ ایک ریلوے لائن کئی میل تک چلی گئی تھی لیکن کئی سالوں سے زیرِ استعمال نہ ہونے کے سبب اسے ناکارہ قرار دے کر لوہا فروخت کر دیا گیا۔ بعد میں اس راستے کو سائیکل چلانے کے لیے مخصوص کر کے حال ہی میں فوت ہونے والے اسکول سپرنٹنڈنٹ سے منسوب کر دیا گیا۔ جس فیکٹری کا تذکرہ کیا گیا تھا، وہ 1954ء میں بند ہو گئی تھی اور اسی ریلوے لائن کے راستے میں واقع تھی جہاں سے ایک چھوٹی سڑک فیکٹری کے احاطے تک جاتی تھی۔

اوبرن نے انٹرنیٹ سے کوک کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ یہ ایندھن خام کوئلے کو گرم کر کے حاصل کیا جاتا تھا۔ انیسویں صدی میں اس کا استعمال ریلوے انجنوں اور بھاپ سے چلنے والی دوسری مشینوں میں ہوتا تھا جبکہ فولاد سازی میں بھی کوک استعمال کیا جاتا ہے اس کی

''ٹھیک ہے۔۔۔۔۔۔ تم یہاں بہت آرام محسوس کر رہے ہو گے۔۔۔۔۔۔ لیکن اب تمہیں گھر جانا ہی پڑے گا۔ تمہارا نفسیاتی علاج ختم ہو چکا ہے۔''

www.pkdigest.com

ہزاروں بھٹیاں کوئلے کی کانوں اور فولاد بنانے والے کارخانوں کے نزدیک کام کر رہی ہیں۔ شہد کی مکھیوں کے چھتے کی طرز پر بنائی گئی اینٹوں کی یہ بھٹیاں پہاڑی کے ایک طرف قطار میں تعمیر کی گئی تھیں۔ ان میں اوپر کی جانب سے خام لوہا ڈالا جاتا تھا اور نیچے بنے ہوئے دروازے سے کوک نکلتا تھا۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد اوبرن اپنے باس لیفٹیننٹ سیویج کے پاس گیا اور اسے وہ نوٹ بک اور کارڈ دکھایا۔ ان چیزوں کو دیکھنے کے بعد سیویج طنزیہ انداز میں بولا۔ ''کمال ہے۔ اسے ایک سال بعد یہ چیزیں لانے کا خیال آیا؟ شاید وہ اور مینڈلیس سمجھتے ہوں گے کہ میرون... کی لاش تلاش کرنے کے لیے یہ مناسب وقت ہے تاکہ وہ انشورنس کی رقم حاصل کر سکیں۔''

''ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو لیکن...''

''مینڈلیس کے ہوتے ہوئے اس کے امکانات بہت زیادہ ہیں۔'' سیویج اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ''اگر میرون اس کے ساتھ یا اس کے لیے کام کرتا تھا تو اس کے ہاتھ بھی شاید صاف نہ ہوں۔ اس کارڈ پر لکھی تحریر کا کیا مطلب ہے۔ گرل، اندھیرا پھیلنے کے بعد نقدادائیگی۔ ایسا لگتا ہے کہ وہاں بچوں کو تمباکو اور نشہ آور اشیا فروخت کی جاتی ہیں۔''

''ڈائرکٹری میں ایسے کسی کاروبار کا تذکرہ نہیں ہے جو اس فیکٹری کے قرب و جوار میں ہو رہا ہو۔''

''میرا خیال ہے کہ تم خود وہاں جا کر اس بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہ رہے ہو؟ اگر ایسا ہے تو ڈولنگر کو بھی ساتھ لے جانا۔''

گوکہ پائیرانڈ روڈ شہر کی حدود میں ہی واقع تھا لیکن اوبرن کو کبھی اس طرف جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ یہ سڑک شہر کے شمال مغرب میں ایک کھاڑی سے گزرتی تھی۔ قریب ہی ایک لوہے کا پل بنا ہوا تھا۔ جونہی ان کی گاڑی پل پر پہنچی تو انہیں وہ فیکٹری نظر آگئی جس کی حالت کافی خستہ تھی البتہ اس پر بڑے بڑے حروف میں ہیلر میٹل کیسکٹ کمپنی لکھا ہوا تھا۔ آگے جا کر سڑک تنگ ہو گئی تھی جس پر ان کی گاڑی نہیں جا سکتی تھی۔ اوبرن کو یاد آیا کہ فیکٹری کا بیرونی دنیا سے رابطہ ریل کے ذریعے تھا جس کی پٹری کا نام و نشان بھی مٹ چکا تھا۔ ڈولنگر نے ایک چکر لگایا اور گاڑی ایک پارکنگ لاٹ میں کھڑی کر دی جو غالباً بائیک وے استعمال کرنے والوں کے لیے بنائی گئی تھی۔ وہاں پہلے سے ہی دو کاریں کھڑی تھیں۔ انہوں نے بائیک وے کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیا۔ ان کے داہنے ہاتھ پر کھاڑی تھی جبکہ بائیں ہاتھ پر فیکٹری نظر آرہی تھی۔ وہ آگے بڑھتے گئے یہاں تک کہ کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا جہاں کچھ مکانات بھی بنے ہوئے تھے۔

اچانک ہی دو لڑکے جنہیں اس وقت اسکول میں ہونا چاہیے تھا، کسی موڑ سے نکل کر ان کے سامنے آگئے اور ڈولنگر کی وردی پر نظر پڑتے ہی تیزی سے آگے نکل گئے۔ چلتے چلتے وہ ایک بند نالے تک پہنچ گئے جس کا منہ لوہے کی بھاری جالی سے بند کر دیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک سائیکل کھڑی تھی اور ایک سیاہ فام نوجوان کنکریٹ سے بنی ہوئی دیوار پر اسپرے پینٹ کر رہا تھا۔ قدموں کی چاپ سن کر اس نے ان کی جانب دیکھا اور دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

''تم آج اسکول کیوں نہیں گئے؟'' اوبرن نے اس سے پوچھا۔

''ٹیچرز کی میٹنگ تھی۔'' لڑکے نے ان کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔ وہ دیوار پر سیاہ، سرخ اور سلور کلرز کی لائنیں لگا رہا تھا جو تجریدی آرٹ کا نمونہ لگ رہی تھیں۔ تاہم رنگوں کے امتزاج اور اس کے ہاتھ کی حرکت سے اوبرن نے اندازہ لگا لیا کہ وہ کوئی اناڑی پینٹر نہیں ہے۔ اس نے لڑکے سے پوچھا۔ ''کیا تم کولڈ اسمتھ نارتھ میں پڑھتے ہو؟'' یہ اسکول ایسے طلبہ کے لیے تھا جن میں خداداد فنکارانہ صلاحیتیں ہوتی تھیں۔

''جی جناب!'' لڑکے نے مؤدبانہ انداز میں جواب دیا۔

''شاباش... لگے رہو۔'' یہ کہہ کر اوبرن نے چھلانگ لگائی اور باڑھ کے دوسری طرف آگیا۔

''میں یہاں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' ڈولنگر نے اس کی تقلید کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ جگہ مجھے ان گھنے جنگلوں جیسی لگ رہی ہے جہاں داخل ہونے کے بعد کوئی بھی سرچ پارٹی تین دن سے پہلے واپس نہیں آسکتی۔''

''دیکھتے ہیں کہ ہمیں یہاں کیا ملتا ہے۔ اس کے بعد ہم فیکٹری کی طرف واپس آئیں گے۔'' اوبرن نے کہا۔

وہ کھیتوں میں سیدھے چلتے ہوئے ایک بڑے گودام کے عقب میں واقع فارم ہاؤس تک پہنچے جس کے عقبی دروازے پر ایک پرانا ٹرک کھڑا تھا اور فارم ہاؤس کی بغلی دیوار پر ''گلیسپ گارڈ فارم اور بٹر اینڈ ایگ مین'' کے الفاظ درج تھے۔ انہیں دیکھتے ہی دروازے پر بندھے ہاؤنڈ نے بھونکنا شروع کر دیا۔

اس کے بھونکنے کی آواز سن کر ایک عمر رسیدہ شخص باہر آیا جس کے چہرے پر گھنی سفید داڑھی تھی اور اس نے ایک لمبا کوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ غراتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں کس کی تلاش ہے؟''

اوبرن نے آگے بڑھ کر اپنا تعارف کرایا اور پوچھا کہ کیا وہی اس جگہ کا مالک ہے؟

''ہاں، یہ میری جگہ ہے اور میں نے آج تک کسی کا ایک پیسا بھی نہیں رکھا۔'' وہ غصیلی بوڑھا ان سے بالکل بھی مرعوب نہیں ہوا۔

''کیا تمہارے علاقے میں کوئی کوک اوون بھی ہے؟''

''کوک اوون...!'' بوڑھا بڑبڑایا پھر بولا۔ ''تم غلط جگہ پر آگئے ہو مسٹر۔ تمہیں فیکٹری کے عقب میں واقع مغربی پہاڑیوں پر جانا چاہیے لیکن وہاں تک پہنچنے کے لیے میرے کھیتوں سے مت گزرنا۔ یہ شارع عام نہیں ہے۔''

''کیا تم جانتے ہو کہ گزشتہ دو برسوں کے درمیان کوئی شخص ان کوک اوون کو دیکھنے یا ان کی تصاویر بنانے آیا ہو؟''

''اگر ایسا کوئی شخص آیا بھی ہوگا تو میں نے اسے نہیں دیکھا۔'' یہ کہہ کر اس نے بات ختم کر دی اور اس وقت تک پورچ میں کھڑا رہا جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئے۔ اوبرن کو شبہ تھا کہ بوڑھے نے اپنے لباس میں کوئی پستول چھپا رکھا تھا۔ پارکنگ لاٹ پہنچ کر وہ سڑک کی طرف گھوم گئے جو فیکٹری کی طرف جا رہی تھی۔ اس کا فولادی گیٹ زنگ آلود ہو چکا تھا اور ایک طرف کو جھول رہا تھا۔ اندرونی راستے پر بھی جابجا گڑھے اور دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ وہاں انہوں نے ٹائروں کے تازہ نشانات دیکھے۔ وہ ان نشانات کا تعاقب کرتے ہوئے فیکٹری کی مرکزی عمارت تک پہنچ گئے جس کی تمام کھڑکیاں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ بلڈنگ کے عقب میں حال ہی میں بنایا گیا پارکنگ لاٹ تھا جہاں پہنچ کر ٹائروں کے نشانات ختم ہو گئے تھے۔ وہاں ایک دو منزلہ عمارت کے باہر چار کاریں اور ایک ٹرک کھڑا ہوا تھا جس کے دروازے پر ایک ہتھیلی کا نشان بنا ہوا تھا۔ ایسا ہی ایک نشان عمارت کی دیوار پر بھی نظر آیا۔ اس کے دروازے کے ساتھ ہی ایک بورڈ لگا ہوا تھا جس پر لکھا تھا۔ ''عطیات پیر تا جمعہ صبح 10 سے چھ بجے تک وصول کیے جاتے ہیں۔ ہم پرانا فرنیچر یا ضائع ہو جانے والا کھانا قبول نہیں کرتے۔ براہ کرم عطیات دینے کے لیے گھنٹی بجائیں۔''

اوبرن نے یہ عبارت پڑھنے کے بعد گھنٹی بجا دی۔ جس شخص نے دروازہ کھولنے سے پہلے ایک چھوٹی سی کھڑکی سے جھانکا، وہ ان دونوں کے لیے جانا پہچانا تھا۔ وہ کئی سال پہلے ٹی وی کمرشلز میں آیا کرتا تھا۔ بزنس سے ریٹائر ہونے کے بعد بھی وہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا رہا اور مختلف فلاحی کاموں کی پروموشن کے لیے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا رہا۔ ان دونوں کو دیکھتے ہی وہ بولا۔

''اندر آجاؤ۔ لگتا ہے تم کسی کی تلاش میں یہاں تک پہنچے ہو؟''

''یہ محض ایک معمول کی کارروائی ہے۔'' اوبرن نے اپنا شناختی کارڈ دکھاتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم یہاں کے انچارج ہو؟''

''تم ایسا کہہ سکتے ہو۔'' روتھ انہیں ایک بڑے کمرے میں لے گیا جہاں تین عورتیں پرانے کپڑوں کو چھانٹ کر انہیں خانوں میں رکھ رہی تھیں۔ دیواروں کے ساتھ مختلف اقسام کی کرسیاں اور میزیں ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے ریڈیو کا سوئچ آف کیا اور ایک میز پر بیٹھ گیا جس پر بہت سے کاغذات رکھے ہوئے تھے۔

''شاید تم جانتے ہو کہ یہ پروگرام مشکل میں گھرے ہوئے لوگوں کے لیے شروع کیا گیا ہے۔ مثلاً بے روزگار، سیلاب یا آگ کے متاثرین اور بے گھر افراد وغیرہ۔ اسے مقامی گرجا گھروں کے تعاون سے چلایا جا رہا ہے اور انہوں نے مجھے یہاں کا انتظام سنبھالنے کی ذمے داری سونپی ہے کیونکہ میں چالیس سال تک کپڑے بیچتا رہا ہوں۔''

''تمہیں یہاں آئے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا؟''

''تقریباً ایک سال۔''

''کیا تمہارے پاس فیکٹری کا بھی حصہ ہے؟''

''ہاں، یہاں پہلے فیکٹری کا دفتر ہوا کرتا تھا۔ اصل فیکٹری تو بالکل تباہ ہو چکی ہے۔ تم یہاں کس سلسلے میں آئے ہو؟''

''ہم ایک ایسے شخص کا کھوج لگانے کی کوشش کر رہے ہیں جو ایک سال پہلے یہاں آیا تھا اور غائب ہو گیا۔ ممکن ہے کہ وہ تم سے پہلے یہاں آیا ہو۔ کیا اس وقت یہاں کوئی اور کام بھی ہوتا تھا؟''

''نہیں، کئی سالوں سے یہ جگہ بے کار پڑی ہے۔ اس حصے میں بجلی اور پانی کا کام بھی ہم نے کروایا ہے۔ تم نے بتایا کہ وہ شخص یہاں کی تصویریں لینا چاہتا تھا... اس کی کوئی خاص وجہ؟''

''ہاں، وہ پرانی صنعتوں پر ایک کتاب لکھ رہا تھا۔ اس علاقے میں کچھ کوک اوون ہیں۔ وہ ان کی تصویریں بھی لینا چاہ رہا تھا۔''

''اوہ!'' روتھ یہ سن کر ایسے چونکا جیسے گہری نیند سے بیدار ہوا ہو پھر بولا۔ ''میرے ساتھ آؤ۔''

وہ ایک طویلی راہداری سے گزرتے ہوئے عمارت

www.pkdigest.com

کے غیر استعمال شدہ حصے تک پہنچے جہاں بغیر دروازوں کی کھڑکیوں سے باہر کا منظر صاف نظر آرہا تھا۔ ان کی نظریں ایک ابھرے ہوئے ٹیلے پر جم گئیں جس کے ساتھ ساتھ ایک چودہ فٹ اونچی دیوار بنی ہوئی تھی جس میں محراب نما بڑے سوراخ ایک قطار میں نظر آرہے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر جھاڑیوں اور درختوں کے پیچھے چھپ گئے تھے۔

”میں گزشتہ ایک سال سے انھیں دیکھ کر حیران ہو رہا ہوں۔“ روتھ بولا۔ ”لیکن کبھی کسی سے اس بارے میں نہیں پوچھا۔ تم نے کیا کہا تھا... کوک اوون؟“

”یہ خام کوئلے کو کوک میں تبدیل کرتے ہیں۔ اس بات کا امکان ہے کہ فوٹوگرافر ان میں سے کسی ایک میں گر کر زخمی نہ ہو گیا ہو۔ کیا تم نے کبھی اس جگہ کا جائزہ لیا ہے؟“

”میں زیادہ تر اس عمارت میں ہی رہتا ہوں۔ اس لیے ایسے کسی شخص پر میری نظر نہیں گئی۔“ روتھ نے جواب دیا۔

اوبرن اور ڈونلگر کوک اوون کا معائنہ کرنے کے لیے آدھے ایکڑ کا فاصلہ طے کر کے وہاں تک پہنچے۔ ان کے جوتے اور پتلون کے پائنچے کیچڑ میں لت پت ہو چکے تھے۔ اوبرن نے دیوار کے قریب پہنچ کر ان کی گنتی کی۔ وہ تعداد میں بیس تھے۔ ان کے سامنے سے چھوٹے گیج کی پٹری گزر رہی تھی جس پر کسی زمانے میں کوک لے جانے والی ویگن گزرتی ہوگی۔ انھوں نے بائیں سرے سے انھیں دیکھنا شروع کیا اور اپنی ٹارچوں کی مدد سے اندر کا جائزہ لینے لگے۔ ان میں دو کی اندرونی دیوار ٹوٹ چکی تھی اور اس کی اینٹیں فرش پر بکھری پڑی تھیں۔

نویں اوون میں انھیں وہ کچھ نظر آگیا جس کی تلاش میں وہ یہاں تک پہنچے تھے۔ اندر ایک انسانی ڈھانچا، ہڈیاں اور کپڑے پڑے ہوئے تھے۔ انھوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ کسی چیز کو نہ چھیڑا جائے۔ اوبرن نے اپنا سیل فون نکالا اور کسی سے باتیں کرنے لگا۔

سہ پہر تک روتھ کے آفس کا پارکنگ ایریا سرکاری گاڑیوں سے بھر چکا تھا اور مکمل تحقیقات کے لیے اوون نمبر 9 ان کی توجہ کا مرکز تھا۔ سارجنٹ ڈیوڈ کیسٹرل اور نک اسٹے مائی، لاش اور اس کے اردگرد کی تصویریں لے رہے تھے۔ دیگر لوگوں میں میونسپل عملہ، سٹی انجینئر اور کفن دفن کا انتظام کرنے والی کمپنی کا اسٹاف شامل تھا جبکہ روتھ اور اس کے ساتھی اپنی کھڑکیوں سے یہ کارروائی دیکھ رہے تھے جہاں سے اوبرن اور ڈونلگر نے پہلی بار یہ اوون دیکھے تھے۔ ڈھائی بجے کے قریب چینل نور کی نیوز ٹیم بھی وہاں پہنچ گئی۔ اوبرن نے ان کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے خاصا محتاط انداز اختیار کیا کہ لاش کی شناخت نہیں ہو سکی ہے اور اس طرح کے کیسز کی تحقیقات پبلک سیفٹی یا ہومی سائیڈ کے لوگ کرتے ہیں۔ لہٰذا اس بارے میں مزید تفصیلات انہی سے معلوم کی جائیں۔

اس دوران اسٹے مائی نے لاش کو وہاں سے ہٹانے اور تدفین کے لیے منتقل کرنے کے احکامات دے دیے۔ بہت سی باتیں واضح ہو چکی تھیں۔ لاش کے پاس سے کوئی کوٹ یا ہیٹ نہیں ملا تھا جبکہ میرون موسم سرما میں لاپتا ہوا تھا۔ نہ ہی اس کی ذاتی اشیا مثلاً پرس، چابیاں یا گھڑی ملی تھیں۔ اگر یہ میرون ہی تھا تو اس کا کیمرا کہیں راستے میں ہی گر گیا ہوگا۔

جس جگہ سے لاش دریافت ہوئی تھی، وہاں چھت پر تقریباً ایک گز قطر کا سوراخ تھا جہاں سے آسمان صاف نظر آرہا تھا۔ بظاہر یہی معلوم ہو رہا تھا کہ مرنے والا اسی سوراخ سے نیچے گرا ہوگا یا کسی نے اسے وہاں سے گرایا ہوگا۔ اوبرن اور کیسٹرل اوون کی بالائی سطح پر پہنچے تو یہاں بھی ایک چھوٹی پٹری بچھی ہوئی تھی۔ ان میں سے کچھ اوون کے بالائی حصے لوہے کے ڈھکنوں سے ڈھانپ دیے گئے تھے اور کچھ کھلے ہوئے تھے۔ کیسٹرل نے ایک بار پھر تصویریں اتارنا شروع کر دیں اور پورا ایک رول خالی کر دیا۔ اوبرن اسے اپنے کام میں مصروف چھوڑ کر اکیلا ہی نیچے چلا آیا۔ وہ جلد از جلد مسز وین موسمک سے بات کرنا چاہتا تھا ورنہ وہ چھ بجے کی خبروں میں یہاں کی کارروائی سن کر پریشان ہو جاتی۔ اسٹے مائی کا کام ختم ہو چکا تھا اس لیے وہ بھی اوبرن کے ساتھ مسز میرون وین موسمک کی مضافاتی رہائش گاہ پر چلا آیا۔

اوبرن نے روانہ ہونے سے پہلے فون کر کے معلوم کر لیا تھا کہ وہ گھر پر ہی ہے۔ جب وہ اس کی رہائش گاہ پر پہنچے تو وہ اپنی لائبریری میں کتابوں کی ترتیب درست کر رہی تھی۔ اوبرن نے اسے بتایا کہ کوک اوون کی تلاش کے دوران انھیں ایک شخص کی لاش ملی ہے لیکن اس کی شناخت کے لیے ڈی این اے ٹیسٹ کروانا ہوگا۔ انجیل نے اسے بتایا کہ میرون کے دو بھائی زندہ ہیں اور ضرورت پڑنے پر ان کے خون کا نمونہ لیا جا سکتا ہے۔ اسٹے مائی نے مناسب الفاظ میں انجیل سے ہمدردی کا اظہار کیا اور کہا کہ لاش کی حالت ایسی نہیں کہ وہ اسے دیکھ سکے اور نہ ہی اس کی شناخت ہو سکتی ہے۔

ہیڈکوارٹر پہنچنے کے بعد اوبرن نے لیفٹیننٹ سیونج
......کو مکمل رپورٹ پیش کی اور کلیپ گارڈ، میلون روتھ اور اوپن ہینڈ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی ہدایات جاری کیں۔ جب تک لیبارٹری اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹس نہیں آجاتیں، اس وقت تک اس کے پاس اس کیس کے حوالے سے کوئی کام نہ تھا چنانچہ وہ دوسرے کیسز کی جانب متوجہ ہو گیا۔

اتوار کے دن وہ معمول کے مطابق انٹرنیٹ کھول کر بیٹھ گیا اور مختلف سائٹس سرچ کرنے لگا۔ اچانک اس کی نگاہ ایک ویب سائٹ پر گئی جس پر ایک وارننگ درج تھی۔ ”اگر آپ کو یقین ہے کہ آپ نے چوری شدہ اشیا اس ویب سائٹ کے ذریعے خریدی ہیں تو اس کی اطلاع ویب ماسٹر یا فروخت کنندہ کو نہ دیں۔ اس کے بجائے آپ بڈیج سے فوری طور پر رابطہ کریں تاکہ آپ کے سوالوں سے ذاتی اور خفیہ طور پر نمٹا جائے۔ یہ آپ کے لیے پیسے واپس لینے کا بہترین موقع ہوگا۔ یہاں کلک کریں۔“

گو کہ یہ عجیب و غریب تحریر اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی لیکن اس نے فوری طور پر انٹرنیٹ کے ذریعے چوری شدہ اشیا کی نیلامی اور ذاتی استعمال کی الیکٹرانک اشیا کی بڑھتی ہوئی چوری کی وارداتوں کے درمیان تعلق ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ قانون نافذ کرنے والے ادارے میں پندرہ سال گزارنے کے بعد وہ ان باتوں کا عادی ہو چکا تھا اور ایسی کوئی چیز اسے حیران نہیں کرتی تھی لیکن جب اس نے یہ سائٹ سرچ کی تو بدحواس ہو گیا۔ اس روز چھتیس ہزار سیل فون اور تقریباً پچاس ہزار ریکارڈرز اور دیگر اشیا نیلامی کے لیے پیش کی گئی تھیں۔ اس سلسلے میں جب اس نے لیفٹیننٹ ڈیمار سے بات کی تو اس نے بتایا کہ انٹرنیٹ کے ذریعے کی جانے والی ان پیشکشوں کی مستقل نگرانی کا بھی کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ اس کاروبار میں ملوث بااثر لوگ مختلف ای میل ایڈریس استعمال کرتے ہیں اور قانونی رعایتوں کی وجہ سے انھیں ان سائٹس کے ذریعے شناخت یا تلاش کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے انکم ٹیکس اور سیلز ٹیکس میں بھی نقصان ہوتا ہے اور یہ پوشیدہ آمدنی کروڑوں ڈالرز میں ہوتی ہے۔

سوموار کی صبح اسٹے مائی نے اسے کوک اوون سے ملنے والی لاش کے معائنے کی ابتدائی رپورٹ بھیج دی۔ لیبارٹری کے پیتھالوجسٹ نے باقیات کو جوڑ کر ایک مکمل ڈھانچا بنا لیا تھا۔ مرنے والے کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی اور وہ سفید فام تھا۔ اس کے دماغ کی ہڈیاں سلامت تھیں۔ البتہ ایک پسلی متاثر ہوئی تھی۔ شاید یہ گولی لگنے کی وجہ سے ہوا تھا۔ اب لاش کی نرم بافتوں اور زہریلے مادوں کا ڈی این اے ٹیسٹ ہونا باقی تھا۔

اوپن ہینڈ کی امدادی سرگرمیاں جاری تھیں۔ اس کے گوداموں میں جمع ہونے والی اشیا ضرورت مندوں میں بلا معاوضہ تقسیم کی جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ نچلے درجے کے لوگوں کو رعایتی نرخوں پر سستے اسٹور سے پرانے کپڑے بھی فروخت کیے جاتے تھے۔ اس آمدنی سے کرایہ، مختلف بل، انشورنس اور عملے کی تنخواہیں ادا کی جاتی تھیں جبکہ بیشتر اسٹاف رضاکارانہ خدمات سرانجام دیتا تھا۔

اڑتالیس سالہ ڈسکل کلیپ گارڈ مجرد زندگی گزار رہا تھا۔ اس کے خلاف کوئی شکایت نہیں ملی تھی۔ وہ اپنے کاروبار کی تشہیر میڈیا اور زرد صفحات کے ذریعے نہیں کرتا تھا۔ البتہ اس نے ایک ویب پیج لے رکھا تھا۔ لنچ سے پہلے اوبرن کنٹری انجینئر ہوبارٹ سے ملنے چلا گیا۔ وہ دیکھنے میں البرٹ آئن اسٹائن جیسا نظر آتا تھا۔ اس وقت بھی وہ اپنی بڑی سی میز پر کئی نقشے اور پلان لیے بیٹھا تھا تاکہ اوبرن کو ان معلومات سے آگاہ کر سکے جو اس نے حاصل کی تھیں۔

”ایک بات یاد رکھنا۔ یہ تفصیلات مکمل نہیں ہیں۔ وہاں لوگوں کی ذاتی زمینوں کے نیچے زیر زمین نالے ہیں جن کا ہمارے پاس کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ہم اس نجی زمین کے بارے میں بھی کچھ نہیں بتا سکتے جو اس محکمے کے قائم ہونے سے پہلے وہاں موجود تھی۔“

سہ پہر کو اوبرن کی ملاقات لیفٹیننٹ سیونج سے ہوئی تو اس نے اسے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے آگاہ کیا اور ساتھ ہی اسے اب تک ہونے والی تحقیقات کے بارے میں بھی بتایا۔ وہ ایک بار پھر اس علاقے میں جا کر مزید تحقیقات کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے لیے اسے سرچ وارنٹ کی ضرورت تھی جو اسے مل گیا۔

تین بجے کے قریب وہ اور ڈونلگر ایک بار پھر اپنی منزل مقصود کی جانب روانہ ہوئے۔ اس روز مطلع ابر آلود تھا اور بارش کی بھی پیش گوئی کی گئی تھی۔ اس روز انھیں نالے کی دیوار پر وہ لڑکا نظر نہیں آیا جس سے گزشتہ بار ان کا سامنا ہوا تھا۔ شاید وہ اس وقت اسکول میں ہوگا۔ وہ دونوں نالے میں اتر گئے۔ اس کا اندرونی قطر چون انچ تھا اور یہ سیدھا پہاڑی تک جاتا تھا۔ نالے کے منہ پر ایک جالی لگی ہوئی تھی لیکن اب وہ اپنی جگہ سے ہٹ چکی تھی اور ایک ادھ کھلے گیٹ کی طرح نظر آرہی تھی۔ ڈونلگر نے اندر داخل ہونے سے پہلے اپنی ٹارچ روشن کی اور نالے کے فرش پر ٹانگیں پھیلا کر کھڑا ہو گیا تاکہ بہتے ہوئے پانی کے دباؤ کا مقابلہ کر سکے۔

”خیال رکھنا۔ ایسی جگہوں پر آبی جانور بھی ہوتے ہیں۔ کہیں کوئی مگرمچھ تمھیں نہ لپٹ جائے۔“ اوبرن نے کہا۔

www.pkdigest.com

اوبرن اور ڈونگر کیچڑ اور پانی میں سے گزرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ کلیپ گارڈ کے فارم ہاؤس پر پہنچ کر اس نے ایک بار پھر گودام کے گرد چکر لگایا اور کچن کے دروازے پر دستک دی۔ کئی منٹ گزرنے کے بعد اس نے چٹخنی گرنے کی آواز سنی۔ اوبرن نے..... ہولسٹر پر ہاتھ رکھ کر ریوالور کی موجودگی کا یقین کیا۔

اسے دیکھتے ہی کلیپ گارڈ کا منہ بن گیا اور وہ بھناتے ہوئے بولا۔ ”میں نے تمہیں گزشتہ ہفتے ہی بتا دیا تھا کہ میری زمین پر کوئی کوک اوون نہیں ہے۔ اس کے باوجود تم دوبارہ چلے آئے۔“

اوبرن نے اپنا پیر دروازے میں رکھا اور اسے سرچ وارنٹ دکھانے سے پہلے یقین کر لیا کہ اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے۔ ”آج میں کوک اوون کے لیے نہیں آیا بلکہ یہ جاننے آیا ہوں کہ یہاں پس پردہ کیا ہو رہا ہے؟“

کلیپ گارڈ کسی بپھرے ہوئے جانور کی طرح غرایا۔ ”مجھے نہیں معلوم کہ تم کیا بکواس کر رہے ہو۔“ پھر اس نے جیب سے چشمہ نکال کر لگایا اور وارنٹ پر نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ ”کیا دیکھنا چاہتے ہو؟ تمہیں کس چیز کی تلاش ہے؟“

”یہ محض معمول کی کارروائی ہے۔“ اوبرن شائستگی سے بولا۔ ”تم نے اخبارات میں پڑھا ہوگا کہ ہمیں گزشتہ ہفتے فیکٹری کے عقب میں واقع کوک اوون سے ایک لاش ملی ہے۔ ہمیں شبہ ہے کہ اس موت کا تعلق ان سرگرمیوں سے ہے جو تمہاری زمین پر ہو رہی ہیں۔ میں اس نالے کو دیکھنا چاہتا ہوں جو تمہارے فارم ہاؤس کے عقب میں واقع پہاڑی سے ہیرون کریک تک جاتا ہے۔“

کلیپ گارڈ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا لیکن پھر وہ ایک قدم پیچھے ہٹا اور شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ ”بہتر ہوگا کہ تم اندر آ جاؤ۔“

اوبرن نے اندر جا کر کلیپ گارڈ کی رہائش گاہ کا سرسری جائزہ لیا۔ وہ جگہ کسی ہارڈ ویئر اسٹور کا منظر پیش کر رہی تھی۔ اوپر دو کمرے تھے جن کا فرنیچر گرد سے اٹا ہوا تھا۔ وہ واپس کچن کی طرف آیا اور ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ کلیپ گارڈ بولا۔ ”یہ تہ خانے کا دروازہ ہے۔ وہاں چوہوں اور کیڑے مکوڑوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔“

”ایک نظر دیکھ لیتے ہیں۔“ اوبرن بولا۔ ”پہلے تم نیچے جاؤ۔“

اوبرن کو توقع تھی کہ ڈونگر اسے فون کرے گا لیکن شاید اس کا سیل فون زیر زمین سگنل وصول نہیں کر رہا تھا۔ کلیپ گارڈ کا تہ خانہ قدرے بہتر حالت میں تھا۔ فرش کہیں کہیں سے اُدھڑا ہوا تھا لیکن وہاں جدید طرز کی ٹیوب لائٹس لگی ہوئی تھیں۔ دیواریں اینٹوں کی بنی ہوئی تھیں۔ البتہ ایک لوہے کے بڑے دروازے کے اردگرد کے حصے پر پلاستر کیا گیا تھا۔

اوبرن نے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ کیا ہے؟“

”کچھ نہیں، سامان رکھنے کی جگہ ہے۔ میں نے تو کئی برسوں سے اسے کھول کر نہیں دیکھا۔“

اوبرن نے بھاری دروازے کا ہینڈل گھما کر اسے کھول دیا۔ اس نے تہ خانے کی بتیاں روشن کیں۔ اس کی نظریں ایک سرنگ کے دہانے پر جم گئیں۔ اوبرن نے آگے بڑھ کر دیکھا تو اسے وہاں لکڑی کی سیڑھیوں سے بنا ہوا راستہ نظر آیا جو اوبرن کے خیال کے مطابق گودام تک جاتا تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لی۔ وہ اپنی فتح کے قریب پہنچ چکا تھا لیکن یقین سے کچھ کہنا مشکل تھا۔ ممکن ہے کہ اس کا خیال غلط نکلتا اور گودام میں پرانے کاشت کاری کے آلات ہی پڑے ہوتے۔

”جب میں نے اپنے باس کو بتایا کہ تمہارے گودام میں کوئی دروازہ نہیں تو وہ بولا کہ جب کوئی گھوڑا چوری ہو جائے گا تو یہ دروازہ بنانے کی ضرورت پیش آئے گی... لیکن تمہارے پاس تو کوئی گھوڑا بھی نہیں بلکہ مرغی تک نہیں ہے۔“

”تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟ ابھی تو تم نے صرف مکان ہی دیکھا ہے... باقی جگہوں پر نہیں گئے۔“

”میں نے بچپن میں کچھ عرصہ فارم پر کام کیا ہے اور جانتا ہوں کہ جانوروں کو ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ کہیں نہ کہیں بندھے یا گھومتے ہوئے نظر آ جاتے ہیں۔“ اوبرن نے کہا۔ ”خیر، تم آگے بڑھو۔“

کلیپ گارڈ نے اسے گھور کر دیکھا اور زور زور سے قدم رکھتا ہوا سیڑھیاں اترنے لگا۔ اوبرن اس کے پیچھے تھا۔ سیڑھیوں کے اختتام پر ایک اور لوہے کا دروازہ تھا۔ کلیپ گارڈ نے ایک بار پھر تالا کھولنے میں ہچکچاہٹ سے کام لیا لیکن اوبرن کے مجبور کرنے پر اسے ایسا کرنا پڑا۔ اوبرن نے دروازہ کھولا اور اندر کی بتیاں روشن کر دیں۔

وہ ایک بہت بڑا کمرا تھا اور کوئی گودام ہی لگ رہا تھا۔ وہاں ہر طرف الماریاں اور شیلف رکھے ہوئے تھے جن میں برقی اور الیکٹرانک اشیا مثلاً واک مین، موبائل فون، لیپ ٹاپ، کمپیوٹرز وغیرہ شامل تھے۔ کمرے کے وسط میں ایک بڑی میز پر کمپیوٹر رکھا تھا اور اس کے اردگرد مختلف سائز کے خالی ڈبے موجود تھے۔ اس کے عقب میں ایک زردی مائل

سرخ رنگ کا کیبل سانپ کی طرح بل کھا رہا تھا۔ اوبرن نے گزشتہ بار ایسا ہی ایک کیبل گودام کے باہر زمین پر پھیلا ہوا دیکھا تھا۔

”مسٹر کلیپ گارڈ!“ اوبرن نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔ ”گو کہ اس سامان کی مالیت لاکھوں میں ہو سکتی ہے لیکن اس کے لیے سرکاری وکیل کو یہ ثابت کرنا ہوگا کہ تم نے کوئی قانون توڑا ہے۔ لہٰذا تمہیں اس بارے میں خاموشی اختیار کرنے کا حق ہے۔ تم کسی سوال کا جواب نہیں دو گے اور نہ ہی کوئی معلومات فراہم کرو گے۔ تم میری بات سن رہے ہو نا؟“

کوئی جواب نہ ملنے پر اس نے کلیپ گارڈ کی جانب دیکھا جو اپنے ہاتھ میں رائفل تھامے کھڑا تھا۔ گو کہ اوبرن کو شاید ہی پہلے کبھی ایسی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا ہو لیکن اس نے خوف زدہ ہونے کے بجائے کلیپ گارڈ کو وارننگ دینا چاہی لیکن اس سے پہلے ہی کلیپ گارڈ رائفل کا رخ اس کی جانب کرتے ہوئے بولا۔ ”دیوار کی طرف منہ کر کے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لو۔“

اوبرن نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ کلیپ گارڈ نے آگے بڑھ کر اس کی جیب سے سروس ریوالور نکال لیا اور بولا۔ ”اوکے... اب سیڑھیوں سے اتر کر نیچے کی طرف چلو اور سرنگ میں پہنچ کر دائیں جانب گھوم جاؤ۔“

اوبرن نے آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ جیسے جیسے وہ تہ خانے سے دور ہوتے گئے، سرنگ کا اندھیرا بڑھتا گیا لیکن دوسرے سرے سے نمودار ہوتی دن کی روشنی نے اوبرن کو بہت کچھ سجھا دیا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک نسبتاً چوڑی جگہ پر پہنچ گئے جہاں اسے داہنی دیوار کے ساتھ لکڑی کا ایک بکس رکھا ہوا نظر آیا۔ کلیپ گارڈ بولا۔ ”یہیں رک جاؤ۔ جس شخص کی لاش تمہیں کوک اوون سے ملی، وہ یہاں کیمرا لیے گھوم رہا تھا جیسے جاسوسی کرنے آیا ہو۔ میں نے چالیس گز کے فاصلے سے گولی چلائی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ پھر میں نے ایک چاقو کی مدد سے وہ گولی اس کے جسم سے نکال لی اور اب ایسا ہی کچھ تمہارے ساتھ بھی ہونے والا ہے۔“

”اس سے تمہیں افسوس کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو گا۔“ اوبرن بے خوفی سے بولا۔ ”ایک پولیس آفیسر کو مارنے کے بعد تم ساری عمر بھاگتے رہو گے کیونکہ اس جرم کو معاشرہ کبھی نظر انداز نہیں کرے گا اور پولیس اس وقت تک تمہارا پیچھا کرتی رہے گی جب تک تم پکڑے نہیں جاتے۔“

”میرا کچھ نہیں بگڑے گا کیونکہ اس جرم کا کوئی عینی شاہد نہیں ہے۔ تمہارے موٹے دوست کو میں آدھ گھنٹا پہلے ہی گرا چکا ہوں۔“

اوبرن کو اس وقت اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہونے لگا کہ اس نے نتائج کا جائزہ لیے بغیر یہ اندھا دھند قدم کیوں اٹھایا۔ بہرحال، وہ بے بسی کی موت نہیں مرنا چاہتا تھا چنانچہ اس نے اپنے بچاؤ کے لیے مختلف ترکیبیں سوچنا شروع کر دیں۔ وہ کبھی فوج میں نہیں رہا تھا لیکن پولیس اکیڈمی میں تربیت کے دوران اس نے دست بدست لڑائی سیکھی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس طرح کے حالات میں مخالف پر حملہ کرنا فائدہ مند ہوتا ہے، خواہ وہ مسلح ہی کیوں نہ ہو۔

دوسرے ہی لمحے اوبرن نے اپنے جسم کو بائیں جانب جھکایا اور رائفل کی زد سے باہر نکلتے ہوئے خود کو کلیپ گارڈ پر گرا دیا۔ اسے اس حملے کی توقع نہیں تھی۔ اوبرن نے اسے مہلت دیے بغیر ایک جھٹکے سے رائفل چھین لی اور اس کے اگلے سرے سے اس کے پیٹ کو دبایا۔ کلیپ گارڈ تکلیف کی شدت سے دہرا ہو گیا۔ اوبرن نے ایک بار پھر رائفل گھمائی اور اس کی کنپٹی پر دہنی طرف شدید ضرب لگائی تو وہ بے ہوش ہو گیا۔

”ویل ڈن سارجنٹ!“ اوبرن کو ایک شناسا آواز سنائی دی۔

اس نے اپنی طرف بڑھتے ہوئے سائے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم زخمی ہو؟“

”کچھ زیادہ نہیں۔“

اوبرن نے اپنی ٹارچ کی روشنی میں دیکھا کہ ڈونگر سرنگ کی دائیں شاخ سے باہر آ رہا تھا۔ ”میں اس کے نشانے کی زد پر تھا لیکن وہ مجھے اپنی توقع کے مطابق نقصان نہیں پہنچا سکا۔“

”تم نے مجھے فون کیوں نہیں کیا؟“

”ایسا میں نے جان بوجھ کر کیا تاکہ اسے شک نہ ہو کہ میں زندہ ہوں اور مجھے اس پر قابو پانے کا موقع مل جائے۔“

”اچھا، دیکھوں تو سہی کہ تمہیں کہاں زخم لگا ہے۔“ اوبرن نے تشویش سے کہا۔

اس کی کمر کی دائیں جانب سے گولی چھوتی ہوئی گزر گئی تھی جس کی وجہ سے اس کے لباس پر خون جم گیا تھا۔

”یقین کرو سارجنٹ... مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے لیکن بہتر ہوگا کہ ہم پولیس فورس طلب کر لیں تاکہ وہ اس بہروپیے کی اصل حقیقت جان جائیں۔“

اوبرن نے ایک نظر بے ہوش کلیپ گارڈ پر ڈالی اور ہیڈ کوارٹر کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

www.pkdigest.com

www.paksociety.com

سولہویں قسط

اسما قادری

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ ڈور بااثر سماج کے روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں۔مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کئی رخ ہیں، بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے..... یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے..... ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے۔ پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو۔محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس ہوجاتی ہے۔ دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے۔ زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں..... کبھی بازی پلٹ بھی جاتی ہے۔ بیتا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ لے جاتا ہے..... اس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے۔ جرم، افسرشاہی، جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی لامتناہی سلسلہ

تقدیر کی فسوں گری، قسمت کی چالبازی یا مقدر کا کھیل..... ملنے اور بچھڑ جانے والوں کی کہانی

بارسوخ خاندان سے تعلق رکھنے والا شہریار عادل ایک پرجوش جوان ہے جس کی بطور اسسٹنٹ کمشنر پہلی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ اس کے زیر تحت ضلع کے سب سے بڑے گاؤں پیر آباد کا چودھری افتخار عالم شاہ ایک روایتی جاگیردار ہے جو شہریار کو اپنے رعب پر چلانے میں کامیاب نہیں ہوتا اور دونوں کے درمیان مخاصمت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ چودھری ظالم و جابر اور عیاش تھا۔ شہریار اس کے ناجائز کاموں میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ پیر آباد کا رہائشی ماسٹر آفتاب جو عرصے سے گاؤں کے پرائمری اسکول کی ترقی کا خواہش مند ہوتا ہے، شہریار کا سہارا پاکر کھل کر اپنے مشن پر کام کرنے لگتا ہے۔ چودھری کی نفاست پسند بیٹی کشور، آفتاب کو دیکھتی ہے تو اس کی محبت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اس کی محبت کی شدت کو دیکھتے ہوئے آفتاب کو اسے اپنے دل میں جگہ دینی پڑتی ہے اور دونوں کے درمیان ہونے والی چوری چھپے کی ملاقاتیں خفیہ نکاح تک جا پہنچتی ہیں۔ ماہ بانو کا تعلق بھی پیر آباد سے ہے۔ اس کے والدین بچپن میں ہی اسے اس کے خالہ خالو کو گود دے دیتے ہیں جن کے ساتھ وہ فیصل آباد میں رہتی تھی لیکن والدین اور بھائی بہنوں سے ملاقات کے لیے اس کا پیر آباد آنا جانا رہتا تھا۔ چودھری افتخار پیری مریدی کے چکر میں اپنے مرحوم دادا کا عرس بڑی شان و شوکت سے مناتا ہے۔ عرس کے دنوں میں جبراً حویلی کے کاموں کے لیے بلوائی جانے والی ماہ بانو کو دیکھتا ہے تو اس پر اس کا دل آجاتا ہے اور وہ ماہ بانو کی عزت پامال کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ چودھری کے چنگل سے نکل کر بھاگ جانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اگلی بار اس کا اپنی بہن کی شادی میں دوبارہ پیر آباد آنا ہوتا ہے۔ چودھری اسے اغوا کروالیتا ہے لیکن ماہ بانو ایک بار پھر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ چودھری افتخار بہرصورت اس سے شادی کرنا چاہتا ہے مگر ماہ بانو شادی سے قبل ہی اپنی بہن زہرہ کے تعاون سے گھر سے بھاگ نکلتی ہے اور شہریار سے جا ملتی ہے۔ شہریار اسے اپنی گاڑی میں چھپا کر پیر آباد سے نکال دیتا ہے اور وہ دارالامان پہنچا دیتا ہے لیکن چودھری کے آدمی مستقل اس کے پیچھے رہتے ہیں پھر ماہ بانو مشکلات سے گزرتی ہوئی خواجہ سراؤں کے ہتھے لگ جاتی ہے۔ خواجہ سراؤں کا گرو الماس بہ طور سزا اس سے وہی کام لیتا ہے جو اس کے گرگے کرتے ہیں۔ ایک روز الماس اسے لے کر ایک ہندو سیٹھ کی کوٹھی پہنچتا ہے۔ راستے میں ٹیکسی والے کی بدتمیزی کی وجہ سے ماہ بانو زخمی ہو جاتی ہے۔ کوٹھی میں اسے ایک حیرت انگیز منظر دیکھنے کو ملتا ہے۔ کوٹھی کے تہ خانے میں کئی خواجہ سرا جمع ہوتے ہیں جن کی موجودگی میں ان کا مہا گرو ایک نوجوان لڑکی کو ایک مورتی کے قدموں میں بھینٹ چڑھا دیتا ہے پھر ایک چھاپے کے دوران ماہ بانو کو تھانے لے جایا جاتا ہے۔ سجاد رانا کو اپنی بیٹی شینا کی تلاش ہوتی ہے جسے خواجہ سراؤں کے ایک گروہ نے اغوا کر لیا تھا۔ چنانچہ جب انہیں یہ اطلاع ملتی ہے کہ خواجہ سراؤں کے ایک گروہ میں ایک لڑکی دیکھی گئی ہے تو وہ اسے اپنی بیٹی سمجھ کر بازیافت کروانے کی کوشش کرتا ہے اور نتیجے میں ماہ بانو آزاد ہو جاتی ہے۔ ماہ بانو کو شہریار کا ماموں زاد بھائی سجاد رانا اپنے ساتھ اپنے گھر لے جاتا ہے جہاں شہریار بھی موجود ہوتا ہے۔ وہیں وہ شینا کی تصویر دیکھتی ہے اور شہریار کو بتاتی ہے کہ اس لڑکی کو ہندو سیٹھ کی کوٹھی میں ایک دیوی کے قدموں میں بھینٹ چڑھایا جا چکا ہے۔ ہندو سیٹھ کی کوٹھی پر چھاپا مارا جاتا ہے لیکن وہاں سے سیٹھ اور شینا کو اغوا کرنے والے خواجہ سراؤں کی لاشوں کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ سجاد رانا کو اپنی بیٹی کے قاتلوں کی تلاش تھی اور یہ تلاش اس کی "را" کے ایجنٹوں سے مڈبھیڑ کروا دیتی ہے جس کا حتمی نتیجہ اس کے قتل کی صورت میں نکلتا ہے۔ چودھری، ماہ بانو کی سجاد رانا کے گھر موجودگی کی بھنک پا کر اسے وہاں سے اغوا کروانے کی کوشش کرتا ہے لیکن یہ کوشش ناکام ہو جاتی ہے اور شہریار اپنے ڈرائیور مشاہرم خان کے مشورے پر ماہ بانو کو کاغان منتقل کر دیتا ہے۔ کاغان سے ماہ بانو مشاہرم خان کے بھائی اکرم خان اور ماں کے ساتھ ہوتے ہوئے ایک شادی میں شرکت کے لیے جاتی ہے اور وہاں کی کیمپنگ سائٹ پر ایک گورے کی ہوس کا نشانہ بننے سے بچ جاتی ہے لیکن وہ ماہ بانو کو اغوا کر لیتا ہے اور اس کارروائی میں اکرم خان مارا جاتا ہے۔ گورا جس کا نام ڈیوڈ ہے اصل میں موساد کا ایجنٹ ہے۔ وہ ماہ بانو کے بارے میں ساری معلومات حاصل کر لیتا ہے اور یہ جاننے کے بعد کہ چودھری ماہ بانو کی تلاش میں ہے، ایک منصوبہ تشکیل دیتا ہے۔ پیر آباد سے متصل جنگل کو اس کے مخصوص ماحول کی وجہ سے پوست کی کاشت کے لیے استعمال کرنا اس کے منصوبوں میں سے ایک ہے جس کے لیے وہ ماہ بانو کا لالچ دے کر چودھری کو اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ چودھری کے ظلم و جبر کی ایک نشانی فریدہ ہے۔ وہ نور پور گاؤں کے چودھری مختار کی بہن ہے۔ شہریار اور چودھری کے درمیان مخاصمت اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ چودھری ڈاکٹر ماریا نامی ایک لڑکی کے ساتھ اس کی قابل اعتراض تصویریں اتار کر اسے بلیک میل کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن ڈاکٹر ماریا کے تعاون کی وجہ سے شہریار وہ تصویریں حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور چودھری کی چال سے بچ نکلتا ہے۔ کشور آفتاب کے کہنے پر حویلی چھوڑ دیتی ہے۔ اس کا آفتاب کے دوست افضل اور اس کی بیوی کے ذریعے فرار ممکن ہوتا ہے۔ ادھر کشور کے غائب ہونے سے حویلی میں کھلبلی مچ جاتی ہے اور کشور کے غیاب پر وہاں کی ملازمائیں زیر عتاب آجاتی ہیں۔ خاص طور پر کشور کی ملازمہ خاص رانی۔ ادھر ماہ بانو اس برف زار سے فرار ہونے کی کوشش کرتی ہے اور وہاں موجود عمران نامی لڑکے کے ساتھ بھاگ نکلتی ہے مگر عمران ایک جگہ ایوالانچ کی زد میں آجاتا ہے اور اس میں دب کر اپنی جان گنوا بیٹھتا ہے۔ ماہ بانو تنہا اس برف زار میں بھٹکنے لگتی ہے۔ ادھر چودھری افتخار نیویارک سے واپس آکر بہانے سے اپنے ملازموں سے کشور کے غیاب کی تفتیش کرتا ہے اور رانی پر بے انتہا تشدد کرتا ہے مگر رانی موقع پاکر چودھری کے ریوالور سے خود کو ختم کر لیتی ہے۔ شہریار نور پور سے واپسی پر تھانے جاتا ہے جہاں ایک اتائی ڈاکٹر سے تفتیش کے دوران موت کے منہ میں چلے جانے والے بچے کا باپ مجھو مل جاتا ہے اور وہ شہریار کا احسان مند ہوتے ہوئے اسے اپنا موبائل نمبر دے کر اپنی خدمات پیش کرنے کی آفر کرتا ہے۔ ادھر مشاہرم خان ماہ بانو کی تلاش میں اس برف زار تک پہنچ جاتا ہے اور دشمنوں کا پتا لگا لیتا ہے مگر وہ اسے بھی آدبوچتے ہیں مگر مشاہرم خان موقع پا کر ان سے الجھ جاتا ہے اور اس نتیجے میں وہاں آگ لگ جاتی ہے اور پہاڑوں میں موجود دھماکا خیز مواد پھٹ پڑتا ہے جس میں کافی ہلاکتیں ہوتی ہیں۔ چودھری افتخار کو کشور کے حوالے سے ڈیوڈ کی زبانی آفتاب اور افضل سے متعلق اطلاعات ملتی ہیں کہ ان افراد کی شخصیت مشکوک ہے۔ چودھری افتخار ماسٹر آفتاب کو اغوا کرا لیتا ہے۔ شہریار کو جب اس کی اطلاع ملتی ہے تو وہ ڈیرے پر ریڈ کرتا ہے مگر آفتاب کو بازیاب نہیں کرا پاتا۔ ماہ بانو برف زار میں بھٹکتے بھٹکتے بے ہوش ہو جاتی ہے اور اس دوران اسے ایک مہربان شخص مل جاتا ہے جو کلا گیر ہوتا ہے، وہ اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ ادھر کشور کو جب آفتاب کے اغوا کی خبر ملتی ہے تو وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔ افضل اسے اسپتال لے کر جاتا ہے۔ واپسی پر جب وہ اپنے گھر پہنچتا ہے تو ایک ایسا منظر دیکھتا ہے جس کے بعد اس میں کھڑے رہنے کی ہمت نہیں رہتی۔

اس نے اپنی صحافتی زندگی میں بے شمار ایسے مناظر دیکھے تھے جو دل کو دہلا ڈالتے تھے اور وہ ایک دردمند انسان ہونے کی وجہ سے متاثر بھی ہوتا تھا لیکن یہ منظر تو ایسا تھا کہ لگتا تھا دل دھڑکنا ہی بند کر دے گا۔ سامنے بیڈ پر اس کی عزیز از جان بیوی اور معصوم بچوں کی خون میں نہائی ہوئی لاشیں پڑی تھیں۔ مہتاب نے دونوں بچوں کے گرد اپنے بازو اس طرح لپیٹ رکھے تھے جیسے انہیں اپنی آغوش میں چھپا لینا چاہتی ہو لیکن ظالم موت نے کچھ اس طرح سے وار کیا تھا کہ ماں کی آغوش بھی معصوم جانوں کو پناہ فراہم نہیں کر سکی تھی۔ افضل کچھ دیر زمین پر بے حس و حرکت بیٹھا پتھرائی ہوئی آنکھوں سے یہ منظر دیکھتا رہا پھر یک دم اس کے دل میں اس امید نے سر اٹھایا کہ شاید ان تینوں میں سے کسی کے بدن میں ابھی زندگی کی رمق باقی ہو۔ اس امید کا سہارا لے کر وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور ڈگمگاتے قدموں سے بیڈ کے قریب پہنچا۔ قریب پہنچ کر اس نے باری باری مہتاب اور دونوں بچوں کی نبضیں چیک کیں لیکن وہاں جامد خاموشی تھی اور حرارت سے عاری قدرے اکڑ جانے والے بدن گواہی دے رہے تھے کہ روح اور جسم کا رشتہ ٹوٹے کافی دیر گزر چکی ہے۔ اس کی پیاری بیوی مہتاب جسے اس نے بڑی دعاؤں کے بعد حاصل کیا تھا اور جس کی آغوش میں پلنے والے اپنے ننھے تاروں کو دیکھ دیکھ کر جیا کرتا تھا... کسی چاندنی طرح اچانک بدلی میں چھپ گئی تھی اور ساتھ ہی ننھے تاروں کو بھی لے گئی تھی۔

مہتاب اور بچوں کے جسم میں پیوست گولیاں کن ظالم ہاتھوں میں تھمے ہتھیاروں سے نکلی تھیں، وہ نہیں جانتا تھا۔ ان بے گناہوں کو اس انجام تک پہنچانے والے چودھری افتخار کے گرگے بھی ہو سکتے تھے۔ افضل نے آفتاب سے دوستی نبھاتے ہوئے چودھری کی بیٹی کو فرار کروانے کا ناقابل معافی جرم جو کیا تھا اور برسوں سے مہتاب کی تلاش میں بھٹکتا اس کا سابقہ منگیتر بھی اپنی نارسائی کا انتقام لینے کے لیے یہ حرکت کر سکتا تھا۔ دشمنوں میں سے کس دشمن نے یہ وار کیا ہے، فی الحال افضل یہ تجزیہ کرنے کے قابل نہیں تھا۔ ابھی تو وہ اپنے پیاروں کی لاشوں کے سرہانے بیٹھا زاروقطار رو رہا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جن پر اس کی کل کائنات مشتمل تھی اور اس سے اچانک ہی اس کائنات کو چھین لیا گیا تھا۔ اپنی اس تہی دامنی کا وہ جتنا بھی سوگ مناتا، کم تھا لیکن پھر اسے ہوش آگیا۔ بیوی بچوں کی لاشوں کے سرہانے بیٹھ کر رونے سے اسے کچھ نہیں ملنے والا تھا۔ یہ غم زندگی بھر کا تھا اور اسے زندگی بھر اس غم کو سینے سے لگا کر جینا تھا لیکن وقت کا تقاضا تھا کہ وہ حرکت میں آجائے اور وہ کرے جو اس وقت ضروری تھا۔ سب سے پہلے اس نے قریبی پولیس اسٹیشن فون کر کے اپنے اوپر گزرنے والے حادثے کی اطلاع دی پھر ایک قریبی دوست کا نمبر ملایا۔

"بابر! امپاز کے نام سے میری ایک عزیزہ وشی اسپتال میں ایڈمٹ ہے۔ تمہیں اسے بہت خاموشی اور رازداری کے ساتھ کسی دوسرے اسپتال شفٹ کروانا ہے۔ جتنی جلدی ہو سکے یہ کام کر دو اور پلیز خیال رکھنا کہ اس بات کا تمہارے سوا کسی دوسرے کو علم نہ ہونے پائے۔" اس نے ابھی تازہ ترین دشمنی چودھری ہی کی پالی تھی اس لیے منطقی طور پر یہی خیال آیا تھا کہ جو کچھ ہوا ہے، اس کے پیچھے چودھری کا ہاتھ ہے۔ بہت ممکن تھا کہ اس نے آفتاب کو اغوا کروانے کے بعد اس سے تشدد کے زور پر یہ حقیقت اگلوائی ہو کہ کشور، افضل کے گھر میں مقیم ہے۔ یہ جاننے کے بعد چودھری نے اپنے بندوں کو افضل کے گھر دوڑا دیا ہوگا لیکن جب انہوں نے یہاں کشور کو نہیں پایا تو طیش میں آکر مہتاب اور بچوں کو ہلاک کر ڈالا۔ ان حالات میں ضروری تھا کہ کشور کو فوری طور پر کسی دوسری جگہ منتقل کر دیا جائے ورنہ جب میڈیا پر یہ خبر آئے کہ نامور صحافی افضل کی اہلیہ اور بچوں کو رات کے کسی پہر قتل کر دیا گیا تو ممکن تھا کہ اسپتال کے عملے میں سے جن لوگوں نے اسے دیکھا تھا، وہ کسی کے سامنے اس بات کا اظہار کر دیں کہ جس وقت افضل کے بیوی بچے قتل ہوئے، وہ ایک خاتون کے ساتھ اسپتال میں تھا۔ یہ خبر کسی طرح چودھری تک بھی پہنچ سکتی تھی۔ چنانچہ کشور کی اسپتال سے منتقلی ضروری تھی۔ غم سے نڈھال افضل نے اپنی زندگی کے نازک ترین لمحات میں بھی دوستی کے تقاضوں کو یاد رکھا تھا اور دوست کی امانت کی حفاظت کا انتظام مقدم جانتے ہوئے اتنی بے غرضی کا مظاہرہ کیا تھا کہ اپنے صحافی دوست بابر کو اپنے ساتھ بیتنے والے حادثے کی اطلاع بھی نہیں دی تھی کہ مبادا وہ اس کے معاملے میں الجھ کر کشور کو اسپتال سے منتقل کروانے میں کسی تاخیر کا مرتکب ہو جائے۔

☆☆☆

مشاہرم خان جانتا تھا کہ وہ اتنے بہت سارے مسلح افراد کا تنہا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ آدمیوں کی اتنی بڑی جماعت سے نمٹنے کے لیے طاقت کے بجائے حکمت کی ضرورت تھی چنانچہ اس نے ان افراد کے کمانڈر کو قابو میں کرنے کے بعد انہیں غار میں چلے جانے پر مجبور کر دیا تھا لیکن اسے یہ بھی

معلوم تھا کہ جیسے ہی وہ یہاں سے نکلنے کی کوشش کرے گا، وہ لوگ بھی اس کے پیچھے تعاقب میں نکل کھڑے ہوں گے اور ظاہر ہے وہ اتنے بہت سارے لوگ مل کر اسے آسانی سے چھاپ سکتے تھے۔ انہیں اپنے تعاقب میں آنے سے روکنے کے لیے اس نے یہ ترکیب سوچی تھی کہ غار کے دہانے کے آگے آگ لگا دے گا تاکہ اندر موجود لوگ باہر نہ نکل سکیں لیکن نائب کمانڈر عین وقت پر سرکشی پر اتر آیا اور اس نے کمانڈر کی زندگی کی پروا نہ کرتے ہوئے مشابرم خان کے خلاف ہتھیار اٹھا لیا۔ مجبوراً مشابرم خان کو بھی فوراً ایکشن لینا پڑا۔ اس کی چلائی گئی گولیوں میں سے ایک نائب کمانڈر کو لگی جبکہ دوسری نے مٹی کے تیل کے کین میں سوراخ کر دیا۔ فوراً ہی وہاں آگ بھڑک اٹھی۔ اس پر سے نائب کمانڈر نے اس پر پھینکنے کے لیے جو ہینڈ گرینیڈ نکالا تھا، وہ بھی پھٹ گیا۔ گرینیڈ پھٹنے سے آگ اور بھی شدت سے بھڑک اٹھی۔ ادھر کین سے نکل کر بہنے والے تیل نے غار کے اندر تک راستہ بنا لیا اور اس آگ اور تیل نے مل کر غار میں ذخیرہ شدہ ہتھیاروں اور دھماکہ خیز مواد تک رسائی حاصل کر لی۔ نتیجہ پے در پے دھماکوں کی صورت میں نکلا۔ ان دھماکوں نے پہاڑوں کو تھرا کر رکھ دیا اور ٹوٹے ہوئے چٹانوں کے ٹکڑے اور پتھر ادھر اُدھر اڑنے لگے۔ غار میں موجود بہت سے افراد تو آگ کی لپیٹ میں آ چکے تھے۔ ان میں سے چند جو کسی نہ کسی طرح بچ کر نکلنے میں کامیاب ہوئے، وہ ان اڑتے ہوئے پتھروں کی زد میں آ گئے۔ مشابرم خان خود ہینڈ گرینیڈ پھٹتے ہی کمانڈر کی گردن ایک جھٹکے سے توڑ کر بھاگ پڑا تھا لیکن اسے زیادہ دور تک جانے کا موقع نہیں ملا اور ایک نکیلا پتھر آ کر اس کی کنپٹی سے ٹکرایا۔ پتھر کی ضرب اتنی زوردار تھی کہ اس کے حواس جواب دے گئے اور وہ ایک قدم بھی مزید آگے بڑھانے میں ناکام ہو کر زمین پر آ رہا۔ زمین پر گرنے کے بعد اس کی آنکھوں نے جو آخری منظر دیکھا، وہ قیامت کے منظر کے سوا کچھ نہیں تھا۔ دھماکوں سے اڑتے پہاڑ کے ٹکڑے اور پناہ کے لیے چیختے پکارتے انسانوں کے لیے کہیں کوئی جائے پناہ نہیں تھی۔ تمام تر صورتِ حال قیامت کی بیان کردہ نشانیوں ہی کی تو منظر کشی کر رہی تھی۔

زخمی مشابرم خان کی آنکھیں چند لمحوں سے زیادہ یہ منظر نہیں دیکھ سکیں اور اس کے دماغ پر تاریکی کی چادر تن گئی۔ اس تاریکی میں ڈوبتے ہوئے اس کے ذہن میں یہی خیال آیا تھا کہ اس کا آخری وقت آ چکا ہے اور اب جب بھی اس کی آنکھ کھلے گی تو وہ دوسرے جہان میں ہو گا مگر اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ معلوم نہیں کتنے گھنٹوں کے بعد جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ اسی جگہ موجود تھا اور دو افراد اسے اسٹریچر پر ڈال کر ایک ہیلی کاپٹر کی طرف لے جا رہے تھے۔ ہیلی کاپٹر کی مخصوص رنگت اور اسٹریچر اٹھانے والے آدمیوں کا یونیفارم دیکھ کر اس نے جان لیا کہ پاکستان آرمی وہاں پہنچ چکی ہے۔ ظاہر ہے وہاں جتنے زوردار دھماکے گونجے تھے اس کے بعد آرمی والوں کا متوجہ نہ ہونا ممکن نہیں تھا۔ انہیں اس جگہ پہنچ کر کارروائی شروع کرنے میں کافی وقت تو ضرور لگا ہو گا لیکن بہرحال اب وہ وہاں موجود تھے اور مشابرم خان کی آنکھیں دیکھ سکتی تھیں کہ وردی پوش فوج کے جوان اِدھر اُدھر پھیلے بری طرح مصروف تھے۔ وہ کوشش کر رہے تھے کہ زندہ بچ جانے والے افراد کو طبی امداد فراہم کی جا سکے لیکن وہاں مشابرم خان جیسے خوش نصیب شاذ و نادر ہی تھے۔ ان میں سے بیشتر کو موت نے آدبوچا تھا۔ کچھ آگ میں جل کر مرے تھے، کچھ پتھروں کی زد میں آئے تھے اور کچھ جو صرف زخمی ہوئے تھے دھماکے کی وجہ سے اپنی جگہ چھوڑ دینے والی برف تلے آ کر دب گئے تھے۔ مشابرم خان کی خوش نصیبی تھی کہ وہ صرف زخمی ہوا تھا اور پتھروں اور برف میں دبنے سے بچ گیا تھا۔ اسے فرسٹ ایڈ دینے والوں نے اس کے زخم پر پٹی باندھ دی تھی اور وہ جو اپنا آخری وقت سمجھ رہا تھا، ایک اسٹریچر پر لدا زندہ سلامت ہیلی کاپٹر میں سوار تھا۔ اس ہیلی کاپٹر میں اس کے سوا تین زخمی اور بھی تھے۔ اس کے علاوہ ایک ڈاکٹر بھی تھا جو زخمیوں کی دیکھ بھال میں مصروف تھا۔ مشابرم خان کو ہیلی کاپٹر میں سوار کرنے کے بعد اس کا دروازہ بند کر دیا گیا اور ذرا دیر بعد ہیلی کاپٹر حرکت میں آ گیا۔ متحرک ہیلی کاپٹر اپنی منزل پر پہنچتا، اس سے قبل ہی مشابرم خان پر ایک بار پھر غنودگی سی چھا گئی۔ دوبارہ اس کی آنکھ کھلی تو وہ کسی اسپتال میں تھا۔

''اسے ہوش آ گیا ہے۔ میجر صاحب کو اطلاع دے دو۔'' اسے آنکھیں کھول کر دیکھتا پا کر وہاں موجود ڈاکٹر نے کسی سے کہا اور خود اس کا معائنہ کرنے لگا۔

''تم کیسا محسوس کر رہے ہو مسٹر؟'' معائنے کے دوران میں اس نے مشابرم خان سے سوال کیا۔

''میرے سارے جسم میں شدید درد ہے، خاص طور پر سر تو درد سے پھٹا جا رہا ہے۔'' مشابرم خان نے اپنی کیفیت سے آگاہ کیا۔

''تمہیں کافی چوٹیں آئی ہیں اس لیے درد تو ہو گا۔ شکر کرو کہ تمہاری ہڈیاں سلامت ہیں ورنہ تمہارے ساتھ جو دوسرے زخمی لائے گئے ہیں، ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں

جس کی کوئی ہڈی نہ ٹوٹی ہو، سب کے سب شدید زخمی ہیں۔ بہرحال، میں تمہیں پین کلر لگا رہا ہوں اس سے تم اپنے درد میں کافی کمی محسوس کرو گے۔'' ڈاکٹر نے اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے اپنے قریب کھڑی نرس سے انجکشن تیار کرنے کو کہا۔ ڈاکٹر انجکشن لگا کر فارغ ہوا ہی تھا کہ قدموں کی آواز ابھری اور سادہ لباس میں ملبوس دو افراد کمرے میں داخل ہوئے۔ سادہ لباس میں ہونے کے باوجود ان دونوں کا مخصوص ہیئر اسٹائل چغلی کھا رہا تھا کہ ان کا تعلق فوج سے ہے۔ ان دونوں کے اندر داخل ہوتے ہی ڈاکٹر اور نرس باہر نکل گئے جبکہ ان دونوں نے مشابرم خان کے بیڈ کے ساتھ رکھی کرسیاں سنبھال لیں۔

''تمہارا نام؟'' ان میں سے ایک نے جس کے چہرے پر نسبتاً زیادہ رعب و دبدبہ محسوس ہو رہا تھا، مشابرم خان کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے گمبھیر لہجے میں پوچھا جبکہ اس کا ساتھی قلم اور نوٹ پیڈ سنبھالے یقیناً اس کے جوابات نوٹ کرنے کے لیے تیار تھا۔

''مشابرم خان۔''

''کہاں کے رہنے والے ہو؟'' فوراً ہی دوسرا سوال داغا گیا۔

''کاغذ کے لیکن کافی عرصے سے ملازمت کے سلسلے میں پنجاب میں رہ رہا ہوں۔'' مشابرم خان جانتا تھا کہ وہ جو اتنا بڑا حادثہ پیش آ چکا ہے، اس کے بعد یہ تفتیش لازمی ہے اس لیے سب کچھ سچ بتا دینے کا فیصلہ کرتے ہوئے اس آدمی کے سوالوں کا جو اس کے اندازے کے مطابق میجر تھا، جواب دینے لگا۔

''کہاں اور کس قسم کی ملازمت کرتے ہو؟'' سوالات کا سلسلہ آگے بڑھا۔

''میں ڈرائیور ہوں اور آج کل اسسٹنٹ کمشنر شہریار عادل کے ڈرائیور کے طور پر کام کر رہا ہوں۔'' اس کا جواب سن کر میجر نے اس کی مدتِ ملازمت، تعیناتی کے اضلاع اور کام کی نوعیت کے متعلق متعدد سوالات کر ڈالے۔ مشابرم خان ہر سوال کا جواب سچائی کے ساتھ دیتا رہا۔

''ویل مسٹر مشابرم خان...'' میجر نے کرسی پر اپنا انداز نشست ذرا سا تبدیل کیا۔ ''اب یہ بتاؤ کہ تم یہاں کس سلسلے میں آئے تھے اور پھر پہاڑوں پر اس جگہ کیسے جا پہنچے جہاں سے آرمی والے تمہیں اٹھا کر لائے ہیں؟'' مشابرم خان کا پورا پس منظر جان لینے کے بعد وہ اصل واقعات کی تحقیق کی طرف آیا۔

''میں یہاں اپنے بھائی کے قاتلوں کی تلاش میں آیا تھا اور ان قاتلوں کو تلاش کرتا کرتا وہاں پہنچ گیا۔''

''مطلب؟ ذرا کھل کر اور تفصیل سے ساری بات بتاؤ؟'' میجر نے اسے حکم دیا۔

''یہ تفصیل تھوڑی سی طویل ہے سر! بہرحال میں آپ کو ذرا مختصر کر کے سنانے کی کوشش کرتا ہوں۔'' وہ میجر کو اپنی ملازمت، شہریار کی فطرت، اس کے اور چودھری کے درمیان جاری مخاصمت سے لے کر ماہ بانو کے قصے سمیت ایک ایک بات بتاتا چلا گیا۔ اس نے اکرم خان کے قتل اور ماہ بانو کے اغوا کے بعد اپنے بلتستان پہنچنے سے لے کر مجرموں کی تلاش میں کی جانے والی اپنی ساری جدوجہد کی تفصیل بھی کہہ سنائی۔ میجر نہایت سنجیدگی اور غور سے اس کی داستان سنتا رہا۔ اس کی ایکسرے جیسی نگاہیں مشابرم خان کے چہرے پر یوں گڑی ہوئی تھیں جیسے وہ اس کے اندر تک جھانک کر سب سچ جھوٹ جان لینے کا خواہش مند ہو۔ اس کا ساتھی البتہ بغیر نظر اٹھائے تیزی کے ساتھ نوٹس لینے میں مصروف تھا۔ مشابرم خان نے دیکھا کہ اس شخص کے پاس قلم اور نوٹ پیڈ کے علاوہ ایک چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر بھی موجود ہے جس میں یقینی طور پر اس کا ہر ہر لفظ ریکارڈ ہو رہا تھا۔ وہ کسی بھی قسم کا خوف دل میں لائے بغیر سچ بتاتا رہا کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی ذرا سی غلط بیانی سے ان عناصر کے خلاف تحقیقات میں کوئی رکاوٹ کھڑی ہو جو پہاڑوں میں موجود خفیہ پناہ گاہ میں یقینی طور پر وطن دشمن سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ اس سے قبل اس نے ذاتی طور پر بھائی کا انتقام لینے کے چکر میں پولیس والوں کو اس معاملے میں ملوث نہیں کیا تھا لیکن اب بات دوسری تھی۔ پولیس کے مقابلے میں اسے آرمی کی کارکردگی پر زیادہ بھروسا تھا اور اس کے سینے میں جلتی انتقام کی آگ بھی سرد پڑ چکی تھی۔ اکرم خان کے وجود میں گولیاں اتارنے والا شخص کون تھا، یہ تو اسے نہیں معلوم تھا لیکن وہ یہ جانتا تھا کہ اس نے اس جرم میں ملوث پورے گروہ کو ہی نادانستہ طور پر ہی سہی اذیت ناک موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ بھڑکتی آگ اور پتھروں کی بارش کی زد میں آ کر مرنے والے اس سارے دہشت گرد گروہ کے افراد نے یقیناً مرتے وقت ایک بار تو ضرور یہ سوچا ہو گا کہ انہیں قیامت کی گھڑیوں نے گھیر لیا ہے۔ وہ سب جوان پہاڑوں پر بپتا تھا کسی آسمانی عذاب سے کم تو نہیں تھا اور آسمانی عذاب کبھی کسی مومن و مجاہد پر نہیں آیا کرتا۔ تو وہ سب جو اس عذاب کی زد میں آ کر مارے گئے تھے... کیا مرتے وقت انہیں یہ

www.pkdigest.com

ادراک نہ ہوا ہوگا کہ وہ گمراہی میں مبتلا تھے؟

☆☆☆

''سوری سر! لیکن میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ آپ نے جذبات میں آکر چودھری افتخار کے ڈیرے پر ریڈ کروا کر بہت بڑی غلطی کی۔ آپ کو پہلے ہی سمجھ لینا چاہیے تھا کہ اس طرح پولیس ریڈ کروانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ پولیس اور چودھری کا گٹھ جوڑ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ چودھری کے کسی چیلے نے ریڈ سے پہلے ہی اسے اطلاع دے دی ہوگی چنانچہ اس نے پولیس کے پہنچنے سے پہلے ہی آفتاب کو وہاں سے ہٹا لیا۔ اس ریڈ سے آپ کے ہاتھ ناکامی اور چودھری کی مخالفت کے سوا کچھ نہیں آیا۔'' وہ ڈیرے پر ناکام ریڈ کے بعد واپس اپنے دفتر پہنچا تو عبدالمنان نے سارا واقعہ جاننے کے بعد نہایت صاف گوئی سے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ اس کی یہ صاف گوئی اس اعتماد اور آزادی کا نتیجہ تھی جو شہریار کی طرف سے اسے حاصل تھی۔ اگر شہریار کوئی روایتی افسر ہوتا تو وہ ہرگز اس کے سامنے اتنی صاف گوئی کا مظاہرہ نہیں کر سکتا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کا آفیسر سچ سننے اور اپنی غلطی قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ جس وقت شہریار کے پاس فیب کا فون آیا اور اس نے ڈیرے پر ریڈ کا فیصلہ کیا عبدالمنان دفتر میں موجود نہیں تھا۔ وہ اپنے کسی نجی کام کے سلسلے میں دفتر سے چند گھنٹوں کی چھٹی لے کر گیا ہوا تھا۔ واپس آیا تو سارا قصہ معلوم ہوا جسے جان کر اسے سخت افسوس ہوا۔

''تم صحیح کہہ رہے ہو۔ میں نے صرف اس بنیاد پر کہ اس تانگے والے اکو نے چودھری کے بندوں کو آفتاب کو ڈیرے پر لے جاتے ہوئے دیکھا ہے، پورے اعتماد سے ڈیرے پر ریڈ کروا دیا۔ اس وقت میں یہ بات بھول گیا تھا کہ پولیس والوں میں بھی چودھری کے مخبر موجود ہیں۔ اصل میں تم جانتے ہی ہو کہ میں آفتاب کو اس کی ہمت اور لگن کی وجہ سے کتنا پسند کرتا ہوں۔ وہ میری ٹیم کا بہت اہم کارکن ہے جسے میں کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتا۔'' اس نے اپنی غلطی کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ہوئے اس کی توجیہہ بھی پیش کی۔

''یہ بات تو میں بھی اچھی طرح سمجھتا ہوں سر! ہم یقیناً اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ اگر ہم نے آفتاب کو کھو دیا تو اس جیسا کوئی دوسرا بندہ ملنا بہت مشکل ہے۔ وہ اس وقت بھی پیرآباد میں چودھری کے خلاف ڈٹا ہوا تھا جب اسے آپ کی سپورٹ حاصل نہیں تھی بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ پیرآباد کا اسکول اگر کھلا رہا تو اس کے پیچھے صرف اور صرف آفتاب کا حوصلہ اور مستقل مزاجی تھی۔ میں خود اس کے اغوا کا سن کر بہت پریشان ہوں اور ہر حال میں اسے چودھری کے چنگل سے نکالنا چاہتا ہوں لیکن اس مقصد کے لیے ہمیں قانونی طریقۂ کار اختیار کرنے کے بجائے کوئی اور راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔''

''مطلب...؟'' شہریار اس کی بات سن کر چونکا۔

''مطلب یہ کہ جب گھی سیدھی انگلیوں سے نہ نکلے تو انگلیاں ٹیڑھی کرنی پڑتی ہیں۔ آپ نے ڈیرے پر پولیس ریڈ کروا کر دیکھ لیا، اس ریڈ کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ اب ہم ایسا کوئی ذریعہ استعمال کریں گے کہ کام صفائی سے ہو جائے اور کوئی چودھری کو قبل از وقت خبردار کرنے والا بھی نہ ہو۔'' عبدالمنان کا انداز معنی خیز تھا۔

''پہیلیاں مت بجھواؤ... کھل کر بتاؤ کہ تمہارے ذہن میں کیا ہے؟'' شہریار نے اسے ٹوکا۔

''آپ کو جگو تو یاد ہوگا سر! اس بچے کا باپ جو نور پور جاتے ہوئے ہمیں شدید بیمار حالت میں ملا تھا اور آپ نے اپنا نور پور جانا کینسل کر کے اس بچے کو اپنی گاڑی میں فوری طور پر اسپتال پہنچانے کے ساتھ ساتھ اس اتائی ڈاکٹر کو بھی گرفتار کروا ڈالا تھا جس کی غلط دوا نے بچے کو اس حال کو پہنچایا تھا۔ آپ کے اس عمل سے بچے کا باپ جگو آپ کا کتنا احسان مند ہوا تھا اور اس نے آپ کو اپنا فون نمبر دیتے ہوئے کہا تھا کہ آپ جب چاہیں اسے کسی بھی کام کے لیے یاد کر سکتے ہیں۔ تو میرا خیال ہے ہم آفتاب کی بازیابی کے لیے جگو کی خدمات حاصل کریں۔ مجھے پوری امید ہے کہ وہ یہ کارنامہ انجام دے دے گا۔'' عبدالمنان نے اپنی بات کی وضاحت کی۔

''میرا تو جہاں تک اندازہ ہے جگو کوئی عام سا غنڈا ہے جو چودھری سے ٹکر لینے کی ہمت نہیں کرے گا۔'' عبدالمنان کا منصوبہ سن کر اس نے اعتراض کیا۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے سر! جب جگو نے اپنا فون نمبر آپ کو دے کر اپنی خدمات کی پیشکش کی تھی تو میں نے اسے کام کا بندہ جان کر اس کے بارے میں معلومات حاصل کر لی تھیں۔ وہ اتنا معمولی غنڈا بھی نہیں ہے۔ اس کی ایک بڑی سیاسی جماعت کے ساتھ وابستگی ہے جس کے لیے کام کرنے والے غنڈوں میں جگو کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ جگو چاہے تو اپنے بچے اور بیوی کو شہر میں رکھ کر انہیں بہت اچھی زندگی دے سکتا ہے لیکن اس نے شہر میں ایک اور شادی کی ہوئی ہے اور اپنی طرح دار شہری بیوی کی وجہ سے گاؤں والی کو شہر نہیں لے جاتا ہے۔'' عبدالمنان نے اسے جو رپورٹ پیش کی، اسے سن کر وہ حیران رہ گیا۔ اس کا پی اے واقعی ایک بیدار مغز

آدمی تھا جو موقع بے موقع اس کے کام آ کر اس پر اپنی اہمیت ثابت کر دیتا تھا۔

''اگر تم کہتے ہو تو جگو سے رابطہ کر کے دیکھ لیتے ہیں۔'' شہریار نے گویا اسے اجازت دی۔ اس کی طرف سے اجازت ملتے ہی عبدالمنان جگو سے رابطہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ دو تین گھنٹیوں کے بعد دوسری طرف سے کال ریسیو کر لی گئی اور جگو کی سخت آواز سنائی دی۔

''میں اسسٹنٹ کمشنر شہریار عادل کا پی اے عبدالمنان بات کر رہا ہوں۔ آپ مسٹر جگو ہی ہیں نا؟'' عبدالمنان نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''بالکل جناب! فرمایئے آپ نے کیسے مجھے یاد کیا؟ اپنے اے سی صاحب تو خیریت سے ہیں نا؟'' تعارف سنتے ہی جگو کا سخت لہجہ خوشگوار ہو گیا اور وہ بڑی عاجزی سے پوچھنے لگا۔

''الحمدللہ اے سی صاحب بالکل ٹھیک ہیں بس ایک کام کے سلسلے میں ہمیں تمہارے تعاون کی ضرورت تھی اسی لیے انہوں نے تمہیں یاد کیا ہے۔''

''بالکل جناب! یہ تو میری خوش نصیبی ہے کہ اے سی صاحب نے مجھے یہ موقع دیا۔ میں ان کے کام آ کر دلی خوشی محسوس کروں گا۔'' جگو نے خوش دلی سے جواب دیا۔

''تو ایسا کرو تم اے سی صاحب سے ہی بات کر لو۔'' عبدالمنان نے فون شہریار کے ہاتھ میں تھما دیا۔

''سلام سر جی! حکم کریں کہ کیا کام ہے؟ جگو اپنے وعدے کے مطابق آپ کی ہر خدمت انجام دینے کو تیار ہے۔'' اس کے ''ہیلو'' بولتے ہی جگو نے قدرے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔

''سوچ لو جگو، کام ذرا مشکل ہے اور جس بندے کے خلاف کرنا ہے اس سے دشمنی مول لینے کی جرأت شاید تم میں نہ ہو۔'' اصل بات کرنے سے پہلے شہریار نے اسے جانچ لینا مناسب سمجھا۔

''دشمنیوں سے جگو نہیں ڈرتا سر جی! جگو پہلے ہی اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھرتا ہے اس لیے اگر اس کا ایک دشمن ہور بھی بن گیا تو پروا نہیں۔ آپ بس حکم کرو کہ کس کے خلاف کارروائی ڈالنی ہے۔'' جگو کے لہجے سے ایسا لگتا تھا کہ اس نے باقاعدہ سینہ ٹھونک کر یہ بات کی ہوگی۔ شہریار کے ہونٹوں پر اس کے انداز پر دھیمی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''اس بندے کا نام ہے چودھری افتخار عالم شاہ...'' آخر اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں جگو کو بتا ہی دیا۔ دوسری طرف پل بھر کے لیے خاموشی چھائی پھر جگو کی مضبوط لہجے والی آواز سنائی دی۔

''حکم کریں سر کہ چودھری کا کیا کرنا ہے؟ اگر آپ کو اس کی لاش دیکھنی ہے تو بھی میں اس کا بندوبست کر دوں گا۔''

''ایسا کچھ نہیں کرنا ہے۔ میرا ایک اہم بندہ چودھری نے اغوا کروا لیا ہے۔ اس بندے کو چودھری کے چنگل سے چھڑوانا ہے۔'' شہریار نے اسے بتایا۔

''بندے کا حدود اربع بتائیں؟'' جگو نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''اس کا نام آفتاب ہے۔ پیرآباد کے اسکول میں پڑھاتا ہے۔ چودھری نے اپنے بندوں کے ذریعے اسے اغوا کروایا ہے اور ایک عینی شاہد کے مطابق اغوا کے بعد اسے چودھری کے ڈیرے پر لے جایا گیا تھا لیکن ہم پولیس ریڈ کروا کر بھی ڈیرے سے اسے بازیافت نہیں کروا سکے۔ تمہیں اس بندے کا پتا بھی معلوم کرنا ہے اور اسے آزاد بھی کروانا ہے۔ کیا تم یہ کام کر لو گے؟'' شہریار نے اسے مختصراً بتاتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔

''تسی فکر نہ کرو سر جی! رب نے چاہا تو آج رات ہی آپ کا بندہ چودھری کی قید سے آزاد ہو جائے گا۔ اگر کچھ دیر بھی لگی تو چوبیس گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں لوں گا میں آپ سے۔'' جگو نے دعویٰ کیا۔ اس کا اعتماد بتا رہا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اس کے مطابق عمل بھی کرے گا۔ اس سے بات کر کے شہریار نے فون بند کیا تو اس کے دل کو ایک اطمینان سا تھا کہ اگر آفتاب زندہ ہے تو جگو اسے چودھری کی قید سے ضرور آزاد کروا لائے گا۔

''مجھے لگتا ہے کہ میں نے تمہارے مشورے پر عمل کر کے اچھا کیا ہے۔ یہ جگو کافی کام کا بندہ لگتا ہے اگر اس میں صلاحیت نہیں ہوتی تو چودھری کا نام سن کر ہی ہمت چھوڑ دیتا اور پیچھے ہٹ جاتا لیکن اس نے دعویٰ کیا ہے کہ وہ یہ کام ضرور کروا لے گا۔ اب مجھے آفتاب کی طرف سے اچھی امید بندھ گئی ہے۔'' فون بند کرنے کے بعد اس نے عبدالمنان کی طرف دیکھتے ہوئے تبصرہ کیا۔

''انشاء اللہ سر! اگر اللہ کو منظور ہوا تو جگو کی طرف سے ہمیں کامیابی ہی کی اطلاع ملے گی۔'' عبدالمنان نے بھی خوش امیدی کا اظہار کیا۔ ابھی ان دونوں کے درمیان اس موضوع پر گفتگو جاری ہی تھی کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

عبدالمنان نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف آفتاب کا دوست افضل تھا اور شہریار سے بات کرنے کا خواہش مند تھا۔ شہریار کی طرف سے رضامندی پا کر عبدالمنان نے ریسیور

www.pkdigest.com

اسے تھما دیا۔ افضل نے پہلے ایک صفائی اور آفتاب کے دوست کی حیثیت سے شہریار سے اپنا تعارف کروایا پھر اسے آفتاب کے اغوا والے معاملے سے آگاہ کیا۔

''مجھے اس واقعے کا علم ہے اور میں پوری کوشش کر رہا ہوں کہ کسی طرح آفتاب کو بازیافت کروا لیا جائے۔'' شہریار نے اسے جواب دیا اور ساتھ ہی ڈیرے پر پولیس ریڈ کے بارے میں بھی بتا دیا۔ اس ناکام پولیس ریڈ کی اطلاع دینے کے ساتھ ساتھ اس نے افضل کو یقین دہانی کروائی کہ وہ اپنی پہلی کوشش میں ناکامی کے بعد آرام سے نہیں بیٹھے گا اور آفتاب کی رہائی کے سلسلے میں ہر ممکن اقدامات کرے گا۔ افضل جانے مطمئن ہوا یا نہیں تاہم اس نے شہریار کے اس تعاون کے لیے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فون بند کر دیا۔

اس فون کال سے فارغ ہونے کے بعد شہریار نے دفتر سے اٹھنے کا فیصلہ کیا۔ آج ویسے ہی وہ لوگ معمول سے کافی زیادہ وقت دفتر میں ٹھہر گئے تھے۔ دفتر سے اپنے ٹھکانے پہنچ کر وہ ابھی فریش ہی ہوا تھا کہ آئی جی مختار مراد کی کال آ گئی۔

''تم بہت غیر محتاط ہوتے جا رہے ہو شہریار! آج تم نے چودھری کے خلاف جو کارروائی کی اسے میں محض جذباتیت کے سوا کچھ نہیں کہوں گا۔'' سلام دعا اور خیر خیریت کے بعد انہوں نے اسے تنبیہہ کرنے والے لہجے میں ٹوکا۔

''تو آپ تک اطلاع پہنچ گئی ہے'' اس نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے سر صوفے کی پشت سے ٹکایا۔

''چودھری نے خود مجھے کال کی تھی اور تمہارے رویے کی شکایت کرتے ہوئے مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں تمہیں آئندہ اس طرح کی کوئی حماقت کرنے سے روکوں۔'' انہوں نے کچھ ناراض سے لہجے میں بتایا۔

''وہ حماقت نہیں، میرا فرض تھا۔ چودھری نے ایک پُرامن شہری کو اپنی غنڈا گردی کے بل پر غائب کروا لا ہے اور ہر ایک مجھے یہ احساس دلا رہا ہے کہ مجھے اس غنڈا گردی کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لینا چاہیے تھا۔ آپ بتائیں کہ یہ کہاں کا انصاف ہے؟ ایک شخص دن دہاڑے جرم کرتا ہے اور ہم قانون نافذ کرنے والے اداروں سے تعلق رکھنے کے باوجود اس کے خلاف کوئی کارروائی کرنے سے صرف اس لیے ڈرتے ہیں کہ کہیں اس کا مزاج برہم نہ ہو جائے۔ میں اس ناانصافی کو نہیں مانتا۔ اگر میرے پاس چودھری سے لے کر اس کے ایک معمولی مزارع تک کسی کے خلاف بھی کمپلین آئے گی تو میں ضرور ایکشن لوں گا۔'' وہ یک دم ہی جھنجلاہٹ کا شکار ہو گیا تھا اس لیے مختار مراد کے سامنے اپنے دلی جذبات کا اظہار کرتا چلا گیا۔

''تم غلط نہیں ہو لیکن یہاں سسٹم ہی کچھ ایسا ہے کہ صحیح آدمی کو ہی زیادہ احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے۔ بہرحال جو ہوا سو ہوا۔ میں نے چودھری کے سامنے تو تمہاری ہی حمایت کی تھی لیکن ایک بزرگ کی حیثیت سے میں تمہیں یہ نصیحت ضرور کروں گا کہ آئندہ محتاط رہنا اور ایسا کوئی قدم اٹھانے سے پہلے مجھ سے مشورہ لے لینا۔'' مختار مراد نے اس کا موڈ دیکھتے ہوئے بات کو زیادہ طول نہیں دیا اور نرم لہجے میں بولا۔

''سوری انکل! میں کچھ جذباتی ہو گیا تھا۔ اصل میں اغوا ہونے والا اسکول ماسٹر آفتاب مجھے بہت عزیز ہے اس لیے میں تھوڑی کافی ڈسٹرب ہوں۔'' ان کے نرم لہجے پر اسے اپنے رویے کا احساس ہوا تو فوراً ان سے معذرت کی۔

''کوئی بات نہیں۔ جوانی میں آدمی ایسا ہی جذباتی ہوتا ہے لیکن ہم بزرگوں کا فرض ہے کہ چھوٹوں کو جوش سے زیادہ ہوش سے کام لینے کی نصیحت کرتے رہیں۔'' انہوں نے گویا بات ہی ختم کر دی۔ ان سے بات کرنے کے بعد شہریار خلافِ معمول جلد اپنے بیڈ روم میں چلا گیا۔ آج اس نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا اور صرف ایک گلاس دودھ پر اکتفا کیا تھا۔ بیڈ روم میں آ کر وہ فوری طور پر سونے کے بجائے ایک کتاب کا مطالعہ کرنے لگا۔ مکمل ذہنی یکسوئی حاصل نہ ہونے کے باوجود اس کا ذہن مطالعے کی وجہ سے کچھ نہ کچھ بٹ ہی گیا۔ اس لیے جب بیڈ روم کی مکمل خاموشی میں اس کے موبائل کی گھنٹی بجی تو وہ ذرا سا چونک گیا۔ موبائل اٹھا کر اس نے اسکرین پر آنے والا نام دیکھا۔ جگو کی طرف سے کال کی جا رہی تھی۔ اس نے جگو کو آج ہی کسی ایمرجنسی کی صورت میں رابطے کے لیے اپنا نمبر نوٹ کروایا تھا اور خود اس کا نمبر اپنے موبائل میں فیڈ کر لیا تھا۔ اب جو جگو نے کال کی تو اس کا دل دھڑک اٹھا۔

''ہیلو! ہاں جگو کیا بات ہے؟'' اس کا مٹن پش کرتے ہوئے اس نے جگو سے دریافت کیا۔

''آپ کو اس وقت ڈسٹرب کرنے پر معافی چاہتا ہوں سر مجھے آپ سے یہ کہنا تھا کہ میں نے کارروائی شروع کر دی ہے۔ اللہ نے چاہا تو آج رات ہی کچھ ہو جائے گا۔ آپ سے بس اتنی درخواست ہے کہ پولیس والوں کو ہدایت کر دیجیے گا کہ اگر پیر آباد سے کسی ہنگامے کی اطلاع آئے تو وہ اپنے کان بند کر کے بیٹھ جائیں۔ باقی آپ کا کام میرے ذمے ہے۔ وہ ہر حال میں ہو جائے گا۔''

''میں یہ کام کر دوں گا لیکن تم خیال رکھنا کہ کسی بے

گناہ انسانی جان کو نقصان نہ پہنچے۔'' شہریار نے مضطرب ہو کر اسے نصیحت کی۔

''آپ فکر نہ کریں سر جی! ایسا کچھ نہیں ہوگا۔'' جگو نے اسے تسلی دی۔ اس سے بات کرنے کے بعد شہریار نے ایس پی کا نمبر ڈائل کیا اور اسے احکامات جاری کیے۔ ایسی قسم کے احکامات کا ملنا ایس پی کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اپنی مدتِ ملازمت میں اس نے بہت کچھ دیکھا تھا چنانچہ شہریار کو یقین دہانی کروائی کہ اس کے حکم پر عمل ہوگا۔ دوسری طرف شہریار سوچ رہا تھا کہ آخر کار اسے سسٹم کے خلاف لڑنے کے لیے خود بھی ایک ایسا طریقہ اختیار کرنے پر مجبور ہونا ہی پڑا جو کسی بھی طرح اس کے لیے پسندیدہ نہیں تھا لیکن جو جنگ اسے لڑنی پڑ رہی تھی، اس میں کسی اصول پر عمل ہی کب کیا جا رہا تھا جو وہ اپنا طرزِ عمل تبدیل کرنے پر مجبور نہ ہوتا۔ عبدالمنان نے بھی تو اسے انگلی ٹیڑھی کرنے کا ہی مشورہ دیا تھا چنانچہ اب وہ اس مشورے پر عمل پیرا تھا۔

☆☆☆

زخموں سے چور آفتاب فرش پر پڑا سسک رہا تھا۔ اسے اتنی بُری طرح تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا کہ اس کے جسم کا کوئی حصہ زخم سے خالی نظر نہیں آ رہا تھا۔ مارنے والوں نے اسے ہی بھرکس مارا تھا اور کمال یہ تھا کہ اس تشدد کے بدلے میں وہ اس سے کچھ پوچھ بھی نہیں رہے تھے۔ ان میں سے کسی کی زبان پر یہ مطالبہ نہیں آیا تھا کہ وہ انہیں کشور کا پتا بتا دے۔ ان کے سوال نہ کرنے نے آفتاب کو مشکل سے بچا لیا تھا۔ یوں تو وہ کشور کا پتا کسی کو بتانے کا ارادہ بھی نہیں رکھتا تھا لیکن جس طرح کا تشدد اس پر کیا گیا تھا، وہ کوئی معمولی نہیں تھا۔ کیا خبر کہ وہ اس تشدد کے دوران کسی مقام پر اپنی برداشت کی حد سے گزر کر زبان کھول بیٹھتا لیکن جب سوال ہی نہیں ہوا تھا تو جواب دینے کی ضرورت ہی کیسے پیش آتی؟ مارنے والوں کے انداز سے اسے یہی اندازہ ہوا تھا کہ وہ چودھری کے حکم پر اس سے کچھ اگلوانے کے لیے نہیں بلکہ اسے اس کے جرم کی سزا دینے کے لیے اذیت رسانی کر رہے ہیں اور یہ اذیت تو بہرحال اسے سہنی ہی تھی۔ چودھری افتخار عالم شاہ کی بیٹی کی محبت کو قبول کرتے ہوئے اسے اپنے اس انجام کو دھیان میں رکھنا پڑا تھا۔ وہ شروع سے جانتا تھا کہ جب بھی چودھری پر اس کی اور کشور کی محبت کا راز آشکار ہوا تو وہ ان دونوں پر قہر بن کر ٹوٹ پڑے گا۔ آج وہ چودھری کے اس قہر کو سہہ رہا تھا لیکن اسے خوشی تھی کہ کشور اپنے باپ کے ہاتھ نہیں لگ سکی ورنہ شاید اب تک وہ زندہ نہ ہوتی اور چودھری خود اپنے ہاتھ سے اسے موت کے گھاٹ اتار دیتا۔ آفتاب کو اپنے اب تک زندہ ہونے پر بھی کسی قسم کی خوش فہمی نہیں تھی۔ اسے معلوم تھا کہ خود اس کا انجام بھی موت ہی ہے لیکن شاید چودھری نے کشور کے مل جانے تک اسے زندہ رکھنا مناسب سمجھا تھا کیونکہ وہی تھا جو اسے کشور کے بارے میں بتا سکتا تھا۔

''کہو ماسٹر! کیا حال ہے؟ ہماری مہمان نوازی پسند تو آ رہی ہے نا یا پھر کوئی کسر باقی ہے؟'' زخموں کی شدت سے بے حال آنکھیں بند کیے تکلیف کو برداشت کرتے آفتاب کو احساس بھی نہیں ہوا کہ کب کمرے کا دروازہ کھلا اور کوئی اندر داخل ہوا۔ وہ تو جب چودھری کی تمسخرانہ آواز کمرے میں گونجی تو وہ متوجہ ہوا اور دونوں آنکھوں پر رکھا بازو بہ مشکل ہٹا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس بازو کو بھی بُری طرح تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا اور اسے یہ معمولی سی حرکت دینے میں بھی اسے کافی تکلیف برداشت کرنی پڑی تھی۔

''ہر آدمی اپنے ظرف کے حساب سے دوسرے کو دیتا ہے چودھری صاحب۔ آپ نے ساری زندگی ظلم و ناانصافی کے ساتھ گزاری ہے چنانچہ آپ کے ملازم آپ کے حکم کی تعمیل میں اس شے کو بانٹنے میں کوئی کسر کیسے اٹھا رکھ سکتے ہیں۔ لیکن اگر آپ یہ سوچ رہے ہیں کہ اس ظلم کے بدلے میں آپ مجھ سے اپنی مطلوبہ معلومات حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے تو ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ میں اپنی جان تو دے دوں گا لیکن زبان نہیں کھولوں گا۔''

چودھری کے طنزیہ سوالوں کے جواب میں اس نے اپنے عزم کا اظہار کیا۔ اس کے جواب میں چودھری قہقہہ لگا کر ہنس پڑا پھر نفرت سے بولا۔ ''یہ تمہاری بھول ہے ماسٹر کہ ہم تم سے کچھ معلوم کرنے کے لیے تم پر یہ تشدد کر رہے ہیں۔ ہم اتنے مجبور نہیں ہیں کہ ایک معمولی سی گل بلوم کرنے کے لیے تمہارے محتاج ہوں۔ تمہارے اس صفائی دوست کا پتا ہم تک پہنچ گیا ہے۔ آج کی رات وہ اپنے جرم کی سزا بھی بھگت لے گا اور ہم اپنی چرائی جانے والی چیز بھی حاصل کر لیں گے۔ ہاں البتہ تمہارے لیے ہمارے پاس آسان موت نہیں ہے۔ تمہیں ہم اسی طرح سسکا سسکا کر زندہ رکھیں گے تاکہ تم ہر سانس کے ساتھ یہ گل سمجھ سکو کہ چودھری افتخار عالم شاہ کی عزت پر ہاتھ ڈالنا کیسا بھیانک جرم ہے۔ اگر تمہیں اس سزا سے نجات حاصل کرنی ہو تو گڑگڑا کر خود ہی اپنی موت کی دعا کرتے رہو۔ شاید موت کے فرشتے کو تم پر رحم آ جائے اور وہ تمہیں ہمارے قہر سے بچا کر لے جائے۔ اس کے علاوہ تو تمہارے پاس بچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ تمہارے سارے

www.pkdigest.com

ہمدردوں کو ہم ایک جنگلی میں اڑا سکتے ہیں۔"

چودھری کی باتیں ہتھوڑے کی طرح آفتاب کے دماغ پر برس رہی تھیں۔ چودھری نے اس پر یہ شک تو پہلے ہی ظاہر کیا تھا کہ اس نے افضل کے ذریعے کشور کو گاؤں سے نکالا ہے اب وہ افضل کا پتا بھی حاصل کر چکا تھا اور آج رات اس کے گھر پر چڑھائی کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اگر چودھری کے کارندے افضل کے گھر پہنچ جاتے تو وہ نہ صرف کشور کو پانے میں کامیاب ہو جاتے بلکہ افضل اور اس کے گھر والوں کے ساتھ بھی کوئی کسی بھی قسم کا سلوک کر سکتے تھے۔ جہاں کشور کا اپنے ظالم باپ کی گرفت میں آجانے کا خیال اس کے لیے سوہانِ روح تھا وہیں وہ افضل اور اس کے گھر والوں پر کوئی آنچ آنے کے خیال سے بری طرح مضطرب ہو گیا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح افضل کو یہ اطلاع پہنچا دے تاکہ وہ کشور اور اپنے بیوی بچوں کے ساتھ کسی محفوظ مقام پر منتقل ہو جائے مگر اطلاع پہنچانے کا کوئی ذریعہ تھا ہی کہاں؟ اپنا موبائل فون اس نے اسی وقت جیب سے نکال کر پھینک دیا تھا جب چودھری کے کارندوں نے اسے اغوا کیا تھا۔ موبائل میں کشور اور افضل دونوں کے فون نمبرز فیڈ تھے اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان نمبروں کے ذریعے کشور کو ٹریس کیا جا سکے۔ اس کی اس احتیاط کے باوجود چودھری کشور کا پتا معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور وہ اپنے موبائل سے محرومی کے باوجود بھی ناکام رہا تھا... خیر موبائل ہوتا بھی تو اس وقت اس کی دسترس میں نہ ہوتا بلکہ اس کی مدد سے چودھری بہت پہلے کشور تک جا پہنچتا۔

"تیرا وہ ہمدردا سی بھی تیرے لیے وڈا بے قرار ہے۔ پولیس لے کر ڈیرے پر چڑھ دوڑا تھا پر وچارے کے ہتھ ککھ بھی نہ آیا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی اس کو نمٹا کر آیا ہوں۔ تیرے نہ ملنے سے وڈا مایوس ہو کر گیا ہے۔ بے وقوف سمجھ رہا تھا کہ تجھے اپنے ساتھ لے کر ہی یہاں سے جائے گا پر اس واری میرا انتظام پکا تھا۔ میں اتنا کچا تو نہیں ہوں کہ بار بار دشمن کو اپنے ٹھکانے پر پہنچ کر کھل کھیلنے کا موقع دے دوں۔" چودھری کے لہجے میں شہریار کے لیے سخت نفرت تھی۔ دراصل اسے ابھی وہ ہزیمت بھولتی نہیں تھی جب شہریار تن تنہا اس کے ڈیرے میں داخل ہو کر اس کے آدمیوں کو قابو میں کرنے کے بعد تہ خانے میں موجود خفیہ سیف سے اپنی وہ تصویریں نکال لے گیا تھا جنہیں چودھری نے بڑی منصوبہ بندی کے بعد حاصل کیا تھا۔

چودھری کی بات سن کر آفتاب کو خیال آیا کہ جب وہ نیم غنودگی کے عالم میں تھا تو اسے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے کوئی اسے ہاتھ پیروں سے اٹھا کر کسی دوسری جگہ لے جا رہا ہو۔ یقیناً چودھری کو کسی ذریعے سے اطلاع مل گئی ہوگی کہ شہریار آفتاب کی بازیابی کے لیے ڈیرے پر چھاپا مارنے آ رہا ہے چنانچہ اس نے آفتاب کو منظر سے ہٹا دیا۔ اب وہ جس کمرے میں تھا، وہ پہلے والے سے بالکل مختلف تھا۔ جس وقت اسے یہاں منتقل کیا گیا تھا اس کی حالت اتنی ردی ہو رہی تھی کہ وہ آنکھیں کھول کر دیکھنے کی ہمت تک نہیں کر سکا اور اب چودھری کی بات سن کر اس نے غور کیا تھا کہ اسے کہیں اور منتقل کیا جا چکا ہے۔ اب جانے یہ کمرا ڈیرے میں تھا یا کہیں اور کسی جگہ خود اسے جہاں تک یاد پڑتا تھا اس کے مطابق تو اس نے انسانی بازوؤں کے علاوہ کسی اور شے پر فاصلہ طے نہیں کیا تھا چنانچہ یہی قیاس کیا جا سکتا تھا کہ وہ ڈیرے میں ہی کہیں ایسی جگہ موجود ہے جو خفیہ ہونے کے باعث پولیس والوں کی نظر میں نہیں آسکی۔ اس سارے حساب کتاب میں گم وہ گھنٹی بجنے کی آواز پر چونکا۔ یہ چودھری کے موبائل فون کی گھنٹی تھی۔

"ہاں بالے ابول کیا گل ہے؟" چودھری نے کال ریسیو کرتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں پوچھا اور دوسری طرف کی بات سننے لگا۔

"تیرا یار کہیں ایسے ہی بھڑک تو نہیں مار رہا۔ اپنا کیش جانے کے چکر میں بھی حرام خور مال کو بڑھا چڑھا کر بتا سکتا ہے۔ تجھے ملوم ہے آج کل میرا مزاج وڈا بگڑا ہوا ہے کوئی ایسی ویسی چیز سامنے آگئی تو متھا ہور بھی گھوم جائے گا۔" وہ جانے کس شے کے بارے میں گفتگو کر رہا تھا، آفتاب اندازہ نہیں لگا سکا۔

"چل تو کہتا ہے کہ سوہنا آئٹم ہے ہور تو میرا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے ہی اسے یہاں لا رہا ہے تو فیر میں دیکھ لیتا ہوں۔ اج رات ویسے ہی میرے کلیجے میں ٹھنڈ پڑنے والی ہے، چنگا ہے کہ پہلے ہی جشن کا بندوبست ہو جائے۔" چودھری کے الفاظ سے اب اسے کسی حد تک اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کسی عورت کے بارے میں بات کر رہا ہے۔ یقیناً وہ کوئی طوائف ہو گی جسے اس کے کارندے نے اپنے آقا کی دل بستگی کے لیے تلاش کیا ہو گا۔ اپنی عزت، اپنی بیٹی کے لیے اتاؤلے ہو جانے والے چودھری کا یہ دہرا معیارِ زندگی آفتاب کے اندر تک کڑی دوڑا گیا۔ اپنے نفس کو کسی آوارہ کتے کی طرح آزاد چھوڑ دینے والا چودھری اپنی بیٹی کو اس کا جائز حق تک دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اگر وہ حقوق ادا کرنے والا آدمی ہوتا تو آج اس پر یہ وقت ہی نہیں آتا کہ اس کی بیٹی

حویلی کی چوکھٹ پھلانگنے پر خود کو مجبور پاتی۔ کشور نے جو بھی قدم اٹھایا تھا، اس کے پیچھے اس کی مکمل خوشی تو بہر حال نہیں تھی۔ وہ بھی ہر لڑکی کی طرح عزت سے بیاہے جانے کے خواب دیکھتی تھی لیکن جس کے ذمے یہ کام تھا اس نے فرسودہ رسموں اور اپنے مفاد کو بیٹی کے جذبات پر مقدم جانا تھا اور آج نتیجے میں تلملاتا پھر رہا تھا۔

"چل بھئی ماسٹر! میں تو چلا عیش کرنے۔ تجھ میں ہمت ہوئی تو میں بالے سے کہہ دوں گا کہ تیری آج رات تھوڑی ہور خاطر شاطر کر دے ورنہ تو خیر مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ تجھے میں لمبے عرصے کے لیے اپنا مہمان رکھوں گا۔ فیر تیری خاطریں ہوتی رہیں گی۔" ہوس پرست چودھری کا موڈ "نئے مال" کا سن کر خاصا خوش گوار ہو گیا چنانچہ وہ لہک کر کہتا ہوا وہاں سے واپس چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد آفتاب کے پاس تنہائی میں ڈسنے والے اندیشوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ کچھ وہ پہلے ہی اندازہ لگا چکا تھا اور اب چودھری نے بھی اس بات کی تصدیق کر دی تھی کہ وہ اسے ایک بار کے بجائے آہستہ آہستہ سسکا سسکا کر مارنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ آج دوپہر اسے خوراک کے نام پر بدمزہ دلیے کی آدھی پیالی زبردستی کھلائی گئی تھی۔ وہ سمجھ سکتا تھا کہ خوراک کی معمولی مقدار اس کے جسم کو مطلوب توانائی تو فراہم نہیں کر سکے گی لیکن اس کی وجہ سے جسم و جاں کا رشتہ اس طرح جڑا رہے گا کہ وہ خود اپنے مرنے کی تمنا کرے گا۔ ایک طرف اس کے سامنے اپنا یہ لرزا دینے والا انجام تھا تو دوسری طرف کشور، افضل اور اس کے اہلِ خانہ کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ وہ سب اسے بے حد عزیز تھے اور ان میں سے کسی کو بھی گزند پہنچتی تو وہ بے حد تکلیف محسوس کرتا اور یقیناً اس تکلیف کی شدت اس جسمانی تکلیف سے کہیں بڑھ کر ہوتی جو اسے چودھری کی قید میں اٹھانی پڑ رہی تھی۔ افضل جیسے جاں نثار دوست اور کشور جیسی محبوب بیوی کو کوئی نقصان پہنچنے کا خیال ہی سوہانِ روح تھا اور یہاں تو چودھری صاف اپنے عزائم کا اظہار کر کے گیا تھا۔ اس کا اعتماد اور یقین دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ اس نے جو کچھ کہا ہے اس کے لیے پورا بندوبست کر چکا ہے۔ یہ بُری گھڑی ٹل جائے اور چودھری کو اپنے ارادوں میں ناکامی حاصل ہو، اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے آفتاب کے پاس دعا کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ دل کی گہرائیوں سے اپنی جگہ لیٹے لیٹے ہی رب العالمین کو پکارنے لگا کہ کسی طرح اس بُری گھڑی کو ٹال دے اور ظالم کی چال خود اس پر ہی الٹ دے۔ ہوش اور نیم بے ہوشی کے دوران اسی طرح گڑگڑاتے ہوئے کتنا وقت گزر گیا، اسے اندازہ نہیں ہو سکا۔

رات کا آخری پہر چل رہا تھا تب اسے کچھ غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔ وہ بہت دور سے سنائی دینے والی مدھم آوازیں تھیں جو کسی پُر ہنگام جگہ پر شاید اسے سنائی بھی نہ دیتیں لیکن اپنے قید خانے کی تنہائی میں اسے وہ آوازیں سنائی دے گئیں۔ وہ کان لگا کر غور سے ان آوازوں کو سننے لگا۔ یکدم اسے ادراک ہوا کہ وہ فائرنگ کی آوازیں تھیں۔ کہیں مسلسل اور لگاتار فائرنگ کا سلسلہ جاری تھا اور یوں لگتا تھا کہ دو گروہ آپس میں متصادم ہوں۔ چودھری کی عمل داری میں ہونے کی وجہ سے اسے یہ تو سمجھ آ گیا کہ لڑنے والوں میں سے ایک گروہ چودھری کے گرگوں کا ہو گا لیکن دوسرے گروہ کے بارے میں وہ اچنبھے کا شکار تھا۔ چودھری کے علاقے میں گھس کر باقاعدہ اس کے بندوں سے مقابلہ کرنا کسی عام شخص کے بس کی بات نہیں تھی۔ ارد گرد کے جتنے بھی زمیندار اور جاگیردار تھے، وہ چودھری سے دبتے تھے اور ان میں سے کسی کی جرأت نہیں تھی کہ وہ اس کے خلاف ہتھیار اٹھا سکیں۔ اب دوسرا امکان یہ تھا کہ پولیس نے اپنی دن والی ناکامی کے بعد رات کو ایک بار پھر چھاپا مارا ہو لیکن یہ بھی کوئی آسان بات نہیں تھی۔ شہریار لاکھ اس کو پسند کرتا تھا لیکن اوپر والوں کو جواب دہی کی تلوار تو اس کے سر پر بھی لٹکتی رہتی تھی۔ ایک بار ڈیرے پر ریڈ میں ناکام ہونے کے بعد وہ بھلا کس چیز کو جواز بنا کر دوبارہ پولیس فورس کے ساتھ وہاں چڑھائی کر سکتا تھا۔ تذبذب میں مبتلا آفتاب کان لگائے فائرنگ کی آوازیں سنتا رہا۔ آخر اسے احساس ہوا کہ فائرنگ کی شدت بتدریج کم ہوتی جا رہی ہے۔ آخر کار آہستہ آہستہ فائرنگ کا سلسلہ رک گیا اور کچھ دیر کے لیے بالکل خاموشی چھا گئی پھر کچھ دیر بعد اس خاموشی میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوا۔ وہ یقیناً کچھ لوگوں کے بھاگنے دوڑنے اور باتیں کرنے کی آوازیں تھیں جنہیں وہ تقریباً اپنے سر پر محسوس کر رہا تھا۔ ان آوازوں کو سن کر اسے اندازہ ہوا کہ وہ کسی تہ خانے میں ہے یعنی اسے ایک تہ خانے سے نکال کر دوسرے تہ خانے میں ہی منتقل کیا گیا تھا۔ آوازوں کے سنائی دینے کے بعد اسے بہت دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ وہ دو افراد تھے جو پانچ منٹ سے بھی کم وقفے میں اس تک آ پہنچے تھے۔

"تم ماسٹر آفتاب ہو؟" آنے والوں میں سے ایک نے اس سے سوال کیا جس کے جواب میں وہ محض اثبات میں گردن ہی ہلا سکا۔

"ہم تمہیں لینے آئے ہیں۔" اس کی طرف سے

www.pkdigest.com

اثبات میں جواب پا کر اس شخص نے بتایا اور پھر آفتاب کی حالت کو دیکھتے ہوئے خود ہی اس کی بغل میں ہاتھ ڈال کر اسے سہارے سے کھڑا ہونے میں مدد دی۔ اس کا دوسرا ساتھی بھی اس کے ساتھ شامل ہو گیا۔ آفتاب کی ٹانگوں پر ہاکی کی مدد سے اتنی ضربیں لگائی گئی تھیں کہ وہ انہیں ہلا بھی نہیں پا رہا تھا۔ اس کے لیے بھی امداد بن کر آنے والے دونوں افراد تقریباً اسے اٹھا کر ہی اپنے ساتھ لے جا رہے تھے۔

کمرے سے نکلنے کے بعد وہ لوگ ایک سرنگ نما راستے میں داخل ہوئے۔ یہ راستہ چند فٹ سے زیادہ طویل نہیں تھا جس کے اختتام پر ایک کھلا ہوا راستہ نظر آ رہا تھا۔ اس راستے سے گزر کر وہ لوگ دوسری طرف پہنچے تو اس نے خود کو ایک اسٹور نما جگہ پر پایا۔ یہاں بہت سا کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کاٹھ کباڑ کو یہاں پھینکنے کے لیے آنے کے علاوہ کوئی اس جگہ کا رخ بھی نہ کرتا ہوگا۔ وہ لوگ اس اسٹور نما جگہ سے باہر آئے تو آفتاب کو شناسائی کا احساس ہوا۔ یہ وہی وسیع تہ خانہ تھا جس کے ایک کمرے میں اسے اغوا کر کے لانے کے بعد رکھا گیا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ معاملہ کیا ہے۔ تہ خانے سے متصل ایک اور خفیہ تہ خانہ بھی بنایا گیا تھا۔ باہر سے کوئی بھی فرد آتا تو وہ بیرونی تہ خانے کو دیکھ کر ہی واپس چلا جاتا۔ شہریار کا پولیس کے ذریعے کروایا گیا ریڈ اسی لیے ناکام ہو گیا تھا کہ پولیس والوں نے اوپر ڈیرے کی عمارت دیکھی اور پھر نیچے تہ خانے کی تلاشی لے کر چلے گئے۔ کاٹھ کباڑ سے بھرے اسٹور روم میں موجود خفیہ راستے، سرنگ اور پھر اس کے ساتھ جڑے دوسرے تہ خانے کی طرف کسی کا دھیان ہی نہیں گیا لیکن یہ نہ جانے کون لوگ تھے جنہوں نے نہ صرف اس خفیہ تہ خانے کو دریافت کر لیا تھا بلکہ اسے رہائی دلوا کر اپنے ساتھ بھی لے جا رہے تھے۔ وہ ان لوگوں سے ان کے بارے میں سوال کرنا چاہتا تھا لیکن وہ جتنی خاموشی کا مظاہرہ کر رہے تھے اس کو دیکھتے ہوئے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ شاید ہی اس کے کسی سوال کا جواب دیں۔ ویسے بھی وہ جتنی غلبت میں تھے ان سے کسی سوال کی گنجائش نکلتی بھی نہیں تھی۔ وہ اسے اٹھائے اٹھائے سیڑھیاں چڑھ کر کھلے حصے میں آ گئے۔ اس حصے میں آتے ہی آفتاب کی نظر زمین پر گرے دو افراد پر پڑی۔ ان دونوں کے لباس خون آلود نظر آ رہے تھے اور حتمی طور پر کہنا مشکل تھا کہ وہ مردہ ہیں یا پھر صرف زخمی ہوئے ہیں البتہ اس نظارے نے اسے یہ ضرور باور کروا دیا تھا کہ وہاں ٹھیک ٹھاک معرکہ ہوا تھا جس میں چودھری کے کارندے کام میں آ گئے تھے۔ اسے حیرت ہوئی کہ یہ سارا ہنگامہ ایک اس کی ذات کے لیے کیا گیا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے لیے غیبی امداد بن کر آنے والے یہ مددگار کون ہیں؟ وہ ان سے یہ سوال کر بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ لوگ خود بڑی افراتفری میں نظر آ رہے تھے۔ اسے اپنے آدمیوں کے ساتھ تہ خانے سے باہر آتے دیکھ کر احاطے میں اِدھر اُدھر بکھرے افراد نے تیزی سے گاڑیوں میں بیٹھنا شروع کر دیا۔ آفتاب کو بھی انہوں نے ایک آرام دہ گاڑی میں بٹھا دیا۔ اس گاڑی میں ڈرائیور کے ساتھ اگلی نشست پر ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا جبکہ آفتاب کے ساتھ پچھلی نشست پر اسے اپنے ساتھ تہ خانے سے لے کر آنے والوں میں سے ایک براجمان ہو گیا تھا۔

''اس کی مرہم پٹی کر کے کوئی سکون کی گولی کھلا دے شہزاد! بے چارے کی حالت خراب ہے اتنے لمبے سفر میں تکلیف اور بھی..... بڑھ جائے گی۔'' گاڑی اسٹارٹ ہو کر ابھی احاطے سے نکلی ہی تھی کہ اگلی نشست پر موجود شخص نے آفتاب کے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمی کو حکم دیا۔ وہ فوراً ہی سیٹ کے نیچے سے فرسٹ ایڈ باکس نکال کر اس حکم کی پیروی کرنے لگا۔ گاڑی بے حد شان دار تھی چنانچہ تیز رفتاری سے گاڑی کے کچے پکے راستوں سے گزرنے کے باوجود اسے اتنے جھٹکے نہیں لگ رہے تھے کہ شہزاد نامی شخص کو اپنے کام میں دشواری پیش آتی۔ اس نے پہلے آفتاب کو سکون آور گولی کھانے کے لیے دی اور پھر اس کے زخموں کو صاف کر کے ان پر مرہم لگانے لگا۔ جب تک وہ اس کام سے فارغ ہوا وہ لوگ گاؤں کی حدود سے نکل کر پختہ سڑک پر آ چکے تھے۔ پختہ سڑک پر پہنچنے کے بعد گاڑی کی رفتار بالکل ہموار ہو گئی اور وہ جو اکا دکا جھٹکے لگ رہے تھے ان سے بھی نجات مل گئی۔ سڑک رفتاری سے چلتی اس گاڑی کی ٹھنڈی فضا میں کب وہ نیند کی آغوش میں جا پہنچا خود اسے بھی خبر نہ ہو سکی۔

☆☆☆

شہریار کے موبائل کی گھنٹی علی الصباح بجی۔ اس نے موبائل اٹھا کر چیک کیا۔ کال جگو کی طرف سے آ رہی تھی۔ اس نے فوراً ریسیو کا بٹن پش کر دیا۔

''آپ کا کام ہو گیا ہے سر جی! آپ کا بندہ چودھری کی قید سے چھڑا لائے ہیں ہم لیکن بے چارہ تھا بہت بُرے حالوں میں اس لیے میں اسے سیدھا اپنے ساتھ لاہور لے آیا ہوں اور یہاں اپنی جان پہچان کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں داخل کروا دیا ہے۔ اس پر بہت زیادہ تشدد کیا گیا ہے۔ سارا جسم زخموں سے بھرا ہوا ہے دونوں ٹانگوں اور ایک ہاتھ میں فریکچرز بھی ہیں۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ وہ بہت لمبے عرصے تک بستر سے اترنے کے قابل نہیں ہو سکے گا۔'' اس کی ''ہیلو'' سنتے ہی جگو نے اسے رپورٹ پیش کرنا شروع کر دی جسے سن کر اس نے سکون کا سانس لیا۔ بے شک آفتاب شدید زخمی حالت میں ملا تھا لیکن یہی کیا کم تھا کہ وہ چودھری کی قید سے زندہ واپس آ گیا تھا ورنہ اسے جس جرم کے بدلے اغوا کروایا گیا تھا اس کے بعد تو اسے مسلسل یہی خدشہ ستاتا رہا تھا کہ جانے وہ زندہ بھی ہوگا یا نہیں۔

''تھینک یو جگو! تم نے میرا بہت بڑا کام اتنے کم وقت میں کر کے کارنامہ انجام دیا ہے۔'' اس نے تہ دل سے جگو کا شکریہ ادا کیا۔

''آپ کا مجھ پر احسان ہے اے سی صاحب! آپ نے میرے اکلوتے بیٹے کی جان بچا کر مجھے خرید لیا ہے۔ آپ یہ نہ سمجھیے گا کہ اس ایک کام کو کر کے میں نے آپ کے احسان کا بدلہ چکا دیا ہے۔ میں ساری زندگی کے لیے آپ کا خادم ہوں۔ آپ جب ضرورت محسوس کریں مجھے یاد کر سکتے ہیں جگو کبھی آپ کو ''نہ'' نہیں کہے گا۔'' جگو نے عاجزی سے اس کی بات کا جواب دیا۔ اس جواب سن کر وہ اللہ کے انوکھے نظام پر ششدر رہ گیا۔ ایک بندہ جو کہ غنڈا تھا اور اپنی سیاسی جماعت کے حکم پر ہر جائز و ناجائز کام کرتا پھرتا تھا جس کے اپنے قریبی رشتے دار اس سے خوف زدہ رہتے تھے، کس طرح اس کا تابع ہو گیا۔ ایک معمولی سے احسان نے جو اس نے احسان سمجھ کر کیا بھی نہیں تھا، بلکہ اپنی دانست میں تو ایک انسانی فریضہ انجام دیا تھا، جگو کو خرید لیا تھا۔ شاید اللہ حق کی راہ پر چلنے والوں کی اسی طرح مدد کیا کرتا ہے۔

''یہ تو تمہارا بڑا پن ہے کہ تم ایسا سوچتے ہو ورنہ سچ یہ ہے کہ میں نے کبھی اس واقعے کا احسان نہیں جانا۔ زندگی اور موت کی کشمکش سے دوچار ایک بیمار بچے کو بروقت اسپتال پہنچانا میرا انسانی فرض تھا۔ بہرحال، یہ تمہاری اپنی مرضی ہے کہ تم اسے احسان جانو ورنہ میری طرف سے کوئی جبر نہیں ہاں اگر تم میرے کہنے پر کبھی میرا کوئی کام کر دو گے تو یہ اطمینان رکھنا کہ وہ بھلائی کا ہی کام ہوگا۔ میں تمہیں تمہاری سیاسی جماعت کے لیڈروں کی طرح اپنے کسی ناجائز مفاد کے لیے ہرگز بھی استعمال نہیں کروں گا۔'' شہریار نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے بتایا۔

''مجھے معلوم ہے سر اور میں خوش بھی ہوں کہ میری گناہوں سے بھری زندگی میں بھی آپ کی بدولت چند ایسے اعمال جمع ہو جائیں گے جنہیں میں نیکی کہہ کر اپنے رب کے حضور لے جا سکوں۔'' جگو کی آواز میں وہی بھیگا پن تھا جو کسی پتھر دل پر ضرب لگنے پر لہجے میں اترتا ہے۔

''خیر اچھی تم ان باتوں کو جانے دو اور فی الحال تو مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے یہ کارنامہ انجام کیسے دیا؟ ہم تو ڈیرے سے ناکام آ گئے تھے۔ تم نے چودھری کا دوسرا ٹھکانا کیسے تلاش کر کے وہاں سے آفتاب کو آزاد کروایا؟'' گفتگو کا رخ تبدیل کرتے ہوئے شہریار نے واقعے کی تفصیل جاننا چاہی۔

''میری کامیابی کی وجہ یہ ہے کہ میں چودھری کی فطرت کو سمجھتا ہوں۔ ایک تو پیر آباد اور میرا گاؤں قریب ہونے کی وجہ سے میں پہلے ہی اسے کافی جانتا تھا پھر آپ کی طرف سے کام ملا تو میں نے اپنے ذریعے سے تھوڑی سی معلومات اور کروالی۔ چودھری کے بارے میں معلوم پڑا کہ وہ عورتوں کا رسیا ہے بس تو پھر کام آسان ہو گیا ایک اسٹیج ڈانسر ہے نیلی... بڑی طرح دار ہے اور ہمارے کہنے پر ہمارے لیے کام کرتی رہتی ہے۔ میں نے اپنے ایک ذریعے سے اسے چودھری کے خاص گرگے بالے تک پہنچا دیا۔ بالے نے فوراً اسے اپنے آقا کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اس کے بعد تو نیلی کے لیے چودھری سے کچھ اگلوانا مشکل ہی نہیں تھا۔ چودھری کو شراب اور شباب کے نشے میں ڈبو کر اس نے سب معلوم کر لیا۔ وہ اپنے ساتھ ایک موبائل فون لے گئی تھی جس کو اس نے آن رکھا تھا۔ ادھر چودھری اگلتا گیا ادھر ہم سنتے رہے۔ بندے تو میں نے پہلے ہی تیار کر رکھے تھے جیسے ہی معلوم ہوا کہ اس نے ماسٹر کو کہاں رکھا ہوا ہے میں اپنے بندے لے کر روانہ ہو گیا۔ نیلی کو بھی انداز تھا کہ ہم وہاں کتنی دیر میں پہنچ جائیں گے اس لیے وہ پہلے ہی چودھری سے رخصت لے کر وہاں سے نکل گئی تھی۔ خود چودھری بھی حویلی واپس چلا گیا تھا۔ بعد میں ڈیرے پر جو مار ماری ہوئی اس کے بارے میں تو آپ کو خود ہی رپورٹ مل جائے گی۔'' جگو نے اسے تفصیل سنائی۔

''اس کا مطلب ہے آفتاب ڈیرے پر ہی تھا پھر پولیس اسے کیوں تلاش نہیں کر سکی؟'' جگو کی رپورٹ سن کر وہ حیرت سے بولا۔

''پولیس کا اس میں زیادہ قصور نہیں۔ اگر نیلی نہ ہوتی تو ہم بھی ڈیرے سے ناکام ہی واپس آتے۔ یہ تو نیلی کی وجہ سے ہمیں یہ معلومات مل گئی تھیں کہ چودھری نے تہ خانے کے ساتھ ایک اور نیا خفیہ تہ خانہ بنوایا ہے شاید کچھ عرصے پہلے کوئی ایسا واقعہ پیش آیا تھا جب کوئی تہ خانے کے خفیہ سیف سے کچھ چرا کر لے گیا تھا اور تہ خانے میں آگ لگا دی تھی۔ اس کے بعد چودھری نے جب پرانے تہ خانے کی مرمت کروائی تو ساتھ ہی

www.pkdigest.com

ایک اور خفیہ تہ خانہ بھی بنوا ڈالا۔ آفتاب کو اس نے اسی تہ خانے میں رکھا ہوا تھا۔" جگو نے اس کی حیرت دور کی۔

"او کے جگو! تم نے میرا بہت بڑا مسئلہ حل کر دیا اور ساری الجھنیں بھی دور ہو گئیں۔ اب تم ایسا کرو کہ مجھے اس اسپتال کا نام پتا لکھوا دو جہاں تم نے آفتاب کو ایڈمٹ کروایا ہے اور خود آرام کرو۔ رات بھر تم نے بڑی بھاگ دوڑ کی ہے اس لیے اب آرام ضروری ہے۔" سب جان لینے کے بعد اس نے گفتگو کو سمیٹتے ہوئے کہا تو اس نے بنا تامل اسے اسپتال کا پتا بتانے کے بعد سلسلہ منقطع کر دیا۔ شہریار کو اسے یہ باور کروانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی کہ وہ اس بارے میں کسی اور کو خبر نہ ہونے دے۔ جگو جس نظام کا حصہ تھا وہاں ایسی احتیاطیں اور رازداریاں تربیت کا لازمی حصہ ہوتی ہیں۔ خود وہ جگو کی کال سے فارغ ہونے کے بعد فریش ہونے کے لیے چلا گیا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا آج کا دن بہت مصروف گزرنے والا ہے۔ آخر چودھری افتخار عالم شاہ کے ڈیرے پر حملہ ہوا تھا اور ضلع پولیس خاموش تماشائی بنی رہی تھی۔ اب تک تو اس واقعے کے خلاف چودھری نے جانے اپنے کتنے جاننے والے اعلیٰ عہدے داروں کو شکایت نوٹ کروا دی ہو گی۔ آج کا دن شہریار کو چودھری کے ان سارے ہمدردوں کو بھگتانا تھا۔

☆☆☆

سرخ و سنہری خوبانیوں سے لدے درخت، کھیتوں میں ہل چلاتی زوہ کی جوڑی، پانی کا مٹکا سر پہ اٹھائے بے وجہ ہنستی ہوئی گھروں کی طرف جاتی لڑکیاں، ادھر ادھر آوارہ کھیلتے بچے، وہ راستے میں پڑنے والے ہر ہر منظر کو ایک عالم حیرت میں دیکھتی ہوئی آ رہی تھی۔ اس کی سیاہ چمکدار آنکھیں یوں نیم وا تھیں جیسے وہ خواب کی کیفیت میں ہو۔ حقیقت میں اسے یہ خواب ہی تو لگتا تھا اور کھلی آنکھوں سے سب کچھ دیکھنے کے باوجود یقین نہیں آتا تھا کہ وہ زندہ صحیح سلامت ان مناظر سے گزر رہی ہے۔ وہ فان کی راہنمائی میں اس برف زار سے جس میں اسے لگتا تھا کہ اس نے صدیاں بھٹکتے ہوئے گزاری ہوں، نکل آئی تھی لیکن ابھی سفید چمکتی برف کا عکس اور تند ہواؤں کی یخ بستگی اس کے ذہن پر نقش تھی۔ بدن موسم کی ان شدتوں سے رہائی پانے کے باوجود ابھی تک ٹھٹھرا ہوا تھا۔ اس کا ذہن حقیقت کو بھی حقیقت مانتے ہوئے ڈر رہا تھا اور اسے یوں لگتا تھا کہ شاید وہ ان برف پوش پہاڑوں میں بھٹکتے ہوئے کچھ دیر کے لیے سو گئی ہے اور سوتے میں یہ سہانا خواب دیکھ رہی ہے۔ یہ ہنستے مسکراتے انسانی چہرے، یہ لہلہاتے کھیت، زندگی کا جاری کاروبار سب خواب ہی تو لگتا تھا۔ وہ عمران کے ساتھ اپنے قید خانے سے بھاگ نکلنے کے بعد مسلسل ان سب مناظر میں پہنچنے کے لیے سرگرداں رہی تھی اور اب پہنچ گئی تھی تو لگتا تھا کہ اپنی ہی آنکھیں دھوکا دے رہی ہیں۔ فان اس کی اس حالت کو دیکھ اور سمجھ رہا تھا چنانچہ اسے اس کیفیت سے نکالنے کے لیے مسلسل باتیں کرتا رہتا۔ راستے میں پڑنے والے ہر منظر، ہر مقام کے بارے میں اسے آگاہ کرتا رہتا۔ یہ سوچے بغیر کہ وہ اس کی باتوں کا کتنا فیصد حصہ سمجھ رہی ہے اور کتنا اس کے سر کے اوپر سے گزرتا جا رہا ہے۔ اس کی یہ محنت بالکل رائیگاں نہیں گئی تھی۔ آہستہ آہستہ ماہ بانو اس پر اعتماد کرنے لگی تھی اور اس نے ٹوٹے پھوٹے جملوں میں اپنے ساتھ گزرنے والے واقعات کی مختصر روداد اسے سنا ڈالی تھی چنانچہ جب وہ لوگ چھوٹی چھوٹی بستیوں سے گزرنے کے بعد اسکردو پہنچے تو فان اسے کسی ہوٹل میں ٹھہرانے کے بجائے اپنے ایک واقف کار کے گھر لے گیا۔ اس کا یہ واقف کار فوج سے ریٹائرڈ تھا اور اب اپنا ایک جنرل اسٹور چلا رہا تھا۔ فان اور ماہ بانو اس کی رہائش گاہ پہ پہنچے تو اس نے گرم گرم قہوے اور خشک میووں سے ان کی خاطر مدارات کی۔ پھر چھٹیاں گزارنے کے لیے گھر آئے ہوئے اپنے ایک دوست کے بیٹے کو جو کہ میڈیکل کالج کے آخری سال میں تھا، بلا کر ماہ بانو کا پیر دکھایا جو کافی دیر تک برف میں کھلا رہنے کی وجہ سے متاثر ہوا تھا۔

"باقی پیر تو ٹھیک ہے لیکن یہ درمیانی انگلی بری طرح متاثر ہوئی ہے۔ یہ انگلی فراسٹ بائٹ کا شکار ہوئی ہے اور اب اس میں زندگی کے کوئی آثار باقی نہیں ہیں چنانچہ اسے کاٹ کر ان کے پاؤں سے الگ کرنا ہوگا۔" معائنے کے بعد میڈیکل کے اس طالب علم نے اعلان کیا۔ فان اس بات کا پہلے ہی اندازہ لگا چکا تھا لیکن اپنی زبان سے کچھ کہنے کے بجائے اس نے یہی مناسب سمجھا تھا کہ کسی ڈاکٹر کی رائے لے لی جائے۔

"اس کام کے لیے تو اسپتال ہی جانا پڑے گا۔ تمہارا معائنے کے لیے آنے کا بہت بہت شکریہ بیٹے۔" فان کے واقف کار نے اپنے دوست کے بیٹے کو رخصت کر دیا۔

"اسپتال جانے سے پہلے میں اس لڑکی کو کسی ذمے دار شخص سے ملوانا چاہتا ہوں۔ تمہارے پاس آنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ تم اپنی آرمی کی سابقہ ملازمت کی وجہ سے اس کام میں ہماری بہتر مدد کر سکو گے۔ اصل میں یہ لڑکی کچھ ایسی باتیں جانتی ہے جن کا کسی عام فرد کے علم میں آنا شاید تمہارے ملک کے لیے نقصان دہ ہو اور خود یہ بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔" فان بہت زیرک آدمی تھا۔ پاکستان کا باشندہ نہ ہونے کے باوجود وہ صرف یہاں کئی بار آنے کی وجہ سے یہاں کے ماحول کو سمجھتا تھا اس لیے پوری احتیاط برت رہا تھا یہاں تک کہ اس نے اپنے واقف کار کو بھی سارے معاملے سے ابھی تک آگاہ نہیں کیا تھا اور صرف یہ چاہتا تھا کہ ماہ بانو کو کسی محفوظ ہاتھ تک پہنچا دے۔

"اگر معاملہ اتنا ہی حساس ہے تو پھر میرے خیال میں، میں تمہیں اپنے بھتیجے سے ملوا دیتا ہوں۔ وہ آرمی انٹیلی جنس میں میجر کے عہدے پر کام کر رہا ہے اور آج کل یہیں ہے۔ وہ اس لڑکی کی بہتر مدد کر سکے گا۔" ان کے میزبان نے انہیں بتایا اور پھر اپنے بھتیجے کو فون کرنے چلا گیا۔

"میں نے فون کر دیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ دو گھنٹے بعد یہاں آ سکے گا۔ اس کے آنے تک تم دونوں آرام کر سکتے ہو۔" واپس آ کر اس نے انہیں اطلاع دینے کے ساتھ ساتھ ایک پرکشش پیشکش بھی کی۔ لمبی مسافت طے کر کے آنے والے ان مسافروں کو آرام سے بہتر کیا لگ سکتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنے میزبان کے فراہم کردہ آرام دہ بستروں میں محو استراحت تھے۔ ماہ بانو کو کسی گھر کی چار دیواری میں آرام دہ بستر پر سونے کا موقع بہت عرصے بعد میسر آیا تھا۔ وہ تو ایسی کسی عیاشی کے تصور سے بھی تقریباً بیگانی ہو چکی تھی چنانچہ اب جو یہ سہولت میسر آئی تو بے ساختہ ہی اس کی پلکیں بھیگ گئیں۔ نرم و ملائم بستر کی آغوش میں نیند کی وادیوں میں اترتے ہوئے اس کے ذہن میں تواتر سے قرآن کی یہ آیت گونج رہی ہے۔ "اور تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔"

وہ تو ان ان مقامات پر اور ایسی مشکل گھڑیوں میں اپنے رب کی نعمتوں سے سرفراز ہوئی تھی کہ جس کا تصور ہی محال تھا۔ نوازے جانے کے اس احسان کو اپنے دل کی گہرائیوں سے محسوس کرتے ہوئے وہ ایسی پرسکون نیند میں ڈوبی کہ پھر فان کے پکارنے پر ہی جاگی۔

"میجر ذیشان آ گیا ہے اور تم سے ملاقات کا منتظر ہے۔" اس نے آنکھ کھول کر دیکھا تو فان نے اسے اطلاع دی۔ اس اطلاع پر اس نے فوراً ہی بستر چھوڑ دیا اور لباس کی سلوٹیں دور کرتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ یہ لباس اسے ایک گاؤں سے گزرتے ہوئے فان نے ایک محنت کش عورت سے خرید کر دیا تھا۔ وہ اچھا آدمی تھا اور بہت ترقی یافتہ لیکن ایشیائی ملک کا باشندہ ہونے کی وجہ سے شاید اس میں مشرق کی یہ ادا موجود تھی کہ کسی کو مصیبت میں دیکھ کر بے نیازی سے شانے اچکا کر گزر جانے کے بجائے ممکنہ حد تک اس مصیبت زدہ کی مدد کرے۔ ماہ بانو کم از کم اس کے مہربان رویے کی یہی توجیح کر سکی تھی لیکن اصل بات تو یہ تھی کہ فان فطرتاً ایک اچھا آدمی تھا۔ آدمی فطرت سے اچھا ہو تو پھر مشرق و مغرب کا فرق کوئی معنی نہیں رکھتا اور خراب فطرت اچھے سے اچھے ماحول میں بھی اپنا رنگ دکھا جاتی ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو سڑک پر حادثے کا شکار ہو کر بے ہوش ہو جانے والے آدمی کی جیب سے اس کا بٹوا اور موبائل فون نکالے جانے کے مناظر ہمارے ہاں کیونکر دکھائی دیتے؟

"السلام علیکم۔" سنجیدہ چہرے والے مدبر سے میجر کے سامنے پہنچ کر ماہ بانو نے اسے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔ بیٹھیں بی بی اور مجھے بتائیں کہ آپ ایسا کیا جانتی ہیں جس کا کسی انٹیلی جنس کے بندے کے علم میں لایا جانا ضروری ہے لیکن پلیز ذرا وقت کا خیال رکھ کر مختصر بات کیجیے گا۔ میں بہت مصروف ہوں اور زیادہ دیر یہاں نہیں رک سکوں گا۔" وہ یقیناً اپنے چچا کی مروت میں وہاں تک آ گیا تھا لیکن اس بات کے لیے بھی فکرمند تھا کہ اس کا وقت ضائع نہ ہونے پائے۔ ماہ بانو نے اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ممکنہ اختصار سے اپنی آپ بیتی سنانی شروع کر دی۔ واقعات سناتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ میجر جو کافی بے دلی سے یہاں تک آیا تھا اب اس کی داستان میں گہری دلچسپی لے رہا ہے اور بغور اس کا ایک ایک لفظ سن رہا ہے۔ کئی جگہ پر اس نے دخل اندازی کرتے ہوئے ماہ بانو سے سوالات بھی کیے۔ یقیناً اختصار کی ہدایت کے ساتھ شروع کی جانے والی گفتگو خاصا طول کھینچ گئی۔ اس عرصے میں فان اپنے میزبان کے ساتھ دوسرے کمرے میں بیٹھا شطرنج کھیلتا رہا تھا۔ میجر کی خاطر مدارات کے لیے ایک بار قہوے کے ساتھ نمکین کا جا اور بسکٹ پیش کرنے کے لیے آنے کے سوا ان دونوں کی گفتگو کے دوران کوئی کمرے میں نہیں آیا تھا۔

"تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا جہاں میں تمہیں لے کر جاؤں گا وہاں تمہارا بیان بھی ریکارڈ ہوگا اور میں تمہاری ایک ایسے شخص سے ملاقات بھی کرواؤں گا جسے دیکھ کر تم یقیناً خوشی محسوس کرو گی۔" گفتگو کے اختتام پر میجر نے اس سے کہا اور پھر اس کا جواب سنے بغیر اپنے چچا کو آواز دینے لگا۔

"میں اس خاتون کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔" چچا کے سامنے آنے پر اس نے اسے مطلع کیا۔

"کھانا کھا کر چلے جانا۔ میں دم کا گوشت بنا رہا تھا جو تمہیں بہت پسند ہے۔"

www.pkdigest.com

"پھر کبھی سہی۔ ابھی مجھے جلدی ہے۔ اس لڑکی کے علاج اور کھانے پینے کا انتظام بھی میں خود ہی کر دوں گا۔" اس نے عجلت میں جواب دیا اور ماہ پا کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کرتے ہوئے قدم آگے بڑھا دیے۔ وہ قدرے جھجکتی ہوئی اس کے پیچھے چل پڑی۔ ذاتی سامان تو اس کے پاس کچھ رہا نہیں تھا کہ اسے سمیٹنے کی فکر ہوتی البتہ ایک اجنبی کے ساتھ جانے میں کچھ تامل تھا لیکن پھر اس نے اپنے ہر اندیشے کو جھٹک ڈالا۔ اب تک اس کی زندگی میں آنے والے بیشتر اجنبی اس کے لیے مددگار ہی ثابت ہوئے تھے اور اگر کہیں کسی نے مشکل کھڑی کرنے کی کوشش بھی کی تھی تو اللہ رب العزت تھوڑی سی آزمائش کے بعد اسے اس مشکل سے نکال لایا تھا پھر اسے کیا ضرورت پڑی تھی کہ بہت زیادہ فکر اور اندیشے پالتی۔ وہ تھا نا اس کا مددگار جس کا سہارا اور ساتھ ہر سہارے سے بڑھ کر قابل بھروسا تھا۔

☆☆☆

"یہ سب کیا ہو رہا ہے شہریار! مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ اس طرح تو تم اپنے لیے بہت زیادہ مشکلات کھڑی کر لو گے۔ چودھری بہت غضبناک ہے۔ اس کے دو بندے مارے گئے ہیں۔ چار اچھے خاصے زخمی ہیں۔ وہ سب طرف شکایتیں کرتا پھر رہا ہے کہ اس کے ڈیرے پر شب خون مارا گیا اور کہیں سے کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔" یہ مختار مراد تھے۔ اس کے لیے پریشان، فکرمند اور اپنائیت کے ساتھ خفا ہوتے۔

"کارروائی کیسے ہوتی انکل! جس وقت چودھری کے ڈیرے پر حملہ ہوا اتفاق سے پولیس اسٹیشن کا فون ڈیڈ پڑا ہوا تھا۔ ایس پی صاحب اپنی فیملی کے ساتھ کسی تقریب میں شرکت کے لیے لاہور میں تھے اور میں طبیعت کی خرابی کی وجہ سے ملازمین کو ڈسٹرب نہ کرنے کی ہدایت کر کے جلدی سو گیا تھا۔ اب ہم ان سارے اتفاقات کو چودھری صاحب کی بدقسمتی کہہ کر افسوس کرنے کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں۔" اس نے زیر لب مسکراتے ہوئے مختار مراد کو جواب دیا۔

"تم جانتے ہو کہ یہ ساری کہانیاں سنا کر مجھے بے وقوف نہیں بنایا جا سکتا۔ میں نے پولیس ڈپارٹمنٹ میں ایک عمر گزاری ہے اور میں اس طرح کے سارے کھیل تماشوں سے بہت اچھی طرح واقف ہوں۔" اس کا جواب سن کر انہوں نے ناراضی کا اظہار کیا۔

"میں آپ کی شان میں ایسی گستاخی نہیں کر سکتا انکل! میں جانتا ہوں کہ آپ ہر بات اچھی طرح سمجھتے ہیں لیکن آپ بتائیں کہ کیا اس کے سوا میرے پاس کوئی دوسرا حل تھا؟ ابھی بھی آفتاب جس حالت میں ہمیں ملا ہے، وہ نہایت قابل افسوس ہے۔ اتنا تشدد تو پولیس والے بھی کسی خطرناک مجرم سے اقبال جرم کروانے کے لیے نہیں کرتے جتنا اس پر کیا گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ایک آدھ دن اور گزر جاتا تو وہ بے چارہ اپنی جان سے چلا جاتا اور آپ یقین کریں کہ آفتاب جیسے مخلص، محنتی اور دیانت دار آدمی کی زندگی چودھری کے ان پٹھوؤں سے کہیں زیادہ قیمتی ہے جو اپنے مالک کے حکم پر کمزور اور نہتے لوگوں پر ظلم ڈھاتے پھرتے ہیں۔" اس بار اس نے بھی صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

"تمہاری یہ جذباتیت تمہیں بہت نقصان پہنچائے گی شہریار!" مختار مراد نے بے بسی سے اسے تنبیہ کی۔

"نقصان اٹھاتے ہوئے مجھے یہ اطمینان تو ہو گا کہ میرے جذبات نے کسی ظالم کا ساتھ نہیں دیا۔" اس نے ترنت جواب دیا۔

"میں رانا صاحب کی وجہ سے تمہیں احتیاط کی نصیحت کرتا ہوں۔ وہ پہلے ہی صاحب فراش ہیں اور آج کل عملی طور پر سیاست کے کاموں میں حصہ نہیں لے پا رہے ہیں۔ اس لیے ان تک زیادہ خبریں بھی نہیں پہنچتی ہیں لیکن اگر انہیں یہ معلوم ہو گیا کہ تم کھلم کھلا چودھری سے جنگ شروع کر چکے ہو تو وہ بہت پریشان ہو جائیں گے۔" وہ نرمی سے اسے حالات کا احساس دلانے لگے۔

"آپ فکر نہ کریں انکل... اگر ماموں جان سے بھی کبھی اس موضوع پر بات ہو تو انہیں تسلی دیں کہ چودھری کی مخالفت سے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچنے والا۔ چودھری کوئی خدا نہیں ہے کہ اس کی مرضی سے لوگوں کی زندگی اور موت کا فیصلہ ہو ہاں، اگر اس لڑائی میں میری موت لکھی ہے تو پھر کسی بھی تدبیر سے اسے ٹالا نہیں جا سکے گا۔ اب بھی آپ دیکھیے کہ چودھری صرف بلبلانے اور ادھر ادھر فون گھمانے کے علاوہ کیا کر پا رہا ہے۔ وہ تو کسی ایسے شخص کا نام بھی نہیں لے سکا جس پر اسے شک ہو کہ اس نے یہ حملہ کروایا ہے۔ کم از کم میرا نام تو وہ کسی صورت نہیں لے سکتا۔ اگر لے گا تو اس بات کی وضاحت کیسے کرے گا کہ میری طرف سے یہ حملہ کیوں کروایا گیا؟ کیا وہ قبول کر سکتا ہے کہ اس نے ماسٹر آفتاب کو اپنے ڈیرے کے خفیہ تہ خانے میں حبس بے جا میں رکھا ہوا تھا اور اس پر غیر انسانی تشدد کر رہا تھا کہ کوئی اس کے پنجوں سے شکار چھین کر لے گیا۔ یقین کریں وہ تو پولیس کے پوچھنے کے باوجود یہ تک الزام نہیں لگا سکا کہ اس کے ڈیرے سے کچھ چرایا گیا ہے یا وہاں توڑ پھوڑ کی گئی ہے۔ ان حالات میں پولیس

اس کے ڈیرے پر ہونے والے حملے کو ذاتی دشمنی کا نتیجہ قرار دے کر نامعلوم افراد کے نام رپورٹ درج کرنے کے سوا اور کیا کر سکتی تھی اور یہ سب ہی جانتے ہیں کہ ایسے نامعلوم قاتل کبھی نہیں پکڑے جاتے۔ آپ کے پاس پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان کے قتل سے لے کر آج تک کوئی ایسی مثال ہے جس میں اصل قاتلوں اور حملہ آوروں تک پہنچا جا سکا ہو؟" وہ بولنے پر آیا تو بولتا چلا گیا اور اس کی ہر بات اتنی سچ تھی کہ مختار مراد کچھ کہنے کے قابل نہیں تھے۔

"میں آپ سے معافی چاہتا ہوں انکل! ہو سکتا ہے میری باتوں نے آپ کو ہرٹ کیا ہو لیکن میں صرف اپنی کرسی اور جان بچانے کے لیے ظلم کے سامنے اس حد تک نہیں جھک سکتا کہ خود اپنا سامنا کرنے میں بھی مجھے شرمندگی ہو۔ البتہ آپ کی تسلی کے لیے اتنی یقین دہانی ضرور کروا سکتا ہوں کہ میں بلاوجہ خود کو کسی خطرے میں ڈالنے سے حتی الامکان پرہیز کروں گا۔" ان کی خاموشی کو محسوس کر کے اس نے اپنا لہجہ ذرا دھیما کرتے ہوئے ان سے کہا۔

"میں نے تمہاری کسی بات کا برا نہیں مانا بیٹا! میں تمہارے لیے یہی دعا کر سکتا ہوں کہ تمہارا یہ جذبہ ہمیشہ سلامت رہے اور راہ کی مشکلات تمہارے حوصلے کو توڑنے نہ دیں۔ بس یہ یاد رکھنا کہ جو راہ تم نے اپنے لیے منتخب کی ہے، وہ بہت کٹھن ہے۔ اس راہ میں تمہیں اپنے قدموں کے نیچے پھول بچھے کبھی نہیں ملیں گے... ہاں ان کانٹوں سے ضرور ہر قدم پر سامنا ہو گا جو تمہارے تلووں پر لہو کے بیل بوٹے منقش کر دیں گے۔" انہوں نے فون بند کر دیا اور وہ خود کافی دیر تک یونہی گم صم بیٹھا رہا۔

مختار مراد کی کوئی بات غلط نہیں تھی۔ اب تک اس کے پاس کتنے اعلیٰ عہدے داروں کے فون آ چکے تھے جنہوں نے چودھری کے ڈیرے پر ہونے والے حملے کی مذمت کرتے ہوئے اس سے جواب دہی چاہی تھی۔ وزیراعلیٰ تک نے فون کر کے اس صورت حال پر ناراضی کا اظہار کیا تھا۔ اگر اس کی پشت پر اتنا مضبوط خاندان موجود نہ ہوتا تو یقیناً اب تک وہ یا تو اپنی ملازمت سے فارغ ہو چکا ہوتا یا پھر کسی دور دراز مقام پر ٹرانسفر کر دیا گیا ہوتا۔ کسی نسبتاً کمزور آدمی کا تو چودھری جیسے جابر کے سامنے ٹھہرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ وہ اپنے ایسے مخالفین کو خس و خاشاک کی طرح اڑا دیتا تھا۔

آفتاب کے صحافی دوست افضل کے ساتھ گزرنے والے حادثے کی اطلاع اس تک پہنچ گئی تھی۔ افضل کے بیوی بچوں کو رات کی تاریکی میں جس طرح موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا وہ نہایت افسوسناک تھا اور خود بخود ہی ذہن میں قاتل کے طور پر چودھری کا نام آ جاتا تھا۔ بے شک یہ قتل اس نے اپنے ہاتھ سے نہیں کیے ہوں گے لیکن حکم تو اسی کا ہو گا۔ ابھی اس کی افضل سے براہ راست بات نہیں ہو سکی تھی اس لیے اس واقعے پر اس کی رائے کے بارے میں آگاہ نہیں تھا۔ اس نے عبدالمنان کو ہدایت کر رکھی تھی کہ جب بھی ممکن ہو اس کا افضل سے فون پر رابطہ کروا دیا جائے لیکن شاید اپنی بیوی بچوں کی آخری رسومات میں مصروف غم سے نڈھال افضل نے ڈسٹربنس سے بچنے کے لیے اپنا موبائل ہی آف کر رکھا تھا اس لیے متعدد بار کوشش کرنے کے باوجود اس سے رابطہ ممکن نہیں ہو سکا تھا۔ افضل سے رابطہ ہو جاتا تو وہ اس کے ساتھ گزرنے والے حادثے پر تعزیت کرنے کے ساتھ ساتھ اسے آفتاب کے بارے میں بھی بتا دیتا۔ جگو نے اسے آفتاب کے سلسلے میں پورا اطمینان دلایا تھا لیکن پھر بھی وہ مناسب سمجھتا تھا کہ کوئی ایسا شخص بھی اس کی خیر خبر لینے والا ہو جس سے اس کا قریبی تعلق اور دلی وابستگی ہو۔ افضل لاکھ دکھ اور صدمے کی کیفیت میں ہونے کے باوجود اپنے دوست کی خبر گیری میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھے گا، اس بات کا اسے یقین تھا۔

"سر! اسکردو سے کوئی میجر ذیشان آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔" وہ سوچوں کے تانے بانے میں الجھا ہوا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اس کا خیال تھا کہ افضل سے رابطہ ہو گیا ہو گا لیکن فون اٹھانے پر جو اطلاع دی گئی اسے سن کر وہ بری طرح چونک گیا۔ اسکردو میں آج کل مشاہدم خان مقیم تھا جس سے کئی دنوں سے اس کا رابطہ نہیں ہو سکا تھا۔ وہ مشاہدم خان کے غیاب پر تشویش میں مبتلا تھا اور اس نے وہاں کے ذمے دار افراد سے مشاہدم خان کا کھوج لگانے کے سلسلے میں گزارش بھی کی تھی لیکن فوج سے تعلق رکھنے والے کسی شخص کا فون کرنا خود اس کے لیے اچنبھے کی بات تھی۔

"بات کروائیں۔" اپنی حیرت اور تشویش کو ظاہر کیے بغیر اس نے جواب دیا۔

"ہیلو! اے سی صاحب! میں اسکردو سے میجر ذیشان بات کر رہا ہوں۔" رابطہ ملتے ہی اسے دوسری طرف سے ایک سنجیدہ اور بردبار آواز سنائی دی۔

"جی میجر صاحب! فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" اس نے بھی ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

"آپ کو میری درخواست پر یہاں اسکردو تک آنے کی زحمت اٹھانی پڑے گی۔" میجر ذیشان نے اسی سنجیدگی سے اسے جواب دیا۔ اس کے درخواست کا لفظ استعمال کرنے

www.pkdigest.com

کے باوجود شہریار پر واضح ہو گیا کہ یہ ایک سرکاری حکم ہے جس پر اسے عمل پیرا ہونا پڑے گا۔ اسے اس حکم کی پیروی میں کوئی عار نہیں تھا لیکن وہ اپنے اس طرح بلائے جانے کی وجہ بھی سمجھنے سے قاصر تھا۔

''میں حاضر ہو جاؤں گا لیکن کیا آپ بتانا پسند کریں گے کہ میری وہاں اس طلبی کا کیا مقصد ہے؟''

''میں بہت کھل کر اس وقت آپ کو سب کچھ نہیں بتا سکتا لیکن دو نام ایسے ہیں جنہیں سن کر یقیناً آپ یہاں آنے میں کوئی تاخیر کرنا پسند نہیں کریں گے۔ آپ کا ڈرائیور مشابرم خان اور پیر آباد کی ماہ بانو دونوں اس وقت میرے پاس ہیں اور ان دونوں افراد نے اپنے بیان میں آپ کا نام لیا ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ سے مل کر ان دونوں کی بہت سی باتوں کی تصدیق کی جا سکے۔'' میجر ذیشان نے اس کے استفسار کے جواب میں دھماکا ہی کر ڈالا۔ وہ تو صرف مشابرم خان کے بارے میں کسی اطلاع کی امید کر رہا تھا لیکن وہاں تو مشابرم خان کے ساتھ ساتھ ماہ بانو کے مل جانے کی خوش خبری بھی اسے سنائی جا رہی تھی۔

''میں ان دونوں افراد سے واقف ہوں اور مجھے یقین ہے کہ انہوں نے آپ کو اپنے بارے میں جو کچھ بھی بتایا ہے اس میں کوئی جھوٹ شامل نہیں ہوگا۔'' اپنے اندر کا ہیجان بہ مشکل چھپاتے ہوئے اس نے ہموار لہجے میں میجر ذیشان کو یقین دہانی کروائی۔

''آپ اتنے اطمینان سے یہ بات اس لیے کہہ رہے ہیں کہ آپ حالات سے مکمل طور پر واقف نہیں۔ یہاں بہت حساس نوعیت کے واقعات پیش آچکے ہیں جن کی تحقیق و تفتیش بڑی باریک بینی سے کی جا رہی ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں آپ کا تعاون بھی درکار ہے اسی لیے میں نے آپ کو کال کی ہے اور میری خواہش ہے کہ آپ جتنی جلدی ممکن ہو سکے بنا کسی تاخیر کے یہاں تشریف لے آئیں۔'' میجر ذیشان کے جواب نے اسے الجھن میں ڈال دیا لیکن اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ معاملہ اگر بہت حساس نوعیت کا ہے تو اس کے استفسار کے باوجود میجر ذیشان اسے فون پر مزید کچھ بتانا پسند نہیں کرے گا چنانچہ کوئی سوال کیے بغیر سنجیدگی سے بولا۔

''آپ فکر نہ کریں میجر صاحب! میں فوری طور پر وہاں پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ آپ مجھے اپنا کانٹیکٹ نمبر نوٹ کروا دیں تا کہ میں آپ سے رابطے میں رہ سکوں۔'' اس کی فرمائش پر میجر ذیشان نے اسے کانٹیکٹ نمبر نوٹ کروا دیا۔

''عبدالمنان! چیک کرو کہ اسکردو جانے والی فرسٹ فلائٹ کب کی ہے۔ اس فلائٹ پر میرے لیے ایک سیٹ بک کروا دو۔'' فون سے فارغ ہونے کے بعد اس نے انٹرکام پر عبدالمنان کو حکم دیا۔

''اوکے سر! میں دیکھتا ہوں۔'' یقیناً وہ بھی اس کا یہ اچانک پروگرام سن کر حیران ہوا تھا لیکن کوئی سوال کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ عبدالمنان کو ہدایت دینے کے بعد گھر پر اپنے بیٹ مین کو تیاری کے سلسلے میں احکامات دینے لگا۔ دفتری امور کے سلسلے میں اہم نوعیت کی ہدایات اور احکامات جاری کرنے تک بیٹ مین اس کے حسب ہدایت اس کا سامان تیار کر کے بھجوا چکا تھا جو گاڑی کی ڈکی میں رکھا تھا اور وہ ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میں لاہور کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ لاہور سے اسے بذریعہ ہوائی جہاز اسلام آباد جانا تھا جہاں عبدالمنان کی کوششوں سے اسکردو جانے والی فلائٹ میں اس کے لیے بکنگ ہو چکی تھی۔ نور کوٹ سے لاہور ائرپورٹ تک کا طویل سفر طے کر کے وہ ڈپارچر لاؤنج میں پہنچا تو عبدالمنان نے اسے افضل سے رابطہ ہو جانے کی اطلاع دی۔

''ٹھیک ہے تم میری طرف سے اس سے تعزیت کرلو اور اسے آفتاب کے بارے میں بتا دو۔'' اس نے مختصراً احکامات جاری کیے۔ وہ بالکل عین وقت پر ائرپورٹ پہنچا تھا اور اس کے پاس اتنی مہلت نہیں تھی کہ وہ خود رک کر افضل سے بات کر سکتا۔ یوں بھی اسے جس دیار کی طرف جانا تھا وہاں سے خوشبوئے یار آ رہی تھی اور بہت عرصہ فرائض و حقوق کی ادائیگی میں الجھے رہنے کے بعد اب اس میں اتنا یارا نہیں رہا تھا کہ مزید ضبط کا مظاہرہ کر سکتا اور اپنے دل کی صدا پر لبیک کہتے ہوئے کوئے یار کی طرف روانہ ہونے کے بجائے کسی اور الجھن میں خود کو گرفتار کر کے بیٹھ جاتا۔

☆☆☆

''آفتاب۔'' وہ آنکھیں موندے بستر پر لیٹا قطرہ قطرہ اپنے جسم میں داخل ہوتے حیات بخش محلول کی تاثیر محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ گزرے حالات کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اس جانی پہچانی آواز کو سن کر چونک گیا اور فوراً آنکھیں کھول کر پکارنے والے کی طرف دیکھا۔ وہ افضل تھا، اس کا عزیز از جان دوست جو آنکھوں میں نمی لیے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''تم ٹھیک تو ہو نا دوست! ظالموں نے تمہارا یہ کیا حال کر دیا ہے؟'' آفتاب کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر اس نے دردمندی سے پوچھا اور اس کا دایاں ہاتھ تھام لیا۔

''جیسا ہوں تمہارے سامنے ہوں اور خود بھی حیران ہوں کہ میں زندہ بچ کر یہاں تک کیسے پہنچ گیا۔'' آفتاب نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔ اس کا سارا جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا اور یہ معمولی سی مسکراہٹ لبوں پر سجانے کے لیے بھی اسے سخت جدوجہد کرنی پڑی تھی۔

''زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ جس کا وقت پورا ہو جائے وہ گھر کی چار دیواری میں بھی محفوظ نہیں رہتا اور جس کی سانسیں باقی ہوں اس کے جینے کے لیے اللہ کوئی نہ کوئی ذریعہ بنا ہی دیتا ہے۔'' افضل کے لہجے میں زمانے بھر کا درد تھا جسے آفتاب اپنی دھن میں محسوس نہیں کر سکا اور اس کی تائید کرتے ہوئے کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔

''تم بالکل ٹھیک کہتے ہو یار! میں اب تک نہیں سمجھ پایا کہ وہ کون لوگ تھے جنہوں نے مجھے چودھری کے چنگل سے نجات دلائی۔ اپنے انداز و اطوار سے تو وہ غنڈے لگتے تھے لیکن میرے لیے رحمت کے فرشتے ثابت ہوئے۔ انہوں نے نہ صرف چودھری کے ڈیرے کے تہہ خانے سے مجھے نکالا بلکہ یہاں اس اسپتال میں داخل بھی کروا دیا۔'' وہ افضل کو بتاتے بتاتے یک دم چونک سا گیا۔ ''تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں ایڈمٹ ہوں؟''

''مجھے پی اے سی شہریار اعوال کے پی اے کا فون آیا تھا۔ انہوں نے مجھے اس اسپتال کا ایڈریس دیتے ہوئے بتایا کہ تم شدید زخمی حالت میں یہاں داخل ہو۔'' افضل نے اسے بتایا۔

''اس کا مطلب ہے کہ میری رہائی کے پیچھے اے سی صاحب کا ہاتھ ہے۔ انہوں نے جب دیکھا ہوگا کہ سیدھی انگلیوں سے گھی نہیں نکل رہا تو پھر انہوں نے وہ طریقہ استعمال کیا جس کے ذریعے چودھری جیسے بندے کو قابو کیا جا سکے۔''

''میرے خیال میں تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ تمہاری بازیابی کے سلسلے میں پہلے انہوں نے قانونی طریقہ استعمال کرتے ہوئے پولیس کے ذریعے چودھری کے ڈیرے پر ریڈ کروایا تھا جو کہ ناکام ثابت ہوا۔ اس ناکامی کے بعد انہوں نے سوچا ہوگا کہ یوں بات نہیں بنے گی اور انگلیاں ٹیڑھی کرنی ہی پڑیں گی چنانچہ انہوں نے تمہاری رہائی کے لیے غنڈا عناصر کو استعمال کیا۔ چودھری افتخار کے ڈیرے پر حملے کی اطلاع مجھے بھی ملی تھی لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ سارا ہنگامہ تمہاری خاطر کھڑا کیا گیا ہے۔ اب تمہیں یہاں اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں تو ساری کہانی سمجھ میں آ رہی ہے۔'' افضل نے اس کی تائید کرتے ہوئے خود بھی حالات کا تجزیہ کیا۔

''تمہیں کس نے اطلاع دی تھی میرے اغوا کی؟''

''میرے پاس منیب کا فون آیا تھا۔ پیر آباد میں کوئی اکوتا گجے والا ہے۔ اس نے تمہیں اغوا ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس نے منیب کو بتایا اور منیب سے اے سی صاحب اور مجھ تک خبر پہنچی۔'' افضل نے اسے بتایا۔

''اوہ آئی سی۔'' آفتاب نے تفہیمی انداز میں کہا اور پھر افسردگی سے بولا۔ ''اکو کی منگیتر رانی، کشور کی ملازمہ تھی۔ رانی بے چاری نے ہم دونوں کا بہت ساتھ دیا اور شاید اس جرم کی سزا میں ہی اس سے اس کی زندگی چھین لی گئی۔ میں رانی کی لاش ملنے کی اطلاع سن کر منیب کے مشورے پر پیر آباد سے نکل رہا تھا کہ چودھری کے کارندوں نے مجھے گھیر لیا۔ چودھری نے حالات کا تجزیہ کر کے اندازہ کر لیا تھا کہ کشور کو تمہارے ذریعے ہی گاؤں سے نکالا گیا ہے، بس وہ مجھ سے یہ بات کنفرم کرنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے اندر بھڑکتی انتقام کی آگ بھی تھی جس کی وجہ سے اس نے مجھ پر بے تحاشا تشدد کروایا۔ اسے مجھ پر اتنا شدید غصہ تھا کہ وہ مجھے جان سے مارنے کے بجائے سسکا سسکا کر زندہ رکھنے پر تلا ہوا تھا۔'' خود پر گزرنے والے تشدد کا سوچ کر آفتاب نے ایک جھرجھری سی لی پھر موضوع کو قدرے بدلتے ہوئے بولا۔ ''تم نے بھابی اور کشور کو تو میرے اغوا کے بارے میں نہیں بتایا نا؟ یہ خواتین ذرا کم ہمت ہوا کرتی ہیں اور کوئی بھی ایسی ویسی بات سن کر حوصلہ چھوڑ دیتی ہیں۔''

''آئی ایم سوری یار! اصل میں بات یہ ہے کہ مجھے خود تمہارے اغوا کا علم کشور کی وجہ سے ہو سکا۔ وہ فون پر تم سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جب اس کی تم سے بات نہیں ہو سکی تو اس نے پریشان ہو کر مجھ سے تمہارا پتا کرنے کو کہا۔ اس کے کہنے پر میں نے منیب سے رابطہ کیا تو معلوم ہوا کہ تمہیں اغوا کیا جا چکا ہے۔ میں یہ بات مہتاب کو بتا رہا تھا کہ میری لاعلمی سے کشور نے بھی سب کچھ سن لیا اور یہ سن کر وہ اتنے شدید اسٹریس میں آگئی کہ بے ہوش ہو کر گر گئی۔ گرنے سے اس کے سر میں بھی چوٹ لگ گئی۔ میں فوری طور پر اسے اسپتال لے گیا جہاں ڈاکٹر نے اسے ٹریٹمنٹ دینے کے بعد مجھے بتایا کہ سر کی چوٹ معمولی نوعیت کی ہے لیکن ذہنی صدمے کے باعث اسے ہوش نہیں آ رہا ہے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ کشور اسپتال میں ایڈمٹ ہے اور ہنوز بے ہوشی کی حالت میں ہے۔'' وہ خود بہت بڑے صدمے سے گزر رہا تھا لیکن خود پر کڑا ضبط کرتے ہوئے ابھی تک آفتاب پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا اور اسے یہ بتانے کے بجائے کہ تمہارے ساتھ

www.pkdigest.com

دوستی نبھانے کی خاطر میں اپنی محبوب بیوی اور معصوم بچوں سے ہاتھ دھو بیٹھا ہوں، کشور کی حالت پر مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی ندامت کا اظہار کر رہا تھا۔

''وہ کون سے اسپتال میں ہے؟ تم مجھے اس کے پاس لے چلو۔'' کشور کی حالت کے بارے میں سن کر وہ لیٹے سے اٹھ بیٹھا۔ اس پل اسے اس طرح اچانک اٹھ بیٹھنے سے جسم میں دوڑ جانے والی درد کی ٹیسوں کا بھی احساس نہیں ہو سکا۔ اگر کچھ دھیان میں تھا تو صرف یہ کہ اس کی کشور اس کی وجہ سے بے ہوشی کی حالت میں کسی اسپتال میں پڑی ہے۔

''تم وہاں کیسے جاؤ گے؟ تم تو خود اتنے شدید زخمی ہو۔ یہاں کے ڈاکٹرز تمہیں بستر سے اٹھنے اور باہر نکلنے کی اجازت نہیں دیں گے۔'' افضل نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے دوبارہ لٹانے کی کوشش کرتے ہوئے سمجھایا۔

''میں یہ سب نہیں جانتا افضل! مجھے ابھی اور اسی وقت کشور کے پاس جانا ہے۔ وہ میری وجہ سے اس حال کو پہنچی ہے اور میں اسے اس حال میں چھوڑ کر یہاں پڑا رہوں، یہ مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔'' وہ اس وقت شدید جذباتی ہو رہا تھا۔

''اوکے! تم تھوڑی دیر آرام سے لیٹ کر انتظار کرو۔ میں ڈاکٹرز سے بات کر کے کچھ کرتا ہوں۔'' اس کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے افضل نے مزید اسے روکنے کی کوشش کرنا بے سود جانا اور تسلی دیتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کو دوبارہ آفتاب کے پاس واپس آنے میں تقریباً پندرہ منٹ لگ گئے اور اس نے یہ پندرہ منٹ کسی مرغِ بسمل کی طرح تڑپتے ہوئے گزارے تھے۔ یہ تو شکر ہوا کہ افضل واپس آیا تو اس کے ساتھ وہیل چیئر لیے اسپتال کا ایک ملازم بھی موجود تھا جسے دیکھ کر آفتاب کو تسلی ہوئی ورنہ شاید وہ افضل پر خفا ہونے لگتا۔ افضل اور وارڈ بوائے نے مل کر اسے وہیل چیئر پر بٹھایا۔ افضل خود اس کی وہیل چیئر کو دھکیلتے ہوئے اس مقام تک لے گیا جہاں انہیں لے جانے کے لیے ایمبولینس تیار کھڑی تھی۔ آفتاب کو اس میں منتقل کر دیا گیا۔

''ڈاکٹرز نے بہت مشکل سے تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت دی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ تمہاری ٹانگ میں فریکچر ہے اور پھر بعض گہرے زخموں کو اسٹچز لگا کر بند کیا گیا ہے۔ خطرہ ہے کہ زیادہ حرکت کرنے سے اسٹچز کھل سکتے ہیں۔ میں نے مشکل سے سمجھایا کہ ان کے اجازت نہ دینے پر بھی تم رکنے کے لیے راضی نہیں ہو گے میرے اصرار پر انہوں نے جگو نامی آدمی کو فون کر کے اسے صورتِ حال بتائی اور پھر اس کی طرف سے اجازت ملنے پر مجھے اجازت دی کہ میں تمہیں اپنے ساتھ لے جا سکتا ہوں۔'' ایمبولینس اسپتال سے نکل کر سڑک پر دوڑنے لگی تب افضل نے اسے یہ ساری تفصیل بتائی۔

''جگو وہی شخص ہے جس نے اپنے آدمیوں کے ساتھ مل کر مجھے چودھری کے ڈیرے سے نکالا تھا۔'' اس نے بتایا تو افضل سر کو تھپکی جنبش دے کر چپ ہو گیا۔ باقی کا راستہ خاموشی کے ساتھ ہی کٹا۔ درمیان میں بس ایک بار افضل نے کوئی فون کال ریسیو کی۔ اس کا موبائل یقیناً وائبریشن پر تھا اس لیے آفتاب کو گھنٹی کی آواز سنائی نہیں دی تھی۔

''میں آپ کو بتا چکا ہوں انسپکٹر صاحب کہ میں کسی مشکوک فرد کا نام نہیں لے سکتا۔ میں صحافی ہوں اور میرے قلم والفاظ کی وجہ سے میرے اتنے دشمن ہیں کہ میں خود بھی اپنے ان دشمنوں سے واقف نہیں ہوں، ایسے میں کسی کا خاص طور پر نام لینا میرے لیے کسی صورت ممکن نہیں۔'' افضل کے الفاظ اس کے کانوں میں پڑے تو وہ ذرا چونکا۔

''خیریت! کیا معاملہ ہے؟''

''کچھ نہیں یار! تمہیں تو معلوم ہے کہ ہم لوگوں کے ساتھ کچھ نہ کچھ چلتا ہی رہتا ہے۔'' افضل نے اسے ٹال دیا۔ کچھ وہ بھی ذہنی طور پر مکمل حاضر نہیں تھا اس لیے زیادہ دھیان نہیں دیا۔ جلد ہی ایمبولینس نے انہیں ایک نجی اسپتال تک پہنچا دیا۔ افضل اسے وہیل چیئر پر بٹھا کر ایک کمرے تک لے گیا۔ آفتاب کو کشور سے ملانے لانے سے پہلے وہ اسپتال کی انتظامیہ سے فون پر بات کر چکا تھا اس لیے کسی نے اسے روکا نہیں۔ کمرے کا بند دروازہ کھول کر وہ آفتاب کی وہیل چیئر کو دھکیلتا ہوا اندر لے گیا تو آفتاب کا دل گویا کسی نے مٹھی میں لے کر بھینچ لیا۔ ہاتھ میں لگی ڈرپ اور مختلف نلکیوں کی محتاج بنی بستر پر بند آنکھوں کے ساتھ لیٹی زرد رو لڑکی وہ بھی جس کی تندو تیز محبت نے اس کی ایک مخصوص دائرے میں گھومتی زندگی میں کچھ نئے رنگ بھر کر ہلچل سی مچا دی تھی اور اب وہ لڑکی یوں بے حس و حرکت اسپتال کے ایک بستر پر لیٹی تھی... تو اس کا دل بُری طرح بھر آیا۔ اپنی کسی بھی تکلیف کی پروا نہ کرتے ہوئے اس نے اس بار افضل کی مدد لینے کے بجائے خود وہیل چیئر کو حرکت دی اور کشور کے نزدیک جا پہنچا اور بہت دھیمی آواز میں بالکل سرگوشی کے سے انداز میں اس کے کان کے قریب اپنے ہونٹ لے جا کر اسے پکارا۔

''کشور...'' یہ ایک سرگوشی نہیں تھی۔ صدا تھی جو کشور کے کانوں سے گزر کر اس کے جسم و جان میں گونج اٹھی۔

''آنکھیں کھولو میری جان! دیکھو میں تمہارا آفتاب تم

سے ملنے آیا ہے۔ کیا ایک نظر مجھے دیکھو گی نہیں؟'' اس نے کشور کا ہاتھ تھام کر اسے چومتے ہوئے سرگوشی میں ہی استدعا کی۔ اس کے ساتھ کمرے میں موجود افضل چپکے سے پلٹ کر باہر نکل گیا۔ وہ محبت کو سمجھنے والا آدمی تھا۔ اسے معلوم تھا کہ دل کی گہرائیوں سے کسی سے سچی محبت کرنے والا شخص صرف محبت نہیں کرتا بلکہ عبادت کرتا ہے کیونکہ محبت اسے سکھاتی ہے کہ جس خالق نے محبت تخلیق کی ہے وہ خود کس قدر چاہے جانے کے قابل ہے۔ محبت کرنے والا صرف اپنے محبوب سے محبت نہیں کرتا بلکہ اسے محبوب سے بڑھ کر محبوب جانتا ہے جس نے اس کے محبوب کو تخلیق کیا ہے۔ محبت اللہ پر انسان کے یقین کو پختہ کرتی ہے۔ اس وقت آفتاب جو اتنی بے قراری سے کشور کو پکار رہا تھا تو اسی یقین کے سہارے پکار رہا تھا کہ جس رب نے اس کے دل میں محبت کا بیج بویا ہے، وہ اس کی صدا میں اتنی طاقت بھی پیدا کرے گا جو کشور کو اس کی بے ہوشی سے باہر نکال سکے۔ کوئی اس رمز کو سمجھے نہ سمجھے لیکن درحقیقت جو کچھ آفتاب کر رہا تھا وہ عبادت تھی۔

''تم ڈر گئی تھیں نا کہ کہیں میں تم سے جدا نہ ہو جاؤں۔ اٹھو اور دیکھو کہ تمہاری محبت مجھے زندہ تمہارے پاس لے آئی ہے۔'' بہت دھیمی آواز میں یہ کہہ کر اس نے کشور کے نیم وا لبوں پر ایک نرم سا بوسا دیا۔ اس بوسے کی حرارت نے گویا اس کے وجود میں برقی رو دوڑا دی اور بے حد بڑے جسم کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اسے لگنے والے اس جھٹکے نے آفتاب کو دیوانہ سا کر دیا اور اس عالمِ دیوانگی میں وہ کشور کے ایک ایک نقش کو چومتا چلا گیا۔ اس کی پیشانی، آنکھیں، رخسار، لب، گردن ہر ہر جگہ پر آفتاب کے بوسے ثبت ہوتے چلے گئے۔

''میں موت کے منہ سے لوٹ کر آیا ہوں۔ مجھے یہ زندگی تمہارے لیے دی گئی ہے۔ تم مجھ سے منہ موڑ کر اس طرح چپ چاپ لیٹی نہیں رہ سکتیں۔ تمہیں آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھنا ہوگا اور مجھے یہ یقین دلانا ہوگا کہ زندگی کے اس سفر میں تم ہر قدم پر میرے ساتھ ہو۔'' وہ اسے بے تحاشا پیار کرنے کے ساتھ ساتھ مسلسل اس سے سرگوشیوں میں مخاطب بھی تھا۔ بالآخر کشور نے اس کی صدا پر لبیک کہا اور آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا لیکن ایسا وہ صرف پل بھر کے لیے ہی کر سکی تھی۔ ابھی آفتاب اس کی کھلی آنکھوں کو دیکھ کر پوری طرح خوش بھی نہیں ہو سکا تھا کہ ایک بار پھر اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور جسم کو مسلسل جھٹکے لگنے لگے۔ اس کی اس کیفیت پر وہ پریشان ہو گیا اور وہیل چیئر کو تیزی سے حرکت دیتا ہوا دروازے تک پہنچا۔ دروازے پر پہنچ کر اس نے ڈاکٹرز کو پکارنا شروع کر دیا۔ فوراً ہی دو تین افراد کشور کے کمرے کی طرف بھاگے۔ ان میں سے کسی نے اس کی وہیل چیئر کو دھکیل کر مکمل طور پر دروازے سے باہر کر دیا اور پھر دروازہ بند ہو گیا۔ افضل جو باہر ہی موجود تھا تیزی سے اس کے قریب آیا۔

''اس کے لیے دعا کرو یار! اسے کچھ ہوا تو میں خود کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گا۔ اس نے میری خاطر روایتوں سے ٹکر لی ہے۔ وہ آنکھوں میں بہت سے خواب سجا کر میری طرف آئی تھی۔ اس کے سارے خواب مجھ پر قرض ہیں، اگر اسے کچھ ہو گیا تو میں یہ قرض کیسے ادا کروں گا؟'' وہ دلاسے کے لیے شانے پر رکھا افضل کا ہاتھ تھام کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

''حوصلہ کرو آفتاب! اللہ نے چاہا تو کشور کو کچھ نہیں ہو گا۔ تم دونوں ایک دوسرے کے لیے بنے ہو۔ اللہ تمہیں بھی ایک دوسرے سے جدا نہیں کرے گا۔'' افضل نے نم آنکھوں کے ساتھ خلوصِ دل سے یہ سب کہتے ہوئے گویا اس کے لیے دعا بھی کی۔ ابھی تو اس کا اپنا زخم بالکل تازہ تھا۔ چنانچہ اس کی دعا میں وہ تڑپ بھی شامل تھی جو عرشِ الٰہی کو ہلا ڈالنے کی طاقت رکھتی ہے۔ اس کی تسلی اور دلاسوں نے آفتاب کو بھی سنبھلنے میں مدد دی اور وہ خود پر قابو پا کر جھکے سر کے ساتھ دل ہی دل میں پروردگار سے کشور کی زندگی کے لیے بھیک مانگنے لگا۔ یہی کام اس کے ساتھ افضل بھی کر رہا تھا۔ اس نے خود جدائی کا زخم سہا تھا چنانچہ نہ دل سے خواہش مند تھا کہ اس کے دوست کو یہ زخم نہ سہنا پڑے۔ اللہ اللہ کر کے انتظار کی جاں گسل گھڑیاں گزریں اور تقریباً پون گھنٹے بعد ایک ڈاکٹر نے ان کے قریب آ کر خوش خبری سنائی۔

''مبارک ہو۔ آپ کی مریضہ بالکل ٹھیک ہیں۔ بس طویل بے ہوشی کے بعد ہوش میں آنے کی وجہ سے ان کی حالت بگڑ گئی تھی لیکن اب سب کچھ انڈر کنٹرول ہے۔ میں نے اور میرے ساتھی ڈاکٹرز نے مل کر ان کا اچھی طرح چیک اپ کیا ہے۔ ہمارا اندازہ ہے کہ ان کے سارے آرگنز بالکل صحیح فنکشن کر رہے ہیں۔ فوری طور پر ممکن ٹیسٹ ہم نے کر لیے ہیں لیکن کچھ ٹیسٹ مزید ہونا باقی ہیں جن کے لیے کچھ وقت درکار ہے اس لیے آپ کو کچھ دن اور مریضہ کو یہاں ایڈمٹ رکھنا ہوگا۔'' ڈاکٹر نے انہیں خوش خبری سنانے کے ساتھ ساتھ ساری صورتِ حال بھی واضح کی۔

''کیا ہم اپنے مریض کو دیکھ سکتے ہیں ڈاکٹر؟'' آفتاب تو کچھ بولنے کے لائق ہی نہیں رہا تھا، افضل نے ہی اس کے

www.pkdigest.com

جذبات کو زبان دیتے ہوئے ڈاکٹر سے دریافت کیا۔

''فی الحال ہم نے انہیں سکون آور ادویات دی ہوئی ہیں تاکہ وہ کسی اچانک لگنے والے جذباتی جھٹکے سے متاثر نہ ہوں۔ اس طرح طویل بے ہوشی سے ہوش میں آنے والے مریض بہت نازک ہوتے ہیں اور انہیں بہت احتیاط سے ہینڈل کرنا ہوتا ہے۔ میں یہ سب آپ لوگوں کو اس لیے سمجھا رہا ہوں کہ آپ سے جذبات میں کوئی غلطی سرزد نہ ہو اور آپ اپنے جذبات کو کنٹرول میں رکھیں۔''

''آپ بے فکر رہیں ڈاکٹر صاحب! ہم پوری احتیاط کریں گے۔'' ڈاکٹر کی ہدایات کے جواب میں افضل نے ہی اسے یقین دہانی کرائی۔

''او کے، آپ کے اصرار پر میں آپ کو صرف اتنی اجازت دے سکتا ہوں کہ آپ ایک نظر مریضہ کو دیکھ لیں لیکن پلیز خیال رکھیے گا کہ ان کو پکارنے یا ان سے بات چیت کرنے کی غلطی نہ ہو۔ ویسے تو وہ خود ادویات کے زیر اثر ہیں لیکن پھر بھی آپ کو پوری احتیاط کرنی ہوگی کہ انہیں معمولی سا بھی ڈسٹرب نہ کریں۔'' ڈاکٹر سختی سے ہدایات جاری کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا تو ان دونوں نے کشور کے کمرے کا رخ کیا۔ کمرے میں ایک نرس اس کی دیکھ بھال کے لیے موجود تھی۔ ان دونوں کو دیکھ کر وہ زبان سے کچھ نہیں بولی بس ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ پہلے ہی ڈاکٹر کی ہدایات سن کر آئے تھے چنانچہ خود سے بھی احتیاط برت رہے تھے۔ بستر پر دراز کشور کا چہرہ پہلے سے بھی زیادہ زرد لگ رہا تھا لیکن اس زردی کے باوجود اس کے تاثرات میں واضح تبدیلی محسوس کی جاسکتی تھی۔ پہلے اس کے ہر نقش سے بے چینی اور اضطراب ظاہر ہو رہا تھا جبکہ اس وقت اس کے چہرے پر واضح اطمینان چھایا ہوا تھا۔ اس اطمینان نے آفتاب کے دل کو بھی پُرسکون کر دیا اور وہ نرس کی طرف سے اشارہ ملنے سے قبل ہی اپنی وہیل چیئر سمیت کمرے سے باہر نکل گیا۔ وقت کے قلیل عرصے میں وہ جس بہت بڑے جذباتی طوفان سے گزرا تھا، وہ طوفان اس ایک نظر کی دید نے ہی تابوکر کے اسے پُرسکون کر دیا تھا۔

☆☆☆

''سب کچھ برباد ہو گیا۔ کچھ بھی باقی نہیں بچا۔ اتنے برسوں کی محنت اور انویسٹمنٹ منٹوں میں تباہ ہو کر رہ گئی۔'' مٹھیاں بھینچ کر کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلتا ہوا ڈیوڈ مسلسل بڑبڑا رہا تھا۔

''کچھ معلوم نہیں ہوا کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا؟ ہمارے آدمیوں سے کوئی تو ایسی غلطی ہوئی ہوگی جس کی وجہ سے ہمیں اتنا بڑا نقصان اٹھانا پڑا۔'' لہٰذا اسی کمرے میں ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس نے حسب معمول مختصر لباس زیب تن کر رکھا تھا لیکن اس وقت وہ اپنے حسن کی بجلیاں گرانے کے بجائے اس مسئلے میں زیادہ الجھی ہوئی تھی جس نے ڈیوڈ کا چین چھین لیا تھا۔ ان تک پاکستان کے پہاڑی سلسلے میں واقع اپنے خفیہ ٹھکانے کی تباہی کی خبر پہنچ گئی تھی۔ یہ خبر ایسی تھی جس نے انہیں ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ برسوں سے اس پروجیکٹ پر کام کر رہے تھے۔ اپنے لوگوں کو تربیت دے کر انہیں پاکستان کے دینی مدرسوں اور حلقوں میں اس طرح داخل کرنا کہ کوئی ان کی شخصیت پر بہروپ کا شک نہ کر سکے، کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ایسے افراد کو بہت ہوشیاری اور چابک دستی سے کام لینا پڑتا تھا۔ وہ بہت چالاکی اور مکاری سے لوگوں کے ذہنوں میں زہر انڈیلتے رہتے تھے پھر ان افراد میں سے ان لوگوں کو چھانٹ کر الگ کر لیا جاتا تھا جن کی روح تک اس زہر کے اثر سے نیلو نیل ہو جاتی تھی۔ عموماً یہ وہ لوگ ہوتے تھے جو کسی نہ کسی معاشرتی ناانصافی کا شکار ہوں۔ ایسے افراد کے اندر معاشرے کی... کئی ناانصافی کا بدلہ لینے کی خواہش درون دل الاؤ جل رہی ہوتی ہے چنانچہ اس خواہش کو مہمیز کر کے انہیں اپنے راستے پر چلانا آسان ہوتا ہے۔ ان کے اس پروجیکٹ میں بھارت بھی ان کے ساتھ تعاون کر رہا تھا۔ موساد کی نسبت بھارتی ایجنٹ یہ کام زیادہ آسانی سے کر لیتے تھے کیونکہ جغرافیائی اور ثقافتی مشابہت کے باعث ان کے لیے پاکستان کے ماحول میں سرو وائیو کرنا زیادہ آسان تھا۔ وہ نہ تو شکلوں سے الگ دکھائی دیتے تھے، نہ ان کے لیے اپنے لب و لہجے کو مخصوص ماحول میں ڈھال لینا زیادہ مشکل تھا۔ وہ پاکستانیوں کی نفسیات بھی بہتر طور پر سمجھتے تھے۔ ان ہی باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے موساد کے اکابرین نے راکو اپنے اس مشن میں شامل کرنا پسند کیا تھا۔ بھارت نے بھی اپنی ازلی پاکستان دشمنی کی وجہ سے بخوشی ان کے ساتھ شمولیت اختیار کر لی تھی حالانکہ موساد اس کے ایجنٹس کو صرف مہروں کی طرح استعمال کر رہی تھی اور انہیں سوائے اس کے کہ وہ پاکستانیوں میں ہی سے پاکستان کو کھوکھلا کرنے والے دہشت گرد تیار کرنے پر مامور ہیں، کچھ خبر نہیں تھی۔ بھارتی اکابرین اچھی طرح سمجھتے تھے کہ موساد مسلم دشمنی میں ان سے بھی دو ہاتھ آگے ہے چنانچہ انہوں نے کبھی سب کچھ جان لینے کے لیے زیادہ تردد بھی نہیں کیا تھا۔ کسی بھی طرح سہی پاکستان کو نقصان تو پہنچ رہا تھا، ان کے لیے یہ اطمینان کافی تھا۔ انہیں

جاسوسی ڈائجسٹ میں شائع ہونے والا مقبول سلسلہ

شناخت

مصنف: محی الدین نواب

اپنی شناخت کی تلاش میں سرگرداں، ایک بے شناخت کا احوالِ ثبات، اُس کی تعمیر میں مضمر خرابی کی ایک صورت اسے یہاں، وہاں لئے پھر رہی تھی، کبھی اِس ڈگر، کبھی اُس ڈگر..... بادلوں سا اُڑتا، ہواؤں سے لڑتا وہ اپنی اصل کو کھوجتا پھر رہا تھا، دنیا کی بھیڑ میں اُسے اپنے بھی ملے اور بیگانے بھی، دوست بھی..... حتیٰ کہ اپنا عکس بھی، بس وہ ہی نہیں مل رہا تھا، جس کی اُسے تلاش تھی..... وہ اپنے ہونے اور نہ ہونے کے درمیان معلق اپنے وجود میں بے وجودی کا شکار تھا اور آباد ہو کر بھی برباد۔

آئینہ خانہ دہر میں چہرہ چہرہ خود کو کھوجتے ایک بے شناخت کی داستان

2 جلدوں میں شائع ہوگئی ہے

خوب صورت سرورق، سفید کاغذ، عمدہ طباعت || قیمت مکمل سیٹ:-/700 روپے

القریش پبلی کیشنز سرکلر روڈ چوک اُردو بازار لاہور
فون: 042-37652546 , 042-37668958

www.alquraish.com E.mail:info@alquraish.com

www.pkdigest.com

پاکستان میں موجود موساد کے خفیہ ٹھکانوں کے بارے میں بھی مکمل معلومات حاصل نہیں تھیں۔ ان کے ایجنٹس کو چند مخصوص ٹھکانوں اور افراد تک محدود رکھا گیا تھا۔

موساد ایک ایسی قوم کی خفیہ تنظیم تھی جو برسوں کی نہیں صدیوں کی منصوبہ بندی کرتے ہیں اور ایسی منصوبہ بندی کی کامیابی کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ کم سے کم افراد کو رازدار بنایا جائے۔ اس پروجیکٹ کے لیے بھی جس میں بھارت نے بھی اچھی خاصی سرمایہ کاری کی تھی، انہوں نے خاصی رازداری برتی تھی اسی لیے اب حیران بھی تھے کہ ایک ایسا ٹھکانا جس کا علم ان کے معاونین کو بھی نہیں، آخر کیسے اور کیونکر تباہ ہوا؟ ان کے جو چند ایک ایجنٹس اسکردو میں موجود تھے، وہ بھی بہت زیادہ معلومات فراہم نہیں کرسکے تھے۔ بس انہیں یہی معلوم ہوسکا تھا کہ جہاں انہوں نے اپنی پہاڑی پناہ گاہ بنا رکھی تھی وہاں بہت شدید دھماکے سنے گئے تھے۔ ان دھماکوں نے پاکستان آرمی کو متوجہ کیا اور جب وہ لوگ وہاں پہنچے تو سب کچھ تباہ ہوچکا تھا۔ صرف چند زخمی افراد کو ہی وہاں سے لایا جاسکا تھا جن میں سے کسی کی زندگی کا کوئی بھروسا نہیں تھا۔ ان افراد کے بارے میں جو معلومات حاصل ہوئی تھیں، اس کے مطابق وہ سب ان کے لیے بے کار تھے کیونکہ ان میں سے کوئی بھی فرد ان کا کارکن نہیں تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہیں مختلف علاقوں سے گھیر کر لانے کے بعد اس خفیہ پناہ گاہ میں تربیت دی جارہی تھی۔ یہ افراد اگر زندہ بھی بچ جاتے اور کوئی بیان دینے کے لائق بھی ہوجاتے تو اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکتے تھے کہ وہ جذبۂ جہاد سے سرشار ہوکر آتشیں ہتھیاروں کا استعمال اور خودکش حملوں کی تربیت حاصل کررہے تھے۔ ان کا یہ بیان سننے والے یہی گمان کرتے کہ وہ کسی مذہبی انتہا پسند تنظیم کے لیے کام کررہے تھے۔ موساد یا را کا نام کسی صورت سامنے نہیں آسکتا تھا لیکن ڈیوڈ یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ اتنا بڑا حادثہ کیسے اور کیونکر پیش آیا۔ وہ اپنی غلطیوں سے سبق سیکھنے والے لوگ تھے چنانچہ یہ جاننا ضروری تھا کہ غلطی کہاں اور کیا ہوئی ہے؟ ویسے بھی وہ اپنی تنظیم کی طرف سے اس پروجیکٹ کا انچارج تھا، اس پر تفصیلات جاننے کی ذمے داری یوں بھی عائد ہوتی تھی۔ لنڈا نے جو اس کی گرل فرینڈ ہونے کے ساتھ ساتھ دستِ راست بھی تھی، سوال اٹھایا تو وہ ٹہلنا چھوڑ کر اس کے قریب ہی رکھی دوسری کرسی پر بیٹھ گیا اور میز پر پڑی شیمپین کی بوتل منہ سے لگا کر غٹاغٹ کئی گھونٹ چڑھا گیا۔ اس بوتل کے ساتھ وہاں گلاس بھی موجود تھے لیکن وہ جس ذہنی انتشار کا شکار تھا، اس میں کسی قسم کے تکلفات نہیں برت سکتا تھا۔ شراب حلق سے نیچے اتری تو وہ قدرے پُرسکون ہوا اور لنڈا کے سوال کا جواب دیتے ہوئے بولا۔

"غلطی تو یقیناً ہمارے لوگوں سے ہی ہوئی ہے۔ اب تک مجھے جو معلومات فراہم کی گئی ہیں، ان کی روشنی میں مشابرم خان نامی ایک کردار سامنے آیا ہے۔ یہ شخص اسے کی شہریار عادل کا ڈرائیور ہے جس کا آبائی گھر بلتستان میں ہی ہے۔ شہریار نے چودھری افتخار سے ماہ بانو کو محفوظ رکھنے کے لیے اسی شخص کے گھر میں چھپایا ہوا تھا۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ ماہ بانو مجھے مل گئی اور میں نے چودھری کو اپنے کنٹرول میں لینے کے لیے اسے کڈنیپ کروالیا۔ شہریار کو جب ماہ بانو کے کڈنیپ ہونے کی اطلاع ملی تو اس نے مشابرم خان کو اس کی تلاش پر مامور کردیا۔ مشابرم خان کا اپنا بھائی اس واقعے میں مارا گیا تھا چنانچہ ذاتی انتقام کی وجہ سے بھی وہ اس کام کو تندہی سے کرنے لگا۔ اس کی سرگرمیوں کا ہمارے لوگوں کو علم تھا لیکن وہ صرف اس وجہ سے کہ مشابرم خان اصل معاملے تک نہیں پہنچ سکتا اس سے چھیڑ چھاڑ کرنے سے گریز کرتے رہے اور شاید یہی ان کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ ان کی نظرانداز کردینے والی پالیسی کا فائدہ اٹھا کر مشابرم خان اچانک ہی کہیں غائب ہوگیا اور جانتی ہو کر کیا ہوا؟ وہی مشابرم خان آرمی والوں کو ہمارے پہاڑی ٹھکانے کے پاس زخمی حالت میں ملا ہے جسے انہوں نے تفتیش کے لیے اپنی کسٹڈی میں لے لیا ہے اور اتنا خفیہ رکھا ہے کہ ابھی تک ہمارا کوئی آدمی اس تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ نہ ہی یہ علم ہوسکا ہے کہ اس نے کیا بیان دیا ہے؟"

"یہ تو واقعی بہت گمبھیر صورتِ حال ہے۔ اس معاملے کی پوری انویسٹی گیشن ہونی چاہیے۔ ویسے مجھے یقین ہے کہ پہاڑی ٹھکانے پر موجود ہمارے افراد نے بھی کچھ ایسی غلطیاں کی ہیں جو ہمارے علم میں نہیں آسکیں ورنہ یہ تو کسی صورت ممکن نہیں کہ ایک اکیلا شخص اس ٹھکانے تک پہنچ کر اتنی آسانی سے اسے تباہ کردے۔ مجھے یا تمہیں خود وہاں جاکر ساری صورتِ حال کی چھان بین کرنی چاہیے۔" اس کی بات سن کر لنڈا نے مختصراً اپنا تجزیہ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ تجویز بھی پیش کی۔ اس وقت اس کے چہرے پر اتنی گہری سنجیدگی تھی کہ اگر چودھری افتخار اسے دیکھ لیتا تو ہرگز یقین نہیں کرتا کہ یہ وہی لنڈا ہے جس کی آنکھوں کے اشارے اور ہونٹوں پر بجلی کی طرح کوندتی مسکراہٹیں اسے بلاوا دیتی تھیں۔

"میرے خیال میں تم چلی جاؤ۔ ساتھ ساتھ چودھری کو بھی نمٹا دینا۔ اب صورتِ حال ایسی ہوگئی ہے کہ میں حسب

وعدہ ماہ بانو کو اس کے حوالے نہیں کرسکتا۔ وہ اسی پہاڑی ٹھکانے پر موجود تھی اور یقیناً دیگر افراد کے ساتھ ساتھ اس کے جسم کے بھی چیتھڑے اڑ گئے ہوں گے۔ چودھری کو ماہ بانو کے بغیر بہلانے اور کام کی طرف متوجہ کرنے کے لیے تمہارا وہاں جانا مفید ثابت ہوگا۔ ویسے بھی اپنی بیٹی والے معاملے میں الجھ کر وہ میری مرضی کی کارکردگی نہیں دکھا رہا ہے۔ ہونے کو تو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میں اپنے آدمیوں کے ذریعے اس کا مسئلہ حل کردوں لیکن میں اپنے بندوں کو ان غیر ضروری معاملات میں زیادہ استعمال نہیں کرنا چاہ رہا۔ ویسے بھی میں کوئی چودھری کا نوکر نہیں ہوں کہ اس کے تمام مسئلے حل کرکے دوں۔ ہم اس سے جو کام لے رہے ہیں، اس کے بدلے میں معاوضہ بھی دے رہے ہیں اس لیے تم وہاں جاؤ تو اسے اچھی طرح یہ بات سمجھا دینا کہ کام کو کام سمجھ کر کرے۔" عام حالات میں شاید وہ چودھری کو رعایت دے بھی دیتا لیکن اس وقت بُری طرح اپ سیٹ تھا چنانچہ سخت بے مروتی کا مظاہرہ کررہا تھا۔

"اوکے ڈارلنگ! تم ٹینشن مت لو۔ میں ہوں نا۔ میں سب کچھ سنبھال لوں گی۔" لنڈا نے اس کی کیفیت سمجھتے ہوئے اسے تسلی دی اور اسے اپنی بانہوں میں لے کر اس کے رخسار پر ایک بوسا دینے کے بعد وہاں سے رخصت ہوگئی۔ ڈیوڈ نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ جانتا تھا کہ لنڈا جتنی حسین ہے اس سے بڑھ کر خطرناک بھی ہے اور جب کوئی کام اپنے ذمے لے لیتی ہے تو پھر اس کی تکمیل کے لیے اپنی جان لڑا دیتی ہے۔ اب وہ اپنا مشن مکمل ہونے تک سکون سے بیٹھنے والی نہیں تھی چنانچہ اب وہ اسے اس کی کامیابی تک اپنی محبوبہ کے روپ میں نہیں دیکھ سکے گا۔ اب وہ صرف اور صرف موساد کی ٹاپ ایجنٹ کے روپ میں نظر آئے گی جسے عظیم اسرائیل کے مفادات سے زیادہ کسی شے کی پروا نہیں ہوسکتی تھی۔

☆☆☆

"آپ کی بیان کردہ تفصیلات ان تمام باتوں کی تصدیق کررہی ہیں جو ہمیں مشابرم خان اور ماہ بانو نے بتائی ہیں لیکن اس سے آگے کے معاملات اتنی بُری طرح الجھے ہوئے ہیں کہ مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ ان دونوں خصوصاً مشابرم خان کے ساتھ کس طرح پیش آیا جائے۔ وہ ایک ایسے معاملے میں انوالو ہوگیا ہے جس کا تعلق ملکی سالمیت سے ہے۔" اسکردو پہنچنے کے بعد شہریار کی میجر ذیشان سے ملاقات ہوئی تو اس نے میجر کی فرمائش پر ...... بلاکم وکاست ماہ بانو کا سارا قصہ سنانے کے ساتھ ساتھ مشابرم خان کے بلتستان آنے کی وجوہات بھی بیان کردیں۔ اس کا بیان سننے کے بعد ہی میجر ذیشان نے یہ تبصرہ کیا تھا۔ ویسے شہریار جانتا تھا کہ ان سب باتوں کی پہلے بھی کسی اور ذریعے سے تصدیق کروائی گئی ہوگی اور اسے یہاں بلانے کا مقصد محض شخصی ضمانت حاصل کرنا ہے چنانچہ اس نے اپنے بیان میں کہیں کسی غلط بیانی سے کام نہیں لیا تھا۔

"کیا آپ مجھے بتانا پسند کریں گے کہ وہ کون سے معاملات ہیں جن میں مشابرم خان اس طرح انوالو ہوگیا ہے کہ اس کی ذات آرمی انٹیلی جنس کے لیے مشکوک قرار پائی ہے؟" اس نے میجر ذیشان سے سوال کیا۔

"یہ تو بہت کانفیڈنشل معاملہ لیکن کیونکہ آپ شروع سے کسی نہ کسی حد تک اس معاملے سے جڑے رہے ہیں اس لیے میں آپ کو مختصراً بریف کرسکتا ہوں۔" وہ پہاڑوں میں ہونے والے دھماکوں سے لے کر فوج کے وہاں پہنچنے، مشابرم خان کے ملنے اور پھر اس کے بیان تک مختصر الفاظ میں شہریار کو سب کچھ بتاتا چلا گیا۔

"مجھے یقین ہے کہ اس میں ایک لفظ بھی غلط نہیں ہوگا۔ مشابرم خان بہت سچا اور کھرا آدمی ہے اور اس کے بیان کی تصدیق کے لیے ماہ بانو کا وہ بیان ہی کافی ہے جو اس نے ازخود آپ سے مل کر آپ کو دیا ہے۔ آپ دونوں کے بیانات کو آپس میں ملا کر دیکھیں تو اس بات کی تصدیق ہوجاتی ہے کہ اوپر پہاڑوں میں کسی دہشت گرد تنظیم کے ارکان نے اپنا خفیہ ٹھکانا بنا رکھا تھا جہاں وہ لڑکوں کو دہشت گردی کی تربیت دیتے تھے۔ ماہ بانو کے بیان میں عمران نامی جو کردار سامنے آیا ہے اس کے حالات سن کر یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ لوگ کس قسم کے افراد کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کررہے تھے۔ ایک شخص جو پہلے ہی پریشان حال ہو اور ظلم و ناانصافی کا شکار ہونے کے بعد اپنے لیے کوئی انصاف فراہم کرنے والا نہ پائے اس کو گھیر کر اس کی برین واشنگ کر ڈالنا اور اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ ہمارا پڑوسی ملک مسلسل ایسی کوششیں کرتا رہتا ہے اور مجھے افسوس سے یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ وہ اپنی اس کوشش میں کافی حد تک کامیاب بھی ہے۔" شہریار نے مشابرم خان کی حمایت میں اپنا موقف بیان کیا جسے سن کر میجر ذیشان چونک گیا۔

"آپ کیسے اتنے یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ اس معاملے میں پڑوسی ملک انوالو ہے؟"

"حالات کا تجزیہ کرنے پر میں یہی نتیجہ اخذ کرسکا ہوں۔ ماہ بانو کے بیان کی روشنی میں یہ بات سامنے آگئی ہے

کہ جن افراد کو دہشت گردی کی تربیت دی جا رہی تھی، انہیں مذہب کے نام پر یہ سب کچھ کرنے پر اکسایا گیا تھا۔ ایسا ہی ایک کیس میں اپنے ضلع میں دیکھ چکا ہوں۔ اللہ آباد نام کے ایک گاؤں میں ایک بھارتی ایجنٹ نے شاہنواز کا روپ دھار کر وہاں ایک مدرسہ قائم کر رکھا تھا۔ بظاہر شاہنواز ایک نیک اور گاؤں والوں کا ہمدرد آدمی تھا لیکن اندر ہی اندر وہ گاؤں کے بچوں کے معصوم ذہنوں کو بھٹکانے کا کام کر رہا تھا۔ اس کی برین واشنگ کے نتیجے میں عبدالحسین نام کا ایک نوجوان جذبات میں آکر خودکش حملہ آور بن گیا۔ عبدالحسین کی موت کے بعد میں تحقیقات کرتا ہوا شاہنواز کے مدرسے تک پہنچا تو وہ گاؤں کے دو نوجوانوں کو لے کر پہلے ہی فرار ہو چکا تھا لیکن مدرسے کی عمارت کی تلاشی لینے کے بعد یہ بات سامنے آگئی کہ شاہنواز اصل میں کوئی بھارتی ایجنٹ تھا جو سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اپنے مشن پر کام کر رہا تھا۔'' میجر کے سوال پر اس نے مختصراً اپنے یقین کی وجہ بیان کی۔

''آپ کا اندازہ کافی حد تک ٹھیک لگتا ہے مسٹر شہریار! تباہ شدہ پہاڑی ٹھکانے سے ہمیں جو اسلحہ اور ٹیکنیکل آلات کی باقیات ملی ہیں، ان میں سے بیشتر بھارتی ساختہ ہیں۔ اب یہ نہیں معلوم کہ وہ لوگ براہِ راست خود اس تنظیم کو چلا رہے تھے یا کوئی نام نہاد جہادی تنظیم ان اشیا کی بھارت سے غیر قانونی طور پر خریداری کرتی رہی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب کچھ اتنے خفیہ طریقے سے کیا گیا کہ ہماری انٹیلی جنس ایجنسیوں کو بھنک تک نہیں ملی۔ اب جو افراد زندہ ہمارے ہاتھ آئے ہیں ان میں سے بھی ایک آدھ ہی اس لائق ہے کہ کوئی بیان دے سکے اور ان کے دیے گئے بیانات سے اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں ہو سکا جو ہمیں مشارم خان اور ماہ بانو بتا چکے ہیں۔ ان حالات میں آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان دونوں کی ہمارے لیے کس قدر اہمیت ہوگی اور فی الحال ہم انہیں اپنی کسٹڈی میں ہی رکھنا پسند کریں گے۔''

''یہ ان دونوں کے ساتھ سخت زیادتی ہوگی میجر! ان دونوں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے بلکہ وہ تو خود حالات کا شکار ہوئے ہیں۔'' میجر کی بات سن کر شہریار نے احتجاج کیا۔

''مجبوری ہے مسٹر شہریار! ویسے بھی کم از کم مشارم خان کو تو مکمل طور پر معصوم نہیں مانا جا سکتا۔ اس نے قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کی غلطی کی ہے۔ اسے چاہیے تھا کہ پہلے ہی مرحلے پر جب اس کے علم میں یہ بات آگئی تھی کہ نیاز علی ڈرائیور کسی مشکوک سرگرمی میں ملوث ہے، وہ پولیس کو رپورٹ کرتا لیکن اس نے ایسا کرنے کے بجائے خود نیاز علی سے پوچھ گچھ کی کوشش کی اور اس کوشش میں نیاز علی اپنی جان سے چلا گیا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے صغیر ٹورسٹ کمپنی کے مالک صغیر بیگ کو اغوا کر کے حبسِ بے جا میں رکھا اور پھر خود ہی تنہا ایک مہم سر کرنے نکل کھڑا ہوا۔ اگر وہ یہ سب کرنے کے بجائے قانون نافذ کرنے والے اداروں کو اپنے اعتماد میں لیتا تو صورتِ حال مختلف بھی ہو سکتی تھی۔ ہم لوگ طریقے اور پلاننگ سے مجرموں کو گھیرتے تو بہت سی اہم معلومات حاصل ہو سکتی تھیں۔ اب تو سب کچھ تباہ ہو کر رہ گیا ہے اور ہم بالکل اندھیرے میں کھڑے ہیں، اس لائق بھی نہیں کہ کسی پر کوئی الزام دھر سکیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہم نے پہاڑوں پر ہونے والے دھماکوں کے لیے کیا مؤقف اختیار کیا ہے؟''

میجر ذیشان کے چہرے پر غصے کی ہلکی سی سرخی چھا گئی تھی جو اس بات کی علامت تھی کہ وہ ایک محبِ وطن آدمی ہے جسے میڈیا کے سامنے یہ بیان دیتے ہوئے کہ دھماکے دراصل پاک آرمی کے ایک ٹھکانے پر ہوئے تھے جہاں وہ اپنے معمول کی مشقیں کر رہے تھے... یقیناً شدید کوفت ہوئی تھی۔ دشمن سے اتنی بڑی زک اٹھانے کے بعد وہ اس لائق بھی نہیں تھے کہ اس کی طرف انگلی اٹھا سکیں جبکہ ان کے مقابلے میں بھارت والے اپنے ہاں ہونے والے ہر حادثے کے لیے بلاتکلف پاکستان پر الزام دھر دیتے تھے اور اپنے اس الزام کو ثابت کرنے کے لیے خود ہی سچے جھوٹے ثبوت بھی بنا ڈالتے تھے۔

''جو کچھ ہوا وہ، وہ یقیناً افسوسناک ہے اور میں تسلیم کرتا ہوں کہ مشارم خان سے کچھ کوتاہیاں ہوئی ہیں لیکن بہرحال وہ اتنا بڑا مجرم نہیں جس کے لیے کوئی سزا تجویز کی جا سکے۔ اگر آپ اسے مجرم قرار دیں گے تو پھر سب سے پہلے آپ کو خود اپنا جرم تسلیم کرنا پڑے گا۔ سب سے بڑی کوتاہی اور غفلت تو آپ کے ادارے سے ہوئی ہے۔ آپ کی ناک کے نیچے اتنا زبردست سیٹ اپ تیار کر لیا گیا اور آپ بے خبر رہے تو یقیناً یہ ایک مجرمانہ غفلت کا نتیجہ ہے۔ پھر بھی اگر آپ مشارم خان کو مجرم سمجھتے ہوئے اسے اپنی کسٹڈی میں رکھنے پر بضد ہیں تو میں کسی حد تک آپ کا مؤقف تسلیم کر لیتا ہوں لیکن ماہ بانو کو آپ کس بنیاد پر روک سکتے ہیں؟ وہ تو خود حالات کا شکار رہی ہے اور جیسے ہی اسے موقع ملا، اس نے سب سے پہلے آپ لوگوں سے رابطہ کر کے اپنے قانون پسند ہونے کا ثبوت فراہم کیا۔ کیا آپ اس لڑکی کو اس کی اس قانون پسندی کی سزا دیں گے؟'' وہ بھی بولنے پر آیا تو اپنے مزاج کے مطابق صاف صاف سب کچھ کہتا چلا گیا۔

''سوری مسٹر شہریار! میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ مجھے صرف آپ سے مل کر واقعات کی تصدیق کرنے کی ذمے داری سونپی گئی تھی۔ آگے کیا ہوتا ہے اور کیا نہیں... اس کا فیصلہ کرنل توحید کریں گے۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ اتنا مضبوط بیک گراؤنڈ رکھتے ہیں کہ آپ کے لیے کرنل توحید کو اپروچ کرنا زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوگا۔ آپ چاہیں تو ان سے ملاقات کر کے یہ سب ڈسکس کر سکتے ہیں۔'' میجر ذیشان نے سپاٹ لہجے میں اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ گویا ملاقات ختم ہو گئی تھی اور شہریار اتنا لمبا سفر طے کر کے یہاں تک پہنچنے کے بعد بھی ماہ بانو کی ایک جھلک دیکھنے سے محروم رہا...

☆☆☆

''ہیلو آفتاب! مبارک ہو یار، میں نے ابھی ابھی ڈاکٹر آفندی کو فون کیا تھا۔ ان سے معلوم ہوا کہ کشور کی حالت اب بالکل ٹھیک ہے اور وہ ایک نارمل پرسن کی طرح بی ہیو کر رہی ہے... یہ تو سن کر بڑی خوشی ہوئی اب تم بھی جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ تاکہ دونوں میاں بیوی اسپتال کا پیچھا چھوڑ کر کہیں کسی ڈھنگ کی جگہ رہ سکو بلکہ میرے خیال میں تو اسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد تم لوگ بیرونِ ملک یا [illegible] طرف نکل جانا۔ ایک لیٹ ہنی مون بھی منا لو گے اور [illegible] پھرنے والوں سے بھی پیچھا چھوٹے گا۔'' آج کل افضل کی مصروفیت بہت بڑھی ہوئی تھی۔ اس کے بے شمار جاننے والے تھے جن کی طرف سے ابھی تک تعزیت کا سلسلہ جاری تھا، دوسری طرف صحافتی ذمے داریاں بھی ایسی تھیں کہ وہ غم کی ان گھڑیوں میں بھی مکمل طور پر اپنا دامن چھڑانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ کسی نہ کسی اہم معاملے میں اس کی ضرورت پڑ جاتی تھی اور اس کے کولیگز بے پناہ معذرت اور شرمندگی کے اظہار کے ساتھ اس کی مدد لینے پر مجبور ہو جاتے۔ اپنی ان مصروفیات کی وجہ سے وہ دوبارہ اسپتال جانے کی مہلت نہیں نکال سکا تھا۔ البتہ اپنے اسی کولیگ کے ذریعے جس کی مدد سے کشور کو اس اسپتال میں شفٹ کروایا تھا، آفتاب کو بھی اسی اسپتال میں شفٹ کروا دیا تھا تاکہ وہ قریب رہ کر کشور کی خبر گیری بھی کرتا رہے اور خود اس کا علاج بھی جاری رہے۔ اس کے کہنے پر اس کے کولیگ نے آفتاب کو ایک نیا سیل فون سم سمیت مہیا کر دیا تھا اور اب وہ اسی سیل پر آفتاب سے بات کر رہا تھا۔

''میں تم سے ملنا چاہتا ہوں افضل!'' اس کی تمام باتوں کے جواب میں آفتاب نے صرف ایک جملہ کہا اور افضل کو ایسا لگا جیسے یہ جملہ کہتے ہوئے اس کا لہجہ بالکل بجھا ہوا ہو۔

''میں موقع دیکھ کر تمہارے پاس چکر لگاؤں گا لیکن سوری یار! ابھی فوری طور پر نہیں آسکتا۔'' اس نے معذرت کی۔

''مجھے معلوم ہے کہ تم بہت مصروف ہوگے اور تمہارے لیے میرے پاس آنا آسان نہیں ہوگا۔'' اس بار آفتاب کے لہجے میں تلخی سی تھی۔

''مصروفیت تو واقعی ہے لیکن میں احتیاطاً بھی تمہاری طرف آنے سے گریز کر رہا ہوں۔ مجھے شک ہے کہ کچھ لوگ مسلسل میری نگرانی کر رہے ہیں۔ ممکن ہے یہ چودھری کے کرگے ہوں اور میرے پیچھے لگ کر تم تک پہنچ جائیں۔'' اس نے آفتاب کے لہجے کی تلخی کو نظرانداز کرتے ہوئے رسان سے جواب دیا۔ اس کا خیال تھا کہ اسپتال میں مجبور و لاچار پڑے آفتاب کو اس کے انکار سے ٹھیس لگی ہے اس لیے اس کا لہجہ تلخ ہو چلا ہے۔

''اچھا ہے کہ پہنچ جائیں۔ کم سے کم تم تو مزید قربانی کا بکرا بننے سے بچ گے۔'' آفتاب کے جھنجلاہٹ اور یاسیت میں ڈوبے اس جواب نے اسے چونکا دیا۔

''کیسی باتیں کر رہے ہو یار!'' اس کے انداز پر الجھ کر وہ اتنا ہی کہہ سکا۔

''اور کتنا چھپاؤ گے دوست! تم پر جو گزری ہے اس نے مجھے صرف دکھ ہی نہیں دیا، گہری شرمندگی سے بھی دوچار کیا ہے۔ یہ احساس کہ تم میری وجہ سے، میری خاطر اتنے عظیم صدمے سے گزرے ہو، مجھے ایک پل چین نہیں لینے دے رہا۔'' اس بار آفتاب کی آواز رندھ سی گئی جبکہ افضل نے سارا معاملہ سمجھتے ہوئے ایک گہرا سانس لیا اور بولا۔

''میں نے تم سے کچھ چھپایا نہیں ہے بس بتانے سے گریز کیا تھا کہ تم پہلے ہی اتنی پریشانی میں تھے۔ ایک طرف تمہاری اپنی حالت، دوسری طرف کشور کی پریشانی چنانچہ میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ تمہیں ایک اور صدمے سے دوچار کر دوں۔''

''میری تکلیف اور پریشانی تمہارے دکھ کے سامنے کچھ بھی نہیں ہے۔ اگر مجھے تمہارا دکھ اپنے دل پر سہنا پڑے تو یہ ایک دوست کی حیثیت سے میرا حق ہے اور یہاں تو ایک طرح سے میں ہی تمہیں یہ دکھ پہنچانے کا سبب بنا ہوں۔''

''ایسا کچھ نہیں ہے۔ میری قسمت میں جو چوٹ لکھی تھی وہ مجھے مل گئی۔ ان تینوں کا مجھ سے بچھڑنا قدرت کا فیصلہ ہے۔ جب خدا نے ہمارا ساتھ ہی اتنا لکھا تھا تو سبب چاہے جو بھی ہوتا، مقررہ وقت پر یہ ساتھ ختم ہو ہی جاتا تھا۔ تم خوامخواہ خود کو موردِ الزام نہ ٹھہراؤ۔'' شدید غم سے دوچار ہونے کے

www.pkdigest.com

باوجود وہ آفتاب کو ایک اچھے دوست کا فرض ادا کرتے ہوئے اس کے احساس شرمندگی سے نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔

''مجھے تمہاری دوستی پر فخر ہے افضل اتم نے ہر ضرورت کے وقت پر میرا ساتھ دیا ہے لیکن افسوس کہ جب تم پر مشکل گھڑی آئی تو میں تم سے دور تھا۔ تم نے ملاقات ہونے پر بھی کچھ نہیں بتایا وہ تو ابھی تھوڑی دیر پہلے اتفاق سے میں نرس سے پچھلے دو چار دن کے اخبارات منگوا کر ان کا مطالعہ کر رہا تھا تو تمہارے متعلق خبر پر نظر پڑی۔ میں تو چکرا کر رہ گیا۔ یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ بھابی اور بچے اب اس دنیا میں نہیں رہے ہیں۔ سوچ رہا تھا تمہیں فون کر کے تم سے بات کروں لیکن ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی، وہ تو خود تمہاری کال آگئی۔'' وہ گہری اداسی میں ڈوبا کہتا جا رہا تھا۔

''بس یار! جو اللہ کو منظور تھا، وہ ہو گیا۔ زخم تو خیر ایسا لگا ہے کہ اب ساری زندگی بھرنے والا نہیں لیکن صبر کے سوا چارہ بھی کیا ہے؟ اب تو میری یہی خواہش ہے کہ تم اور کشور سکھی رہو اور سارے جہان کی خوشیاں پاؤ۔ میں تمہارے بچوں میں اپنے بچوں کا پیار پالوں گا۔'' افضل کی آواز میں بھی بالآخر دکھ کی جھلک آہی گئی لیکن اس نے خود پر فوراً ہی قابو پالیا۔

''اب تم آرام کرو اور اپنے ذہن کو فضول باتوں میں الجھنے سے بچاؤ۔ اور ہاں کسی قسم کی بے احتیاطی مت کرنا۔ ابھی تمہارا روپوش رہنا بہت ضروری ہے۔ چودھری کے کارندے کتوں کی طرح تمہاری بو سونگھتے پھر رہے ہوں گے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم ذرا سی بداحتیاطی سے ان کی نظر میں آجاؤ۔ اللہ نے تمہیں اور کشور دونوں کو نئی زندگی عطا کی ہے۔ اس زندگی کی قدر کرنا اور اس کی حفاظت کرنا تمہارا فرض ہے بلکہ میرا خیال ہے کہ تم اپنے اسپتال میں محدود رہنے کا فائدہ اٹھاؤ اور اس عرصے میں اپنا حلیہ تبدیل کر ڈالو۔ میرے خیال میں داڑھی مونچھیں رکھ لینے اور ہیئر اسٹائل تبدیل کر لینے سے تمہارے حلیے میں نمایاں تبدیلی آجائے گی اور سرسری طور پر دیکھنے والے کے لیے آسانی سے تمہیں شناخت کر لینا آسان نہیں رہے گا۔'' وہ پے در پے اس کو ہدایات جاری کرتا جا رہا تھا۔

''ٹھیک ہے یار! میں خیال رکھوں گا تم میرے لیے اتنا پریشان مت ہو۔'' اس نے افضل کو تسلی دی۔

''او کے، میں فون بند کرتا ہوں۔ آج مجھے ذرا اپنے دفتر کا بھی چکر لگانا ہے۔ کئی کام ادھورے پڑے ہیں، انہیں بھی دیکھنا ہے۔'' افضل نے فون بند کر دیا۔ فون بند کرتے ہی اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ وہ آفتاب سے بات کرتے ہوئے کمال ضبط کا مظاہرہ کرتا رہا تھا ورنہ حقیقت یہ تھی کہ اس کا دل دھاڑیں مار مار کر رونے کو چاہ رہا تھا۔ عجیب وقت آپڑا تھا کہ وہ دوست کے سینے سے لگ کر اپنے آنسو بھی نہیں بہا سکتا تھا اور اب اسے ساری زندگی ان آنسوؤں پر بند ہی باندھے رکھنا تھا۔ سینے میں موجزن غم کے طوفان کو ساری دنیا سے چھپا کر زندگی کو پوری فنکاری کے ساتھ گزارنا تھا۔

اس وقت بھی اس نے اپنے رونے کی خواہش کو پیچھے دھکیلا اور گاڑی کی چابیاں لے کر ایک حسرت بھری نظر خالی گھر پر ڈالتے ہوئے باہر نکل گیا۔ گاڑی اپنے علاقے سے نکال کر وہ مین روڈ پر پہنچا تو ایک ایسی گاڑی اس کی نظر میں آچکی تھی جو گھر سے مسلسل اس کے تعاقب میں تھی۔ اس نے اس تعاقب کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے سابقہ انداز میں ڈرائیونگ جاری رکھی۔ اگر تعاقب کرنے والوں کا مقصد اس کے ذریعے آفتاب اور کشور تک پہنچنا تھا تو وہ اس سلسلے میں پوری طرح محتاط ہو چکا تھا۔ اول تو وہ ان سے ملاقات کے لیے جانے کا ارادہ ہی نہیں رکھتا تھا اور اگر کبھی جاتا بھی تو پھر ان تعاقب کنندگان سے پیچھا چھڑا کر ہی وہاں جاتا۔ فی الحال تو اسے اپنے اخبار کے دفتر جانا تھا اور وہاں تک کسی کا پیچھے پیچھے پہنچ جانا کوئی قابل تشویش بات نہیں تھی۔ یہ دنیا جانتی تھی کہ وہ ایک مشہور اخبار کے ساتھ منسلک ہے اور اسی اخبار کے لانچ کردہ نیوز چینل کے لیے بھی کام کرتا ہے۔

شہر کے گنجان علاقے میں واقع اخبار کے دفتر کے سامنے اپنی گاڑی روک کر وہ نیچے اترا تو بیک ویو مرر میں اسے وہ گاڑی بھی نظر آگئی جو گھر سے ہی اس کے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ اس گاڑی کو یہاں بھی دیکھ کر اب کسی شک کی گنجائش باقی نہیں رہی کہ واقعی اس کی نگرانی کی جا رہی ہے۔ نگرانی کرنے والوں کے بارے میں وہ یہی قیاس کر سکتا تھا کہ وہ چودھری کے کارندے ہیں جنہوں نے مبینہ طور پر اس کے بیوی بچوں کو بھی قتل کیا تھا۔ اپنے ہنستے بستے گھر کو اجاڑنے والے قاتلوں کا تصور کر کے اس کی مٹھیاں غصے سے بھنچ گئیں لیکن اس غصے کے اظہار کے لیے پیچھے گاڑی میں موجود لوگوں تک جانا اور ان سے بھڑنا کوئی دانشمندی نہیں تھی۔ وہ بہ مشکل خود پر قابو پاتے ہوئے دفتر کی سیڑھیاں چڑھ گیا۔ وہاں موجود ساتھیوں نے بڑے خلوص سے اس کا خیر مقدم کیا۔ وہ سب تعزیت کے لیے اس کے گھر بھی آئے تھے اور اس کے ساتھ ہونے والے حادثے پر بڑے غم و غصے کا اظہار بھی کیا تھا۔ اس وقت بھی وہ لوگ اس سے بہت ہمدردی کے ساتھ حال احوال دریافت کرنے لگے۔ وہ ان لوگوں کے سوالوں کا جواب دے ہی رہا تھا کہ چپراسی پیغام لے کر آگیا کہ ایڈیٹر

صاحب اسے اپنے کمرے میں بلا رہے ہیں۔ ان تک اس کے آنے کی اطلاع پہنچانے والا بھی یقیناً وہی تھا۔ پیغام ملتے ہی وہ اٹھ کر ایڈیٹر کے کمرے میں چلا گیا۔

''آؤ افضل! مجھے تمہیں دوبارہ دفتر میں دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے۔ یہ مت سمجھنا کہ میں خود غرضی کا مظاہرہ کر رہا ہوں۔ ایسا میں تمہاری ہی وجہ سے کہہ رہا ہوں۔ تم جتنی جلدی خود کو زندگی کے معمولات میں شامل کر لو گے خود پر گزرنے والے حادثے کے صدمے کو سہنا اتنا ہی آسان ہوتا جائے گا۔ بس ان حالات میں تم خود کو تنہا مت سمجھنا۔ تم نے کسی مشکوک فرد کا نام نہیں لیا ورنہ تم دیکھتے کہ پوری صحافی برادری تمہارے پیچھے کھڑی ہو کر اس شخص کو کیفر کردار تک پہنچانے میں حصہ لیتی۔'' ایڈیٹر صاحب کے ان دعوؤں میں کتنے فیصد سچائی تھی، یہ افضل بھی سمجھتا تھا۔ وہ کوئی پہلا صحافی تو نہیں تھا جس کو کسی حادثے سے گزرنا پڑا تھا۔ کتنے تو اس دشت کی سیاحی میں خود اپنی جان بھی گنوا چکے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ ان کے ساتھی ایسے مواقعوں پر بھرپور احتجاج کرتے تھے لیکن انصاف... انصاف یہاں کس کو ملا تھا جو وہ اپنے لیے کوئی امید لگاتا۔ ہاں ایڈیٹر صاحب نے جو زبانی ہمدردی کروی تھی وہ بھی دل کو سہارا دینے کے لیے کافی تھی۔

''شکریہ سر! لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں خود بھی کام لینے سے قاصر تھا اس لیے آپ لوگوں کو کیسے زحمت دیتا؟'' اس نے ان کے سامنے بھی وہی موقف اختیار کیا جو اب تک پولیس اور پریس کے سامنے ظاہر کرتا رہا تھا۔ اس کے اس جواب کے بعد ایڈیٹر صاحب نے بھی موضوع بدل دیا اور ان پروجیکٹس پر گفتگو کرنے لگے جن پر وہ کام کر رہا تھا۔ آدھے گھنٹے کی ڈسکشن کے بعد جب انہیں یقین ہو گیا کہ افضل پہلے ہی خاصا کام کر چکا ہے اور آگے بھی مقررہ وقت پر اپنا کام کر لے گا تو انہوں نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔

''ارے ہاں افضل! یاد آیا، جس رات تمہاری بیوی اور بچوں کا قتل ہوا اُس دن صبح میں ایک شخص تمہارا پوچھتا ہوا یہاں دفتر آیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ تمہاری بیوی کا کزن ہے لیکن اسے تمہارے گھر کا ایڈریس معلوم نہیں اس لیے دفتر چلا آیا ہے۔ اس روز تم فیلڈ میں تھے۔ میں نے اس شخص کو تمہارے گھر کا ایڈریس دے دیا تھا۔ وہ گھر پر تم لوگوں سے ملنے آیا تو ہوگا؟'' وہ ایڈیٹر کے کمرے سے نکلنے ہی لگا تھا کہ انہوں نے پیچھے سے اسے آواز دے کر روکتے ہوئے یہ سب بتایا۔

''میری بیوی کا کزن...!'' افضل حیران ہوا۔

''کیا نام بتایا تھا اس نے اپنا؟''

''نام تو مجھے یاد نہیں رہا۔'' ایڈیٹر صاحب نے اپنا سر کھجایا۔ ''بہرحال، دیکھنے میں کسی اچھی فیملی کا ممبر لگ رہا تھا۔ رنگ گورا اور آنکھیں نیلی تھیں۔ جوان العمر آدمی تھا۔ میں نے سنا ہے کہ تمہاری بیوی کا تعلق کسی قبائلی خاندان سے تھا اس لیے اس جوان کو دیکھ کر مجھے یقین آگیا کہ وہ تمہارا سسرالی رشتے دار ہی ہے۔ کیا وہ تم سے ملنے تمہارے گھر نہیں آیا تھا؟'' انہوں نے اپنی یادداشت پر زور دے کر اسے تفصیلات بتاتے ہوئے آخر میں تشویش سے سوال بھی کیا۔

''میرے علم میں نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے وہ میری غیر موجودگی میں میری بیگم سے مل کر چلا گیا ہو۔ بعد میں تو اس بے چاری کو موقع ہی نہیں ملا کہ وہ مجھے کچھ بتا سکتی۔ ممکن ہے بعد میں اس کا وہ کزن جنازے میں شرکت کے لیے بھی آیا ہو لیکن اس روز اتنے لوگ تھے کہ مجھے خود ہوش نہیں کہ کون کون مجھ سے آکر ملا تھا۔'' وہ نوجوان کا حلیہ سن کر مزید کھٹک گیا تھا لیکن ایڈیٹر پر کچھ ظاہر کرنا مناسب نہیں سمجھا اور گول مول جواب دے کر باہر نکل گیا۔ اس کے بعد اس سے دفتر میں بھی زیادہ دیر نہیں ٹھہرا گیا اور وہ ایک گھنٹے سے بھی قبل وقت میں وہاں سے نکل پڑا۔ واپسی کے سفر میں بھی وہی گاڑی اس کے تعاقب میں تھی لیکن اب وہ تعاقب کنندگان کے بارے میں ابہام کا شکار تھا۔ پہلے تو اسے سو فیصد یقین تھا کہ چودھری کے کارندے آفتاب اور کشور کا پتا جاننے کے لیے اس کا پیچھا کر رہے ہیں لیکن اب وہ سوچنے پر مجبور تھا کہ کہیں یہ مہتاب کا وہ پٹھان زادہ تو نہیں جو ماضی میں بھی اس کا منگیتر رہا تھا اور جس نے تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ ایک نہ ایک دن ضرور مہتاب کو تلاش کر کے اپنے ٹھکرائے جانے کا انتقام لے کر رہے گا۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ مہتاب اور بچوں کو ٹھکانے لگانے کے بعد اب وہ افضل کی جان کے درپے ہوتا کہ اپنے انتقام کی تکمیل کر سکے۔ ان خیالوں میں گم گاڑی چلاتے ہوئے اس کی نظریں مسلسل عقب نما آئینے میں پیچھے آنے والی گاڑی کو دیکھ رہی تھیں۔ اس گاڑی اور اس کے سواروں کے بارے میں سوچتے ہوئے اسے اندازہ ہی نہیں ہو سکا اور پیچھے سے ایک تیز رفتار کار تعاقب میں آئی گاڑی کو اوورٹیک کر کے خود اس کی گاڑی کے ساتھ ساتھ بائیں جانب چلنے لگی۔ کار سوار نے لمحے بھر کے لیے اسے شعلہ بار نظروں سے دیکھا اور پھر ڈیش بورڈ پر پڑا چھوٹا مگر جدید ساخت کا پسٹل اٹھا کر اس کا نشانہ لیتے ہوئے ٹریگر دبا دیا۔

☆☆☆

''یہ کیا چکر ہے؟ تمہارے علاوہ اور کون ہے جو اس

www.pkdigest.com

سالے صحافی کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ اس کی وجہ سے ہم پہلے بھی ناکام رہے اور اب پھر اس نے ایسی گڑبڑ کی ہے کہ وہ صحافی کا بچہ اپنے سائے سے بھی ہوشیار رہنے لگے گا۔" بالا اپنی رپورٹ کے ساتھ چودھری کی خدمت میں حاضر تھا اور اس کی پیش کردہ رپورٹ سن کر چودھری نے تشویش بھرے لہجے میں یہ تبصرہ کیا تھا۔

"معلوم نہیں سرکار کون ہے۔ میں تو بس اتنا ہی دیکھ سکا کہ ایک گڈی ہمارے پیچھے سے نکل کر آگے آئی اور گڈی والے نے صحافی کی گڈی کے ساتھ چلتے ہوئے بالکل اچانک ہی فیر (فائر) مارا اور ہوا کی طرح اپنی گڈی نکال کر لے گیا۔ گولی کھا کر صحافی اپنی گڈی کو سنبھال نہیں سکا لیکن یہ ہے کہ اس کی قسمت چنگی تھی اس لیے گڈی تھوڑی اِدھر اُدھر ہوئی اور پھر شاید انجن بند ہونے کی وجہ سے رک گئی۔ گولی سے بھی اسے ایسا خاص نقصان نہیں پہنچا بس بازو کے زخمی ہونے پر ٹل گئی۔ اب اسپتال میں پڑا ہے علاج کے لیے۔ تین چار دن سے پہلے تو اسے وہاں سے چھٹی نہیں ملنے والی اس لیے میں گامے اور شیدے کو اس کی نگرانی کی ڈیوٹی دے کر آپ کے پاس چلا آیا ہوں۔" بالا، چودھری کے چہرے پر چھائی کوفت اور غصے کی سرخی کو دیکھتے ہوئے جواب میں ایک بار پھر وہی سب کچھ دہرا رہا تھا جو وہ پہلے بھی بیان کر چکا تھا۔

چودھری کا مزاج آج کل کس قدر برہم ہے، وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ کچھ نامعلوم افراد اس کے ڈیرے پر حملہ کر کے اس کے شکار آفتاب کو بہت صفائی سے نکال لے گئے تھے۔ اس رات حملے سے آدھا ایک گھنٹا پہلے ہی بالا اپنے آدمیوں کو لے کر لاہور کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ وہ لوگ افضل کے گھر جانے کے لیے نکلے تھے۔ حالات کے پیش نظر چودھری نے اسے اور فضلی کو اپنا رازدان بنا لیا تھا۔ چنانچہ اسے اس رات یہ کرنا تھا کہ افضل کے گھر پہنچ کر اسے اور اس کے اہل خانہ کو قابو میں کرتا اور اگر کشور وہاں موجود ہوتی تو اسے اپنے ساتھ لے آتا۔ دوسری صورت میں وہ افضل کے بیوی بچوں کو تشدد کا نشانہ بنا کر اسے اس بات پر مجبور کرتا کہ وہ کشور کا پتا بتا دے لیکن جب وہ اپنے آدمیوں کے ساتھ افضل کی رہائش گاہ پر پہنچا تو وہاں تو صورت حال ہی کچھ اور تھی۔ وہ اپنے ایک ساتھی کے ساتھ دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہوا تو انہیں گھر میں کسی کی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا بلکہ اندر داخل ہو کر ان لوگوں کو بالکل ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کسی غیر آباد گھر میں پہنچ گئے ہیں۔ گھر کے اس غیر معمولی سناٹے کو آدھی رات کے بعد چھا جانے والی خاموشی پر محمول کرتے ہوئے انہوں نے جائزہ لینا شروع کیا تو ایک کمرے میں افضل کی بیوی اور بچوں کی لاشیں دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ لاشیں دیکھ کر صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ انہیں سوتے میں موت کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ اس صورت حال پر ہکا بکا ہوتے ہوئے انہوں نے باقی گھر کی عجلت میں تلاشی لی لیکن نہ تو وہاں کشور موجود تھی اور نہ ہی افضل۔ وہ لوگ صورت حال کو نہ سمجھتے ہوئے واپس پلٹ گئے۔ واپس پہنچے تو معلوم ہوا ڈیرے پر اس عرصے میں کیا گزر چکی ہے۔ وہ خود شکاری بن کر کہیں شکار کرنے گئے تھے لیکن ایک طرف انہیں اپنی شکارگاہ میں کچھ نہیں ملا تو دوسری طرف پیچھے سے کوئی ان کے ٹھکانے پر ہی شکار کھیل کر چلا گیا۔ اپنے سارے اچھے لڑاکے بالا ساتھ لے کر گیا تھا۔ جو چند ایک ڈیرے پر موجود تھے وہ حملہ آوروں کا مقابلہ نہیں کر سکے تھے اور بری طرح چوٹ کھائی تھی۔

ڈیرے پر اس طرح حملہ ہو جانے کا تو ان میں سے کسی کو گمان تک نہیں تھا جو وہاں کی حفاظت کا بہت مضبوط انتظام کر کے جاتے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ ڈیرا دہشت کی ایسی علامت تھا جہاں کسی کی قدم رکھنے کی جرأت ہی نہیں ہوتی تھی اور ماضی میں وہاں عموماً دو سے تین ملازموں کی ڈیوٹی لگانے پر ہی اکتفا کیا جاتا تھا لیکن جب شہریار نے ایک بار وہاں گھس کر ڈیوٹی پر موجود دو بندوں کو اپاہج کرنے کے بعد صرف اپنی وہ تصویریں حاصل کر لیں جن کے ذریعے چودھری اسے بلیک میل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا بلکہ تہ خانے میں آگ بھی لگا گیا تو اس کے بعد وہ لوگ ڈیرے کی نگرانی کے بارے میں کافی چوکنے ہو گئے اور زیادہ آدمی وہاں نگرانی کا کام انجام دینے لگے لیکن اس رات تو مجبوری تھی۔ بالا ایک اہم کام کے لیے جا رہا تھا اور اس کے ساتھ ہوشیار بندوں کا ہونا ضروری تھا اور پھر وہ لوگ ڈیرا کوئی بالکل ہی خالی چھوڑ کر نہیں چلے گئے تھے۔ جتنے ہتھیار بند بندے وہاں موجود تھے وہ بھی نگرانی کے لیے کافی تھے لیکن ڈیرے پر حملہ ہی اتنا منظم ہوا تھا کہ وہاں موجود بندے کچھ نہیں کر سکے۔ اپنے آدمیوں کی اس شکست نے چودھری کو بڑا چراغ پا کیا تھا۔ اس کے بعد بالا بھی اپنی مہم میں ناکام ہو کر واپس آ گیا تھا۔ اس ہزیمت پر پہلے تو چودھری تمام کارندوں پر خوب گرجا برسا اور پھر جب غصے کی شدت ذرا کم ہوئی اور وہ کچھ سوچنے سمجھنے کے لائق ہوا تو اس نے بالے اور اس کے آدمیوں کو افضل کی نگرانی کا حکم دیا۔ اس حکم کو صادر کرنے اور پھر بالے کے عمل پیرا ہونے میں اتنا وقت لگ گیا تھا کہ وہ لوگ افضل کے پیچھے اس اسپتال تک نہیں پہنچ سکے جہاں آفتاب اور کشور دونوں زیر علاج

تھے۔ اپنی اس ایک اور بدقسمتی سے بے خبر وہ لوگ افضل کی نگرانی پر لگے رہے۔

افضل نے نگرانی کو محسوس کر کے اسپتال کا رخ ہی نہیں کیا لیکن اس نے کسی مرحلے پر ان نگرانی کرنے والوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی اس لیے بالے اور اس کے ساتھیوں کو اندازہ ہی نہیں ہو سکا کہ افضل نے اپنے تعاقب کو بھانپ لیا ہے۔ وہ معمول کے مطابق اپنے کام میں لگے رہے لیکن اب پھر ایک ایسا حادثہ پیش آ گیا تھا جس کے باعث افضل کی نقل و حرکت اسپتال کے ایک کمرے تک محدود ہو کر رہ گئی تھی اور وہ اس کا تعاقب کرتے ہوئے ایسی کسی جگہ نہیں پہنچ سکتے تھے جہاں آفتاب یا کشور میں سے کسی کو پا سکتے۔ ان حالات میں چودھری کا مزاج برہم ہونا ایک لازمی بات تھی اور اسی برہمی کے پیش نظر ہی بالا معمول سے کہیں زیادہ نظریں جھکا کر عاجزی سے بات کر رہا تھا پھر بھی اسے ڈر تھا کہ کہیں چودھری بھڑک نہ جائے اور حالات و واقعات کی الٹ پھیر کی وجہ سے کشور اور آفتاب تک پہنچنے میں جو تاخیر ہو رہی ہے، اس کی ذمے داری اس کے شانوں پر ڈال کر اس پر الٹ ہی نہ پڑے لیکن خوش قسمتی سے گفتگو کے اختتام پر پہنچنے سے پہلے ہی چودھری کا موبائل بج اٹھا۔ چودھری نے موبائل کی اسکرین پر کال کرنے والے کا نام پڑھنا چاہا لیکن وہاں کوئی اجنبی نمبر جگمگا رہا تھا۔ اس نے کچھ بے دلی کی سی کیفیت میں کال ریسیو کی۔

"کیا بات ہے چودھری صاحب! آواز کچھ بجھی بجھی سی لگ رہی ہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟" اس کی بے دلی سے کی گئی ہیلو کے جواب میں دوسری طرف سے بہ زبان انگریزی جس کھنکتی ہوئی آواز نے اسے مخاطب کیا، اسے سن کر وہ بہت زیادہ اعصابی تناؤ کا شکار ہونے کے باوجود کھل اٹھا۔ اس کھنکناتی سریلی آواز نے اسے بولنے والی کا دلکش سراپا اور گرم جوش قربت یاد دلا دی تھی۔

"لنڈا... او یئر آر یو؟ میرے موبائل پر جو نمبر آ رہا ہے وہ تو پاکستان کا ہی ہے۔ کیا تم یہاں ہو؟" اس نے بہت بے تابی سے پوچھتے ہوئے بالے کو وہاں سے جانے کا اشارہ کیا۔

"یس، آئی ایم ہیئر۔" اس نے اپنی مخصوص بلاوا دیتی ہنسی کے ساتھ جواب دیا۔

"یہاں کہاں؟ لاہور ائرپورٹ پر یا کسی ہوٹل میں؟ مجھے بتاؤ میں فوراً تمہیں لینے کے لیے گاڑی بھیجتا ہوں۔" چودھری نے بے تابی سے کہا تو وہ ایک بار پھر ہنس پڑی پھر شوخی سے بولی۔

"ابھی بھی کیا بے صبری چودھری صاحب! میں یہاں تک آئی ہوں تو کسی نہ کسی روز آپ سے ملنے بھی آ ہی جاؤں گی۔"

"کسی روز کیوں؟ آج اور ابھی کیوں نہیں؟" چودھری نے کسی نوجوان عاشق کی سی بے قراری سے سوال کیا۔

"ابھی کچھ پابندی ہے۔" اس نے مبہم سا جواب دیا۔

"کیسی پابندی؟ اور یہ پابندی کس نے لگائی ہے؟"

"ڈیوڈ نے۔" یہ جواب دے کر اس نے لمحہ بھر کے لیے توقف کیا اور پھر بھرپور سنجیدگی کے ساتھ بولی۔ "مجھے ڈیوڈ ہی نے یہاں بھیجا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ میں نے چودھری افتخار سے وعدہ کیا تھا کہ لنڈا کو پاکستان بھیجوں گا اس لیے اپنا وہ وعدہ پورا کرنے کے لیے میں تمہیں بھجوا رہا ہوں لیکن ظاہر ہے کہ وہ مجھے صرف آپ کی دل بستگی کے لیے تو نہیں بھیج سکتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ میں آپ کے پاس جاؤں اور اب تک جو کام ہوا ہے اس کا جائزہ لوں۔"

"ہاں تو ٹھیک ہے تم آؤ اور جائزہ لے لو۔" اس نے فوراً پیشکش کی۔

"لیکن کس چیز کا؟" لنڈا کے لہجے میں اس بار طنز کی کاٹ تھی۔ "آپ کیا سمجھ رہے ہیں ڈیوڈ آپ کی طرف سے بے خبر ہے؟ اسے ساری خبر ہے۔ وہ جانتا ہے کہ آپ نے ابھی تک کام شروع نہیں کروایا ہے۔ اس صورت حال پر وہ بہت برہم ہے اگر میں درمیان میں نہ ہوتی تو وہ بہت سختی سے آپ سے بازپرس کرتا لیکن میں نے آپ کی اور اپنی فرینڈشپ کا خیال کرتے ہوئے اسے باز رکھا اور یقین دلایا کہ میرے کہنے پر آپ اپنے کام کی طرف متوجہ ہو جائیں گے۔ اب میں آپ سے کہہ رہی ہوں کہ آپ کے پاس چند دن کی مہلت ہے۔ تمام ضروری سامان ہم پرووائڈ کر چکے ہیں۔ آپ اپنے آدمیوں کو کام پر لگا دیں جب مجھ تک یہ اطلاع پہنچے گی کہ آپ کے آدمی ہمارے حسب منشا کام کر رہے ہیں تو پھر میں خود آپ سے ملاقات کے لیے رابطہ کروں گی۔"

ایک تو چودھری کو یہ اندازہ تھا کہ ڈیوڈ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ اس کی پہنچ کسی ایسے خفیہ ادارے تک ہے جو اس جیسے زمیندار کو کیا پاکستانی حکومت تک کو ہلا کر رکھ سکتا ہے۔ دوسرے یہ سب کہنے والی لنڈا جیسی ہوشربا عورت تھی اس لیے وہ برداشت سے کام لے گیا ورنہ چودھری افتخار عالم شاہ جیسے مطلق العنان شخص سے کوئی اس دھمکی بھرے انداز میں گفتگو کرے، یہ کہاں ممکن تھا لیکن اب وہ جس چکر میں پھنس چکا تھا اس کے بعد یہ سب تو سہنا ہی تھا۔

www.pkdigest.com

''سوری ڈارلنگ! تم اور ڈیوڈ جانتے ہی ہو کہ میں یہاں کس پریشانی میں مبتلا ہوں' اسی وجہ سے میں وہ کام نہیں کر سکا جس کا ڈیوڈ سے وعدہ کیا تھا۔'' اس کی زندگی میں مشکل سے ہی کبھی کوئی ایسا لمحہ آیا ہوگا کہ اسے کسی سے معذرت کرنی پڑی ہو لیکن اس وقت وہ لنڈا سے سوری کہنے پر مجبور تھا۔

''وہ پریشانی آپ کا ذاتی مسئلہ ہے۔ ہم جس حد تک آپ کی ہیلپ کر سکتے تھے، وہ ہم نے کی۔ اگر آپ ڈیوڈ کی طرف سے ملنے والی انفارمیشن پر ڈھنگ سے اور فوری ایکشن لیتے تو آپ کا مسئلہ حل ہو جاتا۔ بہرحال میں ایک بار پھر یہی کہنے پر مجبور ہوں کہ آپ کی یہ پریشانی آپ کا پرسنل پرابلم ہے اور آپ کے کسی پرابلم سے بزنس پرائز نہیں پڑنا چاہیے۔ آئی ہوپ کہ آپ خیال رکھیں گے اور نیکسٹ ٹائم جب میں آپ کو کال کروں گی تو مجھے اچھی پروگریس سننے کو ملے گی پھر میں اپنی آنکھوں سے وہ سب دیکھنے آؤں گی۔'' وہ اسے ساری سنڈروم سنانے کے بعد ایک بار پھر ملاقات کا چارہ ڈالنے لگی۔

''اگر تمہاری یہی شرط ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں تمہاری امید سے بھی بڑھ کر اچھی پروگریس دیکھنے کو ملے گی۔'' چودھری نے دعویٰ کیا۔

''اوکے! میں آپ کے اس چیلنج کو ضرور آزمانے آؤں گی۔ فی الحال تو اتنا ہی کہہ سکتی ہوں کہ گڈ لک اینڈ گڈ بائے۔'' اس نے اچانک ہی فون بند کر دیا۔ چودھری نے بے تاب ہو کر اپنے موبائل پر آنے والے نمبر پر کال بیک کرنا چاہی لیکن وہ نمبر کسی پبلک بوتھ کا تھا جس پر کال بیک کرنا ممکن نہیں تھا۔

''لعنت ہے ایسی اولاد پر جس کی وجہ سے زندگی کا مزہ کرکرا ہو کر رہ جائے۔ ایک بار وہ باغی لڑکی میرے ہاتھ آجائے پھر میں اسے اس کی اس جرأت اور بغاوت کا مزہ چکھاؤں گا۔'' لنڈا سے رابطہ ٹوٹ جانے پر وہ بُری طرح جھنجلا گیا تھا چنانچہ غصے سے بڑبڑانے لگا۔ ویسے لنڈا کا قصہ درمیان میں نہ بھی ہوتا تو کشور کے لیے اس کے پاس کسی رعایت کی گنجائش نہیں تھی۔ خاندانی رسم و رواج سے بغاوت کرنے والی لڑکیوں کو عبرت ناک انجام سے دوچار کرنے کا سلسلہ نسلوں سے ان کے خاندان میں جاری تھا اور چودھری اس رواج کو ختم کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ وہ اپنے بزرگوں کے اس نظریے پر پورا یقین رکھتا تھا کہ بغاوت کرنے والی لڑکی کو ایسی کڑی سزا دی جائے کہ آئندہ جنم لینے والی لڑکیاں بھی ان کے بارے میں سن کر تھرا اٹھیں اور اگر کسی کے دل میں بغاوت کا خیال پیدا ہو تو بھی وہ اس انجام کا سوچ کر توبہ کر لے۔ لیکن کمال یہ تھا کہ اس نظریے اور اصول پر سختی سے کاربند ہونے کے باوجود ہر نسل میں کوئی نہ کوئی ایسی باغی لڑکی تو نکل ہی آتی تھی جو اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافی اور ظلم پر احتجاج کرتے ہوئے خاندانی روایات سے ٹکرانے کی جرأت کر ڈالتی۔ یہ اور بات کہ اس جرأت کے نتیجے میں عموماً اس بے چاری لڑکی کو اپنی جان ہی گنوانی پڑتی تھی لیکن شاید مرتے ہوئے اس کے پاس یہ اطمینان ہوتا ہوگا کہ اس نے سونے سے بنے قفس کی قید میں ساری زندگی سسکتے ہوئے گزارنے کے بجائے اس قفس کو توڑ کر اڑنے کی کوشش تو کی۔ کشور نے بھی اپنی ایسی... باغی نسل کی پیروی کی تھی چنانچہ اس کا باپ اسے ایسی جیسے انجام سے دوچار کرنے پر تلا ہوا تھا۔

☆☆☆

قدرے بچی کھچی سڑک پر مہارت سے جیپ چلاتا ہوا میجر ذیشان معمول کے مطابق اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی کے لیے جا رہا تھا کہ اچانک ہی اسے اپنی جیپ کو بریکس لگا کر روکنا پڑا۔ وہ سنہری بالوں والی کوئی عورت تھی جو سڑک کے درمیان پڑی تھی۔ فاصلے سے دیکھنے پر یہی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کسی حادثے کا شکار ہوئی ہے اور اب بے ہوشی کی حالت میں پڑی ہوئی ہے۔ عورت کی حالت کے پیش نظر وہ جیپ روکنے کے بعد نیچے اترا اور تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ اس کے قریب آنے پر بھی عورت کے جسم میں کوئی جنبش پیدا نہیں ہوئی تو وہ اس کے نزدیک چٹیوں کے بل بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھوں کی مدد سے اسے سیدھا کیا۔ سیدھا کرنے پر عورت کا چہرہ اس کی نظروں کے سامنے آگیا اور یہ چہرہ یقیناً ایسا تھا کہ دیکھنے والا خصوصاً... اگر وہ مرد ہو تو چند پل کے لیے ہی سہی مبہوت ضرور رہ جاتا تھا۔ میجر ذیشان کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ ذرا دیر کے لیے عورت کے دمکتے حسن میں کھو کر ساکت ہی رہ گیا۔ اس کی اپنی اب تک کی زندگی میں بے شمار دیسی اور بدیسی عورتوں سے ملاقات ہوئی تھی ان میں سے بیشتر بہت خوب صورت بھی تھیں لیکن ایسا حسن کبھی اس کے سامنے نہیں آیا تھا جسے پہلی نظر دیکھنے کے ساتھ ہی پورے جسم میں برق سی دوڑ جائے۔ شارٹ اسکرٹ میں ملبوس کبھی عریاں ٹانگوں والی وہ عورت جس کی آنکھیں فی الحال بند تھیں اپنے وجود میں کسی جادوگرنی کا سا سحر رکھتی تھی جو پل بھر میں کسی کو بھی ساکت کر سکتی تھی۔ میجر ذیشان کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا لیکن جب اسے خیال آیا کہ عورت بے ہوش ہے اور شاید اسے فوری طبی امداد کی ضرورت بھی ہے تو وہ ہڑبڑا کر اپنے سکتے کی کیفیت سے باہر آیا اور عورت کے سنہری دمکتے ہوئے رخساروں کو تھپکتے ہوئے اسے ہوش میں لانے کی سعی کرنے لگا لیکن اس کی یہ کوشش بارآور ثابت نہیں ہوئی اور عورت ہنوز بے ہوشی کی ہی حالت میں پڑی رہی۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر وہ اپنی جیپ کی طرف واپس پلٹا اور اس میں سے پانی کی بوتل نکال کر واپس عورت تک آیا۔ اس بار اس نے پانی کی پوری بوتل اس کے چہرے پر انڈیل ڈالی۔ پانی کی تری اور ٹھنڈک نے عورت کو کسمسانے پر مجبور کر دیا اور ایک بھرجھری سی لیتے ہوئے اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ وہ بے پناہ خوب صورت آنکھوں کی مالک تھی۔ اس کی آنکھوں کی نیلاہٹ میں سمندروں جیسی گہرائی تھی جو دیکھنے والے کو ڈبو ڈالنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ میجر ذیشان بھی ڈوبنے لگا تھا لیکن پھر اس نے خود کو سنبھالا اور عورت کی طرف دیکھتے ہوئے نرمی سے پوچھا۔

''ہو آر یو میڈم؟ آر یو او کے؟'' عورت نے اس کے سوالوں کا کوئی جواب نہیں دیا اور چند پل کے لیے نظر اٹھا کر اس کی صورت دیکھتے رہنے کے بعد دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ میجر ذیشان نے محسوس کیا کہ وہ بہت زور زور سے سانس لے رہی ہے۔ سانس لینے کا یہ انداز ایسا تھا جیسے اسے اس کام میں دشواری پیش آرہی ہو۔ عورت کی اس کیفیت سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہوئے کہ بے شک وہ ہوش میں آگئی ہے لیکن نارمل طور پر فٹ نہیں ہے اور اسے طبی امداد ملنی چاہیے، اس نے اسے سہارا دے کر اپنی جیپ تک لے جانے کا فیصلہ کیا تاکہ اسے اسپتال پہنچا سکے۔

''تھوڑی سی ہمت کیجیے میڈم اور میری جیپ میں چل کر بیٹھیے تاکہ میں آپ کو اسپتال پہنچا سکوں۔'' اس نے عورت سے کہا اور اسے سہارا دینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ عورت نے بھی اس کی بات سمجھ لی تھی چنانچہ اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ میجر ذیشان نے اسے سہارا دینے کے لیے اپنا دایاں بازو اس کی کمر کے گرد حمائل کر دیا۔ عورت نے کوئی تعرض نہیں کیا بلکہ خود اپنے بائیں بازو کو اس کے شانوں پر پھیلا دیا اور اپنے جسم کا سارا بوجھ اس پر ڈالتے ہوئے کھڑی ہوئی۔ عورت کی اس قربت نے میجر ذیشان کے جسم میں ایک بار پھر برق دوڑا دی۔ اس بار جسم میں دوڑنے والی برق کی شدت پہلے سے بہت زیادہ تھی۔ پہلی بار اسے صرف اس کے بارعب حسن کے دیدار نے جھٹکا لگایا تھا اور اب بات لمس کی تھی۔ عورت کا لمس تو اس کے عام سا ہونے کی صورت میں بھی مرد کو ہلا ڈالنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور یہاں تو حسن کا شاہکار سامنے موجود تھا۔ وہ حسن کی ان تجلیوں سے خود کو سنبھالنے کی کوشش میں نڈھال ہوا جا رہا تھا تو یہ کوئی ایسا غلط بھی نہیں تھا۔ پھر یہ حسن کوئی ڈھکا چھپا بھی نہیں تھا۔ اپنی تہذیب اور معاشرت کے اعتبار سے اس عورت نے جو لباس زیب تن کر رکھا تھا وہ اس کے جسمانی خطوط کو بہت خوبی کے ساتھ عیاں کر رہا تھا۔ ایک طرف شارٹ اسکرٹ سے جھانکتی سڈول ٹانگیں تھیں تو دوسری طرف کھلے گریبان والے ٹخنے بلاؤز نے بھی بہت سے راز عیاں کر رکھے تھے۔ آج کل موسم خوش گوار تھا یقیناً اس وجہ سے عورت کو اس قسم کا لباس پہننے میں قطعی تکلف محسوس نہیں ہوا ہوگا یوں بھی اس کے خدوخال اور رنگت اس کے مغرب کے باسی ہونے کی گواہی دے رہے تھے۔ سرد ممالک میں رہنے والی عورتیں سردی کی شدت کو برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں اور معمولی درجۂ حرارت گر جانے کی صورت میں اوڑھ لپیٹ کر رہنے کی عادی نہیں ہوتیں چنانچہ وہ بھی اپنے منی اسکرٹ میں مزے سے تھی۔ میجر ذیشان نے ہانپتے کانپتے بہ مشکل اسے جیپ تک پہنچایا اور اسے فرنٹ سیٹ پر بٹھانے کے بعد خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی لیکن فوری طور پر جیپ اسٹارٹ نہیں کر سکا۔ خود کو سنبھالنے کے لیے اسے چند لمحے درکار تھے۔ ان لمحات میں اس نے دیکھا کہ عورت دونوں ہاتھوں سے سر تھامے اسے یوں دبا رہی تھی جیسے شدید درد محسوس کر رہی ہو۔

''کیا تم سر میں درد محسوس کر رہی ہو؟'' میجر ذیشان نے انگریزی میں اس سے پوچھا۔

''ہاں! ایکچوئلی میرے سر کی پشت پر بہت زور سے ضرب لگائی گئی تھی جس کی وجہ سے میں بے ہوش ہو گئی اور اب ہوش میں آنے کے بعد کافی درد محسوس کر رہی ہوں۔'' اس نے پہلی بار میجر کے کسی سوال کا جواب دیا۔ اس کا لب و لہجہ سن کر وہ سمجھ گیا کہ وہ امریکن شہری ہے۔

''کس نے تمہارے سر پر ضرب لگائی تھی ذرا وضاحت سے بتاؤ بلکہ ایسا کرو کہ سب سے پہلے اپنا تعارف کروا دو۔'' ذیشان نے جیپ اسٹارٹ کرتے ہوئے اس سے مطالبہ کیا۔

''میرا نام ایملی پارکر ہے۔ نیویارک سے آئی ہوں۔ وہاں میں ایک کنسٹرکشن کمپنی میں بہ طور آرکیٹیکچر جاب کرتی ہوں۔ مجھے سیاحت کا بہت شوق ہے اس لیے جب بھی کچھ معقول رقم جمع کرنے میں کامیاب ہو جاؤں، چھٹیاں لے کر کسی نہ کسی ملک کی سیاحت کے لیے نکل پڑتی ہوں۔ اس بار میں نے اس کام کے لیے پاکستان کو بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اس کے شمالی علاقہ جات کو چنا ہے۔'' وہ خود کو اس حد تک سنبھال

www.pkdigest.com

چکی تھی کہ سوالات کے جواب دے سکے چنانچہ مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے اس کی فرمائش پر اپنا مختصر تعارف کروایا۔

''میرا نام ذیشان ہے۔ میں اپنی جاب پر جانے کے لیے یہاں سے گزر رہا تھا کہ تم بے ہوش پڑی ہوئی نظر آئیں۔ اب یہ تم بتاؤ گی کہ تمہارے ساتھ کیا بیتی اور تم کیسے اس جگہ بے ہوش ہو کر گر پڑیں؟'' وہ یونیفارم میں نہیں تھا کہ اس کی شناخت ظاہر ہو جاتی چنانچہ اپنے نام کے ساتھ میجر لگائے بغیر محتاط انداز میں اپنا تعارف کروایا۔ یہ اور بات تھی کہ اس کی اس احتیاط پسندی نے تعارف سننے والی کے ہونٹوں پر مبہم سی مسکراہٹ دوڑا دی تھی۔ تاہم جب اس نے میجر ذیشان کے سوالوں کا جواب دینے کے لیے اس کی طرف رخ کیا تو وہ پوری طرح سنجیدہ تھی۔

''میں یہاں ایک ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہوں۔ میرا ارادہ تھا کہ کوئی گروپ مل جائے تو اس کے ساتھ اپر چلی جاؤں گی اس طرح سفری اخراجات کافی کم ہو جاتے ہیں لیکن اتفاق سے آج کے دن ایسا کوئی گروپ روانہ نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا چلو آج یہیں اردگرد گھوم پھر کر دن گزار لیا جائے چنانچہ میں صبح ناشتے سے بھی پہلے ہوٹل سے نکل کھڑی ہوئی۔ میں نے اپنے ساتھ صرف اپنا ہینڈ بیگ لیا تھا اور ارادہ تھا کہ آدھے ایک گھنٹے کی واک کے بعد جہاں کوئی مناسب ہوٹل نظر آیا وہاں ناشتا کر لوں گی لیکن پھر یہ حادثہ پیش آ گیا۔ میں اس سڑک سے گزر رہی تھی کہ کسی نے پیچھے سے میرے سر پر وار کر دیا۔ وار اتنا شدید تھا کہ میں فوراً ہی بے ہوش ہو گئی۔ اب تمہاری کوششوں سے ہوش میں آئی ہوں اور ہوش میں آنے کے بعد مجھے میرا ہینڈ بیگ نظر نہیں آیا اس کا مطلب ہے کہ مجھ پر حملہ کرنے والا کوئی چور اچکا تھا جس نے صرف ہینڈ بیگ حاصل کرنے کے لیے ہی یہ حرکت کی تھی۔'' ایملی کی بتائی تفصیل نے میجر کو شرمندہ کر دیا۔ وہ ایک غیر ملکی تھی جسے اس کے وطن میں لوٹ لیا گیا تھا چنانچہ اسے سخت افسوس ہوا۔

''ایسا کرتے ہیں کہ پہلے تھانے چل کر اس واردات کی رپورٹ لکھوا دیتے ہیں۔ یہاں اس طرح کے جرائم عام نہیں ہیں بلکہ تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا اسے سن کر مجھے کافی حیرت ہوئی ہے یہ اس علاقے میں تو دنیا بھر سے سیاح آتے ہی رہتے ہیں اور کبھی انہیں اس طرح کی کوئی پریشانی نہیں اٹھانی پڑتی۔ مجھے لگتا ہے کہ اس واردات کے پیچھے کوئی باہر سے آیا ہوا بندہ ہے۔ کیا تم نے حملہ آور کو دیکھا تھا؟''

''نہیں، میں نے بتایا نا کہ اس نے مجھ پر پیچھے سے وار کیا تھا اس لیے مجھے اسے دیکھنے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔''

ایملی نے اپنے سر کی پشت سہلاتے ہوئے میجر کے سوال کا جواب دیا۔

''خیر وہ جو کوئی بھی تھا، مجھے امید ہے کہ اسے ڈھونڈ لیا جائے گا اور اس سے تمہارا سامان برآمد ہو جائے گا۔'' اس نے ایملی کو تسلی دی اور جیپ کا رخ مقامی تھانے کی طرف کر دیا۔ تھانے میں ایملی سے اس کے ہینڈ بیگ کی رنگت، ساخت اور اس میں موجود سامان کی تفصیلات کے علاوہ کئی دوسرے سوالات بھی کیے گئے۔ وہ لوگ رپورٹ درج کروا کر تھانے سے باہر نکلے تو کافی وقت گزر چکا تھا۔

''میرے خیال میں تم میری وجہ سے اپنے آفس پہنچنے میں لیٹ ہو گئے ہو۔'' ایملی نے قدرے تاسف کا اظہار کرتے ہوئے ذیشان سے کہا۔

''کوئی بات نہیں، تمہاری مدد کرنا بھی میرا فرض تھا۔'' ایک تو وہ اس کے ساتھ ہونے والی واردات پر شرمندہ تھا دوسرے اس کے رعب حسن نے بھی کچھ اس طرح جکڑا ہوا تھا کہ دل کسی طور اسے چھوڑ کر جانے پر آمادہ نہیں تھا چنانچہ مسکراتے ہوئے بہت اخلاق سے اس کی بات کا جواب دیا اور مزید بولا۔ ''تم نے بتایا تھا کہ ناشتا کیے بغیر اپنے ہوٹل سے نکل کھڑی ہوئی تھیں۔ ایسا کرتے ہیں کہ کسی اچھی سی جگہ ناشتا کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلوں گا۔ تمہارے سر پر لگائی جانے والی چوٹ سے خون بے شک نہیں نکلا لیکن پھر بھی ایک نظر ڈاکٹر کو دکھا لینا مناسب رہے گا۔''

''میرے خیال میں ڈاکٹر کو دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ سر میں معمولی سا درد ہے میں کوئی پین کلر لوں گی تو ٹھیک ہو جائے گا البتہ ناشتا میں ضرور کروں گی بلکہ تم ایسا کرو کہ مجھے میرے ہوٹل تک لے چلو اس طرح تم مجھے ڈراپ بھی کر دو گے اور ہم ساتھ ناشتا بھی کر لیں گے۔'' ایملی نے تجویز پیش کی جس پر صاد کرتے ہوئے میجر ذیشان نے جیپ کا رخ اس ہوٹل کی طرف کر دیا جہاں وہ مقیم تھی۔ ہوٹل کا نام وہ اس وقت سن چکا تھا جب ایملی تھانے میں رپورٹ لکھوا رہی تھی۔ یہ ایک اچھی شہرت کا حامل خوب صورت سا ہوٹل تھا۔ جس کے احاطے میں سیب کے بہت سے درخت لگے ہوئے تھے۔ ہوٹل کا ڈائننگ ہال نچلی منزل پر تھا جبکہ رہائشی کمرے اوپر تھے۔ ہوٹل کے احاطے میں گاڑی روکنے کے بعد میجر ذیشان نے ایملی کے ساتھ ڈائننگ ہال کا رخ کیا لیکن ابھی وہ ایک دو قدم ہی آگے بڑھے تھے کہ ایملی ذرا سا لڑکھڑائی اور میجر کا بائیں بازو دبوچنے کے انداز میں پکڑ کر اس کا سہارا لیا۔

''آر یو اوکے؟'' اس نے خود بھی اسے سہارا دیتے

ہوئے تشویش سے پوچھا۔

''بس ذرا چکر سے آ رہے ہیں۔ ایسا کرتے ہیں کہ اوپر میرے روم میں چلتے ہیں۔ ناشتا وہیں منگوا لیں گے۔'' اس نے نقاہت بھری آواز میں جواب دیا۔

''اگر تمہاری طبیعت زیادہ خراب ہو رہی ہے تو ہم پہلے ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔'' ذیشان نے تشویش سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں، پہلے ناشتا کر لیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ناشتا کر کے میری طبیعت سنبھل جائے۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو پھر ڈاکٹر کے پاس چلیں گے۔'' ایملی نے انکار کر دیا مجبوراً اس نے اس کی بات مان لی۔ کمرے کے دروازے کی اضافی چابی اس نے کاؤنٹر کلرک سے لے لی تھی خود ایملی کے پاس موجود چابی تو اس کے ہینڈ بیگ کے ساتھ ہی چلی گئی تھی۔ ایملی کو سہارا دیے دیے وہ پتھروں سے بنی سیڑھیاں چڑھتا ہوا اس کے کمرے کی طرف بڑھا۔ سیڑھیوں کی تعمیر میں سرخ پتھر استعمال کیا گیا تھا اور حفاظت و سہارے کے لیے لگائی گئی ریلنگ سفید رنگ کی تھی۔ اس ریلنگ پر گلابی پھولوں والی سبز بیل لپٹی ہوئی تھی۔ ایملی کا تقریباً سارا بوجھ اپنے بازوؤں پر سنبھالے اس خوب صورت سے راستے سے گزرتے ہوئے میجر ذیشان اپنے جذبات میں خاصی اتھل پتھل محسوس کر رہا تھا۔ ایسی عورت اور ایسا ماحول کسی بھی مرد کو سحر زدہ کر دینے کے لیے بہت ہوتا ہے۔ وہ بھی اس سحر میں گرفتار ہوتا جا رہا تھا۔ خود کو بڑی مشکل سے قابو میں رکھتے ہوئے وہ ایملی کے کمرے تک پہنچا اور ایک ہاتھ سے دروازے کا لاک کھولا۔ لاک کھولنے کے بعد وہ دونوں اندر داخل ہوئے۔

''مجھے بیڈ پر لٹا دو۔ کچھ دیر لیٹنے سے آرام آ جائے گا تو پھر اس کے بعد ناشتا کریں گے۔'' اندر پہنچتے پر ایملی نے خواہش ظاہر کی۔ اس کے کہنے پر وہ اسے سہارا دیے ہوئے بیڈ تک لے گیا اور جھک کر نرمی سے اسے وہاں لٹایا۔ اسے لٹانے کے بعد وہ سیدھا ہونا چاہتا تھا لیکن نہ ہو سکا۔ ایملی نے ابھی تک اس کا بازو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ اس کے بازو نہ چھوڑنے پر وہ ذرا سا چونکا تو اس نے ہونٹوں پر ایک بلا دیتی ہوئی مسکراہٹ سجاتے ہوئے اپنا دوسرا ہاتھ اس کی گردن کے گرد حمائل کرتے ہوئے ذرا سا اسے اپنی طرف کھینچا۔ وہ اس ذرا سا کھینچنے پر ہی گرتا چلا گیا کہ کوئی چور خواہش تو پہلے ہی اندر مچل رہی تھی۔ ایملی پر گرتے ہی اس نے سب سے پہلے اس کے نرم و گداز سینے کا لمس محسوس کیا۔ تنگ بلاؤز میں قید حسن کا یہ منبع سانسوں کے زیر و بم سے ایک ردھم میں حرکت کرتا پہلے ہی بہت دیر سے اس کے ضبط کا امتحان لے رہا تھا اب جو اس درجے قربت ملی تو اسے یوں لگا کہ وہ ریشم کے کسی ڈھیر پر جا گرا ہے۔ خود سپردگی پر آمادہ، ایملی کے ریشم جیسے بدن کی نرماہٹوں اور گداز میں ڈوبتے ہوئے اسے بالکل بھی اس بات کا خیال نہیں رہا تھا کہ ریشم کے تاروں میں الجھنے کے بعد پھر ان سے نجات پا لینا آسان نہیں ہوتا۔

☆☆☆

اس کے سامنے گویا کوئی ناقابلِ یقین منظر تھا۔ اس ایک چہرے کی دید کے لیے وہ کتنا ترسی تھی۔ پہاڑی قید خانے کی تنہائیوں سے لے کر برف زاروں کی صعوبتوں کو سہتے سہتے گویا یہ امکان ہی معدوم ہو گیا تھا کہ وہ کبھی دوبارہ اس شخص کو دیکھ پائے گی اور اب جبکہ وہ دوبارہ اسے اپنے روبرو دیکھ رہی تھی تو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

''کیسی ہو ماہ بانو؟'' وہ مسکراتا ہوا اس سے مخاطب ہوا تو گویا بے جان تصویر میں جان پڑ گئی۔ اس نے چاہا کہ خود سے پوچھے جانے والے اس سوال کا جواب دے سکے لیکن حلق میں اٹک جانے والے آنسوؤں کے گولے نے اسے بولنے نہیں دیا اور یک دم ہی آنکھوں سے آنسوؤں کا ریلا سا بہہ نکلا۔

''یہ کیا بے وقوف لڑکی! اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہیں اتنے مشکل حالات سے نکال کر ایک بار پھر نئی زندگی عطا کی ہے۔ جہاں تک ممکن ہو سکے، اس زندگی کو ہنستے مسکراتے گزارنے کی کوشش کرو۔ مشکلوں اور پریشانیوں کا کیا ہے یہ تو آتی جاتی رہتی ہیں۔ آج اگر وقت تمہارے لیے سخت ہے تو آنے والے کل میں یقیناً تمہارے حصے میں بہت سی خوشیاں اور آسانیاں بھی لکھی ہوں گی۔'' وہ اس کے بہتے آنسو دیکھ کر اپنی جگہ بیٹھا نہیں رہ سکا اور اس کے قریب صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اسے تسلی دینے کی کوشش کی لیکن اس کوشش کا نتیجہ اور بھی الٹ نکلا۔ وہ بجائے رونا ترک کرنے کے مزید شدت سے آنسو بہانے لگی اور ہچکیاں لیتے ہوئے اس کے سینے سے لگ گئی۔ شہریار کے لیے یہ صورتِ حال بہت اچانک تھی۔ ایک خوب صورت اور نوخیز لڑکی جو کہ اس کے دل سے بھی قریب تھی، اس کے سینے سے لگی تھی اور وہ رونے کی وجہ سے ہچکولے لیتے اس کے جسم کا گداز اپنے بدن پر محسوس کر سکتا تھا۔ وہ گویا دہرے امتحان میں گھر گیا۔ ایک طرف اس کا رونا دل کو تکلیف دے رہا تھا تو دوسری طرف اس کی اس درجے قربت جسم و جاں کو سلگا رہی تھی۔

''خود کو سنبھالو ماہ بانو! یوں سمجھو کہ قدرت نے تمہیں

www.pakdigest.com

زندگی گزارنے کا ایک اور سنہری موقع فراہم کیا ہے۔ تم نے جو پچھلے تکلیف دہ دن گزارے ہیں، اس کا ایک بہت اچھا نتیجہ بھی سامنے آیا ہے۔ تمہیں یہ تو معلوم ہی ہوگا کہ تمہیں جس پہاڑی غار میں قید کیا گیا تھا، وہ مکمل طور پر تباہ ہوگیا ہے۔ اس تباہی میں وہاں موجود تقریباً سارے ہی لوگ مارے گئے ہیں۔ جو زندہ بچے تھے ان میں سے بھی دو کل مر گئے ہیں، باقی بھی اس پوزیشن میں نہیں کہ کوئی بیان دے سکیں۔ اس صورتِ حال کا ایک فائدہ یہ ہوا ہے کہ تمہارے بارے میں کسی کے پاس معلومات نہیں ہیں۔ ہم دو چار لوگوں کے سوا کسی کو نہیں معلوم کہ تم اس قید سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئی تھیں چنانچہ یہی سمجھا جائے گا کہ دیگر لوگوں کے ساتھ تم بھی ماری گئی ہو اور یہ تمہارے حق میں بہت بہتر ہے۔ تمہارے پاس موقع ہے کہ ایک نئے نام اور نئی شناخت کے ساتھ دوبارہ سے زندگی شروع کرسکو۔ میں نے کرنل توحید سے بات کر کے سارے انتظامات کروا دیے ہیں۔ جو بھی حالات و واقعات پیش آئے ہیں، ان میں تمہارا ایک فیصد بھی قصور نہیں نکلتا چنانچہ تم پر کوئی فردِ جرم عائد نہیں کی جاسکتی۔ کرنل توحید اپنے ذرائع سے تمہارے ماضی اور حالات کے بارے میں معلومات حاصل کر چکے ہیں اور انہیں تمہارے ساتھ ہمدردی ہے۔ میری درخواست پر انہوں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں اس سارے معاملے سے الگ رکھا جائے اور کسی کو بھی تمہارے بارے میں بھنک نہ پڑنے دی جائے۔ انہوں نے ازخود یہ تجویز پیش کی ہے کہ تمہیں بالکل خاموشی کے ساتھ یہاں سے کراچی منتقل کر دیا جائے۔ وہاں تم کسی گرلز ہاسٹل میں رہ کر اپنا تعلیمی سلسلہ دوبارہ جوڑ سکتی ہو کیونکہ تمہیں مردہ سمجھا جا چکا ہے اس لیے اس بات کا کوئی امکان نہیں ہوگا کہ کوئی تمہیں ڈھونڈتا ہوا وہاں پہنچ جائے گا۔ کسی دشمن سے اتفاقی ٹکراؤ ہونے سے بچنے کے لیے تم یہ احتیاط کرسکتی ہو کہ جب بھی باہر نکلو تو پردے کا اہتمام کر لو۔ اس طرح تمہیں یکسوئی اور اطمینان سے اپنی تعلیم جاری رکھنے کا موقع مل جائے گا۔"

اس کی قربت سے سلگ اٹھنے کے باوجود شہریار نے یک دم ہی اسے خود سے الگ کر کے شرمندہ کرنا مناسب نہیں سمجھا چنانچہ ہولے ہولے اس کی پشت سہلاتے ہوئے اسے وہ سب کچھ بتاتا چلا گیا جو بڑی جدوجہد کے بعد اس نے اس کے لیے طے کیا تھا۔ کرنل توحید سے ملنے، انہیں حالات کو سمجھانے اور پھر اپنے سوچے ہوئے منصوبے کے لیے قائل کرنے کے لیے اسے کافی محنت کرنی پڑی تھی لیکن خوش کن امر یہ تھا کہ اس کی محنت رائگاں نہیں گئی تھی اور کرنل توحید نے اس کا نکتہ نظر اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ وہ قائل ہوگئے تھے کہ ایک بے سہارا اور مظلوم لڑکی کو جو پہلے ہی حالات کے ہاتھوں اپنا بہت کچھ کھو چکی ہے، مزید مشکلات سے دوچار نہ کیا جائے اور اس کے لیے کچھ ایسے انتظامات کر دیے جائیں کہ وہ نئے سرے سے اپنی زندگی شروع کر سکے۔ ماہ بانو کی اسکردو سے کراچی منتقلی سے قبل ان دونوں کی اس خفیہ ملاقات کا انتظام بھی انہوں نے ہی کیا تھا۔

"کراچی کے ایک گرلز کالج میں تمہارے داخلے کا انتظام ہوگیا ہے۔ اسی کالج کے ہاسٹل میں ہی تمہاری رہائش ہوگی۔ تم وہاں رہ کر دل لگا کر پڑھنا لکھنا۔ تمہاری ضروریات کا میں پورا خیال رکھوں گا۔ موقع ملنے پر تم سے ملاقات کے لیے بھی آسکتا ہوں۔ تم میرا فون نمبر اپنے پاس رکھنا تاکہ وقتِ ضرورت مجھ سے رابطہ کرسکو۔ اور ہاں یاد رکھنا کہ کراچی پہنچنے کے بعد تم ماہ بانو نہیں رہو گی۔ وہاں تمہارا داخلہ مہرین کے نام سے ہوا ہے اور مستقبل میں یہی نام تمہاری پہچان ہو گا۔" اپنی بات کے اختتام پر وہ ذرا سا مسکرایا۔ ماہ بانو روہانسا دھونا بھول کر بہت غور سے اس کی بات سن رہی تھی، یک دم ہی چونکی اور پھر پہلی بار اسے شہریار سے اپنی قربت کا احساس ہوا۔ وہ کسمسا کر اس سے دور ہٹی۔ شہریار بھی اس کی پشت سے جو ہاتھ ہٹا کر یوں صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ ماہ بانو کے لیے اپنے دل میں ایک خاص کیفیت محسوس کرنے کے باوجود وہ ابھی تک اس کے بارے میں اس زاویے سے سوچنے پر آمادہ نہیں ہوا تھا۔ اس کے گریز کی سب سے بڑی وجہ ماہ بانو کی کم عمری تھی۔ وہ پہلے ہی بے حد مصیبتوں کے گرداب میں پھنسی اس لڑکی کو کسی اور مخمصے میں گرفتار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ یہ بات سمجھتا تھا کہ نوعمری کی محبت انسان کے لیے ساری زندگی کا روگ بن جاتی ہے اور وہ خود ماہ بانو کے لیے اپنے جذبات کے سلسلے میں سو فیصد پُریقین نہیں تھا۔ وہ جو کچھ محسوس کرتا تھا، وہ ایک وقتی کشش بھی ہوسکتی تھی۔ اپنے کسی وقتی جذبے کے لیے وہ اس معصوم لڑکی کو زندگی بھر کا روگ لگا دینا، یہ اسے منظور نہیں تھا چنانچہ احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑنے کو تیار نہیں تھا ورنہ حقیقت تو یہ تھی کہ ابھی کچھ دیر قبل جب وہ کمرے میں داخل ہوا تھا اور ماہ بانو کے چہرے پر پہلی نظر پڑی تھی تو اس کے دل نے بہت شدت سے یہ خواہش کی تھی کہ وہ اسے اپنی بانہوں میں بھر لے اور اسے بتائے کہ اس کی گمشدگی کا ایک ایک دن اس نے کتنی مشکل سے گزارا ہے۔

"آپ مجھے چھوڑنے میرے ساتھ کراچی چلیں گے

نا؟" یہ پہلا جملہ تھا جو اب تک ماہ بانو نے اس سے کہا تھا۔

"نہیں، کرنل توحید خود تمہیں اپنے کسی اعتماد کے بندے سے وہاں بھجوائیں گے۔ میں نے تمہارے ساتھ کراچی جانے کے امکان پر غور کیا تھا لیکن مجھے مناسب معلوم نہیں ہوا۔ ہوسکتا ہے کہ تمہاری تلاش میں مارے مارے پھرنے والوں نے میری سرگرمیوں پر نظر رکھی ہوئی ہو۔ یہ تو چودھری بھی سمجھتا ہے کہ تمہیں اس کے چنگل سے نکالنے میں میرا ہی ہاتھ ہے اس لیے وہ اور اس کے پالتو ہر وقت میری بو سونگھتے پھرتے ہیں۔ ان حالات میں تم میرے ساتھ نہ ہی نظر آؤ تو بہتر ہے۔ کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد میں خود مناسب موقع دیکھ کر تم سے ملنے کراچی آؤں گا۔" اس نے انکار میں جواب دیتے ہوئے ماہ بانو کو ساری صورتِ حال سمجھانے کے ساتھ ساتھ تسلی بھی دی۔

"میں آپ کا انتظار کروں گی۔" جواب میں وہ صرف یہی چھوٹا سا جملہ بول سکی لیکن حقیقتاً اس جملے میں بڑی گہرائی تھی۔ اس نے دل کی گہرائی سے یہ دعویٰ کیا تھا۔ اس بات سے ناواقف ہونے کے باوجود کہ وہ خود بھی شہریار کے دل میں نقب لگا چکی ہے، وہ واقعی تاعمر اس کا انتظار کرنے کی خواہش دل میں رکھتی تھی۔ تاہم یہ فیصلہ تو وقت کے ہاتھ میں تھا کہ وہ اپنے وعدے پر قائم رہتی بھی ہے یا نہیں۔ مگر قائم رہتی بھی ہے تو یہ کیا ضروری تھا کہ شہریار اس کی طرف آتا؟ اصولاً تو اس کا انتخاب کوئی ایسی لڑکی ہی ہونی چاہیے تھی جو تعلیم، عمر اور مرتبے میں اس کی ہم پلہ ہوتی لیکن ماہ بانو بھی کیا کرتی کہ وہ محبت جیسے بے بس کر دینے والے جذبے کی زد میں آئی ہوئی تھی اور یہ جذبہ تو ہر حقیقت اور سچائی کو فراموش کر کے بس اپنی ہی کرنے پر تلا رہتا ہے۔

☆☆☆

"یہ سب کیا ہے افضل؟ مجھے اخبار سے پتا چلا کہ تم پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے۔ خود تم تو مجھے کچھ بتاتے نہیں ہو اور جب مجھے معلوم ہوتا ہے تو میں شرمندہ ہو جاتا ہوں کہ یہ ساری مصیبت میری وجہ سے تم پر آئی ہے۔" اس پر قاتلانہ حملے کی اطلاع اس کے حلقے میں تیزی سے پھیل گئی تھی اور فوری طور پر اخبارات میں بھی یہ خبر شائع ہوگئی تھی۔ اس خبر کے ساتھ پچھلے دنوں ہونے والے اس کی بیوی بچوں کے قتل کا حوالہ بھی دیا گیا تھا۔ خبر شائع ہونے سے پہلے ہی جو صحافی دنیا کے لوگ تھے، انہوں نے اس کے موبائل پر فون کر کے اس کی خیریت دریافت کرنی شروع کر دی تھی، باقیوں کو خبر کی اشاعت کے بعد معلوم ہوگیا چنانچہ اس کے موبائل پر کالز کا تانتا سا بندھ گیا تھا۔ وہ بہت زیادہ زخمی نہیں تھا۔ گولی نے صرف بازو کے گوشت کو متاثر کیا تھا اور چند ایک چوٹیں گاڑی کو اچانک لگنے والے جھٹکے کی وجہ سے آئی تھیں اس لیے بستر پر لیٹے لیٹے آرام سے کالز ریسیو کر رہا تھا۔ اس کی اس مصروفیت کو دیکھ کر البتہ ڈاکٹر نے اسے ٹوکا تھا کہ وہ مسلسل فون کالز اٹینڈ کرنے کے بجائے اگر آرام کرے تو بہتر رہے گا۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے بعد وہ نمبر دیکھ کر صرف بہت ضروری کالز ہی ریسیو کر رہا تھا۔ اس بار اس کا موبائل بجا تو اسکرین پر آفتاب کا نمبر جگمگا رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ آفتاب تک اس پر ہونے والے حملے کی اطلاع پہنچ گئی ہے چنانچہ اس نے آواز میں حتی الامکان بشاشت بھرتے ہوئے اس کی کال ریسیو کی تھی لیکن بہرحال وہ اس کی آواز کی بشاشت سے متاثر نہیں ہوا تھا اور دکھ اور شرمندگی کی ملی جلی کیفیت میں اپنے جذبات کا اظہار کرتا چلا گیا۔

"میں ٹھیک ہوں یار، تم میری فکر نہ کرو اور خوامخواہ کی شرمندگی بھی مت پالو۔ تمہاری اس حساسیت کی وجہ سے ہی میں جان بوجھ کر تمہیں کچھ بتانے سے گریز کرتا ہوں لیکن صحافی ہونے کی مجبوری ہے کہ جو بات چھپانا چاہو، یار لوگ اسے بھی چھاپ کر دم لیتے ہیں اور بات چھپنے کے بجائے چھپ جاتی ہے۔" اس نے ہلکے پھلکے انداز میں آفتاب کو بہلانے کی کوشش کی۔

"تمہارے کہنے سے میری فکرمندی دور نہیں ہوسکتی افضل! میں جانتا ہوں کہ یہ چودھری ہی ہے جو میری وجہ سے تمہارے پیچھے پڑ گیا ہے لیکن اب میں نے سوچ لیا ہے کہ میں خود اپنے آپ کو چودھری کے حوالے کر دوں گا تاکہ کم از کم تمہاری جان تو چھوٹے۔ بس تم مجھ پر اتنا احسان اور کرنا کہ کشور کو کسی محفوظ جگہ منتقل کر کے اس کا خیال رکھنا، وہ میرے بچے کی ماں بننے والی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ میں نہ سہی میری محبت کی نشانی ضرور اس کے پاس رہے۔" اس نے اپنا ارادہ ظاہر کرتے ہوئے افضل سے درخواست کی۔

"بکواس مت کرو۔ تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا ہے جو اس قسم کی باتیں سوچ رہے ہو؟ صرف ایک اندازے کی بنیاد پر تم اپنے آپ کو چودھری کے حوالے کرنے چلے ہو۔ یہ سوچے بغیر کہ تمہیں اس کے چنگل سے بچانے کے لیے کسی نے کتنی کوشش کی تھی۔ تمہاری جذباتیت کی وجہ سے اس شخص کی محنت اور میری قربانی دونوں رائگاں چلی جائیں گی۔" اس کا ارادہ جان کر افضل کو شدید غصہ آیا چنانچہ بری طرح اسے ڈپٹنے لگا۔

"مجھے ہر بات کا احساس ہے لیکن میں تمہاری جان کی قیمت پر اپنی جان بچانے کی خودغرضی نہیں دکھا سکتا۔" اس

www.pkdigest.com

کے تحت لہجے کا بُرا مانے بغیر آفتاب نے اپنا نکتۂ نظر بیان کیا۔

''تم جذبات سے کام لے رہے ہو دوست! یہ لازمی نہیں ہے کہ مجھ پر قاتلانہ حملہ کروانے والا چودھری ہی ہو۔ میں صحافی ہوں اور میری ڈھیروں دشمنیاں ہیں، تم تو خود اس فیلڈ سے منسلک ہو۔ تم نہیں جانتے کیا کہ یہاں جہاں ذرا سا کسی کی دُم پر پیر رکھ دو وہ مرنے مارنے پر تُل جاتا ہے اور میری دشمنیوں میں سے ایک بڑی دشمنی تو مہتاب کی وجہ سے بھی ہے۔ خود پر حملے سے پہلے میرے سامنے ایک ایسی بات آئی تھی جس کو سن کر میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ شاید ہم چودھری کو مجرم سمجھ کر غلطی کر رہے ہیں۔ ایڈیٹر صاحب نے بتایا تھا کہ جس رات مہتاب کا قتل ہوا اس دن کوئی شخص مجھ سے ملنے دفتر آیا تھا اور اس نے خود کو مہتاب کا کزن ظاہر کرتے ہوئے دفتر سے میرے گھر کا پتا حاصل کر لیا تھا۔ مجھے لگتا ہے وہ شخص مہتاب کا وہی کزن ہے جس سے اس کی منگنی ہوئی تھی اور جو اتنے برسوں سے ہمیں تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ اب اتفاق سے ایک ایسے وقت میں وہ ہمیں تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا جبکہ چودھری افتخار بھی ہمارا دشمن بنا ہوا ہے چنانچہ میری اور تمہاری دونوں کی توجہ اسی کی طرف رہی اور ہم اپنے دشمن نمبر ایک کو بھول گئے لیکن اب جو صورت حال میرے سامنے آئی ہے اس کے پیش نظر میں تم سے یہی کہوں گا کہ کوئی حماقت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ پتا چلا کہ تم جذبات میں آ کر خود کو چودھری کے حوالے کر دو اور یہاں میں اپنے دشمن کے ہاتھوں مارا جاؤں۔'' افضل نے بہت تیزی سے خود پر قابو پا لیا تھا اور اب رسان سے آفتاب کو ساری صورت حال سمجھا رہا تھا۔

''کہیں ایسا تو نہیں کہ تم مجھے میرے ارادے سے باز رکھنے کے لیے اپنے سسرالی دشمن کا بہانہ بنا رہے ہو؟'' آفتاب نے اس کی بات سن کر مشکوک لہجے میں پوچھا۔

''بالکل نہیں۔ اگر تم حالات کا عقل سے تجزیہ کرو تب بھی یہ بات واضح ہے کہ چودھری کو میرے قتل سے کچھ نہیں ملنے والا۔ مہتاب اور بچوں کو اگر اس نے اشتعال میں قتل کروا بھی دیا ہے تو اب میرے سلسلے میں یہ غلطی نہیں کر سکتا۔ میری موت کا مطلب ہوگا کہ اس نے تم تک پہنچنے کا راستہ کھول دیا۔ اگر اس حادثے کے پیچھے چودھری ہوتا تو لوگ بھی اس کے بندے مجھ پر گولی چلانے کے بجائے مجھے گھیرتے اور تشدد کے ذریعے تمہارا اتا پتا معلوم کرنے کی کوشش کرتے۔'' افضل کی اس دلیل میں جان تھی چنانچہ آفتاب کو قائل ہونا پڑا۔

''جو بھی بات ہو۔ اب تم اپنا بہت خیال رکھنا یار! تم جیسے قیمتی دوست کو کھونے کا حوصلہ نہیں ہے مجھ میں۔'' وہ فون بند کرنے سے پہلے اسے یہ ہدایت کرنا نہیں بھولا تھا۔ اس کی اس فکرمندی پر افضل نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ موبائل ایک طرف رکھتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔ اسے آفتاب کے خلوص پر کوئی شک نہیں تھا بلکہ وہ خود بھی اسے اپنے دوستوں میں سے سب سے قیمتی خیال کرتا تھا لیکن مہتاب اور بچوں کے بعد گویا ہر شخص کی محبت بے معنی ہو کر رہ گئی تھی۔ مہتاب ..... نام کی وہ عورت جو اس کی بیوی اور دو بچوں کی ماں تھی اس کے لیے کتنی اہم تھی، وہ چاہتا بھی تو لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے مہتاب کو بے تحاشا چاہا تھا اور جواب میں اس نے بھی اسے ہر وہ خوشی دی تھی جو اس کے اختیار میں تھی۔ مہتاب اور بچوں کے ساتھ اپنی چھوٹی سی دنیا بسانے کے بعد اس نے گویا ہفت اقلیم کی دولت پا لی تھی اور اب یہ دنیا اجڑی تھی تو باقی کی ساری دنیا بے معنی ہو کر رہ گئی تھی۔

''سر! آپ کی میڈیسن کا ٹائم ہو گیا ہے۔'' وہ خیالوں کی دنیا میں جانے کب تک ڈوبا رہتا کہ اس آواز کو سن کر چونک کر آنکھیں کھولنی پڑیں۔ وہ کوئی میل نرس تھا جو اپنے ہاتھ میں موجود ٹرے اس کے سرہانے موجود سائیڈ ٹیبل پر رکھ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر افضل نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی جب تک وہ بیٹھتا میل نرس اس کی طرف رخ کر چکا تھا۔ مخصوص سفید لباس میں ملبوس سنہری بالوں اور نیلی آنکھوں والے اس میل نرس کو شناخت کرنے میں اسے کچھ دشواری پیش آ سکتی تھی اگر اس کے ہاتھ میں دبا ننھا سا جدید ساخت کا پستول دکھائی نہ دے رہا ہوتا۔ وہ وہی تھا جو اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لیے برسوں سے انتقام کی آگ دل میں جلائے انہیں ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ اپنے اس جنونی رقیب کو نظروں کے سامنے دیکھ کر افضل کو کوئی شک نہیں رہا کہ مہتاب اور بچوں کا قتل اسی کے ہاتھوں ہوا ہے اور اب وہ اپنے انتقام کی آگ بجھانے کے لیے اس کے خون کی بھینٹ لینے آ پہنچا ہے۔ اس شخص کو سامنے دیکھ کر افضل کا دایاں ہاتھ اضطراری طور پر پھیلا اور اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھی دواؤں کی شیشیوں میں سے ایک شیشی اٹھا کر اسے دے ماری۔ اس کی ماری گئی شیشی سیدھی پستول بردار کی آنکھ پر جا کر لگی اور وہاں سے خون کا فوارہ سا پھوٹ پڑا لیکن اس اثنا میں وہ بھی اپنا کام کر چکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں موجود پسٹل جس کا رخ افضل کے سینے کی طرف تھا، چل چکی تھی اور اس کی اور افضل کی چیخ تقریباً ایک ساتھ ہی بلند ہوئی تھی۔

حادثات و سانحات کی شکار.. پناہ کی تلاش میں سرگرداں ماہ بانو کی داستان حیات کے واقعات اگلے ماہ پڑھیے

چالاک احمق

آصف ملک

تقدیر کی مہربانیوں کی چھتری جس کے سر پر سایہ فگن ہو تو وہ اگر خاک کو بھی ہاتھ لگا دے تو سونا بن جاتی ہے مگر جب تقدیر ستم ظریفی پر آمادہ ہو تو پھر ہاتھ آیا سونا بھی مٹی بن جاتا ہے۔ ایسے ہی دو جرائم پیشہ سادہ لوح دوستوں کا ماجرا۔ تقدیر کی ہوا ہمیشہ ان کے مخالف سمت ہی چلی تھی۔

عقلمندوں کی عقل کے آگے اپنی بیوقوفی پر خوشی کے شادیانے بجاتے دو مجرموں کا شگفتہ احوال

ڈیرک اور شارپ کی جوڑی عرف عام میں احمقوں کی جوڑی کے لقب سے مشہور تھی۔ اگر ڈیرک اور شارپ کا نام الگ الگ لیا جاتا تو بہت کم لوگ ان سے واقف نکلتے لیکن جب احمقوں کی جوڑی کہا جاتا تو سب جان جاتے کہ کن کا ذکر ہو رہا ہے۔ وہ معمولی درجے کے مجرم تھے جو چھوٹی موٹی واردات کر کے گزارہ کرتے تھے۔ کبھی کوئی پیٹرول پمپ لوٹ لیا یا کوئی فون بوتھ توڑ کر اس میں موجود رقم نکال لی۔ کبھی کوئی گاڑی چراتے اور کسی ویرانے میں لے جا کر اس میں سے اہم سامان نکال کر فروخت کر دیا کرتے اور باقی ڈھانچا وہیں چھوڑ دیتے۔

ویسے تو ان کی قسمت کا ستارہ اکثر گردش میں رہتا تھا لیکن ان دنوں یہ کچھ زیادہ ہی گردش میں آیا ہوا تھا۔ ایک تو

www.pkdigest.com

انہیں کوئی کام نہیں مل رہا تھا یعنی وہ کوئی کامیاب واردات نہیں کر پا رہے تھے اور دوسرے اپنے علاقے کے ایک ذرا خطرناک بدمعاش موڈی سے ان کی اَن بن ہو گئی تھی... بلکہ ان کی کیا مجال تھی کہ موڈی کے سامنے آتے یا اس کے منہ لگتے وہ تو موڈی کا موڈ ان سے خراب ہو گیا تھا۔ موڈی چاہتا تھا کہ وہ اس کی زیرِ سرپرستی کام کریں لیکن اپنی تمام تر نالائقیوں کے باوجود وہ دونوں موڈی کے ساتھ کام کرنے کو تیار نہیں تھے، انہیں اپنی آزادی عزیز تھی۔ اس لیے جب موڈی نے ان سے صاف کہا کہ وہ یا تو اس کے ساتھ کام کریں یا اپنا بوریا بستر سمیٹ کر اس علاقے سے دفع ہو جائیں، تب بھی وہ اپنے انکار پر قائم رہے۔ ڈیرک نے ہمت کر کے کہا۔

"جناب! ہم الگ ہی کام کرنا چاہتے ہیں۔"

موڈی صورت سے سفاک نظر آنے والا شخص تھا اور وہ جیسا نظر آتا تھا ویسا ہی تھا۔ اس نے ایک خوف ناک تاثر کے ساتھ ان سے کہا۔ "اس صورت میں تمہاری سلامتی کے لیے بہت ضروری ہے کہ تم دونوں میری نگاہوں سے دور چلے جاؤ۔"

"ہم کہاں جائیں جناب۔" شارپ نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔ "ہم شروع سے اس جگہ کام کرتے آئے ہیں۔"

"لیکن اب نہیں کر سکو گے۔"

اصل میں موڈی مافیا کے درجے تک پہنچنے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ وہ ایک معمولی درجے کا بدمعاش تھا لیکن اس میں جرأت اور چالاکی تھی اس لیے وہ موجودہ مقام تک آ گیا تھا اور اب اس سے آگے بڑھنے کی فکر میں تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے اپنے گرد چند بہترین بدمعاش جمع کر لیے تھے اور ان کے بل پر علاقے کا گرو بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ چھوٹے موٹے اٹھائی گیروں کو بھی ساتھ ملانے کی کوشش کر رہا تھا اور جو انکار کر رہے تھے، انہیں اس علاقے سے بے دخل کر رہا تھا۔ ڈیرک اور شارپ کو ملنے والی وارننگ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ انہیں معلوم تھا اگر انہوں نے موڈی کی وارننگ کو نظر انداز کیا تو اس کے سنگین نتائج نکل سکتے ہیں۔ اس سے پہلے جن جرائم پیشہ افراد نے یہ حماقت کی تھی، ان میں بیشتر علاقے سے رخصت ہونے سے پہلے اسپتال میں آرتھوپیڈک شعبے کی سیر کر آئے تھے۔ ان میں سے کئی تو مہینوں داخل رہے تھے اور اسپتال سے واپسی پر ان کی چال ڈھال میں خاصا فرق آ گیا تھا۔ ڈیرک اور شارپ اپنا یہ حشر نہیں چاہتے تھے۔ دوسری طرف کسی نئی جگہ جا کر نئے سرے سے کام شروع کرنا آسان نہیں تھا۔ جرائم پیشہ لوگوں کے لیے کسی دوسری جگہ جا کر کام کرنا ایسا ہی تھا جیسے کسی جنگل میں کوئی درندہ اپنی حد سے نکل کر دوسرے کی حد میں جا کر شکار کرے۔ اس میں لڑائی لازمی ہوتی ہے۔

"اب کیا کریں؟" شارپ نے ڈیرک سے پوچھا۔ نام کے برعکس وہ سوچنے سمجھنے کے معاملات میں ذرا سست تھا اور اس قسم کی صورتِ حال میں وہ ڈیرک کی طرف دیکھتا تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ڈیرک کوئی بہت تیز طرار شخص تھا۔ عقل کے استعمال کے معاملے میں وہ شارپ سے اتنا ہی بہتر تھا جتنا کوئی لکڑبگھا کسی گیدڑ سے ہو سکتا ہے۔

"میرا خیال ہے ہمیں یہاں سے جانا ہوگا۔" ڈیرک نے بہت دیر سوچنے کے بعد کہا تو شارپ اس سے فوراً متفق ہو گیا۔ وہ خود بھی یہی محسوس کر رہا تھا۔ جب موڈی نے انہیں بلا کر دفع ہو جانے کی وارننگ دی تو وہاں موجود موڈی کے گرگے انہیں بہت خوف ناک نظروں سے گھور رہے تھے اور ایسا لگ رہا تھا کہ وہ انہیں دی جانے والی دو دن کی مہلت سے خوش نہیں تھے۔ وہ انہیں بنا وارننگ ہی علاقے سے رخصت کرنا چاہتے تھے۔ اس بات کا امکان تھا کہ وہ دو دن کی مہلت پوری ہونے کا انتظار بھی نہ کریں اور ان کی گوشمالی پر تل جائیں۔

شارپ نے تجویز پیش کی۔ "میرا خیال ہے، ہمیں کچھ عرصے کے لیے نیویارک سے رخصت ہو جانا چاہیے۔"

ڈیرک کا خیال تھا کہ ان کی رخصت شاید ہمیشہ کے لیے ہو لیکن فی الحال ابھی جانا تو لازمی تھا۔ وہ دونوں ویسٹ ٹاؤن کے جس چھوٹے سے فلیٹ میں رہتے تھے، اس میں ان کا سامان بہت تھوڑا سا اور تقریباً بے کار تھا۔ اس لیے اسے چھوڑ کر جانے میں کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ ان کے پاس کوئی کار نہیں تھی اور کار اس وجہ سے نہیں تھی کہ ان کے پاس ڈرائیونگ لائسنس نہیں تھا۔

"یہاں سے جانے کے لیے کار تو لازمی ہے۔" ڈیرک نے شارپ سے کہا۔

"گاڑیاں تو بہت مل جائیں گی لیکن ہمیں ایک ایسی گاڑی کی ضرورت ہے جو کسی کو متوجہ نہ کرے اور اس پر لمبا سفر آسانی سے ہو سکے۔"

طے ہوا کہ وہ دریا کے کنارے کہیں سے کوئی گاڑی اٹھا لیں گے۔ یہ متوسط طبقے کا علاقہ تھا اور یہاں زیادہ تر دو نمبری لوگ رہتے تھے۔ ممکن ہے وہ جو گاڑی اٹھاتے، اس کا مالک پولیس میں رپورٹ درج کرانے کی زحمت ہی نہ کرتا۔ وہ دریا کے پاس ایک چھوٹی سی گلی میں داخل ہوئے۔ صبح کے وقت یہاں سناٹا تھا اور گلی میں کئی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ڈیرک

اور شارپ کی نظر بیک وقت ایک پرانے ماڈل کی بیوک پر پڑی۔ یہ مٹی جیسے رنگ کی بالکل غیر واضح نظر آنے والی گاڑی تھی اور اس کا طاقت ور انجن طویل سفر کے لیے موزوں ہوتا۔

"یہ کیسی رہے گی؟" شارپ نے پوچھا۔

"بہترین۔" ڈیرک نے کار کا معائنہ کیا۔ "اس کی حالت بھی اچھی لگ رہی ہے۔"

شارپ لاک کھولنے کا ماہر تھا لیکن اس نے چابی لگانے میں وقت ضائع کرنے کے بجائے مخصوص لچک دار پٹی شیشے سے اندر ڈال کر لاک کھول لیا اور وہ دونوں اندر گھس گئے۔ تار کی مدد سے انجن کو اسٹارٹ کرنے میں ایک منٹ لگا اور وہ کار لے کر وہاں سے روانہ ہو گئے۔ ان کا ارادہ جنوب مشرق کی طرف جانے کا تھا کیونکہ شمال میں ان دنوں بہت سردی تھی۔ شہر سے نکل کر ہائی وے تک آنے میں انہیں ایک گھنٹا لگ گیا تھا۔ شہر سے نکلنے کے بعد انہوں نے اطمینان کا سانس لیا.... اب گاڑی کی چوری کی اطلاع پولیس کو مل جاتی، تب بھی ہائی وے پولیس تک معلومات دو دن کی تاخیر سے پہنچتیں اور اس دوران میں وہ یہاں سے سیکڑوں میل دور جا چکے ہوتے۔ وہ منہ اندھیرے روانہ ہوئے تھے اور جب سورج بلند ہوا تو وہ نیویارک سے باہر آ چکے تھے اس لیے انہوں نے ایک جگہ رک کر ناشتا لیا۔ وہ کسی ریستوران میں رکنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے کیونکہ دوسروں کے سامنے بار بار گاڑی کو تار کی مدد سے اسٹارٹ کرنا درست نہیں تھا، وہ پکڑے جا سکتے تھے۔

کھانے کا سامان لے کر وہ آگے روانہ ہوئے اور ایک جگہ ہائی وے سے ذرا دور درخت دیکھ کر شارپ نے کار کا رخ اس طرف کر دیا۔ ایک ہری بھری جگہ اس نے کار روکی اور باہر نکل آیا۔ "واہ کیا خوب صورت جگہ ہے۔"

ڈیرک بھی باہر آیا۔ "ناشتے کے لیے بہترین ہے۔"

انہوں نے بونٹ پر ناشتے کا سامان سجایا اور کھانے لگے۔ شارپ مخصوص کپس میں کافی پیک کرا کے لے آیا تھا جو ابھی تک گرم تھی۔ ناشتے کے بعد شارپ اپنے پاس موجود سو چابیوں کے گچھے سے چابیاں آزمانے لگا۔ جلد ایک چابی کار کے اگنیشن میں فٹ آ گئی۔ اس کے بعد اس نے دروازے کی چابی تلاش کی اور تھوڑی دیر میں وہ بھی اسے مل گئی۔

"کام بن گیا۔"

"ابھی ڈکی کی چابی باقی ہے۔" ڈیرک نے اسے یاد دلایا۔

"ہاں، وہ میرے ذہن سے نکل گئی تھی۔" شارپ کہتا ہوا ڈکی کی طرف آیا اور اس کے تالے پر چابیاں آزمانے لگا

☆ عورت اور روپے کے سامنے کبھی کبھی قانون اور انصاف بھی بے بس ہو جاتے ہیں۔

☆ بہت سی عورتیں اپنے جسم سے زیادہ اپنے نخروں کا میک اپ کرتی ہیں۔

☆ ہر لڑکی اسٹین گن ہے۔ غلط باتوں میں۔

☆ مور میں ایک بڑی خوبی ہے۔ وہ عورتوں کی طرح کسی دوسرے کی دم پر رشک نہیں کرتا۔

☆ ہر خرگوش فیملی پلاننگ پر بہترین تقریر کر سکتا ہے۔

لیکن ڈکی کا تالا کچھ اس قسم کا تھا کہ کوئی چابی لگ ہی نہیں رہی تھی۔ شارپ نے ڈیرک کی طرف دیکھا۔

"مجھے لگ رہا ہے، ڈکی میں کوئی خاص چیز ہے اور اسی وجہ سے اس میں اتنا اسپیشل تالا لگا ہے۔"

"کیا خاص چیز ہو سکتی ہے؟"

شارپ جاگتے میں خواب دیکھنے لگا۔ "شاید کوئی قیمتی چیز... جیسے نوٹوں سے بھرا بریف کیس یا سونے سے بھرا بکس۔"

"زیادہ اونچے خواب دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔" ڈیرک نے اس کے شانے پر ہاتھ مارا اور کار کے ڈیش بورڈ سے ٹول کٹ نکال لایا۔ اس نے ایک اوزار منتخب کیا اور اس کا سرا ڈکی کی ایک درز میں پھنسا کر زور لگانے لگا۔ کچھ دیر میں ڈکی کا تالا ٹوٹ گیا۔ "لو اب کھول کر سونا یا رقم نکال لو۔" ڈیرک نے ٹول بکس رکھتے ہوئے کہا۔ شارپ نے ڈکی کھول لی تھی اور جب اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا تو ڈیرک نے جھانک کر دیکھا۔ شارپ منہ کھولے دم بخود سا کھڑا تھا۔

"کیا ہوا؟"

شارپ نے چونک کر تھوک نگلا اور بولا۔ "خود آ کر دیکھ لو۔"

ڈیرک نے آ کر دیکھا تو اس کی حالت بھی خراب ہو گئی۔ ڈکی میں ایک ہاتھ پاؤں اور منہ بندھی لاش پڑی تھی۔ وہ بلاشبہ لاش تھی کیونکہ اس کے عین دل کے مقام پر ایک خنجر گڑا ہوا تھا۔ اس سے بھی زیادہ خطرناک بات یہ تھی کہ لاش مائیکل مورن کی تھی۔ مائیکل ویسٹ ٹاؤن میں موڈی کا سب سے بڑا حریف تھا۔ لیکن کچھ عرصے سے وہ اس کے مقابلے میں ہلکا پڑ رہا تھا اور اب وہ لاش کی صورت میں ان دونوں کے سامنے تھا۔ یہ یقیناً موڈی کا کارنامہ تھا۔ اس نے کسی طریقے سے مائیکل کو اغوا کر کے اس کے دل میں خنجر گھونپ دیا

www.pkdigest.com

اور پھر اس کی لاش اس کار کی ڈکی میں ڈلوادی۔ ان کی بدقسمتی کہ کار وہ لے آئے تھے۔

"یہ ہم نے کیا کیا؟" ڈیرک نے خاصی دیر بعد کہا۔

شارپ اب بدحواسی میں کار کے چاروں طرف ناچ رہا تھا۔ "جو کیا سو کیا... سوال یہ ہے کہ اب اس کا کیا کریں؟"

ڈیرک نے چاروں طرف دیکھا۔ "اس لاش سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے اس سے بہتر جگہ اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ یہیں کہیں دفن کر دیتے ہیں۔"

"اور کوئی آ گیا تو؟" شارپ کی بدحواسی کم نہیں ہوئی تھی۔

"یہاں کون آئے گا؟"

"جیسے ہم آئے ہیں۔ یہ جگہ ہائی وے سے کچھ زیادہ دور تو نہیں ہے۔" شارپ نے اس بار عقل مندی کی بات کی۔

ڈیرک نے سوچا۔ "اوکے... ہم ہائی وے سے اور دور چلے جاتے ہیں اور پھر کہیں مائیکل کی لاش دفن کر دیں گے۔"

"کیسے دفن کریں گے؟" شارپ نے ایک نقطہ اور اٹھایا۔ "ہمارے پاس زمین کھودنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔"

ڈیرک نے سوچا اور اس کا حل بھی نکال لیا۔ "تب ہمیں ایسی جگہ دیکھنی ہوگی جہاں زمین میں گڑھے ہوں اور مٹی بھی نرم ہو۔"

ایسی جگہ انہیں کوئی دو میل آگے ملی تھی۔ انہوں نے ایک گڑھے میں لاش ڈالی اور آس پاس سے مٹی اور پتھر جمع کر کے اس پر ڈالنے لگے۔ اس کام میں انہیں کچھ دشواری تو پیش آئی لیکن وہ گڑھا کھودنے کی زحمت سے بچ گئے تھے۔ پھر بھی دھول مٹی اور سردی کے باوجود پسینے سے ان کا حشر ہو گیا تھا۔ وہاں کہیں پانی نہیں تھا۔ پانی انہیں ہائی وے پر کوئی دس میل آگے جا کر نظر آیا۔ ہائی وے کے نیچے سے ایک برساتی نالا گزر رہا تھا جس میں پانی بھی تھا اور انہوں نے اس میں اتر کر خود کو ممکن حد تک صاف کر لیا تھا۔ ان کا ارادہ اٹلانٹا سٹی یا اس سے آگے فلوریڈا جانے کا تھا۔ وہاں دولت مندوں کی بہتات تھی اور وہاں کمانے کے مواقع بھی زیادہ تھے۔ پھر وہاں موسم بھی نیویارک کے مقابلے میں اچھا تھا۔

مسلسل دو دن سفر کے بعد انہوں نے کار ایک ایسے ویرانے میں چھوڑ دی جہاں سے پولیس اسے آسانی سے تلاش نہ کر سکے کیونکہ اس کی چوری کی اطلاع پولیس کو ہو چکی ہوگی اور اس کار میں کسی شہر میں داخل ہونا خطرناک ہو سکتا تھا۔ وہ بس میں سوار ہو کر اٹلانٹا سٹی میں داخل ہوئے۔ شارپ ایسٹی نژاد تھا اور اٹلانٹا سٹی میں اس کے کئی واقف کار تھے۔ شارپ ایک واقف کار کے پاس پہنچا تو اس نے انہیں ایک چھوٹا سا فلیٹ دلوا دیا۔ اس میں ایک ہی کمرا تھا لیکن ان کے لیے کافی تھا اور خاص بات یہ تھی کہ کمرا فرنش ملا تھا۔ سامان میں ایک چھوٹا سا ٹی وی بھی تھا۔ ڈیرک خوش ہو گیا کیونکہ اسے ٹی وی کا شوق تھا۔

ڈیرک نے ٹی وی آن کیا اور نیویارک کا ایک نیوز چینل لگایا۔ سفر کے دوران انہیں نیویارک کے بارے میں علم نہیں تھا۔ مائیکل کی گمشدگی مقامی سطح پر اتنی بے اثر نہیں تھی۔ وہاں ضرور ہنگامہ ہوا ہوگا۔ ان کا اندازہ درست تھا بلکہ کچھ زیادہ ہی ہنگامہ ہوا تھا۔ پولیس نے موڈی کو... مائیکل کو قتل اور غائب کرنے کے الزام میں گرفتار کر لیا تھا۔ پولیس کو ایسے شواہد مل گئے تھے جو موڈی کو گرفتار کرنے کے لیے کافی تھے۔ اس کے مکان کے عقبی حصے میں خون اور کنگھی کے آثار ملے تھے۔ ٹیسٹ سے خون مائیکل کا ثابت ہوا تھا پھر بعض جگہوں پر مائیکل کی انگلیوں کے نشانات بھی ملے تھے۔ اس لیے پولیس نے فوری طور پر موڈی کو گرفتار کر لیا لیکن وہ اب تک مائیکل کی لاش برآمد نہیں کر سکی تھی۔

ٹی وی رپورٹر کے مطابق موڈی کا کہنا تھا کہ جس رات یہ سب ہوا، اس رات وہ گھر پر نہیں تھا بلکہ ایک نائٹ کلب میں تھا۔ اس کے کئی ایک گواہ تھے اور اس کے خلاف مداوش کی گئی ہے مگر وہ اس کی وضاحت نہیں کر سکا کہ مائیکل کا خون اور اس کی انگلیوں کے نشانات اس کے گھر میں کہاں سے آئے؟ رپورٹ سن کر ڈیرک نے جوش سے کہا۔ "یہ کتے کا بچہ کواس کرتا ہے۔ مائیکل کو اسی نے قتل کیا ہے... اور یہ جس نائٹ کلب کی بات کر رہا ہے، وہ اسی کی ملکیت ہے۔ ظاہر ہے اس کا عملہ اس کے حق میں ہی گواہی دے گا۔"

شارپ سوچ رہا تھا۔ "لیکن کیس کمزور ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"اصل چیز لاش ہے اور وہ غائب ہے۔ جب تک پولیس کو لاش نہیں ملے گی، موڈی پر قتل کی فرد جرم نہیں لگائی جا سکتی۔"

"ہاں، یہ تو ہے۔" ڈیرک نے تشویش سے کہا۔ "اس طرح تو یہ کتے کا بچہ صاف بچ جائے گا۔"

"لیکن پولیس کو لاش مل سکتی ہے۔" شارپ نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "پولیس نہیں جانتی لیکن ہم تو جانتے ہیں کہ لاش کہاں ہے؟"

"ہاں، ایسا ہو سکتا ہے لیکن فی الحال تو ہمیں دیکھنا چاہیے کہ یہ کیس کس کروٹ بیٹھتا ہے۔"

اگلے روز جب دوپہر بجے سوکر اٹھے تو ٹی وی پر موڈی کی ضمانت پر رہائی کی خبر چل رہی تھی۔ اس کے چالاک وکیل

نے پہلی پیشی پر ہی اسے رہا کرا لیا تھا۔ اس سے واضح ہو گیا تھا کہ پولیس کا بنایا کیس اتنا متاثر کن نہیں اور نہ ہی سرکاری وکیل نے موڈی کی ضمانت روکنے کی خاص کوشش کی تھی۔ ٹی وی رپورٹرز کے مطابق سرکاری وکیل نے کوشش ہی نہیں کی تھی لیکن سرکاری وکیل اس کی تردید کر رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ پولیس نے کیس مضبوط نہیں بنایا جبکہ پولیس افسر کا کہنا تھا کہ پولیس نے تمام دستیاب شواہد کی بنیاد پر موڈی کو مائیکل کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا تھا اور اگر سرکاری وکیل کوشش کرتا تو موڈی کی ضمانت نہیں ہو سکتی تھی۔

"یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔" شارپ نے ڈیرک سے کہا۔ "سرکاری وکیل بک گیا ہے یا اسے موڈی کے آدمیوں نے دھمکایا ہوگا۔"

"کچھ بھی ہو، موڈی ضمانت پر رہا ہو گیا ہے اور اب یہ کوشش کرے گا کہ کیس کو طول دے اور اپنے خلاف شہادتوں کو کمزور کر دے۔"

"ظاہر ہے۔" شارپ بولا۔ "لیکن اگر لاش پولیس کو مل جائے تو..."

"ہاں، تب کیس مضبوط ہو سکتا ہے۔ امید ہے کہ موڈی کو سزائے موت نہ ہو مگر وہ عمر بھر کے لیے جیل چلا جائے گا۔"

"اس جیسے آدمی کو جیل ہی جانا چاہیے۔" شارپ نے نفرت سے کہا۔ "ڈیل نے کیسے فرعون بن کر ہمیں نیویارک سے نکل جانے کا حکم دیا تھا۔"

"ہاں... لیکن ابھی ہمیں جلد بازی نہیں کرنی چاہیے۔" ڈیرک نے نفی میں سر ہلایا۔ "کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے خوب سوچ لینا چاہیے تاکہ نقصان نہ ہو۔"

"ہمارے پاس دماغ ہی کہاں ہے۔ لوگ ہمیں بلاوجہ تو احمقوں کی جوڑی نہیں کہتے۔"

"ہمارے پاس دماغ ہے، بس اسے استعمال کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اب موقع ملا ہے تو استعمال کر کے دیکھتے ہیں۔"

ڈیرک اور شارپ جرائم پیشہ اور احمق صحیح... لیکن ان میں ایک خوبی تھی کہ ایک دوسرے کے حد سے زیادہ وفادار تھے اور کوئی انہیں الگ نہیں کر سکتا تھا۔ ان میں ڈیرک غیر رسمی باس تھا اور جب کوئی اہم موقع آتا تو فیصلہ وہی کرتا تھا اور شارپ اس کی بات مان جاتا تھا۔ اس وقت بھی شارپ نے اس کی بات مان لی۔ "ٹھیک ہے لیکن اگر یہ بچنے لگا تو ہم لاش ضرور پولیس کے حوالے کر دیں گے۔"

ڈیرک کے ذہن میں کوئی بات آئی تھی کیونکہ اس نے پرخیال انداز میں سر ہلا کر کہا۔ "تم اس بارے میں فکر مت کرو، وہ بچے گا نہیں اور اس کا انجام برا ہوگا۔"

اگلے ایک ہفتے تک وہ ٹی وی پر کیس کی پیش رفت دیکھتے رہے۔ آہستہ آہستہ واضح ہوتا جا رہا تھا کہ اٹارنی آفس کو اس بنا لاش کے کیس سے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔ اس صورت میں موڈی کے بری ہونے کے امکانات روشن تھے۔ ابھی تک موڈی کے وکیل نے جیوری کی تشکیل نہیں ہونے دی تھی اور اس کی کوشش تھی کہ جیوری میں موڈی کے ہمدرد افراد آ جائیں۔ اس لیے جن پر شبہ ہوتا کہ وہ موڈی کے خلاف ہیں، وہ ان پر اعتراض کر دیا کرتا۔ رہا ہونے کے بعد موڈی زیادہ جارحانہ انداز میں ہاتھ پاؤں پھیلا رہا تھا اور اس کے آدمیوں نے مائیکل کے بزنس پر قبضہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ مائیکل اس علاقے میں اس کا آخری جان دار حریف تھا اس کے بعد موڈی کو روکنے والا کوئی نہیں تھا۔

ڈیرک لیٹا سوچتا رہتا۔ شارپ پریشان تھا کیونکہ ان کی جمع پونجی تیزی سے ختم ہو رہی تھی۔ وہ روزانہ ڈیرک سے کہتا کہ انہیں کچھ کرنا چاہیے ورنہ فاقوں کی نوبت آ جائے گی۔ لیکن ڈیرک کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ جواب دیتا۔ "فکر مت کرو، ابھی ہمارے پاس رقم ہے۔"

ایک دن شارپ نے جھنجھلا کر بتایا۔ "اب ہمارے پاس مشکل سے سو ڈالرز رہ گئے ہیں اور یہ تین دن سے زیادہ نہیں چلیں گے۔"

"بہت ہیں کیونکہ کل ہمیں یہاں سے روانہ ہو جانا ہے۔"

شارپ چونکا۔ "کہاں؟"

"واپس نیویارک کی طرف۔"

"تمہارا دماغ درست ہے؟ وہاں موڈی ہے اور پہلے سے زیادہ خطرناک ہو چکا ہے۔ ہم نے نیویارک میں قدم بھی رکھا تو اگلے روز ہماری لاشیں بھی کسی کار کی ڈکی میں پڑی ہوں گی۔"

"ہم نیویارک کی طرف جائیں گے لیکن وہاں قدم نہیں رکھیں گے۔" ڈیرک نے سکون سے کہا۔

"پھر جانے کا مقصد؟"

"بس تم دیکھتے جاؤ۔ لیکن جانے سے پہلے ہمیں کچھ رقم اور ایک کار کا بندوبست کرنا ہے۔"

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔ ہمیں کچھ ہاتھ پاؤں مارنے چاہئیں۔"

"بس تو کل سے ہم حرکت میں آ جاتے ہیں۔"

اگلے روز انہوں نے ایک پارکنگ میں کھڑی گاڑیوں

www.pkdigest.com

سے کئی چیزیں نکال لیں جو شارپ کے واقف کار کے توسط سے چور بازار میں بک گئیں اور انہیں کچھ رقم ہاتھ آ گئی۔ ڈیرک نے رقم دیکھ کر سرد آہ بھری۔ ''اسی سامان کی نیویارک میں اس سے دگنی قیمت مل سکتی تھی۔''

''ہم اپنے علاقے میں نہیں ہیں۔'' شارپ نے کہا۔ ''اگر یہ ذلیل موڈی جیل چلا جائے تو شاید ہم واپس جا سکیں۔''

''ایسا ہی ہوگا۔'' ڈیرک نے یقین سے کہا۔

شارپ نے ایک پرانی..... کار کا بندوبست کر لیا تھا۔ یہ ان کے فلیٹ کے پاس ایک جگہ بہت عرصے سے ایسے ہی کھڑی تھی۔ شاید اس کا مالک اسے لاوارث چھوڑ گیا تھا اور اب اسے استعمال نہیں کرتا تھا۔ شارپ نے اپنی مخصوص چابیوں کی مدد سے بہ آسانی اس کے تالے کھول کر اسے اسٹارٹ کر لیا۔ انجن میں کچھ مسئلہ تھا۔ وہ بھی انہوں نے ایک گیراج میں ٹھیک کرا لیا۔ روانہ ہونے سے پہلے انہوں نے کچھ خریداری کی۔ وہ چاہتے تھے کہ انہیں راستے میں کہیں رکنا نہ پڑے۔

دو دن کے سفر کے بعد وہ نیویارک کی ریاست میں داخل ہوئے اور شہر میں داخل ہونے کے بجائے ایک ٹریلر پارک میں رک گئے۔ یہاں رکنے کے لیے ضروری نہیں تھا کہ آدمی کے پاس ٹریلر بھی ہو۔ یہاں تمام سہولتیں تھیں اور بہت ارزاں قیمت پر دستیاب تھیں۔ سب سے بڑھ کر وہ یہاں موجود لوگوں کے ہجوم میں غائب رہ سکتے تھے۔ رات گزارنے کے لیے انہوں نے خیمہ لے لیا تھا۔ شارپ کو اب تک نہیں معلوم تھا کہ ڈیرک یہاں کیوں آیا ہے۔ جب وہ خیمے میں لیٹے تھکن اتار رہے تھے تو شارپ نے اس سے پوچھ لیا۔

''ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟''

''دولت کمانے اور موڈی کو ٹھکانے لگانے۔'' ڈیرک نے سرگوشی میں کہا۔ یہ خیمہ باریک میٹریل کا بنا تھا اور کوئی ان کے خیمے کے پاس کھڑا ہوتا تو ان کی گفتگو سن سکتا تھا اس لیے وہ دونوں ہی بہت محتاط ہو کر آہستہ آواز میں بات کر رہے تھے۔

''وہ کیسے؟''

''بس تم دیکھتے جاؤ۔'' ڈیرک نے کہا۔

شام کو وہ ٹریلر پارک سے نکلے۔ ڈیرک نے ایک کباڑ خانے کا رخ کیا۔ چارلی نامی یہ کباڑیا ان سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس کا کام چوری کا سامان خریدنا اور آگے بیچنا تھا جبکہ واحد مشغلہ شراب پینا تھا۔ وہ ہمہ وقت نشے میں رہتا تھا لیکن اس حالت میں بھی کوئی غلطی نہیں کرتا تھا۔ اس وقت بھی وہ بیٹھا پی رہا تھا۔ انہیں دیکھ کر اس نے قہقہہ لگایا۔ ''کہاں غائب ہو گئے تھے تم دونوں.... بہت دن سے نظر نہیں آئے؟''

''بس ذرا سیر کرنے گئے تھے۔'' ڈیرک نے جواب دیا۔

چارلی معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ''لگتا ہے خاصا مال آ گیا ہے... ابھی کیا لائے ہو؟''

''ابھی کچھ نہیں لائے ہیں بلکہ کچھ لینے آئے ہیں۔''

''پہلی بار ایسا ہو رہا ہے۔'' چارلی پھر ہنسا۔ ''کیا چاہیے؟''

''ایک جی پی ایس ریسیور چاہیے۔ کام کرتا ہو۔''

''تم بیٹھو اور چاہو تو بیئر نکال لو۔'' چارلی نے ایک طرف رکھے فریج کی طرف اشارہ کیا اور اپنے کباڑ خانے میں گھس گیا۔ انہوں نے اس کی پیش کش سے استفادہ کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ جب تک چارلی جی پی ایس ریسیور لے کر واپس آتا، وہ تین تین بوتلیں پی چکے تھے۔ چارلی نے توجہ نہیں دی اور ریسیور ڈیرک کی طرف بڑھا دیا۔

''پچاس ڈالرز دو۔''

''پچاس...؟'' ڈیرک اچھل پڑا۔ ''اتنے میں تو نیا آ جاتا ہے۔''

''اچھا، چالیس دے دو۔'' چارلی بولا۔

''میں تمہیں ایک ڈالر اوپر نہیں دوں گا۔'' ڈیرک نے کہا تو چارلی مان گیا۔ ڈیرک نے اس سے ریسیور لے کر چیک کیا، وہ کام کر رہا تھا۔ اس نے ادائیگی کی اور کباڑ خانے سے باہر آ گیا۔

''اس کا کیا کرنا ہے؟'' شارپ نے پوچھا۔

''میں نے کہا نا، دیکھتے جاؤ۔'' ڈیرک بولا اور کار کا رخ ہائی وے کی طرف موڑ دیا۔ ایک گھنٹے بعد وہ اس جگہ تھے جہاں انہوں نے مائیکل کی لاش ایک گڑھے میں دفنائی تھی۔ گڑھا اسی طرح بند تھا اور کسی جنگلی جانور نے اسے نہیں چھیڑا تھا۔ ظاہر ہے اتنے دن میں لاش خراب ہو کر ناقابل شناخت ہو چکی ہوگی لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آج کل ایسے طریقے ایجاد ہو گئے ہیں کہ برسوں پرانی اور بالکل ڈھانچا ہو جانے والی لاش کی شناخت بھی ممکن ہے۔ ڈیرک نے جی پی ایس پر مائیکل کی قبر کی پوزیشن نوٹ کی اور اسے ایک کاغذ پر اتار لیا۔ شارپ نے پھر سوال کیا۔

''یہ کیا کر رہے ہو؟''

ڈیرک نے وہی جواب دیا۔ ''بس دیکھتے جاؤ۔''

وہ وہاں سے روانہ ہوئے۔ ڈیرک مزید کوئی بیس میل نیویارک سے دور گیا اور پھر اس نے ایک فون بوتھ سے نمبر

ملایا۔ شارپ اس کے ساتھ لگ کر کھڑا تھا۔ بولنے سے پہلے ڈیرک نے ماؤتھ پیس پر اپنا رومال لپیٹ لیا تھا تاکہ آواز نہ پہچانی جا سکے۔ شارپ نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

''کسے کال کر رہے ہو؟''

''موڈی کو۔''

''تمہارا دماغ...'' شارپ چلّا اٹھا لیکن اسی لمحے لائن مل گئی اور ڈیرک نے اس کا منہ دبا دیا۔ اس نے شعوری طور پر بھی آواز بھاری بنا کر کہا۔

''مجھے موڈی سے بات کرنی ہے۔''

''کون ہو تم؟''

''یہ میں اسی کو بتاؤں گا۔''

''جہنم میں جاؤ... بلاس ہر ایرے غیرے سے بات نہیں کرتا ہے۔'' موڈی کا گرگا غرا کر بولا۔

''جہنم میں تمہارا باس جائے گا۔ اگر تم نے میری اس سے بات نہیں کرائی۔'' ڈیرک جواباً غرایا۔ ''اور جب اسے پتا چلے گا کہ اس کا نقصان تمہاری وجہ سے ہوا ہے تو وہ پہلے تمہیں جہنم رسید کرے گا۔''

اس دھمکی کے بعد گرگا شرافت کی لائن پر آ گیا۔ ''اوکے... تم آدھے گھنٹے بعد اسی نمبر پر کال کرنا۔''

ڈیرک نے فون بند کیا تو شارپ اس سے چمٹ گیا۔ ''تم پاگل ہو گئے ہو، ہم موڈی سے پیچھے چھڑا رہے ہیں اور تم اسے کال کر رہے ہو؟''

''نہیں، اسے کیا پتا کہ کال ہم کر رہے ہیں۔ فون بوتھ سے کچھ پتا نہیں چلتا اور میں نے رومال رکھ کر آواز بدل لی تھی۔'' ڈیرک نے کہا۔ ''تم نے اچھا یاد دلایا۔'' اس نے جا کر فون بوتھ کو صاف کیا جہاں جہاں اس کے اور شارپ کے ہاتھ لگے تھے۔ ''اگرچہ اس کا کوئی امکان نہیں ہے کہ موڈی کے گرگے اس فون بوتھ کا پتا چلا سکیں لیکن ہمیں محتاط رہنا چاہیے۔''

وہ آگے روانہ ہو گئے۔ شارپ ابھی تک نہیں سمجھا تھا کہ ڈیرک یہ سب کیوں کر رہا ہے۔ ڈیرک نے اس کی عقل کا ماتم کرتے ہوئے کہا۔ ''تم اتنی سی بات نہیں سمجھ پا رہے۔ ہم موڈی سے اس کے دشمن کی لاش کا سودا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''اس کوشش میں ہم خود لاشوں میں بدل جائیں گے۔''

''اسی لیے تو اتنی احتیاط کر رہا ہوں۔''

شارپ اس کی پلاننگ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''ڈیرک! یہ بہت خطرناک ہے۔ موڈی ہمارے مقابلے میں ایسا ہے جیسے کسی چوہے کے مقابلے میں بلی۔ ہم اس کا سامنا نہیں کر سکتے۔''

''اگر بلی پنجرے میں بند ہو تو کر سکتے ہیں۔'' ڈیرک مسکرایا اور دوسرے فون بوتھ کے سامنے گاڑی روک دی۔ ابھی آدھا گھنٹا پورا ہونے میں وقت تھا اور اس دوران میں شارپ ڈیرک کو اس چکر سے باز رکھنے کی کوشش کرتا لیکن پھر اس نے ہار مان لی۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ ڈیرک باز نہیں آئے گا۔

ڈیرک نے نمبر ملایا تو اس بار موڈی نے فون خود اٹھایا۔ ''تم کون ہو؟'' اس نے سوال کیا۔

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میں کون ہوں۔'' ڈیرک نے کہا۔

''پھر تم نے کیوں کال کی ہے؟''

''تمہارے دشمن کی گم ہو جانے والی لاش میرے پاس ہے۔'' ڈیرک نے بہت سادگی سے بتا دیا۔ اس کی بات کا اثر کسی دھماکے سے کم نہیں تھا، موڈی اچھل پڑا۔

''کیا بکواس کر رہے ہو تم؟ تمہاری جرأت کیسے ہوئی؟''

''موڈی! شور مت کرو... کیا یہ لائن محفوظ ہے؟ ایسا نہ ہو کہ پولیس تم سے پہلے پہنچ جائے۔''

اس پر موڈی چپ ہوا۔ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''یہ لائن محفوظ ہے... تم نے لاش کہاں سے حاصل کی ہے؟''

''کیا میں اس کار کا نمبر بتاؤں جس کی ڈکی میں لاش تھی؟''

''ہاں اور اس کا ماڈل بھی بتاؤ؟''

ڈیرک نے کار کا نمبر اور ماڈل بتایا تو موڈی کو سانپ سونگھ گیا پھر اس نے اسے لاش کے بارے میں مزید بتایا۔

''میرا خیال ہے کہ اب تمہیں یقین آ گیا ہوگا؟''

''تم کیا چاہتے ہو؟'' موڈی نے کہا۔

''صرف ایک ملین ڈالرز۔''

موڈی ایک بار پھر اچھل پڑا۔ ''تمہارا دماغ درست ہے؟''

شارپ بھی ڈیرک کو کچھ اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے اسے اس کی دماغی حالت پر شبہ ہو رہا ہو۔ موڈی سے رقم کا مطالبہ کرنا ہاتھی سے کیلا چھیننے سے زیادہ خطرناک کام تھا۔

''نہیں ورنہ میں اتنا خطرناک کام کیوں کرتا۔'' ڈیرک نے چڑ کے کہا۔ ''مجھے معلوم ہے کہ میں تمہارے ہاتھ آ گیا تو میری ہڈیاں بھی نہیں ملیں گی۔''

''پھر بھی تم ایسی جرأت کر رہے ہو؟'' موڈی دہاڑا۔

''ہاں کیونکہ فی الحال میں محفوظ ہوں۔'' ڈیرک محظوظ

www.pkdigest.com

ہوئے والے انداز میں بولا۔ پھر وہ اچانک سنجیدہ ہو گیا۔
''مسٹر موڈی! ایک ملین ڈالرز کی رقم کل شام تک تیار رکھو۔ رقم سو سو ڈالرز کے پرانے نوٹوں کی صورت میں ہونی چاہیے۔ کوئی نئی گڈی نہ ہو۔ میں اسی نمبر پر کال کروں گا۔ اگر تم نے رقم تیار نہ رکھی تو میں اگلی کال پولیس کو کروں گا۔ تم اچھی طرح سمجھ رہے ہو کہ میں پولیس کو کال کیوں کروں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔
''تم بالکل پاگل ہو گئے ہو۔'' شارپ سٹپٹا کر بولا۔ ''موڈی سے ایک ملین ڈالرز کا مطالبہ کر رہے ہو؟''
''تو کیا اس سے سو ڈالرز مانگوں؟''
''پھر بھی وہ پاگل ہو جائے گا۔''
''سنو یار! اگر ہم اس طرح اس سے سو ڈالرز بھی نکلوا لیں تب بھی وہ پاگل ہو جائے گا۔ اس لیے جب خطرہ مول لینا ہے تو لمبی رقم کیوں نہ مانگیں۔ اور وہ ایک ملین ڈالرز دے سکتا ہے۔''
''وہ نہیں دے گا۔'' شارپ نے یقین سے کہا۔
''وہ دے گا کیونکہ پولیس کو لاش مل گئی تو وہ موڈی کے گلے میں پھندا ڈالنے میں دیر نہیں لگائے گی۔'' ڈیرک نے اس سے زیادہ یقین سے کہا۔
''شرط لگاتے ہو؟ نہیں دے گا۔'' شارپ نے اس کی طرف دیکھا۔
''ٹھیک ہے... لیکن کیا شرط لگاتے ہو؟''
''اگر اس نے تمہیں ایک ملین ڈالرز دے دیے تو میں اس میں سے حصہ نہیں مانگوں گا۔'' شارپ نے کہا۔
''منظور ہے۔'' ڈیرک نے ہاتھ آگے کیا اور شارپ نے اس پر ہاتھ مارا۔ وہ واپس ٹریلر پارک آ گئے۔ انہوں نے راستے میں ایک جگہ سے کھانا اور بیئر کی بوتلیں لے لی تھیں اور ان کا ارادہ اب اگلے روز سے پہلے باہر جانے کا نہیں تھا۔ موڈی سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ اپنے آدمیوں کو ہائی وے پر لگا دیتا اور وہ ٹریلر پارک تک بھی آ جاتے۔ ڈیرک نے بستر پر دراز ہو کر ایک بوتل کھولتے ہوئے کہا۔ ''اگر کل موڈی مان گیا تو ہمارے دن بدل جائیں گے اور ہم اس ملک پر لعنت بھیج کر کسی ایسی جگہ چلے جائیں گے جہاں موڈی کا سایہ بھی نہ پہنچے۔''
''اگر وہ مان بھی گیا، تب بھی اس سے رقم نکلوانا آسان کام نہیں ہوگا۔'' شارپ نے اسے خبردار کیا۔
''میں جانتا ہوں لیکن میں نے سوچ لیا ہے کہ ہم کس طرح سامنے آئے بغیر اس سے رقم حاصل کر لیں گے۔''
ڈیرک نے کہا۔ ''کل صبح ہم اس پر کام کریں گے۔''
وہ کھا پی کر سو گئے۔ اگلے روز جب سورج نکلنے میں بھی وقت تھا، وہ پارک سے نکلے اور ایک سپر اسٹور پہنچے جہاں ڈیرک نے یکساں فریکوئنسی پر کام کرنے والے واکی ٹاکی سیٹ لیے۔ ان کی رینج ایک کلومیٹر سے زیادہ تھی۔ پھر اس نے ایک سرخ رنگ کے اسپرے پینٹ کا ڈبا لیا۔ سپر اسٹور سے نکل کر وہ روانہ ہوئے۔ ڈیرک نے کار کا رخ اس ہائی وے کی طرف موڑ دیا جہاں انہوں نے گزشتہ روز فون بوتھ سے موڈی سے بات کی تھی۔ پھر اس پر مغرب کی طرف جانے والی جو پہلی ذیلی سڑک آئی، اس پر مڑ گئے۔ اس سڑک پر بھی خاصا ٹریفک تھا کیونکہ یہ سڑک دو ہائی ویز کو ملا رہی تھی۔ ایک جگہ ڈیرک نے کار کچے میں اتار دی اور اسے ایک نسبتاً اونچی پہاڑی تک لے گیا۔ اس نے کار ایک جھاڑی کے پیچھے روکی اور شارپ سے کہا۔
''تم اس جگہ سے آس پاس کی نگرانی کرو گے اور اگر کوئی خطرہ دیکھو تو مجھے وا کی ٹاکی پر خبردار کرو گے۔''
شارپ نے اس سے پہلے کبھی اس قسم کے کام نہیں کیے تھے اس لیے وہ پریشان تھا۔ ''ڈیرک! یہ کیا کر رہے ہو... ہم کسی فلم میں کام نہیں کر رہے ہیں۔ غلطی ہو گئی تو مارے جائیں گے۔''
''ایک ملین ڈالرز ایسے ہی نہیں مل جائیں گے... اس کے لیے خطرہ مول لینا پڑے گا۔'' ڈیرک نے کہا اور واپس روانہ ہو گیا۔ پھر اس نے سڑک کے دوسری طرف ایک جگہ منتخب کی اور شارپ سے کہا۔ ''میں فون کر کے آ کر اس جگہ چھپ جاؤں گا اور جب ہمیں یقین ہو جائے گا کہ موڈی کا کوئی آدمی یہاں نہیں ہے تو ہم رقم حاصل کر کے روانہ ہو جائیں گے۔''
''کہاں؟''
''واپس انڈیانا کی طرف۔''
دوپہر کا کھانا انہوں نے ایک چھوٹے سے بار میں کیا اور پھر سڑک کے کنارے ایک فون بوتھ سے موڈی کا نمبر ملایا۔ اس نے کال ریسیو کی۔ ''تم نے رقم کا بندوبست کیا ہے یا نہیں؟'' ڈیرک نے دوٹوک انداز میں پوچھا۔
''ہاں، رقم موجود ہے۔ تمہیں کہاں پہنچانی ہے۔'' موڈی نے کہا۔ ''لیکن اس سے پہلے میں لاش کے بارے میں جاننا چاہوں گا۔''
''کیا جاننا چاہتے ہو؟''
''اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم مجھے لاش دے دو گے؟''

''مجھے لاش کا کچھ نہیں کرنا ہے اور نہ ہی میں وعدہ خلافی کرتا ہوں۔''
''یعنی اس بات کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔'' موڈی نے کہا۔ ''یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم مجھ سے رقم لے کر بھی لاش مجھے نہ دو یا پولیس کے حوالے کر دو۔''
''اس معاملے میں تمہیں مجھ پر اعتبار کرنا ہوگا۔'' ڈیرک نے صاف گوئی سے کہا۔ ''تمہارا ایک آدمی رقم لے کر اس جگہ آئے گا جہاں میں کہوں... اور جب مجھے رقم اور اپنے تحفظ کے بارے میں اطمینان ہو جائے گا تو میں تمہیں کال کر کے لاش کے بارے میں بتا دوں گا۔''
''میرا آدمی رقم لے کر کہاں آئے؟''
''اسے کہو کہ ہائی وے نمبر سینتالیس پر ستائیسویں سے پینتیسویں سنگ میل کے درمیان چکر لگاتا رہے۔ میں تمہیں شام چار بجے فون کر کے بتاؤں گا کہ رقم کہاں پہنچانی ہے۔''
ڈیرک فون بوتھ سے باہر آیا اور وہ ذیلی سڑک کی طرف روانہ ہو گئے۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ اس سڑک پر بھی کئی فون بوتھ ہیں۔ انہوں نے راستے میں ایک گیس اسٹیشن سے کار کی ٹنکی بھروائی اور کار کی سروس بھی کرا لی تاکہ عین موقع پر کوئی مسئلہ نہ ہو جائے۔ شارپ اب پوری طرح راضی تھا اور اس نے تسلیم کر لیا تھا کہ وہ شرط ہار گیا ہے۔ اس نے فراخ دلی سے کہا۔ ''یہ ایک ملین ڈالرز تمہارے ہیں۔''
ڈیرک مسکرا دیا۔ اس نے تین بجے شارپ کو واکی ٹاکی سیٹ کے ساتھ اس پہاڑی کے پاس اتار دیا جہاں سے وہ چاروں طرف نظر رکھ سکتا تھا اور پھر خود نیچے روانہ ہو گیا۔ یہاں سے کوئی دس میل آگے ایک فون بوتھ سے اس نے موڈی کو کال کی۔ ''اپنے آدمی سے کہو کہ ہائی وے سینتالیس اور بائیس کو ملانے والی سڑک پر آئے اور بائیں طرف دیکھتا رہے۔ جہاں اسے سڑک کے ساتھ زمین پر سرخ رنگ سے دائرہ بنا دکھائی دے، رقم والا بیگ اس دائرے کے ساتھ موجود جھاڑی میں چھپا دے اور پھر وہاں سے روانہ ہو جائے۔ اگر اس نے اس کے برعکس کچھ کرنے کی کوشش کی تو رقم لینے کوئی نہیں آئے گا البتہ آج رات تک پولیس کو مائیکل کی لاش ضرور مل جائے گی۔''
''تم فکر مت کرو، ایسا نہیں ہوگا۔'' موڈی نے کہا۔
''بس تو اپنے آدمی سے کہو کہ روانہ ہو جائے۔''
ڈیرک فون بند کر کے تیزی سے حرکت میں آیا۔ وہ کار میں بیٹھا اور اس کا اسکسلیٹر دبا دیا۔ دس منٹ بعد وہ پہاڑی کے قریب تھا۔ اس نے کار سے اتر کر ایک جھاڑی کے سامنے اسپرے پینٹ سے زمین پر ایک بڑا سا دائرہ بنایا جو دور سے بھی واضح نظر آ رہا تھا۔ پھر وہ واپس کار میں بیٹھا اور پہاڑی کی مخالف سمت سڑک سے اتر کر ان جھاڑیوں میں پہنچ گیا جہاں اسے بیٹھ کر شارپ سے رپورٹ لینا تھی۔ اس نے کار چھپائی اور واکی ٹاکی نکال کر آن کیا۔
''تم میری آواز سن رہے ہو؟'' اس نے نام لینے سے گریز کیا۔
''ہاں، سن رہا ہوں۔'' شارپ نے رو دینے والی آواز میں کہا۔ ''میں نے تم سے کہا تھا نا۔''
ڈیرک کا ماتھا ٹھنکا۔ ''کیا ہوا؟''
''یہ میں بتاتا ہوں۔'' شارپ کے بجائے ایک اور آواز آئی۔ ''تم نے باس کو کیا احمق سمجھ رکھا ہے اپنی طرح۔''
''تم کون ہو؟'' ڈیرک نے پوچھا۔
''یہ موڈی کے آدمی ہیں۔'' اس بار شارپ کی آواز آئی۔ ''انہوں نے ہمیں تلاش کر لیا ہے۔''
''اپنے آس پاس دیکھو۔'' دوسرے آدمی نے کہا۔
ڈیرک نے بوکھلا کر ارد گرد دیکھا تو اسے دو مسلح افراد نظر آئے جو کار کے دونوں طرف تھے۔ پھر وہ کار میں گھس آئے اور ان میں سے ایک نے ڈیرک سے واکی ٹاکی چھین کر کہا۔ ''ہم نے قابو پا لیا ہے۔''
''اسے لے کر آؤ۔'' دوسری طرف سے حکم دیا گیا۔
''او کے باس۔'' چھیننے والے نے واکی ٹاکی بند کر دیا اور ڈیرک کو حکم دیا۔ ''پہاڑی کی طرف چلو۔''
ڈیرک کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا رہا تھا اور اس اندھیرے میں اسے اپنا انجام صاف نظر آ رہا تھا۔ اس نے کار نکالی اور پہاڑی کی طرف جانے لگا۔ کچھ دیر میں وہ سب ایک جگہ تھے۔ موڈی کے نصف درجن آدمیوں نے انہیں گھیر رکھا تھا۔ شارپ رو رہا تھا اور اس نے ڈیرک سے کہا۔ ''اب ہم مارے جائیں گے۔ کاش! تم میری بات مان جاتے۔''
''اتنی جلدی بھی کیا ہے۔'' ایک نے طنز کیا۔ ''باس کو تو آنے دو... وہی تمہارا فیصلہ کرے گا کہ تمہارے ساتھ کیا کرنا ہے۔''
انہوں نے شارپ اور ڈیرک کو باندھ کر ایک طرف ڈال دیا اور خود ان کی کار سے ملنے والی بیئر کی بوتلیں خالی کرنے لگے۔ موڈی کو آنے میں ایک گھنٹا لگ گیا اور اس وقت تک سورج ڈوبنے کے قریب تھا۔ کچھ دیر میں تاریکی چھا جاتی۔ موڈی اپنی گاڑی سے اتر کر ان کے پاس آیا اکسس نے بلا تمہید پوچھا۔ ''اگر آسان موت مرنا چاہتے ہو تو مجھے مائیکل کی لاش کا پتا بتا دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں ہیروئن

www.pkdigest.com

کا انجکشن لگا کر ماروں گا۔ تمہیں مرنے کا پتا بھی نہیں چلے گا۔"

"اور اگر ہم نہ بتائیں تو...؟" ڈیرک نے دل کڑا کر کے پوچھا۔ شارپ بدستور رونے میں مصروف تھا۔

"اس صورت میں تم دونوں بہت اذیت سے مرو گے۔ تمہیں بھی پتا ہے آدمی کو کیا کیا اذیتیں دی جاسکتی ہیں۔" موڈی کا لہجہ سرد ترین ہو گیا۔

"نہیں۔" شارپ نے ہلبلا کر کہا۔ "میں تکلیف سے نہیں مرنا چاہتا۔"

"تب مجھے مائیکل کی لاش دے دو۔"

ڈیرک نے سوچا اور سر ہلا دیا۔ "ٹھیک ہے، میں تمہیں وہاں تک لے جاسکتا ہوں۔"

"تب چلو۔" موڈی نے کہا۔ وہ مائیکل کی لاش حاصل کرنے کے لیے بے چین تھا۔ انہوں نے ڈیرک اور شارپ کی کار وہیں چھوڑ دی اور انہیں اپنی گاڑیوں میں لے کر روانہ ہو گئے۔ ڈیرک ان کی راہنمائی کر رہا تھا۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ اب گلوخلاصی ممکن نہیں ہے۔ موڈی انہیں مار کر اسی گڑھے میں مائیکل کی لاش کے ساتھ دفن کر دیتا اور کسی کو ان کے انجام کا پتا بھی نہیں چلتا۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ اس جگہ پہنچے جہاں مائیکل کی لاش تھی۔ اس وقت تک تاریکی چھا چکی تھی۔ ڈیرک کو گڑھے کا اچھی طرح علم تھا لیکن اس نے موڈی پر ظاہر کیا کہ اسے وہ جگہ صحیح سے یاد نہیں آ رہی ہے۔ وہ ان سب کو لے کر وہاں گھومنے لگا۔

"مجھے صحیح سے یاد نہیں آ رہا کہ لاش کہاں دفن ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ تمہاری یادداشت درست کرنے کے لیے کچھ کرنا پڑے گا۔" موڈی نے پستول نکال لیا اور اس کا رخ ڈیرک کی طرف کیا۔ "اگر میں تمہیں گھٹنے پر گولی ماروں تو اس سے تمہاری یادداشت پر یقیناً اچھا اثر پڑے گا۔"

ڈیرک دہشت زدہ ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ موڈی مذاق نہیں کر رہا، وہ سچ مچ اسے گولی مار دے گا۔ ڈیرک نے جلدی سے کہا۔ "نہیں... مجھے کچھ کچھ یاد آ رہا ہے۔ وہ یہیں کہیں ہے۔"

موڈی نے پستول واپس رکھ دیا۔ "دیکھو، اس کی جھلک دیکھ کر ہی تمہیں یاد آ گیا۔ اب مجھے دوبارہ پستول نکالنے پر مجبور مت کرنا۔ میں پستول نکال کر جب اسے استعمال کیے بغیر واپس رکھتا ہوں تو مجھے شدت سے توہین کا احساس ہوتا ہے۔"

ڈیرک وقت گزاری کر رہا تھا کہ شاید ان کی بچت کی کوئی صورت نکل آئے لیکن اب اس نے محسوس کر لیا تھا کہ بچت کی کوئی صورت نہیں اس لیے اس نے گڑھے کی نشان دہی کر دی۔ "میرا خیال ہے، لاش اس گڑھے میں ہے۔ اس کی مٹی کھودو تو لاش نکل آئے گی۔"

"مٹی تم کھودو گے۔" موڈی کے نائب نے کہا۔ وہ کھدائی کے اوزار ساتھ لائے تھے۔ مجبوراً ڈیرک اور شارپ مٹی کھودنے میں لگ گئے۔ اس دوران میں موڈی انہیں بتاتا رہا کہ اس نے کیسے ان کا سراغ لگایا تھا۔ انہوں نے حماقت کی تھی۔ مستقل آس پاس کے فون پوتھ استعمال کرتے رہے تھے۔ موڈی نے اپنے آدمیوں کو اس علاقے میں تمام فون بوتھس کی نگرانی پر لگا دیا اور اس طرح وہ پکڑے گئے۔

"میں نے اس احمق کو منع بھی کیا تھا۔" شارپ کھدائی کرتے ہوئے بولا۔ "لیکن اس پر فلمیں سوار رہتی ہیں اور یہ سمجھتا ہے جیسا فلموں میں دکھایا جاتا ہے، ایسا سچ مچ میں بھی ہو سکتا ہے۔"

ڈیرک نے سرد آہ بھری۔ "میں نے ایک جوا کھیلا تھا اور اس میں ناکام رہا۔ میرے دوست! مجھے معاف کر دینا۔"

"اس سے معافی مانگنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم دونوں ایک ہی قبر میں رہو گے۔" موڈی نے کہا۔ "دونوں کا ایک ہی انجام ہوگا۔"

"یہ مجھے منع کرتا رہا تھا کہ میں تمہیں بلیک میل نہ کروں لیکن میں نے اس کی بات نہیں مانی۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم سے زیادہ عقل مند ہے۔" موڈی نے کہا۔ "کاش کہ میں اسے معاف کر سکتا لیکن یہ ممکن نہیں ہے۔"

اسی لمحے لاش نکل آئی۔ اب انہوں نے ہاتھ سے مٹی ہٹائی۔ خلاف توقع لاش خراب نہیں ہوئی تھی۔ شاید ایسا سرد موسم کی وجہ سے تھا لیکن اس سے بو ضرور آنے لگی تھی۔ مائیکل کی لاش دیکھ کر موڈی کے چہرے پر اطمینان نظر آنے لگا۔ یہاں آتے ہوئے راستے میں وہ ان دونوں سے معلوم کر چکا تھا کہ انہوں نے لاش کیسے حاصل کی تھی اور وہ کار کہاں چھوڑی تھی جس میں لاش تھی۔ کار کی اسے فکر نہیں تھی کیونکہ وہ پہلے ہی چوری کی تھی اور ان لوگوں نے بھی اسے چرایا تھا۔ کار کا موڈی سے تعلق ثابت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لاش کی طرف سے اطمینان کے بعد اس نے گڑھے کا جائزہ لیا۔

"اس میں تم دونوں کی گنجائش نہیں ہے۔ تمہارے لیے کوئی اور جگہ تلاش کرنی پڑے گی۔"

"کوئی اور جگہ تلاش کرنے کی کیا ضرورت ہے باس۔" موڈی کے نائب نے کہا۔ "اسی گڑھے کو مزید گہرا کرتے ہیں اور انہیں بھی ساتھ ہی دفنا دیتے ہیں۔"

"ہاں، یہ اچھی تجویز ہے۔" موڈی نے کہا

ڈیرک اور شارپ اب تک امید میں تھے کہ شاید کوئی معجزہ ہو جائے اور ان کی جان بچ جائے لیکن اب تک کوئی معجزہ نہیں ہوا تھا اور وہ مرنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ دونوں موڈی کے سامنے رونے اور گڑگڑانے لگے کہ ان کی جان بخشی کر دی جائے۔ لیکن موڈی اتنا رحم دل نہیں تھا جو اپنے خلاف ایسے گواہ چھوڑ دیتا جو اسے پھانسی کے پھندے تک لے جا سکتے تھے۔ اس نے پستول نکال لیا۔ "سوری دوستو... میں تمہیں معاف نہیں کر سکتا۔ اس دنیا میں احمقوں کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور تم دونوں بھی احمق ہو اس لیے دنیا سے چلے جاؤ۔"

"لیکن تم نے تو کہا تھا کہ ہمیں ہیروئن کا انجکشن دو گے۔" شارپ چلایا۔

"ایک بار پھر معذرت کیونکہ یہاں میں تمہارے لیے ہیروئن کا انجکشن کہاں سے مہیا کروں۔ ویسے سر میں لگنے والی گولی آدمی کو فوراً موت کے گھاٹ اتار دیتی ہے۔" موڈی نے کہا اور پستول پہلے ڈیرک کی طرف کیا۔ اس نے دہشت زدہ ہو کر دونوں ہاتھ سامنے کیے لیکن اس سے پہلے کہ موڈی گولی چلاتا، وہ جہاں کھڑے تھے، وہ جگہ اچانک چاروں طرف سے دو شخصوں میں نہا گئی اور کسی نے میگا فون پر کہا۔ "پولیس... کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔"

لیکن موڈی کے ایک آدمی نے بدحواسی میں فائر کر دیا اور فوراً ہی کئی عدد گولیاں اس کے جسم میں اتر گئیں۔ وہ تیورا کر گرا تو باقی سب نے فوراً ہاتھ اوپر کر لیے۔

ڈیرک اور شارپ کو کچھ دیر یقین ہی نہیں آیا۔ معجزہ ہو گیا تھا اور پولیس آ گئی تھی۔ موڈی کا سب سے بُرا حال تھا۔ ایک تو وہ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا اور پھر مائیکل کی لاش بھی وہاں موجود تھی۔ اس کی اور کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ پولیس کہاں سے آ گئی تھی اور اسے کیسے پتا چلا تھا؟ کچھ دیر میں پولیس کے درجنوں جوانوں نے انہیں گھیر کر ہتھکڑیاں لگانا شروع کر دیں۔ جب ڈیرک اور شارپ کی باری آئی تو ایک پولیس افسر نے منع کر دیا۔ "نہیں، انہیں مت لگاؤ۔"

ڈیرک اور شارپ کو الگ کر کے ایک پولیس کار میں بٹھا دیا گیا۔ وہ زیرِ حراست تو نہیں تھے لیکن یہ بھی واضح تھا کہ فی الحال انہیں جانے کی اجازت نہیں۔ شارپ نے سرگوشی میں کہا۔ "مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔ مجھے لگ رہا ہے جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔"

"ہماری جان بچ گئی ہے۔" ڈیرک نے جوابی سرگوشی کی۔

"لیکن پولیس کیسے آئی؟"

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔" ڈیرک نے کہا۔ "لیکن پتا چل جائے گا۔"

انہیں مقامی پولیس اسٹیشن کے بجائے نیویارک لے جایا گیا۔ پتا چلا کہ موڈی اور اس کے ساتھیوں کی گرفتاری نیویارک پولیس نے مقامی پولیس کے تعاون سے کی تھی۔ اس لیے انہیں نیویارک کے ایک پولیس ہیڈ کوارٹر میں لایا گیا۔ وہاں شارپ اور ڈیرک کو موڈی اور اس کے ساتھیوں سے الگ رکھا گیا۔ انہیں ایک لاک اپ میں جگہ دی گئی لیکن لاک اپ بند نہیں تھا البتہ فی الحال ان کے باہر جانے پر پابندی تھی۔ اگلی صبح ایک پولیس افسر نے ان کا بیان لیا۔ شارپ اور ڈیرک نے بلاکم و کاست سب بتا دیا۔ اگرچہ انہوں نے کاریں چرانے اور دیگر جرائم کا اعتراف نہیں کیا تھا لیکن موڈی کو بلیک میل کرنے کی کوشش کا اعتراف ضرور کر لیا تھا۔

"ہمارا ارادہ اس سے رقم لے کر پولیس کو لاش کے بارے میں بتانے کا تھا۔" ڈیرک نے آخر میں کہا۔

"لیکن تم نے اس کی فوراً اطلاع نہیں دی... جو شہادت چھپانے کی کوشش تھی۔" پولیس افسر نے کہا۔

"پولیس کو کیسے پتا چلا کہ ہم موڈی کو لاش دکھانے لے گئے ہیں؟"

"بہت آسانی سے... ہم موڈی کا فون ٹیپ کر رہے تھے اور ساری باتیں ہمارے علم میں تھیں۔"

"یعنی تم شروع سے سب جانتے تھے؟" شارپ حیرت سے بولا۔ "پھر ہمیں پہلے ہی کیوں نہیں پکڑ لیا؟"

"ہمیں مائیکل کی لاش چاہیے تھی۔ اس کے بغیر موڈی کی گرفتاری بے کار تھی۔ اسے لاش کی تلاش کے لیے تو چھوڑا تھا۔ اب وہ کم سے کم بھی بیس سال کے لیے جیل جائے گا۔"

"اور ہمارا کیا ہوگا؟"

"شاید تم لوگوں کے ساتھ نرمی کی جائے کیونکہ تمہاری وجہ سے موڈی جیسا موذی پکڑا گیا ہے۔ فی الحال تو تم لوگ لاک اپ میں آرام کرو۔"

شارپ نے پولیس افسر کے جانے کے بعد سرد آہ بھری۔ "واقعی احمقوں کے لیے اس دنیا میں کوئی جگہ نہیں ہے۔"

"لیکن دوست... ایک بات تم بھول رہے ہو۔ احمقوں کا اتنا بُرا انجام بھی نہیں ہوتا ہے جو موڈی جیسے عقل مندوں کا ہوتا ہے۔" ڈیرک نے کہا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ "اب آرام کرو... جب تک نصیب میں سرکاری کھانا ہے۔"

www.pkdigest.com

تحیر و اسرار کے پردے کے پیچھے کھیلے گئے سنسنی خیز خونی کھیل کا ماجرا

کاشف زبیر

کٹھ پتلی

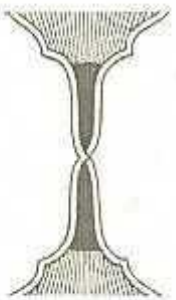

انسان کی فطرت ہے کہ وہ من میں لگی انتقام کی دہکتی آگ کو سرد کرنا چاہتا ہے لیکن اپنے ہاتھ جلائے بغیر۔ اس مجرم کے دل میں بھی انتقام کے شعلے بھڑک رہے تھے، جنہیں بجھانے کے لیے اس نے انوکھے طریقے کا انتخاب کیا۔ اس ذہین خونی کا قصہ جس کے ہاتھ میں نہ تو خنجر تھا اور نہ ہی دامن پہ خون کی کوئی چھینٹ

نوواک اپنے گھر کے واش بیسن کی صفائی کر رہا تھا۔ ڈیزی نے اس میں کچرا پھنس جانے کی شکایت کی تھی۔ آج اس کے پاس وقت تھا اس لیے اس نے سوچا کہ یہ کام کر دے۔ وہ نیچے گھسا واش بیسن کو کھول کر اس کی صفائی کر رہا تھا کہ ڈیزی نے آ کر اس کا پاؤں ہلایا۔ اسی لمحے اوپر سے پانی کا ایک قطرہ اس کی آنکھ میں ٹپک گیا۔ اس نے گھبرا کر اٹھنا چاہا اور یہ بھول گیا کہ اس وقت وہ ایک ریک کے نیچے ہے۔ اس کا سر ریک سے ٹکرایا۔ وہ اس تصادم کو برداشت کرتے ہوئے باہر نکل آیا۔

''کیا مسئلہ ہے؟'' اس نے سر سہلاتے اور آنکھ صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' ڈیزی شرارت سے بولی۔

آٹھ مہینے پہلے ہی ان دونوں کی شادی ہوئی تھی اور اب ڈیزی ماں بننے والی تھی۔ وہ دونوں بے حد خوش تھے۔ وہ آپس میں کزن بھی تھے۔ نوواک ایک ایئر کرافٹ انجینئر تھا اور روتھ وال کے طیارہ ساز پلانٹ میں کام کرتا تھا۔ اس کی ڈیوٹی ذرا سخت تھی۔ اسے روزانہ بارہ گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا۔ لیکن اس کے بدلے اسے ہفتے میں دو چھٹیاں مل جاتیں اور وہ مہینے میں الگ سے تین چھٹیاں کر سکتا تھا۔

ڈیزی نے کافی تیار کی اور اب وہ چاہتی تھی کہ نوواک اس کے ساتھ کافی پیے۔ نوواک نے کافی پیتے ہوئے کہا۔ ''میں ابھی مارکیٹ جا رہا ہوں، تمہیں کچھ منگوانا ہے؟''

''میں بھی چلوں؟''

''نہیں، موسم خراب ہے۔'' نوواک نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ بارش کے آثار نظر آ رہے تھے اور سردی بھی بڑھ گئی تھی۔ ''بہتر ہوگا تم آرام کرو تاکہ رات کے کھانے کے وقت بالکل فریش ہو۔''

''جیسی تمہاری مرضی۔'' ڈیزی نے کہا اور اسے سامان کے بارے میں بتانے لگی جو اسے لانا تھا۔ نوواک نے تمام چیزیں نوٹ کر لیں۔ کافی پی کر اس نے واش بیسن کا باقی کام نمٹایا اور روانہ ہونے والا تھا کہ دروازے کی بیل بجی۔ اس نے جا کر باہر دیکھا تو وہاں کوئی نہیں تھا اور فرش پر ایک

پارسل پڑا تھا۔ اسے حیرت ہوئی۔ اگر پارسل کوئی لایا تھا تو اسے خود دینا چاہیے تھا... اس طرح رکھ کر کیوں چلا گیا؟ پارسل کے اوپر کسی نے موٹے مارکر سے اس کا نام لکھا ہوا تھا لیکن اس پر نہ تو کسی کمپنی کا نام تھا اور نہ ہی کوئی اور نشان جس سے پتا چلتا کہ پارسل کسی کوریئر کمپنی کے ذریعے آیا ہے۔ وہ پارسل لے کر اندر آ گیا۔

''یہ کیا ہے؟'' ڈیزی نے دلچسپی سے دیکھا۔

''پتا نہیں باہر رکھا تھا... لیکن کوئی اور نہیں تھا۔''

''شاید کسی نے ہمارے ساتھ مذاق کیا ہے۔''

''یا کسی نے ہمیں اس طرح سرپرائز دیا ہے۔'' نوواک نے دوسرا خیال پیش کیا۔ ''آؤ اسے کھولتے ہیں۔''

انہوں نے مل کر بیک وقت پارسل کا اوپری کاغذ پھاڑنا شروع کیا۔ جلد کاغذ الگ ہو گیا۔ اندر سے تابوت کی شکل کا ایک لکڑی کا بکس نکلا۔ یہ دو بائی ایک فٹ کا تھا۔ وہ دونوں رک گئے۔ پھر نوواک نے اسے کھولا تو اندر تابوت نما بستر تھا اور اس پر ایک گڈا چپٹ لیٹا ہوا تھا۔ اسے لکڑی کی مدد سے بنایا گیا تھا اور اوپر پورا سوٹ پہنایا ہوا تھا۔ ڈیزی نے گڈا اٹھا لیا۔

''یہ سرپرائز ہے؟'' اس نے گڈے کا معائنہ کیا۔ ''یہ تو چپٹ ہے۔'' ڈیزی نے اس کے پیچھے ہاتھ ڈال کر ان لیورز کو پکڑ لیا جن سے پیٹ کا منہ اور آنکھیں ہلائی جا سکتیں تھیں۔

''ہائے... ! میرا نام پیٹ ہے۔'' ڈیزی نے گڈے کی آواز نکالنے کا مظاہرہ کیا تو نوواک بھی مسکرانے لگا۔

''واقعی کسی نے اچھا مذاق کیا ہے۔''

''مجھے تو یہ بہت اچھا لگا ہے۔'' ڈیزی نے اسے گلے سے لگا لیا۔ ''میں اسے اپنے پاس رکھوں گی اور جب تم کہیں گے ہو گے تو اس سے دل بہلایا کروں گی۔''

''یہ اچھا آئیڈیا ہے۔'' نوواک بولا۔ ''اب تم اسے بیڈروم میں لے جاؤ۔ میں جا رہا ہوں۔''

نوواک نیچے آیا۔ ان کا اپارٹمنٹ دوسری منزل پر تھا اور یہ بہت اچھی اور نگڑری قسم کی عمارت تھی جس میں مہذب اور شائستہ لوگ رہتے تھے۔ نوواک نے شادی کے بعد ہی یہ

www.pkdigest.com

اپارٹمنٹ خریدا تھا۔ وہ اپنی کار میں مارکیٹ کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں ہی بارش شروع ہو گئی تھی۔ وہ شاپنگ سینٹر کے سامنے کار سے اتر کر بھاگتا ہوا اندر گیا اور جلدی جلدی فہرست کے مطابق خریداری کرنے لگا۔ اسے ڈیزی کا خیال تھا کہ وہ زیادہ دیر اکیلی نہ رہے۔ خریداری کر کے وہ باہر نکلا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ بارش اتنی تیز تھی کہ وہ کار میں بیٹھتے بیٹھتے خاصا بھیگ گیا تھا۔ پارکنگ میں کار روک کر وہ بھاگتا ہوا عمارت کے داخلی دروازے سے اندر آیا۔ اسے جانے اور آنے میں مشکل سے ایک گھنٹا لگا تھا۔ اس نے سر سے پانی کے قطرے جھاڑے اور شاپرز لے کر سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا۔ اس نے چابی سے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھولا۔

''ڈیزی!'' اس نے آواز دی۔ ''کہاں ہو تم؟''

لیکن جواب میں صرف چولہے پر رکھی کیتلی سے بھاپ نکلنے کی سیٹی سنائی دی۔ اس نے شاپرز میز پر رکھ کر جلدی سے چولہا بند کیا اور پھر ڈیزی کو آواز دی۔ ''کہاں ہو تم؟ اب مزید ڈراما بند کرو۔''

ڈیزی اکثر اس سے کھیلتی تھی۔ گھر میں کہیں چھپ جاتی تھی اور وہ اسے تلاش کرتا پھرتا تھا۔ اسے لگا کہ آج بھی ڈیزی شرارت کے موڈ میں ہے۔ وہ اسے آواز دیتا ہوا اندر گیلری میں آیا، تب اس کی نظر بیڈروم کے کھلے دروازے پر پڑی۔ کمرا اندر سے تاریک تھا لیکن کبھی کبھی بجلی چمکتی تو روشن ہو جاتا۔ اسے بیڈ پر ڈیزی چادر اوڑھے لیٹی دکھائی دی۔ اس نے پکارا۔ ''ڈیزی! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

مگر اس بار بھی اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ بجلی چمکی تو اس نے دیکھا کہ چادر بالکل ساکت تھی اور یوں لگ رہا تھا جیسے ڈیزی تکیے کے سہارے سر اٹھائے بیٹھی ہے۔ اس نے دروازے تک آ کر لائٹ کا بٹن دبایا۔ کمرا روشن ہو گیا۔ اب اسے غصہ آنے لگا تھا۔

''ڈیزی!'' وہ بستر کے پاس آیا۔ ''اب ختم کرو یہ چکر...''

اس نے کہتے ہوئے چادر کا کنارہ پکڑ کر کھینچ لیا اور پھر اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ ڈیزی اس حال میں تکیے کے سہارے ٹیک لگائے بیٹھی تھی کہ اس کا منہ غیر معمولی طور پر کھلا ہوا تھا اور اندر اس کی زبان اور دانت غائب تھے۔ اس کے منہ سے نکلنے والا خون بہہ کر بستر تک آیا ہوا تھا اور وہ مر چکی تھی۔

☆☆☆

سارجنٹ جاسوس رائٹ فوبس نے نوواک کو دیکھا۔ وہ شاک کی کیفیت میں لگ رہا تھا مگر بہر حال اسے اپنا فرض تو ادا کرنا تھا۔ وہ ابھی لاش اٹھوا کر نیچے آیا تھا۔ ''مسٹر نوواک! مجھے افسوس ہے مگر ہمیں قاتل تک پہنچنے کے لیے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔''

نوواک چونکا۔ ''تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' اس نے اپنی آواز پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''تم نے لاش کو اسی حال میں دیکھا تھا؟''

''نہیں، اس کے اوپر چادر پڑی ہوئی تھی۔''

''وہی چادر جو بستر کے ساتھ ملی ہے؟''

''ہاں وہی چادر...''

''جب تم گھر سے گئے تو ڈیزی کا موڈ کیسا تھا؟''

''بالکل ٹھیک... وہ بہت خوش تھی۔ کسی نے ہمیں گفٹ بھیجا تھا اور وہ اس سے کھیل رہی تھی۔ اسے کھیل کا شوق تھا۔ وہ کبھی کبھی میرے ساتھ بھی کھیلتی تھی۔'' نوواک کی آواز بھرانے لگی۔

رائٹ تحمل سے اس کی بات سن رہا تھا۔ اس کے خاموش ہوتے ہی اس نے اگلا سوال کیا۔ ''جب تم گھر میں آئے تو تمہیں محسوس نہیں ہوا تھا کہ کوئی اور بھی اندر آیا تھا؟''

نوواک نے سوچا۔ ''نہیں... کیونکہ نہ تو تالا کھلا تھا اور نہ ہی اندر کسی کی موجودگی کے نشانات نظر آئے۔''

''کھڑکی کے راستے کوئی اندر نہیں آیا کیونکہ شیشہ بند تھا اور اسے توڑے بغیر کوئی اندر نہیں آ سکتا۔ صرف ایک ہی راستہ بچتا ہے۔''

نوواک سمجھ گیا۔ ''دروازے کی صرف دو چابیاں ہیں، ایک میرے پاس ہے اور دوسری ڈیزی کے پاس ہوتی تھی۔ ڈیزی والی چابی فریج سے لگے کی ہینگر میں موجود ہے... اور میری چابی میرے پاس تھی۔ اسی کی مدد سے میں دروازہ کھول کر اندر آیا تھا۔''

''مسٹر نوواک! تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔ تمہارے کچھ ٹیسٹ ہوں گے اور امید ہے تم اس کا برا نہیں مانو گے۔ تمہیں کلیئر قرار دینے کے لیے یہ ضروری ہیں۔''

''میں سمجھتا ہوں۔'' نوواک نے سر ہلایا۔

رائٹ فوبس اس کے ساتھ نیچے تک آیا۔ اوپر پولیس نے اپنا کام کر لیا تھا اور فارنسک والے اپنے کام کا آخری مرحلہ مکمل کر رہے تھے۔ اس کے بعد اپارٹمنٹ سیل کر دیا جاتا۔ رائٹ فوبس نے اس سلسلے میں اپنے عملے کو ہدایات دیں اور نوواک کے ساتھ وہاں سے روانہ ہو گیا۔ نوواک اپنی کار میں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر پولیس نے اسے جانے کی اجازت دے بھی دی، تب بھی وہ آج رات اپنے اپارٹمنٹ میں نہیں رہ سکے گا۔

رائٹ نے پولیس اسٹیشن میں اس کے چند مخصوص ٹیسٹ کرائے جن میں بلڈ ٹیسٹ اور اس کے جسم کے مکمل معائنے کا ٹیسٹ تھا۔ اگر اس کے جسم پر کہیں بھی ڈیزی کے خون کا ایک ذرہ بھی ہوتا تو ان کو اس کا پتا چل جاتا۔ اس کے بعد اسے رات وہیں گزارنی پڑی کیونکہ سارجنٹ رائٹ نے اسے بڑے دوستانہ انداز میں روک لیا تھا۔ صبح تک اس کی کلیئرنس کی رپورٹ آ گئی لیکن اسے اپارٹمنٹ میں جانے کی اجازت شام تک ملی۔ اس وقت تک پولیس نے اپارٹمنٹ کو کھول دیا تھا۔ رائٹ نے اسے جانے کی اجازت دینے سے پہلے بتایا کہ قاتل نے کسی انوکھی ساخت کے آلے کی مدد سے ڈیزی کا منہ غیر معمولی حد تک کھول کر اس کے سر کے اندر سے سب نکال لیا تھا اور اس کی موت کی وجہ بھی یہی تھی۔

نوواک نے رائٹ فوبس کو اس گڈے پٹ کے بارے میں بتایا تھا لیکن اس نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ اس کے خیال میں یہ کسی جنونی قاتل کا کام تھا۔ قاتل نے کسی ترکیب سے ڈیزی سے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھلوا لیا تھا۔ اس نے ڈیزی کو بے دردی سے قتل کر دیا اور ابھی پولیس کو ایسی مزید وارداتوں کے لیے تیار رہنا تھا۔ نوواک کو رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ ڈیزی کی موت میں اس گڈے پٹ کا کوئی نہ کوئی کردار ضرور ہے۔ اس نے واپس آ کر اپارٹمنٹ میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلے گڈے پٹ کو تلاش کیا۔ وہ اسے سیڑھی کے نیچے پڑا ہوا مل گیا تھا۔ اس نے اس کا پوری طرح معائنہ کیا لیکن اسے اس پر ایسا کوئی نشان یا ٹیگ نہیں ملا جس سے کچھ پتا چل پاتا۔ پھر اسے تابوت کا خیال آیا۔ وہ لاؤنج میں آیا۔ تابوت اسی طرح کھلا پڑا تھا۔ اس نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا لیکن اس پر بھی کوئی نشان نہیں تھا۔ تابوت کے اندر سر رکھنے والے تکیے کے ساتھ سرخ رنگ کا مخمل کور تھا۔ یہ تابوت کے دونوں طرف چڑھا ہوا تھا۔ اس میں بھی کوئی ٹیگ نہیں تھا۔ پھر اسے خیال آیا تو اس نے نیچے والا مخمل پھاڑا۔ اسے اندر کچھ لکھا نظر آیا۔ اس نے زور لگا کر سارا ہی مخمل پھاڑ دیا۔ اندر تابوت کے رگزین پر پرنٹ تھا۔

''آر کی ہوور لیکان تھیٹرز!''

اس نے تابوت ایک طرف پھینک دیا۔ اس کے چند منٹ بعد وہ اپنی کار میں نورفوک کی طرف جا رہا تھا۔ نوواک کا تعلق لیکان خاندان سے تھا۔ اس کا پردادا روس سے نقل مکانی کر کے امریکا میں آ کر بس گیا تھا۔ وہ فن کار تھا۔ وہ روس کی انقلابی حکومت کا شدید مخالف تھا اسی وجہ سے اسے روس سے فرار ہونا پڑا۔ سینٹ پیٹرز برگ کا سب سے بڑا تھیٹر

محروم

کیا آپ کو علم ہے کہ دنیا میں حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ سے زیادہ خوش گوار ازدواجی زندگی کسی دوسرے جوڑے نے آج تک نہیں گزاری، وجہ صرف یہ ہے کہ دونوں ہی ساس سے محروم تھے۔

لیکان خاندان کی ملکیت تھا۔ لیکان زارِ روس کے وفادار تھے اور اسی وجہ سے انقلابی حکومت نے ان کے ساتھ بے رحمانہ سلوک کیا تھا۔ اکثر تو مارے گئے تھے اور بچ جانے والوں کو سائبیریا کے کیمپوں میں بھیج دیا گیا تھا۔ چند ایک اپنی جان بچا کر فرار ہونے میں کامیاب ہوئے تھے۔ ان میں ایک کارل لیکان بھی تھا۔ وہ امریکا آتے ہوئے بے شمار دولت بھی ساتھ لایا تھا۔ اس سے اس نے نورفوک میں بہت بڑی زمین خرید کر اس پر اپنا محل نما مکان اور تھیٹر بنایا تھا۔ اس نے یہ تھیٹر بہت بڑے پیمانے پر اور مکمل سہولیات کے ساتھ بنایا تھا۔ اس میں اس دور کے لحاظ سے ہر چیز اور ساؤنڈ سسٹم بھی تھا۔

نوواک کا باپ تعلیم حاصل کرنے کے بعد نیویارک میں آباد ہو گیا۔ اس کا اس ویرانے میں دل نہیں لگتا تھا۔ وہاں اب زیادہ لوگ نہیں تھے۔ کارل لیکان کے صرف دو بیٹے تھے۔ ان میں سے صرف ایک بیٹے کے ہاں اولاد ہوئی تھی۔ اس کے بھی بس دو بیٹے ہی تھے۔ البتہ ان دو بیٹوں کے ہاں کئی اولادیں ہوئیں۔ ان میں ولیم ابھی زندہ تھا۔ وہ نوواک کے باپ کا بھائی تھا۔ اس کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا مگر بدقسمتی سے ولیم کا بیٹا اس وقت کہیں غائب ہو گیا جب وہ صرف سات برس کا تھا۔ البتہ اس کی بیٹیاں موجود تھیں اور ان میں سے ایک ڈیزی اس کی بیوی تھی۔ اس کی دوسری بیٹی ایک سفارت کار سے شادی کر کے گزشتہ پانچ سال سے ملک سے باہر تھی۔ شیری، ڈیزی سے دو سال بڑی تھی۔

نوواک اپنے باپ اولیف لیکان کا ایک ہی بیٹا تھا۔ اولیف ولیم سے چھوٹا تھا۔ لیکان خاندان میں جاگیر کا وارث بڑا بیٹا ہوتا ہے، اس لیے اولیف نیویارک آ کر بس گیا۔ اس کا جاگیر پر بہت جانا ہوتا تھا۔ دو سال پہلے وہ کینسر کے موذی مرض کا شکار ہو گیا تھا۔ نوواک جاگیر پر کم ہی جاتا تھا۔ ولیم سے آخری بار وہ پانچ سال پہلے ملا تھا۔ اس وقت وہ ٹھیک ٹھاک تھا اور اس نے ایک نوجوان خاتون سے شادی کی تھی جو عمر میں اس سے بائیس برس چھوٹی تھی۔ اس لیے جب ولیم کو فالج ہوا تو نوواک کو خیال آیا کہ وہ انکل ولیم کو چھوڑ جائے

www.pkdigest.com

گی مگر کلارا اس کو چھوڑ کر نہیں گئی۔ نوواک کے خیال میں یہ کلارا کی اچھائی تھی۔ لیکن ڈیزی اپنی سوتیلی ماں سے شدید نفرت کرتی تھی اور اس کا ذکر کرنا بھی گوارا نہیں کرتی تھی۔ اس کی وجہ سے وہ کئی سال سے اپنے باپ سے نہیں ملی تھی۔

اس نے راستے میں رک کر ایک جگہ سے لیکان ہاؤس کال کی۔ اس نے اپنے رشتے کے دادا بورس لیکان سے بات کی تھی۔ بورس، نوواک کے دادا کا بھائی تھا اور ستتر برس کی عمر میں بھی پوری طرح چاق و چوبند تھا۔ وہ لیکان ہاؤس میں اپنے حصے میں رہتا تھا۔ ولیم جو جاگیر کا موجودہ مالک تھا، وہ لیکان ہاؤس کی دوسری منزل پر رہتا تھا اور وہاں کسی کا بھی بنا اجازت داخلہ منع تھا۔ یہ پابندی خود ولیم نے لگائی تھی۔ ڈیزی کا خیال تھا کہ اس پابندی کے پس پشت کلارا کا ہاتھ ہے لیکن نوواک کا خیال تھا کہ انکل ولیم خود تنہائی پسند ہو گئے تھے۔ کبھی بھی فون پر بات ہوتی تو وہ بہت نپی تلی بات کرتے تھے۔ اطلاع دینے کا مقصد یہی تھا کہ جب وہ لیکان ہاؤس پہنچے تو انکل ولیم ذہنی طور پر تیار رہیں۔

نورفوک کے پاس پہنچ کر اس نے سب سے پہلے ایک اچھے موٹیل میں کمرا لیا۔ وہ تابوت اور پیٹ ساتھ لایا تھا۔ پیٹ اس نے وہیں چھوڑا اور پھر لیکان ہاؤس روانہ ہو گیا۔ اسے دیکھ کر دربان نے دروازہ کھول دیا۔ اندر سے کئی ایکڑ پر پھیلا لیکان ہاؤس ویسا ہی تھا اور اس کی عمارت اب بھی شان دار تھی۔ وہ کار سے اتر کر مرکزی دروازے تک آیا۔ اسے معلوم تھا کہ انکل ولیم نے تمام مستقل ملازمین کو نکال دیا تھا اور اب اوپری منزل میں صرف کلارا کے ساتھ رہتا تھا۔ صفائی اور دوسرے کاموں کے لیے عارضی ملازمین آتے تھے۔ اس نے دروازے کا کنڈا بجایا تو جواب میں کلارا خود آئی..... اسے دیکھتے ہی وہ آنکھوں میں آنسو لیے اس کے گلے سے لگ گئی۔ وہ تقریباً چالیس برس کی جوان لمبی، دبلی اور کسی قدر دلکش نظر آنے والی عورت تھی۔ وہ الگ ہو کر بھرائی آواز میں بولی۔ ”مجھے بہت افسوس ہے لیکن مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔“

”یہ حقیقت ہے۔“ نوواک نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ عجیب بات تھی کہ اس لمحے اسے تعزیت کرتی کلارا بالکل اچھی نہیں لگی تھی۔ ”کیا انکل ولیم کو اطلاع کر دی گئی ہے؟“

کلارا نے اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔ ”ہاں لیکن شاید وہ ابھی تم سے نہ مل سکیں۔“

”کیوں؟“ نوواک کا لہجہ جارحانہ ہو گیا۔ وہ تیزی سے اوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ کلارا اسے آواز دیتی اس کے پیچھے آئی لیکن نوواک رکا نہیں۔ جب سے اس نے پیٹ کے تابوت میں لیکان تھیٹر کا مخصوص نشان دیکھا تھا، وہ کچھ بے قابو سا ہو رہا تھا۔ وہ اوپری منزل پر پہنچا۔ کلارا اس کے پیچھے پیچھے تھی۔

”نوواک! میری بات تو سنو... ولیم ابھی...“

مگر نوواک اس کی بات سنے بغیر کمرے میں داخل ہو گیا۔ یہ لاؤنج تھا اور ولیم یہاں نہیں تھا۔ وہ مختلف کمروں سے گزرتا ہوا ایک کمرے میں آیا تو ولیم اسے میز کے ساتھ ایک کتاب پر جھکا نظر آیا۔ اس کے منہ پر آکسیجن ماسک لگا ہوا تھا۔ سردیوں میں عام طور سے اسے سانس کی تکلیف ہو جاتی تھی اس لیے ڈاکٹر نے اسے آکسیجن لگانے کو کہا ہوا تھا۔ جب اسے تکلیف ہوتی تو اس کی وہیل چیئر کے ساتھ لگا آکسیجن ماسک اسے لگا دیا جاتا۔ آکسیجن سلنڈر پیچھے تھا۔ ویسے وہ ٹھیک تھا اور مکمل طور پر سوٹ بوٹ میں تھا۔ نوواک ایک جھٹکے سے رک گیا۔ اس کے عقب میں آتی کلارا نے تیز لہجے میں کہا۔

”میں اس وجہ سے کہہ رہی تھی۔“ وہ اس کے پاس سے گزر کر ولیم کے پاس گئی اور اس کا آکسیجن ماسک اتارتے ہوئے وہیل چیئر کا رخ نوواک کی طرف کر دیا۔ فالج سے ولیم کا جسم مکمل طور پر مفلوج ہو گیا تھا۔ چہرے کے پٹھوں پر بھی اس کا اثر ہوا تھا۔ وہ بڑی مشکل اور آہستہ سے بات کرتا تھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ حالانکہ کچھ دیر پہلے اس نے اپنی بیٹی کی موت کی خبر سنی تھی۔ یہ بھی شاید فالج کی وجہ سے تھا۔ کلارا اس کو سہارا دیے کھڑی تھی۔ اس نے آہستہ سے سر اٹھایا اور بیٹھی ہوئی مدھم آواز میں بولا۔

”مجھے پتا چل گیا تھا۔ پھر مجھے سانس لینے میں مشکل ہونے لگی اس لیے کلارا نے آکسیجن لگا دی۔“

نوواک کا غصہ ختم ہو گیا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”انکل ولیم! مجھے افسوس ہے۔“

”اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟“ ولیم بڑی مشکل سے بات کر رہا تھا اور اس کی سانس میں سیٹی سی بج رہی تھی۔

نوواک نے مناسب الفاظ میں اس کو بتایا کہ ڈیزی کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ انکل ولیم کے صدمے میں اضافہ ہو۔ ”پولیس قاتل کو تلاش کر رہی ہے۔“

”مجھے امید نہیں ہے کہ پولیس قاتل کو تلاش کر سکے گی۔“ ولیم آہستہ سے بولا۔ الفاظ سے زیادہ اس کے لہجے میں سیٹی نمایاں ہو رہی تھی۔ کلارا نے معذرت خواہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔

”اب اسے آکسیجن لگانا ضروری ہو گئی ہے۔ مجھے امید

ہے تم مائنڈ نہیں کرو گے۔“

کلارا نے اس کو چہرے پر ماسک لگایا اور وہ سر پیچھے کر کے آرام کرنے لگا۔ کلارا نوواک کے ساتھ ہی باہر آ گئی۔ نوواک نے اس کی طرف دیکھا۔ ”مجھے ڈیزی نے بتایا تھا کہ تم تربیت یافتہ نرس ہو؟“

کلارا نے سر ہلایا۔ ”اسی وجہ سے میں اکیلے ہی ولیم کی بہترین دیکھ بھال کر لیتی ہوں۔“

”انکل ولیم کچھ زیادہ ہی تنہائی پسند نہیں ہو گئے ہیں؟“ اس نے سرسری سے انداز میں پوچھا۔

”ہاں، وہ بہت تنہائی پسند ہو گیا ہے۔ بڑی مشکل سے کسی سے ملنے پر آمادہ ہوتا ہے۔ ایک بار تو وکیل سے ملنے سے بھی انکار کر دیا تھا۔“

”گرینڈ پا کہاں ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”وہ حسب معمول اپنے حصے میں ہیں۔“ کلارا بولی۔ وہ اسے سیڑھیوں تک چھوڑنے آئی تھی۔

”میں نے سنا ہے کہ گرینڈ پا کئی سال سے یہ سیڑھیاں نہیں چڑھے ہیں۔“ نوواک نے کہا اور کلارا کا ردعمل دیکھے بغیر نیچے اتر گیا۔

بورس لیکان اپنے حصے میں تھا۔ وہ لیکان ہاؤس کے عقبی حصے میں رہتا تھا۔ اس کی بیوی ایما ذہنی طور پر معذور تھی اور اس کی سمجھ بوجھ کسی پانچ چھ سال کے بچے سے زیادہ نہیں تھی۔ جوانی میں اسے کوئی ایسا ذہنی صدمہ ہوا تھا کہ اس کے بعد وہ فاتر العقل ہو گئی تھی۔ وہ ہر وقت ایک مصنوعی بلی لیے پھرتی تھی۔ اس وقت بھی وہ عقبی لان میں میز پر بیٹھی ہوئی تھی اور اپنی بلی کو کچھ کھلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ نوواک اس کے پاس جا بیٹھا۔

”ہیلو گرینی۔“

”ہیلو۔“ وہ اس کی طرف دیکھ کر بچوں کے سے انداز میں مسکرائی۔

”آپ کیسی ہیں؟“

”میں ٹھیک ہوں لیکن تم کون ہو؟“

”میں نوواک ہوں۔ گرینڈ پا بورس کے بھائی کا پوتا۔“

”بے کار ہے۔“ عقب سے بورس نے کہا۔ ”یہ ان باتوں کو سمجھنے کے قابل نہیں ہے۔“

”آپ کیسے ہیں؟“ نوواک نے اس سے ہاتھ ملایا۔

”بہتر ہوں۔“ بورس اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ ”ڈیزی کا سن کر مجھے افسوس ہوا۔ بہت پیاری بچی تھی۔“

نوواک کو لگا اس کے گلے میں کچھ پھنس رہا ہے۔ ”وہ اکیلی نہیں تھی، ہم ماں باپ بننے والے تھے۔“

”اوہ...“ بورس کے لہجے میں افسوس بڑھ گیا۔ ”یہ تو بہت ہی برا ہوا۔ ویسے بھی ہمارا خاندان سکڑتا جا رہا ہے۔ تمہیں شیزی کے بارے میں پتا چل گیا ہو گا؟“

نوواک چونکا۔ ”نہیں، اسے کیا ہوا؟“

”اس نے اپنے شوہر سے طلاق لے لی ہے۔ اصل میں وہ بچے پیدا کرنے کے قابل نہیں تھا لیکن یہ بات شیزی کو بہت دیر سے پتا چلی۔“

”شادی کے چار سال بعد؟“

”ہاں، اصل میں مسئلہ اسپرم کا تھا۔ اس کا ٹیسٹ ہوا تو پتا چلا۔ شیزی نے اس سے طلاق لے لی۔“ بورس لیکان نے کہا۔ ”وہ شاید کل آ جائے گی۔“

”میرا خیال ہے پھر اسے خبر کرنا بے کار ہے۔“

”نہیں، میں نے یہ سوچ کر بتا دیا تھا کہ اس کا کوئی اور پروگرام نہ ہو اس لیے اب وہ سیدھی یہاں آئے گی۔“

نوواک سوچ رہا تھا پھر اس نے ٹٹولتے ہوئے کہا۔ ”میرے اس طرح آنے کی ایک وجہ اور بھی ہے۔ ڈیزی کے قتل سے کچھ دیر پہلے ہمیں ایک پارسل ملا جو کوئی اپارٹمنٹ کے دروازے پر رکھ گیا تھا۔ اس میں سے ایک تابوت نکلا اور تابوت میں ایک پیٹ گڈا تھا۔ تابوت پر بھی کوئی نشان نہیں تھا لیکن اس کے اندر کا مکمل پھاڑنے پر آکسی ہوور لیکان تھیٹر کے الفاظ نظر آئے تھے۔“

بورس دہل گیا۔ کم سے کم اس کے تاثرات سے یہی لگ رہا تھا۔ اس نے جلدی سے پوچھا۔ ”کیا تم نے یہی الفاظ دیکھے تھے؟“

”بالکل... میں تابوت اور پیٹ ساتھ لایا ہوں۔“

بورس پریشان نظر آنے لگا۔ وہ کچھ دیر سوچ میں گم رہا پھر اس نے کہا۔ ”تم آکسی ہوور کے بارے میں کیا جانتے ہو؟“

”یہی کہ وہ گرینڈ پا پلیزر کی دوسری بیوی تھی اور اس نے تھیٹر میں پیٹ شو کیے تھے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ تم اس کے بارے میں بہت کم جانتے ہو۔ وہ صرف پیٹ شو ہی نہیں کرتی تھی بلکہ وہ خود پیٹ تیار کرنے کی ماہر بھی تھی۔ مجھے نہیں معلوم بلی نے اسے کیوں پسند کیا تھا لیکن یہ حقیقت ہے کہ اسے یہاں کوئی پسند نہیں کرتا تھا۔ اسے بھی کسی سے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ بس اپنے کام سے دلچسپی رکھتی تھی۔ اس کے مرنے کے بعد تھیٹر تباہ ہو گیا۔ بلی کے بعد کسی کو اس میں دلچسپی بھی نہیں رہی تھی اس لیے وہاں آنا جانا بند کر دیا تھا۔“

www.pkdigest.com

"کیا تھیٹر اب بھی ہے؟"

"عمارت کی حد تک ہے لیکن سب تباہ ہو گیا ہے۔ میں آخری بار کوئی پندرہ سال پہلے گیا تھا۔ اس کے بعد شاید کوئی بھی وہاں نہیں گیا۔"

"آئزی ہوور کیسی عورت تھی؟"

"بہت خوف ناک... لمبی اور دبلی سی... اس کی صورت جادوگرنیوں جیسی تھی۔ وہ عمر میں بھی بلی سے خاصی بڑی تھی۔ میں نے تو سنا ہے کہ اس کی ایک بیٹی بھی تھی لیکن بلی خاندان والوں کے ڈر سے اسے یہاں نہیں لایا تھا۔ اس کی کہیں اور پرورش ہوتی رہی۔"

"بعد میں اس کا کچھ پتا چلا؟"

بورس نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں اور نہ ہی کسی نے کوشش کی۔ اصل میں کسی کو اس سے دلچسپی نہیں تھی۔"

"یعنی کسی کو نہیں معلوم کہ آئزی کی بیٹی کہاں گئی؟"

"ممکن ہے، وہ اب تک مر چکی ہو۔ اس کی عمر مجھ سے زیادہ تھی۔" بورس نے بتایا۔

"گرینڈ پا! سوال یہ ہے کہ مجھے آئزی ہوور کے نشان والا تابوت کس نے اور کیوں بھیجا؟"

"میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں؟" بورس نے سوچتے ہوئے کہا۔ "لیکن مجھے یہ پتا ہے کہ آئزی ہوور اپنے پوسٹ تابوت نما بکس میں رکھتی تھی۔"

"یہاں محل میں آئزی کا سامان موجود ہے؟"

اس سوال پر بورس نے اسے غور سے دیکھا۔ "تمہارا خیال ہے کہ وہ تابوت یہاں سے بھیجا گیا ہے؟"

"تب آپ بتائیں اور کون اس قسم کی حرکت کر سکتا ہے؟" نوواک نے پوچھا۔ "کسی کو نہ تو اس کے بارے میں معلوم ہوگا اور نہ ہی کسی کو یہ کام کرنے سے کوئی دلچسپی ہو سکتی ہے۔"

بورس نے نوواک کے لیے چائے نکالی۔ "ولیم کیسا ہے؟ میں نے اسے کئی سال سے نہیں دیکھا۔"

"کیا وہ باہر نہیں آتے؟" نوواک کو تعجب ہوا۔

"ہاں، جب سے اس نے دوسروں کو اوپر آنے سے منع کیا ہے، وہ خود بھی نیچے نہیں آتا۔"

"شاید ان کے ساتھ کوئی مسئلہ ہو۔ ویسے ان کی صحت ٹھیک تھی اور سوائے سانس کے مرض کے انہیں کوئی خاص تکلیف نہیں ہے۔" نوواک نے بتایا۔ پھر اس نے تجسس سے پوچھا۔ "کیا شیزی یہیں ٹھہرے گی؟"

"ممکن ہے... ابھی وہ آئے گی تو پتا چلے گا۔" بورس نے جواب دیا۔

نوواک نے ایبا کی طرف دیکھا۔ "گرینی! آپ کی بلی بہت اچھی ہے۔"

"ہے نا۔" وہ خوش ہو گئی۔ "لیکن آج کل یہ کچھ کھا نہیں رہی ہے۔ میں اسے کھلانے کی کوشش میں تھک جاتی ہوں۔" اس نے شکایت کی۔

"کوئی بات نہیں، ممکن ہے اس کا پیٹ خراب ہو۔" نوواک نے اسے تسلی دی اور کھڑا ہو گیا۔ "گرینڈ پا! میں پولیس سے معلوم کر کے آپ کو اطلاع کروں گا کہ ڈیزی کی لاش... کب آئے گی؟"

"میں انتظار کروں گا۔" بورس نے کہا۔ "میری طرف سے ایک بار پھر تعزیت..."

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" نوواک بولا۔ "آپ سے مل کر میرا دکھ ہلکا ہوا ہے۔"

"تم کہاں رکے ہو؟"

نوواک نے اسے اپنے موٹیل کے بارے میں بتایا۔ وہ واپس آیا تو رات ہو چکی تھی۔ اس نے گڈے پیٹ کو کرسی پر بٹھایا تھا اور وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ نوواک کو بھوک نہیں تھی اس لیے اس نے کھانے کا خیال دل سے نکال دیا۔ سونے سے پہلے اس نے فیصلہ کیا کہ کل وہ جا کر تھیٹر کا معائنہ کرے گا۔ وہ سونے کے لیے لیٹا تو کھڑکی سے آتے موٹیل کے سائن بورڈ کی روشنی بار بار جل بجھ کر کمرے کو ایک لمحے کو روشن کر دیتی تھی۔ اس روشنی سے بچنے کے لیے وہ کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد اسے نیند آ گئی۔ سوتے ہوئے اچانک اسے محسوس ہوا جیسے کمرے میں کوئی اور بھی ہے۔ وہ کچھ دیر کسمساتا رہا پھر اچانک اس کی آنکھ کھلی تو اس نے پیٹ گڈے کو بالکل اپنے سامنے پایا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا لیکن اب وہاں پیٹ نہیں تھا۔ اس نے ٹھہر کر لائٹ آن کی تو اسے سامنے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں گڈا نظر آیا۔ اس نے سکون کا سانس لیا۔ وہ لیٹا ہوا تھا اس لیے اسے لگا جیسے گڈا بالکل اس کے سامنے ہو۔

صبح وہ ناشتا کر کے موٹیل سے روانہ ہوا... اس کا رخ لیکان جاگیر کے اس حصے کی طرف تھا جہاں ایک زمانے میں لیکان تھیٹر تھا۔ اس کے ساتھ ہی لیکان خاندان کے لیے مخصوص چھوٹا سا قبرستان تھا۔ یہ جگہ اصل میں ایک جھیل کے وسط میں جزیرے پر تھی۔ جزیرے تک جانے کے لیے لیکان ہاؤس سے کشتی استعمال کی جاتی تھی جبکہ اس جگہ سے پل تھا۔ نوواک نے یہ سارا علاقہ دیکھا ہوا تھا۔ اس نے تھیٹر کی عمارت بھی کئی بار باہر سے دیکھی تھی لیکن اس کے اندر

جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔

لکڑی کے پل سے گزر کر وہ جزیرے میں تھیٹر کی عمارت کے سامنے آیا۔ کسی زمانے میں جس جگہ پارکنگ ہوتی تھی، اب وہاں جنگلی گھاس اگ آیا تھا اور زمین پر سالوں سے جمع شدہ پتوں کا ڈھیر تھا۔ یہ جگہ بہت زیادہ ویران اور وحشت ناک لگ رہی تھی۔ سردی کی وجہ سے جھیل کی جانب سے بخارات اٹھ رہے تھے جو ماحول کو دھندلا رہے تھے۔ اس روز بھی سورج غائب تھا اور بارش کے آثار لگ رہے تھے۔ وہ تھیٹر کی عمارت کے پاس سے ہوتا ہوا اس کے عقب میں واقع قبرستان تک آیا۔ وہاں بہت کم قبریں تھیں۔ ان کی تعداد ایک درجن بھی نہیں تھی۔ اس نے گہری سانس لی۔ بورس ٹھیک کہہ رہا تھا۔ لیکان خاندان سکڑتا جا رہا تھا اور اب وہ اور شیزی بچے تھے جو اس نسل کو آگے چلا سکتے تھے۔ اسے ڈیزی کا خیال آیا تو اس کے دل میں ہوک سی اٹھی۔ اپنے بچے کے لیے وہ کتنی پُرجوش تھی اور اب اسے اس بچے سمیت یہاں اس قبرستان میں آنا تھا۔

اس نے آنسو صاف کیے اور واپس جانے کے لیے مڑا تھا کہ اسے جنگل میں کسی کی جھلک دکھائی دی۔ اسے تعجب ہوا کہ یہاں کون ہے؟ وہ تیزی سے اس طرف بڑھا اور پھر ایبا کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ بوڑھی عورت یہاں تک کیسے آئی تھی؟ لیکان ہاؤس سے یہاں آنے والا راستہ کم سے کم دو میل کا تھا اور کشتی میں آنا بھی اس کے لیے مشکل تھا۔ اس نے جا کر ایبا کا بازو پکڑا۔ "گرینی! آپ یہاں کیسے آئیں؟"

"میں اپنی بلی کو سیر کرانے آئی تھی۔" اس نے معصومانہ انداز میں کہا۔ "یہ بے چاری ایک جگہ رہ کر بور ہو جاتی ہے۔"

"گرینی؟ آپ محل سے یہاں کیسے آئیں؟" نوواک نے سوال کیا۔

ایبا سوچ میں پڑ گئی۔ غالباً اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سوال کا کیا جواب دے۔ اس نے بے بسی سے نوواک کی طرف دیکھا اور بولی۔ "بس آ گئی۔"

نوواک سمجھ گیا کہ وہ اسے نہیں بتا سکے گی کہ یہاں کیسے آئی۔ "آیئے، میں آپ کو گھر چھوڑ دوں۔" وہ ایبا کو کار تک لایا اور اسے ساتھ لے کر محل پہنچا۔ اتفاق سے بورس اسے سامنے ہی مل گیا۔ اس نے ایبا کو دیکھ کر سکون کا سانس لیا۔

"شکر ہے یہ تمہارے ساتھ ہے۔ میں تو پریشان ہو گیا تھا۔" اس نے کہا۔ "یہ تمہیں کہاں سے ملی؟"

"تھیٹر والے جزیرے سے۔" نوواک نے بتایا۔

"تھیٹر والے جزیرے سے؟" بورس حیران ہوا۔ "یہ وہاں تک کیسے گئی؟"

"یہ تو میں بھی نہیں سمجھ سکا اور گرینی بتاتی بھی نہیں ہے۔"

"اس کی خود سمجھ میں نہیں آیا ہوگا۔" بورس نے سر ہلایا۔ "تمہارے لیے ایک اطلاع ہے۔ شیزی آ گئی ہے۔"

"اچھا، کہاں ہے؟"

"اپنے باپ کے پاس گئی ہے۔ اور تم نے ڈیزی کی ڈیڈ باڈی کے لیے پوچھا؟"

"آپ نے یہ اچھا کیا کہ مجھے یاد دلا دیا۔" نوواک نے کہا اور اپنا سیل فون نکال کر سارجنٹ رائٹ فوبس سے رابطہ کیا۔ "میں نوواک لیکان بات کر رہا ہوں۔ مجھے میری بیوی کی لاش کب تک ملے گی؟"

"آج شام تک۔" رائٹ نے بتایا۔ "میں خود لے کر آ رہا ہوں۔ مجھے پتا بتاؤ؟"

نوواک نے اسے پتا سمجھایا اور فون بند کر کے بورس کی طرف دیکھا۔ "آج شام تک لاش آ جائے گی۔"

"میں اسے تیار کروں گا۔" بورس بولا۔

بورس ایک زمانے میں میڈیکل انگیزامنر تھا اور اپنی ملازمت کی مدت پوری کر کے ریٹائر ہوا تھا۔ نوواک نے اس کی پیش کش قبول کر لی۔ "میں شکر گزار رہوں گا۔"

وہاں ایک سیاہ کار کھڑی تھی۔ یہ یقیناً شیزی کی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ اندر سے نمودار ہوئی تو نوواک ایک لمحے کو چونک گیا۔ اسے لگا جیسے ڈیزی زندہ ہو کر آ گئی ہو۔ شیزی حیرت انگیز طور پر اپنی بہن سے مشابہ تھی۔ وہ سیڑھیاں اتر کر ان کے پاس آئی اور نوواک سے ہاتھ ملایا۔ "کیسے ہو تم؟" اس کا لہجہ تھرایا ہوا تھا۔ وہ رو کر آ رہی تھی۔ نوواک نے محسوس کیا کہ وہ غصے میں بھی ہے۔

"میں ٹھیک ہوں۔" نوواک مرجھائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"ڈیزی کے قاتل کا کچھ پتا چلا؟"

"نہیں، میری ابھی تفتیشی افسر سے بات ہوئی ہے۔ اس نے مجھے ایسا کچھ نہیں بتایا۔"

بورس، ایبا کو وہاں سے لے گیا تھا۔ شیزی اور نوواک بات کرتے ہوئے لان میں رکھی کرسیوں تک آئے۔ شیزی اسے اپنے بارے میں بتا رہی تھی۔ "مجھے اولاد کی شدید خواہش تھی اور اسپیورٹ مجھے بے وقوف بناتا رہا۔ اسے اپنے نقص کا علم تھا لیکن اس نے مجھ سے چھپائے رکھا۔"

"اس لیے تم نے اس سے طلاق لے لی؟"

www.pkdigest.com

"ہاں، میں کسی دھوکے باز کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔"
نوواک اسے ڈیزی اور اپنے بارے میں بتانے لگا۔ جب اس نے یہ بتایا کہ ڈیزی امید سے تھی تو شیزی ایک بار پھر رو دی۔ اسے اپنی بہن سے بہت محبت تھی۔ کچھ دیر بعد وہ آنسو صاف کرنے لگی۔
"تم انکل ولیم سے ملیں؟"
"ہاں، ان کے ساتھ وہ چڑیل ہر وقت چپکی رہتی ہے۔ ابھی بھی میں نے ان سے اکیلے میں بات کرنے کی خواہش ظاہر کی تو انہوں نے انکار کر دیا۔"
"انکل ولیم کلارا سے بہت اچھے ہو گئے ہیں۔" نوواک نے محتاط انداز میں کہا۔
"اس عورت نے میرے باپ پر قبضہ کر لیا ہے۔" شیزی کے لہجے میں نفرت تھی۔
نوواک نے موضوع بدل دینا مناسب سمجھا۔ "تم کہاں رکی ہو؟"
"ابھی تو میں سیدھی یہاں آئی ہوں۔ پھر کسی ہوٹل کا رخ کروں گی۔"
"میرے خیال میں تمہیں یہیں رکنا چاہیے۔ یہ تمہارے باپ کا گھر ہے۔"
"تم یہاں کیوں نہیں رکے جبکہ تم بھی اس جاگیر کے وارث ہو؟" شیزی نے الٹا اس سے سوال کیا۔
نوواک کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ اسے اس جاگیر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ شہر میں ڈیزی کے ساتھ خوش تھا۔ اس نے شیزی سے پوچھا۔ "تم میرے ساتھ میرے موٹیل چلو، وہاں اچھے کمرے ہیں۔"
شیزی راضی ہو گئی۔ وہ وہاں سے روانہ ہوئے۔ موٹیل محل سے چند میل دور تھا۔ وہاں شیزی کو جگہ مل گئی۔ پھر نوواک نے اسے ساتھ لنچ کرنے کی دعوت دی جو شیزی نے قبول کر لی۔ لنچ کے بعد وہ واپس آئے تو اسے سارجنٹ رائٹ کا فون موصول ہوا۔ "میں ایمبولینس کے ساتھ نکل رہا ہوں۔"
"تم مطلوبہ پتے پر پہنچ جاؤ... وہاں لاش بورس لیکان کے سپرد کر دینا۔"
"مجھے چند گھنٹے لگیں گے۔ مجھے سب لوگوں سے پوچھ گچھ بھی کرنی ہے۔"
"یہ تمہارا اپنا مسئلہ ہے۔" نوواک نے کہہ کر فون بند کر دیا۔
"ڈیزی کے ساتھ کیا ہوا تھا؟" شیزی نے پہلی بار اس سے پوچھا۔
نوواک نے گہری سانس لی۔ اسے وہ سب دہراتے ہوئے افسوس ہو رہا تھا لیکن اسے بتانا تو تھا۔ شیزی پھر سے دکھ کے حصار میں آ گئی۔
"اتنی درندگی!" اس نے لرز کر کہا۔
"میں اب تک نہیں سمجھ پایا کہ کسی کو ڈیزی کو قتل کرنے کی کیا ضرورت تھی اور وہ بھی اس طرح...!"
"تمہارا کیا خیال ہے... قاتل کا کوئی مقصد نہیں تھا؟"
"میرا خیال ہے کہ یہ قتل کسی سبب سے ہے لیکن میں اور پولیس ابھی اس سبب کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔" نوواک نے کہا اور پھر کسی قدر ہچکچاتے ہوئے شیزی کو پٹ اور تابوت کے بارے میں بتا دیا۔
"تابوت اور گڑیا نما پٹ؟" وہ حیرت سے بولی۔
"مجھے شبہ ہے کہ ڈیزی کے قتل میں ان چیزوں کا بھی کوئی نہ کوئی کردار ہے۔"
"کیا تمہیں یہ بات عجیب نہیں لگی کہ پٹ اور تابوت آزری ہوور کا ہے جو آج سے چالیس برس پہلے گزر چکی ہے؟"
"عجیب تو لگا ہے لیکن ممکن ہے قاتل اس طرح سے ہمیں الجھانا چاہتا ہو۔"
"یہ بھی ممکن ہے کہ ڈیزی کا قتل اس لیے ہوا ہو کہ جاگیر کا ایک وارث ختم کر دیا جائے۔"
نوواک نے چونک کر اسے دیکھا۔ "یہ خیال تمہارے ذہن میں کیوں آیا؟"
"پتا نہیں لیکن مجھے ابھی ابھی خیال آیا ہے۔" وہ بولی۔
نوواک سوچ میں پڑ گیا۔ اس کی طرح ڈیزی کو بھی اس جاگیر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ نہ ہی انہوں نے کبھی اس بارے میں سوچا یا آپس میں تبادلۂ خیال کیا تھا۔ وہ اپنے تین کمروں کے اپارٹمنٹ میں بہت خوش تھے اس لیے جب شیزی نے اس سے یہ کہا تو اس کا چونک جانا لازمی تھا۔
☆☆☆
بورس نے ڈیزی کی لاش وصول کی۔ وہ ایک پلاسٹک بیگ میں پیک تھی۔ لاش کے ساتھ سارجنٹ رائٹ بھی آیا تھا۔ اس نے باضابطہ طور پر لاش بورس کے حوالے کی۔ "ڈاکٹرز نے اگرچہ ممکنہ حد تک سرجری کر دی ہے مگر بہتر یہی ہے کہ لاش کسی کو نہ دکھائی جائے۔"
بورس نے لاش وصول کی اور اسے اپنے ایک خاص کمرے میں لے آیا جو ایک طرح سے لیبارٹری بھی تھی۔ وہاں لاش کے کفن دفن کے لیے تمام انتظامات تھے۔ اس نے رائٹ کو نوواک کا پتا بتایا۔ اس نے بورس سے کہا کہ وہ

لاش کی تدفین کے بعد ان لوگوں سے پوچھ گچھ کرنے آئے گا۔
بورس نے اس کے جانے کے بعد لاش کا معائنہ کرنے کے لیے اسے کھولا اور جب اس نے ڈیزی کا چہرہ دیکھا تو ایک لمحے کو لرز گیا۔
"میرے خدا! پھر وہی...!" اس نے خود سے کہا۔ پھر سنبھل کر اس نے نوواک کو کال کی۔ "تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ ڈیزی کے ساتھ کیا ہوا ہے؟"
"آپ نے پوچھا ہی نہیں۔"
"میں تو سمجھا تھا کہ اسے کوئی عام سا زخم لگا ہے۔"
"آپ نے اسے دیکھ لیا ہے؟"
"ہاں اور میں تم سے بات کرنا چاہ رہا ہوں۔"
"تدفین کل ہو گی تو میں آ جاؤں گا۔ آج مشکل ہے۔" اس نے کہا
"ٹھیک ہے، کل ملاقات ہو گی۔"
☆☆☆
نوواک اور شیزی کا آج تھیٹر کی عمارت میں جانے کا ارادہ تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اس سارے چکر میں اس عمارت کا کوئی نہ کوئی کردار ہے۔ شیزی نے نوواک کو بتایا۔ "میں نے اپنے بچپن میں ایک بار تھیٹر کی عمارت اندر سے دیکھی تھی۔ سب کچھ تباہ ہو گیا تھا۔ کرسیاں ٹوٹ گئی تھیں اور ہر جگہ ملبا بکھرا ہوا تھا۔"
"کیا تمہیں معلوم ہے کہ پٹ کہاں رکھے جاتے تھے؟ کیونکہ کلارا اور گرینڈ پا کا کہنا ہے کہ محل میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے پٹ اور ان کے تابوت نما بکس اصل میں تھیٹر کی عمارت میں رکھے جاتے تھے۔"
"میرا بھی یہی خیال ہے۔ ان کی اصل جگہ وہیں ہے۔"
"تب ہمیں وہاں جا کر دیکھنا چاہیے۔" نوواک بولا۔
"میں آج شام کو جاؤں گا۔"
"میں بھی چلوں گی۔" شیزی بولی۔
نوواک مان گیا۔ اسی دوران میں سارجنٹ رائٹ وہاں آ گیا۔ اس نے شیزی سے بات کی اور اس کا بیان لیا۔ شیزی نے بتایا کہ اس سانحے کے وقت وہ برازیل میں تھی اور اپنے شوہر سے طلاق لینے کے بعد وہاں سے آنے کی تیاری کر رہی تھی۔ رائٹ نے سوال کیا۔
"طلاق کی وجہ؟"
"اس وجہ کا میری بہن کی موت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" شیزی نے سرد سے لہجے میں جواب دیا۔
"او کے!" رائٹ نے سر ہلایا۔ "کیا اپنی بہن کے بعد تم اس ساری جاگیر کی وارث ہو گی؟"
"میں اکیلی نہیں ہوں۔ نوواک بھی اس میں شامل ہے۔" شیزی نے جواب دیا۔
"مجھے معلوم ہے، میں صرف تمہارا پوچھ رہا ہوں۔"
"ہاں، میں بھی اس کی ایک وارث ہوں۔" شیزی نے اعتراف کیا۔
"اب میں طلاق کی وجہ جاننا چاہوں گا؟"
"میرے اپنے شوہر سے اختلافات ہو گئے تھے پھر ہمارے ہاں اولاد بھی نہیں تھی۔"
رائٹ مسکرایا۔ "اب تم نے صحیح وجہ بیان کی ہے۔ میں آنے سے پہلے لیکان خاندان کے بارے میں مکمل تحقیق کر کے آیا ہوں۔"
"تم اور کیا جان چکے ہو؟" نوواک نے اسے غور سے دیکھا۔
"تم نے ٹھیک کہا تھا۔ اس تابوت کا ڈیزی کے قتل سے کوئی نہ کوئی تعلق بنتا ہے۔ مجھے آزری ہوور کے بارے میں پتا چلا ہے کہ وہ اس قسم کے تابوت اپنے پٹ رکھنے کے لیے استعمال کرتی تھی۔ میں وہ تابوت ایک بار پھر دیکھنا پسند کروں گا۔"
نوواک نے اسے کار کی ڈکی میں رکھا تابوت نکال کر دکھایا۔ رائٹ نے اس کا معائنہ کیا اور اسے واپس کر دیا۔ "اگرچہ اس پر وہ نشان پرنٹ ہے جو میں نے اس زمانے کے اخبارات میں دیے گئے لیکان تھیٹرز کے اشتہارات میں بھی دیکھا ہے... لیکن ممکن ہے یہ بنا ہوا ہو۔"
نوواک نے سوچا کہ اسے اپنے اور شیزی کے تھیٹر کی عمارت میں جانے کے بارے میں بتا دے لیکن پھر اس نے یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔ اس نے رائٹ سے پوچھا۔ "تم نے بورس اور دوسرے لوگوں سے بیانات لیے؟"
"نہیں، یہ کام میں کل ڈیزی کی تدفین کے بعد کروں گا۔" اس نے جواب دیا۔ "یہ بتاؤ کہ یہاں کوئی کمرا خالی ہے۔"
"میرا خیال ہے، خالی ہے لیکن بہتر ہوگا کہ تم ڈیسک کلرک سے رجوع کرو۔" نوواک نے اسے مشورہ دیا اور اس کے جانے کے بعد فکرمندی سے کہا۔ "یہ یہاں رکے گا تو ہماری سرگرمیوں پر نظر رکھے گا۔"
"رکھنے دو... ہم کون سا غیر قانونی کام کر رہے ہیں۔" شیزی بولی۔
مگر نوواک فکرمند تھا کیونکہ اسے لگ رہا تھا کہ سارجنٹ رائٹ اس پر شک کر رہا ہے۔ شام کو وہ دونوں کار

www.pkdigest.com

میں تھیٹر والے جزیرے کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ راستہ محل جانے والے راستے سے ہی نکلتا تھا اور جنگل سے گزرتا ہوا جزیرے پر جا نکلتا تھا۔ جب وہ جزیرے تک پہنچے تو رات سر پر تھی اور تاریکی بہت تیزی سے چھا رہی تھی لیکن دن میں ہونے والی بارش کی وجہ سے دھند نہیں تھی۔ نوواک نے اپنی کار سے دو ٹارچیں ساتھ لیں۔ ایک اس نے شیزی کے حوالے کر دی۔

"یہ جگہ تو بالکل بدل گئی ہے۔ کسی جنگل کا حصہ لگ رہی ہے۔" شیزی نے کہا۔

"ممکن ہے آج سے تیس چالیس برس بعد یہ مکمل طور پر جنگل میں بدل جائے۔ عمارت ویسے ہی خستہ حال ہے۔" نوواک نے عمارت کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ سامنے کے بڑے داخلی دروازے کی جگہ لکڑی کے تختے لگا کر راستہ بند کر دیا گیا تھا۔ ان کو اندر جانے کے لیے ایک چھوٹے سے رخنے سے گزرنا پڑا۔ اندر تاریکی تھی۔ وہ ٹارچ کی روشنی میں راستہ دیکھ رہے تھے۔ ایک چھوٹے سے برآمدے سے گزر کر وہ تھیٹر کی مین گیلری میں داخل ہوئے۔ سامنے وسیع ہال بری طرح ٹوٹ پھوٹ اور ملبے کا ڈھیر بنا ہوا تھا۔ شاید ہی کوئی کرسی سلامت ہو۔ سامنے اسٹیج پر بھی ملبے کا ڈھیر تھا۔ کرسیوں کا سرخ مخمل پھٹ گیا تھا اور مٹی کے ڈھیر سے ہر چیز مٹیالے رنگ کی ہو چکی تھی۔

"میرے خدا! کتنی پرشکوہ جگہ تھی۔" شیزی بے ساختہ بولی۔ "میں نے اس جگہ کی تصویریں دیکھی ہیں۔"

"اب تو یہاں کچھ نہیں ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔" نوواک سیڑھیوں سے گزر کر اسٹیج کی طرف جاتے ہوئے بولا۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"اسٹیج کے عقب میں ڈریسنگ روم میں۔ اگر کوئی سراغ ہے تو وہیں ملے گا۔" نوواک اسٹیج پر چڑھ گیا۔ اس نے سہارا دے کر شیزی کو بھی اوپر چڑھایا۔ اسٹیج کا حال سب سے خراب تھا۔ اس میں جابجا دراڑیں پڑ گئی تھیں اور انہیں بہت محتاط ہو کر آگے بڑھنا پڑ رہا تھا۔ اسٹیج کے آخری حصے میں ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔ یہی اسٹیج پر آمد و رفت کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ اس کے آگے کئی پردے ہوتے تھے لیکن اب وہ سب گر چکے تھے۔ چند ایک بلیوں کے سہارے جھول رہے تھے۔ ماحول پراسرار اور خوف زدہ کرنے والا لگ رہا تھا اسی لیے شیزی کچھ دہشت زدہ لگ رہی تھی۔ اس نے نوواک کا بازو تھام لیا۔

وہ دروازے سے گزر کر ایک بڑی سی گیلری میں آئے۔ یہاں ہر طرف پردے لٹک رہے تھے۔ کسی طرف سے ہوا کی آمد کی وجہ سے یہ پردے لہرا رہے تھے۔ نوواک نے روشنی چاروں طرف کی لیکن وہاں انہیں ڈریسنگ روم جیسی کوئی چیز نظر نہیں آئی۔ شیزی بولی۔ "یہاں تو کچھ نہیں ہے۔"

"ڈریسنگ روم یہیں ہوگا۔"

اچانک ایسی آواز گونجی جیسے کسی عورت نے سسکی لی ہو۔ شیزی نے نوواک کا بازو مزید سختی سے پکڑ لیا۔ "یہ کیسی آواز تھی؟"

"شاید ہوا کی وجہ سے ایسی آواز پیدا ہوئی ہے۔"

"نوواک! یہاں سے چلو۔" شیزی نے دہشت زدہ لہجے میں کہا۔ "مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

نوواک اپنا کام مکمل کر کے جانا چاہتا تھا لیکن اسی لمحے سسکی جیسی آواز پھر آئی اور شیزی نے چلنے کی ایسی رٹ لگائی کہ اسے ماننا پڑا۔ وہ باہر آئے تو شیزی کی جان میں جان آئی۔

"مجھے لگتا ہے کہ یہ تھیٹر آسیب زدہ ہو گیا ہے۔"

"تم ایسی باتوں پر یقین رکھتی ہو؟" نوواک نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"نہیں، یقین تو نہیں ہے لیکن مجھے یہاں ایسا ہی لگا ہے۔"

وہ واپس آئے تو رات بھیگنے لگی تھی۔ آسمان پر چھائے بادل جمع ہو رہے تھے اور دھند بھی بڑھنے لگی تھی۔ [illegible] نوواک [illegible] چلا گیا۔ [illegible] دیکھا کہ سارجنٹ رائٹ کے کمرے کی روشنی ان کے آنے تک جل رہی تھی اور جیسے ہی وہ اپنے کمرے کی طرف گیا، روشنی بجھ گئی۔ کیا وہ ان کی نگرانی کر رہا تھا؟

☆☆☆

لیکان خاندان کے قبرستان میں تدفین کے موقع پر سب ہی موجود تھے۔ ولیم بھی کئی سال بعد اپنے محل سے باہر آیا تھا۔ فالج کی وجہ سے اس کے جذبات کا اندازہ مشکل تھا کیونکہ بیٹی کی تدفین کے وقت بھی اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ کلارا ایک خاص گاڑی میں اسے اس کی وہیل چیئر سمیت لے آئی تھی اور قبرستان میں بھی وہی اسے سنبھال رہی تھی۔ شیزی، کلارا کو نفرت سے دیکھ رہی تھی۔ نوواک نے اسے دبی زبان میں "کتیا" کہتے سنا۔

یہ لقب یقیناً کلارا کے لیے تھا۔ وہ ولیم کے عقب میں بالکل ساکت اور چپ تھی۔ ایما اپنی بلی کو بھی لائی تھی۔ وہ رنجیدہ نظر آ رہی تھی۔ کچا ذہن کے باوجود اسے معلوم تھا کہ موت کیا ہوتی ہے۔ وہ عمر میں اپنے شوہر کے برابر تھی۔ پادری دعا پڑھ رہا تھا۔ اس کے بعد ڈیزی کا تابوت قبر میں

اتار دیا گیا۔ نوواک اس وقت خود پر بڑی مشکل سے ضبط کیے ہوئے تھا۔ شیزی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ تدفین ہوتے ہی باقی سب وہاں سے روانہ ہو گئے۔ صرف نوواک، شیزی، ولیم اور کلارا رہ گئے۔

"میرے بچو۔" ولیم نے ان سے کہا۔ "میں تھک گیا ہوں اس لیے مجھے بھی اجازت دو۔" اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"جی ڈیڈی! آپ جا کر آرام کریں۔" شیزی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ وہ کلارا کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔ کلارا نے ولیم کی وہیل چیئر موڑی اور اسے وہاں سے لے گئی۔ نوواک قبر کے پاس بیٹھ گیا۔ ڈیزی کی موت کے بعد پہلی مرتبہ اس کے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے تھے اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ شیزی نے اسے کچھ نہیں کہا۔ بس اس کے پاس بیٹھ کر اس کا ہاتھ تھامے رہی۔ خاصی دیر بعد نوواک نے خود پر قابو پایا۔

"تمہارا شکریہ۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "تم نے اس موقع پر مجھے سہارا دیا جب میں خود کو دنیا میں بالکل اکیلا محسوس کر رہا ہوں۔"

شیزی نے آنسو صاف کیے۔ "یہ ہمارا مشترکہ دکھ ہے۔" وہ باہر آئے تو سارجنٹ رائٹ قبرستان کے باہر ان کا منتظر تھا۔ چونکہ تدفین میں باہر کا کوئی آدمی نہیں تھا شاید اس لیے اس نے بھی اندر آنا مناسب نہیں سمجھا۔

"میں ان لوگوں سے بیان لینے آیا ہوں۔"

"چلو ہم بھی اسی طرف جا رہے ہیں۔" نوواک نے کہا۔ اسے بورس سے ملاقات کرنی تھی۔ وہ اس سے کوئی بات کرنا چاہ رہا تھا۔ وہ اپنی گاڑی میں تھے اور رائٹ اپنی کار میں ان کے پیچھے آیا۔ محل میں رائٹ نے سب سے پہلے ولیم اور کلارا سے ملاقات کے لیے کہا۔ کلارا اسے اوپر لے گئی۔ اس نے رائٹ سے کہا۔

"تدفین کے بعد مسٹر ولیم کی حالت زیادہ اچھی نہیں ہے، بہتر ہے تم اس سے کم سے کم بات کرو۔"

"مجھے جو پوچھنا ہے وہ تو مجھے پوچھنا ہی پڑے گا۔" رائٹ نے اطمینان سے کہا تو شیزی مسکرانے لگی۔ ان کے جانے کے بعد اس نے نوواک سے کہا۔

"سارجنٹ نے اسے بالکل ٹھیک جواب دیا۔ یہ ڈیڈی پر پوری طرح قابض ہو چکی ہے۔"

"لیکن اس کی اجازت انکل ولیم نے خود دی ہے۔" نوواک نے اس سے ذرا اختلاف کیا۔ "آؤ، ہم بورس سے بات کرتے ہیں۔ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔"

"تب تم مل لو۔" شیزی بولی۔ "میرا کچھ سامان آنے والا ہے مجھے اسے ریسیو کرنے کے لیے موٹیل جانا ہوگا۔ لیکن تم مجھے بعد میں بتانا کہ بورس نے تم سے کیا بات کی ہے۔"

"ٹھیک ہے تم جاؤ، میں آ جاؤں گا۔"

شیزی کے جانے کے بعد وہ بورس کے پاس آیا۔ وہ اپنے ایک انڈور گارڈن میں پودوں کو پانی دے رہا تھا۔ ایما وہیں موجود تھی۔ "آپ نے مجھ سے کچھ کہنا تھا۔" نوواک نے بورس سے کہا۔

"ہاں، آؤ میرے ساتھ۔" اس نے کہا اور ایما سے بولا۔ "تم یہیں رہنا، کہیں جانا مت۔"

بورس اسے اپنے خاص کمرے میں لایا۔ اس نے نوواک کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ "تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ ڈیزی کی موت کس طرح ہوئی تھی؟"

"آپ نے یہ بات فون پر بھی پوچھی تھی۔" نوواک نے اسے غور سے دیکھا۔ "اس کی کوئی خاص اہمیت ہے؟"

"بہت خاص۔" بورس نے اضطراب سے کہا۔ "یہ ہمارے خاندان میں پہلی موت نہیں ہے جو اس طرح ہوئی ہے۔"

نوواک حیران رہ گیا۔ "اس سے پہلے بھی...؟"

"ہاں... سب سے پہلے خود کارل یعنی میرا باپ ایسی موت کا شکار ہوا تھا۔"

"اس کے بعد...؟" نوواک غیر ارادی طور پر بولا۔

"میرا بھائی یعنی تمہارا دادا ایلیز بھی ایسی موت کا شکار ہوا تھا۔ یہ آئرزی کے مرنے سے سال بھر پہلے کی بات ہے۔"

"میرے خدا! لیکن ہم میں سے کسی کو اس بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔"

"اس کی وجہ بھی ہے کہ ان باتوں کو چھپا لیا گیا تھا۔ اگر یہ باتیں کھل جاتیں تو خاندان کی بدنامی ہوتی۔"

"یعنی ان اموات کی کوئی پولیس انکوائری بھی نہیں ہوئی۔"

"نہیں، پولیس نے پوری تفتیش کی تھی لیکن ہم نے اسے میڈیا پر آنے نہیں دیا۔ جب کارل کی موت ہوئی تو ہم دونوں بھائیوں نے اسے چھپانے کا فیصلہ کیا۔ پھر ایلیز مرا تو میں نے اس بات کو منظر عام پر آنے سے روکا۔ اب سوچتا ہوں تو سب فضول لگتا ہے لیکن اس وقت خاندان کے نام کا بڑا خبط تھا۔"

نوواک نے سوال کیا۔ "آپ کے خیال میں ان اموات میں کس کا ہاتھ تھا؟"

"اس وقت میرا خیال تھا کہ اس میں آئرزی کا ہاتھ

www.pkdigest.com

ہے۔ ایک تو وہ کارل سے شدید نفرت کرتی تھی کیونکہ پورے پچیس برس تک کارل نے اس کی اور ملیز کی شادی نہیں ہونے دی تھی۔ پھر تمہاری دادی کی وفات کے بعد ملیز نے اس سے شادی کی تھی۔ اس وقت کارل کو مرے ہوئے دس سال ہو چکے تھے۔"

"کیا دادی بھی...؟"

"نہیں، اس کی وفات طبعی تھی۔ اسے ٹی بی ہو گئی تھی۔" بورس نے نفی میں سر ہلایا۔

"کیا آپ کا آئزی کے بارے میں خیال غلط ثابت ہوا تھا؟"

"ملیز کی موت تک میرا یہی خیال تھا لیکن جب آئزی بھی مر گئی تو میرے حساب سے یہ معاملہ ختم ہو گیا۔ جب تک اینٹونوف کے غائب ہونے کا واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔"

"اینٹونوف؟" نوواک چونکا۔ "انکل ولیم کا بیٹا؟"

"ہاں، وہی اینٹونوف۔" بورس نے سر ہلایا۔ "وہ غائب نہیں ہوا تھا بلکہ اس کی لاش ایک سال بعد تھیٹر کی عمارت سے مل گئی تھی۔ میں نے دیکھا تھا، اس کا چہرہ بھی اسی طرح کھل گیا تھا۔"

"میرے خدا! تب قاتل کون ہو سکتا ہے؟"

"خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ اس بات کو بھی اب بیس برس ہو چکے ہیں۔ مجھے آئزی پر اس وجہ سے بھی شک ہوا تھا کہ وہ پیٹ بنانے کے لیے لکڑی کو اندر سے گودنے والا ایک آلہ استعمال کرتی تھی جسے اندر گھما گھما کر پیٹ کے سر کو کھولا کیا جاتا ہے۔ مجھے شک تھا کہ قتل میں یہی آلہ استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ اسی سے انسان کا منہ اس طرح کھل سکتا ہے اور لکڑی کے متقابلے میں انسان کا سر اندر سے بہت نرم ہوتا ہے۔ اس آلے کی مدد سے ایک ہی جھٹکے میں دماغ سمیت سب باہر آ سکتا ہے۔"

"کیا وہ آلہ آپ کے پاس ہے... یا آپ نے دیکھا ہے؟"

"میرے پاس تو نہیں ہے لیکن میں نے اس کی تصویر بنا رکھی ہے۔ میں نے سب مرنے والوں کی تصویریں بھی لی تھیں۔"

بورس نے ایک الماری سے البم نکالی اور نوواک کے سامنے رکھ دی۔ اس نے البم دیکھی۔ اس میں خاندان کے تمام لوگوں کی تصاویر تھیں۔ پھر ان لاشوں کی تصویریں آئیں تو وہ دہل گیا۔ بورس بہت اچھا فوٹو گرافر تھا۔ اس نے بہت وضاحت سے یہ تصویریں لی تھیں۔ کارل، ملیز اور اینٹونوف تینوں کے چہرے بالکل اسی انداز میں پھٹے تھے جیسا اس نے ڈیزی کا دیکھا تھا۔

"میرے خدا! کیا ہمارے خاندان پر کوئی بدروح مسلط ہو گئی ہے؟"

"بعض اوقات مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔" بورس پھیکے انداز میں بولا۔ "آخر کون ہے جو اس خاندان کی چار نسلوں کو ایک ہی طرح سے موت کے گھاٹ اتار رہا ہے؟"

"کیا کارل کی کسی سے دشمنی تھی؟"

"میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ تو آرٹ کا شیدائی تھا۔ شاید تمہیں پتا نہ ہو، آئزی کو بھی اسی نے تھیٹر میں متعارف کرایا تھا۔"

"لیکن اسے گرینڈ پا سے شادی نہیں کرنے دی۔"

"وہ الگ مسئلہ تھا۔ ایک تو وہ عورت پہلے سے شادی شدہ اور ایک بچی کی ماں تھی۔ دوسرے وہ عمر میں ملیز سے خاصی بڑی تھی۔ دیکھنے میں وہ ذرا بھی پُرکشش نہیں تھی۔ لمبی، دبلی اور استخوانی جسم والی۔"

"اس البم میں اس کی تصویر ہے؟"

بورس نے اس سے البم لے کر آئزی کی تصویر نکالی۔ نوواک نے اسے شوق سے دیکھا۔ بورس ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ ذرا بھی پُرکشش نہیں تھی اور اس کا چہرہ جادوگرنیوں جیسا تھا۔ وہ بھی سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس کے دادا نے اس عورت میں کیا دیکھا تھا۔ بورس نے اس کی سوچ بھانپ لی۔

"کارل کے خیال میں یہ عورت سچ مچ جادوگرنی تھی اور اس نے ملیز کے ذہن کو قابو کر لیا تھا۔"

تقریباً نصف صدی پہلے یہ عورت اس دنیا سے گزر چکی تھی۔ دو قتل اس کی زندگی میں ہوئے تھے لیکن باقی دو قتل تو اس کے مرنے کے بہت عرصے بعد ہوئے تھے۔ نوواک نے بورس کی طرف دیکھا۔ "کیا یہ سب انکل ولیم کے علم میں ہے؟"

"بالکل... کیوں نہیں۔" اس نے کہا۔

"گرینڈ پا یہ کلارا کس طرح انکل ولیم کی زندگی میں آئی تھی؟"

"جب ڈیزی کی ماں ایک حادثے میں ماری گئی تو ولیم نے اس عورت سے شادی کر لی۔ اس بات کو پندرہ سال تو ہو چکے ہیں لیکن سنا ہے کہ ولیم کی اس عورت سے اس سے بھی پہلے سے دوستی تھی۔" بورس کے لہجے میں بیزاری تھی۔ "پانچ سال پہلے جب ولیم کو فالج ہوا، تب سے وہ پوری طرح اس کے قابو میں ہے۔ کم سے کم میں نے تو اسے کبھی کلارا کے بغیر نہیں دیکھا۔ وہ ہر وقت اس سے چپکی رہتی ہے۔"

"آئزی کس طرح پرفارم کرتی تھی؟"

"وہ اسٹیج پر پیٹ کی آواز بنا کر مزاحیہ ایکٹ پیش کرتی

تھی۔ میں نے اسے بارہا دیکھا۔ وہ بہت اچھے جملے بناتی اور پھر ان کو پیٹ کی مدد سے پیش کرتی تھی۔ بلاشبہ وہ اپنے فن کی ماہر تھی۔ آوازیں بنانے میں اسے کمال حاصل تھا۔ مرد، عورت، بچے بوڑھے سب کی آوازیں وہ اتنی مہارت سے نکالتی تھی کہ حقیقت کا گمان ہوتا تھا۔ حاضرین کے سامنے وہ اس طرح بنا ہونٹ اور چہرہ ہلائے آواز نکالتی تھی کہ دیکھنے والے کو ذرا بھی احساس نہیں ہوتا تھا۔"

"میں وہ پیٹ اور تابوت ساتھ لایا ہوں... کیا آپ دیکھ کر بتا سکتے ہیں کہ وہ آئزی سے متعلق ہیں یا نہیں؟ میری کار میں رکھے ہیں۔"

"ضرور... چلو دیکھتے ہیں۔"

وہ اور بورس باہر آئے۔ نوواک نے اسے پیٹ اور پھر اس کا تابوت نما بکس دکھایا تو وہ بے ساختہ بول اٹھا۔ "یہ آئزی کا ہی ہے۔ اتنا فن کارانہ کام وہی کر سکتی تھی۔ یہ تابوت بھی ویسا ہی ہے جیسا کہ وہ استعمال کرتی تھی۔"

"کیا آپ جانتے ہیں کہ آئزی اپنا سامان کہاں رکھتی تھی؟ میری مراد پیٹ اور دوسری چیزوں سے ہے۔"

"یہ تو مجھے نہیں پتا۔" بورس نے کہا۔ "لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اس قسم کا سارا سامان تھیٹر میں ہی رکھتی تھی۔ اصل میں مجھے تھیٹر سے اتنی دلچسپی نہیں تھی۔ دلچسپی تو ملیز کو بھی نہیں تھی۔ یوں سمجھ لو کہ آئزی ہی وہاں کی کرتا دھرتا تھی۔ اس کا بیشتر وقت وہیں گزرتا تھا۔ وہ پیٹ بھی وہیں بناتی تھی۔ لازمی بات ہے کہ اس کا سامان بھی وہیں ہونا چاہیے۔"

"وہ لکان کی جاگیر کی وارث نہیں تھی لیکن اس کا اپنا کچھ نہ کچھ تو اثاثہ ہوگا... کیا اس کے مرنے کے بعد اس کا کوئی وارث سامنے نہیں آیا؟"

"نہیں، مجھے بھی اس پر حیرت ہوئی تھی۔" بورس نے کہا۔ "مجھے صحیح سے یاد نہیں ہے لیکن اس کا ایک بینک اکاؤنٹ تھا اور اس میں کچھ نہ کچھ رقم ہوگی۔ شاید وہ اس نے براہِ راست اپنی بیٹی کے حوالے کر دیا ہو اور ہمیں اس کا علم نہ ہو... لیکن یہ ضرور ہے کہ اس سلسلے میں کوئی وکیل یا کوئی اور نمائندہ ہمارے پاس نہیں آیا۔"

ایما ان کے پاس آئی۔ اس نے سہمے ہوئے انداز میں کہا۔ "مجھے جنگل جانا ہے۔ لیکن مجھے پانی والے راستے سے ڈر لگتا ہے۔"

"آپ جنگل کیوں جانا چاہتی ہیں؟" نوواک نے سوال کیا۔ "آپ کو کوئی راستہ پتا ہے؟"

لیکن ایما اس کے سوال کا جواب دیے بغیر وہاں سے چلی گئی۔ نوواک نے بورس کی طرف دیکھا۔ "گرینی کی یہ حالت کب سے ہے؟"

بورس نے گہری سانس لی۔ "اس وقت میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا۔ جب ملیز کی لاش ملی تو یہ اس کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ یہ اس طرح کانپ رہی تھی جیسے اسے سردی لگ رہی ہو۔ میرا خیال ہے کہ اس نے ملیز کو مرتے دیکھا تھا اور اس کے بعد سے یہ اسی حالت میں ہے۔ اس سے معلوم کرنے کی بہت کوشش کی گئی کہ ملی کے ساتھ کیا ہوا تھا اور ممکن ہے اس نے قاتل کو دیکھا ہو... لیکن جب اس سے اس بارے میں بات کی جائے تو یہ بالکل خالی ذہن ہو جاتی ہے۔"

"امکان ہے کہ گرینی نے قتل ہوتے دیکھا ہوگا۔" نوواک نے رائے دی۔ "اسی شاک نے انہیں اس حال میں پہنچایا ہے۔"

"پولیس کا بھی یہی خیال ہے۔" بورس نے اس کی تائید کی۔ "مگر ماہرِ نفسیات بھی اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکے۔"

"کیا قاتل کو گرینی سے خطرہ محسوس نہیں ہوا کہ کبھی امکان ہو کہ وہ اس کی نشان دہی کر دیں۔"

"مجھے بھی یہی خدشہ رہا۔ اسی وجہ سے کئی سال تک میں اس کو اپنے سامنے ہی رکھتا تھا۔ کبھی کہیں جانے نہیں دیتا تھا لیکن جب کئی سال گزر گئے تو میں کچھ بے پروا ہو گیا اور اب تو اس بات کو سالوں گزر چکے ہیں۔"

"اگر اس بات کا امکان تھا کہ قاتل بھی مر چکا ہے تو یہ امکان پہلے اینٹونوف اور پھر اب ڈیزی کے قتل سے ثابت ہو گیا ہے کہ وہ زندہ ہے۔"

بورس متفکر ہو گیا۔ "اینٹونوف کی موت کو بھی عرصہ گزر گیا ہے لیکن جب سے میں نے ڈیزی کو دیکھا ہے، پھر سے خدشہ پیدا ہو گیا ہے۔"

"اس لیے بہتر ہے کہ آپ ان کو باہر نہ جانے دیں اور گھر میں بھی محتاط رہیں۔"

"گھر میں اور بھی زیادہ محتاط رہنا پڑتا ہے کیونکہ تینوں قتل یہیں ہوئے ہیں۔ کارل اپنی اسٹڈی میں ملا تھا اور ملیز کی لاش میرے کام کے کمرے میں ملی تھی جبکہ اینٹونوف کی لاش تھیٹر میں ملی تھی۔"

"گرینڈ پا کی لاش آپ کے خاص کمرے میں ملی۔ وہ وہاں کیا کر رہے تھے؟"

"یہ کسی کو بھی نہیں پتا کہ وہ وہاں کیا کرنے گیا تھا۔ اہم بات یہ ہے کہ کمرا اندر سے بند تھا۔ مجھے اندر جانے کے لیے اس کا لاک توڑنا پڑا تھا۔"

www.pkdigest.com

"اگر کمرا اندر سے بند تھا تو قاتل کہاں سے آیا؟"

بورس اس سوال پر سوچ میں پڑ گیا۔ نوواک کو واپس جانا تھا اس لیے وہ چلا گیا۔ اس دوران میں سارجنٹ رائٹ اوپر سے آ گیا۔ اس نے بورس سے بیان دینے کو کہا۔ بورس اس کے سوالوں کے جواب دیتا رہا اور وہ اپنی نوٹ بک میں لکھتا رہا۔ پھر اس نے نوواک کے بارے میں پوچھا۔ "وہ کہاں ہے؟"

"وہ اپنے ہوٹل چلا گیا ہے۔" بورس نے کہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس پولیس والے کو ایکان خاندان میں ہونے والی اموات کی مماثلت کے بارے میں بتائے یا نہ بتائے۔ پھر وہ یہ سوچ کر چپ رہا کہ یہ ساری رپورٹس پولیس میں ہیں اس لیے اسے لازمی علم ہوگا۔ رائٹ وہاں سے روانہ ہو گیا۔ بورس کو وہ روایتی پولیس جاسوس لگا۔ اس میں کوئی خاص ذہانت نہیں تھی۔ بورس، ایما کو لے کر اندر آ گیا۔ وہ عام طور سے اپنا حصہ لاک رکھتا تھا تاکہ ایما اس کی لاعلمی میں باہر نہ نکل جائے۔ ایک بار وہ اسی طرح چپکے سے باہر چلی گئی تھی اور اسے حادثہ پیش آ گیا تھا جس میں اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی اور اسے دو مہینے اسپتال میں گزارنے پڑے تھے۔

بورس اپنے کام والے کمرے میں آیا۔ یہاں ابھی اس نے کچھ سامان رکھا ہوا تھا اور اس نے ڈیزی کے منہ کے اندر کے زخم کا معائنہ کیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ یہ زخم اسی نوعیت کے آلے کا تھا جو اس سے پہلے ہونے والی وارداتوں میں استعمال ہو چکا تھا۔ اس نے زخم کے کچھ نمونے بھی لیے تھے۔ اس سے اسے پتا چلتا کہ زخم کس دھات کے بنے ہوئے آلے سے آیا ہے۔ اس کے پاس باقی افراد کے زخموں سے حاصل کیے جانے والے نمونے بھی تھے۔ وہ جان سکتا تھا کہ اس بار بھی وہی آلہ استعمال ہوا ہے یا نہیں۔ وہ اپنے کام میں لگ گیا۔ اچانک اسے لگا جیسے کہیں سے کوئی آواز آئی ہے۔ اس نے برابر والے کمرے میں جھانکا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ یہاں دیوار کے ساتھ خانوں والی الماریاں بنی تھیں۔ اسے یقین تھا کہ آواز یہیں سے آئی ہے۔ اس نے خانے کھول کھول کر دیکھنا شروع کر دیے۔ اس کا خیال تھا کہ ممکن ہے کسی خانے میں کوئی چوہا گھس گیا ہو۔ اس نے ایک نیچے کا خانہ کھولا۔ یہ اندر سے بالکل خالی تھا اور اس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ اسے بند کرنے لگا تو آواز ایک بار پھر آئی۔

آواز یقینی طور پر اسی خانے سے آئی تھی۔ لیکن خانے میں کچھ نہیں تھا۔ تو کیا اس کے پیچھے کچھ تھا؟ وہ جھک گیا۔ اس نے خانے کا نچلا حصہ ٹٹولا تو وہ اسے کھوکھلا محسوس ہوا۔ یہ پلائی سے بنا ہوا تھا جبکہ اس کے پیچھے دیوار ہونی چاہیے تھی۔ اس نے ہاتھ مارا تو کھوکھلی سی آواز پیدا ہوئی۔ اس نے تختے پر دباؤ ڈالا تو وہ اندر کی طرف دبنے لگا۔ اس نے مزید زور لگایا تو وہ اچانک ہی کسی دروازے کی طرح کھل گیا۔ بورس دم بخود رہ گیا۔ وہ گزشتہ پچاس سال سے اس کمرے کو استعمال کر رہا تھا اور اسے پتا ہی نہیں تھا کہ یہاں ایک خفیہ خانہ بھی ہے۔ اسے نہیں یاد کہ یہ حصہ کس نے بنوایا تھا لیکن یہ کام اس نے نہیں کروایا تھا۔ ورنہ اسے خانے کا ضرور پتا ہوتا۔ وہ واپس آیا اور اس نے ٹارچ لی۔ پھر خانے میں گھس کر اس نے دوسری طرف دیکھا۔ یہ قدرے چھوٹا سا لیکن پھیلا ہوا حصہ تھا جس میں جابہ جا لکڑی کے شہتیر لگے تھے۔ شاید یہ گنبد کا کوئی نچلا حصہ تھا۔ اس نے ٹارچ سے روشنی ڈالی۔ دور تک صرف لکڑی کے تختے اور شہتیر نظر آ رہے تھے۔ اس نے اندر گھس کر پھر روشنی ڈالی۔ وہ ذرا آگے گیا تھا کہ اچانک عقب سے دروازہ بند ہو گیا۔ اس نے چونک کر دیکھا اور جلدی سے واپس آیا۔ اس نے دروازے کو دھکا دیا تو وہ کھل گیا۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اسی لمحے اسے پیچھے سے آہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو کوئی چیز اس کے منہ میں گھس گئی اور اس نے یک دم ہی بورس کا منہ چیر دیا۔ یہ ایک آہنی آلہ تھا۔ وہ اس کے منہ کے اندر گردش کر رہا تھا اور اس کے دانت، تالو اور دماغ سب کو توڑ پھوڑ رہا تھا۔ مرنے سے پہلے اس نے اپنے قاتل کا چہرہ دیکھا اور پھر موت نے اسے دبوچ لیا۔

☆☆☆

نوواک اپنے کمرے میں تھا۔ شیزی کا سامان آ گیا تھا اور اس کا ارادہ ایک دو دن میں محل میں جا کر رہنے کا تھا لیکن اس نے ابھی اپنے باپ سے اس بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ شیزی کچھ دیر پہلے اس کے کمرے سے گئی تھی۔ اس لیے دروازے پر دستک ہوئی تو وہ سمجھا کہ شیزی ہے۔ اس نے پوچھے بغیر دروازہ کھول دیا اور پھر سامنے کھڑے رائٹ فوبس کو دیکھ کر منہ بنایا۔ "میں ابھی تم سے بات نہیں کر سکتا۔"

"لیکن میں بات کرنے آیا ہوں۔" رائٹ بہت سنجیدہ لگ رہا تھا۔ "تم نے اتنی اہم بات مجھ سے چھپائی ہے۔"

"کون سی بات؟"

"یہی کہ ڈیزی جس طرح موت کا شکار ہوئی ہے اسی طرح تمہارے خاندان کے مزید تین افراد موت کے گھاٹ اتر چکے ہیں۔"

"میرا خیال تھا کہ تمہیں پتا ہوگا اور مجھے خود ابھی کچھ

دیر پہلے گرینڈ پا نے اس بارے میں بتایا ہے۔ ورنہ میں پہلے بے خبر تھا۔"

"مجھے خود ابھی مقامی پولیس کی رپورٹس دیکھنے سے پتا چلا ہے۔ اب یہ معاملہ انتہائی اہمیت کا حامل ہو گیا ہے۔ مجھے تمہارے گرینڈ پا سے بات کرنا ہوگی۔"

"اس وقت...؟" نوواک نے گھڑی دیکھی جس میں رات کے دس بج رہے تھے۔

"ہاں ابھی... یہ بہت ضروری ہے۔"

"کیا تم مجھے بھی لے جانا چاہتے ہو؟"

"اگر تم چلو تو یہ اچھی بات ہوگی۔"

"ٹھیک ہے، میں شیزی کو بتا دیتا ہوں۔"

لیکن جب شیزی نے سنا تو وہ بھی جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ وہ نوواک کی کار میں آ گئی۔ رائٹ اپنی کار میں ان کے پیچھے آ رہا تھا۔ کچھ دیر میں وہ محل کے سامنے تھے۔ اپنی کاریں چھوڑ کر وہ اس کے پچھلے حصے میں آئے۔ بورس کے حصے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ نوواک پریشان ہو گیا۔ اس نے کہا۔ "کوئی مسئلہ ہے ورنہ یہ دروازہ اندر سے بند رہتا ہے۔"

وہ اندر آئے اور مختلف کمروں سے ہوتے ہوئے بورس کے خاص کمرے کی طرف آئے۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ ایما بھی ان کو کہیں نظر نہیں آئی۔ "اس طرف بھی دیکھو۔" سارجنٹ رائٹ نے الماریوں والے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ اس کمرے میں آئے تو روایتی کھلے خانے نے ان کی توجہ کھینچ لی اور جب انہوں نے جھک کر دیکھا تو ایما بورس کی لاش گود میں لیے بیٹھی تھی۔ وہ مر چکا تھا۔ کسی زندہ انسان کا منہ اس حد تک نہیں کھل سکتا۔

"میرے خدا!" نوواک لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا۔

شیزی کے منہ سے بھی چیخ نکلی۔ رائٹ جھک کر بورس کی لاش کا معائنہ کرنے لگا۔ پھر اس نے کھڑے ہو کر کہا۔ "بالکل اسی انداز کی موت ہے۔"

نوواک نے خود پر قابو پاتے ہوئے نیچے ہو کر ایما کو باہر نکلنے میں مدد دی۔ وہ معمول کے مطابق تھی۔ اسے احساس نہیں تھا کہ اس کا شوہر کتنے اذیت ناک طریقے سے مرا ہے۔ نوواک نے اسے کرسی پر بٹھایا۔

"گریٹی! یہ کس نے کیا ہے؟"

ایما اسے خالی نظروں سے دیکھتی رہی۔ رائٹ نے کہا۔ "مشکل ہے، یہ کچھ نہیں بتائے گی۔"

رائٹ نے ٹون دیکھ کر اندازہ لگایا۔ بورس کو مرے زیادہ دیر نہیں گزری تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ قاتل آس پاس ہی تھا۔ اس نے اپنا پستول نکال لیا اور نوواک سے کہا۔ "میں اندر جا رہا ہوں، تم پولیس کو کال کر دو۔"

"نہیں، تم مت جاؤ۔" نوواک نے مضطرب ہو کر کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ قاتل اندر ہو۔"

رائٹ مسکرایا۔ "اسی لیے تو جا رہا ہوں۔ بورس کو مرے زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے۔"

نوواک اپنے سیل فون سے پولیس کو کال کرنے لگا۔ رائٹ خلا میں داخل ہوا۔ وہاں تاریکی تھی لیکن بورس کی ٹارچ وہیں گری ہوئی تھی۔ رائٹ نے اسے اٹھا لیا۔ وہ آگے کھسکنے لگا۔ اس دوران میں وہ محتاط تھا۔ ایک قاتل کی آس پاس موجودگی کا احساس اسے الرٹ کرنے کے لیے کافی تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک کسی قدر کشادہ سرنگ میں داخل ہو گیا۔ سرنگ میں نمی تھی اور اس کی زمین پر پانی جمع ہو رہا تھا۔ وہ ٹارچ کی روشنی میں آگے بڑھتا رہا۔ کچھ دیر بعد ایک زیر زمین جگہ میں داخل ہو گیا۔ اس نے ٹارچ سے اس جگہ کا معائنہ کیا تو اسے احساس ہوا کہ وہ جزیرے کے تھیٹر کے نچلے حصے میں ہے۔ یعنی یہ سرنگ تھیٹر تک آتی تھی اور یہ یقیناً خفیہ تھی۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا۔ اسے ہال نظر آیا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ قاتل اپنا کام کر کے نکل گیا تھا۔ وہ واپس آ گیا۔ نوواک نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس نے بتایا۔

"یہ راستہ تھیٹر کے تہ خانے میں جا کر کھلتا ہے۔"

نوواک کو بورس کی بات یاد آ گئی۔ اس کے دادا ہلیئر کو اسی کمرے میں قتل کیا گیا تھا اور اس وقت بھی دروازہ اندر سے بند تھا۔ یعنی قاتل اسی سرنگ سے آیا تھا اور اس قتل کا تعلق بھی تھیٹر سے بنتا تھا جبکہ اینٹونوف کی لاش تھیٹر سے ملی تھی۔ صرف کارل کی لاش اس کی اسٹڈی سے ملی تھی جو اوپر جانے والی سیڑھیوں کے پاس پہلی منزل پر تھی۔ نوواک کے اندر یہ احساس شدید ہونے لگا کہ اس چکر کا تعلق تھیٹر سے ہی ہے۔

اسی اثنا میں پولیس آ گئی۔ دوسری کاروائیوں کے ساتھ انہوں نے سرنگ کے راستے تھیٹر تک جا کر دیکھا مگر ان کو وہاں کوئی نظر نہیں آیا۔ کلارا اور ولیم کو بھی اس واردات کی خبر ہو گئی تھی اور کلارا نیچے آ گئی۔ اس نے بتایا کہ بورس کے قتل کی خبر سن کے ولیم کی حالت خراب ہو گئی ہے اور وہ اسے آکسیجن لگا کر آئی ہے۔ شیزی نے باپ کے پاس جانا چاہا تو کلارا نے اسے روک دیا۔ "ابھی وہ سو رہا ہے، اسے ڈسٹرب مت کرو۔"

"میرا خیال ہے، وہ میرا باپ بھی ہے۔" شیزی چیخ کر بولی۔

www.pkdigest.com

"ہاں مگر میں اس کی بیوی نہیں بلکہ ایک نرس کی حیثیت سے تمہیں منع کر رہی ہوں۔ اس کی حالت اس وقت کسی سے ملنے والی نہیں ہے۔"

شیزی رک گئی مگر اسے غصہ آ رہا تھا۔ رائٹ لاش اٹھوا کر مقامی پولیس کے ساتھ ہی رخصت ہو گیا۔ اس نے ایما کو بھی مقامی پولیس کی تحویل میں دے دیا تھا کیونکہ اب اس کی ذمے داری اٹھانے والا کوئی نہیں رہا تھا۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد نوواک نے شیزی سے کہا۔ "سنو، میرا ارادہ تھیٹر میں جانے کا ہے۔ مجھے یقین ہے، ڈیزی اور مارے جانے والے تمام افراد کی موت کا معما وہیں ہے۔"

"نہیں۔" شیزی خوف زدہ لہجے میں بولی۔ "وہاں قاتل ہوگا۔"

نوواک نے اسے نرمی سے بازوؤں میں لے لیا۔ "سنو، وہ ہماری تاک میں پہلے سے ہے۔ اس نے سیکڑوں میل دور آ کر ڈیزی کو اپنا نشانہ بنایا اور اب ہماری باری ہے۔ اس لیے ہمیں ہمت کرنا ہوگی۔ پولیس اسے بے نقاب نہیں کر سکتی۔ یہ کام ہمیں ہی کرنا ہوگا۔"

"تب میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔"

نوواک نے سوچا اور سر ہلا دیا۔ "چلو ٹھیک ہے۔"

"تم اسی راستے سے جاؤ گے؟" شیزی کا اشارہ سرنگ کی طرف تھا۔ نوواک نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"نہیں، اسے پولیس نے سیل کر دیا ہے۔ ہم سامنے سے جائیں گے۔ اگر قاتل یہیں موجود ہے تو ہم اسے بھی دھوکا دے سکتے ہیں۔"

محل میں کوئی ملازم نہیں تھا۔ صرف ایک مالی اور گیٹ کا دربان ہوتا تھا لیکن یہ دونوں باہر ہی ہوتے تھے۔ وہ محل سے رخصت ہوئے اور پھر جزیرے کی طرف جانے والی سڑک پر مڑ گئے۔ اس روز بھی سردی کی شدت سے جھیل سے دھند اٹھ کر ماحول کو دھندلا کر رہی تھی۔ جب وہ جزیرے پر جانے والے پل کے قریب پہنچے تو نوواک نے کار کی ہیڈ لائٹس بند کر دیں۔ شیزی کے پوچھنے پر اس نے کہا۔ "میں نہیں چاہتا کہ اگر کوئی یہاں موجود ہے تو اسے ہماری آمد کی اطلاع ملے۔"

اس نے کار تھیٹر سے کچھ دور روک دی تھی۔ وہ نیچے اترے تو ایک لمحے کو سردی سے لرز اٹھے۔ سردی کی شدت میں اچانک ہی اضافہ ہو گیا تھا۔ نوواک نے آہستہ سے کہا۔ "اب کوئی آواز مت کرنا اور نہ ہی بنا ضرورت کے بات کرنا۔"

"میں خیال رکھوں گی۔" شیزی نے سر ہلایا اور وہ تھیٹر کی طرف روانہ ہو گئے۔ نوواک نے اپنے پاس موجود دونوں ٹارچیں نکال لی تھیں لیکن ابھی ان کو جلایا نہیں تھا۔ جب وہ تھیٹر میں داخل ہوئے تب ان کو ٹارچ جلانی پڑی۔ اندر ہال خالی اور تاریک تھا۔ وہ پھر اسٹیج سے ہو کر عقبی گیلری میں پہنچے جہاں پردے لہرا رہے تھے۔ نوواک کی ہدایت پر شیزی خاموش تھی لیکن جب ایک چوہا اس کے پاؤں سے ٹکرایا تو وہ بے اختیار چیخ اٹھی۔ اس نے ٹارچ نیچے کی۔

"چوہا ہے۔" نوواک بولا لیکن شیزی یہ دیکھ کر ڈر گئی تھی کہ وہاں فرش پر بے شمار چوہے پھر رہے تھے۔ اصل میں تھیٹر کی تباہی میں ان کا سب سے بڑا ہاتھ تھا۔ انہوں نے کرسیوں کی لکڑی کاٹ دی تھی۔ اسٹیج کے فرش میں سوراخ کر دیے تھے اور پردوں کو کتر ڈالا تھا۔ اس کے علاوہ یہ کھانے کا سامان اور دوسرا الم غلم لا کر یہاں ڈھیر کرتے رہے تھے۔ اب شیزی کی توجہ ان چوہوں کی طرف تھی۔ وہ ٹارچ ان پر مرکوز کیے ہوئے تھی۔

نوواک پردوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے عقب میں دھاریوں میں رنگی ہوئی دیوار تھی۔ اس نے ایک جگہ روشنی کی تو اسے دیوار میں لائن سی محسوس ہوئی۔ وہ اس کی طرف بڑھا۔ شیزی اس کو دیکھ رہی تھی۔ دیوار کے پاس پہنچ کر نوواک نے دائیں طرف دیکھا تو حیران رہ گیا۔

"تو یہ راستہ ہے۔" اس نے کہا۔

"کیا مطلب؟" شیزی بولی۔

جواب دینے کے بجائے نوواک دائیں طرف سرکا اور یک دم شیزی کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اس کے منہ سے چیخ نکلی۔ "نوواک!" وہ اس طرف لپکی۔ تب نوواک اسے دونوں دیواروں کے درمیان خلا میں نظر آیا۔ یہاں دیوار دوسری دیوار سے کوئی فٹ بھر آگے تھی لیکن دونوں کی یکساں دھاریاں نظر کا ایسا دھوکا پیدا کر رہی تھیں کہ قریب آئے بغیر اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ نوواک ترچھا ہو کر آگے سرک رہا تھا۔ اس نے شیزی کی طرف دیکھا۔ "آ جاؤ... میرا خیال ہے کہ یہ راستہ ڈریسنگ روم کی طرف جاتا ہے۔"

"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" وہ بولی۔

"ڈرو مت... آ جاؤ، میں ساتھ ہوں۔"

شیزی بھی اس تنگ جگہ میں گھس گئی۔ وہ کچھ دیر اسی طرح آگے بڑھتے رہے۔ پھر راستہ کشادہ ہو گیا اور جلد وہ ایک ہال نما جگہ پر پہنچ گئے۔ نوواک کا اندازہ درست تھا۔ وہ آنری ہوور کے ڈریسنگ روم میں تھے۔ یہاں دیوار گیر شوکیس میں اس کے تیار کردہ پپٹ رکھے تھے۔ ان کی تعداد دو

درجن سے زیادہ تھی۔ ان میں مردانہ پپٹ بھی تھے اور نسوانی پپٹ بھی۔ بچوں کے بھی پپٹ تھے اور بوڑھوں کے بھی۔ اتنے سارے خانوں میں صرف ایک خانہ خالی تھا جس میں کوئی پپٹ نہیں تھا۔ شیزی نے اس خالی خانے کی طرف اشارہ کیا۔

"اس کا پپٹ کہاں ہے؟"

نوواک جانتا تھا کہ اس خالی خانے کا پپٹ اس کی کار میں پڑا ہوا ہے۔

"یہ بہت حیرت انگیز ہے۔" شیزی نے ٹارچ سے چاروں طرف روشنی کی۔ نوواک قریب سے جا کر ٹارچ کی روشنی میں پپٹس کا جائزہ لینے لگا۔ اسے ان میں کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ اس نے شیزی کو آواز دی۔ "دیکھو انہیں، یہ کچھ عجیب نہیں لگ رہے ہیں؟"

شیزی اس کے پاس آ گئی۔ اس نے ان کا جائزہ لیا۔ "ہاں کچھ عجیب تو لگ رہے ہیں لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

نوواک غور کر رہا تھا۔ اچانک اس پر انکشاف ہوا کہ ان پپٹس میں بیشتر اس کے خاندان کے مر جانے والے لوگوں سے مشابہ تھے اور ان میں ڈیزی سے مشابہ پپٹ گرل بھی تھی۔ وہ سن رہ گیا۔ تو کیا آنری ابھی تک زندہ تھی؟ وہی پپٹ بنانے کی ماہر تھی۔ پپٹس میں اسے بورس کا پپٹ نظر نہیں آیا۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ قاتل کی خفیہ جگہ کھڑا ہے اور وہ بالکل تنہا تھا۔ اگر قاتل وہاں آ جاتا تو ان کے لیے جان بچانا مشکل ہو جاتا۔ اس نے شیزی کی طرف دیکھا۔ "یہ سارے پپٹ ان لوگوں کے ہیں جو مارے جا چکے ہیں۔ تم غور کرو، ان میں کارل اور دوسرے لوگوں سے مشابہ پپٹ بھی ہیں۔ یہ دیکھو... ڈیزی سے ملتی پپٹ گرل بھی ہے۔"

"ہاں۔" شیزی لرز گئی۔ "یہ تو واقعی..."

"سنو، ہم خطرے میں ہیں... ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔"

"میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔ ہم یہاں سے نکل کر پولیس کو خبردار کرتے ہیں اور اس کے بعد وہ خود قاتل کو پکڑ لے گی۔"

"نہیں، ہم دونوں نہیں... یہ کام تم کرو گی۔" نوواک نے اپنا موبائل نکالا مگر اس جگہ سگنل کام نہیں کر رہے تھے۔ "اسے لے کر باہر جاؤ اور جہاں بھی سگنل ملیں، وہاں سے تم پولیس کو کال کر دینا۔"

شیزی پریشان ہو گئی۔ "تم کیا کرو گے؟"

"میں اسی جگہ رہوں گا اور محل میں جانے والا راستہ تلاش کروں گا۔"

"لیکن وہ تو رائٹ نے تلاش کر لیا تھا۔"

"نہیں، اس نے جو راستہ تلاش کیا تھا، اس کے سوا بھی کوئی اور راستہ ہے جس سے ایما گزر کر یہاں آتی ہے... اور وہ اس نے سب سے چھپا رکھا تھا کہ کہیں اس کے اس راستے سے باہر جانے پر پابندی نہ لگ جائے۔ قاتل بھی اسی راستے کو استعمال کرتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ راستہ ڈریسنگ روم میں کہیں ہے۔"

شیزی اس کے گلے لگ گئی۔ "اپنا خیال رکھنا، میری خاطر... میں پولیس کو کال کر کے کیا کروں؟"

"جب پولیس آ جائے تو اسے اس جگہ لے آنا۔"

شیزی نے اچانک اسے پیار کیا اور وہاں سے چلی گئی۔ نوواک کچھ دیر خاموش کھڑا رہا پھر اس نے ڈریسنگ روم کا معائنہ شروع کر دیا۔ یہ بہت بڑی جگہ تھی اور یہاں کسی راستے کا دروازہ تھا تو اسے تلاش کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ وہ دیواروں پر روشنی ڈالنے لگا۔ اسے پورے ہال کا معائنہ کرنے میں کچھ وقت لگا۔ وہاں کہیں کوئی ایسی جگہ یا رخنہ نظر نہیں آیا جس پر نوواک کو شبہ ہوتا۔ پھر اسے ایک خیال آیا۔ اس نے پپٹس کے ریک کو ہلانے کی کوشش کی۔ یہ بہت بھاری اور ٹھوس لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ وہ ٹارچ سے روشنی ڈالتا ہوا ایک بار پھر ہال میں گردش کرنے لگا۔ ایک طرف ایک پرانا صوفہ سیٹ پڑا تھا۔ یہ پرانے وکٹورین انداز کا صوفہ سیٹ تھا۔ اتفاق سے وہ اس سے ٹکرایا تو صوفہ ذرا سا ہلا۔ اسے تعجب ہوا کیونکہ صوفہ بہ ظاہر بہت بھاری لگ رہا تھا۔ نوواک نے اسے دھکیلا تو وہ ایک طرف سرکتا چلا گیا۔ اس کے نیچے ایک خلا نمودار ہوا۔ نوواک نے نیچے روشنی ڈالی تو اسے سیڑھیاں جاتی نظر آئیں۔ وہ پرجوش ہو گیا۔ اس نے خفیہ راستہ تلاش کر لیا تھا۔ وہ سیڑھیوں سے اندر اتر گیا۔ سیڑھیاں ایک سرنگ میں نکلی تھیں اور یہ صاف ستھری سرنگ تھی جو شاید لیکان ہاؤس کی طرف ہی جا رہی تھی۔ کوئی پانچ سو گز کے بعد پھر سیڑھیاں آ گئیں۔ اسے تعجب ہوا کہ لیکان ہاؤس کے نیچے ایک اتنی لمبی اور باقاعدہ بنی ہوئی سرنگ تھی اور کسی کو اس کے بارے میں پتا تک نہیں تھا۔ وہ اوپر پہنچا۔ اس طرف ایک دروازہ سا تھا۔ اس نے اسے دھکیلا تو یہ آسانی سے کھلتا چلا گیا اور وہ اسٹڈی میں کھڑا تھا۔ خفیہ دروازہ ایک الماری تھی جس میں کتابیں رکھی تھیں اور کسی کو شبہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ کوئی دروازہ ہے۔ اسی اسٹڈی میں کارل لیکان کی لاش ملی تھی۔ اس طرح اس قتل کا سرا بھی تھیٹر سے جا ملتا تھا۔ قاتل ایک ایک کر کے اس خاندان کے سارے افراد کو ختم کر رہا تھا۔ اچانک اسے ولیم اور کلارا کا خیال آیا۔ وہ اس وقت محل میں اکیلے تھے اور

ان کو بھی قاتل سے خطرہ تھا۔ اسے انھیں خبردار کرنا چاہیے۔ اس نے مضطرب ہو کر سوچا۔

وہ اسٹڈی سے نکل کر لیکان ہاؤس کی اوپری منزل پر آیا۔ وہاں سناٹا اور تاریکی تھی۔ نوواک ٹارچ کے سہارے مختلف کمروں میں دیکھتا پھر رہا تھا۔ پھر ولیم اسے اپنے کمرے میں میز کے سامنے بیٹھا نظر آیا جیسے کتاب پڑھ رہا ہو۔ مگر وہاں کوئی روشنی نہیں تھی۔ وہ اس کی طرف بڑھا۔ ''انکل ولیم!'' اس نے آواز دی مگر وہ ساکت بیٹھا رہا۔ اس نے پھر آواز دی۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ ولیم کا انداز غیر فطری تھا۔ وہ بالکل ساکت اور چپ تھا۔ اس نے اس کے قریب جا کر اس کو آہستہ سے ہلایا تو وہ اچانک ہی سامنے کی طرف جھک گیا۔ بیلٹ سے بندھے ہونے کی وجہ سے وہ گرا نہیں مگر جھول کر رہ گیا۔ اسی لمحے ٹارچ کی روشنی اس کی پشت پر گئی تو نوواک نے بہ مشکل اپنی چیخ روکی۔ اس کی پشت کھلی ہوئی تھی اور جسم کے اندر صرف خلا تھا۔ اس خلا میں ایک لکڑی کا لیور لگا ہوا تھا جیسے پپٹ کی کمر میں ہوتا ہے جس سے اس کا منہ اور آنکھیں ہلائی جاتی ہیں۔

نوواک کے ذہن میں جیسے آندھیاں سی چلنے لگیں۔ اب ساری بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ کلارا ان سب کو کس طرح بے وقوف بنا رہی تھی۔ ولیم کی آڑ میں اصل میں وہی بولتی تھی اور سب یہی سمجھتے تھے کہ ولیم بات کر رہا ہے جبکہ وہ برسوں پہلے مر چکا تھا۔ کلارا نے اس کے جسم کو کسی طرح محفوظ کر لیا تھا تاکہ اس کی مدد سے اس جاگیر پر راج کر سکے۔ اس نے ولیم کو سیدھا کیا اور اس کا منہ کھول کر اندر روشنی ڈالی تو اسے اندر خلا ہی نظر آیا۔ اس کا دماغ اور منہ کا پورا حصہ غائب تھا اور وہ بھی اسی آلے کا نشانہ بنا تھا۔ نوواک لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا۔ اسی لمحے اسے کمرے میں کسی اور کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو دروازے کے قریب کلارا کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پستول تھا اور پستول کا رخ اس کی طرف تھا۔

''تم...؟'' نوواک نے کہا۔ ''یہ سب تم نے کیا ہے؟''

''ہاں... یہ سب میں نے کیا ہے۔'' اس نے سکون سے اعتراف کیا۔

''مگر کیوں؟'' نوواک چلا اٹھا۔

''ایک ادھورے مشن کی تکمیل کے لیے۔''

''کیسا ادھورا مشن؟'' نوواک اس کی طرف بڑھا تو اس نے پستول سیدھا کر لیا اور کمرے میں روشنی کر دی۔

''بس... وہیں رک جاؤ۔'' وہ بولی۔ ''ورنہ میں تمھیں ابھی مار دوں گی۔''

نوواک رک گیا۔ ''تم یہاں نہیں تھیں؟''

''ہاں، میں کہیں اور تھی۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولی۔ ''مجھے آنے میں ذرا دیر ہوگئی۔''

''تم کہاں تھیں؟'' نوواک کے دل میں خدشات سر اٹھانے لگے۔ اسے شیزی کا خیال آیا۔ کلارا اس کا خیال بھانپ گئی۔

''تم ٹھیک سمجھے۔ اسے روکنا ضروری تھا۔ اس لیے میں پہلے اس کے پیچھے گئی تھی۔''

''تم نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے؟'' نوواک غصے میں اس کی طرف بڑھا۔ اس نے پھر پستول سیدھا کر لیا۔

''غصہ مت کرو... وہ زندہ ہے۔ بس اسے بے ہوش کر دیا ہے تاکہ وہ پولیس کو اطلاع نہ دے سکے۔''

نوواک رک گیا۔ ''تم یہ سب کیوں کر رہی ہو؟ اس جاگیر کے لیے؟''

''ہاں... میں نے کہا نا، یہ ایک ادھورا مشن ہے۔''

نوواک نے اسے غور سے دیکھا۔ اچانک اس پر ایک انکشاف اور ہوا۔ کلارا بڑی حد تک آئزی سے مشابہ تھی۔ اس نے ہکلا کر کہا۔ ''تم... تم آئزی ہوور کی بیٹی ہو؟''

کلارا نے سر ہلایا۔ ''بیٹی نہیں... میں اس کی نواسی ہوں۔''

''اور اسی کی طرح قاتل بھی۔''

''ہاں، ایسا ہی ہے۔'' کلارا نے اعتراف کیا۔ ''آئزی ایک عظیم فن کارہ تھی۔ افسوس کہ اس کا مشن ادھورا رہ گیا تھا۔ میری ماں اس جاگیر میں بھی داخل نہیں ہو سکی تھی اور وہ ویسے بھی کمزور عورت تھی لیکن میں ایسی نہیں ہوں۔ آئزی کے فن کے ساتھ قدرت نے مجھے اس کا مزاج بھی دیا ہے۔''

''تم اسی کی طرح سفاک ہو... لیکن سوال یہ ہے کہ لیکان خاندان نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟''

یک دم ہی کلارا کا چہرہ جیسے مسخ ہو گیا۔ وہ نفرت سے بولی۔ ''جب آئزی نے بلیز سے شادی کرنا چاہی تو کارل اس شادی میں رکاوٹ بن گیا اور مجبوراً آئزی کو ایک اور آدمی سے شادی کرنا پڑی۔ وہ بھی غریب تھا۔ اس لیے آئزی کو بہت مشکل میں وقت گزارنا پڑا پھر وہ مر گیا تو آئزی بے سہارا ہو گئی۔ وہ فن کارہ تھی۔ کارل اسے بہو بنانے پر تو آمادہ نہیں ہوا لیکن اسے اپنے تھیٹر میں کام دے کر اس سے ڈھیروں کمانے لگا۔''

''اسی لیے اس نے اسے مار ڈالا؟''

''ہاں لیکن اصل وجہ وہی تھی کہ وہ اسے بلیز سے شادی کرنے کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔''

''اس کی بلیز سے شادی ہو تو گئی تھی۔'' نوواک نے اسے یاد دلایا۔ ''اور اس نے اسے بھی مار ڈالا؟''

''ہاں کیونکہ وہ بھی اسی خاندان کا آدمی تھا۔'' اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''اس نے مرنے سے پہلے اپنی ساری جاگیر اپنے بیٹے کے نام کر دی تھی۔ اپنی بیوی کو اس میں سے کچھ نہیں دیا۔ وہ بھی اسے استعمال کرتا رہا۔''

''لیکن ملا تو آئزی کو بھی کچھ نہیں۔''

''ہاں جب اسے پتا چلا کہ بلیز نے ساری جاگیر اپنے بڑے بیٹے کے نام کر دی ہے تو اسے پھر اس سے دلچسپی بھی نہیں رہی۔ وہ تو اس خاندان کو صفحہ ہستی سے مٹا دینا چاہتی تھی مگر اسے زیادہ مہلت نہیں ملی۔ اس کا وقت بھی آ گیا تھا۔''

''اور پھر اس کا ادھورا مشن تم نے سنبھال لیا؟'' نوواک نے نفرت سے کہا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے، اس طرح یہ جاگیر تمھیں مل جائے گی؟''

''مجھے اس کی اتنی پروا نہیں ہے۔ میں نے ویسے ہی بہت حاصل کر لیا ہے۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔ ''ولیم کی ہر چیز میرے اختیار میں ہے۔ اس کے سارے اکاؤنٹ میں ہی آپریٹ کرتی ہوں۔ اصل چیز تو وہ انتقام ہے جس کی تکمیل اب قریب ہے۔ اب صرف تم اور شیزی رہ گئے ہو۔''

''تم مجھے مار دو گی؟''

''مجبوری ہے۔'' اس نے پستول اوپر کیا۔ ''حقیقت میں مجھے تم سے کوئی پرخاش محسوس نہیں ہوتی ہے لیکن...''

''ایک منٹ۔'' نوواک نے جلدی سے کہا۔ ''تم نے اپنے بارے میں تو بتایا ہی نہیں۔ تم نے کہاں سے اس چیز کی تربیت لی اور انکل کی زندگی میں کس طرح آ گئیں؟''

وہ مسکرائی۔ ''یہ جاننا تمہارے لیے ضروری نہیں ہے اور میرے پاس وقت بھی نہیں ہے۔ ابھی مجھے پولیس کے آنے سے پہلے تمھیں ٹھکانے لگانا اور اس کے بعد شیزی کو جھیل میں ڈبونا ہے۔''

''جب صرف تم بچو گی تو پولیس کا شک تم پر ہی جائے گا۔''

''بے شک!'' وہ مسکرائی۔ ''لیکن وہ میرے خلاف کچھ ثابت نہیں کر سکیں گے۔''

''اور یہ جو تم چلتا پھرتا ثبوت اپنے خلاف لیے گھوم رہی ہو...'' نوواک نے ولیم کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس کا کیا کرو گی؟''

''بہت جلد یہاں آگ لگے گی اور اس میں پولیس کو ایک جلی ہوئی لاش ملے گی جسے ولیم کے طور پر میں شناخت کروں گی۔ اس کے بعد یہ قصہ بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔ اگر مجھے یہ جاگیر نہ بھی ملی تو کوئی بات نہیں... میں اب بھی بہت دولت جمع کر چکی ہوں۔ اس کے ساتھ میں کہیں اور جا کر ٹھاٹ سے زندگی بسر کر سکتی ہوں۔ اس لیے گڈ بائے مسٹر نوواک لیکان...''

کلارا نے پستول اس کی طرف سیدھا کیا تھا کہ اس کے عقب سے رائٹ کی آواز آئی۔ ''خبردار! پستول پھینک دو... تم میرے نشانے پر ہو۔''

کلارا ایک لمحے کو ساکت رہ گئی۔ پھر اس نے سکون سے کہا۔ ''اس صورت میں بھی تم نوواک کو نہیں بچا سکو گے۔''

''مجھے اس کا افسوس ہوگا لیکن ایک مجرم کے پکڑے جانے کی مجھے زیادہ خوشی ہوگی۔ تم پستول پھینک رہی ہو یا میں گولی چلاؤں؟''

جس وقت رائٹ تیز تیز لہجے میں بول رہا تھا، نوواک نے کلارا کے عقب میں شیزی کو نمودار ہوتے دیکھا۔ اس نے ایک لکڑی اٹھا رکھی تھی۔ کلارا کے عقب میں آ کر اس نے اچانک ہی لکڑی گھما کر اس کے پستول والے شانے پر دے ماری۔ ضرب کی شدت نے اس کا بازو سن کر دیا لیکن گولی چل گئی۔ نوواک بال بال بچا۔ گولی اس کے پاس سے گزری تھی۔ کلارا کراہ کر جھکی مگر اس نے پستول نہیں چھوڑا۔ وہ سیدھی ہو رہی تھی کہ رائٹ نے اس سے پستول چھین لیا۔ ''بس... کھیل ختم مسز ولیم لیکان۔''

شیزی دوڑ کر نوواک سے لپٹ گئی۔ ''تم ٹھیک ہو نا؟''

''ہاں... بال بال بچا ہوں۔'' نوواک نے مڑ کر دیکھا تو اسے ولیم کے ماتھے پر گولی کا نشان نظر آیا۔ اس دوران میں رائٹ نے مزاحمت کرتی کلارا کو ہتھکڑی ڈال دی تھی۔

نوواک نے اس سے پوچھا۔ ''تم یہاں کیسے آئے؟''

''میں تم لوگوں کے پیچھے تھا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''مجھے یقین تھا کہ تم لوگ تھیٹر میں ضرور آؤ گے۔ لیکن میں راستہ کھو بیٹھا اس لیے ذرا دیر سے اندر پہنچا۔ اس وقت یہ شیزی کو بے ہوش کر کے اندر جا رہی تھی۔ اگر شیزی کا مسئلہ نہ ہوتا تو میں اس کا تعاقب کر کے یہاں تک آ جاتا۔''

''تم نے اچھا کیا۔''

''لیکن اسے کیسے پتا چلا کہ ہم تھیٹر میں ہیں؟'' شیزی نے نفرت سے کلارا کی طرف دیکھا۔

''میرا خیال ہے کہ اس نے وہاں کچھ مائیکروفون لگائے ہوئے ہیں۔ ان سے یہ وہاں آنے والوں کی آوازیں سن لیتی

www.pkdigest.com

ہے۔" نوواک نے خیال ظاہر کیا تو شیزی کو وہ سسکی یاد آگئی جس نے اسے بہت زیادہ ڈرا دیا تھا۔ "ایما نے کسی طرح اسٹڈی والا راستہ تلاش کرلیا تھا اور کیونکہ وہ اسے سب سے چھپاتی تھی اس لیے کلارا نے اسے کچھ کہنے سے گریز کیا۔"

"نہیں، اس کی وجہ یہ نہیں تھی۔" کلارا بولی۔ وہ رائٹ کی گرفت میں بل کھا رہی تھی۔ "اگر اس کا تعلق لیکان خاندان سے ہوتا تو میں اسے بھی نہیں چھوڑتی۔"

"یہ صرف لیکان خاندان کی دشمن ہے۔" نوواک نے کہا۔ رائٹ فون پر کال کرکے مقامی پولیس کو طلب کر رہا تھا۔ نوواک، شیزی کو بازو میں لیے کھڑا تھا۔ اب وہی دونوں اس خاندان کے وارث بچے تھے۔ کچھ دیر میں پولیس آئی اور کلارا کو ساتھ لے گئی۔ اس کے جانے کے بعد نوواک نے ٹھنڈی سانس لی۔

"یہ قصہ بھی ختم ہوا۔"

"نصف صدی پرانا قصہ!" شیزی نے اسے یاد دلایا۔ اس کے سر پر زخم آیا تھا لیکن اس میں تکلیف اتنی نہیں تھی۔ جب پولیس وہاں سے سب کو لے کر روانہ ہوئی تو اتنے بڑے لیکان ہاؤس میں وہی دو باقی رہ گئے تھے۔ شیزی نے گھبرا کر کہا۔ "یہاں سے چلو۔"

خود نوواک کا دل بھی یہاں نہیں لگ رہا تھا اس لیے وہ وہاں سے نکل گئے۔

☆☆☆

ایک مہینے بعد جب نوواک اور شیزی وہاں سے جا رہے تھے تو معاملات نمٹ چکے تھے۔ کلارا کا مقدمہ عدالت میں جاری تھا اور امکان تھا کہ اسے سزائے موت ہوجائے۔ پولیس نے اس پر اینٹونوف، ولیم، ڈیزی اور بورس کے قتل کا الزام لگایا تھا لیکن اس نے چالان ڈیزی، بورس اور ولیم کا پیش کیا تھا۔ اینٹونوف کا کیس پرانا ہوگیا تھا۔ کلارا نے ان تمام جرائم کا اعتراف کرلیا۔ اس نے معاملے کو پُراسرار بنانے کے لیے ان کو پٹ بھیجا تھا اور پھر پیچھے سے خود آکر ڈیزی کو اسی آلے کی مدد سے قتل کر دیا۔ اسے عورت جان کر ڈیزی نے اندر آنے دیا تھا۔ بورس سے اب اسے خطرہ محسوس ہونے لگا تھا کیونکہ وہ جان گیا تھا کہ ڈیزی کا قتل بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس نے اسے خفیہ راستے کی طرف متوجہ کیا اور پھر اسے قتل کر دیا۔ اسی دوران میں رائٹ اور وہ لوگ آگئے تھے اس لیے اسے لاش وہاں سے ہٹا کر خفیہ راستہ بند کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ رائٹ نے نوواک کو اس کے بارے میں بتایا۔

کلارا کو اس کی ماں نے ذہنی مریض بنا دیا تھا۔ وہ اسے اس کی نانی کے حوالے سے اکساتی رہی۔ وہ خود کچھ نہیں کر سکی تھی مگر کلارا کو اس نے ایک خوفناک ہتھیار میں بدل دیا تھا۔ اس نے تھیٹر کی تربیت حاصل کی تھی۔ خاص طور سے بنا منہ ہلائے بولنے کا فن سیکھا تھا۔ وہ ذہین تھی اس لیے جب ایک منصوبے کے تحت وہ ولیم کی زندگی میں آئی تو اسے خاص مشکل نہیں ہوئی۔ لیکن ولیم سے شادی کے بعد اسے احساس ہوا کہ وہ اصل میں پھنس گئی ہے۔ اس لیے جب ولیم کو فالج کا اٹیک ہوا تو اس نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اسے ٹھکانے لگا دیا اور خود اس کی جگہ آواز کی مدد سے حکم چلانے لگی۔ ولیم کی لاش محفوظ رکھنے کے لیے اس نے پہلے لاش محفوظ رکھنے کے طریقوں کے بارے میں جانا تھا۔ اس کے بعد اس نے اس کے جسم کے صرف اوپری حصے کو محفوظ کیا۔ باقی جسم اس نے لکڑی کی مدد سے تیار کیا تھا۔ اسے آیزی کی طرح لکڑی کی مدد سے پٹ سازی میں مہارت حاصل تھی۔ جیسے آیزی، لیکان خاندان کے لوگوں کو مارنے کے بعد ان سے مشابہ پٹ بنا کر رکھتی تھی، اسی طرح کلارا نے بھی جس کسی کو اپنا نشانہ بنایا اُن کے پٹ بھی بنا کر رکھے۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا... سوائے اس کے، اسے یہ نفسیاتی تسکین ملتی تھی کہ اب وہ اس خاندان کو کٹھ پتلی کی طرح چلا رہی ہے۔

ولیم کی لاش کو مخصوص طریقے سے محفوظ کرکے اس نے اس کے بیٹھے اور سر کے اندر میٹر اور قطب لیے تھے جن کی مدد سے وہ اس کے سر، منہ اور آنکھوں کو اس طرح حرکت دیتی تھی کہ دیکھنے والے کو ذرا بھی شبہ نہیں ہوتا تھا کہ یہ ولیم کی حرکت نہیں بلکہ اس کے پس پشت کلارا اسے حرکت دے رہی ہے اور وہی اس کی آواز بنا کر بول رہی ہے۔ اس کا منصوبہ نہایت کامیابی سے جاری تھا۔ واپسی کے سفر میں نوواک نے شیزی سے کہا۔

"اگر وہ ہمیں پٹ بھیجنے کی غلطی نہ کرتی تو شاید میرا ذہن اس طرف نہ جاتا اور آج وہ جیل میں نہ ہوتی۔"

شیزی نے جھرجھری لی۔ "اس کی جگہ ہم قبر میں ہوتے۔"

"خدا کا شکر ہے، اس نے ہمیں بچا لیا۔" نوواک نے اس کی طرف دیکھا۔ "شاید ایک نئی شروعات کے لیے۔"

"اس جاگیر کا کیا کرنا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں، ہم اپنی زندگی شہر میں بسائیں گے اور جاگیر ہماری آنے والی نسل کے لیے ہوگی... وہی اس کا فیصلہ کرے گی۔"

شیزی نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور اپنا سر اس کے شانے سے ٹکا دیا۔

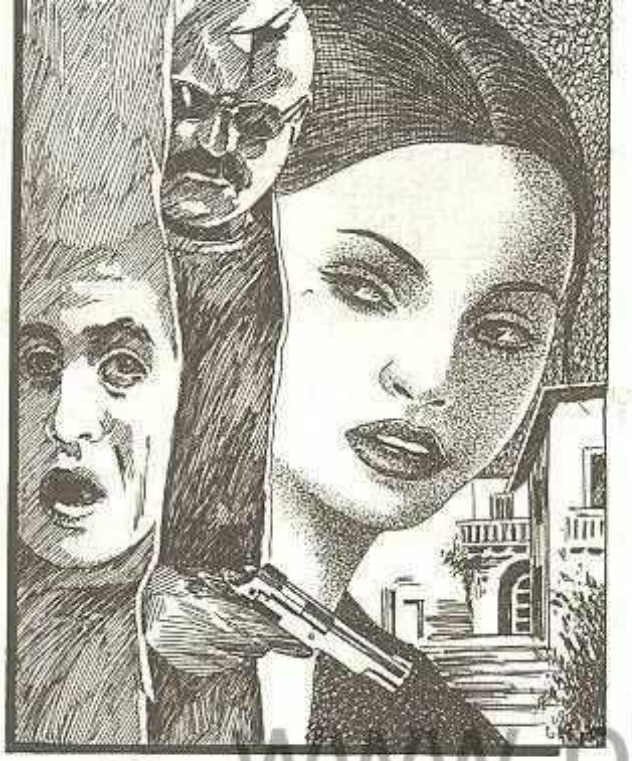

سرورق کے رنگ 2

پہلا رنگ

زر زمین

تنویر ریاض

عمر بھر کی رفاقتیں اور رشتے استوار ہی اس لیے کیے جاتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے دکھ درد بانٹ سکیں — پُرسکون و آسودہ حال زندگی گزارنے والی ایک دوشیزہ کا احوال جس کے گرد جھوٹ، مکر و فریب کی اَن گنت دیواریں کھڑی کر دی گئی تھیں

زمانہ شناس عیار ذہنوں میں پنپنے والی سازشوں کے انکشافات

مسکان کا خیال تھا کہ اسلام آباد ائرپورٹ پر اس کا شان دار استقبال ہوگا اور اسے لینے کے لیے صرف حویلی ہی کے نہیں بلکہ گاؤں کے بھی بہت سے لوگ وہاں موجود ہوں گے لیکن اس کا خیال غلط نکلا۔ وہ کسٹم اور امیگریشن وغیرہ کے مراحل سے فارغ ہوکر باہر آئی تو مسافروں کا استقبال کرنے والوں کے ہجوم میں کسی شناسا چہرے کی تلاش میں اس کی نظریں بھٹکنے لگیں۔ کئی لوگوں نے اپنے ہاتھوں میں ملے کارڈز اٹھائے ہوئے تھے جن پر ان کے مطلوب مسافر کا نام لکھا ہوا تھا۔ مسکان بھی ایک ایک ملے کارڈ کو غور سے دیکھتی ہوئی آگے بڑھتی گئی۔ اسے امید تھی کہ کوئی نہ کوئی اس کے نام کا ملے کارڈ لیے کھڑا ہوگا۔ وہ کسی کو نہیں پہچانتی تھی اور نہ ہی اس کی شکل ان کے لیے جانی پہچانی تھی۔ وہ کافی عرصے بعد پاکستان آئی تھی اور اس لیے اس نے روانگی سے پہلے اپنی ایک تصویر بھیج دی تھی تاکہ ائرپورٹ پر اسے پہچاننے میں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ مسافر ایک ایک کرکے رخصت ہو رہے تھے اور ائرپورٹ کی بھیڑ آہستہ آہستہ کم ہو رہی تھی۔ مسکان کی

www.pkdigest.com

الجھن بڑھتی جارہی تھی۔ اسے تنہا اور پریشان دیکھ کر کئی ٹیکسی ڈرائیوروں نے اس کے قریب آنے اور اسے منزلِ مقصود تک پہنچانے کی پیشکش کی۔ مسکان کے لیے ان لوگوں سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ بار بار اضطراب کے عالم میں گھڑی پر نظر ڈالتی اور گھبرا کر اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگتی۔ اسے ائرپورٹ سے باہر آئے ہوئے پندرہ منٹ ہو چکے تھے لیکن ابھی تک اسے لینے وہاں کوئی نہیں پہنچا تھا۔ اگر ایک روز پہلے اس کی اپنے کزن عادل سے فون پر بات نہ ہوئی ہوتی تو یہ گمان کیا جاسکتا تھا کہ تاریخ، وقت یا فلائٹ نمبر کے حوالے سے کوئی غلط فہمی ہوگئی ہوگی لیکن ایسا نہیں تھا۔ ان دونوں کے درمیان تقریباً آدھ گھنٹے تک بات ہوئی تھی اور مسکان نے اپنی آمد کے بارے میں اسے تفصیل سے بتا دیا تھا جس کے بعد کسی غلط فہمی کی گنجائش باقی نہیں رہنی چاہیے تھی۔

وہ کسی بھی پریشانی کو اپنے اوپر طاری کرنے کے بجائے اس کا حل تلاش کرنے کی عادی تھی۔ اس وقت بھی اس نے ایسا ہی کیا۔ جب اسے یقین ہوگیا کہ کسی وجہ سے عادل یا اس کی فیملی کے دوسرے افراد اسے ریسیو کرنے کے لیے ائرپورٹ نہیں پہنچ سکے تو اس نے فوری طور پر کسی ہوٹل میں عارضی قیام کا فیصلہ کیا۔ اب ان لوگوں کا انتظار کرنا فضول تھا۔ انہیں آنا ہوتا تو وہ اب تک پہنچ چکے ہوتے۔ وہ مزید یہاں رک کر اپنے آپ کو تماشا بنانا نہیں چاہتی تھی۔ پاکستان آنے سے پہلے اسے جس طرح بریف کیا گیا بلکہ ڈرایا گیا تھا، وہ سارے خدشات اس کے ذہن میں کلبلانے لگے۔ برطانیہ میں مقیم اس کے ہمدردوں کے خیال میں پاکستان اس کے لیے انتہائی غیر محفوظ ملک تھا۔ اسے تاکید کی گئی تھی کہ وہ ائرپورٹ سے لے کر اپنے گاؤں تک سفر کے دوران نقد رقم، جیولری یا قیمتی موبائل فون اپنے ساتھ ہرگز نہ رکھے کیونکہ چور، ڈاکو غیر ملکی پروازوں سے آنے والے مسافروں کو ائرپورٹ سے ہی تاڑ لیتے ہیں اور تعاقب کر کے راستے میں کسی سنسان جگہ پر انہیں لوٹ لیتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ خطرناک واردات اغوا برائے تاوان کی ہوسکتی ہے۔ مسکان کو یقین تھا کہ اگر اس کے ساتھ ایسا حادثہ پیش آیا تو وہ کبھی بھی اغوا کرنے والوں کی قید سے رہا نہیں ہو سکے گی کیونکہ اس کے چچا کی مالی حالت ایسی نہیں کہ وہ تاوان ادا کر کے اسے رہا کروا سکیں۔ ظاہر ہے کہ تاوان نہ ملنے کی صورت میں اغوا کرنے والے اسے قتل کر دیتے اور وہ بھری جوانی میں اپنی ناتمام آرزوؤں اور خواہشوں کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہونا نہیں چاہتی تھی۔ چنانچہ اس نے یہی مناسب جانا کہ کسی ڈاکو یا اغوا کرنے والے کی نظروں میں آنے سے پہلے اسے کسی ہوٹل میں شفٹ ہو جانا چاہیے۔

اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے وہ آگے بڑھی اور اس سے پہلے کہ کوئی ٹیکسی والا اس کی جانب متوجہ ہوتا، ایک لمبا چوڑا آدمی سفید شلوار قمیص میں ملبوس اس کی جانب بڑھا اور بالکل اس کے سامنے آکر رک گیا۔ اسے دیکھتے ہی مسکان خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹی اور اسے یقین ہوگیا کہ فرشتۂ اجل اسے لینے آن پہنچا ہے۔ کاش وہ سوچ بچار میں وقت ضائع نہ کرتی اور پہلے ہی یہاں سے کھسک جاتی تو اغوا ہونے سے بچ سکتی تھی لیکن اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ مسکان نے اغوا ہونے کے لیے اپنے آپ کو ذہنی طور پر آمادہ کرلیا اور آنکھیں بند کرنے والی ہی تھی کہ اس اجنبی نے قدرے پُرجوش لہجے میں اسے پکارا۔

"مسکان!"

"اوہ میرے خدا!" مسکان کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ "یہ تو میرا نام بھی جانتا ہے۔ واقعی پاکستان میں اغوا کا کاروبار بڑے منظم اور سائنسی انداز میں ہو رہا ہے۔ یہ لوگ اپنے ٹارگٹ کے بارے میں پہلے ہی پوری معلومات حاصل کر لیتے ہیں۔ اسے نام معلوم ہے تو بیک گراؤنڈ سے بھی واقف ہوگا۔ یا اللہ! مجھ پر رحم کرنا۔ چچا جان تو کبھی بھی اتنا بڑا مطالبہ پورا نہیں کرسکیں گے۔"

"مسکان!" اس اجنبی کی آواز دوبارہ اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ وہ اپنے کرخت چہرے پر نرمی لاتے ہوئے بولا۔

"کہاں کھوئی ہوئی ہو... مجھے پہچانا نہیں؟ میں عادل ہوں... تمہارا کزن۔"

یہ حیرت کا دوسرا جھٹکا تھا جو مسکان نے برداشت کیا۔ اس نے سر سے پاؤں تک اس اجنبی شخص کو غور سے دیکھا۔ شاید یقین کرنا چاہ رہی تھی کہ وہ واقعی عادل ہے یا اس کا نام لے کر بے وقوف بنا رہا ہے۔ گو کہ اس نے عادل کو کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن ٹیلی فون پر ہونے والی گفتگو کے سبب وہ اس کی آواز پہچان سکتی تھی۔ پھر بھی بے یقینی کے عالم میں بولی۔

"عادل بھائی! آپ کہاں رہ گئے تھے؟ میں کب سے انتظار کر رہی ہوں۔ اتنے برے برے خیالات آرہے تھے۔ اوپر سے یہاں کا ماحول۔ ان لوگوں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح مجھے اٹھا کر لے جائیں۔"

"تم کسی جنگل بیابان میں نہیں بلکہ ایک انٹرنیشنل ائرپورٹ کے باہر کھڑی ہو۔ یہاں کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ویسے غلطی میری ہی ہے۔ مجھے وقت سے پہلے یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ بس عین وقت پر ایک ضروری کام پڑ گیا۔ اسی وجہ سے دیر ہوگئی۔ میں نے موبائل پر تم سے رابطہ کرنے کی

کوشش کی تھی لیکن شاید تم نے سم ابھی تک تبدیل نہیں کی ہے۔"

اس جانب مسکان کا خیال نہیں گیا تھا اور نہ ہی اسے یہ پتا تھا کہ ائرپورٹ سے باہر آتے ہی موبائل استعمال کرنے کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا اور ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولی۔ "آپ اکیلے ہی آئے ہیں... کسی اور کو ساتھ نہیں لائے؟"

"سب باتیں یہیں کھڑے کھڑے کرو گی؟ کچھ گھر کے لیے بھی چھوڑ دو۔" عادل اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ پھر اس نے ایک پورٹر کو اشارہ کیا جس نے مسکان کے سامان کی ٹرالی سنبھالی اور وہ لوگ کار پارکنگ کی طرف چل دیے۔ وہ اپنے ساتھ صرف ایک سوٹ کیس اور ہینڈ بیگ لے کر آئی تھی اور اتنے مختصر سامان کے لیے پورٹر کی خدمات حاصل کرنا اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ عادل کے اس طرزِ عمل سے اسے یہ اندازہ لگانے میں بالکل بھی دشواری نہیں ہوئی کہ یہاں کے لوگ اپنا کام کرنا بھی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔

وہ ایک شان دار گاڑی میں بیٹھ کر اپنی منزل کی جانب روانہ ہوئے جسے ڈرائیو چلا رہا تھا۔ عادل اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا جبکہ مسکان کو پچھلی سیٹ پر بٹھایا گیا۔ سارے راستے ان کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ اگر مسکان نے کچھ پوچھا تو عادل نے ہوں ہاں کر کے اسے ٹال دیا اور وہ سمجھ گئی کہ ڈرائیور کی موجودگی عادل کو باتیں کرنے سے روک رہی ہے۔ مسکان کو سب سے زیادہ حیرت اس گاڑی پر ہو رہی تھی کیونکہ گزشتہ بیس سال سے وہ چچا جان کی خراب مالی حالت کے بارے میں سنتی آرہی تھی اور وہ اپنے ہر خط اور ٹیلی فون پر اس کا رونا روتے رہتے تھے۔ مسکان کو اچھی طرح علم تھا کہ اس کے ڈیڈی نے ہمیشہ چچا جان کی مدد کی اور گاہے بگاہے انہیں معقول رقم بھیجتے رہتے تھے۔ چچا جان کی آمدنی کا واحد ذریعہ وہ زمین تھی جو دادا جان ورثے میں چھوڑ گئے تھے۔ اسی سے ان کی گزر بسر ہوتی تھی گو کہ اس کے ڈیڈی نے کبھی بھی زمین سے ہونے والی آمدنی میں اپنا حصہ نہیں مانگا تھا لیکن اس کے باوجود بھی چچا جان کا ہاتھ ہمیشہ تنگ ہی رہتا تھا۔ ان حالات میں ان کے لیے اتنی قیمتی اور شان دار گاڑی افورڈ کرنا ممکن نہیں تھا۔ وہ اس بارے میں عادل سے پوچھنا چاہ رہی تھی لیکن اس کے کرخت چہرے پر چھائی گہری سنجیدگی نے اسے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔

اسے اپنے گاؤں کے بارے میں اتنا ہی معلوم تھا جو اس کے ڈیڈی نے اسے بتایا تھا۔ وہ اپنی زندگی میں صرف ایک بار پاکستان آئی تھی جب اس کی عمر صرف پانچ برس تھی۔ اس وقت بھی ان کا قیام مختصر عرصے کے لیے تھا۔ اس کی غیر ملکی ماں کو گاؤں میں چار دن گزارنے مشکل ہو گئے۔ وہ اس ماحول میں رہنے کی عادی نہیں تھی۔ اوپر سے ستم یہ ہوا کہ گاؤں پہنچنے کے چند روز بعد ہی مسکان بیمار ہوگئی۔ اس کا بخار کسی طرح اترنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ گاؤں میں نہ کوئی ڈاکٹر تھا اور نہ ہی کمپاؤنڈر۔ سب لوگ حکیم کی دوا سے ہی ٹھیک ہو جاتے تھے۔ مسکان کے علاج کے لیے انہیں قریبی قصبے کے اسپتال جانا پڑا جہاں برائے نام طبی سہولتیں دستیاب تھیں۔ خدا خدا کر کے مسکان کی طبیعت بہتر ہوئی تو اس کی ماں نے انگلینڈ واپس جانے کی ضد شروع کر دی جبکہ اس کے ڈیڈی مزید کچھ عرصہ اپنے گھر والوں کے ساتھ رہنا چاہتے تھے لیکن بیوی کی ضد سے مجبور ہو کر انہیں وقت سے پہلے ہی واپس جانا پڑ گیا۔ اس کے بعد مسکان کی ماں نے تہیہ کرلیا کہ وہ کبھی پاکستان نہیں جائے گی اور نہ ہی اپنی بیٹی کو وہاں بھیجے گی۔

ان کا گاؤں ہری پور سے بیس میل کے فاصلے پر ایک سرسبز و شاداب وادی میں واقع تھا جس کی آبادی پانچ چھ سو نفوس پر مشتمل تھی۔ زیادہ تر لوگ کھیتی باڑی کرتے تھے اور جنہیں شہر کی ہوا لگ گئی تھی، وہ کراچی، اسلام آباد اور مری میں چھوٹی موٹی ملازمت یا کاروبار کر رہے تھے۔ مجموعی طور پر اس گاؤں کی حالت پاکستان کے دوسرے دیہات سے مختلف نہیں تھی جہاں غربت اور افلاس نے اپنا ڈیرا جمایا ہوا تھا۔ زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر پورے پورے خاندان پل رہے تھے اور یہی وجہ تھی کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ نہ مٹنے والے خاندان کی بڑھتی ہوئی آبادی کا بوجھ اٹھانے کے لیے کم پڑتی جارہی تھی۔ مسکان کے باپ حیدر زماں نے بہت کم عمری ہی میں اس حقیقت کو سمجھ لیا تھا کہ مستقبل میں اس زمین سے حاصل ہونے والی آمدنی دونوں بھائیوں کے لیے ناکافی ہوگی۔ چنانچہ اس نے میٹرک کرنے کے بعد راولپنڈی کی راہ لی اور ڈاک خانے میں ملازم ہوگیا۔ چھوٹے بھائی گل زماں کو پڑھنے لکھنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے بہ مشکل تمام آٹھ جماعتیں پاس کرنے کے بعد اسکول چھوڑ دیا اور گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ آوارہ گردی میں مشغول ہوگیا۔

حیدر زماں نے پنڈی کے علاقے پھاٹک بازار میں ایک دوست کے ساتھ رہائش اختیار کر رکھی تھی۔ ویسے تو عام طور پر کنوارے لوگوں کے لیے کرائے پر مکان حاصل کرنا ذرا مشکل ہوتا ہے لیکن حیدر زماں اور فرید ایک ساتھ ہی کام کرتے تھے اور ایک دوسرے کے حالات سے اچھی طرح واقف تھے۔ بہت جلد ان کے درمیان اچھی خاصی بے تکلفی

www.pkdigest.com

ہو گئی۔ فرید چاہتا تھا کہ حیدر زماں کو رہنے کے لیے ٹھکانا چاہیے چنانچہ اس نے اپنے گھر میں ایک کمرا اس کے لیے مختص کر دیا۔ حیدر زماں نے پہلے تو رسماً انکار کیا لیکن پھر اس شرط کے ساتھ تیار ہو گیا کہ وہ اس جگہ کا کرایہ ادا کرے گا۔ فرید بھی شاید یہی چاہتا تھا، اس کی مالی حالت کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی اور وہ اپنی قلیل تنخواہ میں ایک بڑے کنبے کی کفالت کر رہا تھا۔ اس نے حیدر کو پیشکش کی کہ وہ ہوٹل کے بجائے ان کے ساتھ ہی کھانا کھا لیا کرے۔ اس طرح حیدر زماں کرائے دار کے بجائے پے انگ گیسٹ کے طور پر فرید کے گھر رہنے لگا۔

فرید کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنے ماں باپ، بہن زرینہ اور چھوٹے بھائی نوید کے ساتھ رہتا تھا۔ گھر کا سارا کام زرینہ ہی کرتی۔ حیدر زماں دفتر سے آنے کے بعد زیادہ وقت اپنے کمرے میں ہی گزارتا۔ فرید کے باپ اور نوید سے تو اس کی ملاقات ہوتی رہتی تھی لیکن ابھی تک اس نے فرید کی ماں اور زرینہ کو نہیں دیکھا تھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ اس گھر میں پردے کی سختی تھی بلکہ حیدر کا مزاج ہی ایسا تھا کہ وہ غیر عورتوں سے ملنے میں جھجک محسوس کرتا تھا۔ پھر ایک دن یہ حجاب بھی ختم ہو گیا اور زرینہ سے اس کا آمنا سامنا ہو ہی گیا۔

اس روز حیدر کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی اس لیے وہ وقت سے پہلے ہی گھر آ گیا۔ اس کمرے کا ایک دروازہ باہر گلی میں کھلتا تھا اور اس کی چابی حیدر کے پاس ہی ہوتی تھی۔ جونہی وہ بیرونی دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلی رہ گئیں۔ زرینہ اس کے بستر پر جھکی چادر ٹھیک کر رہی تھی۔ آہٹ سن کر وہ سیدھی ہوئی اور حیدر کو دیکھ کر کچھ سٹپٹا گئی۔ انداز ایسا تھا جیسے چوری کرتے ہوئے پکڑی گئی ہو۔ اس روز حیدر نے پہلی بار زرینہ کو دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ بلاشبہ اس کا شمار انتہائی خوب صورت لڑکیوں میں ہوتا تھا۔ گوری رنگت، بڑی بڑی روشن آنکھیں، تراشیدہ لب اور کمر سے بھی نیچے تک لمبے گھنے بال۔ اس نے ایسا مکمل حسن پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اسے یہ گھبرائی گھبرائی سی لڑکی بہت اچھی لگی لیکن زرینہ اس کی محویت دیکھ کر اور بھی پریشان ہو گئی اور بوکھلاہٹ کے عالم میں بولی۔

''وہ... وہ... میں آپ کا کمرا صاف کر رہی تھی۔ بہت گندا ہو رہا تھا۔''

شکل کی طرح اس کی آواز بھی بہت پیاری تھی۔ اس کے لہجے کی مٹھاس حیدر کے دل میں اتر گئی۔ اس کا دل چاہا کہ وقت یہیں تھم جائے اور وہ یونہی اس حسین عورت کو دیکھتا رہے لیکن اس کے چاہنے سے کچھ نہ ہوا۔ زرینہ ایک طرف کو ہٹی اور قاتل نگاہوں سے دیکھتی ہوئی بغلی دروازے سے اندر چلی گئی۔

اس اتفاقیہ ٹکراؤ کے بعد حیدر اور زرینہ کے درمیان کوئی پردہ نہ رہا اور آہستہ آہستہ تکلف کی دیوار گرتی گئی۔ حیدر کو کتابیں اور رسالے پڑھنے کا شوق تھا۔ زرینہ کمرا صاف کرنے آتی تو اپنی پسند کی کوئی کتاب یا رسالہ لے جاتی جس پر حیدر نے کبھی اعتراض نہیں کیا بلکہ وہ جان بوجھ کر ایسے رسالے لانے لگا جو زرینہ شوق سے پڑھتی تھی۔ ایک دن فرید کسی کام سے گیا ہوا تھا تو حیدر کے لیے کھانا لانے کی ذمے داری بھی زرینہ کو ہی نبھانا پڑی۔ اس کے ہاتھ میں بہت ذائقہ تھا اور حیدر کئی مرتبہ فرید سے بھی کھانے کی تعریف کر چکا تھا۔ اس روز موقع غنیمت جان کر حیدر نے زرینہ کے منہ پر بھی اس کے بنائے ہوئے کھانوں کی تعریف کی تو وہ خوشی سے نہال ہو گئی۔ اس نے کرید کرید کر حیدر سے اس کے پسندیدہ کھانوں کے بارے میں پوچھا اور پھر وہی چیزیں آئے دن بننے لگیں۔

چند مہینوں میں ہی اسے احساس ہو گیا کہ وہ زرینہ کو پسند کرنے لگا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ فرید اور اس کے ماں باپ، زرینہ کے رشتے کے لیے کافی فکرمند تھے۔ خاندان برادری میں کوئی مناسب جوڑ نہیں تھا اور باہر سے جو رشتے آتے تھے وہ اس گھر کی غربت دیکھ کر ہی واپس لوٹ جاتے تھے۔ اس نے زرینہ سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا لیکن پہلے اس کی مرضی معلوم کرنا ضروری تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں زرینہ اس کی بات سن کر ناراض نہ ہو جائے لیکن اس کے بغیر بات آگے نہیں بڑھ سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے دل کڑا کر کے زرینہ کے سامنے اپنا مدعا بیان کر ہی دیا۔

''دیکھو زرینہ! میں جو کچھ تم سے کہنے والا ہوں اگر وہ تمہیں اچھا نہ لگے تو اس بات کو یہیں ختم کر دینا اور سمجھ لینا کہ میں نے کچھ کہا اور نہ تم نے کچھ سنا۔''

زرینہ نے پہلی بار اسے اس لہجے میں بات کرتے دیکھا تھا۔ وہ تھوڑا سا حیران ہوتے ہوئے بولی۔ ''ایسی کیا بات ہے جس کے لیے اتنی لمبی تمہید باندھی جا رہی ہے؟''

''اگر میں اپنی والدہ کو تمہارے گھر بھیجوں تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہ ہو گا؟''

حیدر نے فارسی نہیں بولی تھی بلکہ انتہائی آسان اردو میں اپنا مدعا بیان کر دیا تھا اس لیے زرینہ کو بات کی تہ تک پہنچنے میں ذرا بھی دیر نہ لگی۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا

اور شرماتے ہوئے بولی۔ ''مجھے نہیں معلوم۔''

حیدر زماں نے پہلا مرحلہ تو آسانی سے سر کر لیا لیکن دوسرا مرحلہ خاصا کٹھن ثابت ہوا۔ اس نے دفتر سے دو دن کی چھٹی لی اور گاؤں پہنچ کر ماں کے سامنے زرینہ کا ذکر کیا تو وہ اپنی جگہ سے یوں اچھلی جیسے کسی بچھو نے اسے ڈنک مار دیا ہو۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

''یہ تو کیا کہہ رہا ہے پتر؟''

''میں نے ایسی کیا بات کہہ دی جس پر تسی اتنے پریشان ہو گئے ہو؟''

''پریشانی والی گل ہے پتر جبھی تو کہہ رہی ہوں۔'' ماں سنبھلتے ہوئے بولی۔ ''میں نے تیری شادی پشمینے سے طے کر دی ہے۔''

پشمینے اس کی خالہ زاد بہن تھی اور اسے بکریاں چرانے کے سوا کوئی کام نہیں آتا تھا۔ حیدر کے خواب بہت اونچے تھے۔ اس میں آگے بڑھنے کی لگن تھی۔ وہ اپنی ذات کو اس گاؤں کے حصار میں قید کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے جس راستے کا انتخاب کیا، اس پر پشمینے نہیں بلکہ زرینہ ہی چل سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے لگی لپٹی میں رکھا یا اور بولا۔

''مجھ سے پوچھے بغیر ہی تم نے اتنا بڑا فیصلہ کر لیا؟''

''شادی بیاہ کے فیصلے ماں باپ ہی کرتے ہیں۔''

''تم نے اپنا فیصلہ سنا دیا اور میں نے اپنی خواہش تمہارے سامنے بیان کر دی۔ اب بابا جان سے بھی پوچھ لو۔ اگر وہ بھی تمہارا ساتھ دیتے ہیں تو میں وہی کروں گا جو میرا من کہے گا۔''

حیدر زماں کا باپ شیر زماں عقل مند اور جہاندیدہ شخص تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ جوان بیٹے کے ساتھ زبردستی کرنے سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔ اس نے بیوی کو بھی یہی سمجھایا کہ زندگی حیدر نے گزارنی ہے تو پھر ہم کیوں اس کی پسند میں رکاوٹ بنیں؟ جب اس نے زرینہ سے شادی کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو وہ کسی دوسری لڑکی کے ساتھ نباہ نہیں کر سکے گا اور اگر ہم نے اس پر اپنی مرضی مسلط کی تو اس طرح ایک نہیں بلکہ تین زندگیاں برباد ہو جائیں گی۔ حیدر کی ماں کو مجبوراً یہ کڑوی گولی نگلنا پڑی اور وہ زرینہ کے گھر حیدر کا رشتہ لے جانے پر رضامند ہو گئی لیکن اس کے دل میں شروع سے ہی زرینہ کی طرف سے بال آ گیا تھا۔

حیدر کی ماں زرینہ کے گھر رشتہ لے کر پہنچی تو کنیوں کے چہرے خوشی سے دمک اٹھے۔ یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے پیاسے پتے صحرا میں بالکل اچانک بارش ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اس رشتے کو مسترد کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جس گھر میں مہینوں سے کوئی کنکر نہ آیا ہو، وہاں حیدر جیسے نیک، شریف اور کماؤ پوت لڑکے تو نصیب والوں کو ملتے ہیں۔ پھر بھی زرینہ کے گھر والوں نے روایت کے مطابق سوچنے کی مہلت مانگی لیکن ان کے انداز سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ دل سے اس رشتے کو قبول کر چکے ہیں۔ البتہ حیدر کی ماں کو اس گھر کی حالت دیکھ کر خاصی مایوسی ہوئی۔ وہ پہلی ہی نظر میں بھانپ گئی کہ یہاں سے زرینہ کو جہیز کے نام پر کچھ بھی نہیں ملنے والا۔ اگر حیدر اس کی بھانجی سے شادی کرنے پر تلا ہوا ہوتا تو وہ جہیز میں اتنا سامان لاتی کہ اس کا گھر بھر جاتا لیکن حیدر کی قسمت میں یہ فقیرنی ہی لکھی تھی تو کوئی کیا کرے۔

حیدر اور زرینہ کی شادی بڑی سادگی سے ہوئی۔ حیدر کی ماں نے برادری کو دکھانے اور اپنی عزت کی خاطر بری میں چند جوڑے اور ہلکا پھلکا زیور تو بنایا لیکن ولیمہ بڑی دھوم دھام سے کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ ساری عمر برادری میں کھاتے آئے ہیں تو اب انہیں بھی لوگوں کو اپنی خوشی میں شریک کرنا چاہیے۔ اس عالی شان دعوت کے نتیجے میں شیر زماں پر قرض کا بوجھ مزید بڑھ گیا لیکن برادری میں ناک اونچی رکھنے کے لیے اس طرح کے بوجھ برداشت کرنے ہی پڑتے ہیں۔

زرینہ چند روز سسرال میں رہی اور حیدر کی چھٹیاں ختم ہونے پر اس کے ساتھ ہی راولپنڈی واپس چلی آئی۔ حیدر چاہتا تھا کہ وہ کچھ عرصہ گاؤں میں ہی رہے۔ اس دوران وہ اپنے لیے دوسری رہائش کا بندوبست کر لے گا لیکن زرینہ کو یہ منظور نہیں تھا۔ اس نے پندرہ دنوں میں ہی ساس کے تیور دیکھ لیے تھے اور جان گئی تھی کہ حیدر کے بغیر وہ اس گھر میں ایک دن بھی نہیں رہ سکتی۔ ملے یہ پایا کہ دوسرا مکان ملنے تک وہ اسی کمرے میں رہیں گے جہاں حیدر پہلے سے پے انگ گیسٹ کے طور پر مقیم تھا۔

دوسرا مکان ملنا اتنا آسان نہیں تھا۔ انہیں جو بھی مکان پسند آتا، اس کا کرایہ سن کر ہی حیدر کی آنکھیں حیرت سے پھیل جاتیں۔ اس محدود تنخواہ میں سے کرایہ نکالنے کے بعد اس کے پاس اتنے پیسے بھی نہ بچتے کہ وہ پورے مہینے کا خرچ چلا سکتا۔ گھر خریدنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حیدر کی بے چینی بڑھتی گئی۔ اسے سسرال میں رہنا گوارا نہیں تھا۔ حالانکہ وہاں اسے بہت آرام تھا۔ سب لوگ اس کی بے حد عزت کرتے تھے لیکن وہ خود اپنے آپ کو

www.pkdigest.com

ان لوگوں پر بوجھ سمجھ رہا تھا۔ اسی تگ و دو میں ایک سال گزر گیا۔ اس دوران حیدر ایک بیٹے کا باپ بن گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی فکروں میں بھی اضافہ ہوگیا۔ شادی کی ہے تو بچے بھی ہوں گے۔ ایک کے بعد دوسرا پھر تیسرا۔ کون جانے یہ سلسلہ کہاں جا کر رکے۔ اسے اپنی آمدنی بڑھانے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔ مگر کیا؟ میٹرک پاس بندہ کلرکی کے علاوہ کیا کرسکتا ہے؟ کاروبار کے لیے سرمایہ چاہیے۔ اس کے پاس تو کچھ پتا ہی نہیں تھا۔ اگر وہ کسی سے قرض ادھار لے کر کوئی کام شروع کرے تو اس کی کامیابی کی کیا ضمانت ہے۔ کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔

بہت سوچ بچار کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اسے ملک سے باہر جا کر قسمت آزمانی چاہیے۔ ان دنوں انگلینڈ جانے کا رجحان عام تھا۔ اس کے اسکول کے زمانے کا ایک دوست طارق مانچسٹر چلا گیا تھا۔ اس کے ساتھ حیدر کی خط و کتابت چل رہی تھی۔ دو تین مہینے میں اس کا ایک خط آجاتا تھا۔ حیدر نے ایک جوابی خط میں اسے اپنے حالات سے آگاہ کیا اور ساتھ ہی یہ بھی دریافت کیا کہ اگر وہ بھی لندن آنا چاہے تو طارق اس سلسلے میں اس کی کیا مدد کرسکتا ہے۔ طارق نے جواب میں لکھا کہ وہ صرف ٹکٹ اور ویزے کا بندوبست کرے۔ اس کے بعد رہائش اور روزگار کے سلسلے میں وہ اس کی پوری مدد کرے گا۔ ساتھ ہی اس نے یہ بھی مشورہ دیا کہ وہ پاسپورٹ کے ساتھ ساتھ اپنا ڈرائیونگ لائسنس بھی بنوالے۔

حیدر نے کسی کو بتائے بغیر انگلینڈ جانے کی تیاری شروع کردی لیکن سب سے بڑا مسئلہ پیسوں کا تھا۔ ٹکٹ کے علاوہ اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے بھی کچھ رقم کی ضرورت تھی۔ اس نے دوستوں اور جاننے والوں سے قرض مانگنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ مجبوراً اسے یہ مسئلہ زرینہ کے سامنے رکھنا پڑا۔ وہ اپنے شوہر کی پریشانی سمجھتی تھی۔ اس نے رونے دھونے اور واویلا کرنے کے بجائے اپنے زیورات حیدر کے سامنے رکھ دیے اور بولی۔ ''میں تمہارے لیے یہی کچھ کرسکتی ہوں۔ انہیں بیچ کر اپنی ضرورت پوری کرلو۔''

''نہیں زرینہ... ایسا نہیں ہوسکتا۔ یہ زیور اماں نے تمہیں پہننے کے لیے دیے ہیں... بیچنے کے لیے نہیں۔''

''اب یہ میری ملکیت ہیں۔ میری مرضی، چاہے پہنوں یا بیچ دوں۔'' زرینہ مضبوط لہجے میں بولی۔ ''نصیب میں ہوا تو اس طرح کا زیور دوبارہ بن جائے گا۔''

''ماں کو معلوم ہوگیا تو وہ بہت ناراض ہوگی۔''

''اول تو انہیں معلوم ہی نہیں ہوگا اور اگر ایسا ہوا تو میں انہیں حقیقت بتا دوں گی۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا، تھوڑا سا شور شرابا کریں گی۔ میں انہیں بھگت لوں گی۔ فی الحال تو تم اپنی ضرورت پوری کرو۔''

حیدر نے جانے سے پہلے وعدہ کیا کہ وہ جلد از جلد اسے اپنے پاس بلا لے گا لیکن وہ اپنا وعدہ پورا نہ کرسکا۔ انگلینڈ پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ دور کے ڈھول سہانے کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ اگر طارق اسے سہارا نہ دیتا تو وہ دو تین ماہ بعد ہی واپس آجاتا۔ رہائش کا مسئلہ تو یوں حل ہوگیا کہ طارق نے اپنے ہی کمرے میں اس کے لیے جگہ بنا دی لیکن ملازمت کے حصول میں اسے کافی دھکے کھانا پڑے۔ پھر طارق ہی کی کوششوں سے اسے ایک پاکستانی ریستوران میں برتن دھونے کا کام مل گیا۔ حیدر نے کبھی اپنے گھر میں چائے کی پیالی بھی نہیں دھوئی تھی۔ اس لیے پہلے تو اسے کافی الجھن ہوئی لیکن اس نے اسے قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کرلیا۔ اس ملازمت سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ وہ اپنے اخراجات پورے کرنے کے قابل ہوگیا۔

تین ماہ بعد اسے ایک ڈسپارٹمنٹل اسٹور میں نسبتاً بہتر تنخواہ پر سیلز مین کی جاب مل گئی۔ اس طرح وہ کچھ بچانے کے قابل ہوا تو اس نے پہلا ڈرافٹ زرینہ اور دوسرا ڈرافٹ اپنے باپ کو بھیجا۔ وہ اپنے گھر والوں کی ضرورتوں کو سمجھتا تھا۔ باپ کی آمدنی سے تو روزمرہ کے اخراجات ہی پورے نہ ہوتے تھے۔ بہنوں کی شادی، مکان کی مرمت اور دوسرے کاموں کے لیے پیسے کہاں سے آتے۔ چنانچہ یہ ذمے داری حیدر زماں نے اپنے سر لے لی۔ اس کا پہلا ڈرافٹ باپ کو ملا تو پورے گاؤں میں دھوم مچ گئی۔ اس کے گھر مبارک باد کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھ گیا اور شیر زماں کو یوں لگا کہ وہ اچانک ہی بہت معتبر اور مقتدر شخصیت بن گیا ہے۔ چھوٹا بھائی گل زماں بھی سینہ پھلائے گاؤں کی گلیوں میں پھر رہا تھا۔ اب اسے کام کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ ماں کا بھی سارا گلہ شکوہ دور ہوگیا۔ حیدر تو خیر اس کا بیٹا تھا لیکن اسے زرینہ پر بھی بہت پیار آنے لگا۔ اس کی شدید خواہش تھی کہ زرینہ بھی ان کے ساتھ ہی رہے۔ بلاوجہ حیدر کو دوہری جگہ کا خرچ اٹھانا پڑ رہا ہے لیکن زرینہ اتنی آسانی سے جال میں پھنسنے والی نہیں تھی۔ اس نے حیدر سے صاف صاف کہہ دیا کہ جب تک وہ اسے اپنے پاس نہیں بلا لیتا، وہ اپنے میکے میں ہی رہے گی۔

حیدر جانتا تھا کہ انگلینڈ میں اس کا قیام عارضی ہے اور ویزے کی مدت ختم ہونے پر اسے یہ ملک چھوڑنا ہوگا۔

ویزے میں توسیع کا انحصار ہوم آفس کی صوابدید پر ہے۔ چنانچہ اس نے انگلینڈ میں اپنا قیام بڑھانے کے لیے دوسرے آپشن پر غور کرنا شروع کردیا جس میں سب سے بہتر حل یہی تھا کہ وہ کسی تعلیمی ادارے میں داخلہ لے لے۔ اس طرح اسٹوڈنٹ ویزا کی بنیاد پر وہ یہاں آرام سے رہ سکتا تھا۔ تعلیمی قابلیت میں اضافہ ہونے سے اسے بہتر ملازمت بھی مل سکتی تھی ورنہ ساری عمر چھوٹے موٹے کام ہی کرکے گزارہ کرنا پڑتا۔ اس کی یہ تدبیر کارگر ثابت ہوئی۔ وہ ایک سیمسٹر پڑھتا اور دوسرے سیمسٹر میں ملازمت کرکے اتنے پیسے کمالیتا کہ اپنے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے ساتھ ساتھ کچھ پیسے گھر بھی بھیج سکے۔

زرینہ کے لیے ایک ایک دن گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ حیدر ماں کو گئے ہوئے تین سال ہوگئے تھے۔ اس دوران وہ خود آیا اور نہ ہی زرینہ کو اپنے پاس بلانے کا بندوبست کرسکا۔ فرید کی شادی ہوگئی تھی اور اس کے کچھ ہی عرصے بعد زرینہ کے ماں باپ ایک ایک کرکے دنیا سے رخصت ہوگئے۔ فرید کی بیوی کا سلوک زرینہ کے ساتھ اچھا نہ تھا۔ ساس، سسر کے سامنے تو اس کی ہمت نہ تھی کہ وہ زرینہ کو کچھ کہتی لیکن ان کے مرنے کے بعد وہ کھل کر اپنی اصلیت پر اتر آئی۔ وہ چاہتی تھی کہ زرینہ اپنے سسرال میں رہے۔ اسی بات پر آئے دن جھگڑے ہونے لگے۔ اس عورت نے فرید کو پوری طرح اپنے قابو میں کرلیا تھا اور وہ بھی بیوی کی ہاں میں ہاں ملانے لگا۔ پہلے تو اس نے زرینہ سے ہمدردی کرتے ہوئے اسے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ جلد از جلد اپنے شوہر کے پاس چلی جائے ورنہ وہ پردیس میں کماتا رہے گا اور یہاں اس کے گھر والے عیش کرتے رہیں گے اور اگر یہ ممکن نہیں تو وہ بھی سسرال میں رہ کر اس عیش و آرام میں اپنا حصہ وصول کرے۔ جب زرینہ نے اس کی باتوں پر سنجیدگی سے توجہ نہ دی تو اس کی بھی نظریں بدل گئیں اور وہ زرینہ کے ساتھ بے رخی برتنے لگا۔ زرینہ نے یہ تمام صورتِ حال حیدر کو لکھ کر بھیجی تو اس نے صاف جواب دے دیا کہ وہ فی الحال اسے اپنے پاس نہیں بلا سکتا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ وہ گاؤں چلی جائے اور اپنے گھر میں عزت کے ساتھ رہے۔

اسی کشمکش میں دو سال مزید گزر گئے۔ حیدر نے گریجویشن کرلیا تو اسے نسبتاً بہتر ملازمت مل گئی۔ اب وہ کچھ پس انداز کرنے کی پوزیشن میں بھی آگیا تھا۔ اس نے ایک ماہ کی چھٹی لی اور وطن واپس آگیا۔ اس بار اس کا ارادہ تھا کہ زرینہ اور اپنے بیٹے ظفر کو ساتھ لے جائے گا لیکن قسمت میں کچھ اور ہی لکھا تھا۔ اس کے آنے کے ایک ہفتے بعد ہی زرینہ کو تیز بخار چڑھا اور وہ دو دن میں ہی زندگی کی بازی ہار گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے حیدر کا ہنستا بھرا گھر اجڑ گیا۔ اس کا بیٹا ظفر صرف چھ سال کا تھا۔ اس نے باپ کو پہلی بار دیکھا تھا۔ اس لیے وہ اسے نامانوس اور اجنبی سا لگا۔ وہ ہر وقت ماں کو یاد کرکے روتا رہتا۔ حیدر کے لیے اسے سنبھالنا مشکل ہوگیا۔ بیوی کی جدائی کا صدمہ ایک طرف اور ساتھ ہی یہ فکر بھی کہ اب اس بچے کو کون سنبھالے گا۔ پہلے اس نے سوچا کہ انگلینڈ واپس جانے کا ارادہ ترک کرکے یہیں کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کرلے لیکن اس کے لیے بھی اچھے خاصے سرمائے کی ضرورت تھی جبکہ وہ ابھی تک کچھ بھی پس انداز نہیں کرپایا تھا۔ اپنے ملک میں ملازمت کے مواقع بھی بڑے محدود تھے اور اگر کوئی جاب مل بھی جاتی تو اس تنخواہ میں گزارہ ممکن نہیں تھا۔ ابھی اسے کئی ذمے داریاں پوری کرنا تھیں جن میں بہنوں کی شادی اور مکان کی تعمیر سرفہرست تھی۔ چنانچہ اس نے دل پر پتھر رکھ کر واپس جانے کا فیصلہ کیا اور بیٹے کو دادا، دادی کے حوالے کرکے رخصت ہوگیا۔

زرینہ کی بے وقت موت نے حیدر کو زندگی سے بہت دور کردیا تھا۔ وہ اس کی پہلی محبت تھی اور زرینہ کے ساتھ گزارے ہوئے چند ماہ اس کی زندگی کا حاصل تھے۔ زرینہ کو بھول جانا اس کے بس میں نہیں تھا۔ چنانچہ وہ اس کی یادوں کو سینے سے لگائے ایک بار پھر زندگی کی شاہراہ پر آگے بڑھنے لگا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ بہنوں کی شادی اور مکان کی تعمیر مکمل ہوجانے کے بعد وہ وطن واپس آکر ساری زندگی اپنے بیٹے کے ساتھ گزار دے گا۔ چنانچہ اس نے پہلے سے زیادہ محنت کرنا شروع کردی۔ وہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ پیسے کمانا چاہ رہا تھا تاکہ اس کے اہداف جلد از جلد پورے ہوسکیں۔ اسی چکر میں وہ آئے دن ملازمت تبدیل کرتا رہتا۔ اس نے اپنے باپ کو لکھ دیا تھا کہ بہنوں کی شادی سے فارغ ہوتے ہی کسی اچھی جگہ پر زمین خرید کر مکان کی تعمیر شروع کردی جائے۔

انسان سوچتا کچھ ہے لیکن ہوتا وہی ہے جو اس کی قسمت میں لکھ دیا گیا ہے۔ حیدر پیسا کمانے کی مشین بن کر رہ گیا تھا۔ اس دوران بہنوں کی شادیاں بھی ہوگئیں اور اس کے باپ نے ایک بڑا سا قطعہ زمین خرید کر اس پر مکان بنوانا شروع کردیا۔ مکان کیا اچھی خاصی حویلی تھی اور اس کا آئیڈیا چھوٹے بھائی گل زمان نے دیا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک شاندار حویلی کا تصور تھا تاکہ دور دور تک ان کی چودھراہٹ

www.pkdigest.com

اور شان و شوکت کا سکہ قائم ہو جائے۔ بھائی کے پیسے پر عیش کرنا وہ اپنا حق سمجھتا تھا۔ حیدر زماں پیسے بھیج بھیج کر تھک گیا لیکن کسی طرح حویلی کی تعمیر مکمل نہیں ہو پا رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ سوچتا کہ شاید وہ کبھی بھی اس گرداب سے نہیں نکل پائے گا۔ اگر وہ اسی طرح پیسے بھیجتا رہا تو اس کے گھر والوں کے مطالبات کبھی ختم نہیں ہوں گے لیکن جس کام میں ہاتھ ڈال چکا تھا، اسے ادھورا بھی نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔

انہی دنوں اس کی ملاقات مارتھا سے ہوئی۔ وہ اس کے مالک کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اس کا باپ اسٹیورٹ بیمار رہنے لگا تھا اور حیدر زماں نے ہی اسٹور کا سارا کام سنبھال رکھا تھا۔ اسٹیورٹ کبھی کبھار آتا ورنہ ٹیلی فون پر حیدر سے بات کر لیا کرتا۔ مارتھا یونیورسٹی کی اسٹوڈنٹ تھی اور اپنی پڑھائی کی وجہ سے اسٹور کے لیے وقت نہیں نکال سکتی تھی۔ اسٹیورٹ اور مارتھا دونوں ہی حیدر کے کام سے بہت مطمئن تھے اور اس پر پورا بھروسا کرتے تھے۔ اسٹیورٹ کے انتقال کے بعد مارتھا بالکل تنہا رہ گئی۔ اس نے حیدر سے درخواست کی کہ وہ مکمل طور پر اسٹور کی ذمّے داری سنبھال لے اور ساتھ ہی اس نے حیدر کو منافع میں پچیس فیصد حصہ دینے کی پیشکش بھی کر دی۔ حیدر کے لیے یہ ایک غیر متوقع آفر تھی۔ چنانچہ اس نے پہلے سے زیادہ دلجمعی کے ساتھ کام کرنا شروع کر دیا۔

مارتھا اور حیدر تیزی سے ایک دوسرے کے قریب آئے جس کا نتیجہ شادی کی صورت میں نکلا۔ مارتھا کو حساب کتاب سے کوئی دلچسپی نہیں تھی چنانچہ اس نے اسٹور کے ساتھ ساتھ اپنی جائداد کے معاملات اور دیگر امور بھی حیدر کے سپرد کر دیے اور خود بے فکری کی زندگی گزارنے لگی۔ حیدر بنیادی طور پر ایمان دار شخص تھا۔ چنانچہ اس نے مختارِ کل ہونے کے باوجود اپنے طے شدہ حصے کے علاوہ کبھی ایک پیسا زیادہ نہیں لیا۔ مارتھا نے کئی بار کہا کہ وہ اپنے بیٹے کو بلا لے۔ وہ اس کی دیکھ بھال اور پرورش کی ذمّے داری قبول کرنے کے لیے تیار ہے لیکن حیدر اپنے بیٹے کو مغربی ماحول سے دور رکھنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ظفر پاکستان میں اپنی تعلیم مکمل کرے پھر وہ اسے اپنے پاس بلا لے گا۔

حویلی کی تعمیر مکمل ہو چکی تھی۔ حیدر پاکستان جانے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ مسکان کی پیدائش کے سبب اسے اپنا ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ حیدر کا کام بہت بڑھ گیا تھا۔ اسے لمحہ بھر کو سر اٹھانے کی فرصت نہیں تھی۔ مارتھا بھی اس کی مصروفیت سے بیزار رہنے لگی۔ وہ چاہتی تھی کہ حیدر کچھ وقت اپنی فیملی کو بھی دے۔ وہ خود بھی یہی چاہتا تھا لیکن کوشش کے باوجود ایسا نہ ہو سکا۔ مارتھا اور حیدر کے درمیان فاصلے بڑھتے گئے۔ اسی کشمکش میں چار پانچ سال گزر گئے۔ حیدر کو باپ کے مرنے کی اطلاع ملی تو وہ تڑپ اٹھا۔ اس نے فوراً ہی پاکستان جانے کا پروگرام بنا لیا۔ مارتھا اسے روک نہیں سکتی تھی چنانچہ خود بھی اس کے ساتھ آنے پر تیار ہو گئی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں حیدر اپنے گھر والوں کی باتوں میں آ کر یا بیٹے کی خاطر وہیں رک جانے کا فیصلہ نہ کر لے۔

حیدر کا خیال تھا کہ پاکستان میں اس کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا جائے گا لیکن اسے یوں لگا جیسے سب لوگوں بالخصوص گل زماں کو اس کی آمد ناگوار گزر رہی ہے۔ بہت جلد اسے اس رویے کی وجہ بھی معلوم ہو گئی۔ ماں اس لیے ناراض تھی کہ حیدر نے ایک فرنگن سے شادی کیوں کی۔ گل زماں کا موڈ اس لیے خراب تھا کہ حیدر نے پاکستان آ کر بلاوجہ ہی اتنا خرچہ کیا۔ یہ پیسے کسی اور کام میں آ سکتے تھے۔ ابھی حویلی کی تزئین و آرائش باقی تھی اور حیدر پہلے کی طرح پیسے نہیں بھیج رہا تھا۔ اس نے حیدر کو یہ بھی جتا دیا کہ زمین سے اتنی آمدنی نہیں ہو رہی جس سے وہ گھر چلانے کے ساتھ ساتھ ظفر کی پرورش کے اخراجات بھی برداشت کر سکے۔ ظفر کو دیکھ کر بھی اسے خاصی مایوسی ہوئی۔ وہ اسے خوف زدہ اور سہما سا نظر آیا۔ وہ سمجھ گیا کہ ظفر پر توجہ دینے والا کوئی نہیں اور وہ ایک خودرو پودے کی طرح [illegible] رہا ہے۔ اس نے ظفر کو ساتھ لے جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو ماں سمیت سبھی نے اس کی مخالفت کی۔ گل زماں اس میں پیش پیش تھا۔ ماں نے تو صاف صاف کہہ دیا کہ وہ کبھی اپنے پوتے کو فرنگن کے حوالے نہیں کرے گی۔ چنانچہ گل زماں سے مشورہ کرنے کے بعد حیدر نے بیٹے کو مری کے بورڈنگ اسکول میں داخل کرا دیا۔ گل زماں نے وعدہ کیا کہ وہ ہر ہفتے اس سے ملنے جایا کرے گا اور اس کی خیریت سے بھائی کو مطلع کرتا رہے گا۔ مارتھا کو ان معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اس ماحول میں اپنے آپ کو اجنبی محسوس کر رہی تھی۔ سب سے بڑا مسئلہ زبان کا تھا۔ انگریزی تو دور کی بات، وہاں کسی کو ڈھنگ سے اردو بولنی بھی نہیں آتی تھی۔ گو کہ حویلی میں اس کے آرام و آسائش کا بہت خیال رکھا جا رہا تھا لیکن وہ اس ماحول میں اپنے آپ کو مس فٹ سمجھ رہی تھی۔ رہی سہی کسر مسکان کی بیماری نے پوری کر دی۔ جیسے ہی اس کی طبیعت بحال ہوئی، مارتھا نے واپس جانے کی ضد شروع کر دی۔ چنانچہ مختصر قیام کے بعد حیدر واپس انگلینڈ چلا گیا۔

مارتھا اور حیدر کے درمیان خلیج بڑھتی گئی۔ ان دونوں

کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ مارتھا کو گھومنے پھرنے اور پارٹیاں اٹینڈ کرنے کا شوق تھا جبکہ حیدر اپنے کام میں مگن رہنے والا سنجیدہ مزاج شخص تھا اور اسے ان فضول مشاغل سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ پہلے تو مارتھا نے اسے اپنے راستے پر لانے کی کوشش کی لیکن جب وہ قابو نہ آیا تو اس نے حیدر کے بغیر ہی اپنے لیے دلچسپیاں تلاش کر لیں۔ حیدر کے لیے اس کی سرگرمیاں ناقابلِ برداشت تھیں۔ اس نے پہلے ڈھکے چھپے الفاظ میں مارتھا کو ان حرکتوں سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن جب وہ باز نہ آئی تو ان کے درمیان آئے دن جھگڑا ہونے لگا۔ کئی بار حیدر نے مارتھا سے علیحدگی کے بارے میں سوچا لیکن مسکان کی وجہ سے کوئی انتہائی قدم اٹھانے سے باز رہا۔ وہ بچی کو ماں کی چھاؤں سے محروم رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ مسکان بڑی ہو رہی تھی اور ماں باپ کے درمیان ہونے والی تلخیوں کو محسوس کر سکتی تھی۔ اسے کبھی کبھی اپنے باپ پر بڑا ترس آتا جو اتنی زیادہ محنت کرنے کے باوجود گھریلو سکون سے محروم تھا۔ اس کا ننھا سا ذہن جب بھی اس بارے میں سوچتا تو اسے اپنی ماں ہی قصور وار نظر آتی جس کے نتیجے میں وہ باپ سے زیادہ قریب ہوتی گئی۔

مسکان اب سولہ برس کی ہو چکی تھی اور حیدر کا خیال تھا کہ اب اسے ظفر کو بھی اپنے پاس بلا لینا چاہیے [illegible] مطمئن نہیں تھا۔ وہ [illegible] کر چکا تھا اور حیدر چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا انگلینڈ میں رہ کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرے۔ پاکستان میں رہ کر وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ گل زماں میں اتنی اہلیت نہیں تھی کہ وہ تعلیم اور کیریئر کے سلسلے میں بھتیجے کی راہنمائی کر سکے لیکن جب اس سلسلے میں اس نے گل زماں سے بات کی تو اس کا جواب سن کر اسے خاصی حیرت ہوئی۔ گل زماں کا کہنا تھا کہ ظفر انگلینڈ آنے کے لیے تیار نہیں ہے اور اسے مزید پڑھائی سے بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ لہٰذا اس نے اپنے کچھ جاننے والوں سے کہہ دیا ہے کہ وہ ظفر کے لیے پاکستان میں ہی کوئی ملازمت تلاش کریں۔

گل زماں کا جواب سن کر حیدر زماں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کی برسوں کی کمائی رائیگاں چلی گئی ہو۔ اس نے یہ بن باس اپنے اور بچوں کے بہتر مستقبل کی خاطر لیا تھا لیکن پیسے کمانے کی دھن میں یہ بھول گیا کہ اولاد نظروں کے سامنے نہ رہے تو اسے گمراہ ہونے یا بگڑنے میں دیر نہیں لگتی۔ اس سے بڑی غلطی یہ ہوئی کہ اس نے ظفر کو گل زماں کی سرپرستی میں دے دیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ نیم خواندہ اور دقیانوسی سوچ رکھنے والا شخص ہے۔ وہ ظفر کی نگرانی اور حفاظت تو کر سکتا ہے لیکن تربیت نہیں۔ گل زماں کی باتیں سننے کے بعد اسے اپنے بیٹے کی ذہنی حالت کے بارے میں بھی شبہ ہونے لگا۔ لوگ تو باہر کے ملکوں میں تعلیم حاصل کرنے اور رہائش اختیار کرنے کے لیے ترستے ہیں اور یہ کیسا لڑکا ہے کہ تمام مواقع موجود ہونے کے بعد بھی اپنا گاؤں چھوڑنے پر تیار نہیں۔ کہیں گل زماں نے اپنی طرف سے تو یہ بات نہیں بنائی۔ ممکن ہے کہ وہ ظفر کو انگلینڈ بھیجنا نہ چاہ رہا ہو۔ لیکن وہ ایسا کیوں چاہے گا؟ اس سوال کا جواب حیدر زماں جیسے شخص کے لیے تلاش کرنا آسان نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ جلد ہی پاکستان جائے گا اور ہر قیمت پر ظفر کو اپنے ساتھ لے کر آئے گا۔

ایک دن مارتھا نے اسے مطلع کیا کہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ ورلڈ ٹور پر جا رہی ہے اور اس کے لیے اسے ایک لمبی رقم کی ضرورت ہے۔ حیدر جانتا تھا کہ وہ خاصی دولت مند ہے اور اس کے پاس اس اسٹور کے علاوہ بھی کئی اثاثے ہیں لیکن وہ جس بیدردی سے پیسا لٹاتی تھی، اس کے لیے قارون کا خزانہ بھی ناکافی تھا۔ حیدر نے پوچھا کہ وہ اس سلسلے میں اس کی کیا مدد کر سکتا ہے۔ اس پر مارتھا نے کہا کہ وہ یہ اسٹور فروخت کرنا چاہ رہی ہے۔ یہ سنتے ہی حیدر کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ یہ اسٹور ہی اس کی آمدنی کا واحد ذریعہ تھا۔ اس کے فروخت ہو جانے کی صورت میں اس کے لیے کئی مسائل کھڑے ہو سکتے تھے۔ نئی ملازمت تلاش کرنا یا اپنا کاروبار شروع کرنا اتنا آسان نہیں تھا اور نہ ہی دونوں صورتوں میں اسے فوری طور پر اتنی آمدنی ہو سکتی تھی جس کا وہ عادی ہو چکا تھا۔ اس مشکل سے نکلنے کا صرف ایک ہی راستہ تھا کہ وہ مارتھا سے یہ اسٹور خود ہی خرید لے۔ اس نے اچھی خاصی رقم پس انداز کر رکھی تھی اور اگر کچھ کمی پڑتی تو وہ مارتھا سے اس کی ادائیگی کے لیے مہلت بھی لے سکتا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے مارتھا کے سامنے یہ تجویز رکھی تو وہ فوراً مان گئی۔ اسے پیسوں سے غرض تھی، چاہے خریدار کوئی بھی ہو۔ یہ ڈیل بڑی آسانی سے طے پا گئی۔ مارتھا نے رقم کا چیک ہاتھ میں پکڑا۔ بچی کو الوداعی بوسہ دیا اور دنیا کی سیاحت پر روانہ ہو گئی۔ جاتے وقت اس نے حیدر اور مسکان پر یہ احسان ضرور کیا کہ وہ اس سفر کے دوران ان سے رابطہ رکھے گی۔

اسٹور کا مالک اور مختار بننے کے بعد حیدر کو ایک بار پھر پاکستان روانگی ملتوی کرنا پڑی۔ گو کہ پہلے بھی وہی اس کا انتظام چلا رہا تھا لیکن مارتھا کی وجہ سے اسے بہت سہولت تھی۔ کم از کم وہ اس کی غیر موجودگی میں اسٹور کی دیکھ بھال کر سکتی

www.pkdigest.com

تھی مگر اب تو سب کچھ اسے خود ہی سنبھالنا تھا۔ اسٹور کی خریداری میں اس کی اچھی خاصی رقم خرچ ہو گئی تھی لہٰذا اس وقت کسی قسم کی بے پروائی یا کوتاہی اس کے لیے نقصان کا سبب بن سکتی تھی۔ اس نے گل زماں سے کہا کہ وہ ایک بار پھر ظفر کو انگلینڈ آنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کرے لیکن گل زماں نے یہی جواب دیا کہ وہ کئی مرتبہ اسے سمجھا چکا ہے لیکن ظفر ٹس سے مس نہیں ہو رہا۔ حیدر نے مجبور ہو کر چپ سادھ لی۔ اب اسے اس وقت کا انتظار تھا جب وہ پاکستان جانے کے قابل ہو سکے گا۔

مارتھا کے جانے کے بعد وہ اپنے آپ کو کافی اداس اور تنہا محسوس کر رہا تھا گو کہ اس کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ اس کے باوجود اس کی موجودگی سے اسے کافی ڈھارس تھی۔ اسی وجہ سے اس کی طبیعت خراب رہنے لگی پھر اسے مسکان کی بھی فکر لگی ہوئی تھی۔ وہ بڑی ہو گئی تھی اور حیدر چاہتا تھا کہ جلد از جلد اس کی شادی کر دی جائے۔ وہ اپنی ماں سے کافی مختلف تھی اور ابھی تک اس نے پر پرزے نہیں نکالے تھے۔ لیکن کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ حیدر صبح سے شام تک اسٹور میں مصروف رہتا اور اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ بیٹی کی نگرانی کر سکے۔ مسلسل محنت، بیٹے سے دوری، بیوی کی بے رخی اور بیٹی کی شادی کی فکر نے اس کے اعصاب کو بری طرح متاثر کیا۔ جب اسے پہلا اٹیک ہوا تو یوں لگا کہ وہ زیادہ عرصے زندہ نہ رہ سکے گا۔ اس نے مسکان کو نصیحت کی کہ اس کے مرنے کے بعد وہ اسٹور سمیت تمام اثاثے فروخت کر کے پاکستان چلی جائے اور اپنے چچا کے پاس رہے۔ اس نے مسکان کو راولپنڈی میں مقیم اپنے ایک وکیل دوست یزدانی کا پتا اور فون نمبر بھی دیا کہ وہ ان سے ضرور رابطے میں رہے۔

مانچسٹر میں حیدر زماں کے دوستوں کا حلقہ کافی وسیع تھا۔ وہ مہینے میں ایک دو مرتبہ پارٹی یا ڈنر کے بہانے مل بیٹھنے کا اہتمام کر لیا کرتے تھے۔ مسکان بھی ان تقاریب میں شریک ہوتی تھی۔ ایسی ہی ایک تقریب میں اس کی ملاقات راحیل سے ہوئی جو لندن کی کسی فرم میں چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ تھا اور مانچسٹر میں اپنے والدین سے ملنے آتا رہتا تھا۔ اس کے والد صدیقی صاحب پراپرٹی کے بزنس سے وابستہ تھے۔ اس کے علاوہ وہ برطانیہ میں مقیم غیر قانونی تارکین وطن کے مسائل بھی حل کیا کرتے تھے۔ راحیل کی بہن زہبی تقریباً مسکان ہی کی ہم عمر تھی۔ اس لیے ان دونوں کے درمیان بہت جلد بے تکلفی ہو گئی۔ حیدر کی بیماری کے دنوں میں راحیل اور زہبی نے مسکان کا بہت ساتھ دیا۔ حیدر کی طبیعت بگڑتی چلی جا رہی تھی۔ جب اسے دوسرا دورہ پڑا تو مسکان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اس نے مارتھا اور گل زماں سے رابطہ کر کے انہیں باپ کی بیماری سے مطلع کیا لیکن دونوں جانب سے ملنے والا رسپانس اس کے لیے حد درجہ غیر متوقع تھا۔ مارتھا نے سرسری انداز میں اس کی بات سنی اور رسماً بولی۔ ”ڈیئر چائلڈ! اس میں اتنا پریشان ہونے والی کیا بات ہے؟ دعا کرو۔ میں بھی اس کی جلد صحت یابی کے لیے دعا گو ہوں۔“

گل زماں نے بھی کچھ ایسا ہی عمل ظاہر کیا تھا۔ مسکان جانتی تھی کہ اس وقت اس کے باپ کو اپنوں کی ضرورت ہے۔ مارتھا سے مایوس ہو جانے کے بعد اس نے گل زماں سے کہا کہ وہ اگر ظفر کو ساتھ لے کر آ جائیں تو وہ ان دونوں کے لیے ٹکٹ کا بندوبست کر سکتی ہے۔ گل زماں نے تو صحت کی خرابی کا عذر کرتے ہوئے معذرت کر لی، البتہ مسکان کا دل رکھنے کے لیے اتنا ضرور کہہ دیا کہ وہ ظفر کو بھیجنے کی کوشش کرے گا لیکن اس کا یہ وعدہ بھی کھوکھلا ثابت ہوا۔ تیسرا دورہ جان لیوا ثابت ہوا اور حیدر زماں اپنی بیٹی مسکان کو روتا ہوا چھوڑ کر آخری سفر پر روانہ ہو گیا۔ آخری وقت تک اس کی نگاہیں بیوی اور بیٹے کے انتظار میں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔

حیدر کے انتقال کے بعد مسکان کو پہلی بار اس دنیا کی حقیقت معلوم ہوئی ورنہ اس سے پہلے تو وہ زندگی کو ایک کھیل سمجھ کر گزار رہی تھی۔ مارتھا تو غیر تھی اس لیے اس کے طرز عمل پر اسے کوئی افسوس نہیں ہوا۔ البتہ اس نے بیٹی کو ایک مخلصانہ مشورہ ضرور دیا کہ اسے باپ کے مرنے کے بعد یقیناً تنہائی محسوس ہو رہی ہو گی لہٰذا اس خلا کو پورا کرنے کے لیے وہ کسی پاکستانی لڑکے سے شادی کر لے۔ گل زماں نے بھائی کے مرنے پر آنسو تو ضرور بہائے لیکن بھتیجی کے مستقبل کے بارے میں کوئی مشورہ نہیں دیا۔ مسکان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے اور کہاں جائے؟ حیدر زماں اس کے لیے بہت کچھ چھوڑ کر مرا تھا۔ اتنا کہ وہ ساری عمر بیٹھ کر کھاتی، تب بھی اسے کوئی کمی نہ ہوتی۔ اس کا سب سے بڑا اثاثہ وہ اسٹور تھا جس سے ہزاروں پاؤنڈ ماہانہ کی آمدنی ہوتی تھی۔ حیدر زماں نے پراپرٹی میں بھی بہت انویسٹ کیا ہوا تھا۔ اس کے انتقال کے ایک ہفتے بعد وکیل روز بیری آیا اور اس نے مسکان کو مطلع کیا کہ حیدر زماں کی وصیت کے مطابق اس کے تمام اثاثے مسکان اور ظفر میں برابر برابر تقسیم ہوں گے لیکن اس کے لیے ظفر کی انگلینڈ میں موجودگی ضروری ہے۔ اس وقت تک مسکان ہی ان اثاثوں کی مختار کل ہو گی۔ وکیل نے ایک

سربمہر لفافہ بھی اس کے حوالے کیا۔ اس خط میں حیدر زماں نے مسکان کو تاکید کی تھی کہ وہ پہلی فرصت میں ظفر کو انگلینڈ بلانے کی کوشش کرے اور اگر اس کے آنے میں کوئی مسئلہ ہو تو وہ ظفر کو لانے کے لیے خود پاکستان چلی جائے۔ حیدر زماں کی یہ وصیت تھی کہ مسکان شادی ہونے تک ظفر کے ساتھ ہی رہے گی اور اس کی تعلیم و تربیت میں اس سے جو کوتاہی سرزد ہوئی ہے، اس کا ازالہ کرے گی۔

مسکان نے باپ کی وصیت سے گل زماں کو آگاہ کیا لیکن اس نے ظفر کو انگلینڈ بھیجنے سے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ یہاں پاکستان میں اس کا علاج ہو رہا ہے اور اس حالت میں اسے سات سمندر پار بھیجنا ممکن نہیں۔ مسکان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کا چچا آخر کیوں ظفر کو انگلینڈ بھیجنے پر تیار نہیں ہوتا۔ یہ کہانی کئی برسوں سے چل رہی تھی۔ حیدر زماں کی مصروفیت اور عدم دلچسپی کی وجہ سے ہی گل زماں اپنی بات منوانے میں کامیاب ہو جاتا تھا لیکن اس بار مسکان نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ ظفر کو اپنے ساتھ لے کر ضرور آئے گی چاہے چچا گل زماں کتنی ہی مخالفت کیوں نہ کرے۔ سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں اسٹور کی دیکھ بھال کون کرتا۔ ویسے تو منیجر اور دوسرے اسٹاف نے کام سنبھال رکھا تھا لیکن ان کی نگرانی بھی ضروری تھی۔ یہ ذمے داری راحیل نے اپنے سر لی اور مسکان سے کہا کہ وہ بے فکر ہو کر پاکستان جائے۔ وہ اس کی غیر موجودگی میں معاملات دیکھ لے گا۔

☆☆☆

گزرے ہوئے واقعات ایک فلم کی طرح اس کے ذہن کی اسکرین پر چل رہے تھے۔ ان میں سے کچھ باتیں اسے حیدر زماں نے بتائی تھیں اور بہت کچھ وہ ہوش سنبھالنے کے بعد سے ہی دیکھتی اور سنتی آ رہی تھی۔ حیدر زماں کی کہانی میں کوئی گلیمر نہیں تھا۔ یہ ایک عام پاکستانی کی داستان تھی جو بہتر زندگی گزارنے کی امید میں اپنا گھر بار، بیوی بچے اور ملک سب کچھ چھوڑ کر دیارِ غیر میں پناہ لیتا ہے اور پیسا کمانے کی دھن میں اپنے کئی فرائض بھول جاتا ہے۔ حیدر کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اسے آخر وقت تک یہ پچھتاوا رہا کہ اس نے اپنے بیٹے کو پاکستان میں چھوڑ کر بہت بڑی غلطی کی تھی۔ دوسری غلطی یہ ہوئی کہ وہ ظفر کو بھائی کے حوالے کر کے مطمئن ہو گیا اور یہ بھی نہ سوچا کہ گل زماں جیسے نیم خواندہ شخص کو ظفر کی پڑھائی سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ تیسری غلطی اس نے یہ کی کہ کئی سالوں تک وہ پاکستان ہی نہیں آیا اور اسے قطعاً یہ خیال نہیں آیا کہ ظفر کی تعلیم کیسی چل رہی ہے۔ گل زماں نے جو بتا دیا، اس پر یقین کر لیا اور جب بیٹے کو پاس بلانے کا خیال آیا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ راستے بھر مسکان کا ذہن انہی خطوط پر سوچتا رہا کہ آخر ظفر کو انگلینڈ نہ بھیجنے میں کیا مصلحت تھی؟ بیماری والی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ لوگ تو علاج کے لیے بیرون ملک جاتے ہیں لیکن یہاں الٹی گنگا بہہ رہی تھی۔ یہی وہ موڑ تھا جہاں سے سسپنس نے جنم لینا شروع کیا... اور مسکان اس قسم کے معاملات میں بہت دلچسپی لیا کرتی تھی لیکن فی الحال تو اسے اس بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ ظفر اسے لینے ائرپورٹ کیوں نہیں آیا؟ یہ سوال بار بار اس کے دماغ میں ہتھوڑے کی طرح بج رہا تھا۔ پھر اس سے ضبط نہ ہو سکا اور وہ بے اختیار بول پڑی۔ ”ظفر کیوں نہیں آیا؟ اس کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“

”خود ہی چل کر دیکھ لینا۔“ عادل نے کھڑکی سے باہر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”ویسے میرا مشورہ ہے کہ فی الحال اس سے دور ہی رہنا بہتر ہو گا۔ وہ اتنی جلدی اجنبیوں سے بے تکلف نہیں ہوتا۔“

مسکان نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور حیرت سے بولی۔ ”میں کوئی اجنبی نہیں بلکہ اس کی بہن ہوں۔“

”تم دونوں نے ایک دوسرے کو کبھی نہیں دیکھا... ایسے ہی لوگوں کے لیے اجنبی کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔“

”یہ محض آپ کا خیال ہے مگر میرے دل میں اس کے لیے وہی جذبات ہیں جو ایک بہن کے اپنے بھائی کے لیے ہو سکتے ہیں۔“

”میں غیر ضروری بحث کرنے کا عادی نہیں ہوں۔“ عادل نے درشت لہجے میں کہا۔ ”گھر پہنچ کر جب اس سے ملو گی تو تمہیں خود ہی میری بات کا یقین آ جائے گا۔“

مسکان نے بھی خاموشی اختیار کرنے میں ہی بہتری سمجھی۔ ویسے بھی عادل اسے ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔ عام طور پر لڑکیوں کے ذہن میں کزن کا جو رومانی تصور ہوتا ہے، وہ اس سے بالکل مختلف تھا۔ مسکان پہلی بار اپنے خاندان کے لوگوں سے ملنے آئی تھی۔ اس کے ذہن میں حویلی کا وہی نقشہ تھا جو عام طور پر خواتین کے رسالوں میں بیان کیا جاتا ہے۔ وسیع و عریض کمرے، کشادہ دالان، برآمدے کے تخت پر بیٹھی دادی اماں اور ان کے اردگرد بہوؤں، بیٹیوں، نواسوں اور پوتیوں کا ہجوم۔ شرارتیں کرنے والے شہزادوں جیسے پوتے اور نواسے لیکن عادل کو دیکھ کر اس کے سارے تصورات چکنا چور ہو گئے اور اسے یقین ہو گیا کہ حویلی میں بھی اسی طرح کی

سردار روحیں ڈیرا جمائے بیٹھی ہوں گی۔ اس کی معلومات کے مطابق حویلی میں صرف چاچا، چاچی، عادل، اس کی دو بہنیں اور ظفر رہتے تھے۔ وہ سوچنے لگی کہ ڈیڈی نے بلاوجہ ہی اتنا پیسا لگا دیا۔ چاچا اور چاچی وفات پا جائیں گے۔ ان کی دونوں بیٹیوں کا بیاہ ہو جائے گا۔ وہ ظفر کو لے کر انگلینڈ چلی جائے گی تو پھر باقی کون بچا؟ صرف عادل۔ وہ اتنی بڑی حویلی میں دندناتا پھرے گا۔ اس نے کن انکھیوں سے عادل کو دیکھا۔ یہ شخص کسی بھی اعتبار سے اس حویلی میں رہنے کا اہل نظر نہیں آتا تھا۔

کئی گھنٹے کی طویل مسافت طے کرنے کے بعد وہ بالآخر اپنے گاؤں پہنچ ہی گئے۔ سارے راستے وہ خوب صورت نظاروں سے لطف اندوز ہوتی آئی تھی۔ اس کا گاؤں بھی ایک خوب صورت وادی کے دامن میں واقع تھا۔ اسے یہ جگہ بہت اچھی لگی۔ ان کی حویلی گاؤں سے الگ تھلگ آبادی سے کچھ فاصلے پر تھی۔ ڈرائیور نے گیٹ کے باہر گاڑی روک کر زور زور سے ہارن بجانا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ کھلا۔ مسکان نے دیکھا کہ ایک ضعیف العمر شخص اپنے دونوں ہاتھ کمر پر رکھے گاڑی کو غور سے دیکھ رہا ہے۔ ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھائی تو وہ بھی گیٹ بند کر کے تیزی سے چلتا ہوا کار تک آیا اور کار کی ڈگی سے مسکان کا سامان نکالنے لگا۔

ہارن کی آواز سن کر چاچا گل زماں بھی باہر آ گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر مسکان کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا اور گلوگیر آواز میں بولا۔

''بالکل... اپنے باپ کی تصویر ہو۔ وہ بھی جوانی میں ایسا ہی خوب صورت ہوا کرتا تھا۔''

مسکان نے اپنا سر اس کے سینے سے نکالا اور بولی۔ ''ڈیڈی ہر وقت آپ ہی کی باتیں کیا کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد آپ کے ساتھ ہی رہیں۔ اگر ظفر وہاں آ جاتا تو شاید وہ بہت پہلے اپنی یہ خواہش پوری کر چکے ہوتے... لیکن ظفر ہے کہاں؟ نظر نہیں آ رہا؟''

گل زماں نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ''وہ اپنے کمرے میں ہے۔ اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ تم اندر چلو، باقی سب لوگ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔''

مسکان کی کچھ عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ جس بھائی سے ملنے کی خاطر وہ سات سمندر پار سے آئی تھی، وہ اب بھی اس کی نظروں سے اوجھل تھا۔ ایسی بھی کیا بیماری کہ وہ بہن کو دیکھنے کے لیے کمرے سے بھی باہر نہیں آ سکتا۔ ضرور کوئی گڑبڑ ہے لیکن اس وقت وہ کسی غیر ضروری بحث میں نہیں الجھنا چاہتی تھی۔ حقیقت خود ہی سامنے آ جائے گی۔ اس لیے وہ کچھ کہے بنا اندر چلی آئی۔ چچی نے اسے دیکھ کر کوئی خاص گرم جوشی نہیں دکھائی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اسے مسکان کا آنا اچھا نہ لگا ہو۔ دونوں بیٹیوں ثمینہ اور فریدہ کے تاثرات بھی اس سے مختلف نہ تھے۔ بہرحال، ان کے انداز میں سرد مہری نہیں تھی۔ مسکان ان تینوں سے باری باری گلے ملی۔ چاچی نے اس کی خیر خیریت پوچھنے کے بجائے پہلا تیر چھوڑا۔

''بھائی حیدر تو ایسا گیا کہ پلٹ کر خبر ہی نہ لی۔ ہمارا نہیں تو کم از کم اپنی اولاد کا ہی خیال کر لیتا... لیکن اسے تو اس موئی فرنگن کے چونچلوں سے ہی فرصت نہیں ملی۔''

مسکان بھی کسی کا ادھار نہیں رکھتی تھی۔ اس نے فوراً حساب برابر کرتے ہوئے کہا۔ ''اس میں ڈیڈی کا کوئی قصور نہیں۔ وہ تو کافی عرصے سے بھائی کو اپنے پاس بلانا چاہ رہے تھے لیکن آپ لوگوں نے ہی ان کی یہ خواہش پوری نہ ہونے دی۔''

''ہاں ہاں تو کیسے بھیج دیتے؟ وہ فرنگن اس کی زندگی عذاب کر دیتی۔ یہاں کم از کم وہ اپنوں میں تو رہ رہا ہے۔''

مسکان نے اس جاہل عورت کے منہ لگنا مناسب نہ سمجھا اور رسان سے بولی۔ ''جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب پرانی باتوں کو دہرانے سے کیا فائدہ؟ میں کچھ دیر آرام کرنا چاہوں گی۔ ظفر اٹھ جائے تو مجھے بلوا لیجیے گا۔''

ثمینہ اس کے قریب آ کر بولی۔ ''چلیں میں نے آپ کا کمرا تیار کر دیا ہے۔ آپ فریش ہو جائیں، میں چائے بناتی ہوں۔''

مسکان کو اوپر کی منزل پر کمرا دیا گیا جس کی کھڑکیاں باہر کی طرف کھلتی تھیں اور وہاں سے گاؤں کا منظر صاف نظر آتا تھا۔ وہ اپنا سامان لے کر خود ہی اوپر آ گئی۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ اتنی بڑی حویلی میں کوئی ملازم نہیں ہے۔ پھر اسے یاد آیا کہ ڈیڈی اکثر چاچا گل زماں کی مالی حالت کا ذکر کیا کرتے تھے۔ مسکان کو بھی یہاں قدم رکھتے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ چاچا گل زماں کی شان و شوکت اور دبدبہ صرف اس حویلی کا ہی مرہون منت تھا ورنہ اندر سے وہ بالکل کھوکھلے تھے۔ اس کا واحد ذریعہ آمدنی زمین کا وہ ٹکڑا تھا جس پر سال میں دو فصلیں کاشت کر کے اسے کچھ رقم مل جاتی تھی۔ عادل کے بارے میں بھی یہی معلوم ہوا تھا کہ وہ کوئی کام دھندا نہیں کرتا اور باپ کے پیسوں پر موج اڑاتا ہے۔ اس کے شاہانہ انداز دیکھ کر یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ وہ گل زماں کی کمائی پر عیش کر رہا ہے۔ یقیناً اس کے کچھ اور ذرائع بھی تھے جن کے

بارے میں کسی کو علم نہیں تھا۔ اس کی سرگرمیاں بھی بڑی مشکوک اور پُراسرار قسم کی تھیں۔ وہ کئی کئی دن کے لیے گھر سے غائب ہو جاتا اور بہانہ یہی بناتا کہ دوستوں کے ساتھ شکار کھیلنے یا کہیں گھومنے گیا ہے۔ اس کے راولپنڈی میں ایک ٹریول ایجنٹ سے بھی روابط تھے جو لوگوں کو ملک سے باہر بھیجتا تھا۔ عادل نے اس کے ذریعے اپنے گاؤں کے چند لوگوں کو بیرون ملک بھیجا تھا جس کے بعد سے اس کی دھاک اور زیادہ بیٹھ گئی تھی۔ گاؤں کے لوگ پہلے اس کی آوارہ گردی اور بدمعاشی سے ڈرتے تھے لیکن بعد میں وہ اس کی عزت کرنے لگے اور باہر جانے کا خواہش مند ہر شخص اس کی چاپلوسی میں لگا رہتا۔ لیکن وہ بھی صرف اس کام میں ہاتھ ڈالتا جہاں سے اسے کچھ ملنے کی توقع ہوتی۔ بظاہر اس کا طریقہ کار بہت سیدھا سادہ تھا۔ وہ گاہک کو لے جا کر ٹریول ایجنٹ سے ملواتا اور اپنا کمیشن کھرا کر کے الگ ہو جاتا۔ گاؤں کے لوگوں پر اس نے یہی ظاہر کر رکھا تھا کہ وہ یہ سب کچھ ان کی ہمدردی میں کر رہا ہے اور اس کام سے اس کا کوئی مالی مفاد وابستہ نہیں۔ اس کے اسمگلروں سے بھی روابط تھے اور وہ مختلف اشیا کی اسمگلنگ میں مڈل مین کا کردار ادا کرتا تھا۔ اس کی یہ سرگرمیاں لوگوں کی نظروں سے اوجھل تھیں لیکن گل زماں کو کچھ شبہ ہو گیا تھا۔ اس نے اس بارے میں پوچھا تو وہ باپ پر ہی چڑھ دوڑا۔ ''تم نے ساری عمر تنہیں ترسا کر اس حال پہنچا دیا۔ اب مجھے آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کا موقع ملا ہے تو میرا راستہ کیوں روک رہے ہو؟''

''میں راستہ نہیں روک رہا۔ صرف تمہاری سرگرمیوں کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔''

''میں اپنا ہر کام خاموشی سے کرنا چاہتا ہوں۔ ڈھنڈورا پیٹنے کی عادت نہیں ہے مجھے۔ بہتر ہوگا کہ آئندہ مجھ سے کوئی پوچھ گچھ نہ کی جائے۔ میں اپنے ہر فعل کا خود ذمے دار ہوں۔''

یہ ٹکا سا جواب سن کر گل زماں کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ اس بارے میں مزید کوئی بات کرے۔ وہ اپنے بیٹے کے مزاج کو اچھی طرح جانتا تھا جو حد درجہ بدتمیز، بدمزاج، اکھڑ، خودسر اور ضدی واقع ہوا تھا۔ ہر ایک پر حکم چلانا اور اپنی بات منوانا اس کی سرشت میں شامل تھا اور اسے اس مقام تک پہنچانے میں اس کی ماں کا بڑا ہاتھ تھا۔ اس کے حد درجہ لاڈ پیار نے عادل کو دو کوڑی کا کر دیا تھا لیکن وہ اسے شہزادوں سے بڑھ کر جانتی تھی۔ اور جب وہ بن ٹھن کر گھر سے باہر نکلتا تو اسے یوں رخصت کرتی جیسے وہ کوئی قلعہ فتح کرنے جا رہا ہو۔ گل زماں نے اس کے معاملے میں بولنا چھوڑ دیا تھا اور ہر وقت اس کی سلامتی اور خیریت کی دعائیں مانگتا رہتا تھا۔ ویسے بھی عادل جو کماتا، وہ اپنے اوپر ہی خرچ کر دیتا۔ گھر میں ایک پیسا بھی نہ دیتا۔ اسی وجہ سے مالی مشکلات بڑھتی جا رہی تھیں۔ حیدر زماں اپنی زندگی میں اس کی کچھ نہ کچھ مدد کرتا رہتا تھا جس سے اس کا بھرم قائم تھا لیکن حیدر کے انتقال کے بعد یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ زمین سے ہونے والی محدود آمدنی میں کس طرح گزارہ کرے گا؟ ابھی اسے دونوں بیٹیوں کی شادیاں بھی کرنی تھیں۔ اوپر سے مسکان بھی آن ٹپکی تھی۔

مسکان کو جس کمرے میں ٹھہرایا گیا، اس کی حالت بھی کافی خستہ تھی۔ دیواروں، دروازوں اور کھڑکیوں کی حالت بتا رہی تھی کہ ان پر عرصہ دراز سے رنگ و روغن نہیں ہوا ہے۔ ایک معمولی سا بیڈ اور چھت پر لگے پنکھے کے سوا کمرے میں کوئی چیز نہیں تھی۔ ظاہر ہے کہ مسکان کے لیے یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ وہ اس ماحول میں رہنے کی عادی نہیں تھی۔ ٹی وی، کمپیوٹر، آڈیو سسٹم اور کتابیں... یہ سب چیزیں اس کے بیڈ روم کا لازمی حصہ تھیں اور ان کے بغیر اس کا گزارہ نہیں تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ پہلی فرصت میں اس کمرے کو اپنی مرضی کے مطابق ترتیب دے گی لیکن فوراً ہی اس خیال کو مسترد کر دیا۔ وہ یہاں مستقل رہنے کے ارادے سے نہیں آئی تھی۔ زیادہ سے زیادہ دس پندرہ دن بعد اسے واپس چلے جانا تھا پھر یہ سب کھڑاگ پھیلانے سے کیا فائدہ؟

ثمینہ اس کے لیے چائے لے کر آئی تو اسے خاصی حیرت ہوئی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ اسے نیچے بلایا جائے گا اور وہ سب کے ساتھ بیٹھ کر چائے پیے گی۔ چھوٹی سی ٹرے میں چائے کے ساتھ ایک پلیٹ میں کچھ بسکٹ بھی رکھے ہوئے تھے۔ مسکان نے اسے اپنے ساتھ ہی بیڈ پر بٹھا لیا اور بولی۔ ''تم میرا ساتھ نہیں دو گی؟''

''نہیں۔'' وہ آہستہ سے بولی۔ ''میں بہت کم چائے پیتی ہوں۔ ویسے بھی ہمارے یہاں صرف صبح کے وقت ہی چائے بنتی ہے۔''

مسکان نے اس کے لہجے میں چھپی محرومی کو محسوس کیا تو اس کا دل اندر سے کٹ کر رہ گیا۔ ایک باپ کے دو بیٹے اور دونوں کے لائف اسٹائل میں زمین آسمان کا فرق۔ اس کے باپ نے نوجوانی میں ہی سمجھ لیا تھا کہ زمین کا یہ ٹکڑا اسے کچھ نہیں دے گا۔ اسی لیے وہ نئی دنیا کی تلاش میں گھر سے نکل گیا۔ اس نے بیوی اور بیٹے کی جدائی برداشت کی لیکن اپنے

www.pkdigest.com

فرض سے غافل نہیں رہا۔ جان توڑ محنت کرنے کے بعد جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوا تو اپنی اولاد کے لیے اتنا چھوڑ گیا کہ وہ زندگی بھر آرام سے بیٹھ کر کھا سکے... جبکہ دوسرے بھائی نے زندگی بھر کام نہ کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ بھائی کے باہر جانے کے بعد تو وہ بالکل ہی بے فکر ہو گیا تھا۔ وہ پیسے بھیج رہا تھا اور یہاں سب لوگ اس کی کمائی پر عیش کر رہے تھے۔ کسی نے یہ نہیں سوچا کہ جس دن اس کی آنکھیں بند ہو گئیں تب کیا ہوگا۔

مسکان اپنے ساتھ اچھی خاصی رقم کے ٹریولرز چیک لے کر آئی تھی۔ وہ چاہتی تو چاچا کو کچھ رقم دے کر اسے فوری مدد دے سکتی تھی۔ نہ جانے اس کے باپ نے کب سے پیسے نہیں بھیجے تھے لیکن اس نے جلد بازی میں کوئی قدم اٹھانا مناسب نہ سمجھا۔ وہ دو چار دن یہاں رہ کر حالات کا جائزہ لینا چاہتی تھی۔ ویسے بھی جس انداز میں اس کا استقبال ہوا تھا، اسے دیکھ کر اس کا سارا جوش اور جذبہ سرد پڑ گیا تھا اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ضرورت سے زیادہ یہاں ایک دن بھی قیام نہیں کرے گی۔ چائے پینے کے دوران وہ ثمینہ سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔ ثمینہ بہت کم بولتی تھی۔ مسکان کی باتوں کے جواب میں وہ ہاں جی اور نہ جی ہی کرتی رہی۔ البتہ اس سے باتیں کر کے مسکان کو یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ اس کے چچا کی پریشانی کی بڑی وجہ مالی حالات نہیں بلکہ عادل کی بے راہ روی ہے۔

''جوان اولاد ماں باپ کا سہارا ہوتی ہے لیکن عادل بھائی کو تو کسی بات کی فکر ہی نہیں ہے۔ بس اپنے ہی چکروں میں پھرتے رہتے ہیں۔''

''اور ظفر... وہ کیا کرتا ہے؟'' مسکان نے موقع جان کر سوال داغ دیا۔

ثمینہ نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا اور بولی۔ ''ان کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہے۔ میں کیا بتاؤں، آپ خود دیکھ لیجیے۔''

مسکان نے مزید کریدنا مناسب نہ سمجھا لیکن ثمینہ کے انداز سے وہ جان گئی کہ ظفر کے ساتھ کوئی ایسا مسئلہ ہے جس کا ذکر کرنے سے بھی یہ لوگ گریز کرتے ہیں۔ اب تک کسی نے اس کے بارے میں کھل کر بات نہیں کی تھی اور نہ ہی اسے مسکان کے سامنے لائے تھے۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے بہن بھائی کو ایک دوسرے سے دور رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اگر یہ مفروضہ صحیح تھا تو پھر اس کے پیچھے چھپی ہوئی حقیقت تک پہنچنے کی کوشش بھی ضرور ہونی چاہیے۔ لیکن مسکان اتنی جلدی کوئی نتیجہ اخذ کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ جب تک وہ ظفر سے خود نہیں مل لیتی، اس وقت تک اس بارے میں کچھ سوچنا بے کار تھا۔

شام کے وقت وہ اپنے کمرے سے باہر آئی۔ اسے ظفر سے ملنے اور حویلی دیکھنے کا شوق تھا۔ چاچا اور عادل کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ چاچی حسبِ معمول برآمدے میں بچھے تخت پر براجمان تھیں جبکہ ثمینہ اور فریدہ رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف تھیں۔ مسکان کو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ اتنی بڑی حویلی میں کوئی نوکر نہیں تھا جبکہ اس نے سن رکھا تھا کہ پاکستان میں تو عام گھروں میں بھی اوپر کا کام کرنے کے لیے ماسیاں ہوتی ہیں۔ وہ خاموشی سے چاچی کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور بولی۔ ''ظفر کہاں ہے؟ میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔''

چاچی نے اس کی طرف دیکھا اور منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''وہ اپنے کمرے سے بہت کم نکلتا ہے۔ میں اسے تمہارے بارے میں بتا چکی ہوں۔ اس کے باوجود وہ باہر نہیں آیا۔ میرا خیال ہے کہ تم خود ہی اس سے جا کر مل لو۔ ٹھہرو، میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔''

وہ اسے لے کر دائیں ہاتھ کی جانب بنے ہوئے کمرے کی جانب چل دی۔ ظفر اپنے بستر پر دیوار کی جانب کروٹ لیے لیٹا ہوا تھا۔ چاچی کی آواز پر وہ ہڑبڑا کر اٹھا اور مسکان کو دیکھتے ہی وہ دہشت زدہ ہو گیا۔ اس کے چہرے پر خوف کے سائے لرزنے لگے۔ یوں لگ رہا تھا کہ اس نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ لیا ہو۔ مسکان آگے بڑھی اور پیار سے بولی۔ ''ظفر! میں مسکان ہوں... تمہاری بہن۔''

اسے اپنی طرف آتا دیکھ کر وہ مزید سہم گیا جیسے مسکان نہیں بلکہ موت کا فرشتہ اس کی جانب بڑھ رہا ہو۔ مسکان اس کے پاس بیٹھ گئی اور اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔ ''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے... اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟''

ظفر کا پورا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ مسکان نے اس کے ہاتھوں میں لرزش محسوس کی تو گھبرا گئی۔ اس نے سوالیہ نظروں سے چاچی کی طرف دیکھا تو وہ بولی۔ ''ظفر کو آرام کرنے دو۔ باقی باتیں بعد میں کر لینا۔''

مسکان اس کا اشارہ سمجھ گئی اور اٹھتے ہوئے بولی۔ ''ٹھیک ہے، رات کو کھانے پر ملاقات ہوگی۔''

ظفر کی یہ حالت دیکھ کر مسکان خاصی پریشان ہو گئی۔ اس نے کمرے سے باہر آتے ہی چاچی سے پوچھا۔ ''یہ سب کیا ہے؟ ظفر نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے؟''

''وہ شروع سے ہی ایسا ہے۔ اسکول اور کالج میں بھی اس کی کسی سے دوستی نہیں تھی۔ کلاس سے فارغ ہونے کے

بعد ہر وقت کمرا بند کیے پڑا رہتا تھا۔ بی اے کے بعد اس نے پڑھائی چھوڑ دی اور گھر میں بیٹھ گیا۔ نہ کہیں باہر جاتا ہے اور نہ کسی سے ملتا ہے۔ گھر میں کوئی آ جائے تو اسے دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی اس کے قریب جانے کی کوشش کرے تو اس کے پورے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی اس کے حلق سے ایسی آوازیں نکلنے لگتی ہیں جیسے کوئی اس کا گلا گھونٹ رہا ہو۔ اکثر سوتے میں ڈر جاتا ہے اور بری طرح چلانے لگتا ہے۔''

''کمال ہے۔ اس کا یہ حال ہو گیا اور آپ لوگوں نے ہمیں کچھ نہیں بتایا؟''

''کیسی باتیں کرتی ہو۔ تمہارے باپ کو ظفر کے بارے میں سب پتا تھا۔ وہ ہمیشہ یہی کہتا کہ بہت جلد اسے اپنے ساتھ لے جائے گا لیکن اس کے پاس شاید بیٹے کے لیے وقت ہی نہیں تھا۔ میں تو کہتی ہوں کہ ظفر کی اس حالت کا ذمے دار بھی وہی ہے۔ اگر وہ شروع سے ہی بیٹے کو اپنے ساتھ رکھتا تو وہ اس حال کو نہ پہنچتا۔''

مسکان کو چاچی کی باتیں بری نہیں لگ رہی تھیں۔ واقعی اس کے ڈیڈی ہی قصوروار تھے۔ اولاد کی پرورش، نگہداشت اور تعلیم و تربیت کی ذمے داری ماں باپ پر ہوتی ہے۔ کوئی چاچا، ماما اس ذمے داری کو احسن طریقے سے نہیں نبھا سکتا۔ اس کے باپ کی یہ سوچ سرے سے ہی غلط تھی کہ ظفر مغربی ماحول میں رہ کر بگڑ جائے گا اور جب اس نے بیٹے کو اپنے پاس بلانے کا سوچا تو وقت نے اتنی مہلت ہی نہ دی کہ وہ اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنا سکتا۔ بہرحال جو ہونا تھا، وہ ہو چکا تھا۔ اب سوچنا یہ تھا کہ ظفر کو نارمل حالت میں کیسے لایا جائے۔ اس نے چاچی سے پوچھا۔

''آپ لوگوں نے اسے کسی ڈاکٹر کو دکھایا؟''

''اے لو، یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔'' چاچی ہاتھ نچاتے ہوئے بولی۔ ''تمہارے چاچا نے تو ڈاکٹروں کی لائن لگا دی۔ چنڈی کا کون سا ڈاکٹر ہے جس کے پاس لے کر نہیں گئے... لیکن سب یہی کہتے ہیں کہ اسے کوئی بیماری نہیں ہے۔ اسے اپنوں کی محبت نہیں ملی جس کی وجہ سے وہ تنہائی پسند ہو گیا ہے۔ ڈپریشن کی وجہ سے ہی اسے دورے پڑتے ہیں۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ جب تک اسے ماں باپ، بہن بھائی کی قربت نہیں ملے گی یہ نارمل نہیں ہو سکتا۔ اب تم ہی بتاؤ کیا ہو سکتا ہے۔ ماں باپ رہے نہیں۔ لے دے کر ایک بہن ہے، وہ بھی سوتیلی۔ اگر تم چاہو تو کوشش کر کے دیکھ لو۔''

مسکان نے بھی ظفر کو سوتیلا نہیں سمجھا تھا لیکن چاچی نے یہ طعنہ دے کر اس کے اندر آگ لگا دی۔ اس نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''میں سگے اور سوتیلے کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتی۔ بس اتنا جانتی ہوں کہ وہ میرے باپ کا بیٹا ہے اور اس حوالے سے میری جو ذمے داریاں ہیں، وہ ضرور نبھاؤں گی۔''

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ گل زماں بھی آ گیا۔ بھتیجی کو چاچی سے باتیں کرتا دیکھ کر اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ بھی قریب ہی پڑے موڑھے پر بیٹھ گیا اور بولا۔ ''ہاں بھئی! کیا باتیں ہو رہی ہیں؟''

''کچھ نہیں۔'' مسکان نے جواب دیا۔ ''ابھی تو ہم ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''اچھا... اچھا، ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔'' گل زماں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''تمہاری ظفر سے ملاقات ہوئی؟''

''جی ہاں، وہ تو کمرے سے باہر نہیں آیا۔ میں اسے سلام کرنے چلی گئی تھی۔'' مسکان کے لہجے میں مایوسی جھلک رہی تھی۔ اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اس کی حالت دیکھ کر بہت افسوس ہوا۔ کاش، آپ اسے پہلے ہی انگلینڈ بھیج دیتے تو اس کا وہاں بہتر علاج ہو جاتا۔''

''علاج تو یہاں بھی ہو رہا ہے۔'' گل زماں بے پروائی سے بولا۔ ''لیکن اسے کوئی جسمانی بیماری نہیں ہے۔ سارا مسئلہ نفسیاتی اور ذہنی ہے۔ اب تم آ گئی ہو تو شاید تمہارے ساتھ رہ کر اس کا احساسِ محرومی دور ہو جائے۔''

''میں یہاں ہمیشہ رہنے کے لیے نہیں آئی۔ زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس دن بعد چلی جاؤں گی۔ اس بار ظفر بھی میرے ساتھ جائے گا کیونکہ جو کوتاہی پاپا سے سرزد ہوئی، میں اسے نہیں دہراؤں گی۔ مجھے یقین ہے کہ انگلینڈ کے ماحول میں رہ کر وہ زیادہ تیزی سے صحت یاب ہو سکے گا۔''

''تم... تم واپس جاؤ گی؟'' گل زماں حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ''یہ کیسے ممکن ہے کہ تم پردیس میں تن تنہا زندگی گزارو۔ میں تمہیں اس کی اجازت ہرگز نہیں دوں گا۔''

مسکان نے اس پہلو پر غور ہی نہیں کیا تھا کہ پاکستان پہنچتے ہی وہ یرغمال بنا لی جائے گی اور چچا سرپرست بن کر اس پر حکم چلانے لگے گا۔ اس نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ ''شاید آپ بھول رہے ہیں کہ میں انگلینڈ میں پیدا ہوئی، وہیں پلی بڑھی اور وہیں میرا گھر بھی ہے۔ میری شہریت میرا پاسپورٹ سب برٹش ہے۔ پھر مجھے وہاں کیا خطرہ ہو سکتا ہے؟ اور میں ظفر کو بھی اسی لیے ساتھ لے جانا چاہ رہی ہوں کہ وہ وہاں ایک بہتر اور محفوظ زندگی گزار سکے۔''

www.pkdigest.com

''اچھا، اچھا ٹھیک ہے۔ ہم اس موضوع پر پھر کبھی بات کریں گے۔ چلو میں تمہیں حویلی دکھاتا ہوں۔''

مسکان فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے خود بھی حویلی دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ وہ حویلی بہت بڑے رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔ مرکزی عمارت کے چاروں طرف بہت بڑا احاطہ تھا جس میں سامنے کی جانب خوب صورت لان بنایا گیا تھا جبکہ عقبی حصے میں پختہ دالان اور برآمدہ بنا ہوا تھا۔ حویلی میں اوپر نیچے کئی کمرے بنے ہوئے تھے اور نیچے کی منزل میں ایک کشادہ ہال بھی تھا۔ مسکان نے پہلی ہی نظر میں اندازہ لگا لیا کہ اس حویلی کی تعمیر پر بے تحاشا پیسا خرچ کیا گیا ہے اور موجودہ دور میں اس کی مالیت کروڑوں میں ہوگی۔ البتہ فرنیچر اور دیگر سامان آرائش کافی پرانا تھا اور کافی عرصے سے اسے بدلنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی۔ بیشتر کمرے بند تھے اور ان کی ظاہری حالت بھی کافی ابتر تھی۔ مسکان سمجھ گئی کہ چاچی اپنی کمزور مالی حالت کی وجہ سے حویلی کی مرمت اور آرائش پر توجہ نہیں دے پا رہے تھے۔

رات کے کھانے پر عادل اور ظفر بھی موجود تھے لیکن مسکان کو ان دونوں کی موجودگی سے الجھن ہو رہی تھی۔ عادل کے چہرے پر ایسی کرختگی اور سنجیدگی تھی جیسے وہ مسکان کو کوئی اہمیت نہ دینا چاہ رہا ہو۔ مسکان نے بھی اسے کوئی لفٹ نہیں کرائی اور زیادہ وقت ثمینہ اور فریدہ سے ہی باتیں کرتی رہی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ظفر سے بھی ڈھیر ساری باتیں کرے لیکن وہ اس کی جانب متوجہ ہی نہیں تھا۔ وہ جب بھی اس کی طرف دیکھتی تو وہ یوں سہم جاتا جیسے کسی نے اس کی گردن پر چھری یا سینے پر پستول رکھ دیا ہو۔ مسکان نے اسے ایک دو مرتبہ مخاطب کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

کھانے کے بعد چائے کا دور چلا۔ مسکان نے اپنے پرس سے سو سو پاؤنڈ کے دو نوٹ نکالے اور ثمینہ، فریدہ کی جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''میں جلدی میں تم لوگوں کے لیے کوئی گفٹ نہیں لا سکی۔ اب تم ان پیسوں سے اپنی پسند کی کوئی چیز خرید لینا۔''

ثمینہ اور فریدہ نے پہلے تو جھجک کا اظہار کیا لیکن پھر چاچی کے کہنے پر انہوں نے وہ نوٹ لے لیے۔ مسکان نے اسی طرح ایک نوٹ ظفر کو بھی دیا لیکن اس نے فوراً ہی وہ نوٹ چاچی کے حوالے کر دیا۔ مسکان سمجھ گئی کہ چاچی نے اسے پوری طرح اپنے ٹرانس میں لے رکھا ہے اور وہ ان کی مرضی اور منشا کے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتا۔ اس نے ایک بار پھر پرس کھولا اور اس میں سے ہزار پاؤنڈ کے نوٹ نکال کر چاچی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''یہ میری طرف سے آپ لوگوں کے لیے ایک حقیر نذرانہ ہے۔ اس میں عادل بھائی کا حصہ بھی شامل ہے۔''

چاچی نے رسماً تکلف کیا پھر نوٹ اپنی جیب میں رکھتے ہوئے بولے۔ ''یہاں کیش لے کر پھرنا ٹھیک نہیں۔ اگر تمہارے پاس زیادہ رقم ہے تو اسے کل ہی بینک میں جمع کروا دو۔''

''آپ بے فکر رہیں۔ میں زیادہ پیسے ساتھ لے کر نہیں آئی۔ تھوڑے سے ٹریولرز چیک ہیں۔ انہی سے گزارہ کر لوں گی۔ البتہ کل صبح میرے لیے ایک گاڑی کا انتظام کر دیں۔ مجھے پنڈی جانا ہے۔''

''ایک بات ذہن میں رکھنا بیٹی! تم اس وقت انگلینڈ میں نہیں بلکہ پاکستان میں ہو اور جانتی ہو کہ یہاں کے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ خاص طور پر باہر سے آنے والوں کے لیے بہت خطرہ ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ تم عادل کو ساتھ لے جانا۔''

''جی نہیں... میں نے ہمیشہ اپنے کام خود کیے ہیں اور کسی کا سہارا یا مدد لینا پسند نہیں کرتی۔ بلاوجہ عادل بھائی کا وقت خراب ہوگا۔ آپ میری فکر نہ کریں۔ مجھے کچھ نہیں ہوگا۔''

عادل نے اسے گھورا پھر باپ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ مسکان کو اکیلے ہی جانے دیں۔ ایک ہی دن میں طبیعت صاف ہو جائے گی۔ اس کے بعد یہ پھر کبھی اکیلے جانے کا نام نہیں لے گی۔'' پھر وہ اچانک ہی ظفر پر برس پڑا۔ ''تم یہاں بیٹھے کیا تماشا دیکھ رہے ہو؟ اپنے کمرے میں جاؤ۔ تمہارے انجکشن کا ٹائم ہو گیا ہے۔''

ظفر ایک معمول کی طرح اٹھا اور خاموشی سے سر جھکائے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ مسکان اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی پھر گل زماں سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ''یہ کیسا انجکشن ہے جو ظفر کو باقاعدگی سے لگایا جا رہا ہے؟''

گل زماں نے مسکان کے لہجے میں چھپی ہوئی تشویش کو محسوس کر لیا اور تسلی دینے والے انداز میں بولا۔ ''شاید میں تمہیں یہ بتانا بھول گیا کہ ظفر رات کو سوتے میں ڈر جاتا ہے اور زور زور سے چیخنے لگتا ہے۔ اسی لیے ڈاکٹر نے یہ انجکشن لکھے ہیں تاکہ وہ پُرسکون نیند سو سکے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر اس طرح تو ظفر اس انجکشن کا عادی ہو جائے گا اور اس کے بغیر اسے نیند ہی نہیں آئے گی۔''

''بیٹی تو تم ٹھیک ہو لیکن ہم اس سلسلے میں کیا کر سکتے ہیں؟ ڈاکٹر کی بات ڈاکٹر ہی جانے۔''

مسکان سرہلا کر رہ گئی لیکن انجکشن والی بات اسے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

دوسرے دن وہ علی الصباح بیدار ہو گئی اور اسے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ چاچا چاچی کے علاوہ گھر کے بھی افراد دیر تک سونے کے عادی تھے۔ باورچی خانے سے برتنوں کی کھڑ پڑ کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے وہاں جھانک کر دیکھا تو اسے ایک ادھیڑ عمر عورت برتن دھوتی نظر آئی۔ مسکان کو چائے کی طلب ہو رہی تھی۔ وہ خود ہی آگے بڑھی اور چولہا جلا کر چائے کا پانی رکھ دیا۔ اسے کام کرتا دیکھ کر وہ عورت بڑی حیران ہوئی اور بولی۔ ''بی بی جی! آپ اندر جاؤ۔ میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔''

مسکان اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنے کمرے میں آ گئی اور پنڈی جانے کے لیے تیار ہونے لگی۔ چاچا جی نے اسے بتایا تھا کہ گاڑی آٹھ بجے تک آ جائے گی۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ ابھی گاڑی آنے میں آدھا گھنٹا باقی تھا۔ وہ جلدی جلدی تیار ہو کر نیچے آئی تو وہ عورت اس کے لیے چائے ہی نہیں بلکہ ناشتا بھی بنا چکی تھی۔ مسکان کو انڈے پراٹھے کھانے کی عادت نہیں تھی۔ اس کا گزارہ سلائس سے ہی ہو جاتا تھا۔ لیکن اس نے عورت کا دل رکھنے کے لیے چند لقمے لے لیے۔ چائے پی کر وہ فارغ ہی ہوئی تھی کہ گاڑی کے ہارن کی آواز سنائی دی۔ اس نے اپنا پرس سنبھالا اور باہر کی طرف لپکی۔ گل زماں وہاں پہلے سے موجود تھا اور گاڑی کے ڈرائیور کو ہدایات دے رہا تھا۔ مسکان بے پروائی سے پرس ہلاتی ہوئی پسنجر سیٹ کا دروازہ کھولنے لگی تو ڈرائیور نے بڑے مؤدبانہ انداز میں کہا۔

''بی بی جی! آپ پچھلی سیٹ پر بیٹھیں۔''

''کیوں؟'' وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔

''یہاں کا یہی رواج ہے۔ عورتیں پچھلی سیٹوں پر بیٹھتی ہیں۔''

''شاید ان کی پسماندگی کی یہی وجہ ہے کہ مرد انہیں برابر کا درجہ نہیں دینا چاہتے... لیکن میں تو فرنٹ سیٹ پر ہی بیٹھوں گی۔''

اس کے بعد ڈرائیور نے کوئی بات نہیں کی لیکن اس کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے مسکان کی ہٹ دھرمی اچھی نہیں لگی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی لڑکی اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھے۔ گل زماں نے اس کی الجھن کو محسوس کر لیا اور مسکان سے بولا۔ ''بیٹی! ضد نہ کرو۔ پیچھے بیٹھ جاؤ ورنہ اس سے گاڑی بھی نہیں چلائی جائے گی۔''

مسکان جھلاتی ہوئی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ ڈرائیور نے اپنی سیٹ سنبھالی اور اللہ کا نام لے کر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ کچھ دیر تک خاموشی رہی پھر مسکان کو بوریت ہونے لگی تو اس نے ڈرائیور کا انٹرویو لینا شروع کر دیا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''اشرف۔'' ڈرائیور نے مختصر سا جواب دیا۔

''شادی ہو چکی ہے؟''

''جی ہاں۔''

''کتنے بچے ہیں؟''

''دو۔''

''یہ گاڑی تمہاری اپنی ہے؟''

''جی ہاں۔''

اس مختصر گفتگو کے بعد مسکان کے پاس سوالات کا ذخیرہ ختم ہو گیا۔ ویسے بھی ڈرائیور کی ہوں ہاں اسے بہت بری لگ رہی تھی۔ شاید وہ کم بولنے کا عادی تھا۔ مسکان نے اپنی نشست کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں اور ظفر کے بارے میں سوچنے لگی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اپنے بھائی کو اس حال میں دیکھے گی۔ ظفر کا رویہ اس کے لیے عجیب و غریب ہی نہیں، مایوس کن بھی تھا۔ اسے صورہ کر ظفر کی دماغی حالت پر شبہ ہو رہا تھا۔ گھر میں کوئی اجنبی بھی آ جائے تو اس سے بھی دشمنا وہ چار باتیں کر لی جاتی ہیں۔ یقیناً وہ نارمل نہیں تھا اور اس کا علاج بھی مناسب طور پر نہیں ہو رہا تھا۔ اسے پہلی فرصت میں کسی ماہر نفسیات کو دکھانے کی ضرورت تھی جو اس کی تنہائی، ڈپریشن اور خوف کا علاج کر سکے۔ محض انجکشن لگا کر سلا دینا مسئلے کا حل نہیں تھا۔

☆☆

راولپنڈی پہنچ کر سب سے پہلے اس نے اپنے موبائل فون میں مقامی سم ڈلوائی اور وکیل یزدانی کو فون کر کے اپنے پاکستان پہنچنے کی اطلاع دی۔ وہ اس وقت اپنے دفتر میں ہی تھے۔ فوراً ہی ملاقات پر آمادہ ہو گئے۔ انہوں نے فون پر ہی مسکان کو اپنا ایڈریس سمجھا دیا اور پندرہ منٹ بعد وہ ان کے آفس میں بیٹھی تھی۔ یزدانی صاحب اس سے بہت شفقت سے پیش آئے اور کافی دیر تک اس کے باپ کی باتیں کرتے رہے۔ حیدر زماں سے ان کی بہت اچھی دوستی تھی اور وہ جب بھی انگلینڈ جاتے تو اسی کے یہاں قیام کرتے۔ حیدر زماں نے ان سے کہہ رکھا تھا کہ اگر مسکان پاکستان میں رہنا چاہے تو وہی اس کے قانونی مشیر اور سرپرست کا کردار ادا کریں گے۔ اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے انہوں نے مسکان سے اس کے آئندہ پروگرام کے بارے میں جاننا چاہا تو وہ

بولی۔ ''ڈیڈی کی وصیت کے مطابق میں ظفر کو یہاں سے لے جانا چاہتی ہوں لیکن اس کی حالت دیکھ کر میری پریشانی بڑھ گئی ہے۔ اسے مکمل علاج اور نگہداشت کی ضرورت ہے لیکن چاچا اور چاچی اس بارے میں خاصے بے پروا دکھائی دیتے ہیں۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ وہ جان بوجھ کر ظفر کی زندگی تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے ظفر کے بارے میں تفصیل سے بتایا تو وہ بولے۔

''اتنی جلدی کوئی رائے قائم کرنا درست نہیں۔ میں گل زماں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم نے ان لوگوں کے بارے میں جو اندازہ لگایا، وہ ٹھیک بھی ہو سکتا ہے لیکن ان لوگوں سے براہ راست الجھنے کے بجائے ظفر کو اپنی جانب مائل کرنا ہوگا۔ وہ اس وقت مکمل طور پر ان کے ٹرانس میں ہے، اور جیسا تم نے بتایا کہ ایک معمول کی طرح ان کے اشاروں پر چلتا ہے، ایسی صورت میں وہ کس طرح تمہارے ساتھ جانے پر راضی ہوگا؟ اور اس سے بھی زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ کیا وہ لوگ ایسا چاہیں گے؟''

''میں نے خود بھی یہی محسوس کیا ہے کہ ظفر کے انگلینڈ نہ جانے میں ڈیڈی کی کوتاہی سے زیادہ چاچا چاچی کی مزاحمت کا زیادہ دخل تھا۔ ڈیڈی نے جب بھی ظفر کو اپنے پاس بلانے کی کوشش کی تو انہوں نے کسی نہ کسی بہانے اسے روک لیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں اور ظفر کو اپنے پاس رکھ کر وہ کیا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں؟''

''شاید تمہیں پوری بات معلوم نہیں۔'' انکل یزدانی مسکراتے ہوئے بولے۔ ''دنیا میں زیادہ تر جھگڑے زر، زن اور زمین کی وجہ سے ہوتے ہیں اور مجھے لگتا ہے کہ ظفر کی زندگی تباہ کرنے کا مقصد بھی یہی ہے۔ تم کیا سمجھتی ہو جس حویلی میں گل زماں رہ رہا ہے، اس کی مالیت کروڑ سے بھی زیادہ ہے۔ پھر تمہارے دادا نے جو زمین چھوڑی، وہ بھی خاصی قیمتی ہے۔ یہ گل زماں اور عادل کی نااہلی ہے کہ وہ اس زمین سے خاطر خواہ آمدنی حاصل نہیں کر پا رہے۔ ویسے تو اس حویلی کی تعمیر میں سارا پیسا تمہارے باپ کا لگا ہوا ہے لیکن یہ زمین چونکہ تمہارے دادا کے نام سے خریدی گئی تھی، اس لیے قانونی طور پر گل زماں بھی اس میں برابر کا حصے دار ہے۔ حیدر کے انتقال کے بعد تم اور ظفر، اس کے وارثوں میں ہو۔ ظفر کو انہوں نے اس حال تک پہنچا دیا ہے کہ وہ بلا چون و چرا ان کی ہر خواہش یا حکم کی تعمیل کرنے پر آمادہ ہو سکتا ہے۔ انہیں توقع نہیں تھی کہ تم بھی پاکستان آ سکتی ہو۔ اسی لیے انہیں تمہاری آمد ناگوار گزری ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ تم پر بھی کسی نہ

کسی انداز میں دباؤ ڈال سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں تمہیں بہت زیادہ محتاط رہنا ہوگا۔''

''انکل! آپ میری فکر نہ کریں۔ میں برطانوی شہری ہوں اور اتنا تو یہ بھی جانتے ہوں گے کہ کسی غیر ملکی کے ساتھ زیادتی کرنے کا نتیجہ کیا ہو سکتا ہے؟''

''مشکل تو یہی ہے کہ یہ لوگ کچھ بھی نہیں جانتے ورنہ آئے دن غیر ملکیوں کے قتل اور اغوا کی وارداتیں نہ ہوتیں۔'' یزدانی صاحب نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''بہرحال اب تم بتاؤ کہ ظفر کے بارے میں کیا سوچا ہے؟ تم اسے کس طرح انگلینڈ لے جانے پر آمادہ کر سکو گی؟''

''میں آپ سے یہی مشورہ کرنے آئی ہوں۔ ظفر کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ میں اسے جلد از جلد یہاں سے لے جانا چاہتی ہوں۔''

''جلد بازی سے کام نہیں چلے گا۔ ممکن ہے کہ تمہیں اپنے قیام کی مدت بڑھانی پڑے۔ فی الحال میں تمہیں یہی مشورہ دے سکتا ہوں کہ ظفر سے قریب ہونے کی کوشش کرو۔ کسی بھی طرح اسے اپنے ساتھ لے کر باہر نکلو تا کہ وہ کھلی فضا میں سانس لے سکے۔ اس کے تمام کام اپنے ذمے لے لو اور ہو سکے تو کسی طرح اس کے انجکشن بند کروا دو تا کہ اس کا سویا ہوا ذہن جاگ جائے اور وہ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہو سکے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ تمہیں اپنی حفاظت کا خیال رکھنا ہوگا۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ لوگ اپنے مقصد کی خاطر تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کریں۔''

''میں سوچ رہی ہوں کہ کسی بہانے ظفر کو پنڈی لے آؤں اور کسی اچھے ڈاکٹر سے اس کا معائنہ کرواؤں۔ کم از کم معلوم تو ہو کہ اس کی بیماری کی نوعیت کیا ہے؟''

''شاید وہ لوگ تمہیں ایسا نہ کرنے دیں۔ اس کے لیے تمہیں خاصی جدوجہد کرنا ہوگی۔''

''کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔ اگر وہ نہ مانے تو میں گھر پر ہی کسی ڈاکٹر کو بلا کر اس کا معائنہ کروا دوں گی۔''

یزدانی صاحب خاصے مضطرب نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے اپنی نشست پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ''میری دو تین باتیں غور سے سن لو۔ سب سے پہلی تو یہ کہ کسی کو میرے اور تمہارے رابطے کے بارے میں معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ تم کسی وکیل یزدانی کو نہیں جانتیں۔ ہو سکے تو اپنے برطانوی پاسپورٹ کی ایک نقل مجھے دے دو۔ روزانہ رات کو سونے سے پہلے مجھے فون ضرور کرو۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو اوکے کا میسج ہی دے دو۔ موبائل سے ہونے والی کالز اور پیغامات کا ڈیٹا

www.pkdigest.com

روزانہ صاف کر دیا کرو۔ انگلینڈ میں تمہارا باپ جو کچھ چھوڑ کر گیا ہے، اس کے بارے میں کسی کو تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں۔ اگر گل زمان یا عادل اس بارے میں کچھ پوچھیں تو صاف کہہ دینا کہ بینک اکاؤنٹ میں موجود تھوڑی سی رقم کے علاوہ تمہارے پاس کچھ نہیں اور تم ملازمت کر کے اپنا گزارہ کر رہی ہو۔ مانچسٹر میں مقیم اپنے دوستوں سے بھی رابطے میں رہو اور انہیں یہاں کے حالات سے آگاہ کرتی رہو تاکہ وقت پڑنے پر وہ تمہاری مدد کر سکیں۔''

یزدانی صاحب سے ملنے کے بعد وہ خاصی پُرسکون ہو گئی تھی۔ اس نے ان کے مشوروں پر عمل کرنے کا وعدہ کیا اور رخصت ہو کر دوسرے کام نمٹانے چل دی۔ سب سے پہلے اس نے بینک سے کچھ ٹریولرز چیک کیش کروائے۔ پھر اپنے لیپ ٹاپ کے لیے وائرلیس کنکشن حاصل کیا۔ ان کاموں سے فارغ ہو کر اس نے کچھ شاپنگ کی۔ اپنے لیے کچھ ڈریسز خریدے پھر اسے کچھ خیال آیا اور اس نے ظفر کے کمرے میں رکھنے کے لیے ایک چھوٹا سا ٹی وی خرید لیا۔ وہ جانتی تھی کہ چاچا اور عادل اس پر اعتراض کریں گے لیکن ان لوگوں کا مقابلہ کرنے کے لیے جارحانہ رویہ اختیار کرنا ضروری تھا۔ اس نے سب کے لیے کچھ نہ کچھ شاپنگ ضروری تاکہ ان کے منہ بند رہیں۔ گھر کی خستہ حالت کو دیکھتے ہوئے تھوڑی سی کراکری، بستر کی چادریں اور کچھ کھانے پینے کا سامان بھی لے لیا۔ اس تمام مصروفیت میں اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ گل زمان نے تاکید کی تھی کہ وہ مغرب سے پہلے واپس آ جائے۔ چنانچہ اس نے باقی شاپنگ ملتوی کر دی اور سامان سے لدی پھندی گاؤں کے لیے روانہ ہو گئی۔ اسے یقین تھا کہ وقت سے پہلے گھر پہنچ جائے گی۔

حویلی کے گیٹ پر گل زمان اور عادل دونوں ہی اس کا انتظار کر رہے تھے۔ اسے دیکھتے ہی عادل تیزی سے اس کی جانب بڑھا اور غضب ناک لہجے میں بولا۔ ''کہاں رہ گئی تھیں؟ اتنی دیر لگا دی۔ ہم لوگ کب سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔''

مسکان نے اس کے غصے کی پروا کیے بغیر کہا۔ ''عادل بھائی! جب آدمی گھر سے نکلتا ہے تو دیر سویر ہو ہی جاتی ہے۔ اور ویسے بھی میں مغرب سے پہلے گھر واپس آ گئی ہوں۔ پھر آپ اتنا غصہ کیوں ہو رہے ہیں؟''

''اس لیے کہ تم یہاں کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔ بہتر ہوگا کہ گھر سے باہر نکلنے میں احتیاط کرو۔''

''آپ بھی میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے اس لیے میرے معاملات میں مداخلت نہ کریں۔ میں وہی کروں گی جو مجھے کرنا ہے۔''

گل زمان نے مسکان کے تیور دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ وہ عادل سے مرعوب ہونے والی نہیں۔ اس لیے مداخلت کرتے ہوئے بولا۔ ''اچھا بھئی، یہ نوک جھونک بعد میں کر لینا۔ پہلے اس ڈرائیور کو تو فارغ کرو۔''

عادل اپنی بے عزتی برداشت نہ کر سکا اور پیر پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد مسکان نے ڈرائیور کو سامان اتارنے کا اشارہ کیا اور جب وہ کرایہ لے کر واپس جانے لگا تو اس کے قریب آ کر سرگوشی میں بولی۔ ''تمہارے پاس موبائل ہے؟''

ڈرائیور نے اثبات میں سر ہلایا تو مسکان نے اپنا سیٹ اس کی جانب بڑھایا اور بولی۔ ''اس میں اپنا نمبر فیڈ کرو تاکہ جب مجھے ضرورت ہو تو تمہیں کال کر سکوں۔''

ڈرائیور نے حکم کی تعمیل کی اور سلام کر کے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد مسکان اندر آ گئی اور سب لوگوں کی چیزیں ان کے حوالے کرنے لگی۔ ثمینہ اور فریدہ کے لیے وہ بڑے خوب صورت اور قیمتی سوٹ لائی تھی جنہیں دیکھ کر وہ نہال ہو گئیں۔ چچی کا موڈ بھی بحال ہو گیا تھا۔ البتہ گل زمان نے ٹی وی پر اعتراض کیا اور بولا۔ ''تم نے یہ بلاوجہ ہی پیسے خراب کیے۔ گھر میں ٹی وی موجود ہے لیکن ظفر کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ سارا سارا دن کمرے سے باہر نہیں نکلتا۔ ٹی وی تو کیا اسے دنیا کا کوئی کام اچھا نہیں لگتا۔''

''ظفر کو اس حال میں نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اسے ہم سب کی توجہ کی ضرورت ہے۔ آپ نے اس کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ اب تھوڑی سی کوشش مجھے بھی کرنے دیں۔ میں اس کی بہن ہوں اور اس حوالے سے کچھ فرض مجھ پر بھی عائد ہوتا ہے۔''

''بہن ضرور ہو لیکن سوتیلی۔'' چاچی نے لقمہ دیا۔ ''اور یہ یاد رکھنا کہ سگے سوتیلے کا فرق ہمیشہ رہتا ہے۔ تم چاہے اس کے لیے دودھ کی نہریں بہا دو لیکن کہلاؤ گی سوتیلی ہی۔''

''مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کی بھلائی کے لیے جو کچھ کر رہی ہوں اس کا نتیجہ بھی اچھا نکلے گا۔''

یہ کہہ کر وہ چاچی کے جواب کا انتظار کیے بغیر ظفر کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ گل زمان بھی اس کے پیچھے لپکا۔ مسکان نے اس کی آمد کا کوئی نوٹس نہ لیا اور دروازے پر دستک دے کر اندر چلی گئی۔ ظفر حسب معمول اوندھے منہ

اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ مسکان نے قریب جا کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ مسکان کو اپنے کمرے میں دیکھ کر اس کی آنکھیں خوف اور حیرت سے پھیل گئیں۔ مسکان اس کے قریب ہی بیٹھ گئی اور پیار سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔

''ڈرو نہیں، میں تمہاری بہن ہوں۔''

اتنی دیر میں گل زمان بھی وہاں آ گیا اور مسکان کو ظفر کے ساتھ بیٹھا دیکھ کر بولا۔ ''اس کے پاس سے ہٹ جاؤ۔ کچھ پتا نہیں کب یہ تم پر حملہ کر دے۔''

مسکان سمجھ گئی کہ وہ اسے محض ظفر سے دور رکھنے کے لیے ایسا کہہ رہا ہے۔ اس لیے ڈھٹائی سے بولی۔ ''چاچا جی! آپ میری فکر نہ کریں۔ یہ مجھے کچھ نہیں کہے گا۔ میرا خیال ہے کہ ابھی اس میں اپنے خون کو پہچاننے کی صلاحیت باقی ہے۔''

یہ کہہ کر اس نے ایک شاپر اٹھایا اور ظفر سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ''دیکھو، میں تمہارے لیے کیا لائی ہوں۔''

پھر اس نے شاپر سے مختلف چیزیں نکالنا شروع کر دیں۔ ان میں ظفر کے لیے شلوار قمیص کے سوٹ، پینٹ شرٹ، کچھ میگزین، کتابیں، چاکلیٹس اور ایک موبائل فون بھی تھا۔ ظفر نے ان سب چیزوں کی طرف دیکھا بھی نہیں اور بے حس سا بیٹھا رہا۔ مسکان کو اس کے رویے سے مایوسی تو ہوئی لیکن وہ ہمت ہارنے والی نہیں تھی۔ اس نے سب چیزیں واپس شاپر میں رکھیں اور بولی۔ ''ٹھیک ہے، یہ سب چیزیں تمہاری ہی ہیں، جب چاہے استعمال کر لینا۔'' پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔ ''میں تمہارے لیے ایک ایسا گفٹ لے کر آئی ہوں جسے دیکھ کر تم خوش ہو جاؤ گے۔''

یہ کہہ کر اس نے کمرے کا جائزہ لیا پھر گل زمان سے بولی۔ ''چاچا جی! کسی بندے کو بلا لیں جو ظفر کے کمرے میں ٹی وی سیٹ کر دے۔''

گل زمان کے ماتھے پر بل پڑ گئے اور وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''آدمی تو آ جائے گا لیکن بہتر ہوگا کہ یہ ٹی وی تم اپنے کمرے میں رکھو۔ ظفر کو اس کی ضرورت نہیں۔''

''چاچا جی! اس بحث کو چھوڑیں۔ یہ میں جانتی ہوں کہ ظفر کو اس کی کتنی ضرورت ہے۔''

گل زمان منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا ہوا وہاں سے چلا گیا تو اس نے شاپر سے چاکلیٹ کا پیکٹ نکالا اور ایک چاکلیٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''یہ لو... بڑے مزے کی ہے۔''

خلاف توقع ظفر نے وہ چاکلیٹ لے لی تو مسکان کی ہمت بڑھی۔ اس نے ایک بار پھر شاپر میں ہاتھ ڈالا اور اس میں سے جوس کا ٹن نکالتے ہوئے بولی۔ ''دیکھو... میں تمہارے لیے بہت خاص قسم کا جوس لے کر آئی ہوں۔ پی کر دیکھو... مزہ آ جائے گا۔''

ظفر نے اس بار بھی کوئی مزاحمت نہیں کی اور ہاتھ بڑھا کر جوس کا ٹن لے لیا۔ مسکان سمجھ گئی کہ برف پگھلنے لگی ہے اور ظفر ایسا ہرگز نہیں جیسا کہ اسے بنا دیا گیا ہے۔ پھر وہ اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔ ظفر خاموشی سے سنتا رہا لیکن جواب میں ایک لفظ بھی نہ بولا۔ البتہ اس کے خوف میں کمی آ چکی تھی۔ کبھی کبھی اس کے چہرے کے تاثرات سے یوں لگتا جیسے وہ مسکان کی باتوں میں دلچسپی لے رہا ہے۔ وہ بڑے غور سے اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہی تھی اور اسے توقع سے زیادہ کامیابی ہوتی نظر آ رہی تھی۔ اب اس کا یہ شک یقین میں بدل گیا تھا کہ ظفر کو جان بوجھ کر قید تنہائی میں رکھا گیا ہے تاکہ باہر کی دنیا سے اس کا رابطہ نہ رہے اور وہ ایک معمول کی طرح ان لوگوں کے اشاروں پر چلتا رہے۔

دو گھنٹے کے انتظار کے بعد گل زمان ایک الیکٹریشن کو لے کر آ گیا۔ اس وقت تک عادل بھی آ چکا تھا۔ اسے جب معلوم ہوا کہ ظفر کے کمرے میں ٹی وی رکھا جا رہا ہے تو اس نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ شور سن کر مسکان بھی کمرے سے باہر آ گئی۔ اس نے دیکھا کہ عادل اس الیکٹریشن کو دھکے دے کر گھر سے چلے جانے کا حکم دے رہا تھا۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی عادل کے سامنے آئی اور ترخ کر بولی۔

''یہ کیا ہو رہا ہے عادل بھائی؟ اسے میں نے بلایا تھا۔''

''میں کب کہہ رہا ہوں کہ اسے میں لے کر آیا ہوں۔'' عادل اونچی آواز میں بولا۔ ''ایسا کارنامہ تم ہی انجام دے سکتی ہو لیکن یہ ٹی وی ظفر کے کمرے میں نہیں رکھا جائے گا۔''

''کیوں؟ آخر کوئی وجہ تو ہو؟''

''ٹی وی پر طرح طرح کے پروگرام چلتے رہتے ہیں جن سے ظفر کا ذہن متاثر ہو سکتا ہے۔''

''میں بھی تو یہی چاہتی ہوں کہ وہ یہ پروگرام دیکھے۔ اسے معلوم ہونا چاہیے کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ اسی طرح اس کا سویا ہوا ذہن بیدار ہو سکتا ہے۔ براہ کرم آپ اس معاملے میں دخل نہ دیں اور مجھے اپنا کام کرنے دیں۔''

اس کے انداز میں کوئی ایسی بات تھی کہ عادل کو بھی وقتی طور پر پسپائی اختیار کرنا پڑی اور وہ بڑبڑاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد مسکان نے الیکٹریشن کو اشارہ کیا کہ وہ اپنا کام شروع کر دے۔ گل زمان، اس کی بیوی اور بیٹیاں خاموشی سے یہ تماشا دیکھتی رہیں۔ البتہ ثمینہ اور فریدہ کو

www.pkdigest.com

یہ خوشی ہو رہی تھی کہ گھر میں ایک اور ٹی وی آ گیا ہے اور اب وہ بھی ظفر کے کمرے میں جا کر اپنے پسندیدہ ٹی وی پروگرام دیکھ سکیں گی کیونکہ ان کا ٹی وی تو بیٹھک میں رکھا ہوا تھا جہاں کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ صرف گل زماں اور عادل ہی اس سے مستفید ہو سکتے تھے۔

تھوڑی دیر بعد ہی الیکٹریشن نے اپنا کام مکمل کر لیا اور جب اس نے ٹی وی آن کیا تو ظفر کی آنکھوں میں بھی ایک خاص چمک نمودار ہوئی۔ وہ بڑی دلچسپی اور حیرت سے ٹی وی اسکرین کی جانب دیکھ رہا تھا۔ مسکان نے ٹی وی کا ریموٹ اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ ''اب تم مزے سے ٹی وی دیکھو۔ باقی باتیں کل کریں گے۔''

اسی رات ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ مسکان دن بھر کی تھکی ہاری اپنے کمرے میں جا کر لیٹی اور منٹوں میں گہری نیند سو گئی۔ رات کے پچھلے پہر اسے یوں محسوس ہوا کہ کوئی زور زور سے چلا رہا ہے۔ اس کے چیخنے کی آوازیں پوری حویلی میں گونج رہی تھیں۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھی اور دوڑتی ہوئی نیچے گئی۔ اسے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ یہ آوازیں ظفر کے کمرے سے آ رہی تھیں۔ وہ اس جانب لپکی تو چاچی نے اس کا راستہ روک لیا اور بولی۔ ''تم نیچے کیوں آ گئیں؟ کیا نیند نہیں آ رہی؟''

''چاچی! یہ آوازیں کیسی ہیں؟ ظفر تو ٹھیک ہے نا؟''

''اسے کچھ نہیں ہوا۔'' چاچی تلخی سے بولی۔ ''بس ہماری قسمت میں سکون نہیں ہے۔''

''پھر بھی کچھ پتا تو چلے کہ کیا ہوا ہے؟''

''کیا کرو گی جا کر؟ یہ تو روز کا تماشا ہے۔ آج تمہارے ٹی وی کے چکر میں عادل اسے انجکشن لگانا بھول گیا اور پھر وہی ہوا جو ہمیشہ ہوتا ہے۔ ظفر نے سوتے میں کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا اور چیخیں مار مار کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ اب عادل اسے انجکشن لگانے گیا ہے تو اس سے زور آزمائی کر رہا ہے۔''

چاچی کی بات پوری نہ ہوئی تھی کہ عادل اور گل زماں کمرے سے باہر آئے۔ عادل نے مسکان کو گھور کر دیکھا اور کچھ کہے بغیر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس کے پیچھے گل زماں اور چاچی بھی چل دیے۔ مسکان سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ ان لوگوں کے ہٹتے ہی ظفر کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ ظفر کی آنکھوں میں خوف اور وحشت کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں اور اس کے بائیں گال پر خون کے چھینٹے نظر آ رہے تھے۔ اس نے جلدی سے اپنے دوپٹے سے اس کا گال صاف کیا لیکن اسے اس کے چہرے پر کوئی چوٹ کا نشان نظر نہیں آیا۔ مسکان نے اس کا سر اپنی آغوش میں لے لیا اور دھیرے دھیرے سے اسے سہلانے لگی۔ وہ ساری پچویشن سمجھ گئی تھی۔ ظفر پر تشدد کیا گیا تھا اور اس کے نتیجے میں ان میں سے کوئی زخمی ہو گیا ہوگا جس کے خون کے چھینٹے ظفر کے گال پر بھی آ گئے تھے۔ زندگی میں شاید کسی نے پہلی بار ظفر کا سر اپنی گود میں لیا تھا۔ وہ یہ ہمدردی برداشت نہ کر سکا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ مسکان واقعے کے بارے میں جاننا چاہتی تھی لیکن ظفر پر انجکشن کا اثر غالب آنے لگا اور وہ تھوڑی دیر بعد ہی سو گیا۔ مسکان نے اسے آرام سے لٹا دیا اور ادھر ادھر جھک کر کچھ تلاش کرنے لگی۔ بستر کی پائنتی رکھی باسکٹ میں اسے اپنی مطلوبہ چیز نظر آ گئی۔ اس نے اسے اٹھایا اور دوپٹے کے پلو میں لپیٹ کر وہاں سے چلی آئی۔

مسکان نے باتھ روم میں جا کر لائٹ جلائی اور دوپٹے کے پلو سے فوائل نکال کر انجکشن کا نام پڑھنے لگی۔ پھر اس نے احتیاط سے اس فوائل کو ایک کاغذ میں لپیٹا اور اپنے پرس میں رکھ لیا۔ اتنا تو وہ جان گئی تھی کہ ظفر کو یہ انجکشن زبردستی لگائے جا رہے تھے اور وہ اکثر و بیشتر مزاحمت بھی کرتا ہے۔ اسے فوری طور پر اس انجکشن کے بارے میں معلومات حاصل کرنا تھیں۔ دوسرے دن صبح اٹھتے ہی اس نے فون پر یہ سارا واقعہ یزدانی صاحب کو سنایا اور ان سے گزارش کی کہ وہ کسی ڈاکٹر سے اس انجکشن کی حقیقت معلوم کریں۔ یزدانی صاحب یہ جان کر متفکر ہو گئے اور انہوں نے مسکان کو بہت زیادہ محتاط رہنے کی ہدایت کی اور ساتھ ہی یہ بھی سمجھایا کہ وہ ان لوگوں سے الجھنے کے بجائے جلد از جلد ظفر کو لے کر وہاں سے نکلنے کی کوشش کرے اور اگر اسے کسی قسم کی قانونی مدد درکار ہے تو وہ اس کا انتظام بھی کر سکتے ہیں۔

دوپہر کے کھانے پر اس کی ملاقات گل زماں سے ہوئی۔ اتفاق سے عادل بھی گھر میں موجود تھا۔ اس نے گل زماں سے صاف کہہ دیا کہ وہ ظفر کی صحت کے بارے میں مطمئن نہیں ہے اور چاہتی ہے کہ لاہور یا راولپنڈی میں کسی اچھے ڈاکٹر سے اس کا معائنہ کروایا جائے۔ اس پر گل زماں نے اسے بتایا کہ ظفر کا ایک بار نہیں کئی بار معائنہ ہو چکا ہے اور ڈاکٹروں کے کہنے کے مطابق اسے کوئی جسمانی عارضہ لاحق نہیں ہے۔ سارا مسئلہ نفسیاتی یا ذہنی ہے جس کے لیے یہ انجکشن لگائے جا رہے ہیں۔ اس کے باوجود اگر وہ مطمئن نہیں ہے تو جس ڈاکٹر کو چاہے دکھا سکتی ہے۔ عادل اس دوران میں کچھ نہ بولا، بس کڑی نظروں سے اسے گھورتا رہا۔ کھانے

کے بعد وہ ظفر کے کمرے میں چلی گئی۔ وہ اسی وقت سو کر اٹھا تھا اور رات والا واقعہ اس کے ذہن میں تازہ تھا۔ اس نے بے چارگی سے مسکان کو دیکھا جیسے اس کی آغوش میں پناہ لینا چاہتا ہو۔ مسکان نے اس سے کہا کہ وہ منہ دھو کر باہر آ جائے۔ وہ اس کے لیے کھانا نکالتی ہے۔

دن کا بقیہ حصہ اس نے ظفر کے ساتھ ہی گزارا۔ اس دوران میں گل زماں اور عادل بار بار ظفر کے کمرے کا چکر لگاتے رہے۔ عادل تو کچھ دیر بعد گھر سے باہر نکل گیا لیکن گل زماں مسلسل ان کے سر پر سوار رہا۔ مسکان نے بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ کسی بھی صورت ظفر کو تنہا نہیں چھوڑے گی اور جب تک وہ سو نہیں جاتا، اس کے کمرے سے نہیں جائے گی۔ اس کی کوشش تھی کہ عادل کسی بھی طرح ظفر کو انجکشن نہ لگا سکے۔

رات دس بجے اس نے وکیل یزدانی کو فون کیا اور جب انہوں نے انجکشن کے بارے میں مطلوبہ معلومات فراہم کیں تو اس کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ وہ نشہ آور انجکشن تھا جس سے انسان کی قوتِ مدافعت کم ہو جاتی تھی۔ یہ ان مریضوں کو لگایا جاتا تھا جنہیں نیند نہ آنے کی پرانی شکایت تھی اور اس کا کورس بارہ انجکشن کا تھا۔ اس کے بعد یہ بند کر دیے جاتے تھے۔ مسکان کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ظفر کو یہ انجکشن کب سے لگائے جا رہے تھے۔ اس نے یزدانی صاحب سے کہا کہ وہ کسی اچھے ڈاکٹر سے اپائنٹمنٹ لے لیں۔ وہ ظفر کا فوری طور پر معائنہ کروانا چاہتی ہے۔ اس کے بعد اس نے مانچسٹر فون کر کے راحیل سے رابطہ کیا اور اسے یہاں کے حالات کے بارے میں مختصراً آگاہ کیا۔ راحیل بھی یہ سب سن کر پریشان ہو گیا اور اسے جلد از جلد واپس آنے کی تاکید کی۔ اس نے راحیل کو یزدانی صاحب کا ایڈریس اور فون نمبر لکھوا دیا تاکہ کسی بھی ہنگامی صورتِ حال میں وہ ان سے رابطہ کر سکے۔

اس رات مسکان نے دو فیصلے کیے۔ ایک تو یہ کہ وہ فوری طور پر ظفر کا معائنہ کروائے گی اور دوسرے یہ کہ اسے ظفر کو لے کر جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ سب سے پہلے اسے ظفر کا شناختی کارڈ اور پاسپورٹ بنوانا تھا۔ کیونکہ وہ خود برطانوی شہری تھی اور اپنے بھائی کو انگلینڈ لے جانا چاہ رہی تھی، اس لیے ظفر کو آسانی سے ویزا مل سکتا تھا۔ وہ رات سکون سے گزر گئی۔ دوسرے دن ناشتے کی میز پر اس نے اعلان کر دیا کہ وہ ظفر کا معائنہ کروانے پنڈی جا رہی ہے۔ گل زماں نے بھی ساتھ چلنے کی خواہش ظاہر کی تو اس نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اسے اور بھی بہت سے کام ہیں۔ وہ کہاں ان کے ساتھ پھرتا رہے گا۔ گل زماں ویسے تو اپنی بات منوانے کا عادی تھا لیکن نہ جانے کیوں مسکان کے سامنے اس کی سٹی گم ہو جاتی تھی۔

دوسری صبح بڑی ہنگامہ خیز ثابت ہوئی۔ عادل کو جب معلوم ہوا کہ مسکان، ظفر کو لے کر پنڈی جا رہی ہے تو اس نے اس کی شدید مخالفت کی۔ وہ کسی قیمت پر بھی ظفر کو مسکان کے ساتھ بھیجنے پر تیار نہ تھا۔ اسے خود کسی ضروری کام سے جانا تھا۔ اس لیے اس نے تجویز پیش کی کہ گل زماں ان کے ساتھ جائے۔ مجبوراً مسکان کو یہ بات ماننا پڑی۔ ویسے بھی وہ محسوس کر رہی تھی کہ شاید وہ ظفر کو ہینڈل نہ کر سکے۔ اب اسے بے چینی سے گاڑی والے کا انتظار تھا جسے وہ رات کو ہی فون پر پنڈی جانے کے پروگرام کے بارے میں بتا چکی تھی اور اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ آٹھ بجے تک پہنچ جائے گا۔ اس نے ظفر کو بھی بہلا پھسلا کر شہر جانے کے لیے آمادہ کر لیا تھا۔ گو کہ اس نے یہ سن کر کسی خاص گرم جوشی کا اظہار نہیں کیا لیکن پہلے کی نسبت اس کا ردِعمل خاصا مثبت تھا۔ جس طرح وہ گل زماں اور عادل کے کہنے پر کسی معمول کی طرح عمل کرتا تھا، اسی طرح اس نے مسکان کی باتوں پر بھی سر جھکانا شروع کر دیا تھا۔

وقت گزرتا جا رہا تھا اور گاڑی والے کا کہیں پتا نہیں تھا۔ دس بج گئے تو مسکان کو تشویش ہونے لگی۔ اس نے گل زماں سے کہا کہ وہ کسی کو بھیج کر اس کا پتا کروائے کیونکہ مسکان کی فون کال کا بھی جواب نہیں دے رہا تھا۔ ایک گھنٹے بعد گل زماں کے آدمی نے اطلاع دی کہ گاڑی والا گھر پر نہیں ہے۔ وہ صبح فجر کی نماز پڑھنے مسجد گیا تھا لیکن واپس نہیں آیا۔ اس کے گھر والے بھی خاصے پریشان نظر آ رہے تھے کیونکہ وہ کبھی بھی بتائے بغیر کہیں نہیں جاتا تھا۔ اس کی گمشدگی کی خبر نے مسکان کو بھی تشویش میں مبتلا کر دیا۔ اگر اسے کوئی حادثہ پیش آ گیا تو بڑی مشکل پیش آئے گی کیونکہ پورے گاؤں میں وہی ایک گاڑی تھی جسے وہاں کے لوگ پنڈی، ایبٹ آباد یا ہری پور جانے کے لیے کرائے پر لیا کرتے تھے، ورنہ عام آمد و رفت کے لیے وہ بس کو ترجیح دیتے تھے جس کے لیے انہیں کافی دور پیدل چل کر بڑی سڑک تک پہنچنا ہوتا تھا۔ مجبوراً مسکان کو اپنا پروگرام ملتوی کرنا پڑا۔ اس نے گل زماں سے کہا کہ وہ گاڑی والے کے بارے میں معلوم کرے کہ آخر وہ کہاں غائب ہو گیا۔ آج نہیں تو کل اس کی ضرورت دوبارہ پیش آ سکتی ہے۔

وہ سارا دن مسکان نے بڑی بے چینی کے عالم میں گزارا۔ ڈرائیور کا یوں اچانک غائب ہو جانا اس کی سمجھ سے

www.pkdigest.com

باہر تھا۔ وہ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھی کہ کوئی اسے اغوا یا قتل کر سکتا ہے۔ وہ مقامی باشندہ تھا اور اس کی کسی سے دشمنی نہیں تھی۔ مسکان کو اس کی پُراسرار گمشدگی میں کسی سازش کی بو نظر آ رہی تھی۔ وہ خود غائب نہیں ہوا بلکہ اسے غائب کر دیا گیا ہے تاکہ وہ مسکان کو لے کر راولپنڈی نہ جا سکے اور یہ کام یقیناً گل زماں یا عادل کا ہو سکتا تھا۔ صبح سے شام ہو گئی لیکن عادل ابھی تک واپس نہیں آیا تھا اور نہ ہی گھر میں کسی کو اس کے بارے میں تشویش تھی۔ ثمینہ بتا چکی تھی کہ وہ گھر میں بتائے بغیر کئی کئی دن کے لیے چلا جاتا ہے۔ شاید اسی لیے وہ لوگ اس طرزِ عمل کے عادی ہو چکے تھے۔

رات گئے عادل کی واپسی ہوئی۔ اس دوران مسکان کئی مرتبہ ڈرائیور سے فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کرتی رہی لیکن دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ عادل جیسے ہی گھر میں داخل ہوا تو مسکان نے اس سے ڈرائیور کے بارے میں پوچھا جس پر عادل نے اسے بتایا کہ اسے اس بارے میں کچھ علم نہیں ہے۔ وہ خود ایک ضروری کام سے ایبٹ آباد گیا ہوا تھا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ ویسے بھی ڈرائیور کی... گمشدگی کے بارے میں جان کر عادل نے تعجب اور حیرت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ جیسے اس کے نزدیک اس واقعے کی کوئی اہمیت نہیں ہو لیکن مسکان کے لیے وہ شخص ایک ہی بہت زیادہ اہم ہو گیا تھا۔ اس کے بغیر وہ اس حویلی اور گاؤں سے باہر نہیں نکل سکتی تھی جبکہ مسکان کو آئندہ چند روز میں اس کی کئی بار ضرورت پیش آئی۔

اس رات وہ بہت دیر تک بے چینی سے بستر پر کروٹ بدلتی رہی۔ ظفر کے ساتھ ان لوگوں کا سلوک ناقابلِ فہم تھا۔ مسکان کے خیال میں تو وہ غریب قیدیوں سے بھی بدتر زندگی گزار رہا تھا۔ اوپر سے علاج کے نام پر جو انجکشن اسے لگائے جا رہے تھے وہ بھی اس کی زندگی کے لیے خطرناک ہو سکتے تھے۔ وہ اسی لیے اس کا معائنہ کروانا چاہ رہی تھی تاکہ مرض کی تشخیص ہو اور اس کا مناسب علاج ہو سکے لیکن یوں لگ رہا تھا جیسے وہ لوگ اس کے حق میں بھی نہیں تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ مسکان کا پروگرام ملتوی ہونے پر وہ خاصے خوش اور مطمئن نظر آ رہے تھے۔ مسکان نے اس ساری صورتِ حال سے وکیل یزدانی کو آگاہ کر دیا تھا۔ ان کا بھی یہی کہنا تھا کہ وہ ہر قیمت پر ظفر کا معائنہ کروائے اور جلد از جلد اس کو لے کر یہاں سے چلی جائے۔ مسکان نے سوچ لیا تھا کہ وہ اس سلسلے میں چاچا گل زماں سے دوٹوک بات کرے گی۔

رات ایک بجے کے قریب مسکان کو پانی کی طلب محسوس ہوئی۔ کمرے میں رکھا ہوا جگ خالی تھا اس لیے وہ دبے پاؤں سیڑھیاں اتر کر نیچے چلی آئی۔ کچن کی طرف جاتے ہوئے اسے چاچا کے کمرے سے باتوں کی آواز آئی۔ اس کے قدم وہیں رک گئے۔ ویسے تو کسی کی باتیں سننا معیوب سمجھا جاتا ہے لیکن مسکان کو یوں لگا جیسے اسی کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہو۔ اس نے دروازے سے کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ واقعی اسی کا ذکر ہو رہا تھا۔ رات کے سناٹے میں چاچا کی آواز اسے صاف سنائی دے رہی تھی۔

"ہم تو ظفر سے ہی جان چھڑانے کے چکر میں تھے، اوپر سے یہ مسکان بھی آن ٹپکی۔ ظفر کو تو ہم نے کسی نہ کسی طرح قابو کر لیا تھا لیکن اس کا کیا علاج کیا جائے؟ یہ بڑی تیز لڑکی ہے۔ اسے سنبھالنا آسان نہیں۔"

"میں نے اس کا علاج سوچ لیا ہے۔ چڑیا کے پَر کاٹ دیے جائیں تو وہ اڑنے کے قابل نہیں رہتی۔ ایسی ترکیب سوچی ہے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔"

"اس بارے میں کچھ غلط مت سوچنا۔ وہ برطانیہ کی شہری ہے۔ اگر اسے کوئی نقصان پہنچا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔"

"تم تو صرف حویلی پر قبضہ کرنا چاہ رہے ہو اور اسی لیے ظفر کو راستے سے ہٹانے کی فکر میں ہو لیکن میں نے جو ترکیب سوچی ہے اس پر عمل کرنے سے صرف مسکان ہی ہمارے قابو میں نہیں آئے گی بلکہ اس کے باپ کی تمام دولت اور جائداد بھی ہمیں مل جائے گی۔"

"ذرا میں بھی تو سنوں کہ تم نے کیا سوچا ہے؟" گل زماں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"مسکان اور عادل کی شادی کر دی جائے تو سارا مسئلہ ہی حل ہو جائے گا۔"

"لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کیا مسکان اس پر راضی ہو جائے گی؟"

"کیوں نہیں؟" چاچی نے مکاری سے کہا۔ "تمہیں صرف یہ کہنا ہوگا کہ یہ رشتہ بھائی حیدر زماں نے اپنی زندگی میں ہی طے کر دیا تھا۔ یہ سننے کے بعد مسکان جھاگ کی طرح بیٹھ جائے گی۔ ویسے بھی باپ کے مرنے کے بعد تم ہی اس کے ولی اور سرپرست ہو اور اس کی شادی کی ذمّے داری تمہارے سر ہے۔"

"بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔" چاچا نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ "لیکن مسکان مان جائے تب ہے۔"

"اگر وہ سیدھی طرح مان جائے تو ٹھیک ہے ورنہ ہم اس کا نکاح زبردستی عادل کے ساتھ پڑھوا دیں گے۔ اسے اتنی مہلت ہی نہیں ملنی چاہیے کہ وہ کسی سے رابطہ کر سکے۔ ویسے بھی وہ یہاں کسی کو نہیں جانتی۔"

"میرے خیال میں زبردستی کرنا ٹھیک نہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ وہ عادل سے شادی کرنے پر تیار ہو جائے۔"

مسکان کے لیے اپنے قدموں پر کھڑا ہونا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ گرتی پڑتی کمرے تک آئی اور بستر پر ڈھے گئی۔ اس کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ اپنے کانوں سے نہ سنا ہوتا تو شاید کبھی یقین نہ کرتی لیکن چاچا اور چاچی کی باتیں سننے کے بعد سارا کھیل اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ کتنے سنگ دل اور بے رحم لوگ تھے کہ محض ایک حویلی کی خاطر اپنے معصوم بھتیجے کی زندگی برباد کرنے پر تُل گئے تھے۔ اس کا دل چاہا کہ اسی وقت چاچا کے پاس جائے اور ان سے کہے کہ وہ اور ظفر اس حویلی میں اپنے حصے سے دستبردار ہونے کو تیار ہیں۔ بشرطیکہ ظفر کو اس کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی جائے لیکن اب تو گیم پلان ہی بدل گیا تھا۔ چاچی صرف حویلی پر ہی نہیں بلکہ حیدر زماں کے چھوڑے ہوئے لاکھوں کی جائداد پر قبضہ کرنا چاہ رہی تھی اور اسی لیے اس نے مسکان کو بہو بنانے کا فیصلہ کیا تھا لیکن اس نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں.... اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کسی قیمت پر بھی اس پلان کو کامیاب نہیں ہونے دے گی۔ اب اسے ظفر سے زیادہ اپنی سلامتی کی فکر ہو گئی تھی۔ اس نے سوچا کہ پہلے خود نکل جائے، بعد میں انکل یزدانی کی مدد سے ظفر کو بھی لے جائے گی۔

دوسری صبح بڑی ہنگامہ خیز ثابت ہوئی۔ وہ ناشتے سے فارغ ہو کر ڈرائیور سے رابطہ کرنے کے بارے میں سوچ رہی تھی تاکہ دوبارہ راولپنڈی جانے کا پروگرام بنا سکے لیکن اس سے پہلے ہی گل زماں اس کے پاس آ گیا۔ چاچی بھی اس کے ساتھ تھی۔ مسکان سمجھ گئی کہ وہ فوراً ہی اپنے منصوبے پر عمل کرنا چاہ رہے ہیں۔ وہ خود بھی ذہنی طور پر اس لمحے کے لیے تیار تھی اور اس نے اس سلسلے میں حکمتِ عملی تیار کر لی تھی۔ گل زماں کچھ دیر خاموش رہا۔ شاید اسے گفتگو کا آغاز کرنے کے لیے مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے پھر اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور بولا۔

"بیٹی! تم نے اپنے مستقبل کے بارے میں کیا سوچا ہے؟"

"مجھے کیا سوچنا ہے، فی الحال تو ظفر کے بارے میں فکرمند ہوں۔ میں اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے یہاں آئی تھی۔ ڈیڈی کی بڑی خواہش تھی کہ ظفر انگلینڈ آ کر اپنی تعلیم مکمل کرے اور میں انہی کی خواہش کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر یہاں آئی تھی... لیکن نہ جانے کیوں آپ لوگ ایسا نہیں چاہتے۔"

"اس وقت میں تمہاری بات کر رہا ہوں۔ ویسے بھی جب تک ظفر مکمل طور پر صحت یاب نہ ہو جائے، میں اسے کہیں نہیں بھیجوں گا۔"

مسکان کو محسوس ہوا کہ گل زماں پہلے کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی سخت رویہ اختیار کیے ہوئے ہے۔ شاید اس طرح وہ مسکان کو دباؤ میں لانا چاہ رہا تھا۔ اس نے انجان بنتے ہوئے کہا۔ "میں سمجھی نہیں کہ آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟"

"دیکھو بیٹی! بھائی حیدر زماں کے انتقال کے بعد تم دونوں کی ذمّے داری بھی مجھ پر آن پڑی ہے۔ تم نے اچھا کیا کہ خود ہی پاکستان چلی آئیں ورنہ میں تمہیں یہاں بلا لیتا۔ ظاہر ہے... پردیس میں تنہا لڑکی کو تو نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ تمہاری شادی کر دی جائے۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" مسکان حیران ہوتے ہوئے بولی۔ "ابھی تو میں نے اس بارے میں کچھ نہیں سوچا ہے۔ جب تک ظفر اپنے پیروں پر نہ کھڑا ہو جائے، میں اس وقت تک شادی نہیں کروں گی۔"

"ظفر کے بارے میں سوچ کر اپنے آپ کو ہلکان مت کرو۔ وہ میری ذمّے داری ہے۔ ویسے بھی وہ تمہارا سوتیلا بھائی ہے۔ اس کی خاطر اپنا وقت ضائع مت کرو۔"

"میں سگے، سوتیلے کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتی۔ بس اتنا جانتی ہوں کہ وہ میرے باپ کی اولاد ہے اور اس رشتے کے حوالے سے مجھ پر جو ذمّے داری عائد ہوتی ہے، اسے ضرور نبھاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے، تم اپنا یہ شوق شادی کے بعد بھی پورا کر سکتی ہو۔ فی الحال تو میں صرف یہ بتانے آیا ہوں کہ میں نے اپنے بھائی کی وصیت کے مطابق عادل سے تمہاری شادی کا فیصلہ کیا ہے۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ ڈیڈی نے مجھ سے کبھی اس کا تذکرہ نہیں کیا۔" وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔

"ممکن ہے کہ وہ یہ بات کہنے کے لیے کسی مناسب وقت کا انتظار کر رہا ہو اور اسے اس کی مہلت ہی نہ ملی ہو۔" گل زماں بہت ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا اور اس کا کہا ہوا ایک ایک لفظ مسکان کے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح برس رہا تھا۔

"بہرحال، حقیقت یہی ہے کہ کئی برس پہلے ہم دونوں یہ رشتہ

طے کر چکے تھے اور اس شادی کے لیے چند ماہ بعد حیدر زماں تمہیں لے کر یہاں آنے والا تھا۔''

مسکان نے بے یقینی کے انداز میں سر ہلایا اور بولی۔ ''وہ اپنی ہر بات مجھ سے شیئر کرتے تھے اور یہ ممکن ہی نہیں کہ میری زندگی کے بارے میں اتنا بڑا فیصلہ ہو جائے اور مجھے اس کا علم ہی نہ ہو۔''

''ہر بات اپنے وقت پر اچھی لگتی ہے۔ حیدر زماں کے بعد یہ ذمّے داری مجھے نبھانا پڑ رہی ہے۔ گو کہ ہمارے یہاں لڑکیوں سے پوچھنے کا رواج نہیں ہے لیکن تم دوسرے ماحول میں پلی بڑھی ہو۔ اس لیے میں تمہاری مرضی ضرور جاننا چاہوں گا۔''

اگر کوئی اور وقت ہوتا تو مسکان فوراً ہی انکار کر دیتی لیکن ان لوگوں کی سازش سمجھ جانے کے بعد اس نے بھی انہیں اندھیرے میں رکھنے کا فیصلہ کیا اور مسکین صورت بناتے ہوئے بولی۔ ''مجھے کچھ سوچنے کا موقع دیں۔ ایسے اہم فیصلے منٹوں میں نہیں کیے جاتے۔''

''فیصلہ تو ہو چکا۔ اب تمہیں اس پر عمل کرنا ہے۔'' گل زماں کے لہجے میں چٹانوں جیسی سختی تھی جسے سن کر وہ اندر سے بری طرح سہم گئی۔

چاچا کے تیور بڑے خطرناک تھے۔ وہ کسی وقت بھی قاضی کو بلا کر اس کا نکاح عادل سے پڑھوا سکتا تھا۔ اس مصیبت سے نکلنے کا ایک ہی راستہ تھا کہ وہ صاف انکار کرنے کے بجائے ان لوگوں کو اندھیرے میں رکھ کر یہاں سے نکلنے کی کوشش کرے۔ وہ باتھ روم میں گئی اور انکل یزدانی کا نمبر ملانے لگی۔ اب تک کسی کو معلوم نہیں ہوا تھا کہ وہ کسی وکیل سے رابطے میں ہے اور وہ بھی اسے آخر وقت تک راز ہی رکھنا چاہتی تھی۔ جب اس نے انکل یزدانی کو تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کیا تو وہ بھی پریشان ہو گئے اور بولے۔ ''اس سے پہلے کہ پانی سر سے اونچا ہو جائے، تمہیں فوراً وہاں سے نکلنا ہوگا۔ ایک بار تم مجھ تک پہنچ جاؤ پھر ہم ظفر کو بازیاب کرانے کے لیے پولیس کی مدد بھی لے سکتے ہیں۔''

''میں خود بھی سوچ رہی ہوں لیکن فی الحال یہ ممکن نہیں ہے۔ جس گاڑی والے کے ساتھ ایک بار راولپنڈی آئی تھی، اس سے رابطہ نہیں ہو پا رہا اور یہ بھی نہیں جانتی کہ یہ لوگ مجھے اس کے ساتھ آنے دیں گے یا نہیں۔ لگتا ہے کہ اب میری نگرانی سخت ہو جائے گی۔''

''تم کہو تو میں آ جاؤں؟''

''جی نہیں، میں نہیں چاہتی کہ ان لوگوں کو آپ کے بارے میں معلوم ہو۔ اور ویسے بھی آپ کے پاس مجھے ساتھ لے جانے کی کیا وجہ ہوگی۔ کیا آپ ان سے یہ کہیں گے کہ میری موکلہ کی شادی اس کی مرضی کے بغیر کی جا رہی ہے... اس لیے اسے ساتھ لے جانے آیا ہوں۔ ویسے بھی یہ مناسب نہ ہوگا کہ مجھ سمیت میرے خاندان والے تھانوں اور عدالتوں کے چکر لگائیں۔ میں خود ہی کوئی ترکیب سوچتی ہوں۔''

''جیسے تمہاری مرضی۔'' انکل یزدانی گہری سانس لے کر بولے۔ ''تم مجھ سے مسلسل رابطے میں رہو گی۔ اگر کوئی ایمرجنسی ہو تو ایک مس کال دے دینا۔ میں خود ہی تمہیں ٹریس کر لوں گا۔''

شام کو عادل گھر آیا تو اس کے چہرے پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ مسکان کو اس کی نظریں اپنے جسم کے آر پار ہوتی محسوس ہوئیں۔ اگلے دو دن وہ گھر میں ہی رہا۔ اس دوران وہ مسلسل اس کے گرد منڈلاتا رہا۔ مسکان نے بھی سوچ رکھا تھا کہ وہ اس کی کسی حرکت پر ردِعمل ظاہر نہیں کرے گی۔ وہ ان لوگوں کو اندھیرے میں رکھ کر اپنا کام کرنا چاہ رہی تھی۔ ادھر چاچا اور چاچی نے اپنے طور پر شادی کی تیاریاں شروع کر دی تھیں اور وہ مسکان پر یہ ظاہر کر رہے تھے کہ اس کی شادی بڑی دھوم دھام سے کی جائے گی جبکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ ان کے پاس شادی کے اخراجات پورے کرنے کے لیے پیسے ہی نہیں تھے۔ پھر انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ فی الحال وہ سادگی سے نکاح کریں گے اور رخصتی فصل کٹنے پر ہوگی۔ مسکان ان کی باتوں پر دل ہی دل میں ہنستی لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے یہ ڈر بھی تھا کہ کہیں اچانک ہی یہ لوگ اس کے نکاح کا پروگرام نہ بنا لیں۔

عادل کا رویہ اس کے ساتھ خاصا جارحانہ تھا۔ جب سے اسے معلوم ہوا تھا کہ مسکان سے اس کی شادی ہونے والی ہے، وہ اسے اپنی ملکیت سمجھنے لگا تھا۔ کبھی کہتا پانی پلا دو، کبھی چائے کی فرمائش کرتا تو کبھی کپڑے استری کرنے کا حکم جاری کر دیتا۔ مسکان ان باتوں کی عادی نہیں تھی۔ لیکن وہ اس سے بگاڑ کر اپنے لیے کوئی مشکل پیدا نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔ اس لیے بہ حالتِ مجبوری یہ سب برداشت کرتی رہی۔ کئی بار اس کا جی چاہا کہ وہ گل زماں سے صاف صاف کہہ دے کہ اسے یہ رشتہ منظور نہیں اور وہ اپنے بھائی کو لے کر واپس جانا چاہتی ہے لیکن وہ جانتی تھی کہ اس طرح معاملہ بگڑ جائے گا اور یہ لوگ زبردستی اس کا نکاح عادل سے کر دیں گے۔ اس لیے بہتر یہی تھا کہ جو مہلت اس کے پاس ہے، اسی

میں وہ اپنے بچاؤ کی کوئی ترکیب کرے۔

مسکان جو چاہ رہی تھی وہ نہ ہو سکا۔ اس کی کوشش تھی کہ عادل سے اس کا ٹکراؤ نہ ہو۔ اسی لیے وہ اس کی بہت سی باتیں برداشت کر رہی تھی لیکن عادل کچھ زیادہ ہی بے صبرا ثابت ہوا۔ ایک دن وہ کسی کام سے کچن میں گئی تو وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے چلا آیا اور بولا۔

''مسکان! جلدی سے اچھی سی چائے بنا دو۔ پھر میں تمہیں گھمانے لے جاؤں گا۔''

''معاف کیجیے۔ مجھے گھومنے کا کوئی شوق نہیں ہے اور نہ ہی اس وقت چائے بنانے کا موڈ ہے۔''

عادل کو اس جواب کی توقع نہ تھی اور نہ وہ ایسی باتیں سننے کا عادی تھا۔ اس لیے غصے سے بولا۔ ''مت بھولو کہ تم میری منگیتر ہو اور میری ہر خواہش پوری کرنا تمہارا فرض ہے۔''

مسکان کو بھی غصہ آ گیا اور وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ ''یہ آپ لوگوں کا خیال ہے۔ ابھی میں نے اس بارے میں کچھ نہیں سوچا ہے۔''

''تمہارے سوچنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ یہ رشتہ بزرگوں نے طے کیا ہے اور تمہیں اسے ہر حال میں قبول کرنا ہوگا۔''

''اگر میں اس سے انکار کر دوں تو؟''

عادل اس کے بالکل قریب آ گیا اور اپنی انگلی سے اس کی ٹھوڑی اٹھاتے ہوئے بولا۔ ''ہم پہلے مانگتے ہیں ورنہ چھین لیتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ عقل مند کے لیے اتنا اشارہ ہی کافی ہے۔''

یہ سن کر مسکان کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور اسے اپنے آپ پر قابو نہ رہا۔ اس نے ایک جھٹکے سے عادل کا ہاتھ اپنی ٹھوڑی سے ہٹایا اور تلملاتے ہوئے بولی۔ ''آپ کیا سمجھتے ہیں کہ مجھے ڈرا دھمکا کر اپنا مقصد حاصل کر لیں گے تو یہ آپ کی بھول ہے۔ میں کسی قیمت پر بھی آپ سے شادی نہیں کروں گی۔''

''سوچ لو مسکان... تمہیں یہ انکار بہت مہنگا پڑے گا۔''

مسکان کا دل چاہا کہ وہ اسے اپنی حیثیت اور اس کی اوقات یاد دلا دے لیکن وہ وقت سے پہلے اپنے کارڈز ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے اس نے بات بڑھانا مناسب نہ سمجھا اور اپنے کمرے میں چلی آئی۔ عادل غصے میں پیر پٹختا ہوا گھر سے باہر چلا گیا۔ مسکان جانتی تھی کہ جلد یا بہ دیر چاچا اور چاچی کو بھی اس کے انکار کا پتا چل جائے گا لہٰذا اس سے پہلے ہی اس نے براہِ راست ایکشن لینے کا

فیصلہ کیا۔ اس نے اپنے ذہن میں ایک پلان ترتیب دے لیا تھا اور اسے یقین تھا کہ اس غیر محسوس قید سے نکلنے کے لیے اس سے بہتر راستہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ اگر گل زماں نے اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی تو مجبوراً اسے انکل یزدانی کی مدد لینا ہوگی۔

وہ ایک عزم کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھی اور سیدھی گل زماں کے پاس گئی۔ چاچی بھی وہاں موجود تھی۔ اس نے بڑے ادب سے دونوں کو سلام کیا اور بولی۔ ''چاچا جی! میں پندرہ دنوں کے لیے یہاں آئی تھی لیکن اب لگ رہا ہے کہ مجھے مستقل طور پر ہی یہاں رہنا ہوگا۔''

گل زماں یہ سن کر خوش ہو گیا اور بولا۔ ''ہمارے لیے اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی ہے کہ تم ہمیشہ ہماری نظروں کے سامنے رہو۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے درست فیصلہ کیا۔''

''لیکن مجھے کچھ دنوں کے لیے واپس جانا ہوگا۔ وہاں کے معاملات نمٹانے کے لیے میرا جانا بہت ضروری ہے۔''

''میں سمجھا نہیں... آخر تم کس لیے واپس جانا چاہ رہی ہو؟'' گل زماں بے چین ہوتے ہوئے بولا۔

''چاچا جی! ڈیڈی کے انتقال کے بعد میں ہی ان کا کاروبار اور دیگر معاملات دیکھ رہی ہوں۔ سب سے بڑا مسئلہ اسٹور کا ہے جسے زیادہ عرصے تک ملازمین کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ مجھے واپس جا کر یہ اسٹور، مکان اور دیگر اثاثے فروخت کرنا ہوں گے۔ میں بہت تھوڑی رقم ساتھ لے کر آئی تھی۔ باقی سارا پیسا بینک میں ہے۔ سوچ رہی ہوں کہ یہ سب کچھ سمیٹ کر پاکستان لے آؤں۔''

گل زماں کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ چاچی نے معنی خیز نظروں سے اسے دیکھا۔ اس کا اندازہ درست نکلا۔ واقعی مسکان کروڑوں کی اسامی تھی۔ اسی لیے اس نے اس سونے کی چڑیا کو پنجرے میں قید کرنے کا منصوبہ بنایا تھا جبکہ گل زماں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ اس کا بھائی اتنا دولت مند ہو گا۔ ویسے بھی حیدر زماں نے کبھی اسے اپنی پوزیشن کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا اور نہ ہی کبھی گل زماں نے اس سے پوچھنے کی ضرورت محسوس کی۔ اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ وہ گاہے بہ گاہے اس کی مدد کرتا رہتا تھا جس سے اس کی اچھے انداز میں گزر بسر ہو رہی تھی۔

مسکان کی زبانی اس کے اثاثوں کی تفصیل سن کر اس کی رال ٹپک پڑی۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ خود مسکان کے ساتھ انگلینڈ جاتا اور بھائی کی ساری دولت سمیٹ کر لے آتا لیکن عملاً ایسا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ اس نے مسکان کو خوشی خوشی

www.pkdigest.com

جانے کی اجازت دے دی اور بولا۔ ''نیک کام میں دیر کیسی۔ ضرور جاؤ لیکن یہ بتا دو کہ واپسی کب تک ہوگی تاکہ ہم بھی اسی حساب سے اپنا پروگرام بنا لیں۔''

مسکان سمجھ گئی کہ بڈھا پوری طرح لالچ میں آگیا ہے اور اسے ہری ہری سوجھ رہی ہے۔ چنانچہ اس نے اس کے آتش شوق کو بھڑکانے کے لیے کہا۔ ''اگر معاملہ صرف اسٹور اور مکان کا ہوتا تو زیادہ دیر نہ لگتی لیکن اس کے علاوہ بھی ڈیڈی کی پراپرٹی ہے۔ شیئر مارکیٹ میں بھی ان کا اچھا خاصا سرمایہ لگا ہوا ہے۔ یہ سب وائنڈ اپ کرنے میں دو تین مہینے تو لگ ہی جائیں گے۔''

''ہاں، مجھے اندازہ ہے۔ اس طرح کے کاموں میں دیر تو لگ ہی جاتی ہے۔'' گل زماں اپنی دلی کیفیت کو چھپاتے ہوئے بولا۔ ''تم بتاؤ کہ جانا کب ہے؟''

''میں کل ہی راولپنڈی جا کر سیٹ بک کرواتی ہوں۔ آپ میرے لیے گاڑی کا بندوبست کر دیں۔'' مسکان بڑی معصومیت سے بولی۔

''تم فکر نہ کرو۔ میں اس کا انتظام کر دوں گا۔'' گل زماں اپنی جگہ سے اٹھا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا گھر سے باہر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد چاچی بولی۔ ''تمہارے آنے سے بڑی رونق ہو گئی تھی۔ ظفر بھی تم سے بہت مانوس ہو گیا تھا۔ تمہارے بغیر یہ دن کیسے گزریں گے؟''

مسکان کو اس کی منافقت اور مکاری پر بہت غصہ آیا لیکن اس نے بھی جواب میں ایسا ہی رویہ اختیار کیا اور بولی۔ ''چاچی! آپ پریشان کیوں ہو رہی ہیں؟ تھوڑے دنوں کی تو بات ہے۔ پھر میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہاں آجاؤں گی۔''

''اللہ تمہاری زبان مبارک کرے۔ خیریت سے جاؤ، خیریت سے آؤ۔''

مسکان کا پلان کامیاب رہا تھا۔ لالچ نے ان دونوں کے سوچنے سمجھنے کی قوت سلب کر لی تھی۔ اب مسکان کو یہ افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے بلاوجہ ہی عادل کے سامنے شادی سے انکار کیا۔ اچھا تھا وہ بھی اندھیرے میں مارا جاتا۔ وہ دعا کر رہی تھی کہ عادل ہمیشہ کی طرح رات کو دیر سے گھر آئے۔ اسے معلوم تھا کہ وہ صبح دیر سے سو کر اٹھتا ہے اور وہ اس سے پہلے ہی راولپنڈی کے لیے روانہ ہو جاتی۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ اس دوران عادل کا سامنا اپنے ماں باپ سے ہو گیا، تب بھی وہ سردمہری کے زعم میں انہیں کچھ نہیں بتائے گا۔ بھونچال تو اس وقت آتا جب وہ چاچا اور چاچی کے سامنے بھی انکار کر دیتی لیکن اس نے اشارتاً بھی ایسی کوئی بات نہیں کی۔ اپنی دانست میں وہ انہیں بے وقوف بنانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

اس کے پلان کا دوسرا حصہ یہ تھا کہ وہ راولپنڈی پہنچ کر کسی بہانے سے ڈرائیور کو فارغ کر دیتی اور خود یزدانی انکل کے گھر یا کسی ہوٹل میں اس وقت تک قیام کرتی جب تک ظفر اس کے پاس نہیں پہنچ جاتا۔ یزدانی صاحب نے اسے یقین دلایا تھا کہ ایک دفعہ وہ اس حویلی سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو جائے، اس کے بعد ظفر کو وہاں سے نکالنا ان کا کام ہے۔ تھوڑی دیر بعد ہی گل زماں نے اسے خوش خبری سنائی کہ گاڑی کا انتظام ہو گیا ہے۔ وہ صبح آٹھ بجے جانے کے لیے تیار رہے۔

رات دس بجے اس نے انکل یزدانی کو فون کر کے ساری پیش رفت سے آگاہ کیا۔ انہوں نے مسکان کے پلان سے اتفاق کیا لیکن ساتھ ہی یہ تشویش بھی ظاہر کی کہ کہیں عادل عین وقت پر کوئی رکاوٹ کھڑی نہ کر دے کیونکہ مسکان نے انکار کر کے اسے مشتعل کر دیا تھا اور اب وہ کبھی نہیں چاہے گا کہ مسکان حویلی سے باہر قدم نکالے۔ دلیل یزدانی کی تشویش اپنی جگہ لیکن مسکان کو اطمینان تھا کہ عادل کو ایسا کرنے کی مہلت ہی نہیں ملے گی۔ وہ ابھی تک گھر نہیں آیا تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ رات باہر ہی گزار دے۔ بالفرض اگر وہ آ بھی گیا اور اس نے مسکان کا راستہ روکنے کی کوشش کی تو وہ اسے ہینڈل کر لے گی۔ مسکان نے اعتماد ظاہر بھی کہہ دیا کہ اگر وہ مقررہ وقت پر ان کے پاس نہ پہنچ سکی تو انہیں مطلع کر دے گی۔ بصورتِ دیگر وہ خود اپنے طور پر کوئی بھی کارروائی کر سکتے ہیں۔

دوسری صبح ڈرائیور ٹھیک وقت پر آگیا۔ مسکان نے اپنے پرس میں پاسپورٹ اور دیگر ضروری چیزیں رکھیں اور باہر چلی آئی۔ سب لوگ سو رہے تھے۔ صرف چاچا گل زماں، ڈرائیور سے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے آج زوردار بارش ہو گی۔ جلدی واپس آنے کی کوشش کرنا۔''

مسکان نے اسے یقین دلایا کہ وہ کام مکمل ہوتے ہی واپس آجائے گی۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں عین وقت پر عادل باہر نہ آجائے۔ گاڑی حویلی سے باہر نکلی تو اس کی جان میں جان آئی۔ وہ آرام سے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور سوچنے لگی کہ اس کے واپس نہ آنے پر ان لوگوں کا کیا ردِعمل ہو گا۔ اسے

سب سے زیادہ ظفر کی فکر تھی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ان کے انتقام کا نشانہ بن جائے۔ تاہم اسے یقین تھا کہ یزدانی انکل بہت جلد ظفر کو ان لوگوں کے چنگل سے نکالنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

گاڑی گاؤں کی حدود سے نکل کر بڑی سڑک کی جانب رواں دواں تھی۔ یہ راستہ عموماً سنسان رہتا تھا اور اس پر آمد و رفت بہت کم ہوا کرتی تھی۔ اچانک ہی گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی۔ پھر مسکان نے ایک ناقابلِ یقین منظر دیکھا۔ ایک جیپ نے ان کی گاڑی کا راستہ روک رکھا تھا اور اس میں سے چار مسلح نقاب پوش اتر کر ان کی گاڑی کی جانب بڑھ رہے تھے۔ مسکان کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخ نکلی۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ دور دور تک کوئی فردِ بشر نظر نہیں آرہا تھا۔ ان میں سے دو آدمیوں نے ڈرائیور کو قابو کیا جبکہ تیسرا مسکان کی جانب آیا اور باہر سے شیشہ بجا کر دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا۔ مسکان کے پاس اس کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا ورنہ وہ گولی بھی مار سکتا تھا۔ اس نے مسکان کو ہاتھ سے پکڑ کر گھسیٹا اور جیپ کی طرف بڑھا۔ پھر اس کے دوسرے ساتھی نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھی اور غراتے ہوئے بولا۔ ''شرافت سے جیپ میں بیٹھ جاؤ۔ شور مچانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ یہاں تمہاری آواز سننے والا کوئی نہیں۔''

مسکان جیسے تیسے جیپ میں سوار ہوئی اور اس کے بیٹھتے ہی جیپ چل پڑی۔ بقیہ افراد بھی دوڑتے ہوئے جیپ میں چڑھ گئے۔ مسکان نے اپنا پرس مضبوطی سے تھام رکھا تھا اور دل ہی دل میں اس مصیبت سے نکلنے کی دعائیں مانگ رہی تھی۔ اتنا تو وہ سمجھ گئی تھی کہ اسے اغوا کیا گیا ہے اور اب یقیناً تاوان کے طور پر چاچا جی سے ایک بڑی رقم کا مطالبہ کیا جائے گا لیکن وہ اس کا بندوبست کیسے کریں گے۔ اس نے سن رکھا تھا کہ اگر اغوا کنندگان کو تاوان ادا نہ کیا جائے تو وہ مغوی کو جان سے مار دیتے ہیں۔ ایسے میں اسے انکل یزدانی اور راحیل کا خیال آیا۔ صرف وہی لوگ تاوان دے کر اسے چھڑا سکتے تھے۔ کچھ دیر بعد جیپ ایک پرانے سے مکان کے سامنے رکی۔ ان میں سے ایک آدمی نے اس کا ہاتھ پکڑا اور مکان میں داخل ہو گیا۔ اس نے مسکان کی آنکھوں پر بندھی پٹی اتار دی اور اسے ایک کمرے میں بند کرتے ہوئے بولا۔ ''تم کچھ دیر آرام کر لو۔ ہم تمہارے لیے کھانے پینے کا بندوبست کرتے ہیں۔''

اس کے جانے کے بعد مسکان نے جلدی سے پرس کھولا اور اس میں سے موبائل نکال کر اپنے گریبان میں چھپا لیا۔ اسے ان لوگوں کی بے پروائی پر حیرت ہو رہی تھی جنہوں نے اس کے پرس کی تلاشی لینے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی۔ ویسے تو اس کے پرس میں موبائل کے علاوہ پاسپورٹ اور کچھ نقدی بھی تھی لیکن مسکان جانتی تھی کہ یہ چیزیں ان لوگوں کے لیے غیر اہم ہیں جبکہ موبائل اس کے بہت کام آسکتا تھا۔ اس نے سوچا کہ اس آدمی کے آنے سے پہلے انکل یزدانی کو اس واقعے کی اطلاع دے دے لیکن پھر اس کا ارادہ بدل گیا۔ اس نے تھوڑا سا انتظار کرنا مناسب سمجھا۔ جب تک یہ معلوم نہ ہو جائے کہ یہ کون لوگ ہیں اور اسے اغوا کر کے کیا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں، اس وقت تک کوئی قدم اٹھانا بے سود تھا۔

اس آدمی کی واپسی آدھ گھنٹے میں ہوئی۔ وہ مسکان کے لیے کچھ پھل اور کولڈ ڈرنک لایا تھا۔ اس نے وہ چیزیں مسکان کے سامنے رکھ دیں اور بولا۔ ''فی الحال اسی پر گزارہ کرو۔ تھوڑی دیر میں چیف یہاں پہنچنے والا ہے۔ اس کے آنے کے بعد ہی فیصلہ ہوگا کہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔''

یہ کہہ کر وہ دروازہ بند کر کے چلا گیا اور مسکان اس کی باتوں پر غور کرنے لگی۔ اسے بالکل بھی بھوک نہیں تھی لیکن پھر بھی اس نے تازہ دم ہونے کے لیے کولڈ ڈرنک کی بوتل اٹھائی اور منہ سے لگا لی۔ اب اسے بے چینی سے چیف کی آمد کا انتظار تھا۔ یہ تو اس کے آنے کے بعد ہی معلوم ہو سکتا تھا کہ ان لوگوں نے یہ کارروائی کس مقصد کے تحت کی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ایک بار پھر دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ مسکان نے سر اٹھا کر دیکھا تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس کے سامنے عادل دنیا بھر کی خباثت اپنے چہرے پر لیے بے شرمی سے مسکرا رہا تھا۔ اس نے اپنے ساتھ آنے والے لوگوں کو باہر رکنے کا اشارہ کیا اور مسکان کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ''تم میرے بھولے بھالے والدین کو جھانسا دے سکتی ہو لیکن مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتیں۔ میں نے کہا تھا نا کہ یہ انکار تمہیں بہت مہنگا پڑے گا۔ میں اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ تم شرافت سے نہیں مانو گی۔ اس لیے مجھے مجبوراً یہ قدم اٹھانا پڑ گیا۔ شاید میں چند روز بعد کوئی کارروائی کرتا لیکن تم نے آج گھر سے نکل کر میرا کام آسان کر دیا۔ مجھے رات ہی تمہارے پروگرام کا علم ہو گیا تھا۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ اس سے اچھا موقع ملنا مشکل ہے۔ اس لیے تمہیں اپنا مہمان بنا کر لے آیا۔''

www.pkdigest.com

"تم نے یہ حرکت کر کے ثابت کر دیا ہے کہ میرا انکار بلا جواز نہ تھا۔ تمہیں اگر پیسوں کی ضرورت تھی تو مجھ سے کہہ دیتے، میں کوئی نہ کوئی انتظام کر دیتی۔ یہ ڈراما کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

عادل نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔ "یہ ڈراما نہیں بلکہ تمہاری زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ جب سامنے پانی کا چشمہ ابل رہا ہو تو ایک گلاس سے بندے کی پیاس نہیں بجھتی۔ میرا ابھی دو چار لاکھ سے گزارہ نہیں ہوگا بلکہ میں چاہتا ہوں کہ سونے کی کان میری ہو جائے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" مسکان غصے سے بولی۔ "کیا چاہتے ہو تم؟"

"تمہارے پاس چند گھنٹوں کی مہلت ہے۔ بہتر ہوگا کہ ہنسی خوشی میری بات مان لو۔ عصر اور مغرب کے بعد ہم دونوں کا نکاح ہوگا۔ اس وقت تک تم یہیں قید رہو گی۔ تمہیں ہر حال میں قاضی کے سامنے ہاں کہنا ہے اور نکاح نامے پر دستخط کرنا ہوں گے۔ ورنہ تمہارے ساتھ ساتھ ظفر کی زندگی بھی خطرے میں ہے۔ میں نے اس نیک کام کے لیے کرائے کے قاتل کی خدمات بھی حاصل کر لی ہیں۔ بہتر ہوگا کہ تم بھی ایک نظر اسے دیکھ لو تا کہ تمہیں میری بات کا یقین آجائے۔"

یہ کہہ کر عادل نے دونوں ہاتھوں سے تالی بجائی۔ دروازے کا پٹ کھلا اور مسکان کو وہاں ایک سفاک شخص کا چہرہ نظر آیا۔ اس کا سر گھٹا ہوا تھا اور ماتھے سے ذرا اوپر ایک زخم کا نشان تھا۔ چہرے پر بڑی بڑی مونچھوں اور سیاہ چشمہ لگائے وہ بے حد سفاک لگ رہا تھا۔ اس نے ایسا لباس پہن رکھا تھا جیسے اسپتال کے آپریشن تھیٹر میں ڈیوٹی انجام دینے والا عملہ پہنتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک پستول تھا۔

"رجبہ بہت ہی سفاک اور بے رحم قاتل ہے۔ تم جیسی خوب صورت لڑکی بھی اسے اپنے ارادے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ میں نے ساری صورتِ حال تمہارے سامنے رکھ دی ہے۔ اپنی اور بھائی کی زندگی چاہتی ہو تو میری بات مان لو ورنہ..."

"بکواس بند کرو۔" وہ غضب ناک انداز میں چلائی۔ "بند کرو یہ ناٹک۔ شاید تم جانتے نہیں کہ میں برطانوی شہری ہوں اور میرا سفارت خانہ اس گمشدگی پر خاموش نہیں رہے گا۔"

"اس وقت تک بہت دیر ہو چکی ہوگی اور وہ کوشش کے باوجود تمہارے بارے میں کچھ نہ جان پائیں گے۔ چلتا ہوں۔ عصر کے وقت قاضی اور گواہوں کو لے کر آؤں گا۔ تیار رہنا۔"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ دروازہ باہر سے لاک ہو گیا تھا۔

اب اسے فوری طور پر اپنے بچاؤ کی کوئی تدبیر کرنا تھی۔ اگر موبائل پر بات کرتی تو اس کی آواز باہر جا سکتی تھی چنانچہ اس نے دیوار کی طرف منہ کر کے موبائل نکالا اور یزدانی صاحب کو ایس ایم ایس کے ذریعے مختصر الفاظ میں اپنی پوزیشن سے آگاہ کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے انہیں ایک مس کال بھی دے دی۔ اب وہ دعا کر رہی تھی کہ خدا کرے یزدانی صاحب اس کا ایس ایم ایس پڑھ لیں۔ اس بات کا بھی خدشہ تھا کہ اگر وہ کورٹ میں ہوئے تو ان کا موبائل بند ہوگا اور ایسی صورت میں شاید وہ بروقت اس کا پیغام نہ پڑھ سکیں۔ اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی جب چند منٹ بعد ہی یزدانی صاحب کا جوابی پیغام آگیا۔ انہوں نے بھی احتیاطاً فون کرنے سے گریز کیا تھا۔ وہ جاننا چاہ رہے تھے کہ کیا مسکان اس لوکیشن کے بارے میں کچھ بتا سکتی ہے۔ جواب میں مسکان نے پیغام دیا کہ وہ صرف عادل کے ذریعے ہی اس جگہ تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ وہ جلد از جلد اسے قابو کرنے کی کوشش کریں۔

عادل دوپہر کا کھانا کھا کر اپنے کمرے میں لیٹا آنے والے لمحات کے تصور سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اب سے چند گھنٹوں بعد مسکان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کی ہو جائے گی اور اس کے ساتھ ہی وہ اپنے تایا کی چھوڑی ہوئی دولت اور جائداد کا مالک بن جائے گا۔ ظفر سے اسے کوئی خطرہ نہیں تھا کیونکہ اس کا ہونا یا نہ ہونا برابر تھا۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ وہ مسکان کے ساتھ انگلینڈ چلا جائے گا اور اس کے تمام اثاثے فروخت کر کے پاکستان واپس آ کر کوئی کاروبار شروع کرے گا اور اگر مسکان نے ذرا بھی اکڑ دکھانے کی کوشش کی تو وہ ظفر کے ساتھ ساتھ اس کا بھی کام تمام کر دے گا۔

خیالی پلاؤ کی دیگ ابھی پک رہی تھی کہ گل زماں ہانپتا کانپتا اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور وہ خاصا گھبرایا ہوا لگ رہا تھا۔ عادل اسے دیکھ کر بستر سے اٹھ گیا اور کچھ کہنے ہی والا تھا کہ گل زماں بولا۔ "پتر! غضب ہو گیا... مسکان بی بی کو کسی نے اغوا کر لیا۔"

"کیا... کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" عادل نے بھی پریشان ہونے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔

"وہ صبح راولپنڈی کے لیے روانہ ہوئی تھی کہ راستے میں ایک جیپ میں سوار چار مسلح نقاب پوشوں نے اس کا راستہ روکا اور مسکان کو ساتھ لے گئے۔ ڈرائیور کو انہوں نے بے ہوش کر دیا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے گرتا پڑتا یہاں تک پہنچا ہے۔"

"میں نے اسی لیے منع کیا تھا کہ وہ تنہا باہر نہ جائے۔ ایسے لوگ ہمیشہ جرائم پیشہ افراد کی نظروں میں رہتے ہیں لیکن وہ تو اپنی مرضی چلانے کی عادی ہے۔ اگر اس کے پاس عقل نہیں ہے تو کم از کم آپ کو ہی سمجھ سے کام لینا چاہیے تھا۔"

"میری ہی عقل پر پتھر پڑ گئے تھے جو اس کی باتوں میں آ گیا۔" گل زماں اپنا سر پیٹتے ہوئے بولا۔ "میرا خیال ہے کہ ہمیں فوراً پولیس میں رپورٹ درج کرا دینی چاہیے۔"

"ایسی غلطی مت کیجیے گا۔" عادل نے دبی آواز میں کہا۔ "ڈرائیور کو بھی منع کر دیں کہ وہ کسی سے اس کا تذکرہ نہ کرے۔ جن لوگوں نے اسے اغوا کیا ہے، وہ تھوڑی دیر میں ہم سے رابطہ کریں گے۔ اب سوچنا یہ ہے کہ تاوان کی رقم کا بندوبست کیسے کیا جائے گا؟"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ وہ کوئی چھوٹا موٹا مطالبہ نہیں کریں گے۔ ہو سکتا ہے دس بیس لاکھ یا پھر اس سے بھی زیادہ جبکہ ہم تو دس بیس ہزار کا بھی بندوبست نہیں کر سکتے۔ میرے خیال میں ہمیں وقت ضائع کرنے کے بجائے جلد از جلد پولیس کو اطلاع دے دینی چاہیے۔"

"گھر کی بات گھر میں رہے تو اچھا ہے۔" عادل نے سنجیدگی سے کہا۔ "مسکان کے اغوا کی خبر پھیلنے سے ہماری بدنامی ہوگی اور ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ کچھ دیر انتظار کر لیا جائے۔ ممکن ہے تب تک یہ تو معلوم ہو جائے کہ اغوا کرنے والوں کی ڈیمانڈ کیا ہے۔"

گل زماں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ چاچی تیزی سے چلتی ہوئی آئی اور بولی۔ "پولیس آئی ہے دروازے پر۔ تمہاری لاڈلی نے تماشا بنا دیا ہمارا۔ اب جاؤ بھگتو ان پولیس والوں کو۔"

عادل بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ "یہ ضرور اس ڈرائیور کی کارستانی ہے، اسی نے پولیس کو بتایا ہوگا۔"

وہ دونوں باہر آئے تو بیرونی برآمدے میں وکیل یزدانی، پولیس انسپکٹر اور چار پانچ سپاہیوں کے ساتھ ان کا منتظر تھا۔ ان کے ساتھ برطانوی سفارت خانے کا ایک اہلکار بھی تھا۔ انسپکٹر آگے بڑھا اور بولا۔ "ہمیں مس مسکان سے ملنا ہے۔"

"وہ تو گھر پر نہیں ہیں۔ صبح ہی پنڈی چلی گئی تھیں۔" گل زماں کے بجائے عادل نے جواب دیا۔

"وہ پنڈی نہیں پہنچیں۔ اسی لیے ہم ان کا پتا کرنے یہاں آئے ہیں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں نے خود اس کے لیے گاڑی کا انتظام کیا تھا اور جس ڈرائیور کے ساتھ اسے بھیجا تھا، وہ بھروسے کا آدمی ہے۔ اسی گاؤں کا رہنے والا ہے۔ میں اسے برسوں سے جانتا ہوں۔" گل زماں بولا۔

"اسی ڈرائیور سے معلوم ہوا ہے کہ مس مسکان کو اغوا کیا گیا ہے اور آپ کو بھی اس کا علم ہے۔ پھر بھی آپ ہم سے یہ بات چھپا رہے ہیں۔"

"ہمیں مسکان کی زندگی عزیز ہے۔ اسی لیے پولیس کو اطلاع دینا مناسب نہ سمجھا۔" عادل ہکلاتے ہوئے بولا۔ "ہم خود ہی ان سے نمٹ لیں گے۔"

"مسٹر عادل! پولیس کو چکما دینے کی کوشش مت کرو۔" انسپکٹر اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔ "مسٹر یزدانی نے تمہارے خلاف مس مسکان کے اغوا کی رپورٹ درج کروائی ہے۔ تمہیں ہمارے ساتھ تھانے چلنا ہوگا۔"

"یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ میں بھلا اپنی کزن کو کیوں اغوا کروں گا؟ آپ ایک اجنبی شخص کے کہنے پر اتنا بڑا الزام لگا رہے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ یہ کون ہے اور مسکان سے اس کا کیا تعلق ہے؟"

انسپکٹر نے دو سپاہیوں کو اشارہ کیا تو انہوں نے آگے بڑھ کر عادل کو ہتھکڑی لگا دی۔ انسپکٹر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "تمہیں ہر سوال کا جواب مل جائے گا لیکن اس سے پہلے تم ہمیں بتاؤ گے کہ مسکان کو کہاں چھپا رکھا ہے۔"

عادل کا کھیل ختم ہو چکا تھا۔ اس لیے اس نے سر جھکانے میں ہی عافیت جانی۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر مسکان کو بازیاب کرا لیا گیا۔ مسکان کے کہنے پر یزدانی صاحب نے ظفر کو بھی اپنی تحویل میں لے لیا۔ جانے سے پہلے مسکان نے ایک الوداعی نظر اس حویلی پر ڈالی جس میں رہنے کی آرزو لیے اس کا باپ دنیا سے رخصت ہو گیا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی گل زماں کے پاس آئی اور بولی۔ "اگر آپ ظفر کو میرے ساتھ جانے دیتے تو شاید ہم دونوں آپ کے حق میں اس حویلی سے دستبردار ہو سکتے تھے مگر آپ نے تو مجھے ایک بے بس اور کمزور لڑکی جان کر لمبا ہاتھ مارنے کی کوشش کی اور خود ہی اپنے جال میں پھنس گئے۔ میں جا رہی ہوں، کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔ یہ حویلی آپ کو مبارک ہو۔ اور ہاں... اگر عادل بھائی کی ضمانت کے لیے کسی قسم کی مدد درکار ہو تو میں یزدانی صاحب سے آپ کی سفارش کر سکتی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ یزدانی صاحب کے ہمراہ روانہ ہو گئی۔ اب اسے فوری طور پر ظفر کے پاسپورٹ اور ویزا کا بندوبست کرنا تھا۔ وہ جلد از جلد انگلینڈ روانہ ہونا چاہتی تھی جہاں راحیل بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

www.pkdigest.com

دوسرا رنگ

گمشدہ کل

احمد اقبال

کچھ لوگوں کی زندگی میں ہر شے جز وقتی ہوتی ہے ...... وہ اس کھوج و جستجو میں کوشاں رہتے ہیں کہ زندگی کو اپنی مرضی اور منشا کے مطابق گزاریں سکیں ...... مگر پے در پے رونما ہونے والے حادثات کچھ بھی کل وقتی نہیں رہنے دیتے ...... زندگی کو نئے رنگوں سے ہم آہنگ کرنے کا عزم لے کر گھر سے نکلنے والے ثابت قدم نوجوان کی کوششیں۔

اس تغیر پرست کا احوال جس کی زندگی میں سب ہی کچھ جز وقتی تھا

وہ بہت دیر سے سونے کی ناکام کوشش میں صرف کروٹیں بدل رہا تھا... نیند نہ آنے کے اسباب میں کچھ داخلی عوامل تھے تو کچھ خارجی جو اس کے بس سے باہر تھے۔

مثال کے طور پر اس کا یہ ایک کمرے والا اپارٹمنٹ جس کا مجموعی رقبہ ساڑھے تین سو مربع فٹ تھا... شاید اس سے کم جگہ میں رہائش کا تصور کسی جیل خانے کی کوٹھری میں ہی ممکن تھا۔ چنانچہ بنانے والوں نے اسے اپارٹمنٹ کا نام دے دیا ورنہ اسی گلستانِ جوہر میں سڑک کے پار سیکڑوں گز پر پھیلے ہوئے ایسے لاتعداد بنگلے تھے جن کے ڈرائنگ روم اس کے اپارٹمنٹ سے بڑے تھے۔ اندر آنے کے ساڑھے تین فٹ چوڑے راستے پر بائیں جانب دو خانے تھے جو پانچ فٹ مربع تھے۔ ایک کا نام غسل خانہ تھا، دوسرے کا باورچی خانہ... ان خانوں کا نقشہ ساز ذہنی کنجوسی کا ماہر تھا ورنہ ایسا اپارٹمنٹ ایجاد ہی کیسے ہوتا جسے ہر اشتہار میں ''لگژری اپارٹمنٹ'' بتایا جاتا تھا... غسل خانے کے ڈبلیو سی کو استعمال کرنے کے بعد اس پر ایک تختہ گرایا جا سکتا تھا... یوں وہ ہموار فرش وجود میں آتا تھا جس پر کھڑا ہو کے وہ سر پر گرنے والے شاور کے پانی سے... بشرطیکہ پانی آ رہا ہو... غسلِ صحت فرما سکتا تھا... ورنہ شاور سے ٹھنڈی ہوا برآمد ہوتی تھی اور اس کے سینے سے سرد آہ اور کام ختم... باورچی خانے میں ایک چولھے پر وہ کچھ بھی پکانے کے لیے آزاد تھا... دال سے چکن قورمے تک... بلڈر نے اس پر کوئی پابندی نہیں لگائی تھی۔

اپارٹمنٹ میں اس کے ساتھ خدا کی بنائی ہوئی دیگر مخلوق کے لیے بھی وافر جگہ تھی مثلاً چھپکلی... مچھر... کاکروچ... مکھیاں... چیونٹیاں اور دیمک وغیرہ... اور ان سب نے ایک مشترکہ لائحہ عمل سے اس کو سمجھا دیا تھا کہ جیسے انہیں بے دخل اور ختم کرنے کی ہر کوشش اب تک ناکام ہوئی ہے ایسے ہی آئندہ بھی ہوگا۔ چنانچہ ان کے درمیان پُرامن بقائے باہمی کا غیر تحریری معاہدہ ہو چکا تھا اور اب وہ امن اور شانتی کے ساتھ اس اپارٹمنٹ کو شیئر کر رہے تھے... اب وہ قاتل برانڈ حشرات الارض مار اسپرے پر فضول پیسے بھی ضائع نہیں کر رہا تھا۔

گلستانِ جوہر بسانے والوں نے بھی منصوبہ بندی کا وہ کمال دکھایا تھا کہ سو دو سو گز کو ایک ... سامنے میں ... کر دیا تھا۔ ایک طرف ساٹھ گز کے ''لگژری بنگلوز'' تھے تو دوسری طرف جس گنارقبے پر پھیلے ہوئے چھ سو گز کے ''غریب خانے''... عرش کی یہ بلندیاں فرش کی پستیوں سے ہیں... ساٹھ گز والے نہ ہوتے تو چھ سو گز والے خدا کا شکر کیسے بجا لاتے اور مغرور کیسے ہوتے... اور چھ سو گز کے عشرت کدے نہ ہوتے تو ساٹھ گز والوں کو نوشتۂ تقدیر کا قائل کرنے کے لیے مولوی صاحب دلیل کہاں سے لاتے۔

نیند نہ آنے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ باہر ایک طرف سے لاؤڈ اسپیکرز پر فرش سے عرش تک سنائی جانے والی محفلِ میلاد جاری تھی اور نعت خواں سونے یا رونے والوں کو ترنم سے ثواب پہنچا رہے تھے تو دوسری طرف کسی شادی خانہ آبادی کا پارٹ ون مہندی کی بے سُری چیخ پکار، ڈھولک کی تھاپ اور جوابی کارروائی کی صورت میں چل رہا تھا... مہندی... پھر بارات اور آخری رسوم میں ولیمہ.................. ہیجانی شادی میں اردگرد کے نہ جانے کتنے عبداللہ دیوانے ہونے کے قریب تھے۔

لیکن عامر خاں پاکستانی کے... کباب سیخ ہیں اور کروٹیں ہر سو بدلتے ہیں... بے سکون ہونے کا اصل سبب

کچھ اور تھا۔ اپنے اس اپارٹمنٹ کے ماحول کا تو وہ عادی ہو چکا تھا جہاں ہر روز کوئی شورِ محشر بپا ہوتا تھا... تو وہ غم ہی کسی نعمۂ شادی نہ سہی... وہ تھکا ہارا آتا تھا تو جوتے کپڑے اتار کے اور بعض اوقات ان کے بغیر ہی بستر پر گرتا تھا تو اس کی آنکھیں پہلے ہی بند ہوتی تھیں... اس نے اپنے احساس پر ایسا آٹومیٹک لاک لگانے میں مہارت حاصل کر لی تھی کہ ڈسٹرب کرنے والے بیرونی عناصر اس کے کانوں یا خیالوں تک رسائی حاصل ہی نہ کریں... چنانچہ وہ ہر طرف مکمل خاموشی اور سکون کے احساس کے سوا کچھ بھی محسوس نہیں کرتا تھا اور صبح تک یوں سوتا تھا جیسے قبر میں مُردے صبحِ محشر کے انتظار میں۔

آج اس کو ایک اجنبی مسافر کا خیال پریشان کر رہا تھا جس نے ... زندگی کی آخری سانسوں ... پورا کرنے کے لیے اس کی ٹیکسی کی پچھلی سیٹ کو منتخب کیا تھا... وہ اس کے خیال کو نادہندہ کرائے دار کی طرح بے دخل کرنے سے قاصر تھا... کرایہ وہ کیسے ادا کرتا جبکہ اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی وہ اللہ میاں کے پاس پہنچ چکا تھا۔

☆☆☆

گزری ہوئی شام کے آخری حصے میں جب تاریکی اترنے لگی تھی، اسے ایک روشن خیال رومانی جوڑے نے شرفِ میزبانی بخشا... لیلیٰ کی آب و تاب اسٹار پلس کے کسی ڈرامے کی ہیروئین سے کم نہ تھی اور مجنوں کسی حد تک مانگے جینس کا برابر کا ... بھی لگتا تھا۔ پچھلی سیٹ پر چپک کر بیٹھنے کے بعد مجنوں نے کہا کہ چلو... کہیں بھی چلو... اچھا، پہلے ہل پارک چلو... اور لیلیٰ نے کہا کہ اپنی نظر سڑک پر رکھنا ہے کہ ہم اتریں

kdigest.com

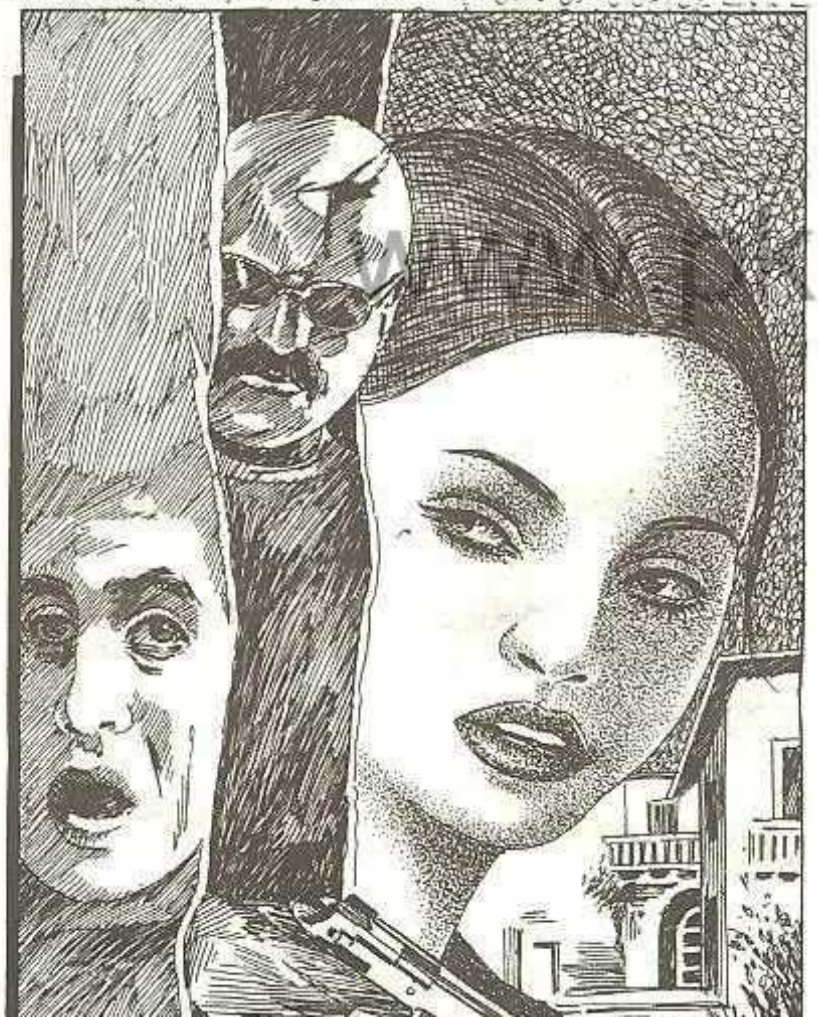

تو کرایہ دیں اور تمھیں ٹیکسی کے ڈینٹ پینٹ کا خرچہ نہ اٹھانا پڑے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ لیلیٰ مجنوں ہل پارک پر ٹیکسی میں غٹرغوں کرتے رہے اور وہ پہاڑی پر سے کبوتر کی طرح شہر کا نظارہ دیکھتا رہا... پھر وہ اسے کلفٹن لے گئے اور اسے کہا کہ وہ دراوراست پر چلتا جائے... بس مڑ کر نہ دیکھے۔

اسے یہ خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں آخر میں وہ اسے چھری چھنڈی یا کوئی ریوالور دکھا کے خالی ہاتھ چلتا نہ کردیں لیکن مجنوں کی صحت واقعی اس خانہ خراب عشق کے باعث یا کسی اور وجہ سے خاصی افسوسناک تھی اور وہ اس کی ایک چھینٹی لگا سکتا تھا کہ وہ سارا عشق بھول جائے... لیکن مجنوں نے پانچ سو کا نوٹ پہلی قسط کے طور پر پیش کر کے اس کا یہ اندیشہ دور کر دیا تو وہ بے غم ہوگیا اور سی ویو کے آخری تاریک حصے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے سمندر کو دیکھنے پر بھی راضی ہوگیا تاکہ لیلیٰ مجنوں کو خلوت میسر رہے۔

جب واپسی کے سفر کا آغاز ہوا تو سب خوش تھے۔ لیلیٰ مجنوں بھی اور وہ بھی... مجنوں نے مزید پانچ سو روپے اس عشق پر قربان کردیے تھے... اس کے لیے دو گھنٹے کے ہزار بہت تھے۔ مجنوں کے لیے وصل لیلیٰ کے ہزار بھی بہت کم... ہر شخص اپنے کام سے کام رکھے اور کسی سے پنگا نہ لے تو دنیا کتنی پرامن جگہ ہوجائے۔

ایک شریفانہ علاقے میں یہ رفاقت ختم ہوئی تو اس نے ہزار میں سے دو تین سو نکال کے خود کو ایک شاندار دعوت دینے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھا اور کڑاہی سے ایک سالم مرغی کے اعضا کو اپنے معدے میں منتقل کرنے کے بعد وہ ہوٹل سے نکلا تو ایک ناک جلانے والی کوک برانڈ ڈکار کے ساتھ شکر الحمدللہ کہہ کے پھر اپنی چار پہیوں والی حسینہ پر سوار ہوگیا۔ اپنی ٹیکسی کا یہ نام خود اس نے نہیں رکھا تھا... سابق مالک نے چابی اب میرے حوالے کرتے ہوئے رقت آمیز لہجے میں کہا تھا کہ یہ نام رہنے دینا... یہ میری مرحومہ زوجۂ اول کا نام تھا۔

اسے کچھ دور سڑک سے نسبتاً تاریک حصے میں ایک شخص کا سایہ سا نظر آیا۔ وہ کوئی سواری اٹھانے بٹھانے کے موڈ میں نہیں تھا لیکن وہ تو جیسے خودکشی پر کمربستہ تھا کہ سامنے آگیا۔

اس نے خفگی سے کہا۔ ''جناب! خودکشی ہی کرنی تھی تو کسی بس، ٹرک کا انتخاب کرتے۔''

مگر اس نے سنا ہی نہیں۔ ''دیکھو... میری طبیعت خراب ہے... مجھے کسی اسپتال پہنچا دو... پلیز...''

ظاہر ہے، اس کے بعد انکار کی گنجائش کہاں تھی مگر جواب سنے بغیر اس شخص نے پیچھے والا دروازہ کھولا اور سیٹ پر گر گیا۔ ''تھینک یو۔''

وہ چالیس پینتالیس سال کا شخص خاصے معقول لباس میں تھا اور یقیناً تعلیم یافتہ تھا۔ بظاہر اس کی صحت بھی ٹھیک لگتی تھی۔ ''کیا ہوا ہے آپ کو جناب؟'' اس نے پوچھا۔

''میرا دل گھبرا رہا ہے... کچھ درد ہے اور سینے میں بھی...''

وہ الرٹ ہوگیا۔ ''تو آپ کو کہاں لے چلوں؟''

''میرا خیال ہے... دل کے اسپتال... این آئی سی ڈی... ان کی ایمرجنسی کا راستہ پیچھے ہے۔''

''مجھے معلوم ہے سر... آپ آرام سے بیٹھ جائیں۔'' اس نے ٹیکسی کو دوڑانا شروع کیا۔ رات کے وقت سڑک پر کم ٹریفک تھا۔ ہوٹل تاج محل سے پہلے اس نے مڑ کر دیکھا... وہ سر پیچھے لگائے بیٹھا تھا۔

''اب کیسی طبیعت ہے سر...''

مسافر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کچھ پریشان ہوا۔ اس نے گاڑی کو بائیں ہاتھ پر موڑا... سامنے سے ٹریفک کی پوری لائن آرہی تھی جو ختم ہونے کا نام نہیں لیتی تھی۔ کوئی اشارہ دیکھنے کے باوجود اسے گیٹ میں مڑنے کی مہلت دینے کو تیار نہ تھا... سب پہلے گزرنا چاہتے تھے۔ بالآخر اس نے رسک لیا اور لائن کے بیچ میں سے گیٹ میں داخل ہوگیا۔ ایک رکشا والے نے چلا کے اسے گالی دی مگر اس نے نہیں سنی۔ وہ ٹیکسی کو سیدھا لے گیا اور ایمرجنسی کے گیٹ پر رکا۔

مسافر بے ہوش پڑا تھا... وہ دوڑتا ہوا اندر گیا اور دو مددگار لے آیا۔ انہوں نے مسافر کو سیٹ سے کھینچ کے نکالا اور اسٹریچر پر ڈالا۔ وہ پیچھے چلا گیا... ایک مددگار نے کہا۔ ''یار! اس میں تو کچھ نہیں۔''

اس کا دل بیٹھ گیا۔ ''کیا مطلب... یہ مر گیا؟''

''لگتا ہے... خیر، دیکھتے ہیں۔''

اس کے سامنے ڈاکٹرز نے مسافر کو اسٹریچر سے بیڈ پر منتقل کیا... نرسوں نے بڑی مہارت سے اس کے مانیٹر لگائے... ایک ڈاکٹر اس پر جھک کے دل کی دھڑکن دیکھنے لگا... پھر اس نے سینہ دبا کے رک جانے والے دل کو اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی... ایمرجنسی وارڈ میں یہ صبح شام کا تماشا تھا... اس وقت بھی جو مر چکے تھے ان کے لواحقین دھاڑیں مار کے رو رہے تھے... باقی امید و بیم کی کیفیت میں پڑے تھے۔

اس نے نرسوں کو ایک مشین لاتے دیکھا۔ انہوں نے مشین کو ایک الیکٹرک ساکٹ میں لگایا... پھر دو تاروں سے

منسلک پیڈ مرجانے والے کے سینے پر دبا کے رکھے۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ''ڈیس...'' مریض اچھلا... مانیٹر پر دل کی دھڑکن بتانے والی لکیر تھوڑا سا لہرائی... پھر سیدھی ہوگئی... ڈاکٹروں نے اسے دوسرا شاک دیا... پھر تیسرا... نتیجہ صفر... ختم ہوئی بارش سنگ... انہوں نے سامان سمیٹا۔

''بھئی کون ہے اس کے ساتھ... سوری۔'' ڈاکٹر نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''اسٹاف... ڈیتھ سرٹیفکیٹ بنا دو... ڈی او اے، ڈیڈ آن ارائیول... جب لایا گیا تو مر چکا تھا۔''

اس وقت وہ گونگا بہرا بن گیا... وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹا... خاموشی سے چوروں کی طرح دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے اندر کی ایک آواز چلا کے اسے خبردار کرنے لگی... بھاگ یہاں سے عامر خاں پاکستانی... اس سے پہلے کوئی تیری طرف انگلی اٹھائے کہ اسے لانے والا یہ ہے... یہاں سے نکل جا ورنہ کسی لمبے چکر میں پڑ جائے گا... پولیس پوچھے گی کہ یہ کون تھا... تیری گواہی تجھے مشکل میں ڈال دے گی... کہیں بعد میں وارثوں نے کہا کہ ڈیتھ سرٹیفکیٹ میں جھوٹ لکھا گیا ہے... ابا کو ہارٹ پرابلم بھی نہیں تھی... انہیں تو بلڈ پریشر بھی نہیں تھا... ان کا کولیسٹرول لیول ٹھیک تھا... ان کی موت کا سبب معلوم کرنے کے لیے پوسٹ مارٹم لازمی ہے... پھر [illegible] ہے... تو کہاں کہاں گواہی دے گا زمین کے تارے... عامر خاں پاکستانی...

جب وہ نکل گیا تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس کی ٹیکسی وہیں کھڑی تھی جہاں اس نے چھوڑی تھی... وہ دوڑ کر اپنی سیٹ پر بیٹھا اور سیدھا نکل گیا... گھوم کے دوسرے دروازے سے سڑک پر آگیا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور پسینا اس کے جسم پر بہنے لگا تھا۔ مرنے والے کی صورت اس کے سامنے ونڈ اسکرین پر یوں چسپاں ہوگئی تھی جیسے وہ ٹی وی اسکرین ہو... کیا تماشائے عبرت ہے کہ ابھی آدھا گھنٹا پہلے جو شخص زندہ سلامت سڑک کے کنارے کھڑا تھا وہ اب چادر اوڑھے ایک اسٹریچر پر مرا پڑا ہے۔ اس کی آواز عامر خاں کے کانوں میں گونج رہی تھی... مگر وہ خدا کا شکر اس لیے بجا لا رہا تھا کہ بڑی صفائی سے نکل آیا تھا۔ خدا کرے کسی نے اس کی ٹیکسی کا نمبر نہ دیکھا ہو... عام طور پر لوگ نہیں دیکھتے... اب رہ گئی اس کی صورت... تو جب تک اس کی پراسرار موت کی تفتیش شروع ہوگی... اگر ہوئی... تب تک تفصیل کسے یاد رہے گی... زیادہ امکان تو اسی بات کا ہے کہ موت کا سبب وہی ہو جو لکھا گیا۔

لیکن اپنے گھٹیا سی اپارٹمنٹ میں آج وہ ہر روز کی

کون کہتا ہے کہ؟
اولاد نہیں ہو سکتی
آج بھی لاکھوں گھرانے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں۔ مایوسی گناہ ہے۔ انشاءاللہ اولاد ہوگی۔ خاتون میں کوئی اندرونی پرابلم ہو یا مردانہ جراثیم کا مسئلہ۔ ہم نے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک خاص قسم کا بے اولادی کورس تیار کیا ہے۔ جو آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھلا سکتا ہے۔ آپکے گھر میں بھی خوبصورت بیٹا پیدا ہو سکتا ہے۔ آج ہی گھر بیٹھے فون پر تمام حالات سے آگاہ کر کے بذریعہ ڈاک وی پی VP بے اولادی کورس منگوائیں۔
المسلم دارالحکمت رجسٹرڈ (دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد۔ پاکستان
0300-6526061
0547-521787
فون اوقات
صبح 9 بجے سے رات 11 بجے تک
آپ ہمیں صرف فون کریں
دوائی آپ تک ہم پہنچائیں گے

www.pkdigest.com

طرح سونے میں ناکام تھا۔ ایک تو ضمیر صاحب تھے جو اندر سے اس کی چھترول کر رہے تھے کہ بزدل عامر خاں پاکستانی... ایسے... کس طرح بھاگ آئے... کیا تھا اگر مرنے والے کے لیے نکی بھُج کے کچھ کر دیتے... اس کی جیب میں سے شناخت کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور ملے گا... لاش بالآخر اس کے گھر پہنچ جائے گی... سنا ہے والی وارث نہ ملے تو اسپتال کا نچلا دیگیل عملہ جیب سے مال غائب کر دیتا ہے۔ سونے کی انگوٹھی... گھڑی سب اتار لیتا ہے۔

معلوم نہیں وہ کون تھا... اس کا گھر کہاں تھا... کیا گزرے گی اس کے بیوی بچوں پر جب سائرن بجاتی اور لائٹ چمکاتی اسپتال کی ایمبولینس ان کے دروازے پر آ رکے گی اور وارثوں سے کہا جائے گا کہ لاش وصول کرلو... ان پر تو جیسے چھت آن گرے گی۔

جیسے اس کے گھر کی چھت آ گری تھی۔

☆☆☆

صبح عامر خاں پاکستانی کی طبیعت نیند کی کمی کے باعث بھی مضمحل تھی... میلا اور مایوں کے مشترکہ شور سے اس کے دونوں کان صبح تین بجے تک تقریباً خراب ہو چکے تھے لیکن اس کے بعد یہ مقابلہ ختم ہوا تو وہ کچھ سونے کے قابل ہو گیا تھا۔ اصل خرابی اس کے دماغ کے اندر پیدا ہو گئی تھی... اس کا بیرونی شور کو بلاک کرنے والا سرکٹ کام نہیں کر رہا تھا کیونکہ وہ سوچ رہا تھا... لیلیٰ مجنوں کے بارے میں نہیں... اس کے بارے میں جس نے مرنے کے لیے اس کی ٹیکسی کو منتخب کیا تھا... گھر جا کر مرتا تو شاید کوئی اس کے سرہانے آخری وقت میں سورۂ یٰسین پڑھتا... اس کے حلق میں آبِ زم زم ٹپکاتا... اسے کلمہ پڑھنے کو کہتا۔

آخر وہ کون تھا؟ اس کے دماغ کی سوئی اس ایک سوال پر آ کے اٹک گئی تھی... اس نے خود کو بہت قائل کرنا چاہا کہ اس سوال کا جواب کسی طرح بھی اس کے لیے اہمیت نہیں رکھتا مگر جیسے اندھیرے میں ایک مچھر کان میں چیں چیں کر کے بھاگ جاتا ہے اور آدمی اپنے گالوں پر بلاوجہ تھپڑ مارتا رہتا ہے... ایسے ہی یہ سوال اسے تنگ کر رہا تھا۔

بالآخر اس نے منہ کو ذرائی کلین کرتے ہوئے... کیونکہ اوپر ٹنکی میں پانی نہ ہونے سے نل صرف ہوا دے رہا تھا... اس نے طے کیا کہ وہ اسپتال جا کے دیکھے گا... کیا لواحقین اس کی لاش لے گئے ہیں... وہ کون تھے... ڈیتھ سرٹیفکیٹ میں انہوں نے کوئی پتا لکھوایا تھا؟ پتا معلوم ہو گیا تو وہ مرنے والے کی نمازِ جنازہ میں ضرور شریک ہو جائے گا... شاید اس سے اس کے دل کو کچھ سکون حاصل ہو... آخر مرنے والے نے اس کے سامنے اس کی ٹیکسی میں جان دی تھی... وہ اجنبی سہی... اس کا ایک تعلق تو بن گیا تھا۔

پھر دوسرا سوال کسی شرپسند کی طرح ہنگامہ کرنے آ جاتا تھا... یار عامر خاں پاکستانی... فرض کرو وہ لاش ابھی تک وہیں موجود ہوئی... فرض کرو اس کی جیب سے کچھ نہ ملا جو لواحقین سے رابطے میں مددگار ہوتا... اور تمہیں دیکھتے ہی کسی نے شور مچا دیا کہ یہ لایا تھا اسے... پھر؟ پھنس گئے نا تم... پولیس تمہیں شاملِ تفتیش کرے گی... تمہاری ٹیکسی کے ساتھ...

تاہم اس نے دوسرے سوال کے خلاف ایک مضبوط دفاعی بندوبست کرلیا... وہ پہلے دیکھے گا... براہِ راست سوال نہیں کرے گا... اس وقت رات والا عملہ تو ہو گا نہیں... اس کے پہچانے یا پکڑے جانے کا خطرہ کوئی نہیں... وارڈ میں بہت لوگ ہوتے ہیں... کون آ رہا ہے، کون جا رہا ہے... کوئی نہیں دیکھتا... گزشتہ رات ایک لاش اسٹریچر پر چادر سے ڈھکی ایک دیوار کے ساتھ ہی موجود تھی... لواحقین موجود نہ ہوں تو اسپتال والے ایسا ہی کرتے ہیں... وہ چادر ہٹا کے دیکھے تو کسی کو اعتراض کیوں ہو گا... سب ہی گم شدہ یا لاپتا ہو جانے والوں کو تلاش کر رہے ہوتے ہیں۔ اسپتالوں میں... مردہ خانوں میں... ایدھی کے کولڈ اسٹوریج میں...

بس... اگر لاش مل گئی تو... ورنہ گھر جائے گا وہ خاموشی سے لوٹ آئے گا۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد اس نے نیچے کھڑی ٹیکسی کے دروازے میں چابی لگائی۔ رات کو کسی نے اوپر سے آم کے چھلکے پھینکے تھے۔ اس نے اوپر کی چار کھڑکیوں کو دیکھا۔ وہ بدتمیز، بدتہذیب، جاہل انہی چار میں سے ایک کھڑکی کے پیچھے کہیں تھے لیکن محفوظ تھے۔ چنانچہ اس نے جو گالیاں دل ہی دل میں دیں، وہ چاروں کے لیے تھیں... آم کے داغ کو رگڑ کے صاف کیا اور اس جوتے سے بال بال بچا جو غالباً کسی بچے نے ڈراپ کیا تھا... بچہ کسی کھڑکی میں نہیں تھا... ابھی تک اس کی والدہ کو بھی علم نہیں تھا کہ ان کے ہونہار سپوت نے آج نیچے کیا پھینکا ہے۔

اچانک عامر خاں پاکستانی کی نظر پچھلی سیٹ پر گئی... وہاں ایک بریف کیس رکھا تھا... اس کا جھپٹ جھکا تا ہاتھ رک گیا۔ خیالات کا گندا نالا رک گیا... سانس رک گیا... بس اس اجنبی کی طرح دل نہیں رکا... اس نے اِدھر اُدھر دیکھا... پھر ڈرتے ڈرتے پچھلا دروازہ کھولا... حالات ایسے تھے کہ وہ کسی بھی لمحے ایک تباہ کن دھماکا سننے کے لیے تیار تھا... جس کے بعد کچھ سنائی دیتا تو صورِ اسرافیل کہ اٹھ عامر خاں پاکستانی اور چل میدانِ حشر کی جانب...

پھر عقل نے بروقت اس کو تسلی دی... یار دھماکا ہونا ہی ہوتا تو اب تک ہو چکا ہوتا... ساری رات گزر گئی... یہ جو ٹائمر ہوتے ہیں ان کا ٹائم زیادہ سے زیادہ بارہ گھنٹے ہوتا ہے... ایک سے بارہ... اس کے بعد پھر ایک آ جاتا ہے... یہ اس نے کہیں پڑھا تھا... پھر؟... اسے کیا کرنا چاہیے... بم ڈسپوزل والوں کو بلانا چاہیے؟

اس نے پچھلا دروازہ بند کیا۔ گاڑی اسٹارٹ کی اور احاطے سے باہر نکل گیا... سڑک پر آ کے اس نے اپنا رخ جو ہر چورنگی کی طرف رکھا... چورنگی سے وہ سیدھا نکل گیا... ہارون رائل سٹی کی ذیلی سڑک بائیں ہاتھ پر رہ گئی... آگے سڑک خالی تھی... بائیں ہاتھ پر کوئی تعمیر نہیں تھی... اس نے ٹیکسی روک دی اور اس کا بونٹ کھولنے کا سوچا... پھر ارادہ ملتوی کر دیا... ابھی کوئی دوسرا ٹیکسی ڈرائیور مدد کے لیے آ جائے گا کہ کیا ہوا...

اس نے پلٹ کر بریف کیس کو دیکھا اور ہاتھ بڑھا کے اٹھا لیا۔ اس شخص نے بھی تو اسے اٹھا ہی رکھا تھا... اور وہ کیا کوئی دہشت گرد لگتا تھا... بالکل نہیں... ذرا بھی نہیں... وہ شرٹ پینٹ میں عام آدمی تھا... اور شریف آدمی تھا... اس نے بڑی شرافت سے درخواست کی تھی... بلکہ بھیک مانگی تھی... اس میں ہمت ہوتی تو وہ آخری وقت آنے سے پہلے پہنچنے کی کوشش کرتا۔ کہتا مجھے فلاں جگہ پہنچا دو... آگے آرمی، نیوی کے بہت دفاتر ہیں... رہائشی علاقے ہیں... وہ اسپتال جانے کا کیوں کہتا؟

وہ سخت کشمکش و پیچ میں پڑ گیا... بریف کیس کھول کر دیکھنے کے خیال سے اس کے پیٹ میں گرہ سی پڑنے لگتی تھی... اگر اسے کھولنے سے دھماکا ہو گیا پھر؟ فوری انتقال پُرملال... چٹکی بجاتے میں اس دنیا سے دوسری دنیا... لیکن ایسا ہو نہیں سکتا... عام شریف آدمی ایسے تباہ کن بریف کیس لے کر نہیں پھرتا۔

اس نے آنکھیں بند کر کے کلمہ پڑھا اور بریف کیس کھول لیا... چند سیکنڈ گزر گئے... کوئی دھماکا نہیں ہوا... اس نے اوپر والا حصہ اٹھایا۔ اور تب وہ دھماکا ہوا جو کسی نے بھی نہیں سنا... اس ٹیکسی والے نے بھی نہیں جو اس کے پیچھے مشکل سے بیس گز کے فاصلے پر پنکچر ہونے والا ٹائر بدل رہا تھا۔ دراصل دھماکا عامر خاں پاکستانی کے دماغ میں ہوا تھا۔

بریف کیس بڑی مالیت کے نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہزار ہزار کے اور پانچ سو کے نوٹ جو جعلی نہیں تھے... اس نے کانپتے ہاتھوں سے ہر گڈی کو اٹھا کے دیکھا... وہ سب پرانے

www.pkdigest.com

ماہرِ نفسیات نے آرٹس مریض سے پوچھا۔ ”کیا کبھی تم نے اپنی بیوی کو دھوکا دیا ہے؟“

”یقیناً دیا ہے۔“ آرٹس نے جواب دیا۔ ”بیوی کے سوا دنیا میں کوئی ایسا میرا اپنا نہیں جسے دھوکا دیا جاسکے۔“

نوٹ تھے... آخر یہ کتنی رقم ہو گی... دس لاکھ... بیس لاکھ... اس نے اندازہ لگانے کی ناکام کوشش کی... کیوں نہ میں اسے گن لوں... اس نے سوچا۔

لیکن اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے بلکہ اندر باہر سے اس کا سارا وجود کانپ رہا تھا۔ اس کا سانس تیز چل رہا تھا اور اس پر ایسی کمزوری غالب آ رہی تھی جیسے اب اس پر ہارٹ اٹیک ہو رہا ہو... اس نے بریف کیس بند کیا... سیٹ کے نیچے سے بوتل نکال کے پانی کے دو گھونٹ پیے اور اپنا سر سیٹ سے لگا کے آنکھیں بند کیے ہوئے چند لمبے گہرے سانس لیے۔

”کیا ہوا استاد...؟“ کسی نے جیسے اس کے کان سے بھونپو لگا کے کہا۔ وہ اچھل پڑا۔ پیچھے ٹیکسی کا پنکچر شدہ ٹائر بدلنے والا کھلی کھڑکی سے منہ لگائے پان چبا رہا تھا۔ ”طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”ہاں... طبیعت ٹھیک ہے... بس ذرا تھکن تھی۔“

”ہاں... میں نے دیکھا تو فکر ہو گئی کہ کہیں ہارٹ اٹیک تو نہیں ہو گیا... ایک بار ہوا تھا ایسا ہی...“ وہ کوئی ذاتی تجربہ سنانے کے موڈ میں تھا۔

عامر خاں نے انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے معذرت کی۔ ”معاف کرنا یار... مجھے ذرا جلدی ہے۔“ اور اس کی غضب ناک آنکھوں کی پروا نہ کرتے ہوئے چل پڑا جو غالباً پان کی پیک سے لال ہو رہی تھیں۔

اس نے کسی محفوظ جگہ کے بارے میں سوچا... آسان یہ تھا کہ وہ واپس لوٹ جائے... اس کا گلزری فلیٹ مشکل سے دو کلومیٹر پیچھے تھا لیکن وہاں وہ ایسا شان دار بریف کیس اٹھا کے گزرتا تو دس فارغ بیٹھے لوفر اسے مشکوک نظروں سے دیکھتے... وہ سب بزنس مین تھے... موبائل فون چھینتے، خریدتے اور بیچتے تھے... بریف کیس بھی ان کو پسند آ جاتا تو خرابی ہوتی۔

اس نے ٹیکسی کو سرسید یونیورسٹی والے اوور ہیڈ برج کے نیچے روکا اور اس کا بونٹ اٹھا دیا۔ وہاں اور بھی بہت سی گاڑیاں پارک تھیں... یہاں مداخلت بے جا کا کوئی امکان نہیں تھا... وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور دروازے کو اندر سے

لاک کر لیا۔ اس کے پاس پلاسٹک کی ایک بڑی سی تھیلی تھی جس میں چھ مہینے پہلے وہ اپنے لیے عید کا جوڑا لایا تھا۔ اس نے وہ کیس سلنڈر کے نیچے سے نکالی... اِدھر اُدھر کا جائزہ لیا اور بریف کیس کھول کے پھر نوٹوں کا ڈھیر دیکھا... ایک لاکھ... اس نے پہلی گڈی کو پلاسٹک کی تھیلی میں ڈال کے کہا... پھر دوسری ڈالی... ڈیڑھ لاکھ... ایک ایک کر کے تمام گڈیاں تھیلی میں منتقل ہو گئیں... یہ چالیس لاکھ تھے... اس کا دماغ گھوم گیا۔

پلاسٹک کی تھیلی کو اس نے ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ کے نیچے منتقل کرنے سے پہلے ٹیپ سے بند کیا... یہ ٹیپ وہ گلوز کمپارٹمنٹ میں رکھتا تھا کہ ضرورت پڑے تو کام آئے... پورا ٹیپ لپیٹ دینے سے تھیلی سیل ہو گئی تھی اور آسانی سے کھولی نہیں جاسکتی تھی۔ تھیلی سیٹ کے نیچے پھنس گئی تھی... کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ چالیس لاکھ کے نوٹوں پر تشریف فرما ہے۔

اب اس کا حلق خشک ہونے لگا تھا۔ بونٹ گرا کے وہ پھر چل پڑا... اس نے ایک جگہ ٹھنڈی بوتل پی کے دماغ کو ٹھنڈا کیا۔ اب اسے یہ طے کرنا تھا کہ وہ اپنے ایمان کو اور خود کو کیسے بچائے... اللہ کو منہ دکھانے کا معاملہ فوری نہیں تھا... ملّاؤں کی پیش گوئیوں کا سلسلہ نہ جانے کب سے چل رہا تھا کہ قیامت کی نشانیاں بہت واضح ہیں مگر قیامت نہیں آئی تھی۔

لیکن پولیس آسکتی تھی... اسے کہیں بھی پکڑ سکتی تھی کہ ذرا بتاؤ یہ بریف کیس کس کا ہے؟ کیا کل تم کسی مریض کو دل کے اسپتال لے گئے تھے... کون تھا وہ؟... اس نے بریف کیس کی پاکٹ کو دیکھا۔ اس میں کوئی کاغذات نہیں تھے۔ غالباً وہ صرف نوٹ لانے کے لیے بریف کیس لے کر نکلا تھا... راہ میں پہلے فرشتۂ اجل مل گیا... پھر عامر خاں پاکستانی... مگر اس کی لاش ہی پہنچی... سکندر جب گیا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے۔

تذبذب کا یہ وقفہ زیادہ طویل نہیں تھا... بالآخر جیت اس کے ضمیر اور ایمان کی ہوئی... بے شک ضرورت اس کی بھی بڑی ہے لیکن پیسے کی ضرورت کسے نہیں... معلوم نہیں یہ چالیس لاکھ وہ کہاں سے لایا تھا اور کیوں... اسے کسی قرض خواہ کو دینے تھے... اس نے کوئی گھر خریدا تھا جس کی ادائیگی باقی تھی... وہ کسی کمپنی کا کیشیئر تھا جسے صبح عملے میں تنخواہ تقسیم کرنی تھی... نہ جانے کتنے لوگ اس رقم کے غائب ہو جانے سے عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے... سب کی بددعا لے کے وہ کیا پائے گا... اس کی زندگی میں سزا کے لیے مزید گنجائش کہاں ہے... وہ اپنا سب کچھ تو گنوا چکا ہے...

اپنی عاقبت سنوارنے اور ضمیر کو سرخرو کرنے والے فیصلے کے بعد عامر خاں پاکستانی کا سر فخر سے بلند ہو گیا اور اس کا اے ون کوالٹی کا دماغ صحیح کام کرنے لگا۔ اس نے اسپتال کا رخ کیا... وہاں سے مرحوم کا پتا معلوم ہونے کا امکان تھا۔

ٹیکسی کو پارکنگ ایریا میں لاک کرنے کے بعد اس نے اللہ کے آسرے پر چھوڑ دیا۔ کوئی ٹیکسی ہی لے جائے تو اور بات ہے... چالیس لاکھ تو ایکسرے میں بھی نظر نہیں آئیں گے... وہ پیدل چلتا ایمرجنسی کے گیٹ کی طرف بڑھتا رہا... وہاں رات والا منظر تھا... لوگ آ جا رہے تھے... وہی افراتفری... وہی آہ و زاری... سسپنس... انتظار... دکھی چہرے... موت کے احساس سے عاری نرسوں اور ڈاکٹروں کے بے حس چہرے۔

اس نے صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد ایک دبلی پتلی معمولی شکل و صورت کی مگر شوخ نرس کو روک لیا۔ اسے سسٹر اور ہمشیرہ وغیرہ کہنے کے بجائے اس نے نہایت مغموم چہرے اور افسردہ آواز میں کہا۔ ”میڈم! کیا آپ میری کچھ مدد کر سکتی ہیں؟“

عامر خاں پاکستانی جوان تھا... ہیرو ٹائپ تھا اور کئی بار اپنی قوتِ تسخیر آزمانے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ عام لڑکی کو متاثر کرنا اس کے لیے کوئی مشکل کام نہیں... اب وہ جو شخص جسے عام جسمانی... کی قطار میں... عامر خاں بھاری تھی کہ کھڑا ہو تو پھر دال گلانے کی کوشش بھی نہیں کرنی چاہیے۔

نرس رک گئی اور اس نے اپنے مقابل ایک غم زدہ نوجوان کو دیکھا۔ ”یس۔“

”میرے چچا تین دن سے لاپتا ہیں... سارے اسپتال دیکھ چکا... کیا کوئی رجسٹر وغیرہ ہے... جس میں یہاں فوت ہونے والوں کے نام ہوں یا لاوارث مرنے... میرا مطلب ہے گزر جانے والوں کا حوالہ ہو؟“

اس نے سوچ کے کہا۔ ”اِدھر آؤ میرے ساتھ... نام کیا تھا ان کا؟“

”عبدالرحمان...“ اس نے سر جھکا کے چلتے ہوئے کہا۔

آخری کونے میں بیٹھے ہوئے ایک گنجے کُڑوس کلرک نے بیزاری سے اس کے سامنے ایک رجسٹر رکھ دیا۔ نرس نے رک کر کہا۔ ”اور کچھ؟“

عامر خاں نے مسکرا کے کہا۔ ”تھینک یو... سسٹر...“ اور اسے پلٹ کے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

رجسٹر میں مرنے والے کا نام اصغر علی لکھا ہوا تھا۔ اس کی تاریخِ وفات اور موت کا وقت بالکل وہی تھا جو عامر خاں

پہلے سے جانتا تھا۔ آگے کے اندراج میں وارث کا نام تھا جو لاش لے گیا تھا... مرنے والے کا پتا تھا... لاش صبح نو بجے وارثوں کے حوالے کی گئی تھی۔ یہی سب تفصیلات ڈیتھ سرٹیفکیٹ میں ہوں گی... وارث اکبر علی ضرور اس کا بیٹا ہوگا۔

وہ رجسٹر کو گنجے اور ناراض کلرک کی طرف کھسکا کے چل پڑا... وہ مزید ناراض نظر آنے لگا۔ نالائق نرس کی وجہ سے اس کو مطلوب معلومات بلا معاوضہ دینا پڑی تھیں ورنہ شاید وہ پچاس روپے تو لیتا... زمانہ ایسا ہی ہے اور آنے والا وقت ایسا ہوگا کہ سلام کا جواب بھی مفت میں کوئی نہیں دے گا۔

عامر خاں اندر سے مرنے والے کے لیے اداس تھا۔ ایسی موت افسوس ناک ہوتی ہے کہ آس پاس اجنبی چہرے ہوں... کسی کی آنکھ میں آنسو نہ ہو... کوئی رونے والا نہ ہو... نہ کوئی نزع کی تکلیف دور کرنے کے لیے سورۃ یٰسین کی تلاوت کرے... نہ حلق میں پانی ٹپکائے... اور مرنے کے بعد ”ڈیڈ باڈی“ ایک طرف ڈال دی جائے... نہ وہاں احترام سے اگر بتی سلگائی جائے اور نہ کوئی مغفرت کے لیے سرہانے بیٹھ کے آنسوؤں کے ساتھ تلاوت کی جائے۔

اسے پتا ہی نہیں چلا اور ٹیکسی اس گھر کے سامنے پہنچ گئی جیسے شہر کے راستے اسے معلوم ہوں... وہاں وہی منظر تھا جو میت والے گھر میں ہوتا ہے... شامیانے کے نیچے کرسیوں پر پندرہ بیس افراد سوگوار صورت بنائے بیٹھے تھے... وہ بھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا... بہت جلد اسے اکبر علی کا پتا چل گیا۔ وہ بیس بائیس سال کا نوجوان تھا جس کی آنکھیں رونے سے لال ہو رہی تھیں اور اندر کے رنج و الم کی کیفیت اس کے چہرے کی افسردگی میں منجمد ہو گئی تھی۔

عامر خاں نے اس سے گلے مل کے تعزیت کے رسمی الفاظ کہے۔ ”بھئی بڑا دکھ ہوا اصغر صاحب کی اچانک وفات پہ...“

وہ اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ”بس جی... اللہ کی مرضی۔“

”یہ اچانک کیسے ہو گیا؟“

”اچانک ہی کہہ سکتے ہیں... ورنہ پرابلم تو تھی... آپ تو جانتے ہوں گے کہ بلڈ پریشر خاموش قاتل کہلاتا ہے۔“

”کیا انہیں پتا نہیں تھا؟“

اکبر علی نے اسے غور سے دیکھا۔ ”سب پتا تھا... چار پانچ سال سے... علاج باقاعدگی سے نہیں کرایا... دوا بھی کبھی نہیں کھائی... پرہیز کے نام سے چڑ تھی... پھر سگریٹ کی عادت... آپ انہیں کیسے جانتے ہیں؟“

عامر خاں نے کہا۔ ”وہ... میرے والد کے ساتھی تھے... مجھے نوکری دلانے میں بڑی مدد کی تھی۔“

”کہاں کام کرتے ہیں آپ...؟“

”ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن... دل کا دورہ کب پڑا تھا؟“

”کل رات دفتر سے واپس آتے وقت... لیکن انہوں نے گھر پر کسی کو نہیں بتایا... خود ہی ٹیکسی میں بیٹھ کے امراضِ قلب کے اسپتال پہنچ گئے تھے... وہاں ڈیتھ ہو گئی۔“

”یہ ٹیکسی والے نے بتایا آپ کو؟“

”نہیں... وہ تو پتا نہیں کون تھا... انہیں وہاں چھوڑ کے گیا... بعد میں اسپتال والوں نے جیب میں دیکھا تو شناختی کارڈ تھا لیکن اس پر پتا پرانا تھا۔ کچھ جاننے والوں کے کارڈ تھے... اسپتال والوں نے ایک کو فون کر دیا... انہوں نے ہمیں بتایا۔“

”کیوں... موبائل فون بھی تو ہوگا؟“

”بالکل تھا... اب معلوم نہیں وہ ٹیکسی والا لے گیا یا ان کے مرنے کے بعد بے ایمان عملے میں سے کسی نے نکال لیا۔“

”ٹیکسی والا تو خود اسپتال لے گیا تھا... ظاہر ہے اس وقت وہ زندہ ہوں گے؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہی تو بات ہے... ڈاکٹر نے بتایا کہ وہ اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی مر گئے تھے... سرٹیفکیٹ میں لکھا ہے ڈیڈ آن ارائیول... اب کیا کریں... زمانہ ہی ایسا ہے... لوگ مُردوں کو بھی لوٹ لیتے ہیں... ان کا پرس ملا مگر پیسے کسی نے نکال لیے تھے... حد یہ ہے کہ ہاتھ کی گھڑی بھی غائب تھی... ان کا بس چلتا تو انگلی کاٹ کے شادی کی انگوٹھی بھی نکال لیتے۔“ اکبر علی ایک دم اٹھ گیا... ”جی ایم صاحب آئے ہیں۔“

عامر خاں نے جی ایم صاحب کو دیکھا... وہ ایک چھوٹا موٹا اور گلاب جیسے چمکتے سر والا روبوٹ تھا جس کی آنکھیں بھی دو حلقوں میں فٹ چھوٹے بلبوں کی طرح روشن نظر آتی تھیں۔ ایک روایتی جی ایم کی طرح اس نے گرمی میں بھی سوٹ پہن رکھا تھا اور ٹائی باندھی تھی... اس کے جوتے پالش سے چمک رہے تھے... اس نے اکبر علی کے جسم کو اپنے جسم سے چھو کر فوراً الگ کر دیا اور اس صوفے پر گر گیا جو آگے رکھا ہوا تھا اور شاید گھر کے کسی کمرے کو خالی کرنے کے لیے نکالا گیا تھا۔

لیڈرل بی ایریا کے بلاک سول میں دو سو گز پر بنے ہوئے گھر بہت کم تھے اور اصغر علی کا یہ دو منزلہ مکان ان میں سے ایک تھا۔ اسے نچلے یا زیادہ سے زیادہ متوسط طبقے میں شامل سمجھا جا سکتا تھا۔ اندر پہلی منزل کے کمروں میں خواتین کے آنے جانے کا سلسلہ جاری تھا۔ وقفے وقفے سے کسی کے

www.pkdigest.com

www.pkdigest.com

رونے کی آواز بھی سنائی دے جاتی تھی۔ اوپر کی منزل کی ایک کھڑکی سے وہ شخص بچے نیچے ہونے والی ساری کارروائی کا بڑی دلچسپی آمیز دہشت سے مشاہدہ کر رہے تھے۔

عامر خاں پاکستانی کی کرسی جی ایم صاحب کے بالکل پیچھے تھی چنانچہ اس نے وہ تمام گفتگو سنی جو مرحوم کے ولی عہد اور آقائے ولی نعمت کے درمیان ہوئی۔

دو رسمی جملے بولنے کے بعد جی ایم نے جیب میں سے ایک کاغذ کا پرزہ برآمد کیا۔ ”یہ لو بیٹا... مرحوم کے تمام واجبات کا چیک۔“

اکبر علی نے دل زدہ لہجے میں کہا۔ ”انکل!“

انکل نے ثابت کیا کہ وہ اسلامی تعلیمات سے بے بہرہ نہیں۔ ”نہیں، یہ تو مجھ پر قرض ہو گیا تھا... ویسے بھی حکم ہے کہ مزدور کو اس کی اجرت پسینا خشک ہونے سے پہلے دے دو۔“ اس نے ایک گیلے ٹشو پیپر سے ماتھے پر چمکنے والا پسینا صاف کیا۔

”ابا آپ کی بہت تعریف کرتے تھے۔“

”بھئی، وہ بڑے بھروسے کا آدمی تھا... ایمان دار اور محنتی... بیس سال ہمارے ساتھ رہا... مجال ہے جو ایک پیسا ادھر سے اُدھر ہو جائے... ہم بھی ایسے وفاداروں کی قدر کرتے ہیں ورنہ یہاں بہت آئے اور گئے... اصغر علی بھی جا سکتا تھا... اس میں صلاحیت تھی اور اس کا تجربہ تھا... کچھ لوگوں نے کوشش بھی کی... دگنی تنخواہ کی آفر دی... لیکن اس میں لالچ نہیں تھا۔“

اللہ معاف کرے... عامر خاں نے خود سے کہا... دراصل اس کے ذہن میں از خود یہ خیال گھس آیا تھا کہ مرحوم خاصے احمق تھے... مگر کسی احمق کے پاس چالیس لاکھ نقد کہاں سے آئے... اس کا کوئی بھی ذکر تک نہیں کر رہا ہے۔

جی ایم صاحب پوچھ رہے تھے۔ ”یہ گھر تمہارا ہے نا؟“

”جی سر... اوپر سے کرائے کے دس ہزار آ جاتے ہیں... اور تو آمدنی کا اب کوئی ذریعہ نہیں رہا...“

جی ایم صاحب نے سر کی شفاف جلد پر رومال پھیرا۔

”تم کیا کرتے ہو؟“

”میں نے ابھی بی کام کیا ہے سر... ایم بی اے کا سوچ رہا ہوں۔“

”ہوں۔“ انہوں نے کبوتر کی طرح آواز نکالی۔ ”کتنے بہن بھائی ہو؟“

”بہن ہے مجھ سے چھوٹی... انٹر میں پڑھ رہی ہے... اس سے چھوٹا بھائی میٹرک کا امتحان دے گا... سب سے بڑی بہن کی شادی ہو چکی۔“

جی ایم صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”سمجھ گیا... اچھا بھئی... کیا نام ہے تمہارا... اکبر علی... ایک آفر ہے تمہارے لیے... تم چاہو تو جوائن کر لو... فی الحال دس ہزار ملیں گے... لیکن اللہ نے چاہا تو ایک دن تم اپنے والد کی طرح کیشیئر بن جاؤ گے۔“

اکبر علی نے رقت آمیز آواز میں کہا۔ ”آپ کی بڑی مہربانی ہے سر!“

”یہ ایم بی اے وغیرہ کرتے رہنا ایوننگ کلاس جوائن کر کے... ابھی گھر چلانا ہے... تم بڑے ہو... یہ تمہاری ذمے داری ہے۔“

”سر! میں جلد ڈیوٹی پر آ جاؤں گا۔“

”آئی ایم سوری... ڈھائی بجے بورڈ کی ایک میٹنگ ہے، اس سے پہلے لنچ ہے... میں نماز جنازہ میں شرکت کے لیے نہیں ٹھہر سکتا۔“

کسی نے کہا۔ ”اس سے ہزار گنا ثواب تو آپ نے لواحقین پر دستِ شفقت رکھ کے کما لیا ہے جناب عالی۔“

عامر خاں نے دیکھا۔ وہ دری پر بیٹھ کے کفن سینے میں مصروف سیاہ داڑھی والا جوان مولوی تھا جس نے بعد میں دیگر تمام امور بھی سرانجام دیے... اس نے میت کے غسل کے بعد نماز جنازہ بھی پڑھائی پھر تدفین کے بعد [illegible] کھڑے لوگوں سے ہاتھ اٹھوا کے تین منٹ کی دعا بھی کرائی اور آخر میں سوئم کے وقت کا اعلان بھی کیا۔

عامر خاں پاکستانی شدید الجھن میں پڑ گیا۔ نماز جنازہ میں شرکت سے حاصل ہونے والے ثواب کا خیال بھی اسے مطمئن نہیں کر سکا... وہاں موجود کسی بھی شخص نے بریف کیس کے نہ ملنے کی بات تک نہیں کی جس میں چالیس لاکھ تھے... وہ موبائل فون اور گھڑی کے غائب ہو جانے پر افسوس کرتے رہے اور پرس میں سے رقم کے نکالے جانے کی بات کرتے رہے جو کسی کو معلوم نہیں تھا کہ کتنی تھی۔ مگر ظاہر ہے سیکڑوں میں ہو سکتی تھی... ہزاروں میں نہیں... اصغر علی کسی اعلیٰ عہدے پر فائز بہت بڑی تنخواہ لینے والا شخص نہیں تھا... اس کے گھر سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بیس سال بعد بیس ہزار ہی لے رہا ہوگا... یا ممکن ہے تیس... مگر موجودہ حالات میں اس سے ایک گھر کے اخراجات پورے کرنے کے بعد کوئی چالیس لاکھ بچا لے... ناممکن!

کھانا وہ مرحوم کے گھر پہ قبرستان سے واپس جانے کے بعد بھی کھا سکتا تھا جہاں کسی نئی مہربان نے چکن قورمے کی دیگ اور گرما گرم خمیری نان منگوائے تھے... لیکن عامر خاں

کے ضمیر... بلکہ اس کے معدے نے کہا کہ اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی... چنانچہ طائر لاہوتی اپنی ٹیکسی لے کر نکل گیا اور ایک کیفے ڈی پھوس میں جا بیٹھا۔ اس کے باوجود کہ اب وہ خود کو بے خوف و خطر چالیس لاکھ کا مالک سمجھ سکتا تھا... لیکن عامر خاں پاکستانی کا سب سے بڑا مسئلہ اس کے ضمیر صاحب تھے جو ملامت کا کوئی موقع لیڈر آف دی اپوزیشن کی طرح ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے... اور یہ سب اس کے ابا کی تربیت کا نقصان تھا۔

وہ بالاکوٹ کے قریب ایک گاؤں میں پیش امام تھے اور اب آٹھ اکتوبر کے زلزلے سے گرنے والے پہاڑ کے ملبے میں گم ہو چکے تھے... اس بات کو بھی دو سال ہو چکے تھے چنانچہ اب یہی توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ صور اسرافیل ہی کے کسی بے نشان مدفن سے خود ہی برآمد ہوں گے... اور کسی کو تو وہ ملے نہیں تھے۔

☆☆☆

صوفی زمان خان کے آبا و اجداد نہ جانے کس زمانے میں افغانستان سے ہجرت کر کے آئے ہوں گے... وہ دنیا بہت مختلف تھی... زمین پر جغرافیائی حد بندیاں ضرور تھیں لیکن ایک ملک سے دوسرے ملک کی سرحد عبور کرنے کے لیے پاسپورٹ نام کی کوئی چیز ضروری نہیں ہوتی تھی... مغلوں کے دور میں ایران اور ترکی اور نہ جانے کہاں کہاں سے علما اور تاجر اور باکمال لوگ آ کے دربار سے وابستہ ہو جاتے تھے۔

یہ تو ابھی عامر خاں پاکستانی کے ہوش سنبھالنے کے بعد بھی ہوتا تھا کہ ادھر موسم سرما شروع ہوا، ادھر لاکھوں کی تعداد میں افغانستان سے خانہ بدوش... جن کو پاوندے... کہا جاتا تھا... سرحد عبور کر کے پاکستان میں آ جاتے تھے اور سردیاں گزار کے واپس چلے جاتے تھے... ان پر کوئی روک ٹوک نہیں تھی اور لنڈی کوتل واحد جگہ تھی جہاں روس سے اسمگل کیا جانے والا الیکٹرانک کا سامان ٹی وی اور اے سی وغیرہ تک دستیاب تھے۔

ان آبا و اجداد نے یہیں مستقل خیمے گاڑ دیے اور پلٹ کے واپس افغانستان نہیں گئے... زمین ہر طرف وافر تھی اور زرخیز تھی... انھوں نے یہاں گھر بنا لیے اور شادیاں کر لیں تو قبیلے اور گاؤں بن گئے... ایسا ہی وہ گاؤں تھا جو بالاکوٹ سے کچھ فاصلے پر کاغان کی طرف آباد تھا۔ اس میں مشکل سے سو گھر ہوں گے جو سب آپس میں کسی نہ کسی رشتے سے جڑے ہوئے تھے... چنانچہ یہ ناممکن تھا کہ اجنبی آئے اور کسی کو خبر نہ ہو۔

صوفی زمان کے باپ اور اس کے باپ کے پاس جو زمین تھی وہ اسی طرح خاندانی ملکیت چلی آ رہی تھی۔ تقسیم ہونے کے باوجود اس کے پاس اتنی زمین تھی کہ اس کا اور اس کے خاندان کا گزارہ خوش حالی سے ہوتا تھا... کچھ زمین پر سیبوں کے باغ تھے... اور اس کا سالانہ ٹھیکہ بھی اچھی خاصی رقم فراہم کر دیتا تھا... چنانچہ صوفی زمان نے ایک باغ کے وسط میں خاصا بڑا پکا مکان بنا لیا تھا جس کی تعمیر میں ہموار تراشے ہوئے پہاڑی پتھر استعمال ہوئے تھے... اس کی ڈھلوان چھتوں پر ٹین کی چادروں کے نیچے لکڑی کے تختوں کی چھت تھی چنانچہ برف باری کا موسم شروع ہوتا تھا تو گرد و پیش کا سارا منظر سفیدی میں ڈوب جاتا تھا... راستے بند ہو جاتے تھے اور چھتوں پر سے برف پھسل کر نہ گرے تو اسے گرانا پڑتا تھا... گھر تک آنے والے راستے کو صاف رکھنا ضروری تھا۔ ایبٹ آباد اور کاغان کی طرف جانے والی مین روڈ سے ملانے والی سڑک بھی بعض اوقات برف میں غائب ہو جاتی تھی اور جب سورج نکلتا تھا تو یہ ممکن ہوتا تھا کہ وہ آ جا سکیں۔

صوفی زمان اس گاؤں کی واحد مسجد کا اعزازی پیش امام تھا۔ نہ جانے کیسے بچپن سے اسے تعلیم حاصل کرنے کا شوق تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ بی اے کرے مگر ابھی اس نے میٹرک ہی کیا تھا کہ اس کی شادی کر دی گئی اور وہ گھر گرہستی کے چکر میں پڑ گیا... باپ نے سب بچوں کے چہرے دیکھ کر ... کٹ کے کچھ نہیں آیا۔ اس کے اپنے چار ہی بچے تھے اور اگرچہ اس کے سارے بزرگ اور ہم عمر بچوں کی تعداد پر کنٹرول کو براہ راست خدا کی رزاقی میں دخل اندازی قرار دیتے تھے لیکن صوفی زمان اپنی روشن خیالی اور گھر والی کے تعاون سے فیملی پلاننگ میں کامیاب تھا... اگرچہ یہ کام وہ رازداری سے چوری چھپے کرتا تھا۔

لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ تدبیر کند بندہ تقدیر کند خندہ... اس کا بڑا بھائی شکار کا شوقین تھا، بندوق لے کر پہاڑ پر گیا۔ اسے کسی نے بتایا تھا کہ اوپر سے آنے والے کسی چیتے نے چار بھیڑیں... ایک بکری اور ایک بچھڑا کھانے کے بعد صرف ایک مہینے میں دو بچے بھی کھا لیے ہیں... چیتے نے اسے بھی کھا لیا... تلاش کے لیے جانے والوں کو اس کی ہڈیاں اور خون آلود کپڑے ہی ملے... انھوں نے مل کے کوشش کی اور تلاش کر کے چیتے کو ہلاک کیا۔

لیکن اس حادثے کے نتیجے میں بھائی کی بیوہ اور اس کے چھ بچے صوفی زمان کی ذمے داری ہو گئے۔ عدت کا زمانہ ختم ہونے کے بعد اسے بڑے بھائی کی بیوی کو اپنی بیوی بنانا پڑا ورنہ وہ ایک گھر میں کیسے رہتے... وہ برتھ کنٹرول کو گناہ

کبیرہ سمجھتی تھی چنانچہ دوسری شادی کے بعد اس نے سالانہ بچے پیدا کرنے کا سلسلہ جاری رکھا... اس نے صوفی زمان کا گھر جو اس کے خاندان کے لیے کافی سے زیادہ تھا... بچوں سے کھچا کھچ بھر دیا... زلزلے میں سب ختم ہونے تک صوفی زمان کے گھر میں دو بیویاں اور چودہ بچے موجود تھے... عامر خاں ان میں سب سے بڑا تھا۔

ان حالات میں صوفی زمان بی اے کرنے کا خواب بھی کیسے دیکھتا مگر اس نے پڑھنے کے شوق میں دینی کتابوں کا مطالعہ جاری رکھا جو وہ کبھی راولپنڈی سے اور کبھی ایبٹ آباد سے لاتا تھا۔ اس کے علم و فضل نے دور دور تک اس کی شہرت ایک عالم کی حیثیت سے بنائی اور لوگ اس سے باقاعدہ فتوے لینے آتے رہے... اس کے گھر کا حال خراب رہا... دو بیویاں تو خیر لڑتی ہی تھیں... جب ان کے بچے لڑتے تھے تو گھر مہابھارت کا نقشہ پیش کرتا تھا جس میں کورو پانڈو بھائی ہونے کے باوجود لڑتے تھے... پانچ ایک طرف سو ایک طرف... یہاں چار ایک طرف ہوتے تھے، گیارہ دوسری طرف۔

عامر خاں کے باقی سب بھائی بہن جہالت کی طرف مائل رہے... بہنوں کی تو بات ہی الگ تھی... سگے سوتیلے بھائیوں کے لیے بھی کئی میل پیدل چل کے گرمی سردی میں اسکول جانا بڑی سخت آزمائش تھی... عامر خاں اس آزمائش سے کامرانی سے گزرا... اس نے میٹرک پاس کیا اور پھر ایبٹ آباد کے گورنمنٹ کالج سے انٹر... صوفی زمان بہت خوش تھا... وہ اپنے خواب کی تعبیر عامر خاں کے روپ میں دیکھ رہا تھا۔

انٹر میں اچھے نمبروں اور مقامی ڈومیسائل کے باعث عامر خاں کو بہ آسانی ایوب میڈیکل کالج میں داخلہ مل جاتا... صوفی زمان کی آنکھوں میں ایک خواب اتر آیا... بہت جلد اس کا بیٹا ڈاکٹر بنے گا... اس علاقے کا پہلا ڈاکٹر... خاندان کا پہلا ڈاکٹر... وہ اپنی ساری زمین بیچ کے اس کے لیے اسپتال بنائے گا... جہاں مستحق مریضوں کا علاج بلا معاوضہ ہوگا۔

لیکن ہر خواب دیکھنے والے کو اس کی تعبیر کی قیمت بھی ادا کرنی پڑتی ہے... عامر خاں کا وجود ہمیشہ فساد اور نزاع کا سبب رہا تھا کیونکہ وہ اندھوں میں کانا راجا تھا۔ جاہلوں کے ہجوم میں اکلوتا پڑھا لکھا تھا چنانچہ ہمیشہ سے باپ کی آنکھوں کا تارا تھا۔ خود اس کے باقی تین بھائی بہن، گیارہ عدد سوتیلے بہن بھائیوں جیسے ہو گئے تھے اور انھوں نے اپنی ماؤں کے ساتھ مل کر ایک متحدہ مجلس عمل بنا رکھی تھی جو عامر خاں کے ساتھ ہونے والے ترجیحی سلوک کی بنا پر صوفی زمان کو سوتیلا ہونے کا الزام دیتی تھی۔

ایک طرف عامر خاں تھا... دوسری طرف چودہ حریف جو محض اپنی جہالت پسندی کے باعث نہیں چاہتے تھے کہ وہ پڑھ لکھ کر انھیں بدنام کرے... وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اتفاق رائے سے عامر خاں کے خلاف محاذ بنا لیتے تھے... وہ اس کی ٹل کے ٹھنکائی لگاتے تھے اور ان کی مائیں دہائی دیتی تھیں کہ یہ تمہارے لاڈلے کا کمینہ پن ہے... وہ ابھی سے دھمکی دے رہا ہے کہ ڈاکٹر بنا تو سب کو زہر کا انجکشن لگا دے گا۔

جب میڈیکل کالج کی فیس دینے کا وقت آیا تو ایک معاشی بحران پہلے سے چل رہا تھا... عامر خاں کی اماں نمبر دو بارھویں کھلاڑی کو دنیا میں لانے پر تلی بیٹھی تھی... باقی ٹیم کا حال بھی پاکستانی کرکٹ ٹیم جیسا تھا کہ اچانک سب کو کوئی نہ کوئی بیماری لگ گئی تھی۔ گھر کی نصف آبادی شہر کے کسی سیانے ڈاکٹر کے پاس علاج کے لیے جانا چاہتی تھی ورنہ اللہ کو پیاری ہونے کی دھمکی دیتی تھی۔

صوفی زمان کے لیے داخلہ فیس اور پہلے سال کے تعلیمی اخراجات نکالنا ناممکن ہو گیا... عامر خاں نے اسکالرشپ کے لیے جو درخواست دی، وہ نامنظور ہو گئی کیونکہ علاقے کے ایم این اے کے خانساماں کے ماموں کے سالے کا بیٹا بھی اس کا دعوے دار تھا اور سفارش کی بنیاد پر مقابلہ جیت گیا...

عامر خاں سخت مایوس ہوا لیکن اس کے باپ نے تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ بیٹے کے مستقبل کی کامیابی کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دے گا چنانچہ اس نے اپنی زمین پر لگے ہوئے سیبوں کے ایک باغ کو فروخت کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلے نے مزید قیامت ڈھائی۔

عامر کی اپنی ماں نے احتجاج کیا۔ ”اس سال کا خرچہ یوں پورا کرو گے... آئندہ سال کیا کرو گے... پھر باغ بیچو گے... اور اس کے بعد؟... یہ تو پانچ سال کی تعلیم ہے... ایسا کرو پہلے ہم سب کو زہر دے دو کیونکہ عامر کو ڈاکٹر بناؤ گے تو ہمارے کھانے کے لیے اور کچھ نہیں ہوگا اور پانچ سال میں تمہاری وہ بھاوج پانچ نئے بھوکے دنیا میں لے آئے گی۔“

صوفی زمان نے اس کے ایک چھانپڑ رسید کیا۔ ”وہ میری بیوی نمبر دو ہے۔“

”ہائے ہائے، مجھے کیوں مارتے ہو... سارا زور مجھ پر ہی چلتا تھا... اس کی پیداوار بند نہیں کر سکتے... دو اور کر لو... شرعی حق جو ہے۔“

حالات ایسے تھے کہ عامر خاں نے خود باپ کو من مانی کرنے سے روک دیا۔ ”آپ باغ بیچنے کا ارادہ چھوڑ دیں۔“ صوفی زمان نے کہا... ”کیوں چھوڑ دوں... میں اس

www.pkdigest.com

کا مالک ہوں... جو چاہوں کروں... اور میں کون سا غلط کام کر رہا ہوں؟"

"باقی سب اسے اپنی حق تلفی سمجھ رہے ہیں... میں نے ان کی باتیں سنی ہیں... انہوں نے آپ کی ضد کا توڑ تلاش کر لیا ہے۔"

صوفی چونکنا ہو گیا۔ "وہ کیا...؟"

"مردود چاہتے ہیں کہ فیصلہ کرنے والا نہ رہے... باغات کے مالک سب ہو جائیں... جو آپ کے وارث ہیں کیونکہ وہ حصے دار ہیں۔"

"میری زندگی میں ایسا نہیں ہو سکتا۔"

عامر خاں نے سر جھکا لیا۔ "ہاں ابا جی... ان کا بھی یہی خیال ہے... بیوہ کا حصہ بھی آٹھواں ہوتا ہے۔"

صوفی زمان خوف سے سن ہو گیا۔ "وہ مجھے مارنا چاہتے ہیں؟"

"خواتین اکثریت میں ہیں... وہ سمجھتی ہیں کہ فساد کی جڑ نکال دی جائے تو سب خود بہ خود ٹھیک ہو جائے گا... میں ابھی مرنا نہیں چاہتا ابا جی!"

صوفی زمان بہت دیر گم سم بیٹھا رہا... "میری بڑی خواہش تھی کہ تو ڈاکٹر بنتا۔"

"آپ کی خواہش پوری ہوگی... انشاء اللہ... لیکن یوں نہیں جیسے آپ چاہتے ہیں۔"

"پھر کیسے ہوگا یہ کام؟"

"سندھ کے میڈیکل کالجوں کے کوٹے میں سرحد کی ایک سیٹ ہے... شہری کوٹے سے ایک... دیہی کوٹے سے ایک... میں نے اس کے لیے اپلائی کیا تھا... اور ساتھ ہی وظیفے کے لیے بھی... وہاں میرا کام ہو جائے گا۔"

"وہ کیسے عامر خاں؟"

"آپ دیکھتے جائیں... میں نے ایک تکڑم لڑائی ہے۔"

عامر خاں نے ٹھیک کہا تھا... اسے نواب شاہ میڈیکل کالج میں داخلہ بھی مل گیا اور خصوصی اسکالرشپ بھی... چٹکی بجاتے میں سارے مسائل حل ہو گئے... نہ باغ کا کوئی حصہ بٹا گیا... نہ دو عورتیں بیوہ ہوئیں اور نہ ان کے حاضر اسٹاک والے پندرہ بچے یتیم ہوئے... عامر خاں کی قربانی نہیں دی گئی... وہ جان بچا کے ایسا بھاگا جیسے قاتل برادرانِ یوسف اب بھی اس کی جان کے در پے پیچھے بھاگتے آرہے ہیں۔

نواب شاہ پہنچ کے اس نے سکون کا سانس لیا... یوں جیسے وہ ایک جیل خانے سے نکل آیا ہو جہاں اسے پھانسی دیے جانے کے انتظامات ہو رہے تھے۔ اس کی اپنی ماں کی صدائے اثر تھی... باقی پندرہ اس کے وجود کو لوحِ جہاں سے حرفِ مکرر کی طرح مٹانے پر تلے ہوئے تھے... وہ اپنے جرم کا ایک اخلاقی جواز تلاش کر چکے تھے... ساری خرابی ایک کے دم سے ہو تو باقی پندرہ زندگی کے حق کے لیے سب کچھ کر سکتے ہیں۔ اب خود کو اس خاندان کا حصہ سمجھتے ہوئے اسے شرم اور نفرت محسوس ہوتی تھی۔ وہ کسی ایسے وحشی اور جنگلی قبیلے جیسے تھے جو اپنی بقا کے لیے اپنوں ہی میں سے کسی کو دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھا دیتے ہوں... زندگی سے چمٹے رہنے کی آرزو انسان کو کتنا سفاک اور خود غرض بنا دیتی ہے۔

عامر خاں زندہ رہنا چاہتا تھا۔ کسی آدم خور جانور کی طرح نہیں... مہذب انسان کی طرح جو دوسروں کے حقِ زندگی کو بھی اپنے برابر تسلیم کرتا ہو... تاہم زندہ رہنے کا ہنر وقت کے ہر دور میں الگ تھا... ہر خطۂ ارض پر جدا تھا... وہ گھر کے اور جدی پشتی گاؤں کے ماحول سے نکلا تو ایک نئی دنیا اس کے انتظار میں تھی۔

پہلا سال اس کے لیے زیادہ مشکلات کا تھا... بے شک اسے تعلیمی وظیفہ مل گیا تھا لیکن دیگر اخراجات پورے کرنے کے لیے اسے بہت جتن کرنا پڑے... وہاں ننانوے فیصد سندھی تھے اور عامر کے لیے زبان یا [illegible] کی وہ اہم والا معاملہ تھا۔ اپنی قومیت یا زبان اور تہذیب کی شناخت پر فخر کو تعصب کا نام دینا غلط تھا۔ وہ انسان دوست رویہ رکھنے والے لوگ تھے مگر لسانی تعصب کی فضا نے ذہنوں کو مسموم کر دیا تھا۔ اسے آسانی سے ٹیوشن بھی نہیں ملتی تھی، حالانکہ اردو وہ بھی اتنی ہی جانتا تھا جتنی اس کے آس پاس کے لوگ... اس کے کچھ کلاس فیلوز نے اس کی مدد کی... اساتذہ اس پر مہربان تھے... اس کا پہلا سال جیسے تیسے کر کے گزر گیا۔

ایک سرخ فیتے کے نظام نے دوسرے سال کے لیے اس کے وظیفے پر سوالیہ نشان لگا دیا... اس کے مقابل دوسرا امیدوار کراچی سے تھا۔ عامر خاں جانتا تھا کہ اس کے مالی حالات اتنے بُرے نہیں... کچھ دوستوں کے سامنے وہ برملا کہہ چکا تھا کہ فیس معاف ہو جائے گی تو وہ گھر والوں کو نہیں بتائے گا اور جو فیس وہ بھیجتے رہیں گے اس کے لیے پاکٹ منی ہوگی۔

عامر خاں نے ذاتی طور پر اسے اپنی مشکلات بتائیں مگر اس نے صاف کہہ دیا... نفسا نفسی کا زمانہ ہے... میں تمہارے لیے کیوں قربانی دوں... آگے جاؤ گے تو مقابلہ اور سخت ہوگا... آگے بڑھنے اور اوپر جانے کے لیے تمہاری لاش

پر پاؤں رکھ کے اپنا مقصد حاصل کرنے سے بھی کوئی گریز نہیں کرے گا...

اس کی ساری گفتگو ایک لائبریری میں ہوئی تھی۔ عامر خاں کو یقین تھا کہ اس کی ٹینشن پرابلم سے حریف پر اثر ہوگا اور وہ خود کو مقابلے سے دستبردار کر لے گا لیکن اس کے انتہائی بے مروتی اور کمینگی والے جواب نے عامر خاں کو سخت مایوس کیا۔

جب وہ باہر نکلا تو ایک لڑکی نے اس کا راستہ روک لیا۔ "اے مسٹر عامر خاں پاکستانی... یہ تم کیا کر رہے تھے؟"

عامر خاں گھبرا گیا۔ اسے یہ نام بطور تمسخر اس لیے دیا گیا تھا کہ اس کی اور انڈین فلمی ہیرو عامر خاں کی شکل میں خاصی مماثلت تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ شروع شروع میں جب اس سے سوال کیا جاتا تھا کہ وہ سندھی ہے، پٹھان یا مہاجر تو وہ مسکرا کے کہتا تھا کہ میں پاکستانی ہوں... یہ بات ایک مذاق بن گئی تھی۔

لڑکی اسمارٹ اور خوب صورت تھی اور عامر خاں کی کلاس فیلو تھی... اسے معلوم تھا کہ وہ ایک بیوروکریٹ کی بیٹی ہے جو کسی کو خاطر میں نہیں لاتی... اس نے عاجزی سے کہا۔

"آئی ایم سوری... میں لائبریری میں [illegible] کر رہا تھا۔"

"میں نے یہ نہیں پوچھا... لائبریری میں پڑھنے والے کم اور چھپ چھپ کے باتیں کرنے والے زیادہ ہوتے ہیں۔ مگر تم باتیں کیا کر رہے تھے؟"

"میں کوئی غلط بات نہیں کر رہا تھا جی۔"

"پھر ایسے گڑگڑا کیوں رہے تھے؟" اس نے دونوں ہاتھوں کو سینے پر سمیٹ کے کتابیں اٹھا رکھی تھیں۔

"میں اپنے حالات بتا رہا تھا... وظیفہ مجھے ملنا چاہیے... میرٹ پر یہ میرا حق بنتا ہے۔"

"حق بنتا ہے تو بھیک مانگنے کی کیا ضرورت تھی... وہ بھی اس کمینے شخص سے۔"

اس نے سر جھکا لیا۔ "اور میں کیا کرتا؟"

"یار حق چھیننا پڑتا ہے... ڈاکا ڈالنا جائز نہیں مگر حق چھیننا جائز ہے... ایسے کمزور بن کے کب تک جیو گے؟"

اب اس نے غور سے نظر بھر کے لڑکی کو دیکھا۔ "آپ کو مجھ سے کیوں ہمدردی ہے مس عافیہ!"

"میں سب سن رہی تھی... کمال ہے... جو حق پر ہے وہ بلی کی طرح میاؤں میاؤں کر رہا ہے... جو غاصب ہے، وہ شیر کی طرح دہاڑ رہا ہے... کیا کرو گے تم اس دنیا میں آگے جا کے؟"

"کمزور ہار جاتا ہے۔"

وہ خفگی سے بولی۔ "تم خود اپنے آپ کو کمزور کہہ رہے ہو... پھر تو کتا بھی تمہارے سامنے شیر بن جائے گا... مجھے بتاؤ تم کیوں مایوس ہو... نمبر اس کے اور تمہارے برابر ہیں... اور کون نہیں جانتا کہ اس نے نقل مار کے نمبر لیے تھے۔"

"اس کے پیچھے سفارش ہے اور ایک دلیل ہے ڈومیسائل کی... وہ سندھی ہے... میں پاکستانی ہوں..."

وہ مسکرانے لگی۔ "دیکھو عامر خاں پاکستانی... اسکالرشپ تمہیں ہی ملے گی... ادھر آؤ میرے ساتھ۔"

وہ دوبارہ لائبریری میں گئے۔ "میں کیا کروں؟"

عافیہ نے کاپی میز پر نکالی اور آگے جھک آئی۔ "ایک درخواست لکھو... کنٹرولر آف ایگزامینیشن کے نام... کہ میرے پیپرز ری مارک کیے جائیں۔"

اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ "رزلٹ آئے تو بہت دن ہو گئے۔"

"اس پر تاریخ ڈالو..." وہ سوچ میں پڑ گئی۔ "کب آیا تمہارا رزلٹ... اس کے دو دن بعد کی... چلو لکھو... میری شکل کیا دیکھ رہے ہو... درخواست مجھے دے دو... کسی سے اس بات کا ذکر بھی کرنے کی ضرورت نہیں۔"

تین دن بعد عامر خاں نے نوٹس بورڈ پر دیکھا... دوبارہ چیک کرنے پر عامر خاں کے ٹوٹل میں ایک نمبر کم شمار ہونا ثابت ہو گیا تھا۔ ایک اضافی نمبر کے ساتھ اسکالرشپ کمیٹی نے تمام درخواستوں پر غور کیا تو یہ اسکالرشپ عامر خاں کے لیے منظور کر لی گئی۔

تین دن تک اسے عافیہ کے سامنے اپنی شکر گزاری کے اظہار کا موقع ہی نہ ملا... وہ سامنے آتی تھی تو اس کے ساتھ کوئی ہوتا تھا اور وہ عامر خاں پر نظر ڈالے بغیر گزر جاتی تھی۔ چوتھے دن وہ لائبریری میں مل گئی۔

"تم شکریہ ادا کرنے کے لیے بہت بے تاب تھے نا... آج یہاں آنے کا مقصد تمہیں یہی موقع فراہم کرنا تھا۔" وہ ایک گوشے میں بیٹھ گئی۔

وہ اس کے سامنے وسیع میز کے دوسرے کنارے پر بیٹھ گیا۔ "تم جان بوجھ کے مجھ سے کترا رہی تھیں؟"

"یس... اس لیے کہ مجھے تمہارے کسی شکریے کی ضرورت نہیں۔"

"لیکن... یہ کیسے کیا تم نے؟"

وہ مسکرائی۔ "آم کھاؤ... پیڑ مت گنو عامر خاں پاکستانی۔"

www.pkdigest.com

"تمہاری مدد شامل حال نہ ہوتی تو شاید میڈیکل کالج میں تعلیم جاری رکھنا میرے لیے مشکل ہو جاتا۔"

"ایسا مت سمجھو... کیا پتا خدا کوئی اور وسیلہ بنا دیتا... کام تو میرے ڈیڈ کے ایک فون نے کیا۔"

"اچھا... وہ کیا ہیں؟"

"وہ ایک بگ گن ہیں... ان کے لیے یہ بہت چھوٹا کام تھا اور میں ان سے ناجائز بات بھی منوا سکتی ہوں... میں ان کی لاڈلی ہوں۔"

"مس لاڈلی... میرا مطلب ہے مس عافیہ... اس سال تو بات بن گئی... آئندہ سال..."

"اُف... کیا چیز ہو تم بھی یار... اگلا سال ابھی آیا نہیں... تم کو پریشانی کا روگ ابھی سے لگ گیا... دیکھو... میں نے تمہارے لیے ایک ٹیوشن کا انتظام کیا ہے۔ تم انگلش پڑھا سکتے ہو... ایک بہت خوب صورت لڑکی ہے..."

بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا۔ "تم سے بھی زیادہ؟"

اس نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا... نہ خفا ہوئی، نہ خوش ہوئی اور نہ شرمائی... وہ بس چند سیکنڈ کے لیے خاموش ہوئی اور اسے دیکھتی رہی پھر اس نے کہا۔ "سر... اسے صرف انگلش پڑھانی ہے... کوئی الٹی پٹی نہیں پڑھاؤ گے تو ہر مہینے پانچ ہزار ملتے رہیں گے۔"

عامر خاں نے سکون کا سانس لیا کہ عافیہ نے بُرا نہیں مانا تھا۔ اپنی سادگی یا بے وقوفی میں جو بات اس کے لبوں سے نکل گئی تھی، اس کے دلی جذبات کی آئینہ دار تھی۔ وہ ایسا ہی سمجھتا تھا مگر عافیہ اس کا مطلب یہ نکال سکتی تھی کہ وہ اظہار عشق کر رہا ہے۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک... وہ اپنی اوقات جانتا تھا اور عافیہ کے سوشل اسٹیٹس کو بھی... اور یہ بھی کہ زندگی کوئی فلم نہیں ہے کہ تین گھنٹے میں مووی کی اینڈ پوار سے چڑھ جاتی ہے اور لوگ خوش خوش گھر چلے جاتے ہیں۔

عافیہ نے چٹکی بجائی۔ "اے مسٹر! کس سوچ میں پڑ گئے...؟ نہیں پڑھانا چاہتے ٹیوشن تو کوئی زبردستی نہیں۔"

وہ چونکا۔ "یہ بات نہیں... میں سوچ رہا تھا کہ تم یہ احسان کیوں کر رہی ہو مجھ پر... جس کا بدلہ میں کبھی ادا نہیں کر سکتا۔"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "فضول باتوں کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہے مسٹر..." اس نے کتابیں اٹھائیں اور چل پڑی۔ لائبریری کے دروازے سے نکلتے نکلتے اس نے صرف ایک بار پلٹ کے دیکھا اور وہ اک نگاہ جو بظاہر نگاہ سے کم تھی... اور اس کی بے نام سی مسکراہٹ عامر کے دل میں اتر گئی... وہ بہت دیر دم بہ خود بیٹھا رہا... سوچتا رہا کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟

عامر خاں کو اس کا باپ باقاعدگی سے تو نہیں لیکن کبھی کبھار پانچ دس ہزار روپے بھیج دیتا تھا۔ ظاہر ہے، وہ اپنی دونوں دشمن جاں بیویوں اور تمام اولادوں سے چھپ کر یہ کام کرتا تھا۔ عامر خاں نے اسے کئی بار لکھا کہ وہ ایسا نہ کرے کیونکہ اسے کسی چیز کی ضرورت نہیں... وہ ہاسٹل میں رہتا تھا... چوری چھپے کراچی جا کے لنڈا بازار کے ماہرین سے پرانے سوٹ اپنے ناپ کے مطابق بنوا لاتا تھا۔ اس کے باوجود اپر کلاس میں شامل ہونا اس کے بس کی بات نہیں تھی کیونکہ وہ بڑے گھر کے شہزادوں کی طرح شوقین مزاجی پر ہزار دل لاکھوں نہیں اڑا سکتا تھا... اس کے پاس کوئی چمکتی دمکتی کار نہیں تھی اور وہ اپنے فیملی بیک گراؤنڈ کے بارے میں بلند و بانگ دعوے نہیں رکھتا تھا... اس کی دوستی اور شناسائی متوسط طبقے کے ان ہونہاروں تک محدود تھی جو ذاتی قابلیت کی بنا پر میڈیکل کالج پہنچے تھے اور اب ڈاکٹر بننے کے بعد والے خوابوں کی دنیا سجائے بیٹھے تھے۔

پانچ ہزار ماہانہ کی آمدنی نے اس کو خاصا آسودہ حال کر دیا۔ اس بہت خوب صورت لڑکی کو انگلش پڑھانے کا سوال ہی نہیں تھا۔ اس کی ماں کے علاوہ بھی بہت سے لوگوں کی نگاہیں ہمہ وقت اس پر نگراں رہتی تھیں اور اس کے باپ کے بارے میں تو یہ بات یقینی تھی کہ اسے شک بھی ہو جاتا تو وہ عامر خاں پاکستانی کو کسی جادوگر کی طرح غائب کر دیتا۔ وہ اپنے علاقے کا سیاسی وڈیرا... لیرا... پیر... ڈاکوؤں کا سردار... چیف جسٹس اور حاکم اعلیٰ سب کچھ تھا... تین مہینے بعد اس نے عامر کو خلوت میں طلب فرما کے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے اس پر اپنا دست شفقت رکھتے ہوئے اور اس کی کارکردگی کا اعتراف کرتے ہوئے ٹیوشن فیس دگنی کر دی تو عامر خاں پاکستانی کو رسم و رواج کے مطابق اس کی قدم بوسی کر کے اور ہاتھ جوڑ کے کہنا پڑا تھا کہ وڈا سائیں... آپ کی مہربانی۔

عافیہ اس کی ناراضی پر خوب ہنسی تھی۔ "یار! یہ سب کرنا پڑتا ہے... کسی نے دیکھا تو نہیں نا... اب تمہیں شرافت کا سرٹیفکیٹ مل گیا ہے تو بس بے غم ہو جاؤ... دس ہزار مہینے کے وصول کرو... اور عیش کرو۔"

عامر خاں نے نفی میں سر ہلایا۔ "عیش میں نہیں کر سکتا۔ مجھے تیسرے سال کے لیے فیس جمع کرنی ہے... اسکالرشپ کا

کیا بھروسا... اگلے سال ملے نہ ملے... اس بار تم نے میرے حریف کو دھکا دے کر لائن سے نکال دیا... اگلی بار کوئی مجھے نکال دے؟"

"آخر تم اتنے قنوطی کیوں ہو... PASSIMIST... ایسا کیوں نہیں سوچتے کہ اگلی بار میں خود سب کو ناک آؤٹ کر دوں گا۔"

اس وقت وہ کیمپس کے کیفے ٹیریا میں سب سے الگ بیٹھے تھے۔ ان جیسے اور بھی تھے جو بڑے معنی خیز انداز میں مسکراتے تھے اور اشارے کرتے تھے کہ لگے رہو... کیونکہ وہاں تقریباً سب ہی آپس میں کسی نہ کسی سے انوالو تھے... لڑکیاں عموماً سیریس تھیں... لڑکے اسے ٹائم پاس کہتے تھے کہ ابھی سے لائف پارٹنر کے لیے سوچنا کیسا... جوڑے تو آسمانوں پر بنتے ہیں... اسے خود ملاوے گا جس سے ملانا ہوگا۔

عافیہ اور عامر کا عشق بھی کسی سے چھپا نہیں رہ سکتا تھا تاہم ایک پُرامن بقائے باہمی کے تحت سب ایک دوسرے کا پردہ رکھتے تھے تاکہ یہ ظالم سماج ابھی سے اپنی ٹانگ نہ اڑائے... وی آر جسٹ گڈ فرینڈز... سب کا سلوگن تھا۔

عافیہ کا باپ واقعی بڑی توپ چیز تھا لیکن وہ کراچی میں تھا اور پڑھا لکھا ماڈرن ہونے کی وجہ سے عامر خاں کو یہ خطرہ بہرحال محسوس نہیں ہوتا تھا کہ کسی دن وہ اسے توپ دم کروے گا یا کرا دے گا... پھر عافیہ اس کی سپورٹر تھی۔ "ڈیڈ کی فکر مت کرو... ان سے میں کچھ بھی منوا سکتی ہوں... اگر میں کہوں کہ کاغان کے اس خچر کو اپنے سر کا تاج بنانا چاہتی ہوں تو وہ کہیں گے کہ بھئی جیسی تمہاری خوشی۔"

"ویسے ایک بات پر میری ناقص عقل چکرا جاتی ہے کہ تم نے آخر اس کاغان کے خچر میں کیا دیکھا؟"

"یہ میڈیکل کا سب سے مشکل سوال ہے جس کا جواب صرف ایک صورت میں مل سکتا ہے کہ میرے دل کے ساتھ میری آنکھیں بھی تمہارے لگا دی جائیں اور پھر تمہیں کھڑا کر دیا جائے آئینے کے روبرو... ورنہ میری نظر سے تم مجھے دیکھو گے تو کیا پتا چلے گا۔"

"مجھے بس ایک پلس پوائنٹ نظر آتا ہے... تمہارے ڈیڈ کو ایک مثالی گھر داماد مل جائے گا... جس کی خواہش سب کرتے ہیں۔"

"کیا تمہارے اچھا شوہر ثابت ہونے کی کوئی گارنٹی نہیں؟"

"گارنٹی آج کل کہاں چلتی ہے میڈم... سب دو نمبر مال آ رہا ہے اور زبان کا پاس کوئی نہیں رکھتا۔"

عافیہ نے بیگ میں سے ایک ریوالور نکالا اور درمیان میں رکھ دیا۔ "اب بولو۔"

عامر خاں پاکستانی پر لرزہ طاری ہو گیا۔ "اب کیا بولوں..."

قریب کی میز پر سے ایک زیر تکمیل ڈاکٹر اپنی پارٹنر کو چھوڑ کے آیا۔ "اچھا ہے۔" اس نے ریوالور اٹھا کے اور الٹ پلٹ کے دیکھا... پھر درخت کی طرف رخ کر کے فائر کیا... اوپر سے ایک کوا نیچے گرا... بہت سے کوے کائیں کائیں کرتے اڑے... "اچھا ہے۔" اس نے پھر کہا اور ریوالور کو میز پر رکھ دیا۔

"تمہارا نشانہ بھی اچھا ہے۔" عافیہ نے کہا۔

وہ عامر خاں پر نظر ڈالے بغیر اپنی میز پر جا کے بیٹھ گیا۔ کیا وقت اور زمانہ آ گیا ہے اور آنے والا ہے... عامر خاں نے اسے دیکھ کر سوچا... صورت اور حلیے سے وہ کسی کاؤبوائے فلم کا کریکٹر یا کسی مافیا کا ڈان لگتا تھا۔ اس کا قد چھ فٹ تھا... شوقیہ اس نے سر منڈوا رکھا تھا اور غالباً بہادری کے نشان کے طور پر کسی زخم کے اس نشان کی نمائش کر رہا تھا جو اس کے سر کی جلد پر بہت نمایاں تھا... رہی سہی کسر ان بن گلاسز نے پوری کر دی تھی جن کی یہاں کوئی خاص ضرورت نہیں تھی کیونکہ مطلع ابر آلود تھا۔

اسلحہ کیمپس میں عام تھا۔ اس کی نمائش بھی کوئی سنسنی نہیں پھیلاتی تھی۔ زیادہ تر بڑے لوگوں کی بگڑی ہوئی اولادیں اسے اپنی حفاظت سے زیادہ اپنی طاقت کے مظاہرے کے لیے استعمال کرتی تھیں۔ لائسنس کسی کے پاس نہیں تھا۔ بعض اوقات دو مخالف سیاسی یا لسانی گروہ کے حامی ایک دوسرے کے مقابلے پر صف آرا ہوتے تھے تو خوب فائرنگ ہوتی تھی... پھر پولیس آ جاتی تھی اور "شرفا" کو جو کہیں کونوں کھدروں میں دبکے پڑے ہوتے تھے، گرفتار کر کے لے جاتی تھی۔ واجبی سی چھترول یا مناسب رشوت لینے کے بعد وہ چھوڑ بھی دیے جاتے تھے۔

کیفے ٹیریا کے خادم گلے مردہ کوے کو اٹھانے سے پہلے وہ دونوں وہاں سے اٹھ چکے تھے۔ "عقلمندی کی جو تم بولے نہیں۔"

"تم نے اعتراض نہیں کیا تو میں کیوں بولتا... مگر یہ تھا کون؟"

"بس یوں سمجھ لو کہ سندھ کے اندر اس کے باپ کا راج ہے۔"

"یار عافیہ! اسلحہ تو ہمارے علاقے میں مرد کا زیور

www.pkdigest.com

کہلاتا ہے لیکن یوں کسی اسکول، کالج یا یونیورسٹی میں استعمال نہیں ہوتا۔“

”تمہارے پاس صدیوں سے ہے... یہاں ابھی آیا ہے... آہستہ آہستہ یہاں کے لوگوں کو بھی اس کے استعمال کا سلیقہ آجائے گا... اچھا، اب ایک بریکنگ نیوز تمہارے لیے... میں کراچی جارہی ہوں۔“

وہ چونکا۔ ”کتنے دن کے لیے؟“

”دن کا کیا مطلب... میں وہاں سندھ یا ڈاؤ میں پڑھوں گی... پاپا کی پوسٹنگ کراچی ہوگئی ہے... میرا ٹرانسفر ہو جائے گا۔“

عامر خاں رک گیا۔ ”یہ بہت جان لیوا مذاق ہے۔“

عافیہ نے اس کا بازو پکڑ کے کھینچا۔ ”ایسی رونی شکل مت بناؤ... میں تمہیں بھی ساتھ لے جاؤں گی... ابھی تو میری وجہ سے تم محفوظ تھے... ورنہ تمہارا یہاں رہنا ٹھیک نہیں... ڈاؤ کی ڈگری بھی بہتر ہے... زیادہ معتبر سمجھی جاتی ہے باہر۔“

”اس کار خیر میں پھر تمہارے پاپا کا لیور استعمال ہو گا... ہمیں یہاں سے اٹھا کے وہاں رکھنے میں۔“

”تم جانتے ہو پھر پوچھتے کیوں ہو... سفارش کے بغیر کچھ ہوتا ہے؟ آگے بہت زندگی پڑی ہے... ڈاکٹری کی ڈگری والا کاغذ لینے سے کیا زندگی بدل جاتی ہے؟ یہ جو اسّی فیصد لڑکیاں ہیں میڈیکل کالج میں... ان میں سے اسّی فیصد ہاؤس وائف بن جائیں گی دو سال کے اندر اندر... بچے پیدا کریں گی اور کچن چلائیں گی... ایک عام میٹرک یا نان میٹرک دیہاتی لڑکی کی طرح... شاید وہ بہتر ہاؤس وائف ثابت ہوتی ہے کیونکہ امور خانہ داری سیکھ کر آتی ہے۔“

”اور تم... تم کیا کرو گی؟“

”میں اسپیشلائز کروں گی... جیسے تم کرو گے... اب یہ مت پوچھنا کیسے؟ پاپا تمہیں اسکالرشپ دلوا دیں گے... مجھے وہ خود بھیج سکتے ہیں۔ تم نے کبھی سوچا ہے کہ تم کہاں جاؤ گے؟“

”اپنے گناہوں پر غور کرتا ہوں تو یقین آجاتا ہے کہ جہنم میں۔“

وہ ہنس پڑی۔ ”میں آئی سرجن ہوں گی... یوں... اس میں ایمرجنسی کوئی نہیں ہوتی کہ آپ کو سوتے سے اٹھ کے دوڑنا پڑے۔“

”ابھی وہ وقت بہت دور ہے مانیا۔“

”تم نے پھر مجھے مانیا کہا... اور اب بکواس کرو گے کہ سچ منہ سے نکل جاتا ہے۔“ وہ سخت خفا ہوگئی۔

”سوری سوری... چڑے کی زبان ہے... پھسل جاتی ہے... اسے تم پروف ریڈنگ کی غلطی سمجھو یا کمپوزنگ کی... اے کی جگہ ایم آجاتا ہے... چلو میرے حق میں بھی تم فیصلہ سنا دو... میں کیا کروں؟“

وہ ایک دم ٹھیک ہوگئی۔ ”دیکھو... بچوں کا ہارٹ سرجن کوئی نہیں یہاں... لوگ اپنے بچوں کو لے کر انڈیا بھاگے تھے ویزا ملتے ہی... تم بن جاؤ انفینٹ کارڈیالوجی کے ماہر... لاکھوں کماؤ گے۔“

”کتنے معصوم شیر خواروں کی جان لینے کے بعد؟“

”یہ جذباتی پن مت... میڈیکل سائنس ایسے ہی ترقی کرتی ہے۔ لاکھوں مینڈک، چوہے، گنی پگ اور خرگوش مارنے کے بعد انسان کی باری آتی ہے... یہ بھی تو سوچو کہ تم کتنے بچوں کو بچالو گے... بس میں نے طے کردیا... تم انفینٹ کارڈیک سرجن ہوگے... پاپا نے کہا ہے کہ تب تک وہ بھی ریٹائر ہوجائیں گے اور ہمارے لیے کلفٹن میں یا ڈیفنس کے بلاک نو، دس میں کوئی اسپتال بنا دیں گے۔“

عامر خاں نے ایک آہ بھری۔ ”گویا میرا گھر داماد ہونا بھی طے ہے؟“

”عامر... میں بیگ ماروں گی کھینچ کے... اپنی خوش نصیبی پر خدا کا شکر ادا نہیں کرتے... ایک سو ایک میں سے عافیہ نے تمہیں چنا... خوش نہیں تو جاؤ اپنے گاؤں کی گوری کے پاس... جو سال کے سال بچہ جنا دے... اللہ میاں کی گائے ہو...“ اپنی بات پر وہ خود ہی ہنس پڑی۔

یہ نادانی انسانوں نے طے کی تھی جو غیب کا علم اور قضا و قدر کے معاملات پر اختیار نہیں رکھتے... کہ دوسرا سال مکمل ہو جائے تو تیسرے کا آغاز کراچی کے ڈاؤ میڈیکل کالج میں کریں گے۔

دوسرے سال کا امتحان سر پر تھا کہ بالاکوٹ سے آزاد کشمیر تک 18 اکتوبر کی صبح آٹھ بجے کی پر قیامت آگئی۔ ایک زلزلے نے جو برصغیر کی تاریخ کا سب سے بڑا ہلاکت خیز زلزلہ تھا، ایک لاکھ افراد کو فنا کردیا۔ ان گنت خاندانوں کے لیے گھر ہی ان کے مدفن ہوگئے۔ بستیاں مٹ گئیں، آبادیوں کا وجود نہ رہا۔

عامر خاں نے سوتے سے جاگ کے موبائل فون اٹھایا۔ وہ رات بھر پڑھتا رہا تھا اور فجر کی نماز پڑھ کے سویا تھا... نمبر دیکھ کے اس نے کہا۔ ”ہیلو مانیا!“

”تم سو رہے ہو؟“ وہ روہانسے لہجے میں بولی۔

”ہاں... کیوں کیا ہوا...؟“

”ٹی وی دیکھو...“ وہ سخت اپ سیٹ تھی۔

”یار! تم بتا دو نا کیا قیامت آگئی؟“

”تم ٹی وی دیکھو... ابھی اٹھو اور کامن روم میں جاؤ... میں نہیں بتا سکتی۔“

عامر کی نیند اڑ گئی... آخر ہوا کیا ہے... انڈیا نے ایٹم بم پھینک دیا کراچی پر... خدانخواستہ... پاکستان پر امریکا نے قبضہ کرلیا... پھر خدانخواستہ... وہ منہ دھوتے ہوئے سوچتا رہا... عافیہ کیوں اتنی پریشان تھی... کیا پاپا نے اس کی شادی اسامہ بن لادن سے طے کردی... یہ خبر ٹی وی پر آسکتی ہے اور عافیہ کی خودکشی کا سبب بھی بن سکتی ہے۔

ہاسٹل کے کامن روم میں پہنچتے ہی عامر خاں کو خبر مل گئی جس نے اس کے حواس گم کردیے... وہاں ٹی وی کے گرد ایک مجمع تھا... اسے دیکھتے ہی سب کے سر گھوم گئے اور خاموشی میں صرف ٹی وی کی آواز رہ گئی... ہر نظر اب عامر پر آکے رک گئی تھی... اس نے ٹی وی کی طرف دیکھا... تصویر کے نیچے خبر کی پٹی چل رہی تھی... وہ بڑی مشکل سے ایک کرسی تک پہنچا۔

کسی نے اسے پانی کا گلاس پیش کیا... پھر کوئی بولا... ”یار! دیکھو چائے ہے... بلکہ ناشتا لاؤ...“ عامر نے اشارے سے سب کو منع کردیا۔ دو گھونٹ پانی کے پی لیے... اس کے سامنے وہ سارا علاقہ تھا جو زلزلے میں سب سے زیادہ متاثر ہوا تھا... بالاکوٹ کا وجود مٹ گیا تھا... اس کے ساتھ ہی تھا وہ پہاڑ جس پر اس کا سارا خاندان آباد تھا... وہ بستی کہاں رہی ہوگی۔

ایک دم اس کے مخالف بھی اس کے سب سے بڑے ہمدرد بن گئے تھے اور ان سب کی ہمدردی جینوئن تھی... حقیقی دکھ کی غماز... سب اسے فوراً جانے کا کہہ رہے تھے... اسے ہر قسم کی آفر دے رہے تھے... ہم تمہیں کراچی لے چلتے ہیں... پہلی فلائٹ پر تمہیں جگہ مل جائے گی... پائلٹ تمہیں اپنے کیبن میں لے جائے گا... ریزرویشن کی فکر مت کرو... چلو... پھر عافیہ آگئی... ایک دم مدد کے لیے جانے والے رضا کاروں کا گروپ بن گیا... ضرورت کا سامان اکٹھا کرنے کا اعلان ہو گیا... جو یہاں ہو رہا تھا سارے ملک میں ہو رہا تھا۔

عامر خاں کو عافیہ اپنی گاڑی میں کراچی لے گئی... وہ عامر کے ساتھ پیچھے بیٹھی رہی... ڈرائیونگ ان کے ایک کلاس فیلو نے کی... اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی لڑکی عافیہ کی سہیلی اور ڈرائیونگ کرنے والے کی محبوبہ تھی... وہ سب عامر کے غم میں برابر شریک تھے جو اس مایوسی کا اظہار کر چکا تھا کہ اس کے گھر میں سے شاید ہی کوئی بچا ہو۔

عامر خاں رو نہیں رہا تھا... وہ افسردہ اور پریشان ضرور تھا اور گم صم باہر دیکھ رہا تھا۔ اس کا ذہن کچھ بھی تصور میں دیکھنے سے قاصر تھا... یہ اندازہ کرنے سے قاصر تھا کہ اسے کون زندہ ملے گا اور کون نہیں... اس وقت وہاں کون بچا ہوگا جو کسی کی مدد کرے... سب ایک ساتھ دفن ہو چکے ہوں گے... اس کی ماں... صوفی زمان اس کا باپ... اس کی دوسری ماں اور اس کے چودہ بہن بھائی... یا شاید سولہ... اسے حیرانی بھی ہوئی اور اپنے آپ سے شرم بھی آئی کہ اس کے دل پر صدمے کا اتنا اثر نہیں... زندگی میں پہلے کئی موقع ایسے آئے تھے جب وہ رویا تھا... آج ماں باپ مر گئے تھے اور اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے... جیسے وہ اس فیملی کا حصہ ہی نہیں تھا جو نہیں رہی۔

عین وقت پر کسی فلائٹ میں جگہ ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا... یہ ایمرجنسی تھی اور اسلام آباد جانے والوں کا ایک ہجوم تھا جو وہاں سے بائی روڈ آگے جاتے... بالاکوٹ سے راولاکوٹ تک سیکڑوں گاؤں اور قصبے زلزلے سے متاثر ہوئے تھے... ان گھروں کے لاتعداد لوگ کراچی میں تھے جو سب ائرپورٹ کی طرف بھاگے تھے... وہ سب اڑ کے اپنے گھر پہنچنا چاہتے تھے۔

عامر خاں کے ساتھ آنے والوں کو بھی ادھر ادھر کئی فون کرنے اور کرانے پڑے... بالآخر وہ عامر خاں کو ایک پائلٹ کے کیبن میں جگہ دلوانے میں کامیاب رہے... عافیہ نے ایک بیگ اسے تھما دیا... ”اسے اپنے ساتھ رکھنا... اس میں کچھ پیسے ہیں... تمہیں ضرورت پڑے گی...“ اس نے اسلام آباد میں اترنے کے بعد دیکھا... یہ ایک لاکھ روپے تھے جو ان ہمدردوں نے جمع کیے تھے۔

اسلام آباد سے پبلک ٹرانسپورٹ ملنے کا کوئی سوال نہ تھا لیکن ان گنت لوگ اپنی کاریں لے کر مدد کے لیے جا رہے تھے... عامر خاں کو ایک لڑکی نے بٹھا لیا... یہ بعد میں پتا چلا کہ وہ ڈاکٹر تھی... عامر خاں کے میڈیکل کا طالب علم ہونے کا سن کے اس کی ہمدردی بڑھ گئی... ایک جگہ آرمی کے جوانوں نے کار کو روک دیا۔ آگے امدادی کام جاری تھا چنانچہ عام ٹریفک کے لیے سڑک بند تھی۔ لیڈی ڈاکٹر کو سخت مایوسی ہوئی۔ عامر خاں نے ایک افسر کو اپنے بارے میں بتایا کہ اس کا گاؤں کہاں تھا... اس نے ان دونوں کو امدادی سامان لے جانے والی ایک گاڑی میں آگے روانہ کردیا۔ لیڈی ڈاکٹر پہلے میڈیکل ریلیف کیمپ پر اتر گئی۔ اس نے عامر خاں کو اپنا کارڈ اور موبائل فون نمبر بھی دیا اور کہا کہ واپسی میں اس سے ضرور ملے... وہ یہیں ہوگی۔

عامر خاں کا دل زلزلے کی تباہ کاری اور لاشوں کے

www.pkdigest.com

ٹوٹے پھوٹے خون آلود انبار دیکھ دیکھ کے بے حس ہونے لگا تھا... درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا... اس کے کان مسلسل آہ و بکا سن رہے تھے... دم توڑتے اور ملبے سے نکالے جانے والے زخمیوں کی چیخ پکار اور زندہ سلامت بچ جانے والوں کی آہ و بکا سے پتھر کا ہو گیا تھا... ہنوز اس کے سامنے ایک طویل سفر باقی تھا... وہ بھوکا پیاسا چلتا گیا۔

رات ہونے تک وہ اپنے گاؤں پہنچنے میں کامیاب رہا۔ اندازہ اسے راہ میں ہی ہو گیا تھا کہ وہ کیا دیکھے گا۔ بالآخر اس نے بستی کی جگہ ایک ویران کھنڈر دیکھ لیا۔ کوئی گھر سلامت نہ تھا۔ ہر دیوار منہدم ہو چکی تھی... ہر چھت مکینوں پر گری تھی۔ جہاں آبادی تھی وہاں صرف ملبے کے ڈھیر رہ گئے تھے... انہی میں اس کا گھر تھا۔ اس کی تباہی دیکھ کے اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ شاید ہی اس کا کوئی مکین زندہ بچا ہو۔

وہاں اردگرد سے مدد کے لیے پہنچنے والے سرگرم عمل تھے۔ ان کی تعداد محدود تھی اور وسائل نہ ہونے کے برابر تھے۔ اس کے باوجود وہ کام کر رہے تھے۔ ہر شخص چاہتا تھا کہ اس کی سنی جائے... وہ زیادہ مصیبت زدہ اور فوری مدد کا زیادہ مستحق ہے۔ عامر خاں کو سخت تھکن اور نقاہت محسوس ہوئی۔ وہ کہیں آرام کرنا چاہتا تھا اور بھوکا بھی تھا لیکن یہاں ایسی کوئی جگہ نہ تھی جہاں سے اسے کھانے کو کچھ مل سکتا... پینے کا پانی تک نایاب تھا۔

وہ بستی سے کچھ فاصلے پر گیا جہاں ایک پہاڑی چشمہ تھا۔ ملبہ گرنے سے چشمہ بہنا بند ہو گیا تھا مگر ایک گڑھے میں پانی تھا جو پیا جا سکتا تھا۔ یہاں کچھ خاموشی بھی تھی۔ جانوروں کی طرح جھک کر اس نے پانی سے منہ لگایا اور پھر کنارے پر لیٹ گیا۔ اب سردی بڑھنے لگی تھی۔ وہ اپنے ساتھ گرم کپڑے لایا تھا لیکن رات کھلے آسمان تلے نہیں گزاری جا سکتی تھی۔

وہ پلٹ کے بستی کی طرف آیا۔ ایک ویران تاریک گھر کا نصف حصہ سلامت کھڑا تھا۔ وہ کھڑکی سے اندر کود گیا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ گھر کس کا ہے... اس کے پکڑے جانے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس نے مکان کے مالک کو نام لے کر آواز دی۔ پھر اس نے موبائل فون کی لائٹ آن کی۔ اس کے سامنے فرش پر برتن بکھرے پڑے تھے۔

تھوڑی سی جستجو کے بعد اسے کھانے کو مل گیا۔ یہ پرانی باسی روٹیاں تھیں جو خشک ہو چکی تھیں۔ ایک شکستہ مرتبان میں گڑ کے ڈھیلے تھے... کونے میں رکھے پلاسٹک کے نیلے ڈرم میں پانی بھی تھا۔ اس نے وہیں بیٹھ کے روٹی کے ٹکڑوں کو پانی میں بھگویا... ان کے نرم ہونے تک وہ گڑ کھاتا رہا۔ پیٹ

بھرنے کے بعد اس نے باقی بچی ہوئی سوکھی روٹیاں اپنے بیگ میں ڈال لیں جس میں ابھی پورے ایک لاکھ روپے تھے... اسے ایک رضائی مل گئی۔ اندر سونے میں خطرہ تھا کہ رات کو کسی وقت دیواریں اس پر آ گریں۔ زلزلے کے جھٹکے وقفے وقفے سے جاری تھے... وہ باہر آ کے سو گیا۔

اسے اپنی شقاوت قلبی پر حیرانی ہوئی... اس کا دماغ خونی مناظر اور موت کے روپ دیکھ کے خراب نہیں ہوا تھا۔ وہ دردناک آوازوں کا شور بھی نہیں سن رہا تھا۔ وہ انسان سے جانور بن گیا تھا جسے صرف اپنی بقائے حیات سے دلچسپی تھی۔ آخر اسے اتنی دور آنے کی ضرورت ہی کیا تھی... گھر میں کوئی نہیں بچا تھا۔ یہ سوچ کے ہی اسے صبر آ گیا تھا کہ اس کا سارا خاندان ختم ہوا... اب وہ دنیا میں اکیلا ہے۔

لیکن جب اس کا خاندان اپنا وجود رکھتا تھا، تب کیا تھا۔ صرف اس کا باپ تھا جو اسے ڈاکٹر بنانا چاہتا تھا۔ اپنا سر فخر سے بلند کرنے کے لیے... اپنی نا تمام حسرتوں کے خواب کو تعبیر دینے کے لیے... اس کی ماں مخالف تھی کیونکہ اسے ڈر تھا کہ وہ ڈاکٹر بن کے شہر میں جائے گا... کسی ڈاکٹرنی یا بڑے گھر کی لڑکی سے شادی کرلے گا اور وہیں رہے گا... ہمیں کیا فائدہ اس کو ڈاکٹر بنانے کا... اس کے سگے سوتیلے تمام جاہل بھائی دوسری ماں کی قیادت میں اس حد تک متحد تھے کہ عامر خاں کو ان کے بلند عزائم سمیت خاک میں ملا دینا چاہتے تھے۔ اس نے خود ان کی گفتگو سنی تھی۔ وہ عامر خاں کی تعلیم کے لیے باغ کا ایک حصہ فروخت کرنے کے فیصلے پر سخت مشتعل تھے اور اس فیصلے پر عمل درآمد روکنے کے لیے وہ میں سے ایک پلان پر عمل درآمد کرنا چاہتے تھے۔ زمین، مکان، باغ سب کے ہیں... سب کی بقا کے لیے ضروری ہیں... یہ کسی ایک کے مستقبل پر قربان نہیں کیے جا سکتے... اگر ایسا ہوتا ہے تو یہ دینے والے کو ختم کر دیا جائے یا لینے والے کو۔

عامر خاں کی دوراندیشی سے معاملہ ٹل گیا تھا۔ کسی کے بیوہ اور یتیم ہونے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ وہ سب زندہ رہے تھے جو بقا کی جنگ میں مرنے سے پہلے مارنے پر یقین رکھتے تھے... عامر خاں کے دل میں ان کے لیے کیا برادرانہ محبت کے جذبات ہوتے... تھوڑا سا دکھ اسے اپنی بے بس ماں کے لیے تھا اور اس سے زیادہ اپنے مجبور باپ کے لیے... جب وہ خود پڑھنا چاہتا تھا تو اسے نہیں پڑھنے دیا گیا... جب وہ بیٹے کو پڑھانا چاہتا تھا تو خود اپنی اولاد آڑے آ گئی... اور تدبیر کرنے والوں پر دور کہیں تقدیر خندہ زن تھی۔

عامر خاں کے اگلے کئی دن ریلیف کیمپوں کے چکر

لگاتے گزرے... وہ صرف ایک کیس رجسٹر کرانا چاہتا تھا کہ یہاں اس کا خاندان تھا... ان کا گھر تھا اور زمین تھی... اگر کوئی نہیں بچا تو وارث کی حیثیت سے اس کا نام لکھا جائے... حکومت کی جانب سے ریلیف فراہم کرنے کے اعلانات بہت تھے۔ مدد باہر سے بھی آ رہی تھی اور مقامی لوگ بھی پوری طرح امدادی کاموں میں شریک تھے لیکن بہت جلد عامر خاں کو اندازہ ہو گیا کہ شاید سب سے آسان مرنا تھا... جینے والوں کے لیے زندگی محض آزمائش ہے... ضابطے کی کارروائی ہے... خانہ پُری ہے۔

عامر خاں کو بہت کچھ ثابت کرنا تھا... گھر کتنا بڑا تھا؟ کس کے نام پر تھا؟ ملکیتی دستاویزات کہاں ہیں... باغ کس کا تھا... اور کتنے وارث تھے؟ سب کے نام... شناختی کارڈ... ڈیتھ سرٹیفکیٹ... ثبوت... شہادت... گواہی... وہ جھوٹا دعوے دار تو نہیں... عامر خاں کا حوصلہ جواب دے گیا... یہاں بھوک سے قحط جیسی صورت حال تھی... پینے کو پانی نہیں تھا... امداد بھی خیرات کی طرح ملتی تھی اور لوٹ مار میں انسان ایسے لڑتے تھے جیسے جانور۔

ایک دن عامر خاں کو اس لیڈی ڈاکٹر کا خیال آ گیا جو اسے یہاں لائی تھی۔ اس نے اسے فون کیا... جواب آیا... آپ کے مطلوبہ نمبر سے جواب موصول نہیں ہو رہا ہے... شاید اس کی بیٹری جواب دے چکی تھی جیسے عامر خاں کے فون کی ختم ہونے کے قریب تھی اور اسے چارج کرنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ پھر اچانک جب وہ مایوس ہو چکا تھا، وہ اسے مل گئی۔

''میں تو واپس جا رہی ہوں... اس سے زیادہ میری برداشت سے باہر ہے۔''

''کیوں... کیا ہوا؟''

''یہ پوچھو کیا نہیں ہوا... دن رات کام... آرام کی گنجائش ہی نہیں... نہ کھانے کو نہ پینے کو... اور اوپر سے ہر طرف وہی جانور... مرد... میں اکیلی عورت کس کس سے خود کو بچاؤں...'' وہ رونے لگی۔

عامر خاں اس کے مختصر خیمے میں فرش پر بیٹھ گیا۔ ''رو کیوں رہی ہو؟''

''کیا تم اندازہ نہیں کر سکتے؟'' وہ چلّا کے بولی۔ ''میری زبانی میرے بے آبرو کیے جانے کی کہانی سننے کا مزہ لینا چاہتے ہو؟''

''آئی... آئی ایم سوری... مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا۔ آدمی اچھا ہوتا ہے تو کتنا اچھا ہوتا ہے... اور بُرا بنتا ہے تو کتنا بُرا بن جاتا ہے۔''

''میں بڑے جذبے کے ساتھ آئی تھی۔''

''میں نے بھی یہاں آ کے یہی محسوس کیا... کہ نہ آتا تو اچھا ہوتا... میرا خیال ہے کہ میں اپنی گزشتہ زندگی کو اپنی عمر کی کتاب سے خارج کر دوں... سمجھ لوں کہ میں اکیلا تھا... اور اکیلا ہوں... کیا تم مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو گی؟''

''ابھی تو رات ہے ورنہ میں کہتی کہ ابھی چلو... جہاں میری گاڑی روکی گئی تھی، وہ جگہ یہاں سے چالیس پچاس کلومیٹر تو ہوگی۔''

''کیا تم نے سب کو بتا دیا ہے... جن کے ساتھ تم کام کر رہی تھیں؟''

''صبح میں کسی کو بتائے بغیر نکل جانا چاہتی ہوں۔''

''صبح کیوں... ابھی کیوں نہیں... ڈرو نہیں... میں ہوں نا تمہارے ساتھ...''

میں ہوں نا... مرد کا اعلان مردانگی جس پر عورت انحصار کر لیتی ہے... لیڈی ڈاکٹر فخر النسا کے پاس کچھ بسکٹ تھے۔ ایک پانی کی بوتل... چالیس پچاس کلومیٹر کے لیے یہ زادِ راہ کافی تھا... اگر کسی سے لفٹ نہ ملتی، تب بھی وہ صبح سے پہلے ہی پہنچ جاتے۔

وہ اس سڑک پر چل پڑے جس پر آمد و رفت جاری تھی۔ لیڈی ڈاکٹر نے اسے اپنے بارے میں بتایا... ''شادی طے ہو چکی ہے... پریکٹس چھوڑنی پڑے گی... پانچ سال کی دن رات کی محنت رائیگاں جائے گی لیکن میرا ہونے والا شوہر بڑے اچھے کھاتے پیتے گھر سے تعلق رکھتا ہے... بزنس مین ہے... اسے میری پریکٹس سے مزید آمدنی کی ضرورت ہی نہیں... میرے شوق کی کوئی اہمیت نہیں... میرے لیے اہمیت گھر اور خاندان کی ہونی چاہیے۔''

''یہی ہوتا ہے لڑکیوں کے ساتھ... انہیں ڈاکٹری پڑھنی ہی نہیں چاہیے یا پھر شادی نہیں کرنی چاہیے... وہ دونوں کام کرنا چاہتی ہیں۔''

''شادی کے بغیر اکیلی عورت اس معاشرے میں کیسے محفوظ رہ سکتی ہے... شادی اس کی مجبوری ہے۔''

''پھر ڈاکٹری کا شوق نہ پالے... بچے پالے۔''

''ہو تم بھی روایتی مرد... سب کی سوچ ایک ہی ہے۔''

''سوری میڈم... میں سوسائٹی کی سوچ نہیں بدل سکتا... اور میں اسی کا حصہ ہوں... کیا تمہیں میری اسٹوری سے کوئی دلچسپی نہیں۔''

''تمہاری مرضی ہے، سناؤ نہ سناؤ۔''

وہ خاموشی سے چلتی گئی اور عامر خاں پاکستانی کی کہانی

www.pkdigest.com

سکتی رہی... وہ وقفے وقفے سے بسکٹ کھاتے رہے اور پانی کے گھونٹ پیتے رہے۔

رات کے دو بجے وہ سڑک کے کنارے ایک پلیا پر بیٹھ کے اپنی تھکن دور کر رہے تھے جب سامنے سے آنے والی ایک گاڑی ان کے پاس رکی۔ اس میں سے ایک پولیس انسپکٹر اترا... پیچھے سے بندوق بردار دو سپاہی اترے۔

"کون ہو تم لوگ؟" انسپکٹر نے بڑی رعونت سے پوچھا۔

"میں ڈاکٹر فخر النسا ہوں۔"

"اور میں عامر خان ہوں... نواب شاہ میڈیکل کالج..."

"یہ ڈاکٹروں کی جوڑی یہاں کیا کر رہی ہے رات دو بجے... کیا رشتہ ہے تمہارا آپس میں؟" انسپکٹر نے سوال کیا۔

عامر خان نے اس کے لہجے سے سمجھ لیا کہ اس کے عزائم کیا ہیں اور اس کا اگلا سوال کیا ہوگا... "یہ بیوی ہے میری... ہم یہاں ریلیف ورک کرنے آئے تھے... اب واپس جا رہے ہیں۔"

فخر النسا نے کہا۔ "میری گاڑی وہاں کھڑی ہے... کچھ آگے روک لی گئی تھی۔"

انسپکٹر کی نظر میں شک برقرار رہا۔ "اس بیگ میں کیا ہے... اوئے... تم دیکھو..." اس نے ایک سپاہی کو حکم دیا۔

سپاہی نے عامر خان سے بیگ چھین لیا۔ اسے کھولتے ہی اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ "سر جی! اس میں تو نوٹ ہی نوٹ بھرے ہیں..."

انسپکٹر مسکرانے لگا۔ "اب ذرا لیڈی ڈاکٹر صاحبہ کا بیگ بھی دیکھو۔"

فخر النسا نے احتجاج کیا۔ "اس میں کچھ نہیں ہے۔"

کانسٹیبل نے بیگ اس سے چھین لیا۔ "کچھ نہیں ہے تو شور کیوں کرتی ہے؟" اس نے بیگ کھولا اور اندر ہاتھ مارا۔

"یہ... یہ کچھ نہیں ہے۔" اس نے ہاتھ نکالا تو اس میں سونے کے زیورات تھے... نیکلس، کنگن، چوڑیاں۔

"اچھا تو یہ ریلیف ورک کر رہے تھے تم دونوں..." انسپکٹر نے طنز سے کہا۔ "مُردوں کا مال لوٹ رہے تھے۔"

عامر خان نے وضاحت کی کوشش کی۔ "سر... یہ بات نہیں ہے۔"

انسپکٹر نے تابڑ توڑ اس کے منہ پر تھپڑ رسید کیے... اس کے منہ سے غلیظ گالیوں کا گٹر ابل پڑا... "ڈالو ان چوروں کو گاڑی میں۔"

فخر النسا نے رونا شروع کر دیا۔ "تھانے دار صاحب! میری بات تو سنیں۔"

"سب سنیں گے ادھر جا کے... تم دونوں گو ریکارڈ کی طرح بجائیں گے... پھر سب پتا چل جائے گا تمہاری اصلیت کا۔"

کسی لحاظ کے بغیر انہوں نے فخر النسا کو بھی جیپ میں ٹھونسا اور پولیس کی مخصوص زبان میں بتاتے رہے کہ تھانے میں کیا ہوگا۔ "تم جیسے شریف صورت لٹیرے بہت آگئے ہیں ادھر... لاشوں کے کان، ہاتھ کاٹ کے عورتوں کے زیور اتار رہے ہیں۔"

"سر... یہ میرا ذاتی ہے... میں نے اس لیے پیچھے نہیں چھوڑا تھا کہ چوری نہ ہو جائے۔" فخر النسا زار و قطار رو رہی تھی۔

عامر خان نے بھی بولنا چاہا۔ "سر! میں یہیں کا رہنے والا ہوں... یہ رقم مجھے میرے کلاس فیلوز نے جمع کر کے دی تھی۔"

جواب میں اس کو لاتیں اور ٹھڈے پڑے تو اسے لگا کہ شاید اس کی پسلیاں ٹوٹ گئی ہوں گی... اسے سانس لینا مشکل ہو گیا... انہیں ایک تھانے کی حوالات میں دھکیل دیا گیا... وہاں چار مجرم پہلے سے موجود تھے... ان میں دو فرش پر لمبی تانے خراٹے لے رہے تھے... ایک پیٹ پکڑ کے ہائے ہائے کر رہا تھا۔ خون اس کے ناک اور منہ سے جاری تھا... اس کی شلوار بھی خون آلود ہو رہی تھی... اسے ابھی ابھی کمرۂ تفتیش سے لایا گیا تھا۔ چوتھا گھٹنوں میں سر دیے سہما بیٹھا تھا۔ جب ایک سپاہی نے اشارے سے اسے بلایا۔ "چل بھئی جوان آجا... تجھے بھی سیر کرا دیں ڈرائنگ روم کی۔" تو وہ گڑگڑانے لگا اور لڑکھڑاتے قدموں سے دروازے تک گیا۔

"قسم اللہ کی... قرآن پاک کی... میں نے کچھ نہیں کیا... مجھے بخش دو... مجھ پر رحم کرو..." سپاہی نے اس کو گدی سے پکڑ کر دھکیلا... عامر خان نے دیکھا کہ وہ اپنے پیچھے فرش پر لہو کی ایک لکیر چھوڑتا جا رہا ہے۔

صبح ہوئی تو عامر نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ "تم زبردستی مجھے مجرم بنانا چاہتے ہو... تم نے میرے ایک لاکھ بھی چھین لیے... میں اسی علاقے کا رہنے والا ہوں... میرے ماں باپ، بھائی بہن سب مر گئے... میری مدد کرنے کے بجائے تم میرے ساتھ یہ کیا سلوک کر رہے ہو... میں آرمی کو رپورٹ کروں گا۔ تم جانتے نہیں میرے تعلقات کہاں تک ہیں۔"

اس دھمکی کا الٹا اثر ہوا۔ تھانے دار نے کہا۔ "ابھی پہلے اس سے پوچھو... یہ صدر کا بھانجا ہے کہ وزیراعظم کا بھتیجا۔"

وہ اسے حوالات سے نکال کے لے گئے اور پچھلے صحن

کے ایک کمرے میں ننگا کر کے الٹا لٹکا دیا۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کے انہوں نے اس کی چھترول شروع کی۔ وہ فٹ لمبے چمڑے کی ہر ضرب سے اس کی جلد کو شعلوں کی زبان چاٹ لیتی تھی... وہ تڑپتا پھڑکتا رہا مگر کوئی چیخ اس کے حلق سے برآمد نہ ہو سکی۔

دوپہر کے بعد تھانے دار پھر آیا تو عامر خان اس کمرے میں فرش پر چادر کے نیچے بے سدھ پڑا تھا... تفتیش کرنے والے نے اپنے افسر اعلیٰ کو رپورٹ دی کہ ملزم نے اعتراف جرم کر لیا ہے اور ایک لاکھ پر اپنے دعوے سے بھی دستبردار ہو چکا ہے۔

تھانے دار نے کہا۔ "ٹھیک ہے... ڈال دو اسے کہیں... مرے گا تو نہیں نا؟"

"نہیں سر جی... بندہ سخت جان ہے۔"

عامر خان کو جب ہوش آیا تو وہ سڑک کے کنارے پڑا تھا... ایک بڈھا اس سے پوچھ رہا تھا۔ "اوئے! کیا ہوا ہے تجھے؟"

عامر خان بڑی مشکل سے اٹھا۔ "کچھ نہیں بابا... یہ کون سی جگہ ہے؟"

"ہری پور... کہاں سے آیا ہے تو...؟"

"بابا... مجھے تھوڑا سا پانی پلا دو... اور کچھ کھانے کو دے دو۔" عامر خان نے کہا۔

بڈھا اسے سہارا دے کر اپنے گھر لے گیا۔ ایک کمرے کے چھوٹے سے نیم پختہ مکان میں وہ اپنے بیٹے اور بہو کے ساتھ رہتا تھا۔ شدید تکلیف کے ساتھ عامر نے روٹی کھا کے چائے پیتے ہوئے بتایا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا... بڈھا دکھ سے سر ہلاتا رہا۔ "یہ انسان نہیں حیوان ہوتے ہیں... جو ان کے ہاتھ لگ جائے..." اس نے دونوں کان چھوئے۔

عامر خان کو کچھ پتا نہیں تھا... اور وہ پتا کرتا بھی تو کیسے... کہ اس لیڈی ڈاکٹر فخر النسا کا کیا بنا... تھانے والوں نے اسے بخشا یا وہ بھی ان کی درندگی کا نشانہ بنی... وہ شام تک سوتا رہا۔ بڈھے نے کہیں سے اسے درد دور کرنے والی گولی بھی لا دی تھی... پولیس نے اس کے ایک لاکھ ہی نہیں رکھے تھے... اس کا موبائل فون، پرس سب کچھ ضبط کر لیا تھا... یقیناً انہوں نے اس کا زیور بھی رکھ لیا ہوگا... اب اسے پھر فخر النسا یاد آنے لگی تھی... اس کے ساتھ بہت ظلم ہوا تھا... وہ یہاں مصیبت زدوں کی مدد کے لیے آئی تھی اور خود مصیبت میں پڑ گئی تھی... اس نے عامر خان کو اپنی گاڑی میں لفٹ دی تھی اور اب وہ پھر اسے اپنی گاڑی میں پنڈی تک لے جانا چاہتی تھی... آخر وہ کیا کرے... کیا وہ پھر تھانے جائے... فخر النسا اب شاید اسے نہ ملے۔ اس نے اپنے گھر والوں کو یا اپنے ساتھی ڈاکٹروں کو بتا دیا ہوگا اور وہ اسے چھڑا کے لے گئے ہوں گے یا اس کا بزنس مین شوہر پہنچ گیا ہوگا... عامر خان کا تو کوئی بھی نہیں تھا... لے دے کے ایک عافیہ تھی مگر اسے اپنے ساتھ ہونے والے انسانیت سوز سلوک کے بارے میں بتاتے ہوئے عامر خان کو اپنی ہتک محسوس ہوتی تھی۔

تاہم اس کے سینے کے اندر ایک آگ بھڑک رہی تھی۔ کاش اس کے پاس بھی عافیہ جیسا ایک ریوالور ہوتا تو وہ اس لالچی، بے ضمیر اور سفاک تھانے دار کے سر میں گولی اتار دیتا جس نے ایک مظلوم کی مدد کرنے کے بجائے اس پر ناقابل بیان ظلم کیا تھا۔ صرف اس لیے کہ اس نے وردی پہن رکھی تھی اور وہ اختیار رکھتا تھا... اس سے تو لٹیرے، ڈاکو اچھے تھے جو صرف مال لیتے تھے... کسی پر جسمانی تشدد تو نہیں کرتے تھے... اس کی نظر میں بار بار وہ منظر آتا تھا جب وہ تھانے میں کسی ذبح ہونے والے بکرے کی طرح الٹا لٹکا ہوا تھا جس کی کھال کھینچی جا رہی تھی اور وہ اذیت سے تڑپ رہا تھا۔

اس کے مددگار بڈھے نے بہت سمجھایا کہ پتر تو مجھ سے پیسے لے اور واپس چلا جا مگر عامر خان کے دماغ کا میٹر گھوم چکا تھا۔ تصدیق کے لیے وہ پہلے اس جگہ تک گیا جہاں فخر النسا کی گاڑی روکی گئی تھی... گاڑی اسی جگہ موجود تھی۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ فخر النسا کا عذاب ابھی ختم نہیں ہوا۔

اسے تھانہ تلاش کرنے میں کچھ وقت لگا لیکن اندر جانے سے پہلے وہ آرمی میڈیکل کور کے ایک فیلڈ اسپتال میں چلا گیا۔ وہاں آرمی کے ڈاکٹر طبی امداد میں دن رات ایک کر رہے تھے۔ کسی کے پاس اتنی فرصت نہ تھی کہ عامر خان کی فریاد سنے اور اس کے ساتھ جا کے اپنی ایک ہم پیشہ ڈاکٹر کو تھانے سے چھڑائے... لیکن ایک کیپٹن نے اسے صحیح جگہ بھیج دیا۔

عامر خان نے بہ مشکل تمام اپنی روداد ایک لیفٹیننٹ کرنل کے گوش گزار کی۔ وہ شفیق اور مہربان آدمی تھا لیکن بے حد مصروف تھا۔ تاہم اس نے عامر خان کو انکار سے مایوس بھی نہیں کیا۔ اس نے ایک صوبیدار کو جیپ دے کر عامر خان کے ساتھ بھیج دیا۔ عامر خان کو یقین تھا کہ اب تھانے دار کی ساری ہیکڑی نکل جائے گی... اس کے ایک لاکھ روپے بھی مل جائیں گے... فخر النسا کا زیور بھی اور اسے رہائی بھی مل جائے گی۔

عامر خان کو سخت مایوسی ہوئی جب تھانے دار نے

www.pkdigest.com

سامنے آ کے اسے پہچاننے سے بھی انکار کر دیا۔ اس نے صوبیدار کے سامنے یہ ظاہر کیا کہ ضرور عامر خاں کو غلط فہمی ہوئی ہے... وہ کوئی دوسرا تھانہ ہوگا۔ یہاں نہ کسی ڈاکٹر فخر النسا کو لایا گیا اور نہ اس کے ساتھ عامر خاں کو... ایک لاکھ روپے یا لیڈی ڈاکٹر کے زیورات رکھنے کا کیا سوال...

صوبیدار سخت مشکل میں پڑ گیا کہ کس کی مانے اور کس کی نہ مانے۔ اس نے کہا۔ ''تھانے دار! یہ بندہ مجھے پاگل تو نہیں لگتا... اور تمہارے ساتھ اس کی کوئی دشمنی بھی نہیں۔''

تھانے دار نے کہا۔ ''صوبیدار صاحب... آپ کرنل صاحب کو بولیں... ہم پتا لگا لیں گے... ایسی لاقانونیت اور ظلم ہمارے ہوتے... ناممکن ہے... یہ غلط فہمی کا معاملہ ہے... رات کا وقت تھا... وردی میں سب ایک سے لگتے ہیں۔''

عامر خاں نے چلّا کے کہا۔ ''صوبیدار صاحب! وہ ڈاکٹر اندر ہی ہوگی... تھانے میں...''

تھانے دار نے گھنٹی بجائی۔ ''اوئے! انہیں اندر لے جا کے سب دکھا دو... اچھی طرح تسلی کرا دینا... بات سمجھ آ گئی نا...''

عامر خاں کو اندر جانے میں کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوا۔ تھانے دار نے اپنی اشاروں کی زبان میں سب کہہ دیا تھا... عامر خاں کو حوالات کے علاوہ دو تین کمرے دکھائے گئے... پھر عقبی حصے کے ایک کمرے میں یوں اچانک دبوچ لیا گیا کہ اس کے حلق سے آواز تک نہ نکل سکی۔

شاید انہوں نے صوبیدار سے یہی کہا ہوگا کہ وہ عامر خاں کو دوسرے تھانوں میں لے جا کے بھی اطمینان کرا دیں گے کہ صوبیدار چلا گیا... عامر خاں کو جب رہائی ملی تو اسے پھر تھانے دار کے سامنے پیش کیا گیا۔

''کیوں... ایک رات میں عقل نہیں آئی تھی تجھے... کہ پھر آ گیا؟''

عامر خاں نے سکون سے کہا۔ ''تم اپنی فکر کرو تھانے دار صاحب! میں نے کرنل صاحب کو پوری اسٹوری سنا دی تھی... اس سے پہلے میں نے میڈیکل کور کے جس کیپٹن کو ساری بات بتائی تھی، اس کی بہن میرے ساتھ پڑھتی ہے... تم میری لاش گُم کر دو... تب بھی یہ معاملہ دبنے والا نہیں ہے۔''

تھانے دار کچھ سوچ میں پڑ گیا تھا۔ ''تیرا پکا بندوبست کرنا پڑے گا۔''

''مجھے وہ ایک لاکھ عافیہ صدیقی نے جمع کر کے دیے تھے... وہی مجھے کراچی ائرپورٹ لے گئی تھی اور وہ چیف سیکریٹری کی بیٹی ہے... جس لڑکے نے مجھے پائلٹ کے کیبن میں سوار کرایا تھا، وہ سول ایوی ایشن کے ڈائریکٹر جنرل کا بھانجا ہے۔''

تھانے دار نے اس کے ایک ایسا تھپڑ رسید کیا کہ عامر خاں کا گال سن ہو گیا۔ ''بھونکنا بند کر کتے۔''

اسی وقت فخر النسا اندر لائی گئی۔ وہ بے حد تھکی ہوئی، اداس اور کمزور لگ رہی تھی۔ عامر خاں اسے دیکھتا رہا... ''کیسی ہو فخر النسا؟''

''ٹھیک ہوں...'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''تمہارے گھر والے تمہیں لینے نہیں آئے؟''

''میرا ان سے رابطہ نہیں ہوا۔'' فخر النسا نے بڑی مشکل سے کہا مگر اس کی آنکھوں سے آنسو بے اختیار بہہ نکلے۔

''میں دیکھ آیا ہوں... تمہاری گاڑی وہیں کھڑی ہوئی ہے۔''

''عامر...'' وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر تھانے دار کے اشارے پر ایک سپاہی اسے کھینچ کے اندر لے گیا۔ عامر نے محسوس کیا کہ وہ اپنی بے وقوفی سے دوبارہ اس جہنم کا قیدی بن گیا ہے... لیکن اس کی دھمکی رائگاں نہیں گئی تھی۔ اس بار اسے حوالات میں بند کیا گیا۔ تھانے دار نے بڑی ہوشیاری سے ان کے خلاف حدود آرڈی نینس کے تحت زنا کا کیس بنایا۔ اس میں لکھا گیا کہ ڈاکٹر فخر النسا اور عامر خاں کو رات دو بجے کہاں سے رنگ رلیاں مناتے ہوئے گرفتار کیا گیا تھا... انہوں نے بیان دیا تھا کہ وہ میاں بیوی ہیں لیکن یہ جھوٹ تھا۔ ان کے پاس سے دو موبائل فون برآمد ہوئے تھے جس پر وہ باتیں کرتے تھے... عامر خاں کے پرس میں ساڑھے تین ہزار روپے تھے اور ڈاکٹر فخر النسا نے دو سونے کی چوڑیاں پہن رکھی تھیں۔ اس کے بیگ میں کچھ میک اپ کا سامان تھا... وہ زلزلہ زدگان کی امداد کے بہانے بھاگ کر یہاں عیش کرنے آئے تھے... عامر خاں کا بیان تھا کہ وہ متاثرین میں ہے مگر اس کا نہ کوئی ثبوت تھا نہ گواہ۔

اس کے بعد ذلت و رسوائی اور قانونی مشکلات کا نیا سلسلہ شروع ہوا۔ فخر النسا کو زنا کے الزام میں عامر خاں کے ساتھ مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا... ان کی ضمانت کا کوئی سوال نہ تھا... فخر النسا کو طبی معائنے کے لیے دارالامان بھیج دیا گیا اور عامر خاں کو جوڈیشل ریمانڈ پر جیل... ان کے انکار کی اب کوئی قانونی حیثیت نہیں رہی تھی اور نہ ان کے اس بیان کی جس میں انہوں نے حقائق بیان کیے تھے۔ اب انہیں اپنی

بے گناہی ثابت کرنا تھی... پولیس کے خلاف کچھ ثابت کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا... اب انہیں کوئی کیپٹن، کرنل رہائی نہیں دلوا سکتا تھا۔ اس دوران عامر خاں کو اس کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا وہ بیان دکھا کے بھی ڈرایا جاتا رہا جو اس نے ایک رات ڈرائنگ روم میں گزارنے کے بعد لکھ کر دیا تھا اور جس میں اس نے اعتراف کیا تھا کہ وہ اور فخر النسا مل کے لوٹ مار کرتے رہے تھے... عدالت میں پیشی اور بے گناہی کی منزل بڑی دور تھی۔

فخر النسا کو پہلے یہ موقع ملا کہ وہ اپنے بارے میں اپنے گھر والوں کو مطلع کر سکے... معلوم نہیں اس نے کسے رشوت دی... کیا رشوت دی... اور کیسے... ایک دن معلوم ہوا کہ وہ چلی گئی ہے... اسی رات تھانے میں کسی اعلیٰ پولیس افسر کا فون موصول ہونے پر عامر خاں کو بھی رہائی نصیب ہوئی... اسے بعد میں معلوم ہوا کہ عافیہ کو فون کرنے والی فخر النسا تھی جس نے صرف یہ بتایا تھا کہ عامر خاں فلاں تھانے میں بند ہے۔

یہ دوسرا تجربہ عامر خاں کا دماغ درست کرنے کے لیے کافی تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ کسی پر بھی کوئی جرم بنانا یا ثابت کرنا پولیس کے لیے کتنا آسان ہے اور آدمی کی سب سے بڑی بدنصیبی اس کا لاوارث ہونا ہے... وہ بااختیار ہے تو قتل بھی کر سکتا ہے کیونکہ بچانے والے بااختیار...

وہ سیکنڈ ایئر میڈیکل کا امتحان نہیں دے سکا تھا... اس کا ایک سال ضائع ہو گیا لیکن اصل نقصان یہ ہوا کہ عافیہ اس سے بدظن ہو گئی۔ اس نے اپنا ٹرانسفر ڈاؤ میڈیکل کالج کرا لیا تھا۔ جب عامر خاں اس سے ملا تو اس نے بڑے تلخ لہجے میں کہا۔ ''اب مجھ سے ملنے کیوں آئے ہو... جاؤ اس کے پاس جس کے ساتھ ایبٹ آباد میں گھوم رہے تھے... جسے تم نے اپنی بیوی بتایا تھا... ڈاکٹر فخر النسا... سب جھوٹ بولا تھا تم نے... تمہارا کوئی عزیز زلزلے میں نہیں مرا تھا... نہ تمہارا کوئی گاؤں تھا نہ گھر۔ تم نے ہماری ہمدردی بھی سمیٹی اور ایک لاکھ روپے بھی اینٹھ لیے... مجھے کیا پتا تھا اصل کہانی کا ورنہ میں تمہاری سفارش بھی نہ کراتی... پڑے ہوتے اسی تھانے کی حوالات میں... آئندہ نہ مجھ سے کوئی توقع رکھنا اور نہ ملنے کی کوشش کرنا۔''

عامر خاں کی ہر وضاحت رائگاں گئی۔ عافیہ اس کا کوئی سچ تسلیم کرنے پر راضی ہی نہ تھی۔ عورت کے دل میں رقابت کا کانٹا ایک بار غلط فہمی پیدا کر دے تو اسے دور نہیں کیا جا سکتا... عامر خاں پاکستانی نے بالآخر یہ مان لیا... زندگی کی اور فلم کی کہانی لکھنے والے الگ ہوتے ہیں... ایک کاتبِ تقدیر کہلاتا ہے، دوسرا اسٹوری رائٹر جو محض ایک انسان ہوتا ہے۔

☆☆☆

عامر خاں شدید ذہنی اضطراب میں مبتلا تھا... اصغر علی کے گھر سے واپس آنے کے بعد وہ تقریباً ساری رات جاگتا رہا۔ اس نے یہ احتیاط ضرور کی تھی کہ شاپنگ بیگ میں ٹھنسے ہوئے بنڈل کو سیٹ کے نیچے سے نکال کے اپنے ساتھ ہی لے آیا تھا... یہ چالیس لاکھ کی رقم اب اس کے بیڈ کے نیچے پڑی تھی۔

ابھی تک ایک لمحے کے لیے بھی چالیس لاکھ کی ملکیت کے خیال نے اسے کوئی مسرت نہیں دی تھی۔ اصغر علی کے جنازے میں جانے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اسے چالیس لاکھ کے بارے میں کچھ معلوم ہو کہ اصغر علی کے پاس اتنی بڑی رقم کیوں تھی اور کہاں سے آئی تھی۔ یہ تو مشکل تھا کہ کسی قسم کی معلومات حاصل کیے بغیر وہ چالیس لاکھ مرنے والے کے وارث یا اس کی بیوہ کے حوالے کر دیتا اور اطمینان سے لوٹ آتا۔

اسے یہ امید تھی کہ وہاں اس رقم کا کوئی حوالہ ضرور دے گا... کہ مرنے والے نے کسی کام کے لیے یہ رقم بینک سے نکالی تھی... مگر خود اس کی مالی حیثیت اتنی بڑی نہ تھی... کیا اس نے یہ رقم کسی سے قرض لی تھی... لی تھی تو کس کام کے لیے... اس نے کوئی پراپرٹی بیچی تھی یا اسے یہ رقم کسی کو پہنچانی تھی؟

عامر خاں کو زیادہ امکان اس بات کا نظر آتا تھا کہ یہ دفتر کی رقم ہوگی جو اس نے چرائی ہوگی یا غبن کی ہوگی لیکن جنازے میں شریک لوگوں کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ مرنے والا شریف اور ایمان دار شخص تھا۔ جس کمپنی میں وہ کام کرتا تھا، اس کے جنرل منیجر نے اس کی وفاداری اور ایمان داری کو بہت سراہا تھا اور اس کی خدمات کے اعتراف میں اکبر علی کو ملازمت بھی پیش کر دی تھی اور مرحوم کے واجبات کی ادائیگی میں بھی دیر نہیں کی تھی۔

بظاہر وہ چوری اور غبن کرنے والا شخص نہیں تھا۔ وہ چالیس لاکھ کہاں سے لایا اور اسے کیوں اپنے ساتھ لیے پھر رہا تھا... یہ سوال ہنوز جواب طلب تھا... کیا وہ کوئی ناجائز دھندا کرتا تھا... جواری تھا یا کسی ڈرگ مافیا کے لیے کام کرتا تھا... ایسا ہوتا تو وہ کسی پوش آبادی میں گھر بناتا... اس کے پاس شان دار گاڑی ہوتی اور وہ کسی ٹیکسی میں نہ مرتا۔

عامر خاں تین مہینے سے ٹیکسی چلا رہا تھا... عافیہ کو تو جیسے کسی بہانے کی تلاش تھی کہ وہ عامر خاں جیسے نچلے طبقے کے

www.pkdigest.com

لاوارث شخص کی محبت کے اسکینڈل سے پیچھا چھڑا لے جو محض اس کی تضحیک اور بدنامی کا باعث ہو رہا تھا اور اپنی اپر کلاس سے کسی کا انتخاب کرلے۔ اس کی ایک نگاہِ کرم کے طلب گار خود اس کے ہم مرتبہ اور ایسے طبقے کے نوجوانوں کی کمی نہ تھی جو اسمارٹ بھی تھے اور خوش حال مستقبل بھی رکھتے تھے... ایک یا ایک سے زائد افیئرز میں کوئی بات معیوب نہ تھی... الٹا لڑکی کے لیے زیادہ سے زیادہ چاہنے والوں کا ہجوم اس کے حسنِ دستیاب کی دلکشی کا ثبوت اور اشتہار ہوتا تھا... وہ اپنے باپ کی لاڈلی تھی... چھر مانگے تو ڈیڈ خوش کہ جیسی تمہاری مرضی... اور ہیرا مانگے تو مزید خوش کہ بیٹی نے اپنا معیار اور اسٹیٹس برقرار رکھا... پہلے انہوں نے یہ دلیل تسلیم کی ہوگی کہ ایک گھر داماد اگر غریب ہو تو اس کا اضافی فائدہ یہ ہے کہ دب کر رہتا ہے... اب عافیہ نے عامر خاں پاکستانی کو مسترد کرنے کی وجہ بتائی ہو گی تو انہوں نے سوچا ہو گا کہ بیٹی ولایت میں اعلیٰ تعلیم کے لیے جائے گی اور کسی عامر خاں ولایتی سے منسوب ہو جائے گی تو گویا ایک ٹکٹ میں دو مزے... برطانیہ کی شہریت اسے خود بخود ڈگری کے ساتھ مل جائے گی۔

آدمی خود کو کتنی آسانی سے مطمئن کر لیتا ہے۔ یوں ہو تب بھی خوشی خوشی جی لیا ہے اور یوں نہ ہو تب بھی... جیسے کہ اب عامر خاں جی رہا تھا... عافیہ کے ایک بامروت دوست نے اس کی دکھ بھری کہانی سن کے عملی طور پر اس کی مدد کی تھی... اس نے کہا تھا کہ اب تم ڈاکٹر نہیں بن سکے اور گھر بار، زمین جائداد بھی نہیں رہے تو کرو گے کیا؟ عامر خاں نے روایتی طریقے پر سوچے سمجھے بغیر کہہ دیا تھا کہ بھوکا تو نہیں مروں گا اور عافیہ کی جدائی کے غم میں خودکشی بھی نہیں کروں گا... محنت مزدوری کروں گا... ٹیکسی بھی چلانی پڑی تو چلاؤں گا... اس نوجوان نے جو خود بھی اپر کلاس سے تعلق رکھتا تھا، عامر خاں کی زندگی کی المناک کہانی کہیں اپنے حلقۂ احباب میں سنائی ہوگی۔

ایک دن اچانک اسے کسی نے فون کر کے کہا۔ ''عامر خاں پاکستانی... میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔''

''کس قسم کی مدد... اور تم کون ہو...؟''

''ریگل پر آجاؤ... میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں... کینیڈے اوڈین۔''

''یار اپنا نام تو بتا دو... میں کیسے پہچانوں گا تمہیں؟''

وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔ ''تم دیکھو گے تو خود پہچان جاؤ گے۔''

ریگل بڑی مصروف جگہ تھی اور وہاں جانے میں خطرے کی کوئی بات نہ تھی... تجسس اور امید عامر خاں کو کینیڈے اوڈین لے گئے... وہ جیسے ہی اندر داخل ہوا، ایک شخص کونے کی میز پر اٹھا... عامر خاں نے اسے فوراً پہچان لیا... یہ وہی تھا جس نے عافیہ کے ریوالور سے فائر کر کے کہا تھا۔ ''اچھا ہے...'' آج بھی جینز پر بند گلے کی شرٹ پہنے ہوئے تھا... اس نے ریسٹورنٹ کے نیم تاریک ماحول میں بھی سیاہ سن گلاسز لگا رکھے تھے اور اس کے اسی ابھرے سر پر زخم کا بدنما داغ اسی طرح نمایاں تھا۔

''تم میری مدد کرنے کے لیے نواب شاہ سے آئے ہو؟''

''نواب شاہ کیا امریکا میں ہے؟'' وہ ہنسا۔ ''مجھ سے تمہارے ایک دوست نے ذکر کیا تھا کہ تم بے روزگار ہو... میرے ساتھ چلو اور ٹیکسی لے لو۔''

''ٹیکسی لے لوں؟'' عامر خاں دم بخود رہ گیا۔ ''مگر کیوں... اور کیسے... میری جیب میں تو پھوٹی کوڑی نہیں... کیا تم مجھے قرض دے رہے ہو یا مجھے قسطوں پر ٹیکسی دلواؤ گے؟''

''چلو... فضول باتوں کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔''

وہ شخص جو عامر خاں پاکستانی کو حلیے سے جرائم پیشہ لگتا تھا اور میڈیکل کالج میں جس کی بدمعاشی کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی... شام تک عامر خاں کو ٹیکسی دلوا کے اور اس کے کاغذات بنوا کے رخصت ہو گیا... عامر خاں نے اس کا شکریہ ادا کرنا چاہا اور احسان مندی کا اظہار کیا تو اس نے ''بکواس مت کرو'' کہا اور نواب شاہ لوٹ گیا... لیکن وہ نواب شاہ نہیں پہنچا... ہالہ کے قریب ایک تیز رفتار ڈمپر نے اس کی گاڑی کو ٹکر ماری اور وہ وہیں جاں بحق ہو گیا... عامر خاں کو اس کا علم ایک مہینے بعد ہوا جب ایک دن اس نے سوچا کہ وہ اپنے محسن سے مل تو آئے جو عامر خاں کو جیسے بھول گیا تھا۔

اب اس بات کو بھی دو مہینے ہو گئے تھے مگر عامر خاں کو اکثر اس کا خیال آتا تھا... چہرے اور حلیے کتنے دھوکے دیتے ہیں... ایک وہ بدمعاش سمجھا جانے والا اجنبی اور دوسری عافیہ جیسی معصوم صورت شریف زادی... دونوں کے دیے ہوئے داغ اس کے دل پر تھے... ایک میں عقیدت کا رنگ تھا... دوسرے میں نفرت کا۔

قدرت نے اسے ایک نئے امتحان میں ڈال دیا تھا... وہ ڈرتا تھا کہ اچانک کوئی اس چالیس لاکھ کا دعوے دار نہ آجائے... وہ دروازے پر دستک دے اور ایک دم اندر آکے ریوالور نکال لے... باپ کا مال سمجھ کے رکھ لیا چالیس لاکھ کی

رقم کو... تم کیا سمجھتے تھے کہ ہم تمہیں تلاش نہیں کر پائیں گے... اصغر علی کے جنازے میں بھی تم معصوم صورت بنائے چپ بیٹھے رہے... ہمیں سب معلوم ہے۔

ایک لاکھ کی مصیبت وہ بھگت چکا تھا... یہ اس سے چالیس گنا رقم تھی... اس کے دعوے دار تو عامر خاں پاکستانی کا چہلم ہی کرائیں گے... مگر وہ ہیں کون... کہاں ہیں... آئیں اور لے جائیں اپنے چالیس لاکھ... مجھے بھاگنا ہوتا تو اب تک ٹیکسی میں بیٹھ کے میں لاہور پہنچ گیا ہوتا۔

عامر خاں نے چالیس لاکھ کی ملکیت کا سراغ لگانے کی ایک آخری کوشش کرنے کا فیصلہ کیا... اس نے بازار سے ایک سستا سا موبائل فون خریدا جو ظاہر ہے چوری کا تھا اور اس میں نہ جانے کس کے نام کی سم تھی۔ اسٹار مارکیٹ میں ہر روز ایسے سیکڑوں فون خریدے اور بیچے جاتے تھے۔

باہر آکے اس نے ایک محفوظ مقام پر ٹیکسی روکی اور اکبر علی کو فون کیا۔ ''ابا کا سوئم کب ہے برخوردار؟''

اکبر علی نے سعادت مندی سے جواب دیا۔ ''کل... نمازِ جمعہ کے بعد... گھر کے قریب ہی مسجد میں... آپ کون ہیں جناب؟''

''میں ان کا ایک دوست ہوں... محمود حسین...'' اس نے فون بند کر دیا۔

اس نے صبح کے تمام صبح اور شام کے اخبارات خریدے اور لوٹ کے گھر آگیا۔ سواریاں اٹھا کے کمائی کرنے کا اس کا کوئی موڈ نہیں تھا... شام تک اس نے ہر اخبار کی ساری اہم اور غیر اہم خبریں غور سے پڑھیں... شام کے اخبارات جرائم کی سنسنی خیز خبروں کو زیادہ اہمیت دیتے تھے... شہر میں چوری کی متعدد وارداتیں ہوئی تھیں... گاڑیاں چھینی گئی تھیں اور موبائل فون چھینے گئے تھے... ڈکیتی کی وارداتوں میں تین خبریں بڑی سرخی کے ساتھ شائع ہوئی تھیں۔

ایک ڈکیتی کی واردات ناظم آباد کے بینک میں ہوئی تھی لیکن اس میں بینک کا فرض شناس چوکیدار مارا گیا تھا اور ایک ڈاکو... باقی کچھ لوٹے بغیر فرار ہو گئے تھے... دوسری ایسی ہی واردات گلشن اقبال میں ہوئی تھی جس میں ڈاکو پچیس لاکھ لے گئے تھے... دبئی سے آنے والی ایک فیملی کو بیس لاکھ کے طلائی زیورات، دس لاکھ نقد اور سامان سے محروم کر دیا گیا تھا... ڈاکو ایئرپورٹ سے ان کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔

قتل... اغوا... زیادتی... حادثات سب کی رپورٹس دیکھ دیکھ کے عامر خاں کا سر گھوم گیا... یوں لگتا تھا جیسے اس شہر میں اور کچھ ہوتا ہی نہیں... اصغر علی جیسا ایمان دار اور شریف آدمی... اچھا شوہر... اچھا باپ... اچھا ملازم... ایسا کوئی کام نہیں کر سکتا تھا... پھر اس کے پاس چالیس لاکھ کہاں سے آئے... کیا اس نے اپنی کمپنی میں غبن کیا تھا جس کی خبر ابھی تک مالکوں کو نہیں ہوئی تھی؟ وہ جوئے میں اتنی بڑی رقم جیت نہیں سکتا تھا... لاٹری... پرائز بونڈ جیسے تمام امکانات معدوم تھے... پرائز بونڈ بڑے انعام والے بھی ہوتے تھے لیکن ان کے ڈرا کی تاریخ ہوتی تھی اور ٹریفک سگنل پر اخبار بیچنے والے لونڈے چلا چلا کے انعامی فہرست والے سپلیمنٹ فروخت کرتے تھے۔

ابھی تک عامر خاں خود کو قائل نہیں کر سکا تھا کہ وہ چالیس لاکھ کی یہ رقم اپنے پاس رکھ سکتا ہے... ایک سبب اس کا خوف تھا... دوسرا سبب جواب کمزور پڑتا جا رہا تھا، اخلاقی جواز تھا... اگر یہ رقم اس فیملی کی ہے جس کا واحد کمانے والا اصغر علی تھا تو یہ انہی کا حق ہے... اگر یہ کسی سے غبن کر کے لوٹی گئی ہے، تب بھی انہی کو ملنی چاہیے ورنہ کمپنی کسی لحاظ کے بغیر پولیس کو رپورٹ کرے گی اور پولیس اکبر علی کو اسی طرح ننگا کر کے الٹا لٹکائے رکھے گی اور ٹارچر کر کے پوچھتی رہے گی کہ وہ رقم کہاں ہے... نوکری گیا، اس کی جان بھی بلاوجہ جا سکتی ہے... اور وہ بیوہ جس کی عدت کا زمانہ ابھی شروع ہوا ہے... وہ کیا کرے گی... نہیں... خدانخواستہ مرحوم نے یہ رقم کمپنی کے حساب سے اڑائی تھی تو کمپنی کو واپس ملنی چاہیے۔

اگلے روز نمازِ جمعہ کے بعد سوئم میں شریک ہونے والوں کی تعداد بہت کم تھی... کچھ لوگ کمپنی سے بھی آئے تھے جو تدفین میں شرکت نہیں کر سکے تھے... عامر خاں بڑے دھیان سے کان لگائے سب کی گفتگو سنتا رہا... ابھی تک کمپنی میں کسی قسم کے غبن کی کوئی بات نہیں کر رہا تھا۔

موقع پا کے اس نے اکبر علی سے کہا۔ ''سنو بیٹا! کیا تمہارے والد کوئی سودا کرنے والے تھے؟''

اکبر علی چونکا۔ ''کس قسم کا سودا؟''

''انہوں نے کوئی مکان فروخت کیا ہو یا زمین؟''

اکبر علی نے اسے حیرانی سے دیکھا۔ ''ہمارے پاس تو یہی ایک مکان ہے انکل جس میں ہم رہتے ہیں۔''

''اچھا... پھر وہ کیوں کہہ رہا تھا کہ چند دن میں وہ ایک بڑا سودا کرنے والا ہے؟''

''وہ کمپنی کے کسی سودے کی بات کر رہے ہوں گے۔''

اکبر علی اٹھ گیا۔

صرف لوگوں کی باتیں سننے کے لیے عامر خاں فاتحہ ہونے تک مسجد میں موجود رہا... اس نے اصغر علی کے ایک

www.pkdigest.com

دفتری ساتھی سے معلوم کیا۔
"کیا اصغر علی کوئی اور کام بھی کرتا تھا... پارٹ ٹائم؟"
اس نے طنز سے جواب دیا۔ "کیسی باتیں کرتے ہیں آپ؟ یہاں آفس آنے کا ٹائم تو ہے... واپسی کا کوئی ٹائم نہیں... اکثر رات ہو جاتی ہے گھر واپس پہنچتے پہنچتے... پارٹ ٹائم کوئی کیسے کر سکتا ہے... سرکاری نوکری والے ہی کرتے ہیں... جب جی چاہا اٹھ گئے... کچھ تو محض حاضری لگانے جاتے ہیں... لیکن آپ کیوں پوچھ رہے ہو یہ بات؟"
"ایسے ہی... وہ اکثر کہتا تھا کہ گزارہ نہیں ہوتا۔"
"گزارہ کس کا ہوتا ہے جی... مگر گزارنے والوں کے دن گزرتے نہیں۔"
اس نے کمپنی کا فون نمبر ایک اخبار میں دیکھ لیا تھا جس میں کمپنی کی طرف سے ان کے اکاؤنٹنٹ کے انتقال پُرملال کی خبر ایک رسمی اعلان کے طور پر شائع ہوئی تھی... اگلے روز عامر خاں نے براہِ راست جی ایم سے بات کی۔
"سر! آپ کے اکاؤنٹنٹ اصغر علی کا انتقال ہوا ہے؟"
"یس... تین دن ہو گئے۔"
"کیا آپ کی کمپنی کے حسابات درست ہیں؟"
"کیا مطلب؟"
"مطلب یہ کہ کوئی غبن وغیرہ تو نہیں ہوا... بینک میں؟"
"واٹ نان سنس... کون ہو تم... اور کیوں پوچھ رہے ہو یہ سب فضول سوالات... یہاں پیسے پیسے کا حساب روز ہوتا ہے۔"
عامر خاں نے فون بند کر دیا۔ بے شک اس کا نمبر جی ایم صاحب نوٹ کر لیتے مگر انکوائری سے وہ اس تک نہیں پہنچ سکتے تھے... عامر خاں مسکرایا، اسے اب مزید تفتیش لاحاصل نظر آئی تھی۔ وہ اتنا بے وقوف بھی نہیں تھا کہ جا کے یہ رقم پولیس کے حوالے کرے اور انہیں ساری کہانی سنا دے... وہ ایسے کہاں کے ایمان دار کہ رقم کے اصل مالک کا سراغ لگائیں... سب ان کی جیب میں جائے گا... الٹا وہ اسے جوتے ماریں گے کہ تین دن سے رقم سمیت روپوش تھا۔
ہاں کوئی حق دار سامنے آتا تو وہ ضرور چالیس لاکھ اس کے حوالے کر دیتا... اب تو ایسا لگتا تھا کہ اس کا سراغ بھی نہیں ملے گا... پھر روزِ حشر ہی سامنے آئے گا کہ یہ چالیس لاکھ کس کے تھے... وہ دو چار دن اور دیکھے گا... پھر سمجھ لے گا کہ قدرت نے اصغر علی کو وسیلہ بنایا اور چالیس لاکھ اسے بھیج دیے... خدا کی باتیں خدا ہی جانے... اس نے ایسی کوئی نیکی تو کی نہیں جس کا یہ انعام ہو۔
لیکن اب عامر خاں کا دل چالیس لاکھ کی ملکیت کے سرور سے دوچار ہونے لگا تھا۔ یہ دولت ایک شاپنگ بیگ میں لپٹی اس کے بیڈ کے نیچے پڑی تھی۔ شام کو اس نے بیگ کھول کے اس میں سے ہزار ہزار والے کچھ نوٹ نکالے اور ٹیکسی لے کر نکل گیا۔ اس نے اپنے لیے بہت مہنگے جوتے اور کپڑے خریدے اور رات تک دل کھول کے عیاشی کی۔ اب اس کے دماغ کی پرواز اونچی ہو گئی تھی۔ وہ بہت کچھ سوچنے لگا تھا۔ چالیس لاکھ میں زندگی کیسے بدل جا سکتی ہے... ایک کے بعد ایک پلان اس کے زیرِ غور تھے۔
وہ اپنے لگژری فلیٹ میں پہنچا تو بہت خوش تھا۔ بہت جلد وہ اس دڑبے سے نکل جائے گا... اپنا بزنس شروع کرے گا اور کسی اچھی سی جگہ پر کرائے کا فلیٹ لے کر رہے گا۔ ورنہ فلیٹ خریدنے کے لیے تو یہ رقم کچھ بھی نہیں... ہاں، بزنس میں ترقی ہوگی تو آہستہ آہستہ سب آ جائے گا۔ فی الحال وہ اپنی اسی ٹیکسی کو کار بنا کے استعمال کرے گا۔
اچانک اس کے فون کی گھنٹی بجی تو وہ کچھ حیران ہوا۔ اسے اس وقت فون کرنے والا کون ہو سکتا تھا؟ اس نے نمبر دیکھا تو اجنبی تھا۔ اس نے محتاط لہجے میں آواز بدل کے کہا۔
"ہیلو۔"
دوسری طرف سے کسی عورت نے پوچھا۔ "آپ کون ہیں؟"
"آپ نے کہاں فون کیا ہے محترمہ... نام جانے بغیر... لیکن کوئی بات نہیں... میں بھی اکیلا بور ہو رہا تھا... مجھے ناصر بغدادی کہتے ہیں۔"
"ناصر صاحب! میں آپ سے ملنا چاہتی تھی۔"
اس نے خوش دلی سے کہا۔ "کیا آپ ایسے ہی اجنبی لوگوں سے ملتی ہیں؟ فرض کیجیے میری جگہ ہوتے مولانا ناصر الدین بغدادی... یا فلمسٹار میرا..."
"دیکھیے... یہ مذاق کی بات نہیں۔"
"میں کب مذاق کر رہا ہوں... ذرا اپنی عمر بتائیے... پتا بتائیے... یہ بتائیے آپ شادی شدہ ہیں یا نہیں... مجھے بے وقوف بنا رہی ہیں یا آپ کا ذریعۂ معاش یہی ہے... اگر ہے تو کیوں نہ ہم کسی ہوٹل میں ملیں۔"
"ناصر صاحب! آپ دو تین دن سے انکوائری کرتے پھر رہے ہیں... اصغر علی کے بارے میں... آپ نے اس کے بیٹے سے پوچھا... اس کمپنی کے جی ایم سے پوچھا جہاں وہ کام کرتا تھا... کون ہو تم...؟" وہ آپ سے تم پر آ گئی۔

www.pkdigest.com

عامر خاں محتاط ہو گیا۔ "میں ناصر بغدادی ہوں۔"
اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ اچانک اس کی چھٹی حس نے اسے خطرے سے خبردار کر دیا۔ عورت کا لہجہ ہی غلط تھا۔ اس نے اعتراف کر لیا تھا کہ وہ عامر خاں کی انکوائری کے بارے میں جان چکی ہے۔ اس نے کوشش کر کے نمبر بھی حاصل کر لیا تھا۔ خیریت گزری کہ نام کسی اور کا تھا اور فون اس کے نام پر نہیں تھا ورنہ وہ عامر خاں کا سراغ بھی لگا لیتی۔ شاید اب وہ کوشش کرے گی کہ موبائل فون کے اصل مالک کا پتا چلائے۔ دیکھے کہ اس کے شناختی کارڈ کا پتا فون کمپنی کے ریکارڈ پر ہے اور پھر اس پتے پر پہنچ جائے... یہ ساری تگ و دو آخر کس لیے... ضرور اس کا ان چالیس لاکھ سے کوئی تعلق ہوگا۔
اب یہ کام اسے کرنا تھا... اس نے کال کرنے والی خاتون کا نمبر محفوظ کر لیا... اگلے دن اسے معلوم ہو گیا کہ فون کسی سارہ فرید کا ہے اور وہ پی ای سی ایچ ایس کے بلاک نو میں رہتی ہے... پتا تلاش کرنا اس کے لیے سب سے آسان کام تھا... وہ کشمیر روڈ پر واقع عالی شان کوٹھی یہ ظاہر کرتی تھی کہ سارہ فرید کوئی معمولی حیثیت والی خاتون نہیں... دروازے پر فرید احمد کے بورڈ سے یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ فرید کی بیوی ہے یا نہیں... لیکن یہ جاننا اتنا ضروری بھی نہیں تھا۔
اس نے علاقے میں ایک ٹیلی فون لائن مین کو کھمبے پر چڑھ کے تار ٹھیک کرتے دیکھا... وہ لائن مین کے نیچے اترنے کا انتظار کرتا رہا... اسے خوب اندازہ تھا کہ یہ لائن مین قسم کی مخلوق کم آمدنی کے باعث وہ رزق کھانے پر کیوں مجبور ہوتی ہے جسے پیٹ بھرے حرام قرار دیتے ہیں... صرف ایک سو روپے لے کر لائن مین نے اسے بتا دیا کہ وہ اسی علاقے میں کام کرتا ہے اور سب کے فون ٹھیک کرنے کے لیے خراب بھی کرتا رہتا ہے۔
جس گھر کی عامر خاں نے بات کی تھی، وہ فرید احمد کا تھا اور سارہ اس کی بیوی تھی۔ سارہ کے کردار پر لائن مین نے خاصی روشنی ڈالی جو تاریک مناظر دکھاتی تھی۔ عامر خاں اور وہ ایک کیفے روڈ سائیڈ میں چائے پی رہے تھے اور ان کے درمیان مراسم کو دوستانہ ہی کہا جا سکتا تھا۔ لائن مین بے وقوف نہ ہوتا تو اتنا نہ بولتا... اس نے بتایا کہ عورت خوب صورت ہے مگر آوارہ ہے... بہت کم کپڑے پہننے کا شوق ہے اور گاڑی لے کر پتا نہیں کس کس کے ساتھ کہاں کہاں آوارہ گردی کرتی ہے... شوہر بے غیرت ہے ورنہ یہ سب کیوں برداشت کرتا... اس کا بھی کچھ پتا نہیں کیا کرتا ہے... ملازم تو نہیں... بزنس مین ہے لیکن بزنس کی نوعیت کا مجھے پتا نہیں... میاں بیوی کی عمر میں کافی فرق ہے... فرید احمد ساٹھ کے قریب ہوگا... سارہ کی عمر اس سے آدھی ہے۔
ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا سارا کو فون کرے تو اس سے کیا کہے کہ خود سارہ کی کال آ گئی... اس نے روانی یا غصے میں کہا۔
"میں سارہ بول رہی ہوں۔"
عامر خاں نے خوش دلی سے جواب دیا۔ "آپ سارہ ہیں یا ساری... آئی ایم سوری۔"
"مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ تم ناصر بغدادی نہیں ہو... تم نے دو مہینے پہلے یہ موبائل فون کسی سے چھینا ہوگا۔"
"آپ تو غیب دان ہونے کا دعویٰ کر رہی ہیں۔"
"بکواس مت کرو... اصل مالک کا نام شریف الدین تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ گن پوائنٹ پر ایک لڑکے نے اس کا موبائل فون کورنگی میں چھینا تھا۔"
"اوہ... اتنی دور جانا پڑا آپ کو... پھر وہاں سے آپ گئی ہوں گی اس لڑکے کے گھر... اس نے کیا کہا؟" عامر اپنی ٹیکسی میں چلا گیا۔
"دیکھو... تم جانتے نہیں کہ میں کون ہوں؟"
"آپ سارہ فرید ہیں... کشمیر روڈ پر رہتی ہیں... آپ کے شوہر فرید احمد آپ سے دگنی عمر کے ہیں۔"
ایسا لگتا تھا کہ وہ کچھ حیران ہوئی ہے یا ڈر گئی ہے۔ "تم یہ سب کیسے جانتے ہو... کون ہو تم... اصغر علی کے کوئی ساتھی... کہیں تم نے تو اسے نہیں لوٹا تھا... اور لوٹ کے مار دیا؟"
وہ متانت سے بولا۔ "آپ کو اصغر علی کی فکر ہے... یا ان چالیس لاکھ روپوں کی جو اس کے پاس تھے؟"
"گویا میرا اندازہ صحیح تھا۔ تم نے ہی اسے لوٹا... تم پہلے موبائل فون چھینتے تھے... اب لوگوں کو لوٹ رہے ہو... اس کو ہارٹ اٹیک تو ہونا ہی تھا... مگر ایک بات اچھی طرح سمجھ لو... تم مجھ سے بچ نہیں سکتے... میرے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔"
وہ ہنس پڑا۔ "کتنے لمبے ہیں؟ گھٹنوں تک یا ٹخنوں تک... بات یہ ہے خاتون کہ میں اپنی گاڑی میں پھر رہا ہوں... چنانچہ کال سے مجھے ٹریس نہیں کیا جا سکتا... اگلی کال میں آپ کو دس منٹ بعد کروں گا۔"
دس منٹ بعد وہ اس جگہ سے مخالف سمت میں دس کلومیٹر چلا گیا تھا۔ سارہ نے بڑی بے تابی سے کال وصول کی۔
"تم نے میری بات کا بالکل غلط مطلب لیا۔" اس کا لہجہ اب بدلا ہوا تھا۔

"مسز سارہ فرید اہم پارٹنر بن کے کام کر سکتے ہیں؟"

"پارٹنر..." وہ کچھ دیر بعد بولی۔

"جس... یہ خیال میرے دماغ میں تمہیں دیکھ کے آیا... اور جب تم مجھے دیکھو گی تو اس خیال سے اتفاق ہی کرو گی۔"

"یہ خوش فہمی کیوں ہے تمہیں... اور تم کس کام میں پارٹنر بننا چاہتے ہو؟"

"وہی کام جو اصغر علی تمہارے لیے کرتا تھا۔" عامر خاں نے ہوا میں تیر چلایا۔ "چالیس لاکھ روپے اس کے پاس کس کے تھے؟"

"جس کے بھی تھے... اس کے بہر حال نہیں تھے۔" وہ خفگی سے بولی۔

"یہی میں بھی کہہ رہا ہوں... اس نے تمہارے لیے کسی سے وصول کیے تھے... یہ کام میں بھی کر سکتا ہوں۔"

"یہ خطرناک کام ہے... کیا تم جانتے ہو... اصغر علی تو پھنس گیا تھا۔"

"میں بھی پھنس گیا ہوں... تمہارے عشق کے جال میں... جب سے تمہیں دیکھا ہے... کیا بتاؤں کیا حال ہے... چالیس لاکھ کی کوئی اہمیت ہی نہیں رہی... جی چاہتا ہے تمہاری ایک ہنسی پر لٹا دوں۔"

"واہ... تم تو بہت بڑے عاشق ہو... لیکن عاشق صاحب عشق قربانی مانگتا ہے۔"

"میں عاشق نہیں... قربانی کا بکرا ہوں۔"

وہ ہنس پڑی۔ "اچھا چلو فرض کرو میں تمہاری بات مان لوں... تمہیں اپنا پارٹنر بنا لوں... اس کے لیے پہلے تمہیں وہ چالیس لاکھ واپس کرنے ہوں گے... جو میرے شوہر کا بزنس ہے... میں کہہ سکتی ہوں کہ اب تم اصغر علی کی جگہ کام کرو گے۔"

"میں اس کے لیے تیار ہوں... ہم کہاں مل سکتے ہیں؟"

"سی ویو پر... آج رات آٹھ بجے ٹھیک رہے گا؟ میں کیسے پہچانوں گی تمہیں؟"

وہ ہنس پڑا۔ "میری آنکھیں تمہیں اس وقت بھی دیکھ رہی ہیں۔"

فون بند کر کے وہ گھر گیا۔ اب وہ بہت مطمئن... خوش تھا... اگلے تین دن میں اس نے وہ کام کیے... اس نے اپنی ٹیکسی کا سودا کیا اور اپنے گلشن کی اپارٹمنٹ کی فروخت کے بارے میں ایک پراپرٹی ڈیلر سے بات کی۔ اس کی گاڑی تین لاکھ میں فروخت ہوئی تھی... اپارٹمنٹ کے بارے میں ڈیلر نے کہا کہ اس کے چھ لاکھ سے اوپر مل سکتے ہیں لیکن جلدی ہے تو ساڑھے پانچ کے گاہک موجود ہیں... ممکن ہے وہ چھ لاکھ بھی دے دیں۔

چوتھے دن عامر خاں کے پاس ٹیکسی کی جگہ ایک مہران کار آ گئی۔ یہ صرف دو سال چلی ہوئی تھی۔ اسی شام عامر خاں نے اپارٹمنٹ کی قیمت چھ لاکھ نقد وصول کی۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ بعد میں ڈیلر بھی اپارٹمنٹ ساڑھے لاکھ میں فروخت کرے گا... اس نے چھیالیس لاکھ کی رقم اپنی کار کی ڈکی میں گیس سلنڈر کے نیچے کی جگہ میں ٹھونسی... اپنے کپڑے اور ضروری سامان کا ایک سوٹ کیس کار کی پچھلی والی سیٹ پر رکھا اور کراچی کو خدا حافظ کہہ دیا... اس کی منزل اب اسلام آباد اور راولپنڈی تھی۔

☆☆☆

عامر خاں پاکستانی کو صرف دس ہزار روپے ماہوار پر پنڈی کے صدر میں ایک کمرا کرائے پر مل گیا۔ ہوٹل بڑی اچھی جگہ پر واقع تھا اور اس میں بنیادی سہولت کی ہر چیز تھی۔ اس کی کار بھی نیچے ہوٹل کے پارکنگ ایریا میں محفوظ کھڑی رہتی تھی۔ پہلے دن اس نے پیدل ہی صدر کے علاقے کا راؤنڈ لگایا۔ کراچی کے مقابلے میں یہ بہت چھوٹا شہر تھا لیکن پرسکون تھا۔ یہاں لوگ بھی افراتفری میں نظر نہیں آتے تھے اور صدر کا علاقہ کراچی کے صدر کا دسواں حصہ ہونے کے باوجود ماڈرن اور صاف ستھرا تھا۔ پیدل ہونے کی وجہ سے یہاں ٹریفک بھی کنٹرول میں چلتی تھی اور لوٹ مار بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔

دوسرے دن وہ اسلام آباد میں پھرا۔ اس کا یہاں مستقل رہائش اختیار کرنے کا ارادہ مزید پکا ہو گیا لیکن ابھی اس کی شرط اول پوری ہونے کی منزل غیر واضح تھی۔ اسے بہت کم امید تھی کہ وہ اپنی تلاش میں کامیاب ہوا تو اس سے کچھ حاصل بھی ہو گا یا اس کی خواہش اور جستجو رائگاں جائے گی۔

تیسرے دن اس کو اچانک ایک بک اسٹال پر ایک ایسی کتاب نظر آ گئی جو اس نے پہلے کہیں نہیں دیکھی تھی۔ یہ ڈاکٹرز ڈائریکٹری تھی جس میں اسلام آباد، راولپنڈی کے نامور اسپتالوں اور نامور ڈاکٹروں کے بارے میں ضروری معلومات کو ترتیب وار اکٹھا کر دیا گیا تھا۔ ہر قسم کے ڈاکٹرز کے نام فہرست میں تھے۔ ہارٹ سرجن... آئی اسپیشلسٹ... گائنی... اور چائلڈ اسپیشلسٹ... آرتھوپیڈک اور میڈیسن اسپیشلسٹ وغیرہ... ہر ڈاکٹر کا ایک صفحہ تھا۔ اس پر نام کے ساتھ ڈاکٹر کی کوالیفکیشن... اس کے اسپتال یا کلینک کا

ایڈریس... فون نمبر اور موبائل نمبر... اوقات کار اور گھر کا ایڈریس سب موجود تھا۔

عامر خاں کو اس کتاب کی دستیابی بالکل تائید ایزدی جیسی لگی۔ اس کی تلاش آسان ہو گئی تھی۔ اپنے ہوٹل کے کمرے میں لیٹ کے اس نے ہر فون نمبر سے پوچھنا شروع کیا۔ "آپ کسی ڈاکٹر فخر النسا کو جانتے ہیں؟" وہ جگہ اسے مثبت جواب ملا۔ ایک خاصی عمر رسیدہ اس کی ماں کی عمر والی خاتون تھیں۔ دوسری نے صاف کہا کہ وہ حال ہی میں برطانیہ سے آئی ہے اور کسی عامر خاں پاکستانی کو نہیں جانتی۔

عامر خاں کو سخت مایوسی ہوئی عمر یہ مایوسی اس وقت پھر امید میں بدل گئی جب ایک ڈاکٹر نے کہا کہ بھائی آپ کس چکر میں پڑے ہوئے ہو... پی ایم اے سے کیوں نہیں پوچھتے... عامر نے نئے سرے سے کوشش کی۔ ایک بار پھر اسے فخر النسا نام کی پانچ ڈاکٹرز کے بارے میں معلوم ہوا۔ اپنا مطلب نکالنے کے لیے اس نے جھوٹ کا سہارا لیا تھا اور ایک ایسی کہانی گھڑ لی تھی جس کا حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہ تھا لیکن جو سننے والوں کو قائل اور متاثر کرتی تھی۔ اسے پانچ جگہ ملے۔ دو کو اس نے مسترد کر دیا کیونکہ ان سے بات ہو چکی تھی۔ باقی تین کی تلاش میں اسے گاڑی لے کر نکلنا پڑا کیونکہ ان کے فون نمبر نہیں ملے تھے... صرف ایڈریس معلوم ہوئے تھے۔

دو جگہ ناکامی سے دوچار ہونے کے بعد وہ خاصا دل شکستہ تھا اور امید چھوڑ چکا تھا۔ تیسری جگہ اس نے ایک پرائیویٹ کلینک دیکھا جو عورتوں، بچوں کے لیے مخصوص تھا۔ کلینک کے اوقات صبح دس سے ایک اور شام پانچ سے آٹھ لکھے تھے... اب ایک بج چکا تھا۔ عامر خاں نے اندر جھانک کے دیکھا تو اسے کوئی مریض دکھائی نہ دیا۔ یہ کلینک ایک دکان میں تھا جس کے دو حصے کر دیے گئے تھے۔ سامنے والے حصے میں بچوں کے مریض بیٹھتے تھے... پھر پارٹیشن والا پردہ تھا جس کے پیچھے ڈاکٹر بیٹھتی تھی۔

عامر خاں نے ڈرتے ڈرتے اندر قدم رکھا اور پردہ ہٹا کے دیکھا تو جیسے منجمد ہو کے رہ گیا۔ فخر النسا اس کے سامنے اپنی میز پر سامان کو ترتیب سے رکھ کے جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ چند لمحے وہ دونوں بت بنے کھڑے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

پھر فخر النسا نے تلخی سے کہا۔ "تم... یہاں بھی آ گئے؟"

عامر خاں اس کرسی پر بیٹھ گیا جس پر مریض بیٹھتا ہو گا۔ "ہاں... اور مت پوچھو تمہاری تلاش میں کتنے پاپڑ بیلے ہیں میں نے۔"

"جاؤ... خدا کے لیے چلے جاؤ۔"

"نہیں فخر النسا... میں جانے کے لیے نہیں آیا ہوں... دو ہزار کلو میٹر کا سفر میں نے اس لیے نہیں کیا تھا۔"

فخر النسا بیٹھ گئی۔ "پھر کس نے کہا تھا... کیا تمہیں معلوم ہے کہ پہلے کیا ہوا تھا... تمہارے ملنے کے بعد..."

"میں معلوم کرنا بھی نہیں چاہتا۔"

"میری زندگی برباد ہو گئی۔ میرے گھر والے، مجھے چھڑا کے تو لے آئے لیکن..."

عامر خاں نے کہا۔ "لیکن تمہاری منگنی ٹوٹ گئی... اس شخص نے تمہیں قبول کرنے سے انکار کر دیا جس سے تمہاری شادی طے تھی۔"

"یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"اور کیا وجہ ہو سکتی ہے تمہارے دکھی ہونے کی... تم جو اتنی تلخ ہو رہی ہو... اس میں اور کس کا قصور ہو سکتا ہے... ایسا ہی ہوتا ہے یہاں فخر النسا... اور مجھے ڈر تھا کہ تمہارے ساتھ بھی ہو گا... وہ شخص عام آدمی ثابت ہوا... جو تمہیں معاف نہیں کر سکا حالانکہ تم ذرا بھی قصوروار نہیں تھیں۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "تمہارے ایسا سمجھنے یا ایسا کہنے سے کچھ نہیں ہو گا عامر خاں پاکستانی۔"

وہ مسکرایا۔ "اگر تمہیں ابھی تک میرا نام یاد ہے... تو کچھ ضرور ہو گا۔"

"میں... میں اب گھر جا رہی ہوں۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"میں تمہارے ساتھ بھی جا سکتا ہوں... لیکن میں بعد میں آؤں گا۔"

"بعد میں کب... میرا مطلب ہے کیوں؟" وہ گھبراہٹ میں بولی۔

"تمہارے والدین سے بات کرنے... تمہارا ہاتھ مانگنے۔"

وہ پھر منجمد ہو گئی۔ "تم... تم نے کیسے فرض کر لیا کہ میں مان جاؤں گی؟"

"میں نے کچھ بھی فرض نہیں کیا... مجھے یقین ہے کہ میں تمہیں منا لوں گا اور تمہارے والدین کو بھی۔"

"عامر... وہ نہیں مانیں گے۔" فخر النسا کا رنگ گلابی ہونے لگا تھا۔

"سمجھ دار والدین کو سمجھ داری کی بات سن کے سمجھ داری سے کام لینا چاہیے... ورنہ بالغ بچے مجبوراً اپنا خود مختاری

www.pkdigest.com

کا حق استعمال کرتے ہیں... شرعی اور قانونی۔"

وہ آہستہ سے مسکرائی۔ "جو میں نہیں کر سکتی۔"

"میں کر سکتا ہوں۔"

"کیا کر سکتے ہو... میری مرضی کے بغیر؟"

"تمہیں اٹھا کے لے جا سکتا ہوں... کسی قاضی کو بھی اٹھا کے لا سکتا ہوں... تم کہہ سکتی ہو کہ میں پروفیشنل اٹھائی گیرا ہوں... لیکن اطمینان رکھو... میں تمہارے والدین کو قائل کر لوں گا... تم دیکھنا... تم گھر کیسے جاتی ہو؟"

"ایک پرانی چھوٹی سی گاڑی ہے میرے پاس جس میں آپ تشریف رکھ چکے ہیں ایک بار..."

"اوہ یس... اسے بھول جانا میری سخت نالائقی ہے... خیر... اب آپ چلیں... میں آپ کا پیچھا کرتا ہوں... ابھی گھر دیکھوں گا اور انشاء اللہ کل کسی وقت پھر آؤں گا... یا رات کو کھانے پر۔"

"مان نہ مان میں تیرا مہمان... میں نے انوائٹ نہیں کیا۔"

"کھانے پر میں آپ کو انوائٹ کر رہا ہوں خاتون... رات کو کلینک بند کرنے کے بعد... آپ ویسا ہی کوئی بہانہ کر سکتی ہیں جیسا کہ لڑکیاں عموماً کرتی ہیں... کسی سہیلی کی سالگرہ ہے... منگنی ہے... بچے کا عقیقہ ہے۔"

وہ ہنس پڑی۔ "بہت تجربہ ہے تمہیں... اگر میں نہ کر دوں تو؟"

"دیکھو... تمہارے گھر والوں سے پہلے مجھے تم کو قائل کرنا ہے... کچھ اہم انکشافات کرنے ہیں... اندیشہ ہے کہ یہاں سنو گی تو خوشی سے بے ہوش ہو جاؤ گی چیخ مار کے... وہاں آس پاس لوگ ہوں گے اور میں آہستہ آہستہ بتاؤں گا... رات دس بجے... ٹھیک... خدا حافظ۔" وہ پلٹا اور فخر النسا کو ہکا بکا چھوڑ کے نکل گیا۔

رات گیارہ بجے دامنِ کوہ کے پُرفضا اور رومانٹک ماحول میں بیٹھ کے عامر خان نے بڑے رومانوی انداز میں اسے پروپوز کیا اور انگوٹھی اس کے سامنے رکھ دی... صاف نظر آ رہا تھا کہ آج کلینک آتے وقت بھی اس نے خصوصی تیاری کی ہوگی... اس کا لباس اور میک اپ خود گواہی دیتا تھا... عامر خان یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ وہ خوش ہے۔

فخر النسا انگوٹھی کی ڈبیا کو دیکھتی رہی... پھر اس نے اسے آہستہ سے کھولا اور چمکتے ہیرے کے نگینے والی انگوٹھی کو دیکھتی رہی۔ عامر خان جانتا تھا کہ یہ کسی بھی لڑکی کے لیے زندگی کا سب سے اہم فیصلہ کن اور خوب صورت لمحہ ہوتا ہے۔ جذبات کے تمام رنگوں سے سجے اس لمحے کے تمام رنگ مل کے حیا کی سرخی اور مسرت کی تابناکی بن کے فخر النسا کے گالوں پر اور اس کی آنکھوں میں آ گئے تھے۔ چند سیکنڈ بعد اس نے آہستہ آہستہ پلکیں اٹھا کے عامر کو دیکھا اور دیکھتی رہی... عامر خان اس کی آنکھوں کے راستے اس کے دل میں اتر گیا۔

اس نے نرمی سے فخر النسا کا ہاتھ پکڑا۔ اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی... اس کا ہاتھ نرم اور سرد تھا... عامر خان نے انگوٹھی نکالی اور اس کی انگلی میں پہنا دی۔ "تھینک یو فخر النسا... تم نے مجھے ناامید نہیں کیا۔"

اس کا چہرہ اب فرطِ جذبات سے تمتما رہا تھا۔ "عامر! میں اسے پہنے نہیں رہ سکتی... گھر جانے سے پہلے اسے اتار دوں گی... تمہارے سامنے پھر پہن لوں گی... تم ڈیڈی سے بات کرو... تاکہ..."

"اگر میں ابھی تمہارے ساتھ جا کے بات کروں... پھر؟"

"یہ مجھے اچھا نہیں لگے گا... سب سمجھیں گے کہ میں تمہیں لے کر آئی ہوں۔"

"او کے... میں صبح آؤں گا... تمہارے کلینک جانے کے بعد۔"

"اب پہلے انکشافات کرو گے یا آرڈر دو گے... میں بے ہوش ہونے والی ہوں بھوک سے۔" وہ بڑی خوب صورتی سے مسکرائی۔

عامر نے آرڈر دیا اور پھر فخر النسا کو بتا دیا۔ "میں تمہارے لیے ایک اسپتال بنانا چاہتا ہوں... پچاس لاکھ کے قریب ہیں میرے پاس... اتنے ہی ہم لون بھی لے سکتے ہیں... تم اپنا میٹرنٹی ہوم چلاؤ... آہستہ آہستہ ہم اس میں سب کچھ کر لیں گے... ایکس رے مشینیں... آپریشن تھیٹر..."

"تم... یہ سب کرو گے... میرے لیے؟" فرطِ جذبات سے فخر النسا کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ "تم یہ سب طے کر کے آئے تھے؟"

"ہاں... لیکن دیکھو... کھانا آنے سے پہلے بے ہوش مت ہونا... رونے کی اجازت بھی نہیں... مسکراتی ہوئی تم زیادہ اچھی لگتی ہو۔"

"اگر میں نہ ملتی... میری شادی ہو گئی ہوتی... پھر؟" اس نے کھانے کے دوران سوال کیا۔

عامر خان نے ہاتھ روک کے کہا۔ "معلوم نہیں کیوں... مجھے یہ امید تھی کہ تم مجھے ملو گی... جب تم ملی تھیں، تب ایسا نہیں تھا... لیکن اس کے بعد جو میرے اور تمہارے ساتھ ہوا... اس کے بعد یہاں ایسا ہی ہوتا ہے... ہر لڑکی کو

ملتی ہے، خواہ اس کا قصور ہو نہ ہو... اور مجھے خیال تھا کہ شاید اب تمہارا وہ نامزد شوہر تمہیں قبول نہ کرے... عام طور پر دنیا کے یہ رشتے ایسے ہی بنتے اور ٹوٹ جاتے ہیں... اختر الایمان کی ایک نظم تھی جو مجھے پوری یاد نہیں... اس میں کچھ ایسا ہی تھا کہ... آ مری جان کب شب تو... دریچے کے قریب... اور نظم کا آخر یہ تھا کہ... دوست ماں باپ اور بھائی بہن... مل کے تیری ہنسی اڑائیں گے... یہ سہارے یہ سوت کے دھاگے... ایک جھٹکے میں ٹوٹ جائیں گے... اور میں نے سوچا کہ سوت کے دھاگے جیسے رشتے ٹوٹتے ہیں تو اس کی تلافی میں کروں گا۔"

وہ پلکیں جھپکائے بغیر سنتی رہی... پھر آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی آئی اور دو آنسو اس کے رخساروں پر اتر آئے۔

"عامر خان پاکستانی... میں خواب تو نہیں دیکھ رہی؟"

وہ ہنسا۔ "چلو کھانا کھاؤ... اور سنو... یہ تو میں نے بتا دیا تمہیں کہ میں ڈاکٹر نہیں بن سکا... میں سیکنڈ ایئر میڈیکل کا امتحان نہیں دے سکا تھا۔ اب میں تمہارے اسپتال میں کمپاؤنڈر بنوں گا۔"

اس نے عامر کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "کیسی بات کرتے ہو..."

"کیوں؟ کیا خرابی ہے اس میں... بیوی ڈاکٹر، میاں کمپاؤنڈر... چلو تم مجھے منیجر سمجھ لو... وہ ہمارا اسپتال ہوگا... ہم مل کے چلائیں گے اسے۔"

"عامر... تم پھر میڈیکل کالج جوائن کرو گے۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں... اب میں اور کچھ نہیں کروں گا... تم سے محبت کے علاوہ۔"

دوسرے دن وہ صبح فخر النسا کے گھر سے نکلتے ہی اس کے ماں باپ سے ملنے پہنچ گیا۔ ان کا گھر ایک متوسط طبقے کی آبادی میں تھا۔ اس کا باپ ایک ریٹائرڈ اکاؤنٹس آفیسر تھا۔ وہ بیمار بھی تھا اور پنشن میں ان کا گزارہ خاصی تنگی سے ہو رہا تھا۔ اس کی بیوی چپ چاپ اپنے شوہر کے پیروں کی طرف بیڈ پر بیٹھی عامر کی بات سنتی رہی۔ عامر نے بڑی عاجزی سے بات کی اور اپنے بارے میں کچھ نہیں چھپایا۔ اس نے سب بتا دیا کہ وہ فخر النسا کے لیے کیا کرنا چاہتا ہے۔

جب عامر خان اپنی ساری بات کہہ دینے کے بعد خاموش ہو گیا، تب بھی فخر النسا کے والدین خاموش بیٹھے اسے دیکھتے رہے۔ ان کے چہرے پر تذبذب، بے یقینی، حیرانی اور پریشانی کے جذبات ان کے خیالات کا انتشار ظاہر کر رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ عامر خان سے کیا کہیں، کیا پوچھیں اور کیا نہ پوچھیں... یہ سب اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ وہ خود کو انتہائی بے بس محسوس کر رہے تھے۔

بالآخر عامر خان نے ہی کہا۔ "آپ مجھ سے کچھ پوچھیں گے نہیں؟"

فخر النسا کے باپ نے سر ہلایا۔ "میری جگہ تم ہوتے بیٹا تو کیا کرتے... ایک بیٹی ہوتی تمہاری اور کوئی اجنبی اچانک آ کے اس کا رشتہ مانگ بیٹھتا جس کا نہ کوئی آگے پیچھے ہوتا... نہ خاندان..."

"ہاں... ہم کس سے پوچھیں اور کیا پوچھیں... بس تمہاری سن کے ہاں کر دیں؟"

"بالکل نہیں... آپ سوچ سمجھ کے فیصلہ کریں... مجھے کوئی جلدی نہیں... یہ ٹھیک ہے کہ میرا کوئی رشتے دار نہیں... میرا گھر بھی تھا... ماں باپ، بھائی بہن سب تھے... آٹھ اکتوبر کو صبح آٹھ بج کے پچاس منٹ تک... اس کے بعد میں اکیلا رہ گیا... شاید میرے نواب شاہ میڈیکل کالج کے پرانے کلاس فیلوز میرے حق میں گواہی دے سکیں... میں اب چلتا ہوں۔"

"ایسے تم کیسے جا سکتے ہو... تم بہرحال ہمارے گھر آئے ہو... ہم ایک کپ چائے تو پیش کر سکتے ہیں۔" خاتون نے کہا۔ "میں چائے لا رہی ہوں۔"

وہ پھر بیٹھ گیا۔ "دیکھیے... مجھے یہ سب نہیں آتا... رشتے مانگنے گھر کے بڑے جاتے ہیں... اس کے بھی کچھ آداب ہیں۔ میں یہاں خالی ہاتھ آ گیا... اور جو دل میں تھا وہ کہہ دیا... اگر میری کوئی بات آپ کو بری لگی ہو تو میں معافی چاہتا ہوں۔"

فخر النسا کی ماں نے چائے کا کپ اس کے سامنے رکھ دیا۔ "ویسے تو تم شریف آدمی لگتے ہو... لیکن بیٹا... فخر النسا کے معاملے میں ہم نے بڑی چوٹ کھائی... وہ بھی شریف لوگ ہی تھے، تمہیں تو ہم جانتے تک نہیں۔"

عامر خان نے چائے حلق میں انڈیلی اور کھڑا ہو گیا۔ "اب تو جان گئے ہیں نا... میرے اتنا کچھ بتانے کے بعد... خدا حافظ۔"

اس کے باپ نے کہا۔ "کیا... یہاں کوئی تمہیں جانتا ہے؟"

وہ دروازے میں رک کے پلٹا اور بولا۔ "ہاں... ڈاکٹر فخر النسا مجھے جانتی ہے۔"

☆☆☆

www.pkdigest.com

تین سال بعد...

اس عورت نے گاڑی کو بیرونی دیوار کے ساتھ پارک کیا جہاں اور بھی بہت سی کاریں کھڑی تھیں۔ وہ زیادہ عمر کی عورت نہیں تھی۔ کچھ غیر ضروری وزن اور کچھ صورت سے عیاں تفکرات نے اس کی ظاہری عمر بڑھا دی تھی ورنہ وہ ایک اچھے گھر کی خوش پوش اور خوش باش لڑکی نظر آتی...

فخر النسا میٹرنٹی ہوم کے ریسپشن پر موجود اسمارٹ لڑکی نے اسے بڑی خوش اخلاقی سے ویلکم کیا۔ ''یس میڈم! وات کین آئی ڈو فار یو۔''

''مجھے ڈاکٹر فخر النسا سے ملنا ہے۔''

''آپ کا کوئی اپائنٹمنٹ تھا؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں انتظار کر سکتی ہوں۔''

لڑکی نے انٹر کام پر فخر النسا سے بات کی۔ پھر عورت کو ایک فارم بھرنے کے لیے دیا۔ ''اتفاق سے وہ مریض ابھی تک نہیں آئی جس کا یہ وقت تھا، آپ کاریڈور میں جائیے... دائیں ہاتھ پر پہلا کمرا... ایک ہزار پلیز...''

اس نے سر ہلا کے کنسلٹیشن فیس ادا کی اور کاریڈور کی طرف بڑھ گئی۔ یہ صبح کا وقت تھا اور او پی ڈی میں عام مریض عورتیں اور بچے آنے لگے تھے۔ انہیں باری باری دوسرے ڈاکٹروں کے پاس بھیجا جا رہا تھا... صرف ڈاکٹر فخر النسا سے ملنے کے لیے مشورہ فیس ایک ہزار دینا اور وقت لینا ضروری تھا۔

ریسپشن کے مقابل اس دروازے سے عامر خاں برآمد ہوا جس کے دروازے پر ''ایڈمنسٹریٹر'' کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ ''اندر ہے کوئی؟''

''یس سر... ایک خاتون ابھی گئی ہیں۔''

خاتون اسی وقت دروازہ کھول کے باہر آ گئی۔ چہرے سے وہ سخت غصے میں لگتی تھی۔ اس نے عامر خاں پاکستانی کو دیکھا اور اپنی جگہ پر منجمد ہو گئی۔ ''تم...!'' اس نے بے یقینی سے کہا۔

اس کے پیچھے پیچھے فخر النسا باہر آئی۔ ''دیکھیے... آپ اپنی فیس واپس لے سکتی ہیں... ہم یہ کام نہیں کرتے۔''

عامر خاں نے کہا۔ ''شی از مائی وائف... ڈاکٹر فخر النسا گائنی اسپیشلسٹ... اور فخر... یہ عافیہ ہے... نواب شاہ میں ہم ایک ساتھ پڑھتے تھے۔''

''مجھے... معلوم نہیں تھا کہ... یہ تمہارا اسپتال ہے... تم نے...'' عافیہ نے اپنا سوال ادھورا چھوڑ دیا۔

عامر خاں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں... میں تو سیکنڈ ایئر کا امتحان ہی نہیں دے سکا تھا... ابھی تک میں وہی ہوں... صرف انٹر سائنس۔''

فخر النسا نے کہا۔ ''یہاں کھڑے ہو کے باتیں کرنا کچھ مناسب نہیں۔''

عامر خاں نے سر ہلایا۔ ''آؤ... میرے کمرے میں۔''

عافیہ ابھی تک سخت حیران تھی۔ وہ ایڈمنسٹریٹر کے شاہانہ انداز میں سجائے گئے کمرے میں بیٹھ گئی۔

''عافیہ! بارش چاہتی تھی... میں نے معذرت کر لی۔'' فخر النسا نے کہا۔

''بارش... کیوں ڈاکٹر عافیہ...؟''

عافیہ نے اداسی سے کہا۔ ''میں ڈاکٹر نہیں ہوں... تھرڈ ایئر میں ہی ایک بہت بڑے وڈیرے نے میرا رشتہ مانگ لیا تھا... اپنے بیٹے کے لیے۔''

''چنانچہ تم نے میڈیکل کی تعلیم چھوڑ دی؟'' عامر خاں نے کہا۔ ''مجھے یقین نہیں آتا۔''

''میں نے انکار کیا تھا۔ اس سے میرے فادر کے لیے مسائل پیدا ہو گئے۔ ان کے خلاف کرپشن اور نااہلی کے کیس بنا دیے گئے... سیاسی دباؤ تھا... ان کو جیل میں ڈال دیا گیا... میں کیا کرتی... میں اب اسلام آباد میں ہوں۔''

خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا۔ ''کتنے بچے ہیں تمہارے؟''

''ایک لڑکا۔'' عافیہ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''پھر... یہ بارش...؟'' فخر النسا نے کہا۔

عافیہ نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ''میرا شوہر بیٹی نہیں چاہتا... میں نے الٹرا ساؤنڈ کرایا تھا...''

''آئی ایم سوری۔'' عامر خاں نے ہمدردی سے کہا۔

عافیہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''میں اب چلتی ہوں۔''

''چائے... کافی... کچھ تو لو۔'' عامر خاں نے اخلاقاً کہا۔

عافیہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''ابھی موڈ نہیں۔''

''اچھا... کسی دن گھر آؤ۔'' فخر النسا نے اخلاقاً کہا۔

اسی وقت ایک بچی لڑکھڑاتے قدموں سے چلتی اندر آ گئی۔ عامر خاں نے کہا۔ ''یہ ہماری بیٹی ہے نور۔ اسے ہم ڈاکٹر بنائیں گے۔'' عامر نے اسے گود میں اٹھا لیا۔ ''اس کا باپ ڈاکٹر نہ بن سکا... بیٹی ضرور بنے گی۔''

عافیہ نے بڑی مشکل سے مسکرا کے کہا۔ ''انشاء اللہ۔''

اور پھر تیز تیز قدموں سے باہر نکل گئی۔

www.pkdigest.com